فقل للعیون الرمد ایاک ان تری سنا الشمس فاستغشی ظلام اللیالیا

گرد آلود آنکھوں سے کہہ دو کہ اگر وہ آفتاب کی روشنی کو نہیں دیکھ سکتیں تو راتوں کی تاریکیاں اپنے اوپر اوڑھ لیں

مقامِ حیات

المسمّٰی بہ

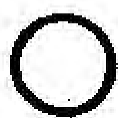
مدارکُ الاذکیاء فی حیاۃِ الانبیاء علیہم السلام

مکینِ گنبدِ خضرا کی حیاتِ برزخی کا بیان

تالیف

ڈاکٹر علامہ خالد محمود

ڈائریکٹر اسلامک اکیڈمی مانچسٹر



دارُ المعارف

الفضل مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

نام کتاب ——— مقام حیات

مصنف ——— ڈاکٹر علامہ خالد محمود مانچسٹر

کتابت ——— محمد حفیظ الحق صدیقی خانیوال

صفحات ——— ۷۵۲

ایڈیشن ہذا ——— ۱۴۱۴ھ / ۱۹۹۳ء

ناشر ——— جامعہ ملیہ اسلامیہ لاہور

دار المعارف اردو بازار لاہور

تعداد ——— گیارہ سو

قیمت اعلیٰ مجلد ——— ۱۷۰ روپے

ممالک یورپ ——— ۱۲ پونڈ

ملنے کے پتے

دفتر دار المعارف ۲/۱ دیو سماج روڈ سنت نگر

جامعہ ملیہ اسلامیہ توحید پارک نزد امامیہ کالونی لاہور

پتہ انگلینڈ : اسلامک اکیڈمی آف مانچسٹر

19 - Charlton Terrace Off Upperbook Street, Manchester 13

فہرست مضامین

انکار حیات کا تاریخی پس منظر

مقدمہ

اسلام کا عقیدہ برزخ ۱۳۱

عذابِ قبر محدثین کی نظر میں

عذابِ قبر احادیث کی روشنی میں ۱۵۶

قبر کی واردات ۱۶۷

ساتویں صدی کی شہادت

آٹھویں صدی کی شہادت

نویں صدی کی شہادت

دسویں صدی کی شہادت

گیارہویں صدی کی شہادت

بارہویں اور تیرہویں صدی

چودہویں صدی کی شہادت

دنیوی زندگی نہیں دنیا کی سی زندگی ہے

آیت اللہ یتوفی الانفس حین موتہا پر بحث

قبر کی حقیقت ۲۷۹

حیات شہداء

حیاتِ جسمانی

حیات برزخی

حیات شہداء کے شواہد

حیات بعد الوفات لسید الکائنات

حدیث الفصل الاول وفیہ ستۃ من المباحث

الفصل الثانی وفیہ ستۃ من المباحث

الفصل الثالث وفیہ ستۃ من المباحث

الفصل الاول مسلک خلفائے راشدینؓ

الفصل الثانی فی بیان المذاہب الاربعہ

الفصل الثالث

الفصل الرابع فی موقف المتکلمین

پاکستان کے دس اکابر مسلک دیوبند کا متفقہ اعلان

ربع صدی کی معرکہ آرائی دیکھنے کے بعد دارالعلوم دیوبند کا تاریخی فیصلہ ۱۴۰۵ھ

مخدوم العلماء جامع شریعت و طریقت حضرت مولانا

قاری محمد طیّب صاحبؒ

کا مؤلف مقامِ حیات کے نام ۱۹۶۲ء کا ایک خط

حضرت محترم زید مجدکم السامی

سلام مسنون نیاز مقرون. گرامی نامہ باعثِ شرف ہوا. میں شعبان رمضان اور اوائل شوال میں مسلسل سفر میں رہا. یہی وجہ تاخیر جواب کی ہے. اب بھی سفر میں ہی ہوں اور ریل ہی میں جواب لکھ رہا ہوں، کل دیوبند پہنچوں گا انشاء اللہ. "مقامِ حیات" جیسے موقر رسالہ سے مستفید ہوا اور حرفاً حرفاً اوّل سے آخر تک پورا رسالہ دیکھا. اس موضوع پہ اس سے بہتر کتاب اب تک میری نظر سے نہیں گذری. مسئلہ کا تجزیہ نہایت ہی فاضلانہ اور محققانہ انداز سے کیا گیا ہے طرزِ بیان انتہائی بلیغ، موثر اور دلنشین ہے. مسئلہ کے ہر پہلو کا حکم نہایت ہی بالغ نظری کے ساتھ اس کی صحیح کیفیت و حقیقت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے. اس کی ایک ایک سطر سے آنکھوں میں نور اور دل میں سرور بڑھتا ہوا محسوس ہوتا تھا. حق تعالیٰ آپ کی اس مبارک سعی کو قبول فرمائے اور جس طرح آپ نے اپنے اسلاف کے مسلک کی نصرت و اعانت کر کے اسے نمایاں فرمایا ہے. حق تعالیٰ آپ کی نصرت دارین میں فرما کر آپ کو سربلند اور رفیع المرتبت بنائے. آمین. اور اس خدمت کو قبول فرمائے.

مستدعی دعا ہوں اور احباب کے لیے ہر وقت دُعا گو ہوں.

والسّلام

محمد طیب مدیر دارالعلوم دیوبند

۱۳۸۱ھ

منقول از ہفت روزہ دعوت لاہور ۱۴ ستمبر ۱۹۶۲ء

سماحۃ الشیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز کا فتویٰ

"نماز کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صاحبین ابوبکرؓ و عمرؓ کی قبروں کی زیارت کرے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کے سامنے ادب کے ساتھ کھڑا ہو جائے اور دبی آواز کے ساتھ آپ پر اس طرح سلام کرے":۔

السلام علیك یارسول اللہ ورحمة اللہ وبرکاته.

جیسا کہ سنن ابی داؤد میں ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جو شخص مجھ پر سلام بھیجتا ہے تو اللہ تعالیٰ میری روح مجھ پر لوٹا دیتا ہے یہاں تک کہ میں اس کے سلام کا جواب دیتا ہوں۔[1]

اس سے پتہ چلا کہ یہ کہنا درست نہیں کہ وفات کے بعد روح قیامت تک بدن میں لوٹنے سے روک دی جاتی ہے۔ فیمسك التی قضیٰ علیها الموت کا مطلب یہ ہے کہ موت والے کی روح اس دنیا میں اُس کے بدن میں لوٹنے سے روک دی جاتی ہے اور نیند والے کی اسے لوٹا دی جاتی ہے۔ یہ نہیں کہ مرنے والے کی روح عالمِ برزخ میں بھی بدن میں لوٹنے سے رکی ہوئی ہے۔۔۔۔ شیخ عبداللہ بن باز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بارے میں فرماتے ہیں:۔

اہل علم کے نزدیک یہ ایک متفق علیہ مسئلہ ہے لیکن آپ کی یہ موت آپکی حیات برزخی کے لیے مانع نہیں جیسے شہداء کی موت ان کی حیاتِ برزخی کے لیے مانع نہیں۔[2]

یعنی اس میں کسی کا اختلاف نہیں کہ حضورؐ پر وفات آئی اور انك میت وانهم میتون کا وعدہ پورا ہوا۔ لیکن اس آیت کو آپ کی عالمِ برزخ کی حیات کے لیے مانع سمجھنا اور اس سے عقیدہ حیات النبی کو رد کرنا کسی صاحبِ علم کا کام نہیں۔ ایسا ہوتا تو قرآن کریم میں حیاتِ شہداء پر نص وارد نہ ہوتی۔

---

[1] الحج والعمرہ والزیارۃ ص۱۵۱ [2] ایضاً ص۱۶۱

تعارف و اعتذار

اس نازک دور میں، جب کہ عوامی سطح پر مذہب کی گرفت ڈھیلی ہوتی جا رہی ہے. تن آسانیاں اور لذت سامانیاں مذہب سے عام بیزاری پیدا کرنے میں مصروف عمل ہیں —— ضرورت تھی کہ احترامِ دین اور فکرِ آخرت رکھنے والا طبقہ —— جسے کہ عام طور پر دینی طبقہ کہا جاتا ہے، —— اپنی مجموعی کوششیں اور تمام تر جدوجہد —— دین و ملت کے اصولی مسائل کے تحفظ پر لگا دے، لیکن افسوس کہ جو لوگ احترامِ دین کے احساس میں مشترک تھے، تفاصیلِ فکر و عمل میں خود مختلف راہیں چلنے لگے اور ؎

جن پر تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

لادینیت کا محاذ

مالی قدروں اور جنسی لذتوں کا آمیزہ —— اسلام کو اپنے رستے میں ایک رکاوٹ سمجھ کر لادینی کے لیے ایک متحدہ محاذ بنا رہا ہے —— زمین کہاں تک ہموار ہو چکی ہے، یہ اس کی تفصیل کا موقعہ نہیں —— مذہبی راہنماؤں سے مذہب تک پہنچنے میں کتنا وقت لگے گا —— تنگ نظر فرقہ پرستوں کو خوش فہمی ہے ؎

ہنوز دہلی دور است

سوادِ اعظم کے مختلف مسالکِ عمل بے شک ایک ہی جادۂ شریعت کے نظامِ وسعت اور ایک ہی چشمۂ عمل کے مختلف کنارے تھے. عقائد کی مختلف تعبیرات بھی بلا ریب نزاعِ لفظی کی حدود سے متجاوز نہ تھیں لیکن افسوس کہ محدود ذہنوں کی تنگ نظری نے انہیں بھی جنگ

کے میدان بنا کر سوادِ اعظم کی مرکزی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا۔ معتزلہ اور کرامیہ خود اہلِ سنّت کی صفوں میں آ گھسے ہیں۔

اختلاف سے خلاف پیدا ہوا اور معاملہ یہاں تک پہنچا کہ اصول تو درکنار، فروعات اور تعبیرات پر بھی تعصب اور تحزب کی تند ہوائیں چلنے لگیں۔ ایسے حالات میں ہر دردمند اور حساس مسلمان کا دل تڑپ اٹھتا ہے اور تڑپنا بھی چاہیئے ؎

یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے

جہاں تک اس حقیقت کا تعلق ہے کہ بعض ابواب میں خود شریعت ہی مختلف طریقِ عمل پیش کر کے اسلام کے نظامِ وسعت کا پتہ دیتی ہے، بے شک ایسے اختلافات رحمت ہیں۔ لیکن بیمار عقلیں اور کمزور ذہن جب ان اختلافات سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اجماعیات اور مسائلِ متفقہ میں بھی کیڑے نکالنے لگیں، تو کون سا حقیقت آشنا دل ہے، جو زخمی نہ ہو، اور کون سی صداقت پسند آنکھ ہے جو اشکبار نہ ہو۔

اندرونی اتحاد کی ضرورت

اندرونی اتحاد کی ضرورت جتنی بیرونی حملے کے وقت ہوتی ہے، شاید ہی اس سے پہلے کبھی محسوس کی گئی ہو۔ ضروری ہوتا ہے کہ داخلی انتشار کے سدِّباب کے لیے جملہ عوامل بروئے کار لائے جائیں ـــــــ فطرت کا نظامِ انقلاب اور قومی زندگی کا مدوجزر اس حقیقت کا نہ صرف پتہ دیتے ہیں، بلکہ یقین دلاتے ہیں کہ وحدتِ ملی کا مرکز و محور صرف اور صرف اعتماد علی السلف ہے۔ سلف سے مراد نسل و وطن کے پیش رو نہیں، بلکہ علم و معرفت کے وہ ستون ہیں جن سے تاریخ کے مختلف ادوار میں علمِ نبوت ـــــــ پوری امت کو وراثت میں ملتا رہا ہے۔ فکر و نظر کی وسعتیں اسی حد تک لائقِ تحسین ہیں کہ اعتماد علی السلف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے اور احساسِ ملی کا یہ چشمۂ حیات گدلا نہ ہونے پائے ؎

راہ آباد رو کہ ایں جمعیت است معنیٔ تقلید ضبطِ ملت است
(اقبال)

اسلام کا عقیدۂ معاد ــــ دینِ محمدی کا اہم ترین موضوع

قرآن کریم کا سب سے بڑا موضوع اللہ رب العزت کی ہستی کا اقرار اور اس کی وحدانیت کا اعتقاد ہے۔ قرآن پاک میں یہ مضمون جگہ جگہ پھیلا ہوا ہے۔ اللہ رب العزت کے وجود علم حیات قدرت اور یہ کہ وہ ہر جگہ سے سنتا ہے اور ہر کسی کو دیکھتا ہے اس کا جگہ جگہ اقرار ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سب پیغمبر اور فرشتے اس کی تخلیق سے وجود میں آئے اور سب امکان و حدوث کے دائرہ میں ہیں ایک وہی ہے جو واجب الوجود ہے اور کوئی اس کا شریک نہیں۔ واجب الوجود کی کوئی صفت بھی کسی بندے میں نہیں آتی اور کوئی انسان صفاتِ واجبہ میں سے کسی صفت سے متصف نہیں ہو سکتا۔ اس کے لوحِ قلب پر ملاء اعلیٰ کی کوئی جھلک اترے تو یہ امر دیگر ہے۔

اس عقیدۂ توحید کے بعد قرآن پاک کا دوسرا بڑا موضوع اسلام کا عقیدۂ معاد ہے، اسے Resurrection (حشر اجساد) بھی کہتے ہیں۔ قرآن کریم میں جس طرح توحید باری کے دلائل و شواہد جگہ جگہ دیئے گئے ہیں۔ دوسرے نمبر پر اسلام کا عقیدہ معاد ہے۔ مسئلہ الٰہ اور یقین آخرت سے رسالت کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اسلام کے یہی تین اصول ہیں۔ توحید، آخرت، اور رسالت۔ اسے اس ترتیب سے بیان کرتے ہیں۔ التوحید والرسالة والآخرة۔ ایمان مجمل میں اللہ تعالیٰ فرشتوں، آسمانی کتابوں اور پیغمبروں کے بعد پانچواں رکن ایمان یہی ہے۔ الروضة الندیہ میں ہے:۔

> هذا هو الركن الخامس من اركان الايمان وهو الايمان باليوم الآخر وجمهور بني آدم يؤمنون بالبعث بعد الموت وقد دل منه على ذلك العقل والفطرة كما صرحت به جميع الكتب السماوية ونادى به الانبياء والمرسلون والناس في البرزخ يفتنون وينعمون او يعذبون على ذلك۔[1]

---

[1] الروضة الندیہ شرح العقیدة الواسطیہ ص۳۱۱ طبع ۱۳۸۸ھ

ترجمہ. ارکان ایمان میں سے پانچواں رکن یہی ہے اور وہ آخرت پر ایمان لانا ہے بنی آدم کی اکثریت اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ مرنے کے بعد پھر اٹھنا ہے عقل اور فطرت اس کی طرف رہنمائی کرتے ہیں. تمام آسمانی کتابوں میں اسکی صراحت ہے اور تمام انبیاء ومرسلین اس دن کی آواز دیتے آئے ہیں اور لوگ برزخ میں (اس درمیانی زندگی میں) آزمائش میں ڈالے جاتے ہیں اور انہیں اس پر نعیم وعذاب میں سے کسی کا سامنا کرنا ہوتا ہے.

جو لوگ منکرین مذہب atheist تھے. انہیں سب سے زیادہ مشکل یہ سمجھنے میں تھی کہ موت کا جو نقشہ اس وقت ہمارے سامنے ہے اس کے بعد پھر سے جی اُٹھنا کیسے ہوگا، قبریں کیسے کھلیں گی اور پھر جی اُٹھنے کی صورت کیا ہوگی —— وہ جہاں کیسا ہوگا جہاں ہم لوٹیں گے.

اس کا ایک جواب بہت آسان تھا. وہ یہ کہ انسان بدن اور روح دو چیزوں سے مرکب ہے آخرت کا تعلق رُوح سے ہے بدن سے نہیں اور وہ ایک رُوحانی جہاں spiritual world ہے. مرنے پر بدن کی ریزہ کاری اس جہان سے متعلق ہے. رُوح باقی ہے اور آخرت کے سارے معاملات رُوح سے متعلق ہوتے ہیں اور اسی پر دُنیا کے اعمال کی جزا وسزا مرتّب ہوگی قبر میں تم بدن کے مٹی ہونے سے کیوں پریشان ہوئے جارہے ہیں اس کی بے شک فنا ہے رُوح ہرگز فانی نہیں سو آخرت برحق ہے.

قرآن کریم نے یہ آسان اور عام فہم جواب نہیں دیا. اگر آخرت کا معاملہ صرف روح سے ہوگا تو اس سے بہتر جواب کوئی نہ تھا. قرآن کریم نے اس کا دوسرا جواب دیا ہے ——— سوال یہ تھا:۔

قال من یحی العظام وھی رمیم۔ (پ ۲۳ یٰسین آیت ۷۸)

ترجمہ. کہنے لگا کون زندہ کرے گا ان ہڈیوں کو جب یہ کھوکھری ہوگئیں.

جواب میں فرمایا:۔

قل یحییھا الذی انشأھا اول مرۃ وھو بکل خلق علیم۔ (پ ۲۳ یٰسین آیت ۷۹)

ترجمہ۔ آپ کہہ دیں اُن کو وہی زندہ کرے گا جس نے بنایا اُن کو پہلی بار۔ اور وہ سب طرح بنانا جانتا ہے۔

قرآن پاک میں یہ مضمون متعدد مقامات پر پھیلا ہوا ہے یہاں انسانی سوچ حیرت میں گھر جاتی ہے ـــــ کیا ضرورت پڑی تھی کہ انہی مُردہ ابدان کو پھر سے اُٹھایا جائے اور انکے ایک ایک ذرے میں زندگی لائی جائے، کیا یہ بہتر نہ تھا کہ آخرت کے سارے معاملات صرف رُوح سے متعلق رکھے جاتے اور آخرت کے اُلم و نعیم کا مورد یہی انسانی روح ہوتی۔ مگر اللہ رب العزت نے ایسا نہیں کیا۔ اُس نے یہی چاہا کہ جن بدنوں سے انسان نے گناہ کیے ہیں یا مشقتیں اٹھائی ہیں وہی ابدان آخرت میں نعیم و اُلم کی جزا یا سزا پائیں۔ یہ نہیں کہ آخرت کی جزا و سزا صرف رُوح پہ اُترے انسان اپنے دُنیا کے بُرے عملوں کی ایک گونہ سزا پاتا ہے آخرت کے بڑے حساب سے پہلے اُسے قبر میں سوال و جواب کے ایک مرحلے سے گزرنا ہے پھر تا حشر وہ اپنے انجام کو دیکھتا رہے گا۔ یہ درمیانہ جہاں چونکہ عام نظروں سے مخفی ہے اس لیے اُسے سمجھنے میں لوگوں نے بہت سی ٹھوکریں کھائی ہیں۔ یہ ایسی زندگی ہے جس کے بارے میں عقل و نقل کے بڑے بڑے معرکے ہوئے۔ اہل السُّنۃ والجماعۃ اور معتزلہ و کرامیہ کا زیادہ محاذ اسی زندگی کے گرد بنا ہوا ہے۔

یہی اختلاف بڑھتے بڑھتے معتزلہ کو اس مقام پہ لے آیا کہ وہ شہداء کی حیات جسمانی کو بھی لا تشعرون کے تحت تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ ہوئے اور اُسے شعور میں لانے کے لیے وہ ظاہر قرآن سے ٹکرا گئے اور پھر آگے چل کر انبیاء کی حیات برزخی بھی اُن کے لیے ایک معمہ بن گئی۔ اہل السنۃ والجماعۃ ظاہر حدیث کے ساتھ رہے اور جو بات عام سمجھ میں نہ آتی تھی اُسے وہ لا تشعرون کے ٹھنڈے سائے میں آرام سے قبول کرتے گئے۔

جاننا چاہیئے کہ اہل السنت والجماعت سوادِ اعظم کا سلف و خلف سے یہ عقیدہ چلا آرہا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس دُنیا سے انتقال فرمانے کے بعد عالم برزخ میں جو حیات حاصل ہے وہ اُسی جسد اطہر کے ساتھ ہے، جو دُنیا میں آپ کا تھا اور جسے روضۂ مطہرہ میں دفن کیا گیا۔

قبرِ منوّر کی اس حیاتِ جسمانی کا مدار اس دُنیا کے رزقِ مادّی پر نہیں، بلکہ برزخ کے رزقِ رُوحانی پر ہے حضور کی ایسی حیاتِ برزخی کا، جو باعتبارِ تعلق بالبدن حیاتِ جسمانی اور باعتبارِ تعلق بالرزق حیاتِ رُوحانی ہو۔ آج تک سلف و خلف میں سے کسی نے انکار نہیں کیا۔ تاریخ کے مختلف اَدوار میں، جس نے بھی اس مسئلہ خامہ پر فرسائی کی، اُسے اس متوارث نظریے کے تسلیم کئے بغیر چارہ نہ رہا —— احناف و شوافع، موالک و حنابلہ، محدثین و متکلمین اور فقہاء و ائمہ ہدیٰ میں سے کسی ایک نامور شخصیت کا بھی —— باوُجود تلاش و تجسّس کے پتہ نہیں چل سکا، جس کا یہ عقیدہ ہو کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جسدِ اطہر روضۂ منورہ میں محض بے جان اور بے حس و بے شعور پڑا ہے اور رُوحِ مبارک کا اس سے کوئی تعلق نہیں —— من ادعی فعلیہ البیان۔

اس میں تو کچھ خفیف سا اختلاف نظر سے گزرا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مدفون ہونے کے بعد آپ کی روحِ اقدس اعلیٰ علیین سے لاکر پھر آپ کے جسدِ اطہر میں لَوٹا دی گئی تھی۔ یا آپ کی وفاتِ شریفہ کے وقت رُوحِ مبارک قبض ہوکر آپ کے قلبِ منوّر ہی میں ٹھہر گئی تھی، جو بعد دفن پھر سارے جسدِ اطہر میں پھیلا دی گئی، یعنی روضۂ منورہ کی یہ حیاتِ جسمانی رُوح لَوٹانے سے قائم ہوئی، یا رُوح پھیلانے سے اس کا استقرار ہوا —— ہمیں یہاں اس بحث میں جانے کی ضرورت نہیں کہ کیفیت وصولِ حیات کیا تھی۔ امرِ واقع خواہ کوئی ہی صورت ہو، یہ قدر مشترک ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آج اپنے روضۂ شریفہ میں حیاتِ جسمانی سے فائزِ حیات ہیں۔

یہ اختلاف بھی نظر سے گزرا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مدفون ہونے کے بعد آپ کی رُوحِ اقدس نے اعلیٰ علیین، رفیقِ اعلیٰ یا خطیرۂ قدسیہ میں استقرار پکڑا اور وہاں سے اُس نے روضۂ منورہ میں پڑے ہوئے جسدِ اطہر پر اپنی شعاعیں ڈالیں اور اس تاثیر سے پھر آپ کے جسدِ اطہر میں حیات لوٹ آئی، یا امرِ واقع یہ تھا کہ روحِ اقدس اس خطیرۂ قدسیہ یا اعلیٰ علیین سے تعلق قائم کر کے پھر قبر شریف میں رکھے ہوئے جسدِ اطہر میں لَوٹا دی گئی۔ یعنی روضۂ منورہ کی یہ حیاتِ جسمانی رُوحِ مبارک لَوٹانے سے قائم ہوئی، یا تاثیرِ رُوح سے اس کا تقدّم ہوا۔ ہمیں اس وقت اس بحث میں جانے کی

ضرورت نہیں کہ اس وصولِ حیات کی کیفیت کیا تھی۔ صورتِ واقعہ خواہ کچھ ہو، یہ حقیقت ہر صورت میں قدرِ مشترک ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے روضۂ شریفہ میں حیاتِ جسمانی سے تشریف فرما ہیں اور وہ جسدِ اطہر وہی ہے جو اس دُنیا میں تھا اور وہ آج بھی اسی طرح تر و تازہ ہے جیسا کہ قبرِ مبارک میں رکھا گیا تھا۔

اگر اختلاف کی حدود یہی رہتیں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روضۂ شریفہ کی حیات ——— کا تقوّم جسدِ اطہر میں روحِ مبارک دوبارہ لوٹانے سے ہوا یا روحِ مبارک پھیلانے سے ——— آپ کی یہ حیاتِ جسمانی دُخولِ رُوح سے قائم ہوئی یا یہ حیات تاثیرِ رُوح سے عمل میں آئی ——— تو اس میں دخل دینے کی ہمیں چنداں ضرورت نہ تھی۔ اس لیے کہ یہ وہ مباحث ہیں، جو خود سوادِ اعظم کے مختلف طبقوں میں پھیلے ہوئے ہیں، نیز جو اختلافاتِ عقائد و احکام پر اثر انداز نہ ہوتے ہوں، اُن پر وقت صَرف کرنا فکر و نظر کی کوئی خاص خدمت نہیں۔ اِن مباحث میں سے خواہ کوئی موقف اختیار کر لیا جائے، اہلِ سنّت کا یہ اجماعی نظریہ ہرگز متاثر نہیں ہوتا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عالمِ برزخ میں جو حیات حاصل ہے وہ اسی دُنیا والے جسدِ اطہر کے ساتھ قائم ہے اور یہ جسمانی حیات ہے اور اُس کا مدار اس دُنیا کے رزقِ مادی پر نہیں، بلکہ عالمِ برزخ کے رزقِ رُوحانی پر ہے۔ دُنیوی حیات کے صرف اِنہی لوازم کو وہاں ثابت مانا جائے گا، جن کے لیے مستقل دلیل شریعتِ طاہرہ میں موجود ہو، اس لیے کہ اِختلافِ دارین متحقق ہو چکا اور اب آپ اس دنیا میں نہیں عالمِ برزخ میں ہیں۔

جہاں ہر صحت مند ذہن اس طریقِ عمل کی شدید مذمت کرے گا کہ فروعی اختلافات اور جُزوی تعبیرات کو فکر و تنقید اور بحث و تحیص کی آماجگاہ بنا لیا جائے، خصوصاً اس دورِ الحاد میں ——— جب کہ خود مذہب سے ہی تنفر بڑھتا چلا جا رہا ہے اور مالی قدروں کا خُمار مذہب کو عہدِ رفتہ کی ایک رسمی یاد سے زیادہ کوئی مقام دینے کے لیے تیار نہیں ——— وہاں اس ضرورت کے تسلیم کرنے سے بھی چارہ نہیں کہ سوادِ اعظم کے اجماعیات کا تحفظ بھی ہر وقت اِمتحان کی پکار اور ہر تردد و الحاد کے سامنے عُلمائے حق کی للکار رہا ہے۔

حیاتُ النبی کا مسئلہ دائرہ اہلِ سُنت میں کوئی اختلافی مسئلہ نہ تھا سب اہلُ السنۃ والجماعۃ حیاتُ النبی کا عقیدہ رکھتے تھے۔ اس حیات کو باعتبار عالم برزخی کہنے والے بھی تھے۔ باعتبار جسد برزخ میں حیاتِ دُنیوی کہنے والے بھی تھے۔ آپ کے عالمِ برزخ میں اپنے آپ کو پُوری طرح زندہ محسوس کرنے کے اعتبار سے اُسے حیاتِ حسی کہنے والے بھی تھے، باعتبار رزق اُسے حیات قائم بالرزق کہنے والے بھی تھے اور اس پہلو سے اُسے حیاتِ رُوحانی کہنے والے بھی تھے۔ تاہم اس پر سب کا اتفاق تھا کہ وہ حیات اس دُنیا والوں سے پردے میں ہے۔ یہاں کی آنکھیں اس حیات کو پا نہیں سکتیں، اُس جہان میں روح کے اثرات غالب ہیں۔ سو اسے کسی نے رُوحانی بھی کہہ دیا لیکن یہ حقیقت ہے کہ یہ سب ایک ہی حقیقت کی مختلف تعبیرات ہیں۔ حیاتُ النبی کا سب میں اقرار ہے اور معنًی یہ سب عنوان متقارب ہیں۔

اگر اختلاف انہی عنوانوں میں رہتا اور ہر حلقہ اپنے اپنے عنوان میں بہتری بتلاتا تو ظاہر ہے بات زیادہ نہ بڑھتی۔ مگر افسوس کہ تحقیقِ مسئلہ کی بجائے تشغیبِ عوام سے کام لیا گیا جس سے دو فریق بن گئے اور عنوان فریقین کے جُدا جُدا ہو گئے، یہ اہل علم کا انداز نہیں۔ پھر کیا ہوا ——— شرافت سر پیٹ کر رہ گئی۔

اس پر تقریریں ہونے لگیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس عالم میں زندہ نہیں ہیں ورنہ صحابہؓ آپ کو دفن نہ کرتے اور آپ کے خلیفہ کا انتخاب عمل میں نہ آتا۔

ذرا سوچیں اپنے حلقے میں کوئی اس کا قائل تھا کہ آپ اس دُنیا میں زندہ ہیں؟ — دُنیوی جسد کی زندگی میں کیا عالمِ برزخ کی صراحت نہ تھی؟ اگر بات یہی ہے تو آپ ہی بتائیں کہ تقریروں کا یہ عنوان بات کو گھٹانے کے لیے تھا یا بات کو بڑھانے کے لیے۔ تشغیبِ عوام اسی کو کہتے ہیں۔

جب فریقین کا محکوم علیہ ہی جُدا جُدا ہے تو اختلاف کس بات میں رہا اور جب اختلاف ہی سامنے نہ آئے تو اتحاد کس میں ہو اور کون کرائے۔ ان حالات میں قوم کو اختلاف کا نہیں انتشار کا سامنا کرنا پڑا اور اب تک انتشار ہی انتشار ہے اختلاف سامنے نہیں کہ اسے سلجھایا جا سکے۔

وقت کا موضوع حیات ہے ممات نہیں

حیات کی آپ جو بھی تشریح کریں اس میں اختلاف زیادہ نہیں بڑھے گا لیکن ممات کو اس وقت کا موضوع نہ بنائیں۔ قاضی شمس الدین صاحب آف گوجرانوالہ اپنے عقیدے کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔
یہ بعد الوفات حیاۃ النبی کا کھلا اقرار ہے۔ فجزاہ اللہ احسن الجزاء۔

بل احیاء ولکن لا تشعرون سے بطور دلالۃ النص سمجھ میں آتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام جن کا درجہ شہداء سے بھی بہت بڑا ہے وہ بعد الوفات زندہ ہیں[1]

عزیزان من حیات الانبیاء میں نزاع نہیں وہ تو بالاتفاق ثابت ہے[2]

اس میں وفات کو پرانی بات اور حیات کو حال کی بات کہا گیا ہے۔ جس سے صاف سمجھ میں آتا ہے کہ اس وقت کا موضوع حیات ہے ممات نہیں۔ وفات النبی آج سے چودہ سو سال پہلے کا واقعہ ہے۔ اس میں سیدنا حضرت عمرؓ اور دوسروں میں اختلاف ہوا تو وہ وہیں ختم ہو گیا ـــــ سو ممات النبی کا اختلاف محض ایک پرانا واقعہ ہے۔ آج کا موضوع حیاتُ النبی ہے ممات النبی نہیں برزخ میں حیات کی تشریحیں جس طرح بھی سلف میں ہوئیں، انہیں اپنے اپنے حلقوں میں بیان کرو لیکن خدارا ممات النبی کو موضوع نہ بناؤ۔ یہ ایک پرانا واقعہ ہے، اِس وقت آپ کے میت ہونے کا کوئی قائل نہیں ہے۔ قاضی شمس الدین صاحب اپنے دوستوں کو بار بار سمجھاتے ہیں کہ تم نے مماتُ النبی کو موضوع بنا کر خواہ مخواہ اپنے آپ کو مماتی بنالیا ہے۔ اس وقت ہم بھی حیات کے قائل ہیں، میں لکھ کر دے چکا ہوں کہ انبیاء بعد الوفات زندہ ہیں۔

اگر یہ لوگ محترم قاضی شمس الدین صاحب کی بات مان لیں اور مماتُ النبی کو موضوع نہ بنائیں تو آج بھی اختلاف کم ہو سکتا ہے۔ جو بات آج سے چودہ سو سال پہلے واقع ہوئی اور اُس کا ہم انکار نہیں کرتے، اُسے تقریروں کا موضوع بنانا اور اس وقت اللہ تعالیٰ نے شہداء اور انبیاء کو

---

[1] مسالک العلماء ص۲۹ [2] مسالک العلماء ص۵۶

جس حیات بعد الوفات سے نواز رکھا ہے اُسے عنوان عقیدہ نہ بنانا کیا یہ اختلاف کو کم کرنے کی طرف قدم ہے یا محض ایک انتشار بڑھانے کی کارروائی ہے۔

آج اگر ایک مقرر انّکَ میّت و انّھم میّتون سے تقریر شروع کرتا ہے اور کہتا ہے کہ حضورؐ اس وقت میّت ہیں زندہ نہیں تو کیا وہ قاضی شمس الدین کے عقیدہ حضورؐ کے بعد الوفات زندہ ہونے کی کھُلی تردید نہیں کر رہا، کوئی شخص ان انتشار پسندوں سے پُوچھے یہ واقعہ وفات جسے تُم بیان کر رہے ہو کب کا ہے؟ تو وہ بھی یہ کہنے پر مجبور ہوں گے کہ آج سے چودہ سو سال پہلے کا —— پھر پُوچھیں اس تاریخی حقیقت کا اب کوئی منکر ہے، وہ بھی کہیں گے نہیں —— پھر پُوچھیں آج شہداء کرام اور انبیاء عظام اگلے جہان میں زندہ ہیں یا اموات؟ —— تو یہ کبھی دیانت سے اس کا جواب نہ دیں گے۔ یہ وہ بواعث ہیں جن سے انتشار بڑھ رہا ہے۔

سو یہ صحیح ہے کہ یہ اختلاف اپنی ابتدائی سطح میں کوئی بُنیادی اختلاف نہ تھا، لیکن اختلاف کرنے والے اگر اسے اس سطح پر لے آئے ہیں کہ آج بھی تمام شہداء اور انبیاء کو اموات کہا جائے کہ وہ بعد الوفات زندہ نہیں اور وہی اجساد زندہ نہیں جن پر موت وارد ہوئی یا وہ قتل ہوئے۔ تو کیا یہ قرآن سے کھُلا تصادم نہیں۔ سو اہل سنّت کے اجماعی عقیدہ کے پیشِ نظر یہ ایسی بات نہیں کہ اس کی تردید میں احادیث شریفہ کے مدلولاتِ صریحہ میں تاویلاتِ رکیکہ، تضعیفِ روایات میں ائمۂ فن کی تجہیل، قواعدِ محدّثین سے استہزاء، شارحین حدیث و فقہاء اور سَلف صالحین سے اعتماد اُٹھنے کے صدمے کو آسانی سے برداشت کر لیا جائے۔ یا اعتماد اُٹھانے کی نہایت خطرناک مہم کو، محض اس لیے کہ ابتدائی سطح امورِ مہمّہ میں سے نہیں یا یہ مسائل روزمرہ کی زندگی سے متعلق نہیں —— یُونہی چلنے دیا جائے۔

حیاتُ النبیؐ کے ضمن میں جب "اعتماد علی السلف" کا اصُولی مسئلہ پامال ہونے لگا، تو اس تخمِ حنظل کے برگ و بار بہت دُور دُور تک پھیلتے نظر آئے۔ راہ گم کردہ قافلہ ہر مقام پر نیا موقف اور ہر طبقے کے سامنے نیا عنوان اختیار کرتا رہا اور یہی اہلِ باطل کا کھُلا نشان ہے کہ کسی بات پر جمتے نہیں۔

روضۂ منورہ کی حیاتِ جسدی کا انکار اور اُس سے متعلقہ مفاسد

جو لوگ یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جسدِ اطہر روضۂ منورہ میں محض بے حس و شعور پڑا ہے اور فقط جمادی حیثیت میں ہے ، رُوحِ اقدس کا اس سے کوئی تعلق نہیں، اُن کا یہ خیال دراصل اس نظریے کا نتیجہ ہے کہ وفات کے بعد ثواب و عقاب کا سارا معاملہ صرف رُوح سے ہوتا ہے ، بدن یا اجزائے بدن کو اس سے کوئی علاقہ نہیں۔

یہ نظریہ اہلِ سنت کے اس اعتقادی پہلو سے قطعی طور پر متصادم ہے کہ ثواب و عقاب کا معاملہ صرف رُوح ہی سے نہیں ، بلکہ قبر میں پڑا ہوا بدن یا اجزائے بدن بھی لذت و اَلم کا اِدراک کرتے ہیں۔ بنی آدم کی اَرواح ، وفات کے بعد خواہ وہ علیین اور سجین ہی میں استقرار پذیر کیوں نہ ہوں ، اُن کا تعلق اجسادِ مدفونہ سے ضرور قائم کیا جاتا ہے اور قبر میں لذّت و اَلم کا ادراک ضرور ہوتا ہے۔

اس دُنیا سے عالمِ برزخ میں انتقال کرنے کے بعد رُوح و بدن میں کلی مفارقت رہتی ہے ؟ یا رُوح و بدن میں کوئی ایسا علاقہ پھر قائم ہو جاتا ہے کہ ہر فوت ہونے والا اپنے اپنے اعمال اور اپنے اپنے مقام کے مطابق اپنے جسد میں اَلم یا لذت کا اِدراک کر سکے ؟

اوّل الذکر نظریہ معتزلہ و روافض کا ہے وہ عذابِ قبر کے قائل نہیں۔ اُن کے نزدیک جسدِ مدفون محض جمادی حیثیت رکھتا ہے۔ ثانی الذکر نظریہ اہلِ حق اہلُ السنۃ والجماعۃ کا ہے۔ فرقہ کرامیہ اور صالحیہ اس کے قائل ہیں کہ اجساد مدفونہ ہیں تو محض جمادی حیثیت میں ، لیکن عذابِ قبر پھر بھی حق ہے۔ یہ تیسرا موقف ایک وہم اور سفسطہ[1] ہے ، جس کی کوئی حقیقت نہیں۔ حق وہی ہے جو اہلِ سنّت کا نظریہ ہے اور قرآن و سنّت کے چشمے اسی عقیدے کی آبیاری کرتے ہیں۔

واعلموا ان اهل الحق اتفقوا على ان الله يخلق فى الميّت نوع حيٰوة فى

---

[1] وجوز بعضهم تعذيب غير الحى ولا شك انه سفسطة (خيالى ص١١) لان الجماد لا حس له فكيف يتصور تعذيبه (حاشیہ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی).

القبر قدر ما یتالم و یتلذذ۔ (شرح فقہ اکبر ص۱۲۱)

ترجمہ۔ جان لیجئے، سب اہل حق اس نظریے پر متفق ہیں کہ اللہ تعالیٰ میت میں ایک ایسی قسم کی حیات ضرور پیدا فرما دیتے ہیں کہ وہ لذت و الم کا ادراک کرتی رہے

ایقبی علی الخیالی میں ہے:۔

ان المذاهب فی هذا المقام ثلثة الاول المیت حیّ فی قبره فیعذب و هذا مذهب اهل السنة والحق والثانی انه جماد لا یعذب ولا یدرك العذاب و هذا مذهب جمهور المعتزله والروافض والثالث انه جماد یعذب۔[1]

ترجمہ۔ اس مقام پر تین مذاہب ہیں۔ ۱۔ میت اپنی قبر میں پھر زندہ ہوتی ہے پس عذابِ قبر برحق ہے، یہ مذہب اہل سنت کا ہے جو اہل حق ہیں۔ ۲۔ میت قبر میں جمادِ محض ہے، پس عذابِ قبر کوئی نہیں، یہ مذہب جمہور معتزلہ اور روافض کا ہے۔ ۳۔ میت قبر میں ہے تو جمادِ محض، لیکن عذابِ قبر پھر بھی ہوتا ہے (یہ مذہب کرامیہ کا ہے)۔[2]

اِن تصریحات کی روشنی میں اہل السنۃ کا عقیدہ ہے کہ جب ہر جسدِ مدفون کو اپنے اپنے مقام کے مطابق کسی نہ کسی طرح کی حیاتِ جسدی حاصل ہوتی ہے، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے روضۂ مطہرہ میں بہت قوی قسم کی اور نہایت ارفع و اعلیٰ حیاتِ جسمانی کیوں حاصل نہیں۔ انبیائے کرام کے اجسادِ دُنیوی کا تحفظ بھی اسی لیے ہے کہ ان پر نہایت قوی قسم کی حیاتِ جسمانی مرتب ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام جس طرح انتہائی طور پر اعلیٰ ہے، اُسی طرح روضۂ اطہر میں آپ کی حیات بھی اپنی رفعت و شان میں نقطۂ انتہا پر ہے۔ روحِ اقدس کا جسدِ اطہر کے ساتھ ایسا قوی تعلق ہے کہ آپ تلذذاً نمازیں بھی پڑھتے ہیں اور روضۂ منورہ پر عرض کئے گئے صلوٰۃ و سلام کو بھی سُنتے ہیں۔

---

[1] وکذلك المختار فی الفتاوی النذیریہ جلد ۱ ص۴۳۳ [2] ایقبی علی الخیالی ص۱۱۸

جسدِ اطہر اور روحِ انور میں کُلّی مفارقت کا عقیدہ رکھنے والوں کو یہ سوچنا چاہیئے کہ جب ہر میت کو، خواہ اس کا جسم محفوظ ہو، خواہ ریزہ ریزہ ہو چکا ہو، ایک جا ہو یا اُس کے اجزائے بدن منتشر ہو چکے ہوں، روح کے ساتھ کسی نہ کسی طرح کا تعلق ضرور حاصل ہوتا ہے اور جسدِ مدفون یا اجزائے جسد اپنے اپنے مقامات کے مطابق لذت و اَلم کا ادراک ضرور کرتے ہیں. تو وہ ذواتِ قدسیہ جن کے اجسادِ مقدسہ کا تحفظ خود پروردگار فرما چکا ہو، اُن میں ان کے مقامات کے مطابق ارواحِ مطہرہ کی تاثیرات کیوں نہ ہوں گی. انبیاء اس اصلِ کُلّی سے مستثنیٰ کیوں ہوں؟ آخر وہ کون سی دلیل ہے جس کی بناء پر انبیائے کرام کو اس اصلِ کُلّی سے نکال کر یہ عقیدہ قائم کیا جا رہا ہے کہ اُن کے اجسادِ مدفونہ صرف اکراماً محفوظ ہیں؟ ارواحِ مطہرہ سے انہیں کُلّی مفارقت ہے۔

اگر کہا جائے کہ ہم اس اصلِ کُلّی ہی کے قائل نہیں کہ وفات کے بعد روح کا بدن یا اجزائے بدن کے ساتھ کسی نہ کسی درجے کا تعلق ضرور قائم رہتا ہے تو پھر یہ مسئلہ اور کھُل کر سامنے آجائے گا، کہ یہ مذہب اہلِ سنّت کا ہے یا معتزلہ و روافض کا. اور عذابِ قبر کے متعلق واضح صورت اختیار کرنی ہوگی کہ اس کا اقرار ہے یا انکار. اس کے بعد صورتِ مسئلہ اس قابل ہوگی کہ اِس پر دلائل پیش کیئے جا سکیں۔

خلاصۃُ المرام ایں کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جسدِ اطہر کو روضۂ منورہ میں محض بے حِس و بے شعور اور جمادِ مطلق تسلیم کیا جائے. تو یا تو اُس پر اِس اصلِ کلی کے درجے کی قوی دلیل قائم کرنا ہو گی کہ انبیاء اس سے مستثنیٰ ہیں اور مستقل دلیل پیش کرنا ہوگی کہ انبیائے کرام اپنے اپنے روضات میں محض بے جان پڑے ہیں ـــــ یا معتزلہ کے اس اصول کو تسلیم کر لیا جائے گا کہ وفات کے بعد روح و بدن میں کوئی تعلق نہیں ہوتا، کُلّی مفارقت رہتی ہے اور ظاہر ہے کہ قرآن و حدیث کے پیشِ نظر یہ اہلِ حق کا نظریہ نہیں۔

عقائدِ اہلِ سنّت کی سب کتابوں میں عذابِ قبر کے برحق ہونے کی تصریح ہے اور اس عقیدے کو ضروریاتِ اہلِ سنّت میں شمار کیا گیا ہے. جو اس کا قائل نہیں وہ معتزلہ و روافض کے موافق اور

اہل سنّت کا مخالف ہے اور اگر بتادیل قائل ہے تو فرقہ کرامیہ میں سے ہونے میں تو شبہ ہی نہیں۔

روضہ منورہ کی حیاتِ جسدی کے انکار کا دوسرا نتیجہ

ہم ہر نماز میں التحیات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اقرار کرتے ہیں:

اشہد ان محمداً عبدہٗ و رسولہ۔

ترجمہ: میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔

عبد کسے کہتے ہیں، روح اور بدن کے مجموعہ کو ــــ سبحٰن الذی اسریٰ بعبدہ میں اللہ تعالیٰ نے سیرِ معراج کسے کرائی؟ عبدہ کو ــــ اسریٰ کا سفر کس نے کیا؟ روح اور بدن کے مجموعے نے ــــ علماء اب تک لفظ عبد سے حضورؐ کے معراج جسمانی پر استدلال کرتے آئے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ حضورؐ اس وقت اللہ کے بندے اور رسُول ہیں یا نہیں؟ ــــ صرف روح کو عبد کہیں تو حقیقت نہ ہوگی، صرف روح کو رسول کہیں تو یہ بھی حقیقت نہیں، ایک مجازی تعبیر ہے اگر روح و بدن سے زندہ ہیں تو بے شک عبدہٗ و رسولہٗ ہیں۔ حضورؐ کی حیات اپنے حق میں حسی ہے اور وہ عالم برزخ میں یہی محسوس کرتے ہیں کہ آپؐ روح و بدن کے ساتھ زندہ ہیں، نمازیں بھی پڑھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے عالم برزخ کی وسعتیں آپ کے لیے پھیلا رکھی ہیں اور حیات اُسی بدن اطہر میں ہے، جو دُنیا میں تھا اور اب وہ بدن روضۂ مبارکہ میں ہے۔ ہاں ہم اس کی نقل و حرکت عالم برزخ میں جاری ہے گو وہ ہمیں یہاں دکھائی نہ دے، اس دُنیا والوں سے وہ حیات پردے میں ہو، لیکن آپ کے لیے وہ حقیقی حسی ہو، جسمانی ہو تو نہ آپ کا بندہ ہونا ایک مجاز ہوگا نہ رسُول ہونا۔ آپ اب بھی عبدہٗ و رسولہ کا مصداق ہیں۔

اور اگر ہم کہیں کہ اس وقت آپ کی روح مُبارک بدن سے کلی طور پر جُدا ہے یا کسی مثالی جسد میں جلوہ پیرا ہے تو آپ کا خُدا کا بندہ ہونا اور رسُول ہونا حقیقت نہ رہے گا، دونوں تعبیریں مجازی ہوں گی، حقیقت میں آپ نہ بندے رہے نہ رسُول ــــ رسُول حقیقی ہونا تو تبھی ہے کہ آپ کے

کچھ اعمالِ رسالت ابھی باقی ہوں (مثلاً امت کے حق میں استغفار) اور امت کی آپ کے پاس حاضری بھی ہوتی رہے گو درمیان میں برزخ کا پردہ ہو، گر سلام امت آپ پر ضرور پیش ہوتا رہے۔

کرامیہ کا عقیدہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی وفات کے بعد صرف حکمی طور پر نبی اور رسُول ہیں آپ حقیقت میں اس وقت رسول نہیں رہے۔ آپ کا روح و بدن علیحدہ علیحدہ ہے کسی کو کسی سے علاقہ نہیں۔ اس عقیدے کے لیے ضروری تھا کہ وہ روضۂ اطہر میں دفن جسدِ اطہر کو بے جان کہیں۔ اس فاسد عقیدے کو پھیلانے کے لیے انہوں نے روضۂ منورہ کی حیاتِ جسمانی کو تختۂ مشق بنایا، اور احادیث کی یکسر تکذیب کر دی۔

کرامیہ کی بنائے استدلال

نبوت کے لیے شعور لازم ہے علم و احساس کے بغیر اس کا تقوم نہیں۔ نبی سے نیند کی حالت میں بھی اس کی نفی نہیں ہوتی۔ اُسے علم ہوتا ہے کہ اس کا وضو باقی ہے یا نہیں، اسے کبھی احتلام نہیں ہوتا۔ جب نبی سے اس شعور کا انتفا ہوگا نبوت منتفی ہو جائے گی۔ اب اسے رسُول کہنا ایک مجازی تعبیر ہوگی۔ کرامیہ کہتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم وفات پانے کے بعد پردۂ قبر میں گئے تو وہاں جسدِ اطہر جمادِ محض ہے، صرف اکراماً محفوظ ہے روح کا اس بدن سے کوئی تعلق نہیں۔

حافظ ابن حزم (۴۵۷ھ) جو عامہ اموات کے باب میں صرف رُوح کے عذاب کا قائل ہے انبیاء کے جسدِ اطہر کو وہ بھی جمادِ محض نہیں مانتا۔ ایسا کہنے کو وہ ایک خبیث عقیدہ کہتا ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ آپ کی روحِ مقدسہ کو بدنِ اطہر سے کلیۃً جُدا کرنے سے آپ کا اس وقت رسُول ہونا خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ ابن حزمؒ لکھتا ہے سرخی ملاحظہ ہو:-

الرد علی من زعم ان الانبیاء علیھم السلام لیسوا انبیاء الیوم ولا الرسل الیوم رسلاً

حدثت فرقۃ مبتدعۃ تزعم ان محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب صلی اللہ علیہ وسلم لیس ھو الاٰن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولکنہ کان رسول اللہ وسلم وھذا قول ذھب الیہ الاشعریۃ

واخبرنی سلیمان بن خلف الباجی و هو من متقدمیهم الیوم ان محمد بن حسن بن فورک الاصبهانی علی هذه المسئلة قتله بالسم محمود بن سبکتگین صاحب ما دون وراء النهر من خراسان ؒ وهذه مقالة خبیثة مخالفة لله تعالٰی ولرسوله صلی الله علیه وسلم ولما اجمع علیه جمیع اهل الاسلام منذ کان الاسلام الی یوم القیمة ... فروح النبی عندهم قد فنیت وبطلت ولا روح له الاٰن عند الله تعالٰی واما جسده ففی قبره موات فبطلت نبوته بذٰلک و رسالته قال ابو محمد ونعوذ بالله من هٰذا القول فانه کفر صراح لا تردد فیه۔[1]

ترجمہ۔ کیا انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام آج انبیاء و رسل نہیں رہے۔ ایک نیا فرقہ پیدا ہوا ہے جو یہ دعوے کرتا ہے کہ رسالت مآب علیہ الصلوٰۃ والسلام اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہیں رہے وہ رسول اللہ تھے اور مجھے سلمان بن خلف الباجی نے جو ان لوگوں کے متقدمین میں سے ہے خبر دی کہ محمد بن حسن بن فورک کا یہی عقیدہ تھا جس کو محمود بن سبکتگین نے زہر دے کر قتل کیا تھا۔ اس فرقہ کا یہ خبیث عقیدہ اس کے اس فاسد نظریہ پر مبنی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جسدِ مبارک روضۂ اطہر میں مُردہ ہے لہٰذا اس وجہ سے آپ کی نبوّت و رسالت جاتی رہی۔

روضۂ منورہ میں حیاتِ جسدی کی نفی اسے لازم ہے کہ اب آپ نبی نہیں رہے۔ اب آپ کی نبوت اس عالم میں صرف اب حکمی طور پر باقی ہے۔ بدن صرف اکرامًا محفوظ ہے اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اسے مٹی نہ کھائے ہم پوچھ سکتے ہیں کہ اگر وہ زندہ نہیں تو اس میں نرمی خوشبو اور پہلے دن کی سی تازگی کہاں سے آرہی ہے۔ اگر یہ روح کے تعلق سے نہیں تو اس کی اور کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ روح کے تعلق کا یہ خفیف سا اظہار ہے ورنہ باقی سارے مراحل برزخ کے پردے میں ہیں۔ ہدایہ میں ہے کہ آپ کا بدن مبارک آج بھی اسی حالت میں ہے جیسے کہ یہ پہلے دن قبر مبارک میں رکھا گیا تھا۔[2]

---

[1] کتاب الفصل فی الملل والنحل جلد ۴ ص ۸۸ [2] ہدایہ جلد ۱ ص ۱۶ باب الجنائز

قاضی شمس الدین صاحب بھی ہدایہ کی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں :-

آپ اپنی قبر میں آج بھی ایسے ہیں جیسے پہلے دن رکھے گئے تھے اور پہلے دن جب رکھے گئے تھے تو کیا کیفیت تھی۔ روح مبارک جب کلام آخری اللھم الرفیق الاعلیٰ رفیقِ اعلیٰ میں پہنچ چکی تھی اور جسم مبارک صحیح وسالم گلاب کے پھول کی طرح تر و تازہ تھا، آج بھی یہی کیفیت ہے اور قیامت تک یہی رہے گی۔[1]

یہاں جب کوئی انسان فوت ہوتا ہے تو اُس کا بدن فوراً نہیں اکڑ جاتا، کچھ عرصے تک نرم رہتا ہے پھر سخت ہونا شروع ہو جاتا ہے ـــــ یہ کیوں؟ یہ اس لیے کہ روح کے اثرات اس کے نکلنے کے باوجود کچھ عرصہ تک باقی رہتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو بدن مبارک تا دفن تر و تازہ رہا، معلوم ہوا رُوح نے اپنے اثرات سَلب نہیں کیے اور قبر مبارک میں یہ اثرات اب تک اسی طرح ہیں۔ سو ہم کیسے مان لیں کہ یہ موت عام اموات کی طرح ایک موت تھی۔ یہ تو ایک پردے میں جانا تھا اور آپ چلے گئے، روح کے برزخ میں جانے کے بعد اگر اس کا تعلق پھر بدن سے قائم ہو جائے، بدن کی پہلی دُنیوی نرمی ابھی باقی ہو کہ روح برزخ میں پھر اس بدن پر پرتو ڈال دے تو اس کا اثر ظاہر میں یہی ہو گا اور ہے کہ بدن آج بھی اسی طرح تر و تازہ ہے جیسا کہ پہلے دن تھا۔

اگر کوئی شخص کسی درجے میں بھی اس جسدِ اطہر کے فائز الحیات ہونے کا اقرار کر لے، رُوحِ مبارک کو اعلیٰ علیین میں مانے یا رفیقِ اعلیٰ میں، لیکن اس کے اتصال سے آپ کی حیاتِ جسمانی کا قائل ہو تو وہ کرامیہ کے عقیدے سے نکل جاتا ہے۔ وہ کہہ سکتا ہے کہ میں حضورؐ کو حقیقی رسُول مانتا ہوں۔

قاضی شمس الدین لکھتے ہیں :-

اسلام میں انبیاء علیہم السلام کے متعلق یہ عقیدہ رکھنا واجب ہے کہ وہ (اس) زندگی میں بھی نبی حقیقی ہیں اور بعد الوفات (زندگی میں) بھی نبی حقیقی ہیں اَبدالآباد کے لیے اور

---

[1] مسالک العلماء صد ۶۸

اُن پر کوئی ایک لحہ بھی ایسا نہیں آتا کہ وہ اس میں نبی حقیقی نہ ہوں بلکہ حکمی یا مجازی ہوں[1]
کرامیہ نے جب جسدِ اطہر کو جمادِ محض کہا، بدن کو صرف محفوظ کہا نرم و نازک نہ مانا تو انہوں نے برملا
کہا کہ حضورؐ اب حقیقی رسُول نہیں رہے۔ امام ابو حنیفہؒ (۱۵۰ھ) نے ڈٹ کر کہا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
اب بھی حقیقۃً رسُول ہیں۔

اہلِ سُنّت کا عقیدہ

علم کلام کے مشہور امام علامہ حسن بن عبدالحسن المشہور بابی عذبہ فرماتے ہیں:۔
قال ابوحنیفۃؒ انہ رسول الاٰن حقیقۃ وقالت الکرامیۃ لا۔[2]
ترجمہ۔ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم اب بھی حقیقی طور پر رسُول ہیں اور فرقہ کرامیہ
والے کہتے ہیں کہ آپ کا رسُول ہونا اب حقیقی معنوں میں نہیں ہے۔
جب آپؐ روح و بدن میں تقسیم ہو کر رہ گئے تو بتایئے رسول کہاں رہے۔ یہ کرامیہ کی بناء
استدلال تھی۔ اہلِ حق نے اس غلط فکر کو بالکل قبول نہ کیا۔ امام ابوالحسن الاشعری (۳۲۴ھ) نے معتزلہ
اور کرامیہ کے سارے استدلال کو توڑ کر رکھ دیا —— ہماری عقائد کی کتابوں میں اسے اس
طرح بیان کیا گیا ہے:۔

هو صلی اللہ علیہ وسلم بعد موتہ باق علیٰ رسالتہ ونبوتہ حقیقۃ کما
یبقیٰ وصف الایمان للمؤمن بعد موتہ وذٰلک الوصف باق بالروح و
الجسد معًا لان الجسد لا تاکلہ الارض۔ . . . . انہ صلی اللہ علیہ و
سلم حی فی قبرہ رسولًا الی الابد حقیقۃ لا مجازًا۔[3]

ترجمہ۔ حضور اکرم اپنی وفاتِ شریفہ کے بعد اب بھی اپنی رسالت اور نبوت پر حقیقی طور
پر قائم ہیں جیسا کہ مومن اپنی وفات کے بعد بھی صفتِ ایمان سے متصف رہتا ہے

---

[1] مسالک العلماء صفحہ ۱ [2] صفحہ ۱۳ طبع حیدر آباد [3] الروضۃ البہیۃ فیما بین الاشاعرۃ والماتریدیہ صفحہ ۱۵

اور حضورؐ کا اپنی رسالت پر حقیقی اعتبار سے قائم رہنا رُوحِ اطہر اور جسدِ انور کے مجموعہ کے ساتھ ہے ...... آپ صلی اللہ علیہ وسلم اب بھی اپنی قبر شریف میں زندہ ہیں اور ہمیشہ تک کے لیے رسُول ہیں حقیقی معنی کے لحاظ سے نہ کہ محض حکمی طور پر.

کرامیہ نے وفاتَ النبی پر انتفائے نبوت کی بنا رکھنے کے لیے روضۂ منورہ کی حیاتِ جسمانی کو تختۂ مشق بنایا اور صریح طور پر عقیدۂ حیاتُ النبی کا انکار کر دیا اور نہ صرف خُود ہی یہ اعتقاد باطل بنایا بلکہ انتفائے نبوّت کے اس عقیدۂ باطلہ کو امامِ اہلِ سُنّت امام ابوالحسن (۳۲۴ ھ) کی طرف بھی منسوب کر دیا جیسا کہ کتاب الفصل سے ظاہر ہے.

امام ابوالحسن الاشعری کی زندگی تک کرامیہ کی یہ بات کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اب حقیقی رسُول نہیں رہے نہ آپ کی عبدیت باقی ہے، روح و بدن میں منقسم ہیں کہیں نہ جم سکی. اُن کے ساتھ امام ابوالمنصور الماتریدی (۳۳۳ ھ) عقائد اہلِ سنت کے گرد حفاظت کا پہرہ دیا. محدثین کی طرف سے امام طحاویؒ (۳۲۱ ھ) اہلسنت عقائد کی سرحد پر آکھڑے ہوئے تھے اور انہوں نے عقیدہ طحاویہ لکھ کر اہلِ حق کی طرف سے پُورا تحفظ کر لیا تھا.

چوتھی صدی ہجری کے آخر میں کرامیہ جو عبداللہ بن کرام کے پیرو تھے اس سلسلے میں کھُلے طور پر آگئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اب نبی اور رسول نہیں رہے. آپ روح اور بدن میں منقسم ہیں. حافظ ابن حزمؒ (۴۵۸ ھ) لکھتے ہیں:

حدث فرقه مبتدعة تزعم ان محمد بن عبد الله ليس هو الآن رسول الله ولكنه كان.[1]

ترجمہ. ایک نیا فرقہ پیدا ہوا ہے جو یہ دعوے کرتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اب رسُول اللہ نہیں رہے.

اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ اسی دور کی پیداوار ہیں. ابن حزمؒ کہتا ہے محمد بن حسن بن فورک ایرانی

---

[1] کتاب الملل والنحل جلد ۲ ص ۸۸

بھی یہی عقیدہ رکھتا تھا اور سلطان محمود(ھ) بن سبکتگین (۴۲۱ھ) نے اُسے الحاد پر موت کی سزا دی تھی۔ پانچویں صدی ہجری کے علماء اس الحاد کے خلاف اُٹھے۔ اس وقت محدثین میں امام احمد بن الحسین البیہقیؒ (۴۵۸ھ) کا چرچا تھا۔ امام ابو القاسم الکریم القشیریؒ (۴۶۵ھ) بھی آپ کے ساتھ تھے۔ ان حضرات نے حیاۃ الانبیاء پر رسالے لکھے اور راہل سنت عقیدے کو بیان کیا۔ علامہ ابن حزم ظاہریؒ (۴۵۷ھ) گو عذاب قبر کے مسئلہ میں اہل السنۃ والجماعۃ کے ساتھ نہ تھے۔ لیکن اس عقیدے کو کہ حضورؐ اپنے روضۂ اطہر میں (معاذ اللہ) مُردہ پڑے ہیں وہ بھی ایک فاسد نظریہ سمجھتے تھے۔ آپ لکھتے ہیں:-

اس فرقہ کا یہ خبیث عقیدہ اس کے اس فاسد نظریہ پر مبنی ہے کہ حضورؐ کا جسدِ مبارک روضۂ اطہر پر مُردہ رکھا ہے۔

کرامیہ اس نظریہ کے حامل تھے کہ اپنے مذہبی خیالات کی ترویج کے لیے جھوٹ بولنا جائز ہے۔ اس راہ سے انہوں نے یہاں تک لکھ دیا کہ امام ابوالحسن الاشعری بھی اسی عقیدے کے تھے۔ یہ اسی طرح ہے جس طرح آج کوئی شخص ان عقائد کو جو علمائے دیوبند کے نہ تھے بلکہ وہ ان سے تحاشی کر چکے تھے ان کے نام لگا کر کہے کہ اکابر علمائے دیوبند کے عقیدے یہی تھے۔

حافظ ابن عساکر الدمشقیؒ (۵۷۱ھ) نے اس فریب کا پردہ چاک کرنے کے لیے ایک مستقل کتاب لکھی جس کا نام "تبیین کذب المفتری فیما نسب الی الامام ابی الحسن الاشعری" ہے۔ اور کرامیہ پر اہل حق کی حجت تمام کردی۔ علامہ ابو القاسم عبدالکریم القشیری نے "شکایۃ اہل السنۃ بما نالہم من اہل المحنۃ" لکھی۔ امام بیہقی نے ایک مستقل رسالہ "حیاۃ الانبیاء" لکھا اور اہلِ حق اس وقت سے لے کر اب تک ان کرامیہ کی پُرزور تردید کرتے آئے ہیں۔

کرامیہ کا مکر و فریب

کرامیہ کا کس قدر فریب ہے کہ اپنے غلط عقائد کی نسبت اکابر اہلِ سُنّت کی طرف کرتے ہیں حیات النبیؐ کا انکار اگر اُن کا اپنا عقیدہ تھا تو صاف طور پر کہتے کہ یہ ہم کرامیہ کا اعتقاد ہے اُسے خواہ

نحواہ اہل سُنّت کا عقیدہ بتلانا علم و دیانت کے قطعاً خلاف ہے۔ حیاتُ النبیؐ کا انکار کرنے والے اس مسلکی التباس کے مُرتکب کیوں ہیں۔ اس لیے کہ اُن کے نزدیک ترویجِ دین کے لیے اور اپنے خیالات پھیلانے کے لیے جھُوٹ بولنا جائز ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ (۸۵۲ھ) لکھتے ہیں:۔

ان بعض الکرامیۃ وبعض المتصوفۃ نقل عنھم اباحۃ الوضع فی الترغیب والترھیب وھو خطاء من فاعلہ نشاء عن جھل۔[۱]

ترجمہ:۔ بے شک بعض کرامیہ[۲] سے اور بعض غلط مدّعیانِ تصوّف سے یہ منقول ہے کہ وہ ترغیب و ترہیب اور وعظ و نصیحت کی خاطر جھُوٹ گھڑنا جائز قرار دیتے ہیں اور یہ بہت بڑی غلطی ہے جس کا منشاء صرف جہالت ہے۔

المراد باعتقاد حل الکذب ھو اعتقاد حلہ لمصلحۃ دینہ وترویج مذھبہ۔[۳]

ترجمہ: جھُوٹ حلال ہونے سے اُن کی مراد یہی ہے کہ اپنے (مزعوم) دین کی خاطر اور اپنے دھڑے کو چلانے کے لیے جھُوٹ بولنا اعتقادی طور پر حلال ہے۔

ان لوگوں کے مکر و فریب کا کیا حال ہوگا جو اسے گناہ کے طور پر نہیں جھُوٹ نیکی سمجھتے ہوئے بولتے ہیں۔ کیا یہ شیعہ کا عقیدۂ تقیہ تو نہیں جو ہمیشہ مختلف اداؤں اور قباؤں میں ادا ہوتا رہا ہے۔

فرقہ کرامیہ کے خصُوصی عقائد

① ——— بنی آدم کی ارواح وفات کے بعد کُلّی مفارقت میں رہتی ہیں۔ اُجساد محض جمادی حیثیت میں ہوتے ہیں۔ عذابِ قبر صرف روح پہ ہے بدن پر نہیں۔

② ——— آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جسدِ اطہر روضۂ اطہر میں بالکل بے جان اور بے حس و بے شعور

---

[۱] شرح نخبۃ الفکر ص۵۸ [۲] ھم فرقۃ من المشبھۃ نسبت الی عبد اللہ بن کرام و یدعون زیادۃ الورع والتقوی والمعرفۃ التامۃ وراجع لہ شرح الشرح لعلی القاری علیہ رحمۃ ربہ الباری۔
[۳] شرح نخبۃ الفکر ص۶۲

ہے اور رُوح مُبارک کا اس سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں۔

③ —— اپنے مسلک کی حمایت میں اور اپنے مذہب کی ترجیح کے لیے غلط بیانی کرنا جائز ہے۔ جھوٹ اس طرح بولو اور اتنا زیادہ بولو کہ یہ سچ نظر آنے لگے

④ —— آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت صرف حکماً باقی ہے۔ آپ خود اب نبی اور رسُول نہیں ہیں۔ (معاذ اللہ)

⑤ —— کلمۂ اسلام کے جزو محمد رسولُ اللہ کا یہ مطلب نہیں کہ آپ اللہ کے رسُول ہیں۔ بلکہ یہ ہے کہ اللہ کے رسول تھے۔

انکارِ حیات کا تاریخی پس منظر

سُلطان طُغرل بیگ سلجُوقی کے عہدِ حکومت میں نیشاپُور کے قریب ایک بہت فتنہ پرداز شخص گزرا ہے، اُس کا نام بکندی تھا۔ وہ لطائف الحیل سے سلجوقی دربار میں منصبِ وزارت پر آگیا تھا اُس کے عقائد اعتزال و رفض کا امتزاج تھے۔

۴۴۵ھ کے قریب اُس نے وفاتُ النبی اور جسدِ جمادی کی تمہید سے انتفائے نبوّت کا عقیدہ اختیار کیا۔ اُس کا اعتقاد تھا کہ حضورؐ کا جسدِ اطہر روضۂ منورہ میں محض بے حس و بے شعور ہے۔ اُس نے اُسے انعزالِ نبوت کے لیے کہ حضورؐ وفاتِ شریفہ کے بعد اب حقیقۃً رسُول نہیں رہے، ایک سیڑھی بنایا۔ اور نہ صرف یہی بلکہ اس نظریے کو امام ابوالحسن اشعریؒ کی طرف بھی منسوب کر دیا۔ اقتدار کے سہارے اُس نے ان خیالات کو بہت دُور تک پہنچانے کی کوشش کی۔

اس کے عقیدہ میں روضۂ منورہ کی حیاتِ جسمانی کا انکار اس لیے بھی تھا کہ اس سے حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کے جوارِ رسول میں ہونے اور روضۂ اطہر میں ہم پہلو سونے کی شانِ امتیاز کمزور ہوتی تھی۔ ممکن ہے اس سے اُس کے رفض کو کچھ تسکین پہنچتی ہو۔

پھر وفات کے بعد روح و بدن کی کُلی مفارقت سے عذابِ قبر کا انکار بہت ہی آسان ہو

جاتا تھا۔ سو اس سے اُس کے اعتزال کو قوت ملتی تھی۔

یہ عقیدہ کہ اب حضورؐ رسول نہیں رہے۔ دراصل جزوِ کلمہ محمد رسول اللہ ہی میں تشکیک کی راہ پیدا کرنا تھا۔ حالانکہ یہ کلمہ بالاجماع صحیح ہے اور اس میں آپ کے لیے صحیح اقرارِ رسالت ہے۔

انکارِ حیاتِ قبریہ اور انعزالِ نبوتِ حقیقیہ کے دونوں باطل عقیدے دوش بدوش چلنے لگے کتاب وسنت کی بہت سی تصریحات بنائے فاسد علی الفاسد کی لپیٹ میں نذرِ تاویلات ہوتی رہیں اور اہلِ حق بھی اپنی طرف سے اس کے ابطال کی طرف پورے متوجہ رہے۔ اکابر اہلِ سنت نے ان نظریات پر نکیر کی اور امامِ اہلِ سنت امام ابوالحسن اشعریؒ پر جو افتراآت باندھے گئے تھے کہ ان کے عقائد بھی یہی تھے۔ ان تمام الزامات کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں۔

اس وقت امام حدیث احمد بن الحسین البیہقیؒ (متوفی ۴۵۸ھ) زندہ تھے۔ آپ نے اور امام ابوالقاسم عبدالکریم القشیریؒ نے نہایت قوت اور ثابت قدمی سے کرامیہ کا مقابلہ کیا۔ یہ سارے مفاسد جس بنیاد پر قائم کیے جا رہے تھے، وہ یہی تھی کہ حضورؐ اب اپنی قبر میں محض بے جان ہیں معاذاللہ ان بزرگوں نے یہ جڑ ہی اکھاڑ کر رکھ دی اور بتایا کہ حقیقتِ حال اور قرآن وسنت کا استدلال کیا ہے۔ امام بیہقیؒ نے رسالہ «حیاۃ الانبیاء» لکھا، اور علامہ قشیریؒ نے شکایۃ اہل السنۃ بما نالھم من المحنۃ» میں ان افتراآت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔

ان واقعات کی تفصیل کے لیے حافظ ابن عساکرؒ کی کتاب «تبیین کذب المفتری» اور طبقات الشافعیہ، زیرِ ترجمہ امام ابوالحسن الاشعریؒ ملاحظہ کیجئے۔ علامہ تقی الدین سبکی لکھتے ہیں:۔

فان قیل فمن این وقعت ھذہ المسئلۃ ان لم یکن لھا اصل قیل ان بعض الکرامیۃ ملأ اللہ تعالیٰ قبرہ نارا وظن ان اللہ قد فعل الزم بعض اصحابنا ......الخ[1]

ترجمہ۔ اگر کہا جائے کہ جب اس مسئلے کی کوئی اصل نہیں، تو پھر یہ کہاں سے آگیا،

---

[1] طبقات الشافعیہ جلد ۲ صہ ۲۸۲

توجواب میں کہا جائے گا کہ بعض کرامیہ نے اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو آگ سے بھرے۔
اور میرا گمان یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بھر دیا ہوگا، سب سے پہلے یہ مسئلہ گھڑا تھا۔
امام حدیثؒ کے اس جلال اور ناراضگی کو دیکھئے اور اس پر غور کیجئے۔ اس کے برعکس اپنا عقیدہ
آپ ان الفاظ میں لکھتے ہیں:۔

لان عندنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حی یحس ویعلم وتعرض
علیہ اعمال الامۃ ویبلغ الصلوٰۃ والسلام علیٰ مابیناہ۔[1]

ترجمہ۔ کیونکہ ہمارے نزدیک حضورؐ زندہ ہیں اور آپ کی یہ حیات حسی ہے اور آپ علم
رکھتے ہیں اور امت کے اعمال آپ پر پیش کیے جاتے ہیں اور آپ کو صلوٰۃ وسلام
جیساکہ ہم نے بیان کیا پہنچایا جاتا ہے۔
پھر آپ نے اپنا عقیدہ ان الفاظ میں لکھا ہے:۔

ان عقائدنا ان الانبیاء علیہم السلام احیاءٌ فی قبورھم فاین الموت الی ان قال
وصنف البیہقیؒ جزؤاً سمعناہ فی حیاۃ الانبیاء فی قبورھم واشتد نکیر الاشاعرۃ
علیٰ من نسب ھذا القول الی الشیخ۔[2]

ترجمہ۔ ہمارے عقائد میں سے ہے کہ انبیاء کرام اپنی اپنی قبروں میں زندہ ہیں، سو وہاں موت کہاں۔
اور امام بیہقیؒ (۴۵۸ھ) نے ایک مستقل جزء اس پر تصنیف کیا ہے جو انبیاء کرام کے قبروں میں
زندہ ہونے کے بارے میں ہے اور جن لوگوں نے حضرت الشیخ ابوالحسن الاشعری کی طرف انبیاء کے
قبروں میں مردہ ہونے کا قول منسوب کیا ہے اشاعرہ نے بڑی سختی سے اس پر نکیر کی ہے۔
حضرت علامہ قشیریؒ فرماتے ہیں:۔

فاما ماحکی عنہ (ای الاشعری) وعن اصحابہ انھم یقولون ان محمدًا
صلی اللہ علیہ وسلم لیس بنبی فی قبرہ ولا رسول بعد موتہ فبھتان عظیم

---

[1] طبقات الشافعیہ جلد ۲ صـ ۲۸۲ [2] ایضاً جـ ۲ صـ ۲۶۶

وكذب محض لم ينطق احد منهم ولا سمع فى مجلس مناظرة ذلك عنهم ولا وجد فى كتاب لهم وكيف يصح ذلك وعندهم محمد صلى الله عليه وسلم حى فى قبره۔[1]

ترجمہ۔ ہاں، جو امام ابوالحسن اشعریؒ اور دوسرے اشاعرہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے کہ ان کے نزدیک حضورؐ اپنی وفاتِ شریفہ کے بعد اب اپنی قبر شریف میں نبی اور رسول نہیں رہے۔ یہ محض جھوٹ اور بہتان عظیم ہے۔ اشاعرہ میں سے یہ کسی نے نہیں کہا نہ ان سے کسی مجلسِ مناظرہ میں ایسی بات سُنی گئی اور نہ اُن کی کسی کتاب میں یہ مضمون ملا ہے اور ان کا یہ عقیدہ کیسے ہو سکتا ہے جب کہ اُن کے ہاں حضورِ اکرمؐ اپنے روضۂ اطہر میں زندہ ہیں۔

علامہ ابن عابدین شامیؒ فرماتے ہیں:۔

واما ما نسب الى الامام الاشعرى امام اهل السنة والجماعة من انكار ثبوتها بعد الموت فهو افتراء وبهتان والمصرح به فى كتبه وكتب اصحابه خلاف ما نسب اليه بعض اعدائه لان الانبياء عليهم الصلوٰة والسلام احياء فى قبورهم وقد اقام النكير على افتراء ذلك ابو القاسم القشيرى۔[2]

ترجمہ۔ امام اہلسنت امام ابوالحسن الاشعریؒ کی طرف جو منسوب کیا گیا ہے کہ وہ حضورؐ کے لیے وفاتِ شریفہ کے بعد اس وصف کے ثابت ہونے کا انکار کرتے ہیں، یہ محض افتراء اور بہتان ہے۔ اُن کی اور ان کے ہم مشرب احباب کی کتابوں میں اس کے خلاف تصریح موجود ہے۔ یہ اُن کے دشمنوں نے اُن کی طرف منسوب کر دیا ہے تحقیق یہی ہے کہ انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی قبروں میں زندہ ہیں۔ اور امام ابوالحسن الاشعریؒ پر اس افتراء باندھنے کے خلاف علامہ ابوالقاسم القشیریؒ نے زبردست احتجاج کیا ہے

---

[1] شکایۃ اہل السنۃ۔ رسائل قشیریہ صفحہ ۱ وطبقات جلد ۲ صفحہ ۱۲۹ [2] شامی جلد ۳ صفحہ ۲۶۷ باب المغنم۔

ان نسبة الخلاف فی هذه المسئلة الی الشیخ ابی الحسن الاشعری زور و

بهتان وانما وقع بسبب ان بعض الکرامیة..... ان الاشعری واصحابه

قائلون بان النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی القبر حی یحس ویعلم[1]

ترجمہ۔ امام ابوالحسن الاشعریؒ کی طرف اس عقیدے کی مخالفت کی نسبت محض افتراء[ع] و بہتان ہے اور اس کا سبب کرامیہ تھے۔ امام اشعریؒ اور اُن کے سب اصحاب تو اسی بات کے قائل ہیں کہ حضورِ انورؐ اپنی قبر شریف میں زندہ ہیں اور علم و احساس بھی رکھتے ہیں۔

ان ائمہ و اکابر کے اندازِ بیان کو دیکھئے اور غور فرمایئے کہ یہ مسئلہ اگر کوئی معمولی مسئلہ ہوتا، تو یہ اکابر و اعیان اتنی سی بات پر اس قدر جلال میں نہ آجاتے۔ حیاتُ النبیؐ کا انکار دراصل بہت سے فتن و مفاسد کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے اور ان ائمہ فن کی اُن پر پُوری نگاہ تھی۔ اندریں صورت یہ مسئلہ ایک اصُولی مسئلہ بن کر سامنے آتا ہے۔ قصیدہ بدء الامالی میں ہے:۔

وان الانبیاء لفی امان | عن العصیان قصداً وانعزال

ترجمہ۔ اور بیشک انبیاء اس سے محفوظ ہیں کہ وہ قصداً خدا کی کوئی نافرمانی کریں اور اس سے بھی کہ وہ کسی طرح نبی نہ رہیں ان کی نبوت جاتی رہے

امام مُلّا علی قاریؒ اس کی شرح میں لکھتے ہیں:۔

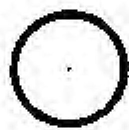
المعنی ان الانبیاء لفی امان عن العزل عن مرتبة النبوة والرسالة وحکی شارح الطوالع فیه اجماع الامة۔[2]

ترجمہ۔ اس کا معنی یہ ہے کہ نبیوں کو مرتبہ نبوت و رسالت سے ہٹائے جانے سے مامون (امن میں) کیا گیا۔ شرح طوالع میں اس پر پوری امت کا اجماع نقل کیا گیا ہے۔

ع اکابر کی طرف انکارِ حیات کی نسبت کرنا کوئی نیا افتراء و بہتان نہیں یہ سنت کرامیہ چلی آرہی ہے۔ ولیست باوّل قارورة کسرت فی الاسلام۔ [1] الروضة البهية فيما بين الاشاعرة الماتریدیہ ص۵۸ [2] ص۱۵۱ مطبع مجتبائی۔

الغرض، یہ اُمور ہیں جنہوں نے ایک ایسے مسئلے کو جو اپنی ابتدائی سطح میں گو درجۂ ضروریات میں سے نہ تھا، بقائے نبوت پیغمبرِ خاتم، شانِ شیخین بجوارِ رسول الثقلین، اعتماد علی السلف، تحفظ مسلک اہل سُنّۃ، ازالہ اوہامِ کرامیت، حقیقتِ عذاب القبر، احترامِ اجماعِ اُمت اور آدابِ زیارت جیسے اہم مسائل کی پامالی کی وجہ سے وہ اہمیت دے دی ہے کہ حقیقتِ حال کو جاننا اور صُورتِ مسئلہ کو پہچاننا ضروری ہو گیا ہے۔

ان حالات اور ضرورات سے متأثر ہو کر کہ مُبادا راہ گُم کردہ قافلہ مسلک اہل سنّت ہی کو مُلتبس کردے اور جوہرِ وحدت سے ہاتھ دھو کر محض تفرقہ ہی نہیں، اپنے عوام کے لیے انتشار و تشتّت اور ذہنی آوارگی کا موجب ہوں، یہ سطور پیشِ خدمت ہیں۔ ممکن ہے یہ ناچیز کوشش اہلِ تذبذب کے لیے شفاقلب کا سامان، راہ گُم کردہ دوستوں کے لیے منزل کا نشان اور اہلِ یقین کے لیے وضوح و برہان ثابت ہو۔



مقدمہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآن و سنت اسلامی فکر و نظر کا سرچشمہ حیات ہیں۔ قرآن پاک کی بلاغت اِس کی انتہا پر واقع ہے کہ طوقِ بشر اس کی نظیر لانے سے عاجز ہے۔ بلاغت کا تقاضا اور ادب کی شان یہ ہے کہ ہر بیان اپنے مفہوم میں کچھ سیاق و سباق، کچھ اندازِ تخاطب اور کچھ قرائن کی وضاحت چاہے۔ اور ظاہر ہے کہ ان امور میں علمی افکار اور نظری مقدمات عوامی سطح پر نہیں آسکتے۔ یہی وجہ ہے کہ اصولی مسائل کے ماسوا، اکابر ہمیشہ سنت سے استدلال کرتے رہے ہیں۔ اسی میں انہیں عمل کی سلامتی نظر آئی اور اسی نظریات کی تفصیل ہوئی جن میں قرآن کا درجۂ اجمال یا درجۂ احتمال میں تھا بعض لوگوں نے تو یہاں تک روایت کیا ہے کہ ترجمان القرآن سیدنا حضرت ابن عباسؓ جب دوسری مرتبہ خوارج سے مناظرہ کرنے کے لئے گئے تو حضرت علیؓ نے انہیں یوں نصیحت فرمائی:۔

ان خاصموک بالقرآن فخاصمهم بالسنة ــ کنز العمال۔[۱]

سیأتی قوم یجادلونکم فخذوهم بالسنن فان اصحاب السنن اعلم بکتاب اللہ۔[۲]

یعنی قرآن سے خطاب نہ کرنا (کہ یہاں ارشادِ باری کو دوسرے معنی پہنانے کی کوشش کی جائے گی) بلکہ استدلال کی بنیاد سنت پر رکھنا کہ یہاں انہیں مخلص نہ مل سکے گا۔

آپ نے بارہا محسوس کیا ہوگا کہ دینی فتنوں کا طریقِ واردات پہلے یہی ہوتا ہے کہ سنتِ پیغمبرؐ اور تشریحاتِ سلف سے بالکل بے نیاز کر کے بالاستقلال قرآن کی دعوت دی جائے۔ اب یہاں اپنا میدان ہے، جو چاہو معنی کر لو۔ قرآن پاک کو اس کی پوری عظمتِ علمی سے سمجھنے والے ارباب

۱ے حقیقۃ الفقہ ص۶۴ مولانا انوار اللہ فاروقی ۲ے کنز العمال جلد ۱ ص۱۹ ، نہج البلاغہ جلد ۲ ص۱۹۵

خبرت اگر باتوں میں نہیں آئیں گے، تو کوئی حرج نہیں۔ اکثریت تو عوام کی ہے۔ انہیں قرآن کے دلکش اور حسین عنوان کے ساتھ مغالطے میں ڈالنا کوئی بات نہیں۔ انکارِ حدیث کی اگر جرأت نہ ہو تو عوامی سطح پر اُسے قرآن سے ٹکرا دیا جائے اور پھر اس عنوان سے اس کا انکار کر دیا جائے کہ جو روایت قرآن کے خلاف ہو اسے ہرگز نہ مانا جائے۔ پھر کرن ہے جو آڑے آسکے عوام میں اتنی استعداد کہاں کہ وہ بشرطِ صحتِ روایت اس ٹکراؤ کو تطبیق و توفیق کے دائرہ میں اُتار سکیں ـــــ عظمتِ قرآن کا یہ دلکش نعرہ مدتوں سے ـــــ پُرانے فتنوں کو کم کرنے کے پروگرام کے ساتھ ـــــ نت نئے فتنوں کو جنم دیتا رہا ہے۔ ملت کا کاروانِ حیات ایسی کئی سرائوں کے پاس سے گزرا ہے، جن کی نشاندہی اس وقت ہمارا موضوع نہیں ہے ؎

ہاں اسی رہ گزر سے شام و سحر　　　اجنبی قافلے بھی گزرے ہیں

اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ قرآن ہماری اساس نہیں۔ اسلام کے جملہ اصُول قرآن کریم میں منصوص ہیں ہم نے جو یہ مشورہ نقل کیا ہے اصُولی مسائل کو مستثنیٰ کر کے ذکر کیا ہے۔ جہاں قرآن پاک اپنے موضوع پر ناطق ہو وہاں تو مسلمان کسی اور طرف جا ہی نہیں سکتا اور جہاں قرآن پاک کی بات میں کئی پہلوؤں کی گنجائش ہو تو پھر سنت ہی ہے جو فیصلہ کرے گی۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ بھی حضرت علیؓ کے پُورے ہمنوا ہیں اور یہی جُملہ اسلاف کا مسلک تھا۔

کان عندھم انہ اذا وجد فی المسئلۃ قرآن ناطق فلا یجوز التحول منہ الی غیرہ واذا کان القرآن متحملاً لوجوہ فالسنۃ قاضیۃ علیہ۔[1]

ترجمہ۔ اسلاف کا یہی طریقہ رہا ہے کہ جب کسی مسئلے میں قرآن ناطق موجود ہو تو اب کسی اور طرف رخ کرنا جائز نہیں اور جب قرآن کریم میں کئی وجوہ کی گنجائش ہو تو اب سنت ہی ہے جو ان پر فیصلہ کرے گی۔

مجتہد اور مناظر میں فرق

مجتہد کا فیصلہ غیر مجتہد کے لیے سند ہوتا ہے اور مجتہد اپنے فیصلے میں بیرونی اثرات سے محفوظ

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ جلد ا صد ۱۱۹

ہوتا ہے۔ قاضی ہو تو جو اس کی بات نہ مانے اسے اس پر حاکمانہ قوت حاصل ہوتی ہے لیکن یہاں کے مناظر جب حق و باطل کے تصفیے کے لیے کھڑے ہو جائیں تو وہاں بات خطابی چلتی ہے اور حق کا ترجمان براہ راست آسان بات پر آتا ہے جس میں دوسرا شخص عوام کو نہ مغالطہ دے سکے نہ بھاگ سکے۔ یہ ایک ضرورت اور وقتی مصلحت تھی جو حضرت علی المرتضیٰؓ نے اختیار فرمائی اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو مشورہ دیا کہ استدلال سنت سے کرنا۔

مسئلے کو اس کے ماخذ سے لینا مجتہد اور ولی الامر کا کام ہے، لیکن بے راہرو مقابل کا منہ بند کرنے کے لیے وقت کی مناسبت دیکھنی پڑتی ہے، وہ آپ کے ماتحت نہیں کہ آپ کی بات ضرور مان لے ایسے موقعہ پر ہر بات وہ کرو جو آسانی سے مل جائے۔

حضرت علیؓ کے مقابل خوارج تھے۔ تصنّع سے قرآن پڑھنا اور لوگوں کو قرآن سے مغالطے میں ڈالنا ان کا فن تھا۔ حضرت علیؓ پوری طرح سمجھتے تھے کہ قرآن اُن کے دلوں میں نہ اُترے گا۔ اس لیے آپ نے وہ نصیحت فرمائی جو ہم نے نقل کی ہے کہ استدلال سنت سے کرنا۔

خوارج جن سے یہ مناظرہ درپیش تھا۔ ان کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیش گوئی کر گئے تھے اور وہ حضرت علیؓ کو معلوم تھی۔ سو آپ کا مذکورہ نصیحت کرنا کوئی بے جا عمل نہ تھا۔ خوارج کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

> یخرج فی ھٰذہ الامۃ قوم تحقرون صلوٰتکم مع صلوٰتھم یقرءون القرآن لا یجاوز حناجرھم یمرقون من الدین کمروق السھم من الرمیۃ۔[1]

ترجمہ: اس امت سے کچھ ایسے لوگ بھی اٹھیں گے کہ تم اپنی نمازوں کو اُن کی نمازوں کے آگے ہیچ سمجھو گے، وہ قرآن قرآن پکارتے ہوں گے، لیکن وہ اُن کے گلوں ہی تک ہوگا۔ یہ لوگ حقیقی دین سے اس طرح نکل جائیں گے جیسے تیر شکار میں سے ہو کر نکل جاتا ہے۔

---

[1] رواہ البخاری عن ابی سعیدؓ جلد ۲ صفحہ ۱۰۲۴

پاکستان میں مسئلہ زیرِ نزاع جن دو فریقوں میں زیرِ بحث ہے۔ ان میں نہ کوئی قاضی شرع ہے نہ کوئی مجتہد اور نہ کوئی حاکمِ وقت کہ اپنے فیصلے کو دوسرے پر مسلط کر سکے۔ سو اگر مسئلہ زیرِ نزاع حدیث میں عبارت النص سے موجود ہو جیسے الانبیاء احیاءٌ فی قبورھم یصلون تو حدیث سے بات سمجھانا بہت آسان رہتا ہے۔ اس بناء پر ہم نے حضرت علی المرتضیٰؓ کا مذکور مشورہ ذکر کیا ہے۔

مجتہد اور مقلدین میں علمی فرق

مجتہد اپنے اُونچے علم کی روشنی میں ان امور میں بھی قرآن سے استدلال کر سکتا ہے جن پر قرآن کا فیصلہ بطور نص موجود نہ ہو۔ مسئلہ پیش افتاد کی قرآن میں نظیر تلاش کرنا اس مسئلے کا حکم پا لینا یہ مجتہد کا کام ہے۔ غیر مجتہد کے لیے سلامتی کی یہ راہ ہے کہ وہ ایسے مسائل میں مجتہدین کے فیصلے سے جو انہوں نے کتاب و سنت سے دریافت کئے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عبداللہ مسعودؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، امام محمد بن سیرینؒ، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ، یہ سب حضرات مجتہدین تھے، مقلدین کو ان کے طریقِ استدلال کی دعوت دینے کی انہی لوگوں کو ضرورت ہو گی جو ائمہ دین سلف صالحین اور اپنے اکابر کی تحقیقات کو ساتھ لے کر نہ چلنا چاہتے ہوں۔

مذہب اہل سنت والجماعت کوئی نیا مذہب نہیں جسے آج ادلہ اربعہ کی روشنی میں ترتیب دیا جائے یہ ایک طے شدہ مدوّن مسلک ہے جس نے معتزلہ کرامیہ جبریہ قدریہ شیعہ و مرجئہ اور خوارج کے مقابل اپنے جملہ اصول و فروع کتابوں میں لکھ دیئے ہیں۔ آج نئے سرے سے ان مسائل کو کتاب و سنت میں تلاش کرنا ان دوستوں کو اس کی ضرورت تبھی محسوس ہو رہی ہے کہ یہ صراحت اسلاف کے ذخیرہ علم میں انہیں کہیں نہیں ملتی اور وہ اس سے کلی طور پر بچنا اور مذہب اہلسنت سے بالکل ہٹنا چاہتے ہیں۔

جس طرح منکرین حدیث ہمیں طعنہ دیتے ہیں کہ یہ لوگ عجمی سازش (جو ان کے نزدیک ذخیرہ حدیث کی تدوین کا نام ہے) کا شکار ہیں۔ اس طرح ہمارے یہ کرم فرما ہمارے مقابل قرآن پاک کی وہ آیات بڑے شد و مد سے پیش کر رہے ہیں۔ جن کا حاصل یہ ہے کہ قرآن کی بات مانو اور یہ کہ یہ کتاب

صحیح کہتی ہے ـــــ گویا حیات النبی کے قائلین سب قرآن کے نہ ماننے والے ہیں اور وہ نہیں سمجھتے کہ یہ کتاب ڈرنے والوں کے لیے ہدایت ہے، علمی ماخذ کی حیثیت سے اس تک مجتہد ہی پہنچ سکتے ہیں، نہ کہ ہر ایک واعظ۔ پھر انہوں نے ڈھونڈ کر وہی آیات پیش کی ہیں جن میں انکارِ حیات کا کوئی ادنیٰ اشارہ بھی نہیں۔ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ کوئی مولوی صاحبان ہیں یا یہ حضرات مسٹر پرویز کے نمائندوں کی حیثیت سے اس میدان میں اترے ہوئے ہیں۔ والی اللہ المشتکیٰ۔

مسئلہ حیاتُ النبی کیا قرآن پاک میں ہے؟

ہمارے کرم فرما خود کہتے ہیں:۔

قرآن کریم میں اس مسئلہ کی کہیں صراحت نہیں، ہاں شہداء کے حق میں ارشاد ہے بل احیاءٌ ولکن لا تشعرون۔ اس سے بطور دلالۃ النص کے سمجھ میں آتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا درجہ شہداء سے بھی بہت بڑا ہے وہ بعد الوفات زندہ ہیں اور اسی طرح علماء کرام نے زادہم اللہ شرفاً یہ مسئلہ قرآن کریم سے نکالا[۱]

اب اگر اس مسئلے کی قرآن میں صراحت نہیں اور حدیث میں اس کی صراحت موجود ہو تو اس عنوان پر براہِ راست حدیث سے استدلال کرنا آپ خود ہی سوچیں اس میں ہم نے کون سی غلطی کی ہے۔ فرق ہے تو یہ کہ ہم نے حیاتِ انبیاء پر حدیث سے استدلال کیا ہے اور آپ نے علماء سے اور آپ نے انہیں اس احسان پر دعا بھی دی ہے کہ زادہم اللہ شرفاً۔

پھر یہ بات جو انہوں نے کہی، ہم خود اُسے ان لفظوں میں کہہ بھی چکے ہیں، مگر نہیں معلوم انہیں اسے دُہرانے سے کیا ملا۔

ہاں شہداء کے لیے حیات بعد الوفات کا ثبوت یقیناً قرآن میں موجود ہے جیسے انبیاء کی حیات بعد الوفات کے لیے دلالۃ النص کے طور پر بیان کیا جا سکتا ہے[۲]

۱؎ مسالک العلماء صفحہ ۱۹ ۲؎ مقامِ حیات طبع اول صفحہ ۲۸

ان سے اصولی موافقت کرتے ہوئے اگر ہم حدیث سے بھی استدلال کرلیں تو یہ ہم پر انگلی اُٹھاتے ہیں اور خود یہ اقوال علماء سے فیصلہ لیں تو ہم پھر بھی انہیں کچھ نہیں کہتے، اپنا اپنا ظرف ہے اور اپنا اپنا مسلک ـــــ ہمیں تو یہ بات زیادہ بہتر معلوم ہوتی ہے کہ مسئلہ اگر قرآن کریم میں صراحت سے نہ ملے تو اسے حدیث میں تلاش کرلیا جائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی ترتیب کو منظوری بخشی تھی، معلوم نہیں ان حضرات کو حدیث سے تنفر کیوں ہے؛ وہ اس طرف کیوں نہیں آتے؟

آیت حیاتِ شہداء میں تخصیص کا احتمال

قرآن کریم میں حیاتِ شہداء عبارۃ النص میں مذکور ہے۔ اگر کوئی صاحب اسے شہداء کی جزوی فضیلت کہے اور حیاتِ انبیاء کا قائل نہ ہو تو کیا ہم اس پر حکم کفر جاری کرسکیں گے؟ ہم یہی کہیں گے کہ اس احتمال کو اس آیت میں نہ آنے دو۔

حدیث میں انبیاء کے لیے صریح طور پر احیاء (وہ زندہ ہیں) کا لفظ موجود ہے۔ اس احتمال کو زائل کرنے کے لیے اگر ہم نے حدیث سے تمسک کیا تو خود ہی فیصلہ کیجئے کون سی غلطی کی ہے ہم نے یہ بات کہی تھی کہ جن مسائل میں قرآن کا یہ درجہ اجمال یا درجہ احتمال میں ہو، ان میں سنت سے استدلال کرلینا چاہیئے۔ اب اس پر ہمارے کرم فرماؤں کا تبصرہ ملاحظہ ہو:۔

> اموات غیر احیاء کو درجہ اجمال و احتمال میں داخل کر دیا، جس کا واضح معنی یہ ہے کہ (انبیاء) اموات ہیں زندہ نہیں اور نہیں جانتے کہ کب اُٹھائے جائیں گے
>
> یہ ایسے ہی ہے جیسے مرزائیوں نے ولکن رسول اللہ وخاتم النّبیّین کو درجہ اجمال اور احتمال میں رکھا ہوا ہے۔[1]

جو لوگ یہ نہ سمجھ سکیں کہ یہ درجہ اجمال و احتمال والی بات آیت اموات غیر احیاء کے بارے میں نہیں، آیت حیات الشہداء کے پیش نظر کہی جارہی ہے اور وہ بھی محض اس لیے کہ ادنیٰ احتمال کی گنجائش

---

[1] مسالک العلماء، ص ۱۱

بھی نہ رہے۔

ہمیں بہت حیرانی ہے کہ ان حضرات نے اموات غیر احیاء کو کس دیدہ دلیری سے آیت ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین کی طرح قطعی الدلالۃ بنا دیا ہے۔ گویا اس میں واقعی کسی اور معنی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

کیا آیت اموات غیر احیاء عقیدہ مماتُ النبی پر قطعیُ الدلالۃ ہے۔

مخالفین اپنے اس دعوے پر کہ حضورؐ اب زندہ نہیں ہیں۔ آیت اموات غیر احیاء کو اسی طرح قطعی الدلالۃ سمجھے بیٹھے ہیں جس طرح آیت ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری نبی ہونے پر قطعی الدلالۃ ہے ــــــ ظاہر ہے کہ خاتم النبیین کا کوئی متبادل معنی نہیں ہے۔ حضورؐ آخری نبی ہیں اور مرتبہ و زماں ہر اعتبار سے آخری نبی ہیں ــــــ کیا آیت اموات غیر احیاء بھی اسی طرح انبیاء علیہم السلام (بشمولیت حضرت عیسیٰ بن مریم) کے بالفعل اموات ہونے پر قطعی الدلالۃ ہے یا اس کے کوئی اور معنی بھی ملتے ہیں؟ ــــــ اموات میں انبیاء کے سوا کوئی اور احتمال بھی ہو کیا یہ ممکن نہیں ــــــ اگر نہیں تو پھر آپ کے نزدیک جملہ انبیاء کو بالفعل اموات نہ ماننے والے اور حضورؐ کو زمانہ اور مرتبہ میں آخری نبی نہ جاننے والے دونوں کا حکم ایک ہونا چاہیئے اور دونوں اپنے ان نصوص قطعیہ کے رد کرنے کے جرم میں دائرہ اسلام سے خارج تصور ہونے چاہئیں۔ مگر سب حضرات جانتے ہیں کہ مماتی لوگ حیات النبی کے قائلین کو کافر نہیں کہتے اور قادیانیوں کو کافر کہتے ہیں ــــــ آخر یہ فرق کیوں؟

کیا اس کی یہ وجہ تو نہیں کہ اموات غیر احیاء کی تفسیر میں اصنام (بت) مراد ہونے کا احتمال بھی لکھا ہے اور اس کا موضوع مجمل ہے کہ وہ جن جن کی عبادت کرتے ہیں وہ سب، اموات ہیں ستارے ہوں یا بت، درخت ہوں یا آگ، زندہ انسان ہوں (جو انجام کار محل موت ہیں) یا شہداء (جو گو اب زندہ ہیں مگر ماضی میں مورد موت بنے) سب ان میں آگئے۔

ظاہر ہے کہ یہ آیت اس پہلو سے انبیاء کرام کے بالفعل اموات ہونے پر ہرگز دلالت نہیں کرتی چہ جائیکہ اسے اس معنی پر قطعی الدلالۃ کہا جا سکے، وہ ماضی میں موت کا ذائقہ چکھ چکے۔ مگر اب وہ زندہ ہیں حالاً اموات نہیں ہیں اور اس عقیدے سے کوئی کافر نہیں ہوجاتا۔

انبیاء کرام کو بھی ساتھ شامل کرلیں اور مطلقہ عامہ میں فعلیت نسبت کا تحقق ماضی میں مانیں، حالاً انہیں زندہ سمجھیں، شہداء کو ماسبق میں قتلوا سمجھیں۔ انہیں احیاء کہیں تو اس میں کوئی شرعی دلیل ایسا کہنے سے مانع نہ ہوگی۔ کیا مطلقہ عامہ میں فعلیت نسبت کا تحقق کسی ایک دور میں کافی نہیں تھا یا انہیں ہمیشہ ہی مرا ہوا ہونا چاہیئے۔ آخر آپ بھی تو کہتے ہیں:۔

شہداء اور انبیاء ــــ بعد الوفات زندہ ہیں۔[1]

اس ساری بحث کا حاصل یہ ہے کہ آپ کے نزدیک آیت اموات غیر احیاء کسی پہلو سے عقیدہ ممات النبی پر دال نہیں، چہ جائیکہ اسے قطعی الدلالۃ اور وہ بھی مثل آیت خاتم النبیین کہا جا سکے ــــ تعصب اور ضد کی بھی آخر کوئی حد ہوتی ہے۔ قاضی صاحب نے کسطرح عقیدہ حیاۃ النبی اور انکار ختم نبوۃ کو برابر کر دیا ہے۔

ہم نے حیات شہداء سے حیات انبیاء ثابت کرنے میں اس احتمال بعید کی رعایت کی کہ کوئی اسے فضیلت جزوی جو غیر نبی کو نبی پر ہو سکتی ہے قرار نہ دے اور کہے کہ حیات شہداء سے حیات انبیاء کا عقیدہ لازم نہیں آتا۔ ہم نے اس کا رد کیے بغیر براہ راست حدیث صحیح سے استدلال کیا کہ انبیاء بعد الوفات زندہ ہیں۔ لفظ اجمال یا احتمال میں ہمارا اشارہ اسی طرف تھا، آیت اموات غیر احیاء کی طرف نہ تھا۔

مگر ہمارے کرم فرماؤں کے علم و فہم کی داد دیجئے۔ وہ اُسے از خود اموات غیر احیاء کے بارے میں لے بیٹھے ــــ اور پھر کیا ہوا، اپنے آپ کو لے بیٹھے ــــ اُن کی صدائے ماتم سُنیئے:۔

امواتٌ غیر احیاءٍ وما یشعرون ایان یبعثون کو درجۂ اجمال و درجۂ احتمال میں داخل کر دیا...... ایسا ہی ہے جیسے مرزائیوں نے ولکن رسول اللّٰہ و

---

[1] مسالک العلماء صـ۲۹

خاتم النبیین کو درجہ اجمال اور احتمال میں رکھا ہوا ہے۔[1]

ایک اور کرم فرما حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

موت کے کوئی اور معنی لے رہے ہیں، اس معنی کو لے کر موت کا انکار نہیں ہو سکتا تو خاتم النبیین کی بھی قادیانی تفسیر اختیار کر کے ختم نبوت کا انکار نہیں ہو سکتا۔ (العیاذ باللہ) ایسی تحریریں دیکھنے سے شبہ ہوتا ہے کہ کہیں یہ لوگ قادیانیوں سے ملے ہوئے تو نہیں جو سارا دیوبند ان کے کھاتے میں ڈال کر خود مسلمان بنے، ساحل پہ کھڑے محو تماشا ہیں۔

عوام کو یہ تأثر دینا کہ قادیانیوں اور مسلمانوں کا اختلاف اسی درجے کا ہے جس درجے کا اختلاف ہم میں حیات و ممات کا ہے۔ یا یہ بات پھیلانا کہ قادیانیوں کی تفسیر آیت خاتم النبیین بھی لائق قبول ہو سکتی ہے۔ یا یہ کہ فلاں فلاں عالم نے فلاں آیت کے معنی اس طرح بدلے ہیں جس طرح قادیانیوں نے قرآن کی تحریف کی ہے۔ آپ سوچیں کہ ان باتوں سے آپ کن لوگوں کی مدد کر رہے ہیں کیا یہ انہی باتوں کا اثر نہیں کہ ان دوستوں کے اپنے ایک رفیق مولوی صاحب قادیانی ہو گئے ہیں۔

ہم اس اختلاف کو سمیٹنا چاہتے ہیں اور یہ لوگ ہیں جو اُسے بڑھا رہے ہیں اور یہاں تک بڑھا رہے ہیں کہ اسے قادیانیوں کی دہلیز تک لے آئے ہیں۔ والی اللہ المشتکی

آیت اموات غیر احیاء کا موضوع بیان

کیا آیت خاتم النبیین اسی درجے میں واضح المعنی ہے جس درجے میں آیت اموات غیر احیاء؟ نہیں، آیت اموات غیر احیاء میں مفسرین نے کئی احتمال ذکر کئے ہیں کہ یہ مراد ہے یا وہ ——— لیکن آیت خاتم النبیین کا کوئی اور متبادل معنی نہیں کہ اس معنی کو چھوڑ کر کوئی اور معنی اختیار کیا جائے۔ اوّل الذکر میں تاویل کرنے والا کافر نہ ہو گا اور ثانی الذکر میں تاویل کرنے والا دائرہ اسلام سے باہر ہو گا۔ لان التاویل فی ضروریات الدین لا یقبل۔

---

[1] مسالک العلماء صـ۱۱

جس طرح آیت بل احیاء ولکن لا تشعرون حیاتِ شہداء کے بارے میں نازل ہوئی،
آیت اموات غیر احیاء مماتِ انبیاء کے موضوع میں نازل نہیں ہوئی، یہ توحید کے موضوع پہ ہے۔
کسی کے لائق عبادت نہ ہونے میں اس کا محلِ موت ہونا کافی ہے، جو ماضی میں یا حال
میں یا مستقبل میں مَوردِ موت ہو، وہ عبادت کے لائق نہیں۔ عبادت کے لائق صرف وہی ہے جو
کبھی نہ مرے۔ آیت کا حاصل یہ ہے کہ اللہ رب العزت کے سوا تم جن کی پوجا کرتے ہو، وہ سب محلِ
موت ہیں، حالاً ہوں یا ماسبق میں یا آئندہ کسی وقت (جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام بعد نزول
وفات پائیں گے)۔ ان میں سے کوئی عبادت کے لائق نہیں۔

اس آیت میں اُن میں سے کسی کے بالفعل مُردہ ہونے کا بیان نہیں ہو رہا۔ فعلیت نسبت کا
تحقق کسی زمانے میں ہو جائے کافی ہے۔ کسی کا بالفعل زندہ ہونا اسلام کے عقیدہ توحید کے ہرگز
منافی نہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آسمانوں پہ زندہ ہونا اور باقی انبیاء کا بعد الوفات زندہ ہونا
رب العزت حی لایموت کی صفتِ حیات سے ہرگز متصادم نہیں ہے۔ آیت کے آگے بھی دیکھئے:۔

والذین یدعون من دون اللہ لا یخلقون شیئا وھم یخلقون ۝ اموات غیر
احیاء وما یشعرون ایان یبعثون ۝ الٰھکم الٰہ واحد۔

(پ۱۴: النحل ع ۲۔ آیت ۲۲)

ترجمہ۔ اور جن کو پکارتے ہیں اللہ کے سوا، کچھ پیدا نہیں کرتے اور وہ تو خود پیدا کیے ہوئے
ہیں مُردے ہیں جن میں جان نہیں اور وہ نہیں جانتے کہ وہ کب اٹھائے جائیں گے
معبود تمہارا معبود ہے اکیلا۔

یہ الفاظ الٰھکم الٰہ واحد بتلا رہے ہیں کہ آیت توحید کے موضوع میں وارد ہے، اس
موضوع میں نہیں کہ انبیاء حالاً اموات ہیں یا ان کے روح کا ان کے جسم سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ مضمون
آیت کا ہرگز موضوع بیان نہیں ہے ـــــ جب موضوع توحید اللہ ہے تو اموات غیر احیاء کا
معنیٰ اسی مورد پر رکھنا چاہیئے جس درجے میں اس کا توحید سے تصادم ہوتا ہو۔ حالاً کسی کا زندہ ہونا توحید

کے ہرگز منافی نہیں ہے۔ روح المعانی میں ہے یہاں ان کے لیے صرف اثباتِ مخلوقیت کافی ہے۔ ان سے نفی حیات کا کوئی تقاضا نہیں :۔

ان اثبات المخلوقیۃ لهم غیر مستدعی لنفی الحیاۃ عنهم لما ان بعض المخلوقین احیاء۔[۱]

ترجمہ۔ ان کا مخلوق ہونا ثابت کرنا اس بات کی دعوت نہیں دیتا کہ ان سے حیات کی بھی نفی کی جائے۔ کتنے لوگ مخلوق ہیں اور وہ زندہ ہیں۔

آیت اموات غیر احیاء میں کیا کسی اور معنی کا دخل بھی ہے ؟

ہاں سیدنا حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے یہاں اموات کے معنی اصنام کئے ہیں۔ مفسر حقانی لکھتے ہیں :۔

جمہور مفسرین کے نزدیک ان سے مراد ان کے بُت ہیں کہ جن کو وہ قادر زندہ اور دانا جان کر پرستش کرتے تھے۔ جلالین میں ہے وهم الاصنام، تفسیر کبیر میں اس جُملہ کی شرح یُوں ہے فاعلم انه تعالیٰ وصف هذه الاصنام بصفات کثیرة پھر اُن کے بتوں کی قدرت کو یُوں باطل کرتا ہے لا یخلقون شیئا و هم یخلقون۔[۲]

صفوۃ التفاسیر میں ہے :۔

والذین یعبدونهم من دون الله کالاوثان والاصنام لا یقدرون علی خلق شئ اصلاً والحال انهم مخلوقون صنعهم البشر بایدیهم فکیف یکونون الهه تعبد من دون الله (اموات غیر احیاء) ای وتلك الاصنام اموات لا ارواح لها لا تسمع ولا تبصر لانها جمادات لا حیاۃ فیها فکیف تعبدونها وانتم افضل منها لما فیکم من الحیاۃ۔[۳]

---

[۱] تفسیر روح المعانی جلد ۱۴ صفحہ ۱۲۰ [۲] تفسیر حقانی جلد ۵ صفحہ ۱۷ [۳] صفوۃ التفاسیر جلد ۲ صفحہ ۱۲۲

ترجمہ۔ اور جن کو پکارتے ہیں اللہ کے سوا جیسے مجسمے ہوتے اور بت وہ بالکل کسی چیز کے پیدا کرنے کی طاقت نہیں رکھتے اور حقیقت یہ ہے کہ خود انہیں انسانوں نے بنایا ہے سو وہ کیسے اللہ کے سوا عبادت کے معبود ہو سکتے ہیں اور یہ بت مُردے ہیں ان کی ارواح ہی ہی نہیں وہ سنتے دیکھتے نہیں کیونکہ وہ جمادات میں سے ہیں ان میں زندگی نہیں۔ تم کس طرح ان کی عبادت کرتے ہو۔ حالانکہ تم ان سے افضل ہو تم میں حیات تو ہے۔

اب کہیے کیا یہ آیت واقعی انبیاء کی نفی حیات کے لیے نازل ہوئی جیسے آیت خاتم النبیین بیان ختم نبوت کے لیے اُتری۔

علامہ محمود آلوسیؒ (۱۲۷۰ھ) نے اموات کو عموم مجاز میں لیا ہے اور اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی لیا ہے جن پر موت آئندہ آئے گی۔ معلوم ہوا اس سے مراد کسی کا حالاً مُردہ ہونا نہیں، محلِ موت ہونا مراد ہے، اس میں وہ بھی آ گئے جن پر پہلے کبھی موت آئی۔ مگر وہ بعد میں زندہ ہو گئے اور وہ بھی جن پر موت آئندہ آئے گی۔ جیسے فرشتے اور وہ بھی جن میں حیات سرے سے آئی ہی نہیں جیسے بُت۔

(اموات) عموم المجاز لیشمل ما کان له حیاة ثم مات کعزیر او سیموت کعیسیٰ والملٰئکة علیهم الصلوٰة والسلام وما لیس من شانه الحیاة اصلاً کالاصنام[1]

ترجمہ۔ اموات عموم مجاز ہے یہ ان کو بھی شامل ہے جن میں پہلے حیات تھی پھر وہ فوت ہوئے جیسے عزیر علیہ السلام اور ان کو بھی شامل ہے جو آئندہ فوت ہوں گے جیسے عیسیٰ علیہ السلام (ان کا بالفعل زندہ ہونا اس کے منافی نہیں ہے) اور فرشتے اور ان کو بھی شامل ہے جن میں حیات سرے سے آئی ہی نہیں جیسے بُت۔

اللہ رب العزت کے لیے حیات تامہ ہے اور وہی ایک عبادت کے لائق ہے۔ باقی جو

---

[1] روح المعانی جلد ۱۴ صفحہ ۱۲۰

ہیں. ان میں کوئی حیاتِ تامہ نہیں رکھتا. جو بھی ہے اسے اوّل یا آخر یا حالاً موت نے گھیر رکھا ہے.
سو اس آیت میں اثباتِ توحید باری ہے. کسی کا حالاً مُردہ ہونا آیت کا موضوع نہیں ہے.

معنی کونھم امواتا انھم لابد لھم من الموت وکونھم غیر احیاء غیر تامۃ
حیاتھم والحیاۃ التامۃ ھی الحیاۃ الذاتیۃ التی لایرد علیھا الموت.[1]

ترجمہ. ان کے اموات ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انہیں موت سے مفر نہیں اور ان کے غیر احیاء
کا معنی یہ ہے کہ ان کی حیات تامہ نہیں. حیاتِ تامہ اس حیاتِ ذاتیہ کو کہتے ہیں جس پر کبھی
موت آئے ہی نہ (نہ پہلے آئی ہو نہ کبھی آئندہ آئے).

حضرت تھانویؒ نے بھی عمومِ مجاز کہا ہے.

یہ معبودین کیسے مستحقِ عبادت ہو سکتے اور وہ مُردے ہیں خواہ دواماً جیسے بُت یا
فی الحال جیسے وہ لوگ جو مر چکے ہیں (گو اب وہ زندہ ہوں) یا فی المآل جو مریں
گے مثلاً جن اور عیسیٰ علیہ السلام وغیرہم زندہ رہنے والے نہیں.[2]

مزید تفصیل درکار ہو تو تفسیر ابن کثیر جلد ۱ ص ۱۱۲ جلد ۲ ص ۵۶۵، تفسیر قرطبی جلد ۱ ص ۹۴، تفسیر خازن
جلد ۳ ص ۱۱۱ میں بھی دیکھ لیں. یہ آیت انبیاء کے اِس وقت اموات اور بے جان ہونے پر ہر گز
دلالت نہیں کرتی۔ ان پر ماسبق میں موت آئی. اسی معنی میں وہ اموات میں آئے لیکن حالاً ان کو یا شہداء
کو ہم اموات کہیں. اس کی قرآن کریم ہمیں اجازت نہیں دیتا.

افسوس کہ ہمارے مخالفین اس آیت اموات غیر احیاء کو جس میں بُت بھی مُراد لیے گئے ہیں
انبیاء کے حالاً بے جان ہونے پر اس درجہ کی قطعی دلیل سمجھتے ہیں. جیسے آیت ولٰکن رسول اللّٰہ وخاتم
النبیین حضورؐ کی ختمِ نبوت کی قطعی دلیل ہے۔ ان حضرات کے علم وفہم اور دیانت وامانت پر جتنے
آنسو بہائے جائیں کم جائیں. یہ حضرات پہلے تو علم سے اتنے دور نہ تھے اب انہیں کیا ہو گیا. اکابر کی
شان میں گستاخی کا یہ فطری انجام ہے کہ قرآن کریم کی یہ آیت انہیں بالکل سمجھ نہیں آرہی.

---

[1] روح المعانی جلد ۱۴ ص ۱۲۰ [2] معارف القرآن جلد ۵ ص ۳۱۶

چوں خدا خواہد کہ پردہ کس درد	میلش اندر طعنہ پاکاں برد

ان دوستوں نے علمی حیثیت سے اپنے آپ کو اتنا گرا لیا ہے کہ شاید ہم انہیں اور مخاطب نہ کر سکیں، سو آئندہ انشاء اللہ العزیز ہم اپنی بات مثبت پیرایہ میں کہیں گے۔ اگر سچائی کی امانت بغیر کسی تعصّب اور احساسِ تحزب کے طلبہ علوم دینیہ اور عام اہل اسلام تک پہنچ جائے تو ہم سمجھتے ہیں کہ ہم نے اپنی ذمّہ داری ادا کر دی۔ واللہ المستعان وعلیہ التکلان۔

قرآن پاک اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی وفات شریفہ

قرآن پاک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی اس دُنیا کی زندگی ہی میں مکمل ہو چکا تھا۔ آپ عالم برزخ میں انتقال فرمانے سے پہلے متعدد اجزاء اور منتشر اوراق میں کتاب الٰہی کی یہ امانت امت کو سپرد کر چکے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس کتاب میں آپ کے وقوعِ وفات کی خبر نہیں ہو سکتی۔ قرآن پاک میں آپ کی وفات کا امکان (افإن مات او قتل کہ اگر آپ فت ہو جائیں یا شہید ہو جائیں) موجود تھا اور آپ کی وفات کی پیشگوئی بھی آیت (انك میت و انهم میتون) میں موجود تھی۔ لیکن اس بات کا بیان کہ آپ پر موت کا وُرود ہو چکا ہے، اس کے لیے ابھی وقت کا انتظار تھا۔ سو اس کا قرآن میں نہ تذکرہ ہے، نہ ہو سکتا ہے جو شخص کہے قرآن میں ہے کہ آپ پر وفات آچکی وہ اپنے اس دعویٰ میں کاذب ہے۔

حضرت مسیح کی وفات کے متعلق نصاریٰ کا جو تصور ہے، یہ پُورا واقعہ صلیب بائبل میں موجود ہے۔ اس کا بائبل میں مذکور ہونا ہی اس بات کی کافی دلیل ہے کہ یہ بائبل وہ انجیل مقدس نہیں جو حضرت عیسیٰ کر دی گئی تھی اور جس کی تبلیغ آپ اپنی قوم کو کرتے رہے۔ ورنہ اس میں آپ کی اپنی موت کی خبر ہرگز نہ ہوتی۔

آنحضرتؐ پر وفات شریفہ کا یقیناً وُرود ہوا اور آپ نے یقیناً اس دُنیا سے انتقال فرمایا لیکن قرآن پاک اس وقوعِ موت کی ہرگز خبر نہیں دیتا۔ آپ پر وفات آچکی۔ اس کا سب سے پہلا ثبوت حضرت صدیق اکبرؓ کا وہ خطبہ بلیغہ ہے، جو کتب حدیث میں اسانید صحیحہ سے منقول چلا آرہا ہے۔

وقوعِ موت ثابت کرنے کے لیے تاریخی حوالے کی بجائے خواہ مخواہ قرآنی آیات پڑھتے چلے جانا، امکان کو وقوع قرار دینا اور پیش گوئیوں کا تحقق وقتِ پیش گوئی سے واقع اور ثابت مانتے چلے آنا، معلوم نہیں کون سا علمی مقام اور کون سا طریقِ برہان ہے، بالخصوص جب کہ یہ کوئی اختلافی مبحث اور محلِ نزاع نہ ہو۔ بلکہ وقوعِ وفات پہ بنا بر خبرِ مستفیض سب کا اجماع اور اتفاق ہو۔

واضح رہے کہ قرآن پاک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پہ ورودِ موت ہو چکنے کی خبر نہیں دیتا۔ وہ اس کے واقع ہو چکنے سے بالکل خاموش ہے۔ آنے والی موت کے بعد پھر حیات حاصل ہو گی یا قیامت تک جسدِ اطہر اور روحِ انور میں کلّی مفارقت رہے گی۔ اس پہ بھی قرآن پاک کی کوئی عبارت النص موجود نہیں۔ اب خواہ مخواہ اقتضاء النص سے بھی کمزور سہارے لے کر آیات پر آیات پڑھتے چلے جانا، جزئیات کو کلیات بناتے چلے آنا اور جزئی اشارات کو کھینچ کھینچ کر مطالب کا جال بنانا، یہ ایک ایسی حرکت ہے کہ کوئی صاحبِ علم اس بے راہروی کی تائید نہ کر سکے گا اور اب اس مرضِ مزمن پہ جتنے آنسو بہائے جائیں کم ہیں۔ ایک قوم کی قوم اس کا شکار ہو چکی ہے۔

ہاں، شہداء کے لیے حیات بعد الوفات کا صریح ثبوت یقیناً قرآن میں موجود ہے، جسے انبیاء کی حیات بعد الوفات کے لیے دلالۃ النص کے طور پہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ مگر ہم اس بحث میں نہیں پڑتے۔ ہمارے کرم فرما خود اسے تسلیم کرتے ہیں —— ہاں یہ بات حق ہے کہ جس طرح وقوعِ وفات کی خبر کتبِ حدیث سے ملتی ہے۔ اسی طرح حیات بعد الوفات کے لیے بھی احادیثِ صحیحہ یقیناً موجود ہیں۔

اثباتِ عقائد کے لئے دلائلِ ظنیّہ سے استشہاد —— ایسا کیوں؟

ممکن ہے کوئی صاحب یہاں یہ اعتراض کر دیں کہ اخبارِ احاد اور سلسلہ روایات سے یہ مسئلہ کیوں ثابت کیا جائے۔ عقائد ثابت کرنے کے لئے تو دلائلِ قطعیہ کی ضرورت ہوتی ہے۔

جواباً عرض ہے کہ یقین کا فائدہ اور قطعیت صرف قرآن پاک اور خبرِ متواتر الاسنادہی میں

منحصر نہیں. بلکہ اخبارِ احاد بھی جو اپنی اپنی جگہ خواہ متفرق ہی سہی، کسی قدرِ مشترک میں متحد ہو جائیں، تو ایسے یقین کا فائدہ دے سکتی ہیں کہ اس پر عقیدے کی بنیاد رکھی جا سکے. پھر جب داخلی اور خارجی قرائن اور مختلف طبقوں کے اہلِ حق کا اجماع اس کے حقیقتِ مسلمہ ہونے کی شہادت دے دیں، تو یہ بنیادِ یقین اور بھی مستحکم ہو جاتی ہے. حضرت علامہ شاطبیؒ ارشاد فرماتے ہیں :-

وانما الادلة المعتبرة ههنا المستقرأة من جملة ادلة ظنية تظافرت علیٰ معنی واحد حتّٰی افادت فيه القطع فان للاجتماع من القوة ما ليس للافتراق ولاجله افاد التواتر القطع وهٰذا نوع منه فاذا حصل من استقراء ادلة المسئلة مجموع يفيد العلم فهو الدليل المطلوب و هو شبيه بالتواتر المعنوی۔[1]

ترجمہ. عام طور پر جو دلائل یہاں معتبر ہیں وہ اس قسم کے ہیں جو علیحدہ علیحدہ اگرچہ ظنی ہوں. مگر کسی ایک قدرِ مشترک پر سب متفق ہو جانے کی وجہ سے خاص اس مسئلہ میں یقین کا فائدہ دینے لگتے ہیں. دلائل کے اس اشتراک کے بعد مسئلے میں جو قوت پیدا ہو جاتی ہے. ظاہر ہے کہ وہ ان کی انفرادی حیثیت میں نہیں ہو سکتی. خبرِ متواتر بھی اسی اجتماعی قوت کی وجہ سے یقین کا فائدہ دیتی ہے. پس جب کسی ایک مسئلے کے لیے متفرق دلائل جمع ہو جائیں، تو اُن کے مجموعے سے (اس قدرِ مشترک کے لیے) ایک یقین حاصل ہو جاتا ہے اور وہ بھی ایک قسم کا تواترِ معنوی ہی ہے.

عذابِ قبر کا برحق ہونا عقائدِ اہلِ سنت میں اسی اصل کے ماتحت ہے. قرآن پاک کی جس آیتِ شریفہ میں اس کا بیان ملتا ہے، وہ قطعی الثبوت ہونے کے باوجود قطعی الدلالت نہیں اور جو احادیث اس مضمون پر قطعی الدلالت ہیں، وہ اپنے ثبوت میں ظنی ہیں. بایں ہمہ عذابِ قبر کو برحق ماننا عقائد میں داخل ہے. ملا علی قاریؒ نے عذابِ قبر کے داخلِ عقائد ہونے میں یہی استدلال پیش کیا ہے :-

---

[1] الموافقات جلد ا صـ ۳۶

فلا يخفى ان المعتبر فى العقائد هو الادلة اليقينية واحاديث الآحاد لو
ثبتت انما تكون ظنية اللّٰهم الا اذا تعدد طرقه بحيث صار متواترًا
معنويًا فحينئذٍ قد يكون قطعيًا۔[1]

ترجمہ. یہ بات مخفی نہ رہے کہ عقائد کے باب میں دلائل یقینیہ ہی معتبر ہیں. اخبار آحاد
اگر ثابت بھی ہوں، تو بھی ظنی ہیں. ہاں، اگر ایک ہی مضمون) متعدد طریقوں سے اس
طرح مروی ہو کہ تواترِ معنوی پیدا ہو جائے، تو اس وقت یہ (قدرِ مشترک) بھی قطعی
اور یقینی ہو جائے گی.

ہاں اس طرح ثابت ہونے والا مسئلہ اگر نظری ہو تو بقول حضرت شاہ صاحبؒ منکر پر تول
کفر لازم نہیں آتا اور زیادہ سے زیادہ یہی شک کا فائدہ ہے جو ہم اپنے مخالفین کو دے سکتے ہیں.
والتفصیل فی العرف الشذی ص۳۴ و ص۳۵۵
واللہ اعلم بالصواب وعلمہ اتم و احکم فی کل باب.

قرآن عزیز کا موتِ انسانی کے بارے میں نظریّہ

ذہن جاہلیت سے مفہوم موت پر اختلاف :

عربوں کا تصور "موت" کے متعلق یہی چلا آرہا تھا کہ :

① ــــ یہ فقط روح کے بدن سے جدا ہونے کا نام ہے اور یہ ایک امر عدمی ہے.

② ــــ ان کے عقائد میں نہ بقائے جسد تھی نہ بقائے روح دونوں کی فنا ہے.

③ ــــ ورودِ موت کے بعد پھر روح اور اس جسدِ دنیوی کا اجتماع اُن کے نزدیک محال
اور ایک امر مستبعد ہے.

قرآن عزیز نے مفہوم "موت" پہ ذہن جاہلیت بدل ڈالا ــــ ان لوگوں نے اپنے فکر و نظر

---

[1] شرح فقہ اکبر ص۱۲۲

کے مطابق "موت" کے لیے کئی لفظ اختیار کر رکھے تھے۔ ابن سید النّاس اُندلسی نے "المخصص" میں ایک فہرست پیش کی ہے اور ہر لفظ پر اشعار جاہلیت سے استدلال کیا ہے۔

اسمائے موت :-

الهميغ والنيط والزهر والمنون والشعوب والفود والحمام والسامر والمقدار وقتيم وجباز وحلاق والقاضية والطلاطل والعول والذام والكفت والجداع والحذرة والحتف والخالج ..... وغيرها۔[1]

انہی میں لفظ "توفی" بھی آیا ہے، لیکن اس پر محقق اندلسیؒ نے اشعارِ عرب سے استناد نہیں کیا۔ بلکہ استدلال میں قرآن عزیز کو پیش کیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ مفہوم موت پر نزولِ قرآن کے وقت ہی سے ذہنِ جاہلیت سے اختلاف چلا آ رہا ہے۔ حضرت مولانا سید انور شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں :-

جاہلیت کے اعتقاد میں موت پر "توفی" کا اطلاق درست نہ تھا کیونکہ اُن کے اعتقاد میں نہ بقائے جسد تھی، نہ بقائے روح۔ توفی وصُول کرنے کو کہتے ہیں، ان کے عقیدے میں موت توفی نہیں ہو سکتی۔ قرآن مجید نے موت پر توفی کا اطلاق کیا اور بتلایا کہ موت سے وصُول یابی ہوتی ہے نہ فنا محض۔ اس حقیقت کو ایک کلمہ سے عیاں کر دیا اور کہیں اس لفظ کا اطلاق اپنے اصلی معنی سے جسد مع الرّوح کے وصُول کرنے پر کیا۔[2]

عربوں کے تصوّرِ موت کو جب اسلام کے قرنِ اوّل ہی سے نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ تو اب موت سے متعلقہ مباحث پر معنیٔ موت کے لیے کلامِ عرب کا مطالبہ ہم نہیں سمجھتے کہ کون سی شانِ تحقیق ہے۔ حالانکہ وہاں بھی صرف "ابانة الروح عن الجسد" کا نام موت نہیں ہے بلکہ قوّتِ حیوانیہ کے زوال یعنی آثارِ حیات کے سلب ہونے کو بھی موت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

---

[1] المخصص جلد ۶ صـ ۱۱۵ [2] مقدمہ مشکلات القرآن صـ ۲۷

علامہ راغب اصفہانی (۵۰۲ھ م) لکھتے ہیں:۔

کل نفس ذائقة الموت فعبارة عن زوال القوة الحیوانیه و ابانة الروح عن الجسد۔[1]

ترجمہ۔ ہر جان نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے پس موت سے مراد۔ ۱۔ حیات کی قوت زائل ہونا اور ۔ ۲۔ روح کا جسد سے جُدا ہونا ہے۔

یہاں موت صرف روح کی جُدائی کو نہیں کہا گیا، اس کے ساتھ قوت حیوانی کا زائل ہونا بھی بیان کیا ہے۔ قرآن کریم نے موت اسی کو کہا ہے

قرآن کریم کی روشنی میں موت کی حقیقت

اللہ یتوفی الانفس حین موتھا والتی لم تمت فی منامھا فیمسک التی قضی علیھا الموت ویرسل الاخریٰ الیٰ اجل مسمی۔ (پ۲۴: الزمر ع ۵ آیت ۴۲)

ترجمہ۔ اللہ کھینچ لیتا ہے جانیں جب وقت ہو ان کے مرنے کا اور جو نہ مریں ان کو کھینچ لیتا ہے ان کی نیند میں پھر روک لیتا ہے ان کو جن پر مرنا ٹھہرا دیا اور چھوڑ دیتا ہے دوسری روحوں کو ایک وقت مقرر تک۔ اس بات میں پتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو دھیان کریں۔

یہ آیت بتلاتی ہے کہ روح قبض ہونے کے باوجود ضروری نہیں کہ موت ہو، سونے والے کی روح قبض ہونے کے باوجود اس کے آثارِ حیات قائم ہیں، نبضیں تک اُچھل رہی ہیں اور روح کے چار گھنٹے باہر رہنے کے باوجود اس کا بدن ٹھنڈا نہیں پڑا، نہ اکڑا ہے، نہ کسی نے اسے دفن کے لیے پکڑا ہے۔

یہ تو نائم کا حال ہے۔ خود میت کو دیکھئے، جونہی روح نکلی بدن فوراً ٹھنڈا نہیں پڑ جاتا، روح کے آثار کچھ دیر کے لیے اور رہتے ہیں اسی لیے یہ بدن کچھ گرم رہتا ہے پھر آہستہ آہستہ ٹھنڈا پڑ جاتا ہے اور اکڑ جاتا ہے، بدن کی وہ تازگی باقی نہیں رہتی۔ اب موت کا پورا تحقق ہو چکا اور

حسب بیان راغب اصفہانی انفکاک الروح عن الجسد بھی ہوا اور قوت حیاتی بھی جاتی رہی۔

اب اگر کوئی ایسا کہیں ہو کہ روح تو قبض ہو جائے لیکن بدن کی تازگی ختم نہ ہو، گھنٹے گزر جائیں مگر بدن نہ اکڑے، پھر دفن کے بعد بھی وہ تازگی رہے اور اسی پر صدیاں گزر جائیں تو یہاں کیا کہا جائے گا؟

یہی ناکہ یہ موت کچھ عجیب سی ہے کہ قبض روح بھی ہو چکا، روح بدن سے جدا ہو کر ایک جگہ سمٹ چکی اور کچھ آثارِ حیات اب تک باقی ہیں۔ علامہ برہان الدین المرغینانی (۵۹۳ھ) لکھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بدن مبارک پانچ صدیاں گزرنے کے بعد آج بھی اسی حالت میں ہے جیسا کہ اسے قبر میں رکھا گیا تھا:۔

وھوالیوم کما وضع[1]

قاضی شمس الدین صاحب (گوجرانوالہ) اس کی تشریح میں لکھتے ہیں:۔

جسم مبارک صحیح وسالم گلاب کے پھول کی طرح تروتازہ تھا۔ آج بھی وہی کیفیت اور قیامت تک وہی کیفیت رہے گی[2]

سوال: قاضی صاحب جب تسلیم کرتے ہیں کہ آپ کے جسدِ اطہر میں کچھ آثارِ حیات اب تک باقی ہیں وہ ایک لمحہ کے لیے بھی بدن اطہر سے نہیں ہٹے تو لوگ انہیں منکرین حیات میں کیوں ذکر کرتے ہیں؟

جواب: یہ تو صحیح ہے کہ اُن کا عقیدہ پیر طریقت والا نہیں لیکن یہ عبارت جو ہم نے پیش کی ہے وہ انہوں نے اپنے عقیدے کے طور پر نہیں کہی۔ انہوں نے صاحب ہدایہ کی بات اپنے لفظوں میں ادا کی ہے۔ اس کے آخر میں فرماتے ہیں۔ یہ ہے ہدایہ کی عبارت کا مطلب۔

معلوم ہوا صاحب ہدایہ صرف اس کے قائل نہیں کہ بدن محفوظ ہو، مٹی میں ریزہ ریزہ نہ ہو۔ بلکہ وہ بدن کی تازگی کے بھی قائل ہیں اور یہ بدوں اس کے نہیں کہ کچھ آثارِ حیات آپ میں آخر تک باقی رہے اور ہیں۔ سو اگر اسے ایک نرالی موت سمجھا جائے یا یوں کہا جائے کہ انبیائے کرام کی موت کی نوع ہی جدا ہے۔ تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ یا یوں کہا جائے کہ آپ کی موت بھی واقع ہوئی اور کسی

---

[1] ہدایہ باب الجنائز جلد ۱ صفحہ ۱۶۱ [2] مسالک العلماء صفحہ ۹۸

درجے میں حیات بھی باقی رہی اور آپ کی موت ساتر حیات ہوئی یہ نہیں کہ اس سے آثارِ حیات کلیۃً منتفی ہوئے

یہ کہنا کہ ہمیں موت کے یہ معنی کلامِ عرب میں نہیں ملتے۔ اسے کوئی شخص جسے یہ علم ہو کہ مفہومِ موت پر اسلام کا ذہن جاہلیت سے شروع ہی سے مختلف ہو گیا تھا، اہمیت نہ دے گا۔ قرآن کریم نے بتایا ہے موت صرف مفارقتِ روح کا نام نہیں، یہ توفیتہ میں بھی ہوتا ہے۔ جب تک پورے آثارِ حیات منتفی نہ ہوں وہ موت نہیں اور راغب نے یہی بات کہی ہے۔ حضورؐ سے بعض آثارِ حیات چونکہ آخر تک منتفی نہ ہوئے بلکہ اب تک باقی ہیں۔ تو اگر اُسے ایک جدی نوعِ حیات کہہ دیا جائے تو معلوم نہیں کون سا آسمان گرتا ہے۔ علامہ محمد بن احمد بن عبد الہادی (۷۴۴ھ) لکھتے ہیں:۔

والحیاۃ جنس تحتہا انواع وکذالک الموت فاثبات بعض انواع الموت لاینافی الحیوۃ۔[۱]

دوستوں کا عذرِ لنگ

بعض کرم فرما یہ کہہ کر بات ٹالتے ہیں کہ نیند کی حالت میں روح نہیں نکلتی۔ قرآن پاک نے جو یہ دعوے کیا ہے یہ متشابہات میں سے ہے۔ ہم کہتے ہیں اگر یہ آیت متشابہات میں سے ہوتی، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعا میں اس آیت کی پیروی نہ کرتے۔ امام بخاری کتاب الدعوات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نیند کے وقت کی یہ دعا نقل کرتے ہیں۔

باسمك ربي وضعت جنبي وبك ارفعه ان امسكت نفسي فارحمها وان ارسلتها فاحفظها بما تحفظ به الصالحين۔[۲]

ترجمہ: تیرے ہی نام پر اے میرے رب! میں نے اپنا پہلو رکھا ہے اور تیرے سہارے ہی میں اسے اٹھاؤں گا اگر تو میری جان کو روکے رکھے تو اس پر رحم فرما اور اگر اسے واپس بھیج دے تو اس کی حفاظت فرما۔ جیسے تو اپنے بندوں کی حفاظت کیا کرتا ہے۔

اس حدیث سے پتہ چلا کہ واقعی نیند کے وقت روح نکلی ہوتی ہے جس کے بعد یہ پھر آجاتی ہے

---

[۱] الصارم المنکی ص۱۸۵ [۲] صحیح بخاری جلد ۲ ص۹۳۵

اور موت والے کے لیے یہ واپس نہیں آتی (برزخ میں روح کا بدن میں واپس آنا یا میدان حشر میں روح کا بدن میں واپس آنا، یہ اس آیت کے خلاف نہیں ہے) یہاں جو اس کے روکے رکھنے کی خبر دی گئی ہے یہ صرف اسی دنیا کی بات ہے کہ اس دنیا میں اب روح بدن کی طرف واپس نہ کی جائے گی۔ امساک کا تعلق اسی جہان سے ہے جس سے ارسال کا تعلق ہے۔ ظاہر ہے کہ نیند والے کی روح اسی جہان میں بدن کی طرف لوٹتی ہے نہ کہ کسی اور جہان میں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ موت کی حقیقت صرف ابانۃ الروح عن الجسد نہیں۔ آثار حیات جب تک پورے منتفی نہ ہوں، قرآن کریم سے موت نہیں کہتا۔ الا یہ کہ کوئی جدا نوعیت موت ہو اور یہ موت کی کوئی اور نوع ہو۔

پہلے دور میں کیا مفہوم موت پر اختلاف نہیں ہوا؟ کیا معتزلہ نے موت کے عدمی ہونے کا دعویٰ نہیں کیا؟ کشاف اٹھا کر دیکھیں۔ اور کیا اہل سنت نے اس کی کھلی تردید نہیں کی، الانتصاف اٹھا کر دیکھیں۔

سوال : نیند والے کی طرف روح کا لوٹنا جسے قرآن کریم نے لفظ ارسال سے بیان فرمایا ہے کہ نیند والے کی روح روکی نہیں جاتی، چھوڑ دی جاتی ہے۔ کیا کہیں اسے احیا (زندہ کرنے) سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ اگر نہیں تو معلوم ہوتا ہے نیند سے حقیقت موت واقع نہ ہوئی تھی؟

جواب : سنن نسائی کی روایت میں اس ارسال کے لیے احیاء کا لفظ بھی وارد ہے۔ حدیث شریف کے الفاظ یہ ہیں :-

اللّٰھم انت خلقت نفسی وانت توفاھا لك مماتھا ومحیاھا ان احییتھا فاحفظھا وان امتھا فاغفر لھا۔[1]

ترجمہ : اے اللہ! تو نے مجھے پیدا کیا اور تو ہی میری جان کی توفی کرے گا میری موت اور زندگی سب تیرے لیے ہیں اگر تو میری جان کو زندگی بخشے تو اس کی حفاظت فرما اور اگر تو اسے موت دے تو اس کی مغفرت فرما۔

---

[1] عن عبد اللہ بن عمرؓ مرفوعاً۔

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے اسے فتح الباری میں نقل کیا ہے اور ابن حبان سے اس کی تصحیح نقل کی ہے[1]

حضرت ابوہریرہؓ کی ایک روایت میں اس جاگنے پہ ردِ روح کے الفاظ بھی ملتے ہیں ،

الحمد للہ الذی عافانی فی جسدی ورد علی روحی[2]

ترجمہ: حمد کے لائق وہ ذات ہے جس نے میرے جسد کو عافیت بخشی اور اس میں میری روح پھر سے لوٹا دی.

امام ترمذی نے اس کی سند کو حسن کہا ہے.

امام نووی کہتے ہیں، اس حدیث کی سند صحیح ہے. حافظ ابن حجر عسقلانی بھی کہتے ہیں کہ اس کی سند حسن ہے[3]

ان تفصیلات سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام نے اپنے طور پہ موت کا ایک مفہوم متعین کیا ہے اور اسلام اس اطلاق میں ذہنِ جاہلیت کا تابع نہیں ہے اور نہ ان حقائق کے لیے وہ اشعار جاہلیت کا محتاج ہے.

نظریۂ قرآن میں موت کیا ہے؟

موت ایک ایسی صفت ہے، جو صفت "حیات" کے تغیر پہ بدن کو عارض ہوتی ہے یہ فقط روح کے بدن سے جدا ہونے کا نام نہیں، بلکہ ایک وجودی شئے ہے جس کی اپنی تخلیق ہے.

خلق الموت والحیات. (پ۲۹ الملک)

ترجمہ. اللہ تعالیٰ نے موت کو بھی پیدا کیا اور حیات کو بھی.

پس جب موت کی اپنی ایک خلقت ہے، تو اُسے محض روح و بدن کی مفارقت سے تعبیر کرنا اور محض ایک امر عدمی قرار دینا کس طرح درست ہو سکتا ہے؟

---

[1] فتح الباری جلد ۲۳ ص۱۴۹ [2] جامع ترمذی جلد ۲ ص۷۶ [3] کما فی فیض القدیر جلد ۱ ص۲۸

امام ناصر الدین احمد بن محمد بن المنیر الاسکندری المالکی (۶۸۳ھ) فرماتے ہیں :۔

ان الموت عدم وهو خطاء صراح ومعتقد اهل السنة انه امر وجودی یضاد الحیاة وکیف یکون العدم بهذه المثابة ولو کان العدم مخلوقاً حادثاً وعدم الحوادث مقرراً ازلاً للزم قطع الحوادث[1]

ترجمہ: موت کو محض ایک عدمی شئے قرار دینا ایک کھلی ہوئی خطا ہے۔ اہل سنت کے عقیدے میں یہ ایک امر وجودی ہے، جو حیات کے مقابل ہے۔ عدمی شئے اس درجے میں نہیں ہو سکتی۔ اگر عدمیات کی بھی خلقت ہوتی ہو اور وہ حادث ہوں اور عدمِ حوادث کا تقرر بھی ازلی ہو تو اس سے قطعِ حوادث لازم آتا ہے۔

روح المعانی میں ہے :۔

والموت علی ما ذهب الیه الکثیر من اهل السنة صفة وجودیة تضاد الحیاة واستدل علی وجودیته بتعلق الخلق به وهو لا یتعلق بالعدمی لازلیة الاعدام[2]

ترجمہ: جمہور اہل سنت کے نزدیک موت ایک صفتِ وجودی ہے، جو حیات کے مقابل ہے اور اس کے وجودی ہونے کا استدلال اس فعلِ خلق سے متعلق ہونے سے ہوتا ہے۔ کیونکہ فعلِ خلق عدمی چیزوں سے متعلق نہیں ہوتا، عدمیات تو ازلی ہیں۔

امام رازیؒ لکھتے ہیں :۔

واختلفوا فی الموت فقال قوم انه عبارة عن هذه الصفة وقال اصحابنا انه صفة وجودیة مضادة للحیاة واحتجوا علی قولهم بانه تعالی قال الذی خلق الموت والحیاة والعدم لا یکون مخلوقاً هذا هو التحقیق.

---

[1] الانتصاف جلد ۳ صفحہ ۲۰۳ مصر [2] روح المعانی جلد ۲۹ صفحہ ۴ مصر [3] تفسیر کبیر جلد ۸ صفحہ ۱۷۰

والموت عند اصحابنا صفة وجودية مضادة للحياة۔ [1]

ترجمہ مفہوم موت پر بہت پہلے سے اختلاف چلا آرہا ہے، بعض اسے عدم حیات سے تعبیر کرتے ہیں اور ہمارے اصحاب (اہل سنت) اس بات کے قائل ہیں کہ وہ (موت) ایک صفتِ وجودی ہے جو حیات کے مقابل ہے۔ اکابر اہل سنت کا استدلال اس ارشادِ قرآنی سے ہے "خلق الموت والحیاۃ" کیونکہ عدمیات کے پیدا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تحقیق یہی ہے کہ موت کوئی عدمی صفت نہیں بلکہ ایک صفتِ وجودی ہے۔

اگر موت عدم کا نام ہو تو خلق کا فعل کس چیز پر واقع ہوگا۔ فتفکر وتدبر۔

موت کا وجود حدیث کی روشنی میں

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

یجمع اللہ الناس یوم القیٰمۃ فی صعید واحدٍ ثم یطلع علیھم رب العٰلمین ۔ ۔ ۔ ۔ فیقوم المسلمون ویوضع الصراط فیمرون علیہ مثل جیاد الخیل و الرکاب وقولھم علیہ سلم سلم ویبقی اھل النار فیطرح منھم فیھا فوج ۔ فاذا ادخل اللہ تعالیٰ اھل الجنۃ الجنۃ واھل النار النار اتی بالموت ملبیا فیوقف علی السور الذی بین اھل الجنۃ واھل النار ثم یقال یا اھل الجنۃ فیطلعون خائفین ثم یقال یا اھل النار فیطلعون مستبشرین یرجون الشفاعۃ فیقال لاھل الجنۃ ولاھل النار ھل تعرفون ھذا فیقولون ھؤلاء وھؤلاء قد عرفناہ ھو الموت الذی وکل بنا فیضجع فیذبح ذبحا علی السور [2]

---

[1] تفسیر ابو السعود ص ۱۹۳ [2] جامع ترمذی جلد ۲ ص ۷۹ دہلی ص ۲۱ لکھنو

ترجمہ. اللہ تعالیٰ تمام لوگوں کو حشر میں ایک جگہ اکٹھا کریں گے. اللہ تعالیٰ ان سے کچھ سوال و جواب کریں گے اور نیک لوگ پل کو عبور کر کے جنت میں پہنچ جائیں گے اور اہل جہنم جہنم میں جاگریں گے. پھر موت کو وہاں لایا جائے گا اور اسے اس دیوار پر کھڑا کیا جائے گا جو اہل جنت اور اہل دوزخ کے مابین ہوگی. پھر فرمائیں گے دیکھتے ہو یہ کیا ہے؟ دونوں کہیں گے، ہاں ہم جانتے ہیں یہ موت ہے جو ہم پر طاری ہوئی تھی. اس وقت اسے لٹایا جائے گا اور اسے ذبح کیا جائے گا...... اس کے بعد موت کسی کو نہ آئیگی.

عن انسؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوتی بالموت یوم القیمۃ کانہ املح فیوقف بین الجنۃ والنار ثم ینادی منادیا اہل الجنۃ فیقولون لبیک ربنا قال فیقال ہل تعرفون ھٰذا فیقولون نعم ربنا ھٰذا الموت فیذبح کما تذبح الشاۃ فیامن ھٰؤلاء وینقطع رجاء ھٰؤلاء رواہ ابویعلیٰ والطبرانی فی الاوسط بنحوہ والبزار ورجالھم رجال الصحیح غیر نافع بن خالد وھو ثقہ[1]

ترجمہ. قیامت کے دن کبش املح کی صورت میں موت کو لایا جائے گا اور جنت اور جہنم کے درمیان کھڑا کیا جائے گا اور اعلان کیا جائے گا کہ جنت والو دیکھو اسے جانتے ہو، وہ کہیں گے یا اللہ ہم جانتے ہیں یہ موت ہے. اس وقت موت ذبح کی جائے گی جیسے کہ بکری ذبح کی جاتی ہے.

اس حدیث کے تمام راوی نافع بن خالد کے سوا سب صحیح بخاری کے رجال ہیں اور نافع بن خالد بھی ثقہ ہے.

ان روایات سے پتہ چلتا ہے کہ موت یہی نہیں کہ ملک الموت آتے اور روح نکال کے جائیں یا نازعات و ناشطات آئیں اور روح نکال لیں. صرف یہی ہو تو یہ ایک عدمی حقیقت ہے مگر حضورؐ نے خبر دی کہ یہ ایک وجودی شئے ہے جو ہر مرنے والے پہ وارد ہوئی تھی اور اسے سب اہل جنت

---

[1] مجمع الزوائد جلد ۱۰ صفحہ ۳۹۵

جنت میں اور سب اہل جہنم جہنم میں پہچانتے ہوں گے ـــــ اگر یہ کوئی وجودی چیز نہیں تو مرنے والوں کو یہ کیا چیز نظر آئی تھی جسے انہوں نے پہچان لیا اور اللہ تعالیٰ نے پھر اسے ذبح کر ڈالا۔ معتزلہ اور کرامیہ مفہوم موت جاہلیت کے اندھیرے میں متعین نہ کرتے اور قرآن و حدیث کی روشنی میں چلتے، تو کبھی نہ کہتے کہ موت صرف اباتہ الروح عن الجسد کا نام ہے اور کچھ نہیں اور یہ کہ کوئی اور اسکی انواع نہیں ہیں۔

ایک سوال

جب موت ذبح کر دی جائے گی اور نیک و بد، جنت و جہنم میں جا چکے ہوں گے تو یہ جو بعض روایات میں ہے کہ جو گنہگار مسلمان جہنم میں ہوں گے۔ ایک موت ان پہ وہاں وارد کی جائے گی۔ تاکہ انہیں نار جہنم کا احساس نہ ہو تو یہ موت کیا اس موت کے علاوہ ہے جو ان پہ وارد ہو گی۔ حدیث کے ان الفاظ پہ غور کریں:-

اذا ادخل اللہ الموحدین النار اماتھم فیھا اماتۃ فاذا اراد ان یخرجھم منھا امتھم الم العذاب تلک الساعۃ[1]

ترجمہ۔ جب اللہ تعالیٰ ان مسلمانوں کو جہنم میں داخل کریں گے تو اللہ تعالیٰ انہیں وہاں موت دے دیں گے جب ارادہ فرمائیں گے کہ انہیں آگ سے نکالا جائے تو اس وقت انہیں یہ عذاب چھوئے گا (اور پھر انہیں جہنم سے نکال دیا جائے گا)۔

(اماتھم فیھا) بمعنی انہ یغیب اجسامھم او یقبض ارواحھم لطفاً منہ بھم واظھاراً لاثر التوحید[2]

ترجمہ۔ اللہ تعالیٰ انہیں وہاں موت دے گا اس کا معنی یہ ہے کہ ان کے جسم وہاں سے غائب ہو جائیں گے اور اللہ تعالیٰ اپنے لطف و کرم سے ان کی روحیں قبض فرمالیں گے یا اس لیے کہ ان پہ توحید کا اثر ظاہر ہو (وہ یہ کہ ان پہ آگ اثر نہ کرے)۔

یہاں اماتھم کا معنی یہ نہیں کہ ان کی روح اُن کے بدن سے نکالی جائے گی۔ یہاں مراد یہ ہے

---

[1] جامع صغیر ص ۲۵ [2] السراج المنیر جلد ۱ ص ۷۹

کہ حق تعالیٰ اُن کے احساس و شعور کو معطل کر دے گا، تاکہ ان کو جہنم کا عذاب محسوس نہ ہو۔

موت تو ذبح ہو چکی، اب یہ تو وہ حقیقت میں زندہ۔ مگر اللہ تعالیٰ ان کی زندگی کے ظاہر آثار اور شعور و احساس کو روک دیں گے۔ یہ بھی ایک قسم کی موت ہے، جسے لسانِ نبوت نے لفظ موت سے تعبیر کیا ہے۔

حقیقتِ موت

موت ایک وجودی چیز ہے جو کسی جسم پر وارد ہوتی ہے۔ موت کی حقیقت انفکاکِ روح یا ازالۂ حیات بتلانا ہمارے دوستوں کو ایک بڑا مغالطہ ہے۔ ازالۂ حیات نہ بھی ہو تو موت وارد ہو سکتی ہے اور ابانۃ الروح پر بھی (جیسے کہ یہ نائم پر وارد ہوتی ہے) تو ضروری نہیں کہ موت ہو جائے روح کا ارسال یا بدن کی طرف عود کرنا پھر ہو سکتا ہے۔ کیا ضرورت پڑی ہے کہ ہمارے دوست موت کا معنی ابانۃ الروح عن الجسد یا ازالۂ حیات ٹھہرا کر معتزلہ کے ذہن سے موت کو ایک عدمی چیز سمجھیں اور قرآن کی نص بھول جائیں کہ موت کی ایک اپنی خلقت ہے، یہ محض ازالۂ حیات کا نام نہیں۔

خلق الموت والحیاۃ لیبلوکم ایکم احسن عملاً۔ (پ۲۹ الملک، آیت ۲)

ترجمہ۔ اس نے پیدا کیا موت کو اور حیات کو۔ تا جانچے تم کو تم میں سے کون اچھے کام کرتا ہے۔

موت کا عدمی معنی (ازالہ حیات) کرنے میں ایک دقت یہ پیش آئے گی کہ موت کے لیے سبق حیات ضروری ہوگا۔ پھر اموات صرف انہیں کو کہا جائے گا، جن میں پہلے حیات رہ چکی۔ اس صورت میں بتوں کو اموات نہیں کہا جا سکے گا کیونکہ ان میں پہلے حیات کبھی نہیں رہی۔ پھر لا یسمع کا معنی بھی یہی ہوگا کہ جو پہلے سنتے تھے اب نہیں سنتے۔ لا یبصر کا معنی یہ ہوگا کہ جو پہلے دیکھتے تھے اب نہیں دیکھتے۔ پہلے کام آتے تھے اب کچھ نہیں کر سکتے۔ پھر یہ کہنا کیسے درست ہوگا۔

لم تعبد مالا یسمع ولا یبصر ولا یغنی عنک شیئا۔

بُت پرستی کی ابتداء بے شک قبر پرستی سے ہوئی لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ صنم پرستی، حجر پرستی، ستارہ پرستی اور سورج اور چاندکی پوجا بھی دُنیا میں ہے اور رہی ہے. قرآن کریم ان سب معبودانِ باطلہ کو اموات کہتا ہے. اگر مسبوقیت الحیاۃ (کہ پہلے ان میں حیات رہی ہو) موت کا لازم اقتضاء ہے اور موت کا معنی ہے. ازالہ حیات تو خود ہی فرمائیں. سورج اور چاند میں، ستاروں اور پتھروں میں پہلے کب زندگی تھی جو اُن کو اب اموات کہا جا رہا ہے کہ اُن کی زندگی جاتی رہی عجیب علم و دانش ہے کہ موت ازالۂ حیات کا نام ہے اور جو ازالہ حیات کے بغیر موت کا اقرار کرے وہ مولانا نانوتویؒ بھی ہو تو ہمارا امام نہیں. ع بریں عقل و دانش بباید گریست

کیف تکفرون باللہ وکنتم امواتًا فاحیاکم (پ البقرہ آیت ۲۸) میں موت کا لفظ حیات کے بالمقابل ہے. یہاں موت کے لیے مسبُوقیت بالحیاۃ نہیں ہے اور موت کا معنی یہاں ازالۂ حیات کا نہیں، یہاں موت سے مراد عدم ہے. حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت مجاہد (۱۱۰ ھ) سے یہی منقول ہے. معلوم ہوا موت کا معنی ازالۂ حیات نہیں، صرف عدم حیات ہے. اُس تعریف پہ معتزلہ کی تائید ہوتی ہے. صحیح یہی ہے کہ موت ایک وجودی چیز ہے. ازالۂ حیات اس کے لیے ضروری نہیں اسی طرح اعادہ روح سے بھی ازالہ اسم موت ضروری نہیں.[1]

ان ھذہ الاعادۃ لیست مستلزمۃ لاثبات حیاۃ مزیلۃ لاسم الموت بل ھی نوع حیاۃ برزخیۃ.

آنحضرتؐ کی موتِ طیّبہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کا عنوان تو آپ نے بارہا سنا ہوگا آج موتِ طیبہ کا عنوان بھی دیکھ لیجیے. طیّب کا لفظ جس طرح آپؐ کی حیات کے لیے ہے، اسی طرح یہ اطلاق آپؐ کی موت کے لیے بھی ہے. حضرت ابوبکر صدیقؓ نے آپؐ کی وفات پہ ان محمّد اقدمات کا اعلان کرنے سے پہلے موتِ طیّبہ کی آواز لگادی تھی. حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے

---

[1] ردالمحتار، شامی جلد ا صفحہ ۳۵۲ [2] الصارم المنکی صفحہ ۱۸۵

حضورؐ کے جسدِ اطہر کو پیشانی پر بوسہ دیا اور کہا۔

طبتَ حیًا و میتًا۔ (آپؐ کی حیات بھی طیب اور موت بھی طیب)[1]

جس طرح آپؐ کے بدنِ اطہر سے زندگی میں خوشبو نکلتی تھی، موت پر بھی وہ جسدِ اطہر اسی طرح خوشبو دے رہا ہے، عروضِ موت نے آپ کی حیات کو صرف زیرِ پردہ کیا ہے۔ آثارِ حیات آپؐ سے منتفی نہ ہوں گے۔ بدن اسی طرح نرم اور تر و تازہ رہے گا۔ اس میں غور کیا جائے تو ماننا پڑتا ہے کہ یہ موت کوئی اور قسم کی ہے اور موت میں اختلاف نوع کا تصور کوئی کفر نہیں ہے کہ اس کی مخالفت کو اشاعت توحید کا نام دیا جائے۔

یہ موتِ طیبہ کیسی تھی یا کیسی نہیں۔ اس بحث میں ہم نہ پڑیں اور انک میت وانھم میتون کی روشنی میں اتنا عقیدہ رکھیں کہ آپ پر موت وارد ہوئی اور اللہ تعالیٰ کا آپ پر موت کا وعدہ پورا ہوا۔ لیکن یہ موت کچھ اس قسم کی تھی کہ نہ صرف کچھ آثارِ حیات باقی رہے، بلکہ بعض اثراتِ ظاہری بھی قائم اور باقی رہے تو ہم نہیں سمجھتے کہ اس سے اسلام کا کون سا ستون ہے جو گرتا ہے اور کون سی شریعت ہے جو بگڑتی ہے۔ موت کا صحیح اقرار تو حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بھی کرتے ہیں اور اگر وہ اسے ساترِ حیات کہتے ہیں اور اس کے کچھ اثراتِ حیات ہم سب تسلیم کرتے ہیں تو پھر ان جزئیات میں الجھنا اور انہیں جنگ کے میدان بنانا کیا کھلی نادانی نہیں۔

اثراتِ حیات جو اجماعاً مسلم رہے

موت کا ایک سریع اور صریح اثر یہ ہے کہ میت کسی چیز کی مالک نہیں رہتی۔ اس کے جملہ اموال اس کی ملک سے نکل جاتے ہیں۔ حضورؐ کے اموال آپؐ کی ملک پہ باقی رہے اور آپؐ کی ملک سے نہ نکلے۔ محدثین نے اپنی کتابوں میں اس مضمون کے باب باندھے ہیں۔

باب کان ماله بعد موته قائمًا علی نفقته و ملکه۔[2]

---

[1] فتح الباری جلد ۱۶ صفحہ ۲۸۱ نقلاً عن ابن ابی شیبۃ۔ [2] سنن کبریٰ امام بیہقی جلد ۷ صفحہ ۶۴

دوسرے لوگوں کے لیے باب یہ بند ہا ہے:۔

ترجمہ: جب آدمی مرجائے تو اس کے مال پر اس کا ملک نہیں رہتا۔[1]

امام بخاریؒ کتاب الفرائض میں حضرت ابوہریرہؓ سے حضورؐ کی یہ حدیث لائے ہیں:۔

لا تقتسم ورثتی دینارًا ما ترکت بعد نفقة نسائی ومؤنة عاملی فهو صدقة۔[2]

ترجمہ: میرے وارث مال آپس میں تقسیم نہ کریں گے اپنی بیویوں کے نفقہ اور اپنے عامل کی مزدوری کے بعد میں جو کچھ چھوڑوں وہ صدقہ ہے۔

(۱) اُمہاتُ المؤمنینؓ کا خرچہ تو سالہا سال تک چلنے والی بات ہے۔ آپ کے اموال بعد وفات بھی آپ کی ملکیت میں رہیں اور آپ کی طرف سے آپ کی ازواج اپنا خرچہ حاصل کریں اور آپ کے عامل اس سے اپنی اُجرت لیں تو یہ آپ کے اموال کا آپ کی مِلک میں باقی رہنا بتاتا ہے کہ اثباتِ حیات میں سے یہ اثر باقی ہے کہ آپ کے اموال آپ کی ملک میں رہے۔

(۲) فوت شدہ کی بیوی تا انقضائے عدت متوفی کے مال میں حقدار ہے اس کے بعد نہیں پھر اس کا خرچہ اس کے والدین دیں یا اس کے بیٹے، اب یہ مرحوم خاوند کے ذمہ نہیں۔ حضورؐ کی ازواج کے لیے یہ عدت نہیں۔ وہ تا زندگی حضورؐ کے اموال میں حقدار ہیں۔ یہ بھی تبھی ہو سکتا ہے کہ حضورؐ کے اموال آپ کی ملک پر باقی رہیں۔

(۳) موت کا وقت اور موت کے بعد کا وقت میت کے حق میں وصیت کے باب میں برابر ہے اسے اپنے مال میں کوئی حق باقی نہیں رہتا۔ حضرت مصعب بن سعدؓ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں:۔

میں بیمار تھا، میں نے حضورؐ کے پاس کسی کو بھیجا کہ کیا میں اپنے کل مال کی وصیت کر سکتا ہوں جہاں چاہوں۔ آپؐ نے اس پر نہ کہی۔ میں نے کہا نصف کی وصیت کروں آپؐ نے اس پر بھی انکار فرمایا ـــــ پھر میں نے ثلث (تہائی) کے لیے کہا، آپ اس پر خاموش رہے۔

---

[1] مجمع الزوائد جلد ۴ ص۲۲۶ [2] صحیح بخاری جلد ۲ ص۹۹۶

لیجئے ذرت ہونے والا خود اپنے مال کے نصف حصّے کا مالک نہیں رہا، اسے اُس کے وارث لیں گے۔ یہ مال گویا اب اس کی ملک میں نہیں رہا۔

مرضت فارسلت الی النبیؐ فقلت دعنی اقسم مالی حیث شئت فابی قلت فالنصف فابی۔[۱]

اُدھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھئے، ازواجِ مطہراتؓ کے خرچہ اور خادم کی اُجرت کے بعد جو بچے اسے علی صدقہ فرما دینے کے حکم سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے اموال اس حالت کے باوجود آپ کی ملک سے نہیں نکلے۔

عام انسان ایسے وقت میں اپنے مال سے بے تعلق ہو جاتا ہے یہ کیوں؟ بوجہ موت کے موت تمام علائق دُنیوی کو ختم کر دیتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے املاک باوجود وفات اُن کی ملک میں ہیں اور آپؐ اس سے اپنے اخراجات جاری رکھنے کا حکم دیتے ہیں۔ تو اگر مختلف مسائل پہ اتنی بات کہہ دی جائے کہ آپ کی موت طیبہ عام انسانوں سے کچھ مختلف تھی اور اس میں موت کا انکار بھی نہ ہو تو محض اتنی بات سے اپنے اسلاف کا استہزاء اور اپنے عوام کی تشغیب ہم نہیں سمجھتے۔ اسلام کی کون سی خدمت ہے اور کس پہلو سے اسے ایک نیکی سمجھا جا رہا ہے۔

موت کے بارے میں اہلِ دانش بہت کچھ کہہ چکے اور کہتے رہیں گے۔ موت کی حقیقت پر اہلِ تحقیق نے بہت گردپیمائی کی ہے۔ بات کو اُلجھانے سے بچانا ناگزیر سمجھئے۔ موت ایک ایسی صفت ہے جو صفتِ حیات کے تغیر پر بدن کو لاحق ہوتی ہے۔ اگر صفتِ حیات اپنے موصوف کے حق میں صفتِ عرضی ہے تو اُس کے زوال پر موت کا ورود ہوتا ہے اور اگر صفتِ حیات اپنے موصوف کے حق میں ذاتی ہو تو پھر دو صورتوں سے خالی نہیں، قابلِ تغیر ہے (جس کا پتہ ہمیں اس سے چل سکتا ہے کہ اس کی کیفیت میں پہلے بھی کبھی ظہور و خفا کا انقلاب آیا ہو) یا ناقابلِ تغیر۔ اگر قابلِ تغیر ہے تو پھر صفتِ حیات کے معرضِ خفا میں آنے یا مستور ہونے پر یہ صفتِ موت بدن کو لاحق

---

[۱] صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۴۰

ہوگی۔ اور اگر ناقابلِ تغیر ہے تو پھر اس پہ ورودِ موت محال ہے۔ پھر وہ حیات دائمہ ازلیہ ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اتنی تدقیق میں جانے کی ضرورت نہیں۔ جمہورِ اہلِ سنت مفہومِ موت کی اس گہرائی میں نہیں گئے۔ ایسی حیاتِ ذاتی جس کی کیفیات ظہور وخفا میں قابلِ تغیر ہوں اور اس کی ذاتیت بھی اضافی ہو، ازلی نہ ہو۔ اس کا مرتبہ ومصداق پوری کائنات میں ایک ہی ذات ہے جو باعثِ تکوینِ عالم اور خلاصہ کائنات ہے۔ اس لیے لسانیات کی دنیا میں مفہومِ موت کا یہ پہلو اتنا شائع وذائع نہ ہوسکا اگر موت کو اسی عام معنی میں لیا جائے کہ موت روح کے بدن سے جدا ہونے کو کہتے ہیں تو عوامی سطح پہ اسے قبول کرنے میں بھی کوئی ممانعت نہیں۔

اس تفصیل سے ہمارا مدعا یہ ہے کہ ان باریک حقائق میں الجھنا اور خواہ مخواہ کسی ایک پہلو کو معرکہ بحث بنانا، کوئی ایسی بات نہیں، جس پہ نجات کا یا کم از کم مسئلہ حیات النبیؐ کے ثبوت یا عدم ثبوت کا مدار ہو۔ موت کو اگر اسی عام معنی میں لے لیا جائے، جو جمہور کی رائے ہے تو بھی مسئلہ زیرِ بحث میں مقصود وکلام قطعاً متاثر نہ ہوگا۔ ہاں یہ پیشِ نظر ہے کہ روح کے بدن میں مقید رہنے کا نام ہی حیات نہیں۔ روح بدن سے نکل جاتے، لیکن اس کا کوئی خاص تعلق یا اثر بدن کے ساتھ قائم رہے تو بایں صورت بھی بدن کو صفتِ حیات حاصل رہے گی۔ محقق ابن ہمامؒ کے بیان سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہاں روح اور حیات میں تلازمہ نہیں، تاثیر وتعلق بھی وجودِ حیات کے لیے کافی ہے۔ متن فقہِ اکبر میں جو یہ جزئیہ داخل عقائد ہے کہ:۔

اعادة الروح الی العبد حق۔[1]

ترجمہ۔ بندے کی طرف (قبر میں) روح کا لوٹایا جانا برحق ہے۔

ممکن ہے اس میں حرف "الی" اسی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہو کہ روح کو بدن میں لوٹانا ضروری نہیں۔ بدن کی طرف لوٹانا ہی اس حیات فی القبر کے لیے کافی ہے۔ جس پہ سوال نکیرین

---

[1] شرح فقہ اکبر ص ۱۲۰

اور ازاں بعد ادراکِ اَلم ولذت کے احکام مرتب ہو سکیں۔

واللہ اعلم بالصواب وعلمہٗ اتم واحکم فی کل باب۔

موت کا شرعی مفہوم

یاد رکھئے موت فنائے محض کا نام نہیں۔ وہ اختلافِ دارین کے تحقق کا نام ہے کہ انسان اس عالمِ دُنیا سے دوسرے عالم میں چلا جائے۔ علامہ عینیؒ (۸۵۵ھ) لکھتے ہیں:

الموت لیس بعدم انما ھو انتقال من دار الی دار۔[1]

ترجمہ: موت ایک عدمی چیز نہیں، بلکہ وہ تو ایک عالم سے دوسرے عالم میں منتقل ہو جانے کا نام ہے۔

لیس بعدم محض ولا فناء صرف۔[2]

ترجمہ: موت ہرگز عدمِ محض اور فنائے خالص کا نام نہیں۔

حجۃ الاسلام حضرت امام غزالیؒ کے الفاظ میں "ایک لباس اُتار کر دوسرا لباس پہننے" کا نام موت ہے ۔

موت کیا ہے یہ راز کھُل ہی گیا ! زندگی اِک رُخ بدلتی ہے
اس کنارے سے اُس کنارے تک جیسے اِک موج جا نکلتی ہے

جاننا چاہیئے کہ کفارِ عرب کی طرح موت کے متعلق قرآن عزیز کا نظریہ فنائے کامل کا نہیں انبیاء وصلحاء تو درکنار کُل بنی آدم ذائقہ موت چکھنے کے بعد پھر انہی اجسام عنصریہ کے ساتھ زندہ کئے جائیں گے۔ اگر آخرت میں یہ جسمانی زندگی محلِ استبعاد نہیں، تو اگر اللہ تعالیٰ بعض نفوسِ قدسیہ کو عالم برزخ ہی میں یہ جسمانی زندگی عطا فرما دیں تو اس میں کون سا استبعاد ہے۔ اگر آپ کی عقل اس کا ادراک نہیں کر سکتی تو عالم آخرت کی عنصری حیات کا ادراک بھی تو کوئی کم کٹھن منزل نہیں، وہ

---

[1] عینی علی البخاری جلد ۲ صفحہ ۲ [2] بشری الکئیب صفحہ ۱۶

کیسے ہوگا. فتفکروا یا اولی الابصار.

قرآن عزیز کہتا ہے:۔

وقالواء اذا کنا عظاما و رفاتاء انا لمبعوثون خلقا جدیدا ہ قل کونوا حجارۃ او حدیدا او خلقا مما یکبر فی صدورکم ج فسیقولون من یعیدنا ط قل الذی فطرکم اول مرۃ ج (پ۱۵ بنی اسرائیل)

ترجمہ۔ اور کہتے ہیں کہ جب ہم ہڈیاں اور چورا چورا ہو جائیں گے، کیا پھر نئے سرے سے بن کر اٹھیں گے؟ آپ کہہ دیجئے کہ تم پتھر ہو جاؤ یا لوہا یا کوئی اور خلقت، جس کو تم اپنے دلوں میں مشکل سمجھ لو۔ پھر پوچھیں گے، کون ہمیں دوبارہ زندہ کرے گا؟ فرما دیجئے، جس نے تمہیں پہلی بار پیدا کیا۔

پھر فرمایا:۔

کما بدأنا اول خلق نعیدہ ط وعدا علینا انا کنا فاعلین۔

(پ۱۷: انبیاء).

ترجمہ۔ جیسے ہم نے پہلے بنایا تھا، اسی طرح پھر اُس کو لوٹائیں گے، ہمارا ضرور وعدہ ہے، ہمیں پورا کرنا ہے۔

جن ذرات کو مٹی کھا چکی، وہ کہاں سے آئیں گے؟ فرمایا:۔

قد علمنا ما تنقص الارض منھم وعندنا کتاب حفیظ (پ۲۶ ق)

ترجمہ۔ ہمیں معلوم ہے جو زمین کھا رہی ہے اُن میں سے، اور ہمارے پاس پورا ریکارڈ محفوظ ہے۔

پھر ارشاد ہے:۔

من یحی العظام وھی رمیم ہ قل یحییھا الذی انشأھا اول مرۃ ط وھو بکل خلق علیم ہ (پ۲۳: یٰسین)

ترجمہ۔ کون ان ہڈیوں کو ریزہ ریزہ ہونے کے بعد پھر زندہ کر دے گا؟ ——
آپ فرما دیجئے، وہی انہیں دوبارہ زندہ کر دے گا جس نے انہیں پہلی بار بنایا
تھا اور وہ سب بنانا جانتا ہے۔

کفار و مشرکین کو حیرت تھی کہ ہڈیوں کے ریزہ ریزہ ہونے کے بعد پھر حیاتِ انسانی کیسے ان ذرّوں میں عود کر آئے گی؟ ربّ العزت نے فرمایا، یہ ریزے اور چورا تو بہر حال انسانی لاش ہے، جس میں بیشتر زندگی رہ چکی ہے اور خود مٹی کے ذرات میں بھی آثارِ حیات کا پیدا ہونا چنداں مستبعد نہیں۔ میں اس سے بڑھ کر تمہیں اجازت دیتا ہوں کہ ہڈیوں کا چورا نہیں، اگر ممکن ہے تو پتھر میں تبدیل ہو جاؤ یا لوہا بن جاؤ، جو آثارِ حیات قبول کرنے کی بظاہر صلاحیت نہیں رکھتے، بلکہ ان سے بھی کوئی زیادہ سخت چیز، جس کا زندہ ہونا تمہیں لوہے اور پتھروں سے بھی زیادہ مشکل نظر آئے، بن کر دیکھ لو۔ حتیٰ کہ موت مجسم بھی بن جاؤ، تو اس قادرِ مطلق کے لیے تمہیں پھر اسی جسدِ عنصری سے زندہ کر دینا کوئی مشکل نہیں۔

ایک سوال

یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ قرآن پاک میں جہاں جہاں بھی حشرِ آخرت کا ذکر ملتا ہے، وہاں ہڈیوں کے چورے اور ذراتِ منتشرہ کو پھر سے جمع کرنے اور زندہ کرنے کا ذکر ملتا ہے۔ جہاں اجمال ہے، وہاں بھی یہ مفہوم منطوی ہے، گویا کہ حشرِ آخرت کے لیے زمین یہی ہے کہ ریزہ ریزہ ہڈیاں اور ذراتِ منتشرہ پھر سے اُٹھائے جائیں۔ پس جب اس دن انبیاء بھی اُٹھائے جائیں گے، تو ان کی یہ بعثت ذراتِ منتشرہ اور عظامِ رمیم سے کیوں نہ ہوگی۔ حدیث شریف کے اس مضمون سے کہ "زمین پر حرام ہے کہ انبیاء کے جسموں کو مٹی بنائے" ان کا اجسادِ سالمہ سے اُٹھایا جانا، کیا قرآن پاک کے ان مضامین کے خلاف نہیں، جہاں "حشرِ آخرت" ہڈیوں کے چورے اور ذراتِ منتشرہ پر مبنی ہے؟

اگر انبیاء اس عموم سے مستثنیٰ ہیں تو کیا اس تخصیص کے لیے اتنے درجے کی قوی دلیل موجود ہے جتنے درجے کی قوی اصل یہ ہے کہ حشر آخرت، ذراتِ منتشر اور عظام رمیم سے ہوگا۔

جواباً عرض ہے کہ انبیاء کے اجساد مٹی نہیں ہوتے۔ اس کی شہادت قرآن مجید میں بھی موجود ہے۔ حضرت عزیر علیہ السلام ایک بستی پر سے گزرے جو چھتوں پر گری پڑی تھی۔ آپ کے دل میں آیا، اللہ تعالیٰ اس بستی کو پھر سے کیسے اُٹھائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر اور ان کی سواری پر موت طاری کر دی اور سو سال اسی حال میں گزر گئے۔ اُن کا گدھا مٹی میں ہڈی ہڈی ہو چکا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو پھر سے اُٹھایا اور فرمایا :۔

وانظر الیٰ حمارك ولنجعلك اٰية للنّاس وانظر الى العظام كيف ننشزها ثم نكسوها لحما۔ (پ۳ البقرہ ع ۲۴)

ترجمہ۔ اور تو دیکھ اپنے گدھے کو اور تاہم تجھے لوگوں کے لیے ایک نشان بنائیں اور تو (گدھے کی) ان ہڈیوں کی طرف دیکھ کس طرح ہم انہیں اُبھار کر جوڑتے ہیں اور انہیں گوشت پہناتے ہیں۔ پھر جب اس پر یہ حال ظاہر ہوگیا تو اُس نے کہا مجھے معلوم ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔

دیکھئے گدھے کا جسم تو ریزہ ریزہ ہوگیا، مگر حضرت عزیر علیہ السلام پر سو سال کی موت نیند جیسی تھی۔ ان کا بدن پُوری طرح محفوظ رہا۔ اللہ نے حرام کر دیا کہ انبیاء کے جسموں کو کھائے۔

حضرت عزیر علیہ السلام کے فوت شدہ پڑے رہنے کے لیے قرآن کریم نے لبثت (آپ رہے) کے الفاظ اختیار کیے ہیں اور اصحاب کہف کے سوئے پڑے رہنے کو بھی قرآن کریم نے ولبثوا فی کھفهم ثلثة مائة سنين (پ۱۵ الکھف ع ۴) سے تعبیر کیا ہے جس طرح سوئے ہوئے اصحاب کہف کو پتہ نہیں چلا کہ وہ کتنا عرصہ سوئے رہے۔ حضرت عزیر علیہ السلام کو بھی پتہ نہ چلا کہ وہ کتنا عرصہ اس حال میں پڑے رہے۔ سو صورتحال سے بے خبری نہ یہاں عدم حیات کی دلیل ہے اور نہ وہاں۔

تاہم یہ بات واضح ہے کہ حضرت عزیر علیہ السلام کا جسد محفوظ رہا اور گدھے کی لاش ریزہ ریزہ ہو گئی۔ حضرت عزیر علیہ السلام کی موت گویا ایک نیند تھی جو اُن پر سو سال تک وارد رہی۔ اس دوران وہ اپنی چھپی زندگی کو نہ پا سکے۔ جس طرح اصحاب کہف کو اپنی زندگی کا کچھ پتہ نہ رہا۔ حالانکہ وہ طبعاً زندہ تھے۔ کھانا پینا یہاں زندگی کا نشان ہے۔ حضرت عزیر علیہ السلام کا کھانا نہ سڑا، نہ باسی ہوا۔ کھانے میں زندگی رہی تو ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ نے کھانے والے کو بھی کوئی مخفی حیات دے رکھی ہو۔ جس کا انہیں خود بھی پتہ نہ رہا ہو۔ انبیاء کا بنیہ جنت کی مٹی سے ہوتا ہے اور یہاں کی مٹی جنت کی مٹی پر غالب نہیں آسکتی۔

حضرت عزیر علیہ السلام کے اس واقعہ میں اس بات پر قوی شہادت موجود ہے انبیاء کے اجساد مٹی کے ساتھ مٹی نہیں ہوتے۔ وہ مٹی سے ملتے تو ہیں مگر مٹی نہیں ہوتے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام وفات کے بعد مدتوں لاٹھی کے سہارے کھڑے رہے، جب لاٹھی کو کیڑا لگ گیا اور وہ ٹوٹ گئی تو حضرت سلیمان علیہ السلام کا جسد زمین پر آگرا۔ اسے کیڑا کیوں نہ لگا؟ اس لیے کہ یہ اللہ کے نبی تھے اور اللہ تعالیٰ نے اس زمین پر حرام کر رکھا ہے کہ نبیوں کے اجساد کو کھائے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے گرنے سے اُنکی ہڈی تک نہ کھنکھنائی، نہ ٹوٹی۔ خشک اور سوکھی ہڈی گرنے سے ٹوٹ جاتی ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کا جسدِ مبارک نرم اور تر و تازہ رہا۔ اس دنیا کے موسمی اثرات اس پر نہ اُترنے پائے۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ اُن کی روح مبارک کے آثار باقیہ اب تک جسد کو محیط تھے فقہاء لکھتے ہیں حضورؐ کا جسدِ اطہر قبر مبارک میں آج بھی اس طرح تر و تازہ اور نرم ہے جیسے کہ اس کو رکھا گیا تھا۔

فلما خر تبینت الجن ان لو کانوا یعلمون الغیب ما لبثوا فی العذاب المھین۔ (پ ۲۲: السبا: ع ۲)

ترجمہ: پھر جب وہ زمین پر آگرا، تو جنوں کو پتہ چل گیا کہ اگر وہ غیب جانتے تو کیوں اتنی کڑی محنت میں لگے رہتے۔

اس میں اشارہ ہے کہ نبی کے اعمال اس کی وفات کے بعد بھی جاری رہتے ہیں جن کے اعمال جاری رہیں، اُن کی موت ایک پردہ ہے۔ اللہ کے قرب میں مزید بڑھنے کا سامان انہیں اب بھی حاصل ہے۔ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ لکھتے ہیں:۔

سلیمان علیہ السلام پر زندگی میں جو انعامات ہوئے تھے یہ اس کی تکمیل ہوئی کہ موت کے بعد بھی ایک ضروری حد تک انہیں باقی رکھا گیا۔[1]

حشر کے دن انبیاء کا اُٹھایا جانا اسی طرح کا ہوگا، جس طرح حضرت عزیر علیہ السلام اُٹھائے گئے کہ بدن بھی محفوظ اور اس میں زندگی کے آثار لطیفہ بھی جنہیں یہاں کے رہنے والے محسوس نہ کر پائیں موجود — جب اُن سے برزخ کا پردہ اُٹھے گا تو وہ کھُلی زندگی میں سامنے آجائیں گے یہی اُن کا حشر ہے اور وہ اُٹھ کھڑے ہوں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ انبیائے کرام کو آخرت میں دوبارہ لباسِ حیات پہنانے کی ضرورت ہی نہیں۔ عامۃ النّاس کو جو زندگی اور کامل حیاتِ عنصری اُس دن ملے گی، وہ انبیائے کرام کو پہلے ہی سے عالمِ برزخ میں حاصل ہے، صرف یہ ہے کہ وہ اوروں سے پردے میں ہے۔ اور وہ اپنی قبور میں ہی اس حیات بعد الوفات پر فائز کر دیئے جاتے ہیں۔ اُس دن تو انہیں صرف اپنی اپنی قبور سے نکلنا ہی ہوگا۔ اور اُن کا عالمِ برزخ اچانک عالمِ آخرت میں بدل جائے گا۔ اور اب یہ ایک کھُلی اور محسوس زندگی ہوگی۔ قدرتِ ایزدی سے اُن کی قبورِ شریفہ شق ہوں گی۔ بخلاف عامۃ النّاس کے کہ وُہ خود نکلنے کی حالت میں نہیں ہوں گے۔ بلکہ انہیں قدرتِ ایزدی سے روح وجسد میں جمع کیا جائے گا، اور اسی دن واذا النفوس زوّجت کی شان ظاہر ہوگی۔ اِس کے برعکس انبیائے کرام کے قیامت کے دن زندہ کئے جانے کا ثبوت کسی روایت سے نہیں ملتا۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا:۔

انا اول الناس خروجًا اذا بعثوا۔[2]

ترجمہ۔ جب لوگ حشر کے دن اٹھائے جائیں گے تو سب سے پہلے قبر سے نکلنے والا میں ہوں گا۔

---

[1] تفسیر عثمانی ص۵۵۷ [2] مشکوٰۃ ص۵۱۴

دوسروں کے لیے لفظ بعثت (اُٹھایا جانا) ہے اور اپنے لیے لفظ خروج (نکلنا) ہے، ان دونوں کو ایک لفظ کے تحت نہیں رکھا گیا، سو جس طرح انبیاء کی موت اوروں کی موت سے مختلف ہے ان کی حیاتِ برزخی دوسروں کی حیاتِ برزخی سے مختلف ہے، اُن کا حشر بھی دوسروں سے مختلف ہے۔ اوروں کا اپنی قبروں سے اُٹھنا ہے اور ان کا نکلنا ہے۔ واللہ اعلم وعلمہ واتم واحکم۔

انبیاء کی یہ خصوصیت ہے کہ وفات کے بعد ان کے اجسامِ عنصریہ میں ریزہ ریزہ ہونے کے بغیر پھر سے حیات عود کر آئے، تو یہ مضمون بھی صحیح ہے کہ اس حیات بعد الوفات کا تحقق قیامت کے دن نیا نہیں، بلکہ قبور شریفہ ہی میں عمل میں آچکا ہو۔ فرق ہے کہ تو یہ کہ برزخ میں یہ حیات پردے میں اور آخرت میں یہ حیات ایک کھلی حیات ہوگی۔ پہلے مضمون پر سب کا اتفاق ہے کہ انبیاء کرام کے لیے اعادۂ حیات اجسامِ عنصریہ کے ریزہ ریزہ ہونے کے بغیر ہے۔ پس یہ قرآنی مضمون کہ حشرِ آخرت زمین کے "ذراتِ منتشرہ"، اور "عظامِ رمیم" سے ہو، انبیاء اس ذیل میں نہیں آتے ——— سو قرآنی عنوانِ بعثت "عام مخصوص منہ البعض" کے درجہ میں ہو تو ظاہر ہے کہ اس کی تخصیص خبرِ واحد سے محلِ کلام نہیں، بناءً علیہ اس حدیث کی وجہ سے کہ "الانبیاء احیاء فی قبورھم یصلون" کہا جاسکتا ہے کہ جس طرح عامۃ الناس کو کامل حیاتِ عنصری حشر کے دن ملے گی، انبیاء کرامؑ اس سے بہت پہلے اپنی اپنی قبورِ شریفہ میں فائز الحیات ہوچکے ہوتے ہیں۔

بس اس باب میں احادیث سے استدلال خصوصاً، جب کہ وہ تواترِ معنی سے اپنے مضمون کو ثابت کر رہی ہوں، عین مقتضائے موضوع ہے۔ یُونہی آیات سے اُلجھتے چلے جانا اور قلبِ موضوع کرنا کوئی امرِ مستحسن نہیں ہے۔

ارشاداتِ پیغمبرِ خاتمِ شریعتِ اسلام میں قانونی حیثیت رکھتے ہیں۔ صحابہؓ کے عہدِ سعادت مہد سے سلسلۂ روایت چلا، تابعین کے عہد کے بعد علمِ حدیث فنِ حدیث سے وابستہ ہوا، اور راویوں کے حالات، اُن کی جرح و تعدیل اور اتصال و ارسال ایک مستقل موضوع بن گئے۔ پہلے دور میں روایات کا مدار زیادہ اعتماد پر رہا اور آگے چل کر اسناد نے زیادہ اہمیت پائی۔

اس تحقیق و تنقیح کی جُوں جُوں ضرورت بڑھتی گئی، محدثین کے قواعد و ضوابط مدوّن ہوتے چلے گئے۔ راویوں کے حالات سے بھی اور محدثین کی تصحیح سے بھی روایات کے صحیح و سقیم ہونے پتہ چلتا رہا تحقیق روایت کی یہ دو ہی راہیں ہیں۔

یہ بات کافی نہیں کہ کسی سلسلۂ روایت میں جب کوئی ایسا راوی ملے، جس پر کسی نے جرح کی ہو، تو یکسر اس روایت کو چھوڑ دیں۔ بلکہ دیکھا جائے گا کہ تعدیل کرنے والے کون کون اور کتنے ہیں اور جرح کرنے والے کون کون اور کتنے ہیں۔ جرح مدلّل ہے یا غیر مدلّل اور محدثین کے نزدیک مقبول ہے یا مردود۔ غرضکہ یہ ایک مستقل فن ہے، جس تک رسائی بغیر فنی مہارت کے ہرگز نہیں ہو سکتی۔ عوام کو تو یہاں بھی اکابر فن کی تقلید سے چارہ نہیں علمی تنقیحات اور فنی مباحث میں عام لوگوں کو کوئی جرح یاد کرا دینا اور پھر ائمہ فن سے استغنا برتنے کی آبیاری کرنا، عام کہتے رہنا کہ اہل سنت کے پاس اپنے مسلک کی حمایت میں صرف منکر اور ضعیف قسم کی ہی روایات ہیں۔ اگر تشغیب العوام نہیں تو اور کیا ہے؟ اگر یہ روایات کلیتہً اور قطعاً لائق رد ہوتیں تو محدثین انہیں روایت کیوں کرتے؟

آپ سمجھ چکے ہوں گے کہ یہاں عوام کو مغالطہ دینے اور تعصب و تحزّب کا شکار کرنے کے لیے کافی گنجائش ہے۔ جہاں انکار مطلوب ہوا کسی راوی پر ادنیٰ اشارہ جرح بھی معاف نہ ہونے دیا اور جہاں خود ضرورت درپیش ہوئی، وہاں تصحیح محدثین کا سہارا لے لیا۔ فالی اللہ المشتکی۔

جہاں صحیح مسلم اور ابو داؤد تک کی احادیث "موضوع روایات" کے تحت درج کی جارہی ہوں اور اس مکتب فکر کے حدیث پڑھنے پڑھانے والے علماء تک کا یہی حال ہو تو اس سے چارہ نہیں کہ اس اندازِ فکر پر خون کے آنسو بہائے جائیں ؎

طبعت علی کدر و انت تریدھا
صفوا من الاقذار والاکدار

ایسے پُر خطر دور میں، جب کہ احترام سلف اور فکر آخرت کا دائرہ سمٹتا چلا جا رہا ہے، جہاں یہ امر ضروری ہے کہ ملک و ملت کی مہمات میں تعمیری اور فروعی اختلافات میں نہ اُلجھا جائے

وہاں اس ضرورت سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ دینی طبقوں میں جہاں بھی ۔ اعتقاد علی السلف ، کے خلاف کوئی چنگاری سلگتی نظر آئے ، اسے اول وھلہ ہی میں بجھا دینے کی پوری جدوجہد کی جائے ۔ بیرونی حملے کے وقت بھی تو اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ اندرونی آشفتگی کہیں خرمنِ حیات کو جلا نہ دے ۔

ہاں ، اگر طریقِ اختلاف ایسا ہو ، جس میں اکابر کے خلاف جذباتِ تنفر نہ پیدا ہوں ۔ تو پھر یہ اختلافِ رائے برداشت کر کے اصولی مسائل میں سب ایک چشمۂ اتحاد سے سیراب ہو سکتے ہیں ، بلکہ بسا اوقات ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ یہ اختلافات تفردات محققین کا مقام پا لیں ۔

اس سے انکار نہیں کہ نظریاتی مسائل میں اختلافِ رائے ہو سکتا ہے ۔ لیکن اگر بعض اکابر سے اختلاف ہو تو بعض دوسرے اکابر کی تائید کے ساتھ ـــــــ اور اس امر کی وضاحت کے ساتھ کہ موقف قطعی نہیں ، اجتہادی رائے ہے ، آخر جانب مخالف بھی احتمالِ صواب سے خالی نہیں ۔ الغرض ہر شئے اپنے محل پر رہے تو اختلاف کے باوجود نزاع کی صورتیں پیدا نہیں ہوتیں ۔

قرآن سے استدلال کرتے اختلاف پیدا ہو تو فیصلہ سنت پر آٹھہرتا ہے ۔ دو مختلف حدیثیں مروی ہوں تو صحابہ کرامؓ کا عمل فیصلہ کن قرار پاتا ہے ۔ حضرت علیؓ کی نصیحت آپ پہلے پڑھ آئے ہیں حضرت عمرؓ کی نصیحت بھی اس باب میں یہی ہے ۔

عن عمرؓ انہ قال سیاتی ناس یجادلونکم بشبھات القرآن فخذوھم بالسنن فان اصحاب السنن اعلم بکتاب اللہ رواہ الدارمی ۔ (کنز العمال جلد ۱ صفحہ ۱۰۸)

ترجمہ ۔ ایسے لوگ بھی آئیں گے جو تم سے متشابہات قرآن سے استدلال کرتے جھگڑیں گے تم ان کا سامنا سنت سے کرنا اصحاب السنن سے زیادہ قرآن کو جاننے والا کون ہو سکتا ہے

اس رسالۂ ہدایت مقالہ میں اس آفتابِ رشد و ہدایت کے زندہ جاوید ہوئے کا بیان ہے جس کے نورِ عرفان نے لاتعداد ذروں کو غیرتِ خورشید بنا دیا تھا اور جس کی تابانی آج بھی بھٹکی مخلوق کو چشمۂ ہدایت سے سیراب کر رہی ہے ۔ ان ارید الا الاصلاح وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب ۔

خالد محمود عفا اللہ عنہ

تمہید

الحمد للہ الکبیر القادر علی جمیع الممکنات المرید لجمیع الکائنات والصلوٰۃ والسلام علی جمیع الہداۃ بالزبر والبینات الذین ھم احیاء فی قبورھم بعد الممات خصوصاً علی خاتم الرسل وافضل المخلوقات سیدنا ومولانا محمد النبی الذی ھو حی فی روضۃ من ریاض الجنات وعلی آلہ واصحابہ واتباعہ الذین یقتبسون من نور حیاتہ فی الحیات وبعد الوفات۔ اما بعد :

عالمِ برزخ کے حالات پر ایک ایسا پردہ پڑا ہے، جو از خود اُٹھایا نہیں جا سکتا۔۔۔۔ قرآن کریم نے عالمِ دُنیا اور عالمِ آخرت کی تفصیلات تو بہت پیش کی ہیں، لیکن درمیانی منزل ۔۔۔۔ عالمِ برزخ ۔۔۔۔ پر اجمال و اشارات ہی کی مصلحت کار فرما ہے۔ برزخ ایک ایسا پردۂ خفا ہے کہ وہاں کے حالات عامۃُ النّاس کی آنکھوں سے اوجھل ہیں۔ عالمِ آخرت کا جتنا حصّہ اس پردۂ خفا میں ہے، اُسے ہی عالمِ برزخ کہا جاتا ہے، اس کی انتہا قیامت پر ہے۔

ومن ورآئھم برزخ الی یوم یبعثون۔ (پ ۱۸، مومنون)

ترجمہ۔ اور ان کے پیچھے قیامت کے دن تک ایک پردہ ہے۔

انسان اُس عالم میں پہنچ کر دُنیا والوں سے پردہ میں ہو جاتا ہے اور آخرت بھی ابھی پوری طرح سامنے نہیں آئی ہوتی۔ صرف اس کا تھوڑا سا نمونہ سامنے رہتا ہے۔ باقی پردہ ہی پردہ ہے، جو نہ ہٹتا ہے، نہ پھٹتا ہے۔

ان انبیاء کرامؑ اور اولیاء عظامؒ نے اس کائنات کے اسرار و رموز کا بارہا مشاہدہ کیا ہے اور ربّ العزت نے کئی دفعہ اس عالم کو اُن پر منکشف فرمایا۔

ظاہر ہے کہ گاہے گاہے کی یہ جھلکیاں اور انکشافات کے یہ پَرتو اس مادی کے ناآشنا

ماحول میں عالمِ برزخ کے روابط و ضوابط کی جملہ کڑیاں نہیں ملا سکتے۔ پس ہمارے لیے یہی کافی ہے کہ آنحضرتؐ نے جو کچھ فرما دیا، اُس پر یقین رکھیں اور برزخ کا جو پہلو معرضِ خفا میں ہا، اُس میں قیاسات کے گھوڑے نہ دوڑائیں اور ما فوق العقل کو خلافِ عقل قیاس کرتے ہوئے منقولاتِ صحیحہ کے انکار کے درپے نہ ہوں۔

حیاتِ انسانی کے چار دَور

عالمِ اَرواح

یہ وہ جہان ہے جہاں رُوحیں رہتی ہیں اور پھر باری باری اس جہان میں کسی بدن سے متعلق ہو کر آتی ہیں۔ سب رُوحوں کی ایک ہی دفعہ تخلیق ہو چکی ہے۔ جب کسی کی باری آجاتی ہے، وہ روح کسی جسم میں آکر یہاں جلوہ پیرا ہوتی ہے۔

انسان کی یہ وہ پہلی زندگی ہے جس میں جملہ بنی نوعِ انسان سے عہدِ اَلست لیا گیا تھا۔ قرآن پاک میں اس کی شہادت موجود ہے:۔

واشھدھم علی انفسھم ج الست بربکم ط قالوا بلیٰ ج شھدنا ان تقولوا یوم القیٰمۃ انا کنا عن ھذا غٰفلین ۝ (پ ۹، الاعراف: ع ۲۲)

ترجمہ۔ اور اللہ نے اُن سے اُن کی جانوں پر اقرار کرایا، "کیا میں نہیں ہوں تمہارا رب"۔ سب نے کہا کیوں نہیں۔ ہم اقرار کرتے ہیں، کہیں کہنے لگو قیامت کے دن، ہم کو تو اس کی خبر نہ تھی۔

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ لکھتے ہیں:۔

ضروری تھا کہ یہ تخمِ ہدایت جسے کل اسلامی تعلیمات کا مبدء و منتہیٰ اور تمام ہدایاتِ ربانیہ کا وجودِ مجمل کہنا چاہیے۔ عامِ فیاضی کے ساتھ نوعِ انسانی کے تمام افراد میں

بکھیر دیا جائے۔ تاکہ ہر آدمی عقل و فہم اور مدگی و الہام کی آبیاری سے اس تخم کو شجرِ توحید و ایمان کے درجہ تک پہنچا سکے۔ اگر قدرت کی طرف سے قلوب بنی آدم میں ابتداءً یہ تخم ریزی نہ ہوتی اور اس سب سے زیادہ اساسی و جوہری عقدہ کا حل ناخنِ عقل و فکر کے سپرد کر دیا جاتا، تو یقیناً یہ مسئلہ بھی منطقی استدلال کی بھول بھلیاں میں پھنس کر ایک نظری مسئلہ بن کر رہ جاتا جس پر سب تو کیا، اکثر آدمی بھی متفق نہ ہو سکتے۔ . . . حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کی پشت سے اُن کی اولاد اور اُن سے اُن کی اولاد نکالی۔ سب سے اقرار کروایا، اپنی خدائی کا، پھر پشت میں داخل کیا۔[1]

پھر یہی نہیں، اللہ تعالیٰ نے اس عالمِ ارواح میں تمام اولادِ آدم کو خبر دی کہ اُن کے پاس اس تخم کی آبیاری کے لیے میرے پیغمبر آتے رہیں گے:۔

یا بنی آدم اما یاتینکم رسل منکم یقصون علیکم آیاتی۔

(پ ۸ الاعراف: ع ۴)

ترجمہ۔ اے اولادِ آدم! اگر آئیں تمہارے پاس رسول تم اولادِ آدم میں سے ہی سنائیں تم کو آیات میری، تو جو کوئی ڈرے اور نیکی اختیار کرے تو نہ خوف ہو گا، اُن پر اور نہ غمگین ہوں گے۔

شیخ الاسلامؒ لکھتے ہیں:۔

ابن جریر (۳۱۰ھ) نے ابو یسار سلمی سے نقل کیا ہے کہ یہ خطاب یا بنی آدم اما یاتینکم کل اولادِ آدم کو عالمِ ارواح میں ہوا تھا۔[2]

احادیث میں بھی اس عالمِ ارواح کا ذکر ملتا ہے۔ اس دور کی انتہا والدہ کے پیٹ میں ہوتی ہے جب روح جسدِ جنین میں داخل ہوتی ہے۔ یہ چند ماہ کی مدت نہ عالمِ ارواح میں ہے نہ دنیا میں ——

---

[1] تفسیر عثمانی صفحہ ۲۲۳ [2] ایضاً صفحہ ۲

یہ عالم ارواح اور دُنیا کا برزخ ہے جو پیدائش پر ختم ہو جاتا ہے اور نُومولود کی دُنیا شروع ہو جاتی ہے۔

عالم ارواح کو اسی لیے عالم ارواح کہتے ہیں کہ اس کے سوا انسانی زندگی کے جتنے دَور ہیں ان سب میں روح اور بدن کا ایک تعلق ہے خواہ جلی طور پر جسے کہ سب دیکھ پائیں یا خفی طور پہ جسے عام دیکھا نہ جا سکے (جیسے قبر میں روح و بدن کا تعلق) تاہم عالم ارواح کے سوا دُنیا ہو یا آخرت (اور آخرت میں بھی برزخ ہو یا قیامت کے بعد کا جہاں) ہر جگہ روح و بدن کا علاقہ ضرور ہے۔

الحاصل عالم ارواح ایک پُورا جہاں ہے جس کے اپنے احکام ہیں۔ اور صرف اسی جہان میں انسان کی روحانی زندگی ہے۔ دُنیا، برزخ اور آخرت۔ تینوں میں بدن کا علاقہ اپنے اپنے حالات کے مطابق ضرور رہتا ہے۔

عالمِ دُنیا

عالم محسوسات میں یہ زندگی انسان کے قریب تر ہے۔ اس کا معنی قریبی زندگی کا دور ہے۔ قرآن اُسے "الحیٰوۃ الدنیا" سے تعبیر کرتا ہے۔ اس میں رُوح و بدن کا تعلق نہایت مضبوط ہوتا ہے۔ مگر جسد کے احکام روح پر غالب ہوتے ہیں[1] یہاں حیات کا تقوّم اس دُنیا کے رزقِ مادی پر ہوتا ہے تغذیہ و تنمیہ اس زندگی کے لوازم ہیں اس دور کی انتہا موت پر ہوتی ہے۔ لیکن بعض اوقات مرنے سے پہلے ہی اگلی زندگی کے آثار نظر آنے شروع ہو جاتے ہیں۔ یہی عالم "دارُ التکلیف" ہے اور یہی "دارُ العمل" جس کے ذخیرۂ عمل پر بعد کی جزا یا سزا مرتب ہوتی ہے۔

---

[1] قال العارف الجامیؒ ان الغالب فی ھذا العالم احکام الاجساد و احکام الروح مستورۃ لظھور الجسد و خفاء الروح و ینعکس الحال فی البرزخ و تظھر احکام الروح اما المحشر فیستاوی فیہ الحکمان واللہ اعلم۔

عالمِ دُنیا میں برزخ کی جھلکیاں

کبھی اس دُنیا کے تیز نظر عارفین برزخ کی کھڑکی میں بھی جھانک لیتے ہیں اور اس دُنیا میں رہتے ہوئے وہ بعض برزخی اعمال کو دیکھ یا سُن پاتے ہیں۔ بایں ہمہ اُن کی یہ دُنیوی زندگی دُنیوی ہی رہتی ہے کیونکہ انہوں نے ابھی عالمِ برزخ میں قدم نہیں رکھا۔ حضرت انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

انه صورت لی الجنة والنار حتی رأیتها وراء الحائط۔[1]

ترجمہ: جنت اور دوزخ ایک تصویر کی صورت میں میرے سامنے لائی گئیں۔ میں نے ان دونوں کو اس دیوار کے پاس سے دیکھا۔

ایک دوسری جگہ یہ روایت یوں ہے:۔

لقد رأیت الآن منذ صلیت بکم الصلوٰة الجنة والنار ممثلتین فی قبلة هذا الجدار۔[2]

ترجمہ: ابھی جب میں نے تمہیں نماز پڑھائی میں نے اس دیوار کے قبلہ کی طرف جنت اور دوزخ مثالی شکل میں دیکھی ہیں۔

یہاں حضورؐ نے عالمِ بیداری میں جنت اور دوزخ کو ایک مثالی صورت میں دیکھا۔ یہ کہاں دیکھا؟ اسی دُنیا میں —— کیا کوئی اور بھی دیکھ پایا؟ نہیں —— یہ دُنیا میں کسی اور جہان کی جھلکیاں ہیں جو آپ دیکھ رہے تھے۔ یہ برزخ کی جھلک تھی۔

حضرت جابر بن عبد اللہؓ کہتے ہیں، ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسوف (سورج گرہن) کی نماز پڑھائی اور فرمایا:۔

انه عرض علی کل شیٔ تولجونه فعرضت علی الجنة حتی تناولت

---

[1] صحیح بخاری جلد ۱ صفحہ ۹۴۱ [2] ایضاً جلد ۱ صفحہ ۱۰۳

منها قطفا اخذته ..... وعرضت علی النار فرأیت فیها امرأۃ من بنی اسرائیل تعذب فی ھرۃ لھا ربطتھا فلم تطعمھا ولم تدعھا تاکل من خشاش الارض ورأیت ابا ثمامۃ عمرو بن ملک یجر قصبہ فی النار۔[1]

ترجمہ: ابھی مجھے ہر چیز جہاں تمہیں جانا ہے دکھائی گئی ہے مجھے جنت بھی دکھائی گئی یہاں تک کہ میں نے اس سے انگور کے کچھ خوشے لیے اور مجھے جہنم بھی دکھائی گئی ہیں نے اس میں بنی اسرائیل کی ایک عورت کو دیکھا جسے ایک بلی کے سلسلے میں عذاب ہو رہا تھا۔ اس نے ایک بلی کو باندھ رکھا تھا اور اسے کھانے کو کچھ نہ دیتی تھی اور نہ اسے چھوڑتی تھی کہ وہ خود زمین کے جانور کھائے اور میں نے ابو ثمامہ عمرو بن ملک کو دیکھا وہ جہنم میں اپنی آنتیں گھسیٹ رہا تھا

اور یہ بھی فرمایا:۔

مامن شیء لم اکن اریتہ الا رایتہ فی مقامی ھذا حتی الجنۃ والنار۔[2]

ترجمہ: کوئی ایسی چیز جو مجھے پہلے نہ دکھائی گئی تھی میں نے ابھی یہاں دیکھی ہے یہاں تک کہ میں نے جنت اور دوزخ کو بھی دیکھا ہے۔

حضرت انس بن مالکؓ آنحضرتؐ سے روایت کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا:۔

عرضت علی اجور امتی ... وعرضت علی ذنوب امتی فلم ار ذنبا اعظم من سورۃ من القرآن او اٰیۃ اخذھا رجل ثم نسیھا۔[3]

ترجمہ: ابھی مجھے اپنی امت کے اجر اعمال دکھائے گئے ... مجھے میری امت کے گناہ بھی دکھلائے گئے اور سب سے بڑا گناہ میں نے یہ دیکھا کہ کوئی شخص قرآن کی کوئی سورت یا آیت سیکھ لے اور پھر اسے بھلا دے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کہتے ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا:۔

عرضت علی الامم ورأیت سوادا کثیرا سد الافق فقیل ھذا موسیٰ

---

[1] صحیح مسلم جلد ۱ صفحہ ۲۹۷ [2] رواہ البخاری عن اسماء جلد ۱ صفحہ ۱۸ [3] جامع ترمذی جلد ۲ صفحہ ۱۱۵

موسیٰ فی قومہ۔[1]

ترجمہ۔ مجھے امتیں دکھائی گئیں اور میں نے ایک بڑی جماعت جو افق ڈھانپ رہی تھی دیکھی مجھے بتایا گیا کہ موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کے ساتھ کھڑے ہیں۔

ایک دفعہ آپ شہدائے اُحد کی قبروں پر تشریف لے گئے۔ وہاں سے آکر آپ نے خطبہ دیا:-

انی واللہ لانظر الی حوضی الآن وانی اعطیت مفاتیح خزائن الارض انی واللہ ما اخاف ان تشرکوا بعدی ولکنی اخاف۔[2]

ترجمہ۔ میں اپنے حوضِ کوثر کو یہیں سے دیکھ رہا ہوں اور مجھ کو زمین کے خزانہ کی کنجیاں دے دی گئیں۔

اے لوگو! مجھے یہ خوف نہیں کہ تم میرے بعد شرک میں جا پڑو گے۔ مجھے ڈر اس بات کا ہے کہ دُنیا کی دولت میں پڑکر آپس میں حسد نہ کرنے لگو۔

حضرت اسامہ بن زیدؓ کہتے ہیں ایک دن آپ شہر سے باہر جا نکلے اور ایک ٹیلے پر چڑھ کر کہا:-

انی لاری الفتن تقع خلال بیوتکم کوقع المطر۔[3]

ترجمہ۔ اے لوگو! جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں، کیا تمہیں نظر آرہا ہے؟ انہوں نے کہا نہیں فرمایا تمہارے گھروں میں فتنوں کو اس طرح اُترتے دیکھ رہا ہوں جس طرح بارش اُتر رہی ہو۔

حضرت ابُو ایوب انصاریؓ کہتے ہیں ایک دفعہ آپ دوپہر کے وقت گھر سے نکلے تو قبروں کے پاس سے گزرے۔ آپ نے فرمایا:-

فقال یہود تعذب فی قبورھا۔[4]

ترجمہ۔ یہود پر اُن کی قبروں میں عذاب ہو رہا ہے۔

طبرانی کی روایت میں ہے آپ نے فرمایا۔ اُن کی آوازیں میرے کانوں میں آرہی ہیں۔[5]

---

[1] صحیح بخاری جلد ۱ صـ ۴۸۴ [2] ایضاً صـ ۹۷۵/۲ [3] صحیح بخاری جلد ۲ صـ ۱۰۴۶ [4] صحیح بخاری جلد ۱ صـ ۱۸۴ کتاب الجنائز
[5] ارشاد الساری جلد صـ

امام احمد، امام بیہقی اور حاکم حضرت زید بن ارقمؓ سے روایت کرتے ہیں۔ ہم ایک دفعہ حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ تھے، کسی نے آپ کو شہد اور پانی پیش کیا تو آپ رو پڑے۔ لوگوں نے رونے کا سبب پوچھا تو آپ نے فرمایا:۔

ترجمہ۔ ایک دن میں حضورؐ کی خدمت میں تھا کہ آپ نے ہاتھ سے کوئی (غیر مرئی) چیز ہٹائی اور مجھے وہ چیز نظر نہ آ رہی تھی میں نے کہا حضورؐ کس چیز کو سامنے سے ہٹا رہے ہیں یہ دُنیا ہے جو میرے سامنے ممثل ہو کر آئی ہے۔ میں نے اُسے کہا ہے میرے پاس سے چلی جا یہ سب برزخی نظارے ہیں جو آپؐ نے عین بیداری میں دیکھے۔ آپؐ کے بعد بہت سے اولیاءً بھی ایسے گزرے ہیں جنہوں نے اس عالم دُنیا میں عالم برزخ کے نظارے دیکھے —— اس سے پتہ چلا کہ برزخ کوئی اتنی دُور کی منزل نہیں کہ اُسے دُنیا میں دیکھا ہی نہ جا سکے۔ تیز نظر عارفین نے کئی دفعہ یہیں اُس عالم کی جھلک دیکھی ہے ؎

گاہ مری نگاہِ تیز چیر گئی دل وجود   گاہ اُلجھ کے رہ گئی اپنے تصورات میں

پھر دُنیا میں پیغمبروں کے خواب بھی خیالات کی پیداوار یا کوئی صدائے بازگشت نہیں ہوتے یہ وحیِ الٰہی کے پردے ہیں جن پہ حقائق و معارف اُترتے ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کہتے ہیں۔

رؤیا الانبیاء وحی۔ (رواہ الترمذی)

(۱) —— حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کہتے ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا۔ میں نے نیند میں دیکھا کہ دودھ کا پیالہ ہے اور میں پی رہا ہوں۔ یہاں تک کہ میں نے اپنے ناخنوں میں اُس کی سیرابی کے اثرات دیکھے:۔

ثم اعطیت فضلی عمرؓ قالوا فما اولتہ یارسول اللہ قال العلم[۱]

ترجمہ۔ میں نے اپنا بچا دودھ عمرؓ کو دیا صحابہؓ نے پُوچھا حضورؐ اس دودھ کی حقیقت کیا ہے۔ فرمایا —— علم

---

[۱] صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۱۰۳۴ جامع ترمذی جلد ۲ صفحہ ۵۲

(۲) ــــــ حضرت ابُو سعید خدریؓ کہتے ہیں حضورؐ نے فرمایا میں سویا ہوا تھا کہ میں نے لوگ دیکھے اُن پر مختلف پیمائشوں کی قمیصیں تھیں:۔

ومرّ علی عمر بن الخطابؓ وعلیہ قمیص یجرہ قالوا ما اولت یارسول اللہ قال الدین۔[1]

ترجمہ۔ اور میرے سامنے سے عمرؓ گزرا اور اس پر اتنی لمبی قمیص تھی کہ وہ زمین پر گھسٹتی جاتی تھی صحابہؓ نے پُوچھا اس قمیص کی حقیقت کیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا ــــ دین۔

(۳) ــــــ حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں حضورؐ نے فرمایا میں نے نیند میں دیکھا کہ میں ایک کنویں پر ہوں اور ایک ڈول دھرا ہے۔ اس ڈول سے کچھ پانی نکالتا رہا پھر اُسے ابُو بکرؓ نے پکڑ لیا اور ایک یا دو ڈول نکالے، پھر ڈول بھاری ہونے لگا۔

فاخذھا عمر بن الخطابؓ فلم ار عبقریا من الناس ینزع نزع ابن الخطابؓ حتٰی ضرب الناس بعطن۔[2]

ترجمہ۔ پھر اسے عمر بن الخطابؓ نے لے لیا اور اب تک کوئی جوان اس طرح پانی نکالتے نہیں دیکھا جس طرح خطاب کا بیٹا پانی کھینچ رہا تھا۔ یہاں تک کہ لوگ اپنے اپنے ڈیروں میں جا بیٹھے۔

یہ خلافت کے جلوے تھے جو اللہ تعالیٰ حضورؐ کو دکھا رہے تھے کہ حضرت عمرؓ جب منصب خلافت پر آئیں گے تو کس طرح ایک دُنیا ان سے سیراب ہوگی۔ چونکہ حضورؐ نے حضرت عمرؓ کو خُدا سے مانگ کر لیا تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ خود حضورؐ کو مقاماتِ عمرؓ دکھلا رہے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

رأیت کان امرأۃ سوداء ثائرۃ الرأس خرجت من المدینۃ حتٰی قامت بمھیعہ وھی الجحفۃ فتاولتھا ان وباء المدینۃ نقل الیھا۔[3]

---

[1] صحیح بخاری جلد ۲ صد ۱۰۳۶ جامع ترمذی جلد ۲ صد ۵۲ [2] صحیح بخاری جلد ۱ صد ۱۰۴۰
[3] صحیح بخاری جلد ۲ صد ۱۰۴۲ جامع ترمذی جلد ۲ صد ۵۲

ترجمہ: میں نے دیکھا کہ ایک سیاہ رنگ عورت ہے جس کے سر کے بال بکھرے ہیں مدینہ سے نکلی ہے اور مہیعہ ٹھہر گئی ہے اور وہ جگہ جحفہ ہے میں نے اس کا مطلب یہ سمجھا کہ مدینہ کی وبا وہاں چلی گئی ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نیند میں تھا کہ مجھے پوری زمین کے خزائن دیئے گئے اور مجھے میرے ہاتھوں میں سونے کے دو کنگن دیئے گئے، وہ مجھے گراں لگے اور انہوں نے مجھے فکر میں ڈالا۔ اسی وقت مجھے وحی آئی:

انفخهما — فنفختهما — فاولتهما الكذابين اللذين انا بينهما صاحب صنعاء وصاحب اليمامة۔[1]

ترجمہ: آپ انہیں پھونک دیں۔ سو میں نے انہیں پھونک دیا (وہ اُڑ گئے) میں نے اُن سے دو کذاب (اسود عنسی اور مسیلمہ کذاب) مراد سمجھے۔ میں اس سرزمین میں ہوں جو اُن دو کے درمیان ہے۔ ایک طرف یمن اور ایک طرف یمامہ۔

دونوں طرف سے دو کذاب اُٹھیں گے اور اس طرح اُڑ جائیں گے جیسے مٹی اُڑ جاتی ہے۔ آپ کو کہا گیا انہیں پھونک لگا دیں۔ آپ نے دونوں پھونک ڈالے۔

عملاً انہیں حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے دورِ خلافت میں پھونکا۔ یہ حضرت صدیق اکبرؓ کی سعادت تھی کہ ارادۂ رسالت بلکہ ارادۂ الٰہیہ ان کے دست حق پرست پر پورا ہوا اور اس سے اُن کی خلافت کی صداقت تمام آشکار ہوئی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خواب خود بھی وحی تھا۔ پھر اس خواب میں وحی آنا ایک اور مرتبہ وحی کا پتہ دیتا ہے اور یہ دونوں مراتب آپ کو نیند میں دکھائے جا رہے ہیں۔ کیا یہ حقائق یہ سمجھنے کے لیے کافی نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں رہتے ہوئے عالم بیداری ہو یا عالم خواب، بارہا برزخی اور اُخروی جلووں سے آشنا ہوتے اور آپ کے لیے عالم دنیا اور عالم برزخ کے کچھ ایسے فاصلے نہ تھے

---

[1] صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۱۰۴۲ جامع ترمذی جلد ۲ صفحہ ۵۲

جن کی سرحدیں ایک دوسرے سے قطعی جُدا ہوں۔ جب یہاں رہتے ہوئے آپ برزخ کوائف سے ناآشنا نہ رہے تو عالمِ برزخ میں جاکر آپ کے بعض دنیوی اعمال باقی رہیں۔ جن کا کم ازکم درجہ یہ ہے کہ امت کا آپ سے سلام کا سلسلہ باقی رہے تو کون سے تعجب کی بات ہے۔

عالمِ برزخ

قرآن کریم میں ہے :-

ومن ورآئھم برزخ الی یوم یبعثون۔ (پ۱۸ : المومنون ع ۶ آیت ۱۰۰)

ترجمہ: اور ان کے ورے ایک پردہ ہے اس دن تک جب وہ اٹھائے جائیں گے۔

موت کے بعد سے لے کر قیامت تک یہ دَور قائم رہتا ہے۔ اس میں روح اور بدن یا روح اور اجزائے بدن کے مابین نہایت لطیف اور قوی تعلق[1] قائم ہوتا ہے۔ اس

---

[1] یہ تعلق یا تو اس طرح قائم ہوتا ہے کہ روح، بدن یا اجزائے بدن پر اپنی تاثیر ڈالتی ہے اور جیسا روح کا مقام ہو اس کے مناسب بدن یا اجزائے بدن میں آثارِ حیات قائم ہو جاتے ہیں اور یا خود رُوح ہی علیین یا سجین سے لاکر داخلِ بدن یا اجزائے بدن کر دی جاتی ہے اور وہ تعلق قائم کر کے پھر اپنے اپنے مستقر میں لَوٹ جاتی ہے۔ اگر رُوح کمزور ہو اور ذراتِ بدن بھی منتشر ہوں تو پھر یہ حیات نہایت کمزور قسم کی ہوتی ہے۔ "در قبر احیاء و اماتہ حقیقی نیست بسبب انعکاس اشعہ روح بہ بدن تعلقی پیدا می شود کہ تغذیہ وتنمیہ ہمراہ آں نمی باشد" (تحفہ اثناء عشریہ صـ۲۳۸ نولکشور)۔ ان ارواح کو ایک علاقہ اپنی قبر سے بھی ہوتا ہے کہ آنے سے زیارت کرنے والوں کی اور اقرباء اور دوستوں سے مطلع ہوتے ہیں۔ کیونکہ رُوح کو قرب اور بُعدِ مکانی سے اس دریافت کو مانع نہیں ہوتا۔ (تفسیر عزیزی پ۳۰ صـ۸۸ مطبع فاروقی دہلی) روح کا علاقہ بدن سے ازراہِ نظرو عنایت کے بحال رہتا ہے اور زیارت کرنے والوں اور دوستوں سے فائدہ لینے والوں کی طرف روح کی توجہ آسانی سے ہوتی ہے کہ بدن کے مکان معین ہونے سے گویا روح کا مقام بھی معین ہے۔ (تفسیر عزیزی پ۳۰ صـ۹۱ تحت آیت ثم اماتہ فاقبرہ)

یں دُنیا والوں سے بھی پردہ ہو جاتا ہے اور آخرت بھی پوری طرح سامنے نہیں آتی۔ یہاں کی زندگی کے لیے روح اور حیات میں تلازمہ نہیں[1]۔ روح اگر بدن میں نہ بھی داخل ہو، صرف تاثیر ہی کر رہی ہو، تو بھی حیات کا تقوم ہو جاتا ہے۔ قبر کی منزل[2] اسی دور میں شمار ہوتی ہے۔ یہ عالم ایک جہت سے مواطنِ دُنیوی سے بھی متعلق ہے اور گنجائش ترقی رکھتا ہے[3]۔

مختلف درجوں کے لوگوں کا برزخ مختلف ہوتا ہے۔ ۱۔ عام اموات عالم برزخ میں روح و بدن کے تعلق سے راحتِ قبر یا عذابِ قبر کے مرحلے سے گزرتی ہیں۔ ۲۔ شہداء عالم برزخ میں جسمانی حیات سے زندہ ہیں۔ اُن کی ارواح پرندوں کی صورت میں متجسد ہوں یا کسی اور صورت میں وہ اپنے ابدان پر برابر متوجہ رہتی ہیں اور اُن کے ابدان میں آثارِ حیات برابر مشاہدہ کئے جاتے رہتے ہیں۔ ۳۔ انبیاء عالم برزخ میں اپنے اجساد کے ساتھ زندہ ہیں، گو وہ زندگی یہاں محسوس اور مشاہد نہ ہو سکے۔ اپنے ہاں وہ ایک

---

[1] الحیاۃ فی اللغۃ شئ مغائر للروح لاعینہ بل ثمرۃ تعلقہ وزعم بعض النّاس انہ نفس الحیٰوۃ ولیس کذلک ففی النصوص ذکر الحیٰوۃ ولیست روحًا واطلاقات الروح فی عقیدۃ السفارینی جلد ۲ صد ۲۹ تحیۃ الاسلام ص۳۶ ان ملازمۃ الحیٰوۃ للروح امر عادی لا عقلی فھذا مما یجوزہ العقل (شفاء السقام ص۱۵۹) [2] عالم برزخ کا محل صرف قبر کا ظاہر نہیں، بلکہ اس قبر کی مافوق الادراک حیثیت ہے۔ بعض قبور اپنی برزخی حیثیت میں میلوں تک وسیع ہو سکتی ہیں۔ اگرچہ عام نظروں میں وہ ایک گڑھا ہی دکھائی دیں اور بعض اپنی ظاہری کشادگی سے بھی تنگ ہو سکتی ہیں، اگرچہ ظاہر میں کتنی ہی وسیع کیوں نہ ہوں پس حقیقتِ قبر صرف اس ظاہری گڑھے کا نام نہیں، یہ ایک عالم برزخ کی منزل ہے۔ یہ قبر صرف اس منزل کا ایک پہلو ہے اور اس کی ظاہری علامت ہے۔ اس کی برزخی وُسعت و تنگی کو ربّ العزت ہی جانتے ہیں یا وہ مقدس ہستیاں جن پر عالم برزخ کا انکشاف ہو رہا ہو، اس سے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیئے کہ اس ظاہر قبر کو حقیقتِ قبر سے کوئی علاقہ نہیں یا برزخ اس قبر سے کوئی بالکل مغائر چیز ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ [3] دیکھیے مکتوبات حضرت مجدد الف ثانیؒ دفتر ۲ ص۱۲ م ۲۹ لکھنؤ

حسی زندگی محسوس کرتے ہیں اور اس احساس سے وہ نمازیں بھی پڑھتے اور ان کے زندوں والے اعمال میں انقطاع نہیں ہوا۔ اُن کی حیات روح کے اعادہ سے ہو یا اس کے اشراف و اشراق سے اس میں اہل السنۃ والجماعۃ کے ہاں کوئی اختلاف نہیں کہ انبیاء علیہم الصلوٰت والتسلیمات اپنی قبور میں زندہ ہیں اور نمازیں پڑھتے ہیں۔

عالمِ برزخ کے لیے دُنیوی تجربے کی قریب ترین تعبیر

عالمِ برزخ پر ایک دبیز پردہ پڑا ہے۔ وہاں کے کوائف اور پیرائے ایسے لطیف اور باریک ہیں کہ ہمارے پاس کوئی ایسا لفظ نہیں جو عالمِ برزخ کا پورا نقشہ کھینچ کر آپ کے سامنے کر دے اور برزخی حالات کو پورا واضح کر کے ہمارے سامنے لے آئے۔ اس زندگی کے قریب تر جو لفظ پایا گیا ہے، وہ لسانِ شریعت میں لفظ نیند ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قبر کے سوال وجواب کی بات کرتے ہوئے مومن کے بارے میں فرماتے ہیں:۔

فیقال نم صالحاً قد علمنا ان کنت لموقنا به[1]

ترجمہ۔ اسے کہا جائے گا آرام سے سو رہو۔ ہمیں علم ہے کہ تو ان پہ ایمان رکھتا تھا۔

یہ برزخی زندگی کی ایک حالت ہے جسے نیند سے تعبیر کیا گیا ہے۔ نیند میں انسان وہیں کا وہیں رہتا ہے۔ لیکن عالمِ خواب میں وہ کہاں کہاں سے ہو آتا ہے یہ کسی سے مخفی نہیں، اور پھر اس سیر کے آثار اس کے اس مادی جسم پہ بھی وارد ہوتے ہیں، وہ پریشان بھی ہوتا ہے اور خوش بھی ہوتا ہے عالمِ برزخ میں میت وہیں کی وہیں دکھائی دیتی ہے۔ مگر خدا کے پیدا کردہ اس عجیب نظام (عالمِ برزخ) میں اس پر وہ تمام واردات ہو رہی ہیں جن کا شریعت نے پتہ دیا ہے اور وہ شرعی حقیقت ہیں۔ کوئی پیرایہ مجاز نہیں۔ محدثین لکھتے ہیں:۔

---

[1] صحیح بخاری جلد ۱ صفحہ ۱۹

تضیق القبر واختلاف الاضلاع حقیق لا انہ مجاز[1]

ترجمہ: قبر کا سمٹنا (تنگ ہونا) اور پسلیوں کا آپس میں ٹکرانا یہ حقیقت ہے کوئی مجاز نہیں۔

برزخی زندگی کی مثال نیند سے دی جاسکتی ہے۔ اصحاب کہف مدتوں نیند میں رہے اور حضرت عزیر علیہ السلام برزخ میں سے اٹھے، دونوں کی کیفیت یہی تھی۔ بعثنایوما او بعض یوم۔ برزخی زندگی میں نیند کی سی ایک کیفیت ہے اور اعمال برزخ کا عالم خواب کی طرح ایک وسیع سلسلہ ہے۔ اس حال سے گزرنے والے اسے نیند ہی سمجھتے ہیں۔

قالوا یاویلنا من بعثنا من مرقدنا ھذا ما وعد الرحمٰن وصدق المرسلون۔ (پ ۲۳: یٰسین: آیت ۵۲)

ترجمہ: کہیں گے خرابی ہماری، کس نے اٹھا دیا ہمیں ہمارے سونے کی جگہ سے۔ یہ وہ ہے جو وعدہ کیا تھا رحمٰن نے اور سچ کہا تھا پیغمبروں نے۔

اللہ تعالیٰ نے بھی ان کی تردید نہیں کی کہ یہ نیند نہیں تھی ایک دورِ برزخ تھا۔

اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے مقام پر بھی نیند اور موت کو جمع کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

اللہ یتوفی الانفس حین موتھا والتی لم تمت فی منامھا۔ (پ ۲۴: الزمر: آیت ۴۲)

ترجمہ۔ اللہ تعالیٰ جانوں کو قبض کرتا ہے موت کے وقت اور جن کی موت واقع نہیں ہوئی ان کی نیند کے وقت۔

اللہ تعالیٰ نے توفی (جان کو پورا کرلینا) کے تحت موت اور نیند دونوں کو جمع کیا ہے۔ توفی میں روح نکلتی ہے جو موت والے کے لیے یہاں نہیں لوٹتی اور نیند والے کے لوٹ آتی ہے امساک و ارسال کا ظہور اسی عالم (دنیا) میں ہوتا ہے۔ نیند اور موت دونوں توفی میں جمع ہیں سو نیند سے زیادہ کوئی حقیقت برزخ کے قریب نہیں ہوسکتی۔ حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رض

---

[1] مرقات جلد ۱ صـ ۲۸

روایت کرتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا:۔

النوم اخوالموت۔[۱] (نیند موت کی بہن ہے)۔

سوال یہ ہے کہ جب عالمِ برزخ نیند کی سی ایک کیفیت ہے تو جنت اور جہنم کے اپنے اپنے ٹھکانوں کا دیکھنا کیسے ہوگا۔ ایک طرف قرآن یہ کہتا ہے کہ حشر پہ اُٹھتے یہ کہیں گے۔ من بعثنا من مرقدنا ہم کو نیند سے کس نے اُٹھایا ـــــ اور دوسری طرف ہے:۔

النار یعرضون علیہا غدوًا و عشیًا۔ (پ۲۴: المؤمن: آیت ۴۶)

ترجمہ: آگ ہے جس پر وہ صبح و شام پیش کیے جاتے ہیں۔

جواب یہ ہے کہ دُنیوی اعمال کے مختلف پیرائے عالمِ برزخ میں بھی مختلف پیرائے اختیار کر لیتے ہیں۔ کہیں عذاب کے منظر دکھائے جا رہے ہیں اور کہیں قیامت کا ہولناک منظر۔ برزخ کو ایک نیند کرکے سمجھا جا رہا ہے یا ہو سکتا ہے، یہ نفخۂ اولیٰ اور ثانیہ کے درمیان بے ہوشی کا وقفہ ہو حقیقت یہ ہے کہ ہم اس نادیدہ شہر کی تفصیل بیان کرنے سے عاجز ہیں۔ یہاں صرف یہ بتلانا ہے کہ محسوسات کے اس دائرہ میں جس سے ہم گزر رہے ہیں صرف نیند ہے جو برزخ کے قریب ہے جس طرح پیغمبروں کی نیند دوسروں کی نیند سے مختلف ہے، آنکھیں سوتی ہیں دل جاگتا ہے، ان کا برزخ بھی دوسروں سے مختلف ہے۔ یہ وہاں پورے احساس سے زندہ ہیں اور ان کے اعمال بھی جاری ہیں جو کیفیت سمجھ میں آجائے بہتر، جو نہ سمجھ میں آئے اُسے لاتشعرون کے پہلو میں جگہ دے دیجیے۔ وفیہ السداد وفیہ السلامۃ۔

حضورؐ سے پوچھا گیا۔ اینام اهل الجنۃ، کیا اہلِ جنت سوئیں گے بھی؟ آپؐ نے فرمایا۔ لاینامون کہ وہ سوئیں گے نہیں۔

انسان خواب و خیال میں کہاں کہاں کھو جاتا ہے، مگر پیغمبر کے خواب پر بھی خدا کا پہرہ ہوتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں:۔

---

[۱] رواہ البیہقی کما فی الجامع الصغیر صفحہ ۲۲۳ السراج المنیر جلد ۴ صفحہ ۳۶۱

رؤیا الانبیاء وحی۔ (انبیاء کا خواب بھی وحی ہے)[1]

یعنی وحی کی طرح محفوظ ہے، مجال ہے کہ اس میں کوئی دخل شیطانی ہو اور عملاً یہ حکم ہے۔ بچے کو بھی ذبح کرتے دیکھیں تو وہ اُسے قربان کرنے نکلیں گے لیکن ہر کسی کا خواب اس درجے کا نہیں۔ انسان کو احتلام دخلِ شیطانی سے ہوتا ہے اور نبی کو کبھی احتلام نہیں ہوتا۔[2]

جب نیند موت کی بہن ہے اور پیغمبروں کی نیند دوسروں کی نیند سے نوعاً مختلف ہے تو اگر ان کی موت بھی دوسروں کی موت سے نوعاً مختلف ہو تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے۔

یہاں اصل موضوع موتِ انبیاء نہیں، اس کی بحث حیاۃ الانبیاء کے ضمن میں آئے گی یہاں ہم صرف یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ عالم برزخ کے کوائف اور حالات بہت عجیب ہیں۔ ہمارے پاس کوئی ایسے الفاظ نہیں جو برزخ کو پوری طرح شیشے میں اُتار سکیں۔ جو شہر دیکھا نہیں ایک اجنبی مسافر اس کا کیا پتہ دے سکتا ہے۔

عالمِ آخرت

یہ وہی آخری مقام ہے، جسے قرآن کریم "دارُالقرار" کہتا ہے۔ یہ ہمیشہ ٹھہرنے کا گھر ہے جنت اور جہنم اسی دُنیا کے دو مختلف نقشے ہیں یہی زندگی "ابقیٰ" ہے۔ (پ۳۰ اعلیٰ) آگے فنا نہیں۔

انّ الدار الاٰخرۃ لھی الحیوان لوکانوا یعلمون۔ (پ۲۱، العنکبوت)

یہ چاروں ادوار بالترتیب چلتے ہیں اور صفاتِ مختلفہ رکھتے ہیں جو مختلف جہات سے جمع ہوتی رہی ہیں۔ ان میں سے کوئی دو عالم آپس میں متوازی نہیں۔

فلھٰذہ الانفس اربع دور کل دار اعظم من التی قبلھا۔[3]

ترجمہ۔ سو ان جانوں کے لیے یہ چار جہان ہیں ان میں سے ہر جہان پہلے سے بڑا ہے۔

---

[1] جامع ترمذی جلد ۲ صفحہ ۵۲۴ لکھنؤ [2] پنجاب کے جھوٹے مدعیٔ نبوت مرزا غلام احمد قادیانی کو احتلام ہوتا تھا۔ (سیرت المہدی حصہ صـ) [3] کتاب الروح صـ ۱۴۴

عالمِ ارواح ہے یہ دنیا وسیع ہے اور اس کے عجائب کی انتہا نہیں۔ سائنس کے سارے کرشمے اسی جہان میں کھلے ہیں۔ اس دنیا سے عالم برزخ کی وسعت زیادہ ہے۔ اس کے اسرار کی انتہا نہیں۔ ہر سُو اللہ رب العزت کی قدرت کے جلوے ہیں اور آخرت کی مدت لامتناہی ہے۔ ہر طرف خالدین فیہا کی صدائیں ہیں۔ یہاں آکر گاڑی رک جاتی ہے اور موت ذبح کر دی جاتی ہے۔ آگے کسی اور جہان میں تبادلہ نہ ہو گا۔ یہ چاروں جہان اپنے اپنے وقت میں رہنے کی جگہیں ہیں۔ وہاں ہمیشہ رہنے کی جگہ صرف آخرت ہے۔

ان الدار الاٰخرۃ لھی الحیوان لو کانوا یعلمون۔ (پ ۲۱ العنکبوت آیت ۶۴)

یہ چاروں جہان آپس میں ایک لطیف ربط رکھتے ہیں۔ آخرت حیاتِ برزخ کی ہی تمام تمام ہے۔ عالم برزخ میں بھی روح و بدن کا ایک لطیف اور برزخی تعلق تھا جو عالمِ آخرت میں آکر کھل گیا اور بدن میں حیات اس طرح عود کر آئی جس طرح عالمِ دنیا میں تھی۔ سو جن آیات اور روایات میں اس دن روح و بدن کا ملنا یا ارواح کا لوٹنا ہے۔ اس سے مراد کامل درجے میں روح و بدن کا ملنا ہے۔ اُن میں یہ مراد ہرگز نہیں کہ پہلے روح و بدن میں کسی درجے کا کوئی علاقہ نہ تھا۔ اگر ہر جہان ایک نئی دنیا ہو تو پھر اگلے جہاں میں پہلے جہان والے پکڑے کیوں جائیں۔

عالم برزخ میں ہر ایک کی پکڑ اپنی اپنی ہے اور عالمِ آخرت میں تمام افراد انسان مختلف انواع میں منقسم ہو کر اجتماعی پکڑ یا اجتماعی آرام و راحت پائیں گے۔

یہ کہنا صحیح نہیں کہ عالم برزخ کا اس دنیا سے کوئی تعلق نہیں۔ اس دنیا والا جسد ہی تو سپردِ برزخ کیا جاتا ہے جس پر پھر وہاں کے حالات کے گزرتے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ لکھتے ہیں:۔

واعلم انّه لیس عالم القبر الّا من بقایا ھذا العالم وانّما تترشح ھنالك العلوم من وراء حجاب وانّما تظھر احکام النفوس المختصة بفرد دون فرد بخلاف لحوادث الحشریة فانّما تظھر علیھا وھی فانیة

من احکامها الخاصة بفرد فرد باقیة باحکام الصورة الانسانیة۔[1]

ترجمہ۔ اور سمجھ لیجئے کہ عالم قبر اس عالم دنیا کا ہی ایک حصہ ہے جو باقی رہا اور اس میں پردۂ غیب کے پیچھے سے علوم اترتے ہیں اور وہی احکام ظاہر ہوتے ہیں جو افراد سے مخصوص ہوں (ہر کسی کے اپنے اپنے) بخلاف حشر کے حالات کے۔ یہ وہاں ظاہر ہوں گے اور برزخ کے انفرادی حالات ختم ہو جائیں گے اور اب اجتماعی انسانی احکام چلیں گے۔

اس سے عالم برزخ اور آخرت میں فرق کھل کر سامنے آگیا۔ برزخ میں روح و بدن کا علاقہ مخفی ہے۔ ایک پردے کے پیچھے ہے اور آخرت میں ظاہر و باہر —— برزخ میں احکام فرداً فرداً اترتے ہیں۔ آخرت میں اجتماعی زندگی میں جو مختلف انواع میں منقسم ہوگی —— یہ بات اصولی ہے کہ عالم برزخ ایک پہلو سے اس دنیا کا ہی ایک حصہ ہے اور یہ بات بھی صحیح ہے کہ عالم آخرت کی زندگی کوئی نئی زندگی نہ ہوگی، حیاتِ برزخی کا ہی ایک پھیلاؤ ہوگی۔ جس میں روح و بدن کھلے طور پر اور کامل طور پر یکجا ہوں گے۔ یہ سمجھ لینا کہ عالم برزخ میں روح کا بدن سے کوئی علاقہ نہیں رہتا۔ یہاں تک کہ تعلقِ توجہ بھی نہیں، سخت نادانی ہے۔ حضرت شاہ صاحب آگے جا کر لکھتے ہیں:۔

فاعلم ان حشر الاجساد واعادة الارواح الیها لیست حیاة مستأنفة انما تتمة النشأة المتقدمة بمنزلة التخمة لکثرة الاکل کیف ولو لا ذلك لکانوا غیر الاولین ولما اخذوا بما فعلوا۔[2]

ترجمہ جان لو کہ حشر اجساد اور جسموں میں روحوں کا (کاملۃً) لوٹنا یہ کوئی نئی زندگی نہیں ہے یہ پہلی گزری زندگی کا ہی ایک تتمہ ہے جیسے بیج سے آگے فصل بنتی ہے اور ایسا کیوں نہ ہو۔ ایسا نہ ہوتا تو بعد کے اجسام پہلوں سے کلیۃً مختلف ہوتے اور ان پر اپنے اعمال کا کسی طرح مواخذہ نہ ہو سکتا۔

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ صہ ۳۶ مترجم صہ
[2] ایضاً ج ۱ صہ ۳۷

ان چار جہانوں میں صرف پہلا جہان عالم الارواح ہے۔ ان تینوں جہانوں میں انسان نفس انسانی رکھتا ہے۔ انسان جسم اور روح دونوں سے مرکب ہے اور اس مجموع کو ہی نفس انسانی کہتے ہیں۔ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب دامت برکاتہم مہتمم دارالعلوم دیوبند لکھتے ہیں :۔

انسان دو چیزوں سے مرکب ہے۔ جسم اور روح۔ اس کا مجموعہ ہی نفسِ انسانی کہلاتا ہے۔ اس نفسِ انسانی کو طبعًا تین جہانوں سے گزرنا ہوتا ہے۔ ایک دُنیا جو دارالعمل ہے۔ ایک آخرت، جو دارالقرار ہے اور ایک برزخ جو دارالانتظار ہے۔ ان تینوں جہانوں کے احکام مختلف ہیں اور ان کی نوعیت الگ الگ ہے۔

(۱) دنیا میں جسم اور جسمانی زندگی اصل ہے۔ روح اس کے تابع ہو کر اس کے اثرات قبول کرتی ہے۔

(۲) برزخ میں روح اور روحانی زندگی اصل ہے۔ جسم اس کے تابع ہو کر اس کی نعمت و مصیبت کے اثرات قبول کرتا ہے۔ خواہ وہ اپنی ہیئت پر ہو، یا بکھر جائے۔

(۳) اور آخرت میں روح و جسم کا مکمل امتزاج ہے جس میں ہر ایک اپنے اپنے تاثر میں مستقل ہے اور ہر ایک کا اپنا اپنا ادراک اور اپنا اپنا انتفاع ہے۔

ان تینوں جہانوں میں روح کے تعلق کی نوعیت

برزخ چونکہ دنیا اور آخرت کے بیچ میں ہے۔ اس لیے اس کا ان دونوں جہانوں سے تعلق ہے۔ آدمی جیسے برزخ میں رہتے ہوئے آخرت کی نعیم و جحیم کا مشاہدہ کرتا ہے۔ روحانی طور پر ان سے متلذذ یا متألم ہوتا ہے اور مدارات آخرت کی زیارت سے بھی مشرف ہوتا ہے۔ ایسے ہی برزخ میں رہتے ہوئے دُنیا کی

معلومات سے بھی حسبِ حیثیت و مرتبہ مستفید ہوتا ہے۔ دنیا والوں کے اعمالِ خیر یعنی دعاء ایصالِ ثواب، افاضۂ باطنی اس تک پہنچتے ہیں حتیٰ کہ وہ اوس کی زیارت سے بھی منتفع ہوتا ہے۔ پھر خود بھی اپنے اسی قسم کے تصرف دعاء اور ہمتِ باطن سے افاضۂ انوار و کیفیات حتیٰ کہ اپنی ملاقات و زیارت کا بھی انہیں موقع دیتا ہے جس کے لیے نصوصِ شرعیہ موجود ہیں۔

برزخ کا عالمِ دُنیا سے قریبی تعلق

لیکن غور کیا جائے تو برزخ کا تعلق کا تعلق بہ نسبت آخرت کے دنیا سے زیادہ ہے۔ کیونکہ انسانی نفس کا ایک مستقل جزو (روح) جیسے عالم برزخ میں ہے ویسے ہی اس کا دوسرا مستقل جزو (بدن) دنیا کے عالم میں موجود ہے۔ خواہ بہیئت بدن ہو یا بہیئتِ ذرات لیکن آخرت میں قبل از قیامت انسانی نفس کا کوئی جزو بھی مستقلاً قائم اور مستقر نہیں چہ جائیکہ خود نفس قائم ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ وقتاً فوقتاً اسے عالمِ آخرت کے اہم مقامات اور عجائبات کی سیر کرا دی جائے یا مشاہدہ ہو جائے اور وہ روحانی طور پر ان کی نعمتوں اور کلفتوں سے متلذذ اور متألم بھی ہو لیکن قیامت سے پہلے آخرت چونکہ انسان کا مستقر نہیں اور اس کا کوئی جزو تک بھی وہاں جنت یا نار میں ٹھہرا ہوا نہیں کہ اس کے حیلہ سے انسان کو وہاں اقامت گزیں اور قیام پذیر کہہ دیا جائے۔ اس لیے اس کے تعلق کی نوعیت بھی صرف ایک مشاہداتی یا جزوی طور پہ انتفاعی رابطہ کی ہے بخلاف دنیا کے کہ اس میں اس کا ½ حصہ (بدن) مقیم ہے خواہ اپنی ہیئت پہ یا بصورتِ ذرات۔ خواہ وہ کہیں منتشر ہوں۔

ف۱ عالم برزخ از حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ

اہلِ برزخ کی دُنیا سے اور اہلِ دنیا کی برزخ سے دلچسپی

اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ برزخ کو جتنا تعلق دنیا سے ہے اتنا آخرت سے نہیں اس کا قدرتی تقاضا ہے کہ برزخی اہلِ دنیا سے اور اہلِ دنیا برزخی افراد سے ملنے، زیارت کرنے اور ان کے احوال و مقامات جاننے کے خواہشمند ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ قبر میں سوال و جواب کے بعد کامیاب میت کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ مجھے اجازت دے دو کہ میں اپنے اعزہ و اقارب کو تسلی دے آؤں کہ میں بہت اچھی حالت میں ہوں۔ بالفاظِ دیگر میں اپنے احوال و متعلقات ان تک پہنچا دوں۔ جیسے بنصِ قرآنی شہداء حق تعالیٰ سے درخواست کرتے ہیں[1] کہ ہمارے ان اعلیٰ مقامات کی خبر ہمارے دنیوی بھائیوں تک پہنچا دی جائے تاکہ وہ بھی جہاد فی سبیل اللہ کی طرف راغب ہو جائیں۔ اسی طرح برزخ والے دنیا والوں کے احوال معلوم کرنے کے خواہشمند رہتے ہیں جیسے بنصِ حدیث نبوی مرنے کے بعد روح کے عالمِ برزخ میں پہنچتے ہی میت کے اعزہ و اقارب اس کے اردگرد جمع ہو جاتے ہیں اور اپنے اپنے عزیزوں کے حالات بے تابی سے دریافت کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ ملائکہ کو یہ کہہ کر انہیں روکنا پڑتا ہے کہ اسے دم تو لینے دو، یہ موت کی شدتوں سے چور چور ہو کر آرہا ہے

بہرحال جانبین سے ایک دوسرے کے احوال و مقامات پر مطلع ہونے کی خواہش اسی بنا پر ہے کہ برزخ کا دُنیا سے اور دنیا کا برزخ سے بہت قریب کا رشتہ ہے۔ ہر ایک کا ایک نصف حصہ دنیا میں ہے۔ اور ایک نصف حصہ برزخ میں۔

---

[1] وَيَسْتَبْشِرُونَ بِالَّذِينَ لَمْ يَلْحَقُوا بِهِم مِّنْ خَلْفِهِمْ۔ (پ۴ آلِ عمران آیت ۱۷۰ تفسیر عثمانی ص۱۲۴)

اہل برزخ اور اہل دنیا کی باہمی واقفیت

حق تعالیٰ کی بالغ حکمت نے جب ان دونوں جہانوں میں اس تقسیم اجزاء کی وجہ سے یہ خواہش فطرتاً ان میں ڈال دی ہے تو اسی کی فیاض قدرت کا یہ بھی تقاضا تھا کہ وہ اس خواہش کی تسکین کا سامان بھی پیدا فرمائے اور ایسے وسائل و ذرائع پیدا فرما دے کہ برزخ والے دنیوی مقامات و احوال سے اور دنیا والے برزخی مقامات و احوال سے خود بلا واسطہ بھی باخبر ہوتے رہیں اور ان مقامات کی معرفت حاصل کرتے رہیں۔

باہمی واقفیت کے پانچ طریقے

باہمی واقفیت کے وسائل و طرق کیا ہیں؟ کتاب و سنت کی روشنی میں جہاں تک اپنے نارسا ذہن کی رسائی ہوئی پانچ طریقے سامنے آئے جن سے براہِ راست برزخی مقامات و احوال کا فی الجملہ علم ہو سکتا ہے:

(۱) ایک عینی مشاہدہ۔

(۲) دوسرے مخبر صادق کی خبر

(۳) تیسرے صاحبِ واقعہ کی اطلاع دہی۔

(۴) چوتھے انکشافِ قلبی۔

(۵) پانچویں قیاس و استنباط

پانچوں طریقوں کے فنی اور اصطلاحی عنوانات

انہی پانچ مقامات کو اگر قدرے ترتیب بدل کر اور اصطلاحی لفظوں میں لاتے ہوئے بحثوں کے انداز سے بطور فنی ترتیب کے ادا کیا جائے تو ذیل کے عنوانات

سے ادا کر سکیں گے۔

پہلا استدلال شرعی۔ دوسرا کشف باطنی۔ تیسرا رویائے صادقہ، چوتھا عبرت و اعتبار۔ پانچواں عیان و مشاہدہ۔

پہلا مقام علماء کا ہے، دوسرا عرفاء کا ہے، تیسرا صلحاء کا ہے، چوتھا عقلاء کا ہے اور پانچواں ہر کس و ناکس کا ہے

پھر ان مقامات کی نوعیت یہ ہے کہ پہلا مقام اختیاری اور یقینی ہے، دوسرا اکتسابی ظنی ہے، تیسرا غیر اختیاری مگر ظنی ہے، چوتھا اختیاری ظنی ہے اور پانچواں کلیۃً غیر اختیاری مگر یقینی ہے جو محض موہبت من اللہ ہے۔ ان پانچوں طریقوں سے لوگوں نے برزخی مقامات تک علمی اور عرفانی رسائی حاصل کی ہے۔

ان مختلف طرق میں اولین مرتبہ استدلال شرعی کا ہے کہ اللہ تعالیٰ و رسولؐ برزخ کے بارے میں خود خبر دیں اور امت اس سے استدلال کر کے اس پر ایمان لائے۔

استدلال کا شخصیاتی درجہ

پھر استدلال شرعی کے درجہ میں ایک درجہ شخصیاتی ہے کہ کسی شخص معین کا نام لے کر اللہ و رسول اسے جنت، یا مقام یا برزخ میں عالی مقام ظاہر فرمائیں تو ظاہر ہے کہ یہ معرفت یقینی اور واجب الاعتقاد ہوگی۔ جیسے ایک بار حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں طرف صدیق اکبرؓ اور بائیں طرف فاروق اعظمؓ تھے اور ایک دوسرے کے گلے میں ہاتھ ڈالے ہوئے نکلے اور حضورؐ نے فرمایا۔ ھکذا نبعث۔ ہم اسی طرح گلے میں باہیں ڈالے ہوئے قبروں سے اٹھیں گے جس سے مقامات۔ برزخ پر روشنی پڑتی ہے۔

یا جیسے حضرت بلالؓ عین نزع کے وقت بے حد خوش و خرم نظر آرہے تھے۔ چہرہ انتہائی بشاش اور امنگوں سے پُر محسوس ہو رہا تھا۔ اسی حالت میں شوق و خوشی سے لبریز آواز میں فرمایا۔ غدا نلقی محمدا و اصحابہٗ (کل کو انشاء اللہ ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحابؓ سے ملیں گے) آپ درحقیقت اپنا برزخی مقام ظاہر کر رہے تھے کہ وہ معیت نبوی میں ہوگا۔ اور ظاہر ہے کہ یہ فرمانا قیاس و تخمین سے ممکن نہ تھا بلکہ قوت یقین اور جوشِ ایمان سے تھا جو بلاشبہ امر تعبدی ہے عقلی اور قیاسی نہیں۔ اس لیے یہ حدیث مرفوع کے حکم میں ہوگا اور یہی کہا جائے گا کہ اس برزخی مقام کی حضورؐ ہی نے انہیں اطلاع دی ہوگی جس پر انہیں اس درجہ کامل وثوق اور یقین تھا اور یقین بھی محض عقلی نہیں بلکہ یقین حالی تھا۔ اس لیے اس اطلاع کو استدلال شرعی کے دائرہ میں ہم شخصیاتی مقام کہیں گے۔ اس سے ہمیں ایک برزخی مقام کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔

استدلال کا طبقاتی درجہ

شرعی استدلال کا دوسرا درجہ طبقاتی ہے کہ اللہ و رسول کسی خاص طبقہ کے برزخی مقام کو ظاہر فرمائیں جس میں افراد و اشخاص کا تذکرہ نہ ہو بلکہ ایک طبقہ اور صنف کا ذکر ہو جیسے قرآن کریم میں شہداء کا مقام بیان کیا گیا کہ وہ زندہ ہیں اور اپنے پروردگار کے پاس سے رزق پاتے ہیں اور بعضِ حدیث انہیں سبز پرندوں کے خول دیئے جائیں گے جن میں وہ اڑ اڑ کر جنتوں میں سیر کریں گے اور انہیں اس کے پھلوں، باغوں اور نہروں سے منتفع ہونے کی آزادی ہوگی۔ لیکن جنت اس وقت ان کا قرار نہ ہوگی بلکہ ان کا قراری مقام وہ سونے اور جواہرات کی قندیلیں ہوں گی جو عرش میں آویزاں ہوں گی اور یہ ارواح طیبہ اپنے ان برزخی اجسام کے ساتھ ان میں

پیرا کریں گی۔ [1]

مزید اکرام و تنشیط کے لیے ان سے بار بار پوچھا جاتا رہے گا کہ کچھ اور چاہتے ہو، وغیرہ۔ اس سے ایک خاص طبقہ کا برزخی مقام مشخص ہوا، اس لیے جو بھی شہادت کے مرتبہ کو پہنچے گا اس کے لیے اسی مقام کی شہادت دی جائے گی۔

استدلال کا کلیاتی درجہ

استدلال شرعی کا تیسرا مقام کلیاتی ہے جس میں برزخی مقام معلوم کرنے کا محض اصولی معیار ذکر کر دیا گیا ہو یعنی اشخاص یا طبقات کا کوئی ذکر نہیں بلکہ صرف ایک کسوٹی دے دی گئی ہو کہ ہر شخص کو اس پر پرکھ کر دیکھ لیا جائے تو اپنا اور غیر کا برزخی مقام معلوم ہو سکے گا۔ حدیث نبوی میں اصول ارشاد فرما دیا گیا کہ:۔

تحشرون کما تموتون و تموتون کما تحیون۔

"تمہارا حشر اس حالت پر ہو گا جس پر موت آئی تھی اور موت اسی حالت پر آئے گی جس پر زندگی گزاری ہے"

اس کلیہ میں ہر شخص کے محشر کے مقام کو پہچاننے کی کسوٹی تو حالت موت کو بنایا گیا ہے اور برزخی مقام پہچاننے کے لیے (جو موت سے شروع ہو کر یوم محشر پر ختم ہوتا ہے) دنیا کی عملی زندگی کو معیار تعارف فرمایا گیا ہے۔ پس اُخروی مقام کے لیے ذریعہ تعارف برزخ ہے اور برزخی مقام کے تعارف کے لیے ذریعہ تعارف دنیوی زندگی کی رفتار ہے جو اصولاً ہر انسان کے سامنے اپنی یا اپنے متعارف انسانوں کی کسی نہ کسی حد تک مستحضر رہتی ہے۔ اس سے برزخی مقام کے پہچاننے

---

[1] وہاں سے ان ارواح کا ان کے یہاں کے اجساد سے جو برزخی تعلق ہے یہ وہاں کا قرار اس تعلق میں مانع نہیں۔

کا ایک اصولی اور کلیاتی طریقہ معلوم ہوا جس سے انسانوں کے اعمال اور زندگی دیکھ کر فی الجملہ ان کے برزخی مقام کو پہچانا جا سکتا ہے۔

کلیاتی استدلال کی مثالی توضیح

یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہم کیسے معلوم کریں کہ اللہ کے یہاں ہمارا کیا مقام اور کیا مرتبہ ہے؟ فرمایا اپنے عمل کو دیکھ لو، یعنی عمل کی نوعیت سے قرب اور قربِ الٰہی کی نوعیت معلوم کرو۔ پھر اس تعارفی طریقہ کو اور ذرا وسیع فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اگر تمہارے پڑوسی تمہارے حق میں نیک گواہی دیں تو سمجھ لو کہ تم عند اللہ بھی اچھے ہو۔ پھر اس معیاری دائرہ کو ذرا اور وسیع کرتے ہوئے ارشاد ہوا کہ تم زمین پر خدا کے سرکاری گواہ ہو جس کے حق میں جیسی گواہی دے دوگے وہ اللہ کے نزدیک بھی ویسا ہی مانا جائے گا۔ خواہ وہ دنیا میں ہو یا برزخ اور آخرت میں۔ چنانچہ دنیا میں ایک جنازہ گزرنے پر حضورؐ نے فرمایا کہ جنت واجب ہو گئی اور علتِ وجوب یہ فرمائی کہ لوگ اس کے بارہ میں کلمہ خیر کہہ رہے ہیں کہ یہ اچھا آدمی تھا، لہٰذا جنتی ہو گیا۔ اور ایک دوسرا جنازہ گزرنے پر فرمایا کہ جہنم واجب ہو گئی کیونکہ لوگ اس کے بارے میں کہتے جا رہے تھے کہ بہت بُرا آدمی تھا خس کم جہاں پاک۔ اسی طرح آخرت میں بھی بحق اقوام اس امت کی شہادت معتبر ہو گی اور اس امت پر رسول شاہد ہوں گے جیسے قوم نوحؑ کا فیصلہ اسی امت کی شہادت پر کیا جائے گا۔

ہر سہ استدلال شرعی سے برزخی مقامات کا اندازہ

بیان مذکور سے معلوم ہوا کہ استدلال شرعی کا ایک مقام شخصیاتی ہے ایک

طبقاتی ہے اور ایک کلیاتی جس سے ہر انسان کے برزخی مقام کا فی الجملہ اندازہ ہو سکتا ہے۔

پھر ان تینوں مقاموں میں اجمال و تفصیل کا فرق بھی ہے۔ مثلاً شخصی طور پہ کسی کے لیے یا اس کے مقام کی تفصیلات ارشاد فرمائی گئی ہوں یا اسے درجۂ اجمال میں ذکر کیا گیا ہو، اسی طرح طبقاتی اور کلیاتی اطلاعات میں بھی اجمال و تفصیل کا فرق ہے کہ کس کے لیے ایک ایک عمل کو تشخص کے ساتھ یا نوعی طور پہ الگ الگ گنا کر اس کا برزخی ثمرہ تفصیل سے ظاہر کیا گیا ہو۔ اس صورت میں تو وہ اس عمل کنندہ کا تفصیلی برزخی مقام ہوگا۔[۱]

عالمِ برزخ کی تفصیل اس لیے گذارش کی گئی ہے کہ آپ اس کی کچھ وسعتوں کا اندازہ کر سکیں تاہم اس اقرار سے چارہ نہیں کہ عالمِ برزخ کے حالات اور کیفیات کا اس طرح جان لینا جیسا کہ ہم یہاں دنیا میں ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں کوئی آسان کام نہیں۔

اس کے مختلف الانواع انکشافات کے باوجود اس پہ الٰہی حکمت کے ہزاروں پردے پڑے ہیں۔ اس کے بعد عالمِ آخرت ہے۔ جس میں ایک دوسرے کو جاننا پہچاننا اور ملنا ملانا اسی طرح واضح ہوگا جس طرح ہم یہاں ایک دوسرے کو جانتے اور پہچانتے ہیں۔ بلکہ وہاں ظواہر کے ساتھ حقائق بھی کھلے نظر آئیں گے۔

عالمِ ارواح کے بعد یہ تینوں جہان عالمِ دنیا ہو یا عالمِ برزخ یا عالمِ آخرت نفسِ انسانی سے قائم ہیں صرف عالمِ ارواح ہے جس میں صرف روحوں کی زندگی ہے اور اسی لیے اسے عالمِ ارواح کہتے ہیں۔ باقی تینوں جہان روح و بدن کے مختلف النوع تعلق سے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ انسان ان جہانوں میں اپنے اپنے وقت میں رہتا ہے۔ وہاں مستقل طور پہ دار القرار صرف عالمِ آخرت ہے۔ ان الدار الآخرۃ لھی الحیوان لو کانوا یعلمون۔

---

[۱] عالمِ برزخ ص۱۳ تالیف حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ طبع لاہور

اگر آپ دنیوی حیات کے لفظ سے بدکتے ہیں تو لیجیے اس کی بھی تفصیل سُن لیں۔ ہم شہداء اور انبیاء کو اس عالم (دنیا) میں نہیں اگلے جہان (عالمِ برزخ) میں زندہ مانتے ہیں۔ انتقالِ دارین ہو چکا ہے اور اب یہ حضرات اِس عالم کے افراد نہیں، اُس جہان کے رہنے والے ہیں۔

اگر کہیں ان نفوسِ قدسیہ کو دنیوی حیات سے زندہ کہا گیا ہے تو اُس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ان کی عالمِ برزخ کی یہ زندگی انہی ابدان سے متعلق ہے جو ان کے اس دنیا میں تھے یا یہ کہ ان کے اعمال میں دنیا کی طرح اب بھی ارتقاء ہے اور ان کی وفات سے ان کے عمل کا ارتقاء رکا نہیں۔

سو ان کی اس زندگی کو دنیا کی سی زندگی تو کہا جا سکتا ہے لیکن حقیقت میں اس عالم کی زندگی نہیں۔ ظرف کے اعتبار سے یہ ان کی برزخی زندگی ہے۔

برزخی زندگی کی اس تفصیل کے بعد ہم انشاء اللہ کچھ وہ عبارات بھی پیش کریں گے جن میں عذابِ قبر کا بیان ہے اور اس میں یہ تفصیل ہے کہ اس کے لیے روح و بدن کا بالکل دنیا کا سا تعلق ہونا ضروری نہیں۔ جس طرح وہ زندگی پردے میں ہے یہ تعلق بھی پردے میں ہے۔

اس برزخی زندگی میں موت و حیات دونوں جمع ہیں اعادہ روح ایسے انداز میں ہوا ہے کہ اس سے وہ حیات قائم نہیں ہوئی جو اسم موت کو کلیۃً اٹھا دے بلکہ اس میں ایک ایسی حیات آئی ہے جو برزخی رہے کہ عام نگاہیں تو اسے نہ پا سکیں مگر اندر ہی اندر ایک حیات قائم ہو جس سے قبر کے نعیم و الم کا ادراک ہو سکے قبر میں نعیم و الم کے اس ادراک کا اقرار اسلام کے عقائد ضروریہ میں سے ہے یہ حیات کی ایک جدی نوع ہے جو ظاہر پردے میں ہوتی ہے اسی لیے اسے حیات برزخی کہتے ہیں۔ علامہ محمد بن احمد بن عبدالہادی لکھتے ہیں:۔

ان هذه الاعادة ليست مستلزمة لاثبات حياة مزيلة لاسم الموت بل هى نوع حياة برزخية والحياة جنس تحته انواع وكذلك الموت فاثبات بعض انواع الموت لا ينافى الحياة [illegible]

اہل شہداء اور انبیاء کے لیے اس حیاۃ برزخی میں آنے سے اسم موت اٹھ جاتا ہے ان کے لیے موت صرف اس درجہ میں تھی کہ وہ عالم دنیا سے نکلے اور عالمِ برزخ میں پہنچے اس کے بعد انکے لیے موت نہیں نہ انہیں مردہ کہو نہ مردہ سمجھو۔

اسلام کا عقیدۂ برزخ

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی اما بعد:

قرآن و حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ عالمِ دُنیا اور عالمِ آخرت میں ایک درمیانی منزل ہے جس پر اسرار کا پردہ پڑا ہے یہ عالمِ برزخ ہے جسے عام نگاہیں دیکھ نہیں پاتیں۔ اس میں بھی انسان اپنے دُنیا کے بُرے عملوں پر ایک گونہ عذاب پاتا ہے۔ آخرت کے بڑے حساب سے پہلے یہاں بھی اسے ایک چھوٹے عذاب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس چھوٹے عذاب میں پھر دو احتمال ہیں۔ دُنیا کے مصائب و آفات اور امراض مراد ہوں یا آخرت سے پہلے عالمِ برزخ کا عذاب مراد ہو حضرت عبداللہ بن عباسؓ پہلی صورت کے قائل ہیں اور حضرت براء بن عازبؓ اور حضرت ابن عباسؓ کے شاگرد مجاہدؒ اس سے عذابِ قبر مراد لیتے ہیں۔ جو صورت مراد لیں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جس طرح عذابِ اکبر (آخرت کا عذاب) روح اور جسم دونوں سے متعلق ہے یہ عذاب ادنیٰ بھی روح اور جسم دونوں سے ہے۔ بدن جس حال میں ہو دیکھا ہو جیسا کہ اس دنیا میں ہے یا ذراتِ منتشرہ کی صورت میں) اس عذابِ ادنیٰ کا تعلق بدن سے ضرور ہے

دُنیا کی زندگی ایک کھلی کتاب ہے۔ ہر کوئی اسے پڑھ سکتا ہے۔ یہ ہر کسی کے لیے مُدرَک اور مُشاہَد ہے۔ آخرت کی زندگی بھی کھلی ہوگی اور لوگ ایک دوسرے کو پہچانیں گے۔ اہلِ نعیم بھی ایک دوسرے کو پہچانیں گے اور جہنمی بھی ایک دوسرے کو پہچانیں گے۔ دُنیا اور آخرت کے درمیان کی زندگی پر ایک پردہ ہے اور یہ پردہ قیامت تک رہے گا۔ پردے کو عربی میں برزخ کہتے ہیں۔ یہ برزخی زندگی پردے میں ہی ہے۔ یہاں کی آنکھیں اسے پا نہیں سکتیں اور یہاں کے کان از خود اسے سُن نہیں پاتے۔ اللہ تعالیٰ اس سے کسی وقت کسی شخص کے لیے پردہ اٹھا دیں تو یہ اور بات ہے۔ علامہ ابو عبداللہ القرطبی (۶۷۱ھ) لکھتے ہیں:

فاعلموا ایہا الاخوان ان عذاب القبر و نعیمہ حق کما صرحت بہ الاحادیث الصحیحۃ و لکن اللہ تعالیٰ یاخذ بابصار الخلائق و

اسماعھم من الجن والانس عن رؤیۃ عذاب القبر ونعیمہ الحکمۃ الٰھیۃ ومن شک فی ذٰلک فھو ملحد[1]

ترجمہ۔ اے بھائیو! جان لو کہ قبر کا عذاب اور اس کا آرام برحق ہے۔ احادیث صحیحہ صراحت سے یہی بتلا رہی ہیں۔ ہاں اللہ تعالیٰ نے دوسرے انسانوں کی آنکھوں اور ان کے کانوں سے اس عذاب اور راحت کو اپنی حکمت سے پردے میں کر رکھا ہے اور جو شخص اس برزخی عمل میں شک کرے وہ ملحد ہے (گمراہ ہو چکا)

یہ عمل پردے کا ہے اسے محسوس نہ کر سکنے کے پیش نظر اس کا انکار نہ کیا جائے اسے برزخی زندگی کہتے ہی اس لیے ہیں کہ اس کا ادراک و احساس کھلے بندوں نہیں ہوتا لیکن اس کا ہونا برحق ہے گو ہم اُسے کھلے طور پر دیکھ نہ سکیں۔ علامہ سیوطی (۹۱۱ھ) لکھتے ہیں:۔

ونحن لا نشعر بہ کما انا نحسب المغمیٰ علیہ میتاً وکذٰلک یضیق علیہ الجو کضمۃ القبر ولا سیکر مشیاء من ذٰلک من خالطہ الایمان قلبہ[2]

ترجمہ۔ اور ہم اسے محسوس نہیں کر پاتے جیسا کہ ہم بے ہوش کو مردہ سمجھ لیتے ہیں اور اسی طرح اس مُردہ پر فضا تنگ کر دی جاتی ہے (جو لکڑی پہ لٹکا ہو) اور یہ اس کے لیے ضمۃ القبر (قبر کا دباؤ) ہے۔

حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ بھی لکھتے ہیں:۔

روح کا تعلق باوجود علیین و سجین کے تعلق کے بدن کے ساتھ بھی ہے اور ضرور ہے۔ مگر اس کو دُنیا کی آنکھیں محسوس نہیں کر سکتیں۔ کیونکہ عالم غیب کے اسرار دُنیا دار کی آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں اور نہ دکھایا جانا ہی مناسب ہے۔ کیونکہ

---

[1] مختصر التذکرہ ص۳۶ للشعرانی طبع مصر [2] شرح الصدور ص۵۹ مصر

پھر ایمان بالغیب نہیں رہے گا۔[1]

دُنیا اور آخرت کے درمیان یہ برزخی زندگی ہے۔ اس کے سارے معاملات پردے کے پیچھے ہیں۔ دُنیوی زندگی، برزخی زندگی اور اُخروی زندگی۔ یہ تین دوائر حیات ہیں اور تینوں میں بدن اور روح ساتھ ساتھ ہیں۔ ہاں برزخ میں یہ ربط اور تعلق اتنا لطیف ہے کہ اسے سمجھنا بہت مشکل ہے۔ سوائے اس کے کہ اس باب میں ہم نصوصِ شریعت پر ایمان لائیں اور اس کے جو آثار ہمیں کتاب و سنت میں ملتے ہیں انہیں حق تسلیم کریں۔

① قرآن کریم میں تین زندگیوں کا ثبوت

حضرت یحیٰی علیہ السلام کے لیے تین دفعہ سلامتی کی دُعا کی گئی ہے

① پیدائش کے دن (یہ سلامتی ان کی پوری دنیوی زندگی کو شامل ہے)۔
② وفات کے دن (یہ سلامتی پوری برزخی زندگی کو شامل ہے)۔
③ جس دن آپ قبر سے زندہ اُٹھائے جائیں گے (یہ سلامتی پوری اُخروی زندگی کو محیط ہوگی۔

قرآن کریم میں ان تینوں حالتوں کا بیان ہے:۔

وسلامٌ علیہ یوم ولد ویوم یموت ویوم یبعث حیًّا

(پ ۱۶۔ سورۂ مریم آیت ۱۵)

پیدائش کے دن کی سلامتی صرف اسی دن کے لیے نہیں۔ پوری دنیوی زندگی کے لیے ہے۔ وفات کے دن کی سلامتی اگلی برزخی زندگی کے لیے مانگی گئی۔ وفات کے بعد اگر کوئی زندگی نہیں تو یہ سلامتی کی دُعا کیا صرف موت کی گھڑی کے لیے کی گئی تھی؟ یہ زندگی پردے میں ہے۔ ہاں کھلی زندگی سے آپ اس وقت اُٹھائے جائیں گے جس دن سب کو قبروں سے اُٹھنا ہے۔ ان تینوں زندگیوں میں روح و بدن دونوں کے لیے سلامتی کی طلب ہے۔

---

[1] المصالح العقلیہ جلد ۳ صد ۲۲۸

اس آیت میں نہایت واضح طور پر تین زندگیوں کا ثبوت ملتا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی دعا کی ہے۔

والسلام علی یوم ولدت ویوم اموت ویوم ابعث حیا۔

(پ ۱۲ : مریم آیت ۳۳)

ترجمہ۔ سلامتی مجھ پر اس دن بھی ہوئی جس دن میں پیدا ہوا اور اس دن بھی ہو جب میں مروں اور اس دن بھی جب میں زندہ کیا جاؤں۔

یہاں تین ایام سے صرف تین دن مراد نہیں تین مواطن مراد ہیں اور یہ تین زندگیاں ہیں۔

یہ صرف ایام ثلٰثہ ہیں یا مراد مواطن ثلٰثہ ہیں

یہاں صرف یوم پیدائش۔ یوم وفات اور یوم بعث مراد نہیں، مراد مواطن ثلٰثہ ہیں اور انسان ان تینوں میں اللہ رب العزت سے سلامتی کا طالب ہے۔ محققین نے یہاں مواطن ثلٰثہ ہی مراد لیے ہیں۔

حافظ ابن الجوزی (۵۹۷ھ) اپنی تفسیر زاد المسیر میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کی اس دعا پر لکھتے ہیں۔

فخص اللہ تعالٰی یحیٰی بالکرامۃ والسلامۃ فی المواطن الثلٰثۃ۔[1]

ترجمہ۔ اللہ تعالٰی نے یحیٰی کو ان تینوں مواطن میں عزت اور سلامتی سے خصوصیت بخشی ہے۔

علامہ نسفی (۷۰۲ھ) بھی مدارک میں لکھتے ہیں کہ یہاں مواطن ثلٰثہ مراد ہیں۔

وذٰلک السلام الموجہ الی یحیٰی فی المواطن الثلٰثۃ۔[2]

آیئے اب ذرا آپ کو ساتویں صدی میں لے چلیں۔

---

[1] زاد المسیر جلد ۵ صفحہ ۲۱۵ [2] مدارک التنزیل جلد ۳ صفحہ ۲۲

علامہ قرطبی (۶۷۱ھ) یوم ولادت سے پوری دنیا کی زندگی مراد لیتے ہیں کہ انسان پوری دنیوی زندگی میں خدا سے سلامتی کا طلب گار ہے۔ ویوم اموت سے پوری قبر کی مدت مراد ہے اور اس دور میں بھی انسان سلامتی کا محتاج ہے اور یوم ابعث حیا سے بھی آخرت کی پوری زندگی مراد ہے۔

ان مواطن کی ابتدا، یوم ولادت، وفات اور یوم بعث ہے اس لیے ذکر کی کہ ان مواقع میں انسان بہت کمزور، بےبس اور نہایت مضمحل ہوتا ہے، پھر کچھ سنبھلتا جاتا ہے۔

علامہ قرطبی لکھتے ہیں!

وجاء فی المواطن التی الانسان فیه فی غایة الضعف والحاجة۔[1]

پھر آگے جا کر لکھتے ہیں:۔

یوم ولدت یعنی فی الدنیا ویوم اموت یعنی فی القبر ویوم ابعث یعنی فی الآخرة۔

اور حاصل اس دعا کا لکھتے ہیں:۔

فسلم فی احواله کلها[2]

کہ وہ اپنے ان تینوں احوال کے کل عرصے میں خدا سے سلامتی کا طالب ہے۔

امام فخر الدین رازی (۶۰۶ھ) بھی ان تین دنوں سے فقط ایام ثلثة مراد نہیں لیتے۔ ان مواطن کی کل مدت مراد لیتے ہیں۔ سو یہاں یوم اموت سے کل برزخی زندگی مراد ہے نہ کہ ایک دن۔ آپ لکھتے ہیں:۔

اعظم احوال الانسان احتیاجا الی السلامة هی هذه الاحوال الثلثة... فجمیع الاحوال یحتاج فیها الی السلامة واجتماع السعادة من قبله تعالیٰ طلبها لیکون مصونا عن الآفات والمخافات فی کل من الاحوال۔[3]

---

[1] الجامع لاحکام القرآن جلد ۱۱ صفحہ ۸۸ [2] تفسیر قرطبی جلد ۱۱ صفحہ ۱۰۵ [3] تفسیر کبیر جلد ۲۱ صفحہ ۲۱۶

ترجمہ۔ انسان کے سب سے زیادہ حاجتمندی کے احوال یہ تین مواقع ہیں۔۔۔۔
سو تمام احوال جن میں وہ خدا کی طرف سے سلامتی اور خوش قسمتی کا طالب ہو سکتا ہے ان میں اس کی طلب ہے کہ وہ ان تمام میں جملہ آفات اور مخافات سے محفوظ رہے۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی بھی یوم اموت کو صرف یوم وفات سے خاص نہیں کرتے اس سے قبر کی پوری مدت مراد لیتے ہیں اور والسلام علی (مجھ پر سلامتی ہو) سے ایک نہایت لطیف معنی اخذ کرتے ہیں کہ یہ جملہ اسمیہ ہے۔ حالانکہ پہلے بات جملہ فعلیہ میں چلی آرہی تھی ـــــ یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے سلامتی دنیا کی پوری زندگی میں قبر کی پوری مدت میں اور آخرت کی پوری زندگی میں شامل رہے۔

(والسلام علی) جعلت اسمیۃ للدلالۃ علی الاستمرار۔[1]

صاحب روح المعانی بھی اس کی تائید کرتے ہیں:۔

نعدل الی الاسمیۃ لارادۃ الدوام والثبوت۔[2]

تفسیر خازن میں بھی یوم وفات کی سلامتی سے مراد صرف یوم وفات کا امن نہیں سلام کی طلب عذاب قبر کی پوری مدت میں مراد لی گئی ہے۔[3]

سو اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان قبر کی برزخی زندگی میں بھی اس حالت میں ہے کہ وہ اس میں خدا کی طرف سے سلامتی اور عذاب قبر سے حفاظت چاہتا ہے۔ وہ قبر میں محض جماد اور بے جان نہیں کہ اس پر جو کچھ گزرے اسے کوئی فرق محسوس نہ ہو۔ برزخی زندگی بھی ایک زندگی ہے وہ اس میں (اپنی قبر میں) خدا سے سلامتی کا طالب ہے۔

برزخی زندگی میں انسان قبر میں اگر محض جماد بے جان ہوتا تو اس دور کے لیے اللہ سے سلامتی کی طلب نہ ہوتی۔

---

[1] تفسیر مظہری جلد ۶ صفحہ ۹۴ [2] روح المعانی جلد ۱۶ صفحہ ۷۴ [3] دیکھیے تفسیر خازن جلد ۳ صفحہ ۲۱۷

قبر میں سلام سے مراد عذاب قبر سے سلامتی ہے یا سلام تحیہ بھی مراد ہو سکتا ہے

علامہ طبری (۳۱۰ھ) نے اس سے مراد مطلق امان لیا ہے اور یہ بات عامہ اموات کے بہت مناسب ہے کہ احوال قبر اور اس کی آفات سے سلامتی مل جائے یہ بڑی بات ہے. لیکن انبیاء علیہم الصلوٰت والتسلیمات کے لیے اس سلام سے مراد سلام تحیہ ہے. ہم جب یہاں ایک دوسرے کو ملتے ہیں تو سلام تحیہ کہتے ہیں. اذا حییتم بتحیۃ فحیوا باحسن منہا (پ النساع ۱۱) میں السلام علیکم کہنے کو سلام تحیۃ کہا گیا ہے. انبیاء کرام پر اس قبر کی زندگی میں جو سلام وارد ہوتا ہے وہ سلام تحیہ ہی ہے.

قرآن کریم میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کے لیے یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے موطن وفات (قبر کی زندگی) میں جس سلام کی طلب ہے وہ یہی سلام تحیۃ ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی قبور میں محض جماد یا پتھر نہ ہوں بلکہ ایسی زندگی سے سرفراز ہوں جو گو دوسروں کو محسوس نہ ہو لیکن اللہ رب العزت کی طرف سے ان پر سلام تحیہ برابر اُترتا ہو اور امت کا سلام بھی اُن پر پیش ہوتا ہو. علامہ ابن عطیہ (ھ) کہتے ہیں :-

والاظہر عندی انہا التحیۃ المتعارفہ فہی اشرف وانبہ من الامان لان الامان متحصل بنفی العصیان عنہ وھی اقل درجاتہ وانما الشرف فی ان سلّم اللہ تعالیٰ علیہ[1]

ترجمہ: میرے نزدیک زیادہ واضح بات یہ ہے کہ یہاں سلام تحیۃ مراد ہے جو بطور سلام متعارف ہے یہ مطلق امان سے شرف اور بزرگی میں زیادہ ہے امان تو اسے گناہ نہ ہونے کی وجہ سے حاصل ہے ہی اور یہ تو ایک ابتدائی درجہ ہے شرف تو یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس (نبی) پر اپنا سلام (تحیہ) بھیجے.

---

[1] تفسیر قرطبی جلد ۱۱ ص ۸۸ روح المعانی جلد ۱۶ ص ۷۲

قرآن کریم کی نص ہے کہ انبیاء علیہم السلام پوری دنیوی زندگی اور پوری اُخروی زندگی خدا کا یہ شرف پاتے ہیں اور اُن پر بے شک یہ سلام تحیۃ اترتا ہے۔ امتوں کا سلام بھی ان پر پیش ہوتا ہے اور وہ اپنی قبر شریف میں محض جماد اور پتھر نہیں ہیں جیسا کہ پتھری سمجھتے ہیں رہی یہ بات کہ یہ قبر کی سلامتی اس متعارف قبر سے نہیں یہ کسی اور درجے کا نام ہے جس پر یہ اکرام و شرف اُترتا ہے۔ سو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کا نہایت واضح جواب ارشاد فرما چکے ہیں۔ آپ نے یہ نہ فرمایا کہ وفات کے بعد یہ اکرام و سلام روح پر پیش ہوتا ہے بلکہ بتلایا کہ اسی بدن پر پیش ہوتا ہے جسے تم سمجھتے ہو کہ ریزہ ریزہ ہو چکا ہوگا۔ حضرت اوس بن اوس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں صحابہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا۔

كيف تعرض صلوتنا عليك وقد ارمت[1]

ترجمہ۔ ہمارا درود آپ پر کیسے پیش کیا جائے جب آپ ریزہ ریزہ ہو چکے ہوں گے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

ان الله حرم على الارض ان تاكل اجساد الانبياء۔

ترجمہ۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کر دیا ہے کہ انبیاء کے بدنوں کو ریزہ ریزہ کرے۔

اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر متنبہ فرمایا کہ یہ موت کے بعد کی زندگی اسی بدن سے متعلق ہے اور یہ برزخی زندگی ہے اور اس میں بھی آپ پر صلوٰۃ و سلام پیش ہوتے ہیں۔ یہ زندگی چونکہ کھلی زندگی نہیں پردے میں ہوتی ہے اس لیے اسے برزخی زندگی بھی کہتے ہیں۔ مگر یہ برزخ چونکہ بعض علماء کے نزدیک موطن دنیوی ہیں سے ہے اس لیے اسے ایک پہلو سے دُنیوی زندگی بھی کہتے ہیں۔

---

[1] سنن ابی داؤد جلد ۱ صفحہ ۱۵۰، نسائی جلد ۱ صفحہ ۱۵۴، سنن کبریٰ للبیہقی جلد ۳ صفحہ ۲۴۹

② قیامت سے پہلے آلِ فرعون کا عذاب

آلِ فرعون کی غرقابی ایک بُری طرح کا عذاب تھا اس سے وہ عالم برزخ میں داخل ہوئے اور یہ ان کا عذاب قبر ہے۔ آخرت کا عذاب انہیں قیامت کے بعد ہوگا۔

وحاق بآل فرعون سوء العذاب ۝ النّار یعرضون علیها غدوًّا وعشیًّا ویوم تقوم الساعة ادخلوا آل فرعون اشدّ العذاب۔

(پ ۲۴ : المومن آیت ۴۶)

ترجمہ۔ اور الٹ پڑا فرعون والوں پر بُری طرح کا عذاب۔ وہ آگ ہے جس پر وہ پیش کئے جاتے ہیں صبح و شام۔ اور جس دن قیامت قائم ہوگی حکم ہوگا کہ داخل کرو فرعون والوں کو سخت در سخت عذاب میں۔

فرعونیوں کی پہلی نافرمانی کی زندگی گزر چکی۔ اب جب عذاب نے انہیں گھیرا اور وہ ڈوبے تو یہ دوسری زندگی شروع ہوگئی۔ یہ سوء العذاب ان پہ آئی۔ اس میں صبح و شام وہ آگ پہ پیش کیے جاتے ہیں کہ یہ تمہارا ٹھکانا ہے۔ اور جس دن قیامت واقع ہوگی کہا جائے گا کہ آلِ فرعون کو اس بڑے عذاب میں ڈالو۔ یہ ان کی تیسری زندگی ہوگی۔ بڑے عذاب میں داخلہ قیامت کو ہے۔ اس آیت میں سوء العذاب اور اشد العذاب کی خبر علیحدہ علیحدہ دی گئی ہے۔ حافظ ابن کثیر (۷۷۴ھ) لکھتے ہیں :۔

وھٰذہ الاٰیة اصل کبیر فی استدلال اھل السنة علیٰ عذاب البرزخ فی القبور۔[1]

ترجمہ۔ اور یہ آیت اہل السنۃ کے استدلال کی بڑی اساس ہے کہ قبروں میں عذاب برزخ ضرور ہے۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر جلد ۴ صد ۸۱

③ دُنیوی پکڑ کے متصل عذابِ اُخروی

قومِ نوح اپنی غرقابی سے اپنی برزخی زندگی میں داخل ہوئی۔ یہ آگ میں داخلہ غرق ہونے کے معاً بعد ہوا۔ اور جس دن قیامت واقع ہوگی اس دن یہ لوگ تیسری زندگی میں داخل کیئے جائیں گے یہ اُن کا اشدالعذاب میں داخلہ ہوگا۔

مما خطیئٰتھم اغرقوا فادخلوا نارًا۔ (پ ۲۹ : نوح آیت ۲۵)

ترجمہ۔ وہ اپنی غلطیوں کے سبب غرق کر دیئے گئے اور اسی وقت آگ میں ڈال دیئے گئے۔

بڑے عذاب میں یہ بھی قیامت کے دن ڈالے جائیں گے۔ شیخ الاسلامؒ لکھتے ہیں۔ بظاہر پانی میں ڈبائے گئے لیکن فی الحقیقت برزخ کی آگ میں پہنچ گئے۔[ل]

④ انسانی زندگی کے تین دور

منھا خلقنٰکم وفیھا نعیدکم ومنھا نخرجکم تارۃً اخرٰی۔

(پ ۱۶ : طٰہٰ آیت ۵۵)

ترجمہ۔ اسی زمین سے ہم نے تم کو بنایا اور اسی میں پھر تمہیں پہنچا دیتے ہیں اور اسی سے نکالیں گے تم کو ایک دفعہ پھر۔

فیھا نعیدکم سے مراد قبر میں جانا ہے۔ قبر جس شکل میں بھی ہو اور جہاں ہو یا جہاں جہاں ہو انسان کو اس میں جانا ضرور ہے۔ جلے ہوئے انسان کے ذراتِ منتشرہ جہاں جہاں بھی ہوں ان میں باریک باہمی ربط ہی اس کی قبر ہے جس پر احوالِ قبر وارد ہوں گے۔ اس قسم کی شاذ مثالوں سے ان قبورِ ظاہرہ کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ قبریں جن میں ہم ظاہراً دفن کرتے ہیں یہ بھی قبریں ہی ہیں۔

ل تفسیر عثمانی صـ ۷۴۲

اور یہی آگ کے گڑھے یا جنت کے باغات ہیں۔ ان میں میتوں کو اُتارو تو یہی سمجھو کہ یہی فیھا نعید کم کا مصداق ہیں۔ حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں :-

برزخ کے احکام روح پر جاری ہوں گے اب دکھ اور سکھ روح کو پہنچے گا وہ بجانب روح کے جسم پر بھی سرایت کرے گا۔ روح کا تعلق بدن سے گو عام حالات میں ظاہر نہیں لیکن ایک غیر معلوم وجہ پر یہ بھی رہتا ہے بدن سے اس کا بالکل انقطاع اور جدائی نہیں ہوتی۔[1]

قبر میں لوٹنے کے بعد وہاں بے جان پڑے رہنا ہے یا وہاں کے کچھ اپنے معاملات بھی ہیں جن کی مخبرِ صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے؟ حضرت براء بن عازبؓ فرماتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :-

فتعاد روحه فی حیاته فیاتیه ملکان فیجلسانه فیقولان له من ربّك۔[2]

ترجمہ۔ پس اس کی روح اس کے بدن میں لوٹائی جاتی ہے پھر اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں اور اسے بٹھاتے ہیں اور اس سے پوچھتے ہیں (تیرے عقیدے میں) تیرا رب کون ہے؟

علامہ قرطبی نے بھی اس حدیث کو ان دو حوالوں سے ذکر کیا ہے۔ اس کی پوری بحث احادیث کے ذیل میں آئے گی۔ یہاں صرف دو حوالے نوٹ فرمالیں :-

روی الامام احمد و ابوداؤد باسناد صحیح عن البراء رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔[3]

ترجمہ۔ امام احمد اور امام ابوداؤد نے سند صحیح کے ساتھ اس حدیث کو حضرت براءؓ سے روایت کیا ہے۔

ضلع مظفر گڑھ کے مشہور محقق عالم حضرت علامہ عبدالعزیز فرہاروی لکھتے ہیں :-

ان الاحادیث الصحیحة ناطقة بان الروح تعاد فی الجسد عند السوال۔[4]

---

[1] المصالح العقلیہ صد ۲۲۶ [2] مسند امام احمد جلد ۴ صد ۲۸۷ سنن ابی داؤد جلد ۲ صد ۲۹۸
[3] مختصر تذکرہ القرطبی صد ۳۴ [4] نبراس علی شرح العقائد صد ۳۲۲

ترجمہ. احادیث صحیحہ پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ روح اس سوال (فی القبر) کے وقت بدن میں لوٹائی جاتی ہے۔

فرشتوں کا میت کو بٹھانا اور سوال کرنا احادیث صحیحہ میں پوری صراحت سے موجود ہے. یہ بیٹھنا اور اٹھنا بدن کی شان ہے. روح تو کروٹیں نہیں لیتی. سو یہ قبر میں ہونوالے سارے معاملات صرف روح سے نہیں بدن اور روح کے تعلق سے ہیں مردہ ایک برزخی حیات پا چکا ہے گو ہمارے لیے یہ حیات اور اٹھنا بیٹھنا مدرک اور مشاہد نہ ہو۔

حافظ ابن مندہ نے کتاب الروح والنفس میں حدیث براء نقل کرتے ہوئے یہ بھی روایت کیا ہے[1] کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قبر میں روح کے لوٹائے جانے کا ذکر کرتے ہوئے یہ آیت بھی تلاوت فرمائی ہے ؛۔

منها خلقناكم و فيها نعيدكم و منها نخرجكم تارةً اخرىٰ۔

(پ ۱۲ : طٰہٰ : آیت ۵۵)

حضورؐ کے اس استشہاد سے ثابت ہوتا ہے کہ قبر میں روح کے لوٹائے جانے کا مسئلہ قرآن کریم میں بھی اشارۃً موجود ہے۔

فیہا نعیدکم میں قبر میں محض بے جان پڑے رہنے کی بات ہوتی تو قرآن کریم اسے اس اہتمام اور شان سے ذکر نہ کرتا. یہ واقعی دنیا اور آخرت کے درمیان ایک برزخی زندگی ہے جس کے اپنے معاملات ہیں اور یہاں مرنے والے کو قیامت تک کے لیے ٹھہرنا ہے۔

⑤ سوالاتِ اُخروی میں ثابت قدمی کی بشارت

يثبت الله الذين امنوا بالقول الثابت فى الحيوٰة الدنيا و فى الأخره و يضل الله الظالمين و يفعل الله ما يشآء۔ (پ ۱۳ : ابراہیم آیت ۲۷)

---

[1] کتاب الروح صفحہ

ترجمہ۔ اللہ ثابت قدم رکھتا ہے ایمان والوں کو، قول ثابت (کلمہ طیبہ) سے دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی اور بھلا (راہ بھلا) دیتا ہے بے انصافوں کو اور کرتا ہے اللہ تعالیٰ جو چاہے۔

قبر کی منزل جو دنیا اور آخرت کے درمیان برزخ ہے اس کو پہلی زندگی میں بھی شمار کر سکتے ہیں کہ قبر اس دنیا میں بھی تو ایک نشان ہے مرنے والا گو اس دنیا سے نکل چکا لیکن ابھی تک اس کا یہاں ایک نشان ہے۔ آخرت کے باوجود اس کا اس سے ایک تعلق ہے —— اور اس برزخی زندگی کو آخرت میں بھی شمار کر سکتے ہیں کہ آخرت کی دو منزلیں ٹھہرائی جائیں۔ پہلی قبر کی زندگی یہاں عذاب قبر ہوگا اور دوسری محشر کی زندگی جہاں قبروں سے اٹھ کر پہنچنا ہے۔ پھر جنت یا دوزخ کی زندگی ہے جہاں راحت حقیقی دائمی یا اشد العذاب کے ٹھکانے ہوں گے۔ حدیث میں قبر پر بھی آخرت کا لفظ وارد ہے:۔

ان القبر اول منازل الآخرة۔[1]

ترجمہ۔ بے شک قبر آخرت کی منزلوں میں سے پہلی منزل ہے۔

شیخ الاسلام لکھتے ہیں:۔

سلف سے دونوں قسم کے اقوال (کہ برزخ کو ادھر شمار کرو یا ادھر) منقول ہیں۔ غرض یہ کہ مومنین دنیا کی زندگی سے لے کر محشر تک اسی کلمہ طیبہ کی بدولت مضبوط اور ثابت قدم رہیں گے۔ دنیا میں کیسی ہی آفات و حوادث پیش آئیں کتنا ہی سخت امتحان ہو قبر میں نکیرین سے سوال و جواب ہو، محشر کا ہولناک منظر ہوش اڑا دینے والا ہو ہر موقعہ پہ یہ ہی کلمہ توحید اُن کی پامردی اور استقامت کا ذریعہ بنے گا۔[2]

صحیح بخاری میں ہے کہ آخرت سے مراد اس آیت میں برزخ ہے۔ حضرت براء بن عازبؓ

---

[1] مستدرک حاکم جلد ۱ ص ۳۷ و احوال البرزخ اشبہ باحوال الآخرۃ فتح الباری پ ۱۳ ص ۲۷۹ [2] تفسیر عثمانی ص ۳۳۵

فرماتے ہیں۔ ان رسول اللہ قال المسلم اذا سئل فی القبر یشہد ان لا الٰہ الا اللہ[1] ... الخ

تقریباً چالیس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے معتبر اسانید کے ساتھ اس مضمون کی حدیثیں منقول ہیں۔ ... ان سب حضرات صحابہ کرامؓ نے آیتِ مذکورہ میں آخرت سے مراد قبر لی ہے اور اس آیت کو قبر کے عذاب و ثواب سے متعلق قرار دیا ہے۔

مرنے اور دفن ہونے کے بعد قبر میں انسان کا دوبارہ زندہ ہو کر فرشتوں کے سوالات کا جواب دینا، پھر اس امتحان میں کامیابی اور ناکامی پر ثواب یا عذاب کا ہونا قرآن مجید کی تقریباً دس آیات میں اشارۃً اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ستر احادیثِ متواترہ میں بڑی صراحت و وضاحت کے ساتھ مذکور ہے جس میں مسلمان کو شک و شبہ کی گنجائش نہیں[2]

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر بقول مفتیٔ اعظم اس میں کسی مسلمان کو شک و شبہ کی گنجائش نہیں تو پھر مفتیوں نے عذابِ قبر کے منکر پر کفر کا فتویٰ کیوں نہیں دیا؟ —— جواب یہ ہے کہ علمائے محققین کا فتویٰ یہی ہے۔ محقق ابوشکور السالمی کتاب التمہید میں لکھتے ہیں:۔

فلما عذاب القبر للمومنین من الجائزات وللکافرین من الواجبات واللہ تعالیٰ یقول النار یعرضون علیہا غدواً و عشیاً یعنی فرعون و قومہ دل انہ کان صحیحاً فی ای موضع وعلیٰ ای حال ومن انکر ھٰذا یصیر کافراً[3]

ترجمہ: پس جب مومنین کے لیے عذابِ قبر جائز ہے اور کافروں کے لیے واجب ہے اور اللہ تعالیٰ نے فرعون والوں کے بارے میں کہا کہ آگ پر وہ صبح و شام پیش کیے جاتے ہیں تو اس سے معلوم ہوا کہ عذابِ قبر حق ہے کہاں ہو اور کس حال میں ہو اور جو اسکا انکار کرے کافر ہو جاتا ہے۔

---

[1] صحیح بخاری جلد ۲ ص ۶۸۲ [2] تفسیر معارف القرآن جلد ۵ ص ۲۳۶ [3] کتاب التمہید ص ۱۲۵ طبع ہندی

حافظ ابن ہمام الاسکندریؒ (۸۶۱ھ) جو بقول علامہ شامیؒ مجتہد کے درجے کو پہنچے ہوئے تھے، لکھتے ہیں:۔

ولا تجوز الصلوٰة خلف منکر الشفاعة والرؤية وعذاب القبر والکرام الکاتبین لانه کافر لتوارث هذه الامور عن الشارع صلی الله علیه وسلم۔[1]

ترجمہ: جو شفاعت کا منکر ہو یا آخرت میں رویت باری تعالیٰ کا منکر ہو عذاب قبر کا منکر ہو یا کرام کاتبین کا اس کے پیچھے نماز جائز نہیں۔ کیونکہ یہ سب باتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے استفاضہ عام سے منقول ہیں۔

عذاب القبر پر اس قدر احادیث وارد ہیں کہ ان کی قدر مشترک تواتر کا حکم رکھتی ہے:۔

عذاب القبور کان ثابتاً بالاحادیث المشهورة التی یبلغ الحد المشترك منها مبلغ التواتر وکان السلف الصالح متفقین علی ذلك قبل ظهور المخالفین۔[2]

ترجمہ: عذاب قبر احادیث مشہورہ سے ثابت ہے۔ جن کی قدر مشترک تواتر کو پہنچتی ہے اور سلف صالحین سب اس پر متفق تھے ان مخالفین کے آنے سے پہلے۔

یہ کہنا کہ عذاب قبر ہمیں نظر نہیں آتا اور سوال و جواب کے لیے میت کو بٹھانا ہم نے کبھی نہیں دیکھا نہایت بے تکی بات ہے۔ اس جہان کی آنکھوں سے اُس جہان کی واردات کو دیکھنا اور انہیں اس جہان کے اسباب میں تولنا یہ ہرگز کوئی شرعی بصیرت نہیں ہے۔

مفتی اعظم پاکستان مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ لکھتے ہیں:۔

---

[1] فتح القدیر جلد ۱ ص ۲۴۷ مصر [2] تنقیح اللمعات جلد ۱ صفحہ ۱۸۹

وہ عامیانہ شبہات کہ دنیا میں دیکھنے والوں کو یہ ثواب و عذاب نظر نہیں آتے سو اس کے تفصیلی جوابات کی تو یہاں گنجائش نہیں۔ اجمالاً اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ کسی چیز کا نظر نہ آنا اس کے موجود نہ ہونے کی دلیل نہیں ہوتی. جنات اور فرشتے بھی کسی کو نظر نہیں آتے مگر موجود ہیں. ہوا نظر نہیں آتی مگر موجود ہے جس کا سناتی فضا کا اس زمانہ میں راکٹوں کے ذریعہ مشاہدہ ہو رہا ہے وہ اب سے پہلے کسی کو نظر نہ آتی تھی مگر موجود تھی. خواب دیکھنے والا خواب میں کسی مصیبت میں گرفتار ہو کر سخت عذاب میں بے چین ہوتا ہے مگر پاس بیٹھنے والوں کو اس کی کچھ خبر نہیں ہوتی.

اصل بات یہ ہے کہ ایک عالم کو دوسرے عالم کے حالات پر قیاس کرنا خود غلط ہے. جب خالق کائنات نے اپنے رسولؐ کے ذریعہ دوسرے عالم میں پہنچنے کے بعد اس عذاب و ثواب کی خبر دی تو اس پر ایمان و اعتقاد رکھنا لازم ہے۔[1]

آخرت کے تمام حالات و واقعات جس طرح قرآن و سنت میں وارد ہوئے ان پر بغیر جھجک اور تاویل کے ایمان لانا ہی درحقیقت ایمان ہے. حشر اجساد کی بجائے حشر روحانی اور عذاب و ثواب جسمانی و روحانی میں اسی طرح وزن اعمال میں تاویلیں کرنا سب اللہ کے نزدیک مردود و باطل اور گمراہی ہے[2]

پھر بھی اگر کوئی شخص اس عالم برزخ اور اس کی کیفیات کا انکار کرے تو ویضل اللہ الظٰلمین کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ظالموں کو بات ماننے کی توفیق نہیں دیتا ورنہ حق تو ظاہر ہے —— اس آیت میں اشارہ دیا گیا ہے کہ عذاب قبر کے منکر ظالم ہیں اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔ ان ظالموں کو مرتے ہی اس عذاب کا سامنا

---

[1] معارف القرآن جلد ۵ صد ۲۳۷ [2] ایضاً جلد ا صد ۳۵۶

ہوگا۔ اس وقت اس کا نام عذاب الہون ہو گا۔ اس سے زیادہ رُسوائی کیا ہوگی کہ جس کا انکار کرتے تھے اسی میں آگھرے۔

⑥ مرنے کے ساتھ ہی عذاب الہون کا سامنا

ولو تریٰ اذ الظالمون فی غمرات الموت والملٰئکۃ باسطوا ایدیھم اخرجوا انفسکمؕ الیوم عذاب الھون بما کنتم تقولون علی اللّٰہ غیر الحق وکنتم عن اٰیاتہ تستکبرون ہ ولقد جئتمونا فرادیٰ کما خلقناکم اوّل مرّۃ۔ (پ الانعام ع ۱۱)

ترجمہ۔ اور اگر آپ دیکھ پائیں (یہ کس حال میں ہیں) جب یہ ظالم موت کی سختیوں میں (جکڑے) ہوں گے اور فرشتے ہاتھ بڑھائے ہوئے ہوں گے کہ نکالو اپنی جانیں۔ تمہیں آج عذاب الہون دیا جائے گا اسی بدلے میں جو تم خدا تعالیٰ پہ جھوٹی باتیں لگاتے تھے اور تمہارا اس کی آیات کو جھٹلانا از راہ تکبر تھا اور اب آئے ہو ہمارے پاس ایک ایک کر کے جیسا کہ ہم نے تمہیں پہلی بار (ایک ایک کر کے) پیدا کیا تھا۔

یہ ایک ایک کر کے خدا کے پاس حاضری برزخ کی حاضری ہے۔ آخرت کی حاضری اکٹھی ہوگی۔ حشر کے ساتھ ہوگی۔ وہاں اگلے پچھلے سب اکٹھے پیش ہوں گے۔ یہ ایک ایک کی حاضری اس سے پہلے کی حاضری ہے ـــــ اس یوم وفات سے ہی عذاب الہون ان کو اپنے گھیرے میں لے گا۔ یہ عذاب برزخ ہے جو ابھی سے شروع ہو گیا ہے۔

آج جو لوگ عذاب قبر کا انکار کر رہے ہیں اور حیات برزخ کے انکار کے لیے بے محل آیتیں پڑھتے چلے جاتے ہیں کیا وہ تقولون علی اللّٰہ غیر الحق کے مخاطب نہ ہوں گے اور کیا ان کی یہ ضد از راہ تکبر نہیں ہے۔ حقیقت وہی ہے جو قرآن کریم نے بتائی ہے۔

ایک پیرِ طریقت کو ہم نے اس برزخی منزل کے انکار پہ یہ آیت پڑھتے خود سُنا۔
ثم انشأنٰہ خلقاً اٰخر فتبارک اللہ احسن الخالقین ہ ثم انکم بعد
ذٰلک لمیتون ہ ثم انکم یوم القیٰمۃ تبعثون ہ

(پ ۱۸: المومنون ع ۱)

ترجمہ۔ پھر ہم نے اُسے اُٹھا کھڑا کیا ایک نئی صورت میں۔ سو بڑی برکت
اللہ کی ہے جو سب سے بہتر بنانے والا ہے۔ پھر تم اس کے بعد مرو گے
پھر تم قیامت کے دن ہی اُٹھائے جاؤ گے۔

اس پہ وہ پیرِ طریقت جھوم جھوم کر کہہ رہے تھے مرنے اور قیامت کے دن اُٹھنے کے درمیان کہاں کوئی زندگی ہے۔ قرآن کریم مرنے کے بعد اور قیامت سے پہلے کسی زندگی کا پتہ نہیں دیتا۔

اس پہ ہمیں یہ آیت یاد آگئی۔ کنتم تقولون علی اللہ غیر الحق۔ تم اللہ رب العزت کے ذمہ وہ باتیں لگاتے تھے جو اس نے نہیں کہیں —— قرآن کریم میں جب مرتے ہی عذاب الھون کی ایک زندگی کی خبر ہے۔ تو کیا کوئی مسلمان قیامت سے پہلے کی اس زندگی کا انکار کر سکتا ہے۔ یہ زندگی چھپی ہے اور علیحدہ علیحدہ ہے۔ ثم انکم یوم القیٰمۃ تبعثون میں اس کھلی زندگی کا بیان ہے جب تم سب اکٹھے اُٹھائے جاؤ گے اور تمہارا حشر ہوگا۔ ظاہر ہے کہ ایسی کھلی زندگی تو قیامت کے دن ہی ملے گی۔ اس میں قبر کی برزخی حیات کا انکار ہرگز نہیں ہے۔ مگر افسوس کہ وہ پیرِ طریقت ان آیات کو اس پہلی زندگی کے انکار کے لیے ہی بار بار پڑھ رہے تھے۔ جس میں کئی آیاتِ قرآنیہ اور احادیثِ نبویہ کا انکار ہو رہا تھا مگر جاہل مریدین سب زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے۔

؎ وھل افسد الدین الا الملوک
واحبار سوء و رھبانہا

⑦ مرنے کی ضربیں اور عذاب الحریق کا سامنا

ولو ترى اذ يتوفى الذين كفروا الملئكة يضربون وجوههم وادبارهم وذوقوا عذاب الحريق ۝ ذلك بما قدمت ايديكم وان الله ليس بظلام للعبيد ۝ (پ۱۰ الانفال ع۷)

ترجمہ۔ اور اگر دیکھے تو جس وقت فرشتے کافروں کی جان قبض کرتے ہیں، تو مارتے ہیں اُن کے منہ پہ (تھپیڑ) اور ان کی پیٹھ پہ (کوڑے) اور کہتے ہیں چکھو عذاب آگ کا۔ یہ بدلہ ہے تمہارے اعمال کا جو تم نے آگے بھیجے اور اللہ ظلم نہیں کرتا اپنے بندوں پہ۔

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اس آیت پہ لکھتے ہیں:۔

یعنی مار کر کہتے ہیں کہ ابھی تو یہ لو اور عذاب جہنم کا مزا آئندہ چکھنا ...... الفاظ آیت کے سب کافروں کو عام ہیں۔ اس لیے راجح یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ (ان کو مارنے کا) عالم برزخ کا ہو۔ اب بدر کے واقعات سے تعلق یہ ہو گا کہ دنیا میں ان کافروں کی گت بنی۔ برزخ میں یہ ہو گا اور آخرۃ کے عذاب کا تو کہنا ہی کیا ہے۔[1]

کیا یہاں کھلے طور پہ ان تین زندگیوں کا اقرار نہیں۔

۱۔ دُنیا ۲۔ برزخ ۳۔ آخرت

یہ آیت بتلاتی ہے کہ قبض روح کے وقت سے ہی اس کی برزخی زندگی شروع ہو گئی اور عذاب اُترنے لگا قبر میں جانے سے پہلے ہی یہ عذاب شروع ہو چکا۔

یہ ضربیں کہاں لگ رہی ہیں؟ بدن کے مختلف حصوں پہ — سو یہ روحانی عذاب

---

[1] تفسیر عثمانی ص۲۴۷

کیسے ہوا؟ قرآن کریم تو کہے یضربون وجوھھم و ادبارھم اور ہم کہیں یہ صرف روحانی عذاب ہے جسمانی نہیں ۔۔۔ کیا قرآن کریم کی بات جھٹلائی جا سکتی ہے؟ نہیں ۔۔۔ ومن اصدق من اللہ قیلا۔

برزخ کا جسمانی عذاب برحق ہے۔ گو یہاں کے رہنے والے اسے دیکھ نہ سکیں یا سُن نہ سکیں۔ یہ واقعات ہمیں نظر نہیں آتے۔ مگر چونکہ قرآن میں ان کا بیان ہے اُن پر ایمان لانا فرض ہے۔ برزخی معاملات یہاں مشاہدہ میں نہ آئیں تو اُن پر تعجب نہ کرنا چاہیئے انہیں تسلیم کر کے ایمان بالغیب کا لطف لیں اور یہی اللہ سے ڈرنے والوں کی شان ہے۔

ذٰلک الکتاب لاریب فیہ ھدیً للمتقین الذین یومنون بالغیب

(پ۱ : آیت اوّل)

ترجمہ۔ اس کتاب میں کوئی شک نہیں راہ بتاتی ہے ڈرنے والوں کو جو ایمان لاتے ہیں بن دیکھے۔

⑧ قیامت سے پہلے ایک برزخی زندگی

حتّٰی اذا جاء احدھم الموت قال رب ارجعون ٭ لعلّی اعمل صالحًا فیما ترکت کلّا ، انھا کلمۃ ھو قائلھا ومن ورآئھم برزخ الٰی یوم یبعثون ٭ (پ ۱۸ : المومنون۔ آیت ۱۰۰ع ۶)

ترجمہ۔ یہاں تک کہ جب پہنچے ان میں سے کسی پر موت تو کہے گا اے رب! مجھے واپس بھیج دو۔ شاید میں کچھ بھلے کام کرلوں جو میں چھوڑ آیا تھا۔۔ ہرگز نہیں (ایسا کبھی نہ ہوگا) یہ ایک بات ہے جو وہ کہہ رہا ہے اور ان کے پیچھے برزخ ہے اس دن تک جب وہ اُٹھائے جائیں گے۔

شیخ الاسلامؒ لکھتے ہیں:۔

عالم برزخ آتا ہے جہاں پہنچ کر دنیا والوں سے پردہ ہو جاتا ہے اور آخرت بھی سامنے نہیں آتی۔ ہاں عذاب آخرت کا تھوڑا سا نمونہ سامنے آتا ہے جس کا مزا قیامت تک پڑا چکھتا رہے گا۔[1]

دُنیا ـــــ برزخ ـــــ آخرت۔ یہ تین جہاں ہیں جن کی قرآن کریم بار بار خبر دیتا ہے ان زندگیوں کی کیفیات احساسات اور لوازمات میں فرق ہو سکتا ہے بعض امور میں اشتراک و اتحاد بھی ہو سکتا ہے لیکن اس یقین سے چارہ نہیں کہ امور قرآن ان تینوں زندگیوں کی خبر دیتے ہیں اور مومن ان تینوں زندگیوں میں اللہ تعالیٰ سے سلامتی چاہتا ہے۔ کما یشیر الیہ قولہ تعالیٰ حاکیاً من لسان عیسیٰ ابن مریم والسلام علیّ یوم ولدت و یوم اموت و یوم ابعث حیّا۔

حکیم الامت حضرت تھانوی ؒ لکھتے ہیں :-

۱۔ اللہ تعالیٰ نے تین مقام انسان کے لیے ٹھہرائے ہیں۔ دُنیا۔ برزخ اور دار قرار ـــــ اور ہر مقام کے لیے علیحدہ علیحدہ کچھ احکام ٹھہرائے ہیں جو اسی سے مخصوص ہیں اور انسان کو بدن اور نفس سے مرکب کیا اور دُنیا کے احکام بدنوں پر ٹھہرائے اور روحوں کو بدنوں کو تابع کیا۔ اس لیے شرعی احکام ان حرکات سے مرکب کئے ہیں جو زبان اور اندا موں سے ظاہر ہوتے ہیں اگرچہ دل میں کچھ اور باتیں چھپی ہوئی ہوں اور خدا تعالیٰ نے برزخ کے احکام روحوں پر ٹھہرائے اور جسموں کو روح کے تابع کیا۔[2]

۲۔ اس جگہ بدن ظاہر ہے اور روح پوشیدہ اور عالم قبر یعنی برزخ میں روح غالب و ظاہر ہوگی اور بدن پوشیدہ اور برزخ کے احکام ارواح پر جاری

---

[1] تفسیر عثمانی صـــ ۵۱۲

[2] جسموں کو روح سے لاتعلق نہیں کیا روح کے تابع کیا۔ یہ ہے مولانا تھانوی ؒ کا عقیدہ۔

ہوں گے یعنی دکھ اور سکھ روح کو پہنچے گا تو وہ صاحب روح کے جسم پر بھی سرایت کرے گا۔

۳۔ روح کا تعلق بدن سے گو عام حالات میں ظاہر نہیں لیکن ایک غیر معلوم وجہ پر یہ بھی رہتا ہے بدن سے اس کا بالکل انقطاع اور جدائی نہیں ہوتی[1]

۴۔ پس یہ امر کہ ارواح کا قبور کے ساتھ تعلق ہونا چاہیئے۔ اس چشم سے لینا چاہیئے جس کو کسی قدر کشفی آنکھ نے بھی بتلایا ہے کہ اس تودہ خاک سے ارواح کا ایک تعلق ہوتا ہے اور السلام علیکم یا اھل القبور کہنے سے جواب ملتا ہے جو آدمی ان قوے سے کام لے جن سے کشفِ قبور ہوتا ہے تو وہ ان تعلقات کو دیکھ سکتا ہے[2]

۵۔ غرض روح کا تعلق قبر کے ساتھ ضرور ہوتا ہے۔ انسان میت سے کلام کر سکتا ہے اور ارواح کا تعلق آسمان سے بھی ہوتا ہے جہاں اس کو ایک مقام ملتا ہے وہاں استقرار ہو یا سیر۔ اور یہ ایک ایسی مسلّم بات ہے کہ ہندوؤں کی کتابوں میں بھی اس کی گواہی موجود ہے۔ پس یہ مسئلہ عام طور پر مسلّمہ مسئلہ ہے بجز اس گمراہ فرقے کے جو نفی بقائے روح کرتا ہے[3]

روح اعلیٰ علیّین میں بھی ہو تو بدنِ مدفون سے بے تعلق نہیں۔ انہیں قبر پہ آنے والوں کے سلام کی اطلاع ہوتی ہے اور روح کے مکانی فاصلے اس دریافت میں مانع نہیں ہوتے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی ؒ لکھتے ہیں:۔

ان ارواح کو ایک ملاقہ اپنی قبر سے ہوتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ روح کو قرب و بعد مکانی اس دریافت سے مانع نہیں ہوتا[4]

اس کی کچھ تفصیل آگے آئے گی جہاں حیات انسانی کے مختلف ادوار سے بحث ہو گی۔

---

[1] المصالح العقلیہ حصہ سوم ص ۲۱۷ [2] ایضاً ص ۲۲۶ [3] ایضاً ص ۲۲۷ [4] تفسیر عزیزی پ ۳۰ ص ۸۸ دہلی۔

یہاں صرف یہ بتلانا ہے کہ حیاتِ انسانی صرف عالمِ ارواح میں بدن سے متعلق نہیں، دنیا، برزخ اور آخرت تینوں جہانوں میں یہ بدن سے متعلق ہے۔ ارشادِ قرآنی والسلام علیہ یوم ولد ویوم یموت ویوم یبعث حیا آپ کے سامنے ہے۔ ولادت موت اور حشر کے دن اٹھنا کس سے ہے؟۔ بدن سے۔ ولادت بھی بدن سے۔ موت بھی بدن پر اور پھر جی اٹھنا بھی بدن سے ہوگا۔ سو ولادت موت اور بعثت کے بعد کی زندگیاں اسی بدن سے ہیں اور انصاف کا بھی یہی تقاضا ہے کہ انسان نے جس بدن سے عبادت یا معصیت کی ہے۔ عالمِ برزخ اور عالمِ آخرت کی راحت اور کلفت اسی بدن کے تعلق سے ہو۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ کسی جہان میں بدن کے احکام غالب ہوں اور کسی میں روح کے اور کسی میں روح اور بدن کی کیفیت ایک سی ہو جائے۔[1]

عذابِ برزخ اور عذابِ آخرت

یہاں ہم عالمِ برزخ پر بحث کر رہے ہیں قرآن کریم کی آٹھ آیات سے ہم نے عالمِ برزخ ثابت کیا ہے۔ یہ ایک جہان ہے جو عالمِ دنیا اور عالمِ آخرت کے مابین قائم ہے اور اس کے اپنے حالات اور احکام اس میں اور عالمِ آخرت میں قدرِ مشترک وہ نعیم و عذاب ہے جو انسان کو اپنے اس دنیا میں کئے گئے اعمال کے نتیجہ میں ملے گا۔ یہ پہلا عذاب، عذابِ ادنیٰ ہے تو دوسرا عذاب اکبر، یہ قیامت تک کے لیے ہے اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔

آخرت کے نعیم و عذاب کے بارے میں سب کا اتفاق ہے کہ وہ اسی بدن پر ہوگا جو دنیا میں تھا اور جس کے تعلق سے انسان گناہ کرتا رہا اور فطرت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ جزا و سزا اسی بدن کو ہو جس سے انسان نے کوئی نیکی یا گناہ کیا۔ آخرت کے فیصلے کے لیے اللہ تعالیٰ کوئی نئے بدن نہ بنائیں گے انہی ریزہ ریزہ ہوئے ابدان کو پھر سے قبروں سے اٹھایا جائے گا۔

عذابِ برزخ اور نعیم برزخ بھی جب انہی دنیا میں کئے گئے اعمال کی ایک چھوٹے درجے کی جزا و سزا ہے تو فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ اس بدن سے ضرور متعلق ہو جس سے انسان نے کوئی نیکی یا کوئی گناہ کیا تھا جس اصول کی بنا پر آخرت میں یہ عنصری بدن مور دِ لطف و بطش ہوگا۔ اسی اصول پر عالمِ برزخ میں عذابِ قبر اس بدن سے متعلق چاہیے جس سے انسان نے گناہ کئے ہیں۔

قرآن کریم سے عالمِ برزخ کا نشان اور عذابِ قبر کا پتہ ہم آپ کو پہلے دے آئے ہیں، آئیے آپ کو احادیث سے بھی اس جہان اور اس کے کچھ حالات کی خبر دیں۔

---

[1] کما یشیر الیہ قول العارف الجامی ان الحشر یتساوی فیہ الحکمان فافہم

عذابِ قبر محدّثین کی نظر میں

قرآن کریم کے بعد دوسری سند علمی ارشاداتِ نبوت ہیں بیشتر اس کے کہ ہم وہ احادیث پیش کریں جن میں حیاتِ برزخ کی خبر دی گئی ہے. مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اس باب میں کچھ مسلکِ محدثین کی وضاحت کر دی جائے. تا معلوم ہو کہ یہ محض نقل واقعہ نہیں نہ یہ صرف احکامِ میت میں سے ہے بلکہ اسے سلفاً و خلفاً ہمیشہ سے ایک عقیدے کی حیثیت حاصل رہی ہے اور اہل سنّت کے ہاں یہ مسئلہ ہمیشہ ایمان کا جزء سمجھا گیا ہے.

امام سلیمان بن اشعث ابو داؤد السجستانی (۲۷۵ھ) صاحب السنن سے کون واقف نہیں. ائمہ صحاح ستہ میں فقہی دقت نظر کی بناء پر آپ کا خاص مقام ہے. آپ کی مرویات مجتہد کا ایک جامع ذخیرہ علم ہیں. آپ نے معتزلہ. کرامیہ. جبریہ. قدریہ اور شیعہ و خوارج کے بالمقابل عقائد اہل سنّت کا پورا تحفظ کیا ہے اور سنن ابی داؤد میں کتاب السنۃ کے نام سے ایک مرکزی سلسلہ ابواب قائم کیا ہے. آپ اس میں یہ باب لائے ہیں ۔

فی المسئلۃ فی القبر و عذاب القبر۔

اس کے بعد آپ نے باب المیزان باندھا ہے (کہ اعمال تولے جائیں گے) پھر دجّال کے ظہور کا باب ہے. یہ سب وہ مسائل ہیں جو ان دنوں معتزلہ اور اہل السنۃ کے مابین اختلافی مسائل تھے. معتزلہ نہ سوال فی القبر کے قائل تھے نہ عذاب قبر کے امام ابو داؤد نے عذابِ قبر کو کتاب السنۃ میں لاکر اسی طرف اشارہ کیا ہے کہ اس کا انکار اعتزال کا ایک کھلا نشان ہے. اور جو اس کا قائل نہیں وہ اہل سنت میں سے نہیں.

امام مسلمؒ (۲۶۱ھ) صحیح مسلم میں کتاب صفۃ المنافقین واحکامھم اور کتاب الجنۃ وصفۃ نعیمھا کے تحت اثبات عذاب القبر کو لائے ہیں. باب باندھنے والے نے گو یہاں دو بڑے باب

باندھے ہیں لیکن آخری باب الامر بحسن الظن باللہ تعالیٰ عند الموت اور باب لن یدخل احد الجنۃ بعملہ بل برحمۃ اللہ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ساری بحث ایک ہے اور کتاب صفۃ المنافقین کے تحت ہے اور وہی عالم برزخ میں میت کو (جنت یا دوزخ کے) ٹھکانہ دکھائے جانے اور عذاب قبر کے منکر ہیں. صحیح مسلم کا باب[1] عرض مقعد المیت من الجنۃ والنار علیہ واثبات عذاب القبر والتعوذ منہ بتا رہا ہے کہ محدثین نے اسے ہمیشہ اہل السنۃ کے اصولی مسائل میں جگہ دی ہے. اسے محض ایک انکشاف یا نقل واقعہ کا درجہ نہیں دیا. بلکہ اثبات عذاب القبر سے معتزلہ پر حجت تمام کی ہے. اس کے بعد صحیح مسلم میں کتاب الفتن ہے[1]

حضرت امام بخاریؒ (۲۵۶ ھ) نے جہاں اور فتنوں سے اللہ کی پناہ میں آنے کے باب باندھے ہیں ان میں آپ باب التعوذ من عذاب القبر لائے ہیں. آپ نے اسی میں عذاب قبر کی احادیث لکھی ہیں اور ان تمام فتنوں سے پناہ مانگی ہے.

امام نسائی (۳۰۳ ھ) سنن نسائی میں اسے کتاب الاستعاذہ میں لائے ہیں. پہلے الاستعاذہ من عذاب القبر کا باب ہے پھر باب الاستعاذۃ من عذاب جھنم. یہ ترتیب بتاتی ہے کہ عذاب جہنم سے پہلے ایک چھوٹا عذاب ہے یہی عذاب برزخ ہے، اور یہی عذاب قبر.

امام ترمذیؒ (۲۷۹ ھ) عذاب قبر کی احادیث نو صحابہؓ سے مروی بتاتے ہیں. یہ نو کی نو مرفوع ہیں اور حضورؐ سے مروی ہیں. آپ لکھتے ہیں:-

وفی الباب عن علی وزید بن ثابت وابن عباس والبراء بن عازب وابی ایوب وانس وجابر وعائشۃ وابی سعید کلھم رووا عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی عذاب القبر[2]

---

[1] صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۳۸۵ [2] جامع ترمذی جلد ۱ صفحہ ۱۲۷

ان حضرات کے علاوہ احادیث عذاب قبر حضرت ابو ہریرہؓ حضرت عبداللہ بن عمرؓ حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ سے بھی مروی ہیں۔

صحاح ستہ ایک طرف رہیں، مشکوٰۃ تو ہر عالم کے پاس ہوتی ہے اس میں دیکھ لیں خطیب تبریزی عذاب القبر کا باب کتاب الایمان میں لائے ہیں جس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ عقیدہ عذاب قبر کو ہمیشہ ایمان کی حیثیت حاصل رہی ہے مشکوٰۃ کتاب الایمان میں پانچ باب ہیں۔

① ——— الکبائر وعلامات بالنفاق

② ——— الوسوسہ

③ ——— الایمان بالقدر

④ ——— اثبات عذاب القبر

⑤ ——— الاعتصام بالکتاب والسنۃ

آپ نے اثبات عذاب القبر کو الایمان بالقدر کے ساتھ لاکر اس پر متنبہ کیا ہے کہ جس طرح تقدیر کا انکار معتزلہ کا موقف ہے۔ عذاب قبر کے منکرین بھی معتزلہ میں شمار ہوں گے۔ محدثین کی یہ تنبیہ معتزلہ کے بدعی عقائد سے بچنے کے لیے ہے۔

محدثین کا مسلک کھل کر آپ کے سامنے آچکا ہے۔ جو بات بارہ صحابہؓ سے مروی ہو اس کے تواتر میں کیسے شبہ ہو سکتا ہے۔ یہ کوئی خبر واحد نہیں کہ اس کا انکار کفر نہ ہو۔ اب ہم یہاں دس بزرگوں کی روایات پیش کرتے ہیں جنہوں نے عذاب قبر کی احادیث خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہیں۔

عذاب قبر پر احادیث کی روشنی میں محدثین کی شہادت

قرآن کریم کی شہادت کھل کر آپ کے سامنے آچکی ہے۔ اب آیئے حدیث کی روشنی

ہیں عالم برزخ کا کچھ پتہ لگائیں اور جاننے کی کوشش کریں کہ برزخ کے یہ حالات اور اس کے ثواب و عذاب کی واردات کہاں اور کس طرح واقع ہوتی ہیں اور یہ کہ یہ احادیث کس پائے کی ہیں؟ —— اس کے بعد ان شاء اللہ اس پہ بحث ہوگی کہ امت نے پچھلے چودہ سو سال میں اس عقیدے کو کس درجے اور کس تفصیل سے قبول کیا ہے۔

(۱) —— حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:۔

مرّ النبی صلی اللہ علیہ وسلم بقبرین فقال انھما لیعذّبان وما یعذبان فی کبیر اما احدھما فکان لا یستتر من البول واما الآخر فکان یمشی بالنمیمۃ ثم اخذ جریدۃ رطبۃ فشقھا نصفین فغرز فی کل قبر واحدۃ قالوا یارسول اللہ لم فعلت ھٰذا قال لعلّہ یخفف عنھما مالم ییبسا[1]

ترجمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دو قبروں کے پاس سے گزرے۔ آپ نے بتایا کہ ان دو کو عذاب ہو رہا ہے اور وہ کسی بڑے گناہ پر نہیں۔ ایک تو پیشاب کی چھینٹوں سے بچاؤ نہیں کرتا تھا اور دوسرا چغلی کھانے کا رسیا تھا پھر آپ نے کھجور کی ایک ٹہنی لی اور اس کے دو حصوں میں کاٹا اور دونوں ٹکڑے ایک ایک قبر میں گاڑ دیئے۔ صحابہؓ نے اس کی وجہ پوچھی تو آپ نے فرمایا۔ شاید جب تک یہ ٹہنیاں سبز رہیں اُن سے عذاب ٹلتا رہے۔

اس حدیث میں یہ امور پیش نظر رہیں:۔

(۱) —— یہ حدیث کسی نادر کتاب کی نہیں۔ حدیث کی اوّل درجے کی کتابوں میں ہے۔

(۲) —— آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دو شخصوں کو انہی گڑھوں میں عذاب ہوتے پایا۔ جنہیں ظاہری قبریں کہا جاتا تھا۔ کسی اور عالم غیب کی خبر نہیں دی جو ان قبروں

---

[1] صحیح بخاری جلد ا صث ۳۵ صحیح مسلم جلد ا صا۱۴۱

سے بالکل لاتعلق ہو اور وہاں ان کو عذاب ہو رہا ہو۔

(۳) —— پھر آپ نے کھجور کی شاخیں بھی انہی قبروں پر رکھیں جنہیں عرف عام میں قبر کہا جاتا ہے۔ کیا آپ یہ شاخیں مقام سجین پر رکھ رہے تھے ؟ —— یہ اسی نشانِ قبر کی بات ہے۔

(۴) —— یہ عذاب جو انہیں ہو رہا تھا حشر کے بعد نہیں، جسے عذابِ آخرت کہتے ہیں یہ عالمِ برزخ کی واردات ہے اور اسے ہی عذابِ قبر کہتے ہیں۔ یہ عذابِ اکبر سے پہلے ایک چھوٹا عذاب ہے۔

(۲) —— حضرت زید بن ثابتؓ فرماتے ہیں :-

بینما النبی صلی اللہ علیہ و سلم فی حائط لبنی النجار علی بغلۃ لہ ونحن معہ اذ حادت بہ فکادت تلقیہ واذا اقبر ستۃ او خمسۃ او اربعۃ ...... فقال من یعرف اصحاب ھٰذہ الاقبر فقال رجل انا قال متیٰ مات ھٰؤلاء قال ماتوا فی الاشراک فقال ان ھٰذہ الامۃ تبتلیٰ فی قبورھا فلولا ان لاتدافنوا موتاکم لدعوت اللہ ان یسمعکم من عذاب القبر الذی اسمع منہ۔[1]

ترجمہ۔ حضورؐ ایک خچر پہ سوار ہوئے بنو نجار کے ایک باغ سے گزر رہے تھے اور ہم آپؐ کے ساتھ تھے کہ خچر یکایک بدکا۔ قریب تھا کہ وہ حضورؐ کو اتار ڈالتا۔ وہاں چھ یا پانچ قبریں تھیں۔ آپ نے پوچھا۔ کوئی ان قبروں والوں کو جانتا ہے ؟ ایک شخص نے کہا میں جانتا ہوں۔ آپ نے پوچھا۔ یہ کب کے لوگ ہیں ؟ اس نے کہا، دورِ شرک کے۔ آپ نے فرمایا۔ یہ لوگ اپنی قبروں میں ابتلاء میں گھرے ہیں۔ یہ ڈر نہ ہوتا کہ تم اپنے مُردوں کو دفن کرنا چھوڑ دو گے تو

---

[1] صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۳۸۶ سنن ابی داؤد جلد ص

میں خدا سے دُعا کرتا کہ وہ یہ عذابِ قبر تمہیں بھی سُنا دے جو میں سُن رہا ہوں۔"

اس حدیث میں بھی یہ اُمور پیشِ نظر رہیں :-

(۱) —— یہ حدیث کس پائے کی کتاب میں ہے۔ صحیح مسلم اوّل درجے کی دو کتابوں میں سے ایک ہے۔ اس کے ساتھ امام ابو داؤد نے اپنی سنن میں اسے روایت کیا ہے۔

(۲) —— آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وہیں اس عذابِ قبر کی آوازیں سُنیں جہاں یہ ظاہری قبریں تھیں۔ سو ان گڑھوں کو عالمِ برزخ سے بے تعلق نہیں کیا جا سکتا یہی قبر مومن کے لیے دور تک وسیع کر دی جاتی ہے گو ہم اس کا ادراک نہ کر سکیں۔ لیکن اس عدمِ ادراک سے اس نتیجہ پر پہنچنا کہ یہ گڑھا قبر ہے ہی نہیں، ہرگز درست نہیں۔ ہاں یُوں کہیے اس کا دوسرا کنارا عالمِ غیب میں ہے کیونکہ ہم اسے محسوس نہیں کر رہے ہیں —— اس کے بغیر ان احادیث صحیحہ صریحہ کی تکذیب لازم آتی ہے۔ العیاذ باللہ الکریم۔

(۳) —— اللہ کے سُنانے سے ان آوازوں کا صحابہؓ کو بھی سُنایا جانا ممکن تھا حضورؐ دعا کرتے تو ہو سکتا ہے صحابہؓ بھی انہیں سُن پاتے۔ حضورؐ کا انہیں سننا بھی اللہ کے ہی سُنانے سے تھا۔ منوں مٹی کے نیچے سے آوازیں سُنی جائیں یہ اسماعِ الٰہی سے ہے۔ بندہ اسباب سے اتنے دُور سے نہیں سُن پاتا۔

(۴) —— حضورؐ اس دُنیا سے مٹی کے اتنے گہرے فاصلے سے برزخ کی آوازیں باسماعِ الٰہی سُن سکتے ہیں۔ تو جب حضورؐ خود عالمِ برزخ (اپنی قبر شریف) میں ہوں تو یہاں کی سلام معروض کو باسماعِ الٰہی کیوں نہیں سن سکتے۔ اس میں کونسا عقلی یا شرعی استبعاد ہے جو اس کا انکار کیا جائے۔

(۵) —— حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اگلے جہان کی آوازیں تو سُن لیں لیکن یہ لوگوں سے دریافت فرمایا کہ یہ لوگ کون تھے؟ یہ اس لیے کہ پہلی بات کشف اور مشاہدہ سے تعلق رکھتی ہے اور دوسری علم سے —— غیب کی بات جب تک اللہ تعالیٰ نہ بتائیں از خود اُسے

جان لینا یہ کسی کے بس میں نہیں. نہ غیب جاننے کی چابی اللہ رب العزت نے کسی کو دی ہے۔

(۶) —— اس خچر کا اس عذابِ قبر کو سن پانا اور صحابہؓ کا اسے نہ سننا یہ کسی حکمتِ الٰہیہ کے سبب تھا۔ نہ اس لیے کہ خچر کا درجہ اور مرتبہ کوئی زیادہ ہے سو اس قسم کے جاہلی استدلالات کہ شیطان کو مشرق و مغرب میں جو وسعتِ پرواز حاصل ہے وہ اولیاء اللہ کو کیوں نہیں. یہ ہرگز کسی اخلاص اور تحقیق پر مبنی نہیں. نہ انسانوں کو جنات و ملائکہ یا حیوانات اور پرندوں پہ قیاس کیا جا سکتا ہے۔

(۳) —— حضرت براءؓ بن عازبؓ فرماتے ہیں:-

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال المسلم اذا سئل فی القبر یشھد ان لا الٰہ الا اللہ وان محمداً رسول اللہ فذٰلک قولہ یثبت اللہ الذین اٰمنوا بالقول الثابت فی الحیٰوۃ الدنیا وفی الاٰخرہ۔[1]

ترجمہ :- بے شک حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مسلمان سے جب قبر میں سوال ہوتا ہے وہ کلمہ شہادت پڑھتا ہے. سو یہاں اللہ تعالیٰ کی بات پوری ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو قولِ ثابت میں ثابت قدم رکھتا ہے. دنیا میں اور آخرت میں (یہ قبر آخرت کی پہلی منزل ہے)۔

(۴) —— حضرت انسؓ فرماتے ہیں :-

قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان العبد اذا وضع فی قبرہ وتولّٰی عنہ اصحابہ انہ یسمع قرع نعالھم اتاہ ملکان فیقعدانہ فیقولان . . . . واما المنافق والکافر . . . . فیقال لہ لادریت ولا تلیت ویضرب بمطارق من حدید ضربۃ فیصیح صیحۃ یسمعھا

---

[1] صحیح بخاری جلد ۲ صد ۶۸۲ سنن ابی داؤد جلد ۲ صد ۶۵۳

من يليه غير الثقلين. متفق عليه۔[1]

ترجمہ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میت کو جب قبر میں رکھا جاتا ہے اور اس کے ساتھی اسے چھوڑ آتے ہیں اور وہ ان کے جوتوں کی آواز سنتا ہے تو اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں اسے بٹھلاتے ہیں اور اس سے سوال و جواب کرتے ہیں. جو منافق اور کافر ہوتا ہے اسے کہتے ہیں نہ تو نے بات خود سمجھی نہ کسی دوسرے سمجھنے والے کے پیچھے چلا. پھر اسے لوہے کے ہتھوڑوں سے مارتے ہیں. اور وہ چیختا ہے ایسی چیخ کہ اسے سب پاس والے سنتے ہیں انسانوں اور جنات کے علاوہ.

اس حدیث میں ان امور پر نظر رہے :-

(۱) —— یہ واقعہ کس قبر میں پیش آتا ہے جس میں میت کو اتارا جاتا ہے اور جس سے اس کے ساتھی رخصت ہوتے ہیں اور وہ ان کے جانے کی آواز سنتا ہے۔

(۲) —— فرشتے اس کے پاس کس قبر میں آتے ہیں؟ جس میں اسے پکارا گیا اور جہاں اسے چھوڑ کر اس کے ساتھی چل دیئے. اگر یہ فرشتے سجین میں اس کے پاس آئے ہوں تو اُسے اس طرح بیان نہ کیا جاتا.

(۳) —— وہ فرشتے اسے بٹھاتے ہیں. یہ اس کا بیٹھنا عالم دنیا کا نہیں. نہ یہاں کے حواس سے اسے دیکھا جا سکتا ہے. یہ عالم برزخ کا معاملہ ہے جو اسی قبر میں اسی بدن سے پیش آ رہا ہے. گو یہاں سے جھانکنے والے کو وہاں کچھ بھی ہوتا دکھائی نہ دے۔

(۴) —— کافر اور منافق کی سزا کو وہی سن سکتے ہیں جو اس قبر کے زیادہ قریب ہوں. يسمعها من يليه —— سو عذاب اسی قبر میں ہو رہا ہے گو یہ اتنی تنگ ہو رہی ہو کہ اس کی پسلیاں اس میں پس جائیں اور دیکھنے والے کو وہ ویسی ہی دکھائی دے۔

---

[1] مشکوٰۃ صـ۲۵ ابوداؤد جلد ۲ صـ۶۵۴ سنن نسائی جلد ۱ صـ۲۸۸

(۵) ——— حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں۔

قال قال رسول اللہ ان احدکم اذا مات عرض علیہ مقعدہ بالغداۃ والعشی ان کان من اہل الجنۃ فمن اہل الجنۃ وان کان من اہل النار فمن اہل النار فیقال ھذا مقعدک حتی یبعثک اللہ الیہ یوم القیٰمۃ۔[۱]

ترجمہ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میں سے جب کوئی مر جائے۔ تو اسے (عالم برزخ میں) اس کا ٹھکانہ (جہاں اس نے جانا ہے) صبح و شام دکھایا جاتا ہے۔ اگر وہ اہل جنت میں سے ہے تو وہ اہل جنت میں دکھایا جاتا ہے اور اگر وہ جہنم والوں سے ہے تو اسے اس کا ٹھکانا جہنم میں دکھایا جاتا ہے اور اسے کہا جاتا ہے یہ تمہارا ٹھکانہ ہے یہاں تک کہ تجھے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن لے جائے۔

قیامت تک کا یہ مستقر عالم برزخ کا مستقر ہے۔ اس میں بدن مدفون صبح و شام اپنا آخرت کا ٹھکانہ دیکھتا ہے۔ اگر روح اس جسد مدفون سے بالکل بے تعلق ہے تو کیا روح کی آنکھیں اسے علیین اور سجین سے دیکھ رہی ہیں۔ پھر اس قبر سے اس کا کیا تعلق اور کیا ان ٹھکانوں میں بھی جو دکھلائے جاتے ہیں صرف روح ہی جائے گی۔ کیونکہ یہ تو اسی کو کہا جا رہا ہے۔ ھذا مقعدک فافھم۔

(۶) ——— حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا اقبر المیت اتاہ ملکان اسودان ازرقان یقال لاحدھما المنکر وللاٰخر النکیر فیقولان ..... وان کان منافقاً ..... فیقال للارض التئمی علیہ فتلتئم علیہ فتختلف اضلاعہ فلا یزال فیہا معذباً حتی یبعثہ اللہ من مضجعہ ذٰلک رواہ الترمذی۔[۲]

---

[۱] مشکوٰۃ ص۲۵ سنن نسائی جلد ا ص ۲۹۱ [۲] مشکوٰۃ ص ۲۵

ترجمہ۔ آنحضرتؐ نے فرمایا جب میت قبر میں اتاری جاتی ہے تو اس کے پاس دو سیاہ رنگ نیلی آنکھوں والے فرشتے منکر اور نکیر آتے ہیں اور اس سے سوال جواب کرتے ہیں اگر وہ منافق ہو تو زمین کو کہا جاتا ہے کہ اس پر تو سمٹ آ۔ وہ اس پر سمٹ آتی ہے یہاں تک کہ اس کی پسلیاں ایک دوسری میں دھنس جاتی ہیں۔ اسے اسی طرح عذاب ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اسے اس کی اس قبر سے اٹھادے۔

(۲)—— حضرت ابو ہریرہؓ یہ بھی فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نصیحت فرمائی:۔

استعیذوا باللّٰه من خمس۔ ۱۔ من عذاب جھنم۔ ۲۔ وعذاب القبر۔ ۳۔ وفتنة المحیا۔ ۴۔ والممات۔ ۵۔ وفتنة المسیح الدجال۔[۱]

ترجمہ۔ اللہ تعالیٰ پانچ چیزوں سے پناہ مانگو۔ ۱۔ عذاب جہنم سے (جو آخرت میں ہوگا)۔ ۲۔ عذاب قبر سے (جو برزخ میں ہوگا)۔ ۳۔ زندگی کے فتنہ سے۔ ۴۔ موت کے فتنہ سے (یہ کہ خاتمہ خیر پر ہو) اور۔ ۵۔ مسیح دجال کے فتنہ سے۔

(۳)—— آپ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی نقل فرمایا کہ آپ نے کہا۔

ان المیت یصیر الی القبر فیجلس الرجل الصالح فی قبرہ۔ الحدیث[۲]

ترجمہ۔ میت قبر میں جاتی ہے نیک آدمی کو اس کی قبر میں بٹھا دیا جاتا ہے اس طرح کہ اسے کوئی گھبراہٹ اور پریشانی نہیں ہوتی۔ پھر اس سے پوچھا جاتا ہے تو کس حال میں رہا۔ وہ کہتا ہے فی الاسلام۔ پھر اسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں پوچھا جاتا ہے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لیتا ہے کہ آپ ہمارے پاس روشن معجزات کے ساتھ آئے اور ہم نے آپ کی تصدیق کی دلائے پھر یہاں اپنا آخرت کا ٹھکانہ دکھایا جاتا ہے۔

(۷)—— حضرت جابر بن عبداللہ انصاریؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

---

[۱] سنن نسائی جلد ۲ ص ۔ [۲] سنن ابن ماجہ ص ۳۱۵

اذا ادخل المیت القبر مثلت له الشمس عند غروبها فیجلس یمسح عینیه ویقول دعونی اصلی رواه ابن ماجه۔[1]

ترجمہ: جب میت کو قبر میں داخل کیا جاتا ہے تو اس کے سامنے غروب آفتاب کا منظر لایا جاتا ہے وہ اپنی آنکھیں پونچھتا ہوا اٹھتا ہے اور کہتا ہے مجھے نماز پڑھنے دو۔

کاش! کہ یہ کرم فرما قبر میں نماز پڑھنے کو مذاق بنانے کی بجائے اس فرمودۂ رسالت پر غور کرتے۔

(۸) — حضرت جابرؓ کہتے ہیں حضورؐ نے جب حضرت سعد بن معاذؓ کی نماز جنازہ پڑھائی اور آپ کو قبر میں اتار دیا گیا اور آپ پر مٹی برابر کر دی گئی۔ حضورؐ دیر تک تسبیح پڑھتے رہے ہم بھی آپ کے ساتھ تسبیح پڑھتے رہے۔ پھر آپ نے تکبیر کہی۔ ہم نے بھی آپ کے ساتھ تکبیر کہی — پھر ہم نے آپ سے اس تسبیح و تکبیر کا سبب پوچھا تو آپ نے فرمایا:۔

لقد تضایق علی ھذا العبد الصالح قبرہ حتی فرجہ اللّٰہ عنہ۔[2]

ترجمہ: اس نیک بندے پر قبر تنگ ہو رہی تھی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اس سے کشائش بخشی۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ بڑے بڑے صلحاء کو بھی اس منزل سے گزرنا پڑتا ہے اور یہ کہ اس کے قریب اللہ رب العزت کی تسبیح و تقدیس کی جائے تو اللہ رب العزت اس سختی کو معاف فرما دیتے ہیں۔

حضورؐ کہاں کھڑے رہے؟ اسی گڑھے کے پاس جس کو عرف عام میں گڑھا کہتے ہیں یا یہ سب معاملہ مقام علیین میں ہو رہا تھا۔ جہاں صلحاء کی ارواح حاضری دیتی ہیں۔

(۹) — حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ کہتی ہیں:۔

قام رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم خطیبا فذکر فتنۃ القبر التی یفتتن فیھا المرء فلما ذکر ذلک ضج المسلمون ضجۃ رواہ البخاری۔[3]

---

[1] مشکوٰۃ صـ۲۶ [2] ایضاً [3] ایضاً

ترجمہ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ پر کھڑے ہوئے اور آپ نے فتنہ قبر کا ذکر کیا جس میں آدمی مبتلا کیا جائے گا. آپ نے جب یہ ذکر فرمایا تو مسلمان (اسکی گھبراہٹ سے) چیخ اٹھے۔

کیا حضورؐ اس وقت کسی آسمانی قبر کا ذکر کر رہے تھے یا یہ اسی قبر کا ذکر تھا جسے لوگ قبر سمجھتے تھے۔

سنن نسائی میں یہ زیادہ ہے کہ اسماء بنت ابی بکرؓ آپ کی بات آخر تک نہ سن سکیں آپ نے ایک دوسرے شخص سے پوچھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آخر میں کیا فرمایا تھا اس نے بتایا کہ آپ نے کہا۔

قد اوحی الی انکم تفتنون فی القبور قریباً من فتنۃ الدجال۔[1]

ترجمہ۔ مجھے وحی کے ذریعہ بتایا گیا ہے کہ تم اپنی قبروں میں آزمائش میں ڈالے جاؤ گے یہ آزمائش فتنہ دجال کی آزمائش کے قریب ہوگی۔

حضرت امام بخاریؒ نے اس پر باب التعوذ من عذاب القبر باندھا ہے۔ام خالد کہتی ہیں میں نے کسی صحابیؓ سے اس کے خلاف کچھ نہیں سنا جسے اس نے حضورؐ سے روایت کیا ہو۔

لم اسمع احدا سمع من النبی صلی اللہ علیہ وسلم غیرھا۔[2]

اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ حضورؐ کے صحابہؓ میں سے کسی نے اس مسئلہ سے (عذاب القبر) سے اختلاف نہیں کیا. نہ اس میں اختلاف کی کوئی گنجائش موجود تھی۔

(١٠) ———— ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کہتی ہیں میرے پاس دو بوڑھی یہودی عورتیں آئیں اور مجھے بتایا۔ اھل القبور یعذبون فی قبورھم کہ فوت شدگان کو ان کی قبور میں عذاب ہوتا ہے میں نے ان کی تصدیق نہ کی اور یہ مجھے اچھا نہ لگا کہ میں یہود کی تصدیق کروں. وہ چلی گئیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے. میں نے حضورؐ سے سارا واقعہ عرض کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ان دونوں نے سچ کہا ہے:۔

---

[1] سنن نسائی جلد ۱ ص ۲۹۰ [2] صحیح بخاری جلد ۲ ص ۹۴۲

انھم یعذبون عذاباً تسمعہ البھائم کلھا۔

ترجمہ۔ وہ ایسا عذاب پا رہے ہیں جسے سب چوپائے سُن رہے ہیں۔ صرف انسانوں اور جنوں سے وہ عذاب پردے میں رکھا گیا ہے

ام المومنین کہتی ہیں کہ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی نماز میں اس دُعا کو نہیں چھوڑا۔ آپ ہر نماز کے بعد اعوذ بک من عذاب القبر پڑھتے تھے۔

بہائم (چوپائے) کہاں رہتے ہیں؟ زمین پر ــــــ کیا یہ سجین میں عذاب سُننے جاتے ہیں یا اسی زمین پر قبروں سے گزرتے ہوئے یہ آوازیں ان تک پہنچتی ہیں؟

نہایت افسوس ہے کہ ایک پیر طریقت نے یہاں بھی مثالی ابدان کی بات چلا رکھی ہے اور اس ظاہری قبر کو وہ قبر ماننے کے لیے تیار نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ (اس زمین کے) اصل چوپائے ان عذاب یافتہ لوگوں کی آوازیں نہیں سنتے۔ ان کے مثالی ابدان مقام سجین پر لے جائے جاتے ہیں۔ وہ وہاں عذاب یافتہ لوگوں کی آہ و بکا سنتے ہیں۔ ان قبروں (اس زمین پر نظر آنے والی قبروں) کا اس عذاب سے کوئی تعلق نہیں۔ نہ یہ گڑھے قبریں ہیں۔ یہاں کسی کو عذاب نہیں ہوتا۔ نہ یہاں چوپائے کوئی عذاب قبر سنتے ہیں۔

ان سے پوچھا گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان معذبین کی آوازیں کہاں سے سُنی تھیں؟ انہی گڑھوں سے یا مقام سجین سے؟ اس پر پیر طریقت نے فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانیت بہت اونچی ہے۔ آپ یہیں سے (اس زمین سے) مقام سجین کی آوازیں سن رہے تھے آوازیں وہاں سے آ رہی تھیں مگر آپ کو اس طرح محسوس ہوتا تھا گویا انہی قبروں سے سُن رہے ہیں۔

پھر آپ سے پوچھا گیا کہ حضورؐ نے جب پوچھا تھا کہ یہ کن کی قبریں ہیں؟ تو کیا آپ نے ان گڑھوں کی طرف اشارہ کر کے نہ پوچھا تھا۔ یہ کن کی قبریں ہیں۔ ہم کیسے مان لیں کہ ان گڑھوں کا قبر سے کوئی تعلق نہیں ہوتا؟ اس پر پیر طریقت لاجواب ہو گئے۔

قبر کی واردات

اسلام کا چودہ سو سال کا مسلسل اعتقاد

حدیث کی ان روشن شہادتوں سے یہ بات واضح ہے کہ یہ قبریں صرف گڑھے نہیں ہیں۔ یہ وہ اسرار گاہیں ہیں جن میں قدرت باری کا نقشہ کھل کر سامنے آتا ہے۔ آیئے اب ان واردات پر اسلام کی چودہ صدیوں کی شہادت لیں۔ اہل اسلام نے اپنی تاریخ کے کسی موڑ پر اس حقیقت کا انکار نہیں کیا کہ عذاب قبر برحق ہے۔ قبر ظاہر میں تو ایک گڑھا ہے۔ مگر اس میں وہ لاتعداد ہنگامے ہو رہے ہیں کہ یہاں کی آنکھ نہ انہیں دیکھ سکے نہ یہاں کے کان انہیں سن سکیں۔ مسلمان قرآن و حدیث کی روشنی میں انہیں تسلیم کر کے ایمان بالغیب کی لذت پاتا ہے۔

۲۰ جلیل القدر صحابہؓ کی گواہی جامع ترمذی کے حوالے سے آپ دیکھ آئے ہیں۔ یہ اسلام کی پہلی صدی کی آواز ہے۔ ہم نے اس پر کچھ اور شہادتیں بھی پیش کی ہیں۔ آیئے اب ہم آپ کو دوسری صدی ہجری میں لے چلیں۔

پہلی صدی کے اختتام پر حضرت امام ابو حنیفہؒ کی عمر بیس سال کی تھی۔ آپ نے حضرت انس بن مالکؓ (۹۱ھ) جو حدیث احوال برزخ کے راوی بھی ہیں کی زیارت بھی کی تھی[1]۔ آپ کے درس و تدریس کا دور دوسری صدی کا نصف اول ہے۔ آپ نے کوفہ و بصرہ کے جبر و قدر کے معرکے اور اعتزال و ارجاء کے فتنوں کو قریب سے دیکھا تھا۔ آپ نے عقائد سنت کے تحفظ کے لیے اور حضورؐ کی امت کو عقائد بدعت سے بچانے کے لیے عقائد اسلام پر ایک

---

[1] رای انس بن مالک غیر مرة لما قدم علیهم الکوفة۔ (تذکرة الحفاظ جلد ا صفحہ ۱۵۸)

چھوٹا سا رسالہ لکھا۔ عقائدِ اسلام پر یہ اس امت کی سب سے پہلی تحریر ہے۔ آپ کے نزدیک احکام کی فقہ دراصل فقہ اصغر ہے اور عقائد کی فقہ، فقہ اکبر ہے۔ آپ نے یہی نام اپنے رسالہ کو دیا جس کی بڑے بڑے محدثین نے شرحیں لکھی ہیں۔ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ (۱۵۰ھ) اس میں قبر کی واردات کا یوں ذکر کرتے ہیں :-

واعادة الروح الی العبد فی قبرہ حق۔[1]

ترجمہ۔ اور روح کا بندہ کی طرف لوٹایا جانا برحق ہے

تیسری صدی جلیل القدر ائمہ حدیث کی صدی ہے۔ حضرت امام احمدؒ (۲۴۱ھ) لکھتے ہیں :-

الایمان بالحوض والشفاعة والایمان بمنکر ونکیر و عذاب القبر و الایمان بملک الموت بقبض الارواح ثم ترد فی الاجساد فی القبور فیسألون عن الایمان والتوحید۔[2]

ترجمہ ۔ حوضِ کوثر۔ شفاعت۔ قبر میں منکر ونکیر کا آنا۔ عذاب قبر اس بات پر ایمان لانا کہ ملک الموت روحیں قبض کرتا ہے پھر یہ روحیں قبروں میں اپنے اجساد میں لوٹائی جاتی ہیں اور وہاں ایمان اور توحید کے بارے میں پوچھ لیا جاتا ہے (یہ سب امور برحق ہیں)۔

پھر امام بخاریؒ (۲۵۶ھ) امام مسلمؒ (۲۶۱ھ) امام ابو داؤدؒ (۲۷۵ھ) اور امام ترمذیؒ (۲۷۹ھ) کی شہادتیں بھی آپ کے سامنے آچکیں۔ اب آیئے اس تسلسل کو چوتھی صدی میں دیکھیں۔ حافظ ابن جریر الطبری (۳۱۰ھ) لکھتے ہیں :-

ذکر قبض روح المؤمن فتعاد روحہ فی جسدہ ویاتیہ الملکان فیجلسانہ فی قبرہ فیقولان من ربک۔[3]

ترجمہ۔ یہ مومن کی روح کے قبض ہونے کا بیان ہے پھر وہ روح (قبر میں) اس کے جسد میں لوٹائی جاتی

---

[1] منح شرح الفقہ الاکبر صفحہ ۱۲۱ [2] کتاب الصلوٰۃ للامام احمد بن حنبل صفحہ ۴۵ [3] تفسیر ابن جریر جلد ۱۳ صفحہ ۲۱۴

ہے اور اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں اسے (اس میت کو) قبر میں بٹھاتے ہیں اور پوچھتے ہیں تیرا رب کون ہے؟

امام ابو جعفر الطحاوی (۳۲۱ھ) جنہیں فقہاء کرام اعلم بمذھب ابی حنیفۃ وصاحبیہ لکھتے ہیں۔[1] رقمطراز ہیں:-

ونؤمن بعذاب القبر ونعیمہ ..... وبسوال منکر ونکیر للمیت فی قبرہ عن ربہ ودینہ ونبیہ علیٰ ماجاءت بہ الاخبار عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وعن اصحابہ اجمعین والقبر روضۃ من ریاض الجنۃ او حفرۃ من حفر النیران۔[2]

ترجمہ ہم عذاب قبر اور نعیم قبر پر ایمان لاتے ہیں... منکر و نکیر کا قبر میں تین سوال پوچھنا جیسا کہ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے سب صحابہؓ سے منقول ہے برحق ہے اور قبر جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ یہ اس زمین کی قبر کو روضۃ من ریاض الجنۃ نہیں کہا گیا۔ وہ قبر کہیں اور ہے تو وہ لازماً حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ کے روضۂ منورہ کو بھی روضۃ من ریاض الجنۃ نہیں مانتے ہوں گے۔

حافظ ابو بکر الجصاص الرازیؒ (۳۷۰ھ) لکھتے ہیں:-

واذا جاز ان یکون المومنون قد احیوا فی قبورھم قبل یوم القیٰمۃ وھم منعمون جاز ان یحیی الکفار فی قبورھم فیعذبوا۔[3]

ترجمہ۔ اور جب یہ جائز ہے کہ مومن کو قیامت سے پہلے ان کی قبروں میں زندہ کیا جائے اور وہاں نعمت ربانی سے سرفراز ہوں۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کافر بھی اپنی قبروں میں زندگی پائیں اور (اس زندگی سے) انہیں وہاں عذاب ملے۔

نعیم قبر اور عذاب قبر کی ان کیفیتوں کو ان قبروں سے یکسر بے تعلق سمجھا گیا ظاہر شریعت کا انکار نہیں؟

---

[1] طحطاوی علی المراقی الفلاح ص۳۴۲ [2] عقیدۃ الطحاوی مع الشرح ص۶ [3] احکام القرآن جلد ۱ ص۱۰۱

پانچویں صدی کے علماء میں امام بیہقیؒ (۴۵۸ھ) امام ابو المظفر الاسفرائنی (۴۷۱ھ) امام ابو القاسم عبد الکریم القشیریؒ (۴۶۵ھ) حافظ ابن عساکر الدمشقی (۵۷۱ھ) اور امام غزالیؒ (۵۰۵ھ) نے عقائد کی سرحدوں پر بڑا کام کیا ہے

ابو المظفر طاہر بن محمد الاسفرائنی لکھتے ہیں:۔

اخبر انھم یحیون فی القبور وقد ورد فی معنی احیاء الموتی فی القبور ما لا یحصی من الآی والاخبار والآثار۔[1]

ترجمہ۔ آپ نے خبر دی ہے کہ انہیں قبروں میں زندگی ملتی ہے اور قبروں میں مردوں کو زندہ کیا جاتا ہے اس پر اتنی آیات اور احادیث اور آثار وارد ہیں کہ گنے نہیں جا سکتے۔

وفیہ احادیث کثیرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی ھذا الباب ان الملکین یجیئان فی القبر الی المیت ویحیی اللہ المیت فیسألان عما ذکرنا وقد انکرت المعتزلۃ وعامۃ المبتدعۃ ھذا۔[2]

ترجمہ۔ اور اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے احادیث کثیرہ منقول ہیں کہ قبر میں میت کے پاس دو فرشتے آتے ہیں اور اللہ تعالیٰ میت کو زندہ کر دیتا ہے اور وہ فرشتے اس سے وہ باتیں پوچھتے ہیں جو ہم نے ذکر کی ہیں۔ معتزلہ اور بدعتی لوگ قبر کے اس سوال وجواب کے منکر ہیں۔

امام غزالیؒ (۵۰۵ھ) لکھتے ہیں:۔

واما عذاب القبر فقد دلت علیہ قواطع الشرع اذ تواتر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم وعن الصحابۃ رضی اللہ عنھم بالاستعاذۃ منہ فی الادعیۃ واشتھر عند المرور بقبرین انھما لیعذبان و

---

[1] التبصیر ص ۱۵۵ [2] اصول الدین ص ۱۲۵

دل علیہ قولہ تعالیٰ وحاق بآل فرعون سوء العذاب۔ النار یعرضون علیہا غدوًا وعشیًا وھو ممکن فیجب التصدیق بہ ووجہ امکانہ ظاھر وانما تنکرہ المعتزلۃ۔[1]

ترجمہ۔ اور عذاب قبر کے ثبوت پر شریعت کے قطعی دلائل وارد ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے تواتر سے ثابت ہے کہ یہ حضرات اپنی دعاؤں میں عذاب قبر سے پناہ مانگتے رہے اور یہ بات آپ سے خبر مشہور کے درجہ میں ہے کہ آپ دو قبروں کے پاس سے گزرے جن میں مردوں کو عذاب ہو رہا تھا اس برزخی عذاب پر قرآن کریم کی یہ آیت دلالت کرتی ہے " اور گھیر لیا آل فرعون کو بُرے عذاب نے آگ ہے جس پر وہ صبح و شام پیش کیے جاتے ہیں اور ایسا ہونا ممکن ہے۔ سو ضروری ہے کہ اس کی تصدیق کی جائے اور اس کی وجہ امکان ظاہر ہے اور سوائے معتزلہ کے اس کا انکار کوئی نہیں کرتا۔

پھر یہ بھی لکھتے ہیں:۔

ولا یبعد ان تعاد الروح الی الجسد فی القبر ولا یبعد ان تؤخر الی یوم البعث۔[2]

ترجمہ۔ اور بعید نہیں کہ قبر میں روح ہی جسد میں لوٹائی جاتی ہو اور یہ بھی بعید نہیں کہ اسے حشر تک مؤخر رکھا جائے (یعنی اس دوران روح کا بدن سے صرف تعلق ہو)۔

نوٹ

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے بھی اس باب میں امام غزالیؒ سے تمسک کیا ہے اور ان کی تائید کی ہے۔[3]

---

[1] الاقتصاد فی الاعتقاد ص۹۷ [2] احیاء العلوم جلد ۴ ص ۴۰۹ [3] حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۲ ج ۱

اب ذرا چھٹی صدی میں چلیے۔

علامہ برہان الدین المرغینانی (۵۹۳ھ) صاحب الہدایہ

ومن یعذب فی القبر یوضع فیہ الحیٰوۃ فی قولہ العامۃ۔[1]

ترجمہ۔ اور جسے قبر میں عذاب دیا جائے اس میں جمہور اہل سنت کے قول کے مطابق زندگی قائم کی جاتی ہے۔

ساتویں صدی کی شہادت

علامہ قرطبی ابوعبداللہ محمد بن احمد (۶۷۱ھ)

ان عذاب القبر ونعیمہ حق کما صرحت بہ الاحادیث الصحیحۃ و لکن اللہ تعالیٰ یاخذ بابصار الخلائق واسماعھم من الجن والانس عن رویۃ عذاب القبر ونعیمہ۔[2]

ترجمہ۔ عذاب قبر اور نعیم قبر برحق ہے جیسا کہ احادیث صحیحہ نے اس کی تصریح کی ہے لیکن اللہ تعالیٰ عام انسانوں اور جنات کی آنکھوں کو اور ان کے کانوں کو عذاب قبر اور نعیم قبر سے روکے رکھتے ہیں (کہ وہ اسے دیکھ نہیں پاتے۔

علامہ قرطبی کی دوسری عبارت:

وقد اجمع اھل الکشف ان المیت یحس بضغطۃ القبر و یحس باختلاف اضلاعہ ولو کان فی بطون السباع والطیور اوکان قد حرق وذری فی الریح فتحس کل ذرۃ بالالم ولو کانت متفرقۃ۔[3]

---

[1] ہدایہ جلد ۲ صفحہ ۴۸۴ [2] مختصر تذکرہ القرطبی صفحہ ۳۶ [3] ایضاً

ترجمہ: سب اہل کشف اس پر متفق ہیں کہ میت قبر کے دباؤ کو محسوس کرتی ہے اور پسلیوں کے ایک دوسرے میں دھنسنے کو محسوس کرتی ہے گو وہ میت درندوں اور پرندوں کے پیٹوں میں ہی کیوں نہ ہو یا وہ جل کر خاک ہو گئی ہو اور خاک میں اڑ گئی ہو۔ اس میت کا ایک ایک ذرہ اس اَلَم (عذاب قبر) کو محسوس کرتا ہے گو وہ میت متفرق ذرات میں ہی کیوں نہ بٹی ہو۔

امام نووی (۶۷۶ھ) شرح صحیح مسلم میں برزخی عذاب کی یہ صورت بتلاتے ہیں:۔

ثم المعذب عند اهل السنة الجسد بعينه او بعضه بعد اعادة الروح اليه او الى جزء منه وخالف فيه محمد بن جرير وعبد الله بن كرام وطائفة فقالوا لا يشترط اعادة الروح قال اصحابنا هذا فاسد لان الالم والاحساس انما يكون فى الحى قال اصحابنا ولا يمنع من ذلك كون الميت قد تفرقت اجزاءه كما نشاهده فى العادة او اكلته السباع او حيتان البحر او نحو ذلك فكما ان الله تعالىٰ يعيده للحشر وهو سبحانه وتعالىٰ قادر على ذلك فكذا يعيد الحيٰوة الى جزء منه وان اكلته السباع والحيتان[1]

ترجمہ: پھر اہل السنۃ والجماعۃ کے نزدیک عذاب اس (دنیا والے) جسد کو پورے جسد کو یا بعض حصہ بدن کو اس میں روح لوٹنے کے بعد ہوتا ہے گو وہ اس کے کسی ایک جزو میں ہی کیوں نہ ہو۔ اس میں محمد بن جریر اور عبد اللہ بن کرام (جو فرقہ کرامیہ کا بانی گزرا ہے) اور کچھ دوسرے لوگوں نے اختلاف کیا ہے وہ کہتے ہیں روح کا لوٹنا اس کے لیے شرط نہیں۔ ہمارے اصحاب (اہل السنۃ والجماعۃ) کا کہنا ہے عذاب قبر میں یہ بات مانع نہیں کہ میت کے بدن کے اجزاء مختلف جگہوں میں بکھر گئے ہوں

---

[1] شرح صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۳۸۶

جیسا کہ ہم روز دیکھتے ہیں یا اسے (میت کو) درندوں نے یا سمندر کی مچھلیوں نے کھالیا ہو یا ایسا ہی کوئی اور سبب واقع ہوا ہو۔ سو جیسے اللہ تعالیٰ ان ذراتِ منتشرہ کو حشر کے دن لوٹائے گا اور اللہ تعالیٰ جو ہر کمزوری سے پاک ہے اور وہ اس پہ قادر ہے سو اسی طرح اللہ تعالیٰ اس میں دگو اس کے کسی ایک حصہ بدن میں کیوں نہ ہو) حیات لوٹا دیتا ہے گر اسے درندے اور مچھلیاں کھا چکے ہوں۔

اس عبارت میں امام نووی ؒ نے محمد بن جریر اور عبداللہ بن کرام کے مقابلہ میں جن علماء کو پیش کیا ہے انہیں اصحابنا کہہ کر پیش کیا ہے اور دو دفعہ ایسا کہا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ دونوں حضرات ان کے نزدیک اہل سنت کے افراد نہیں۔ ورنہ ان کے مقابلے میں وہ قال اصحابنا کی تعبیر اختیار نہ کرتے۔ سو جاننا چاہیئے کہ اس محمد بن جریر سے مراد ابن جریر طبری نہیں ابن جریر کرامی ہے جسے علماء کرام شیعہ لکھتے ہیں۔ کرامیہ اور شیعہ دونوں تقیہ کے قائل ہیں اور جھوٹ بولنا جائز سمجھتے ہیں —— سو ہم صاحب نبراس سے اتفاق نہیں کر سکتے۔ جو اسے اہل سنت میں سے سمجھتے ہیں۔ یہ اس صورت میں ہے کہ نبراس ص۲۲۲ میں یہ اضافہ کسی نقل نویس کا نہ ہو۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم۔

تفسیر ابن جریر طبری جلد ۱۲ ص۲۱۴ میں عقیدہ اہل سنت کی کھلی تائید موجود ہے۔

امام نسفی (۷۰۱ھ) بھی لکھتے ہیں:۔

عند العامه توضع فيه الحيٰوة بقدر ما يتالم والحياة المطلقة وقيل توضع فيه الحيٰوة من كل وجه[1]

ترجمہ۔ جمہور اہل سنت کے نزدیک میت میں اس قدر حیات ڈال دی جاتی ہے کہ وہ نعیم والم کا ادراک کر سکے۔ وہ مطلق حیات ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہر پہلو سے اس میں حیات لوٹائی جاتی ہے۔

---

[1] الکافی شرح الوافی ص

آٹھویں صدی کی شہادت

علامہ صدرالدین الحنفی (۷۹۲ھ) شارح عقیدہ طحاویہ رقمطراز ہیں۔

وکذلك عذاب القبر یکون للنفس والبدن جمیعاً باتفاق اهل السنة والجماعة[1]

ترجمہ۔ اور اسی طرح عذاب قبر ہے جو باتفاق اہل السنۃ والجماعۃ روح اور بدن دونوں کو ہوتا ہے۔

افسوس کہ اہل السنۃ والجماعت کی یہ اجماعی پکار بھی ہمارے رائم کردہ دوستوں کو راہ نہیں دکھا سکی۔

علامہ تقی الدین السبکی الشافعی (۷۵۶ھ)

وقد اجمع اهل السنة علی اثبات الحیٰوة فی القبور قال امام الحرمین فی الشامل وقد اتفق سلف الامة علی اثبات عذاب القبر واحیاء الموتی فی قبورهم ورد الارواح فی اجسادهم[2]

ترجمہ۔ اہل السنۃ کا اجماع ہے کہ قبروں میں میت کو حیات ملتی ہے امام الحرمین نے لکھا ہے سب سلف امت کا اس پہ اتفاق ہے کہ ۱۔ عذاب قبر ثابت ہے ۲۔ مردوں کو یہ زندگی قبروں میں ملتی ہے اور ۳۔ یہ کہ ارواح اجساد میں لوٹائی جاتی ہیں۔

ان حیاة جمیع الموتٰی بارواحهم واجسامهم فی قبورهم لا شك فیها[3]

ترجمہ۔ اسلاف امت کے اس کھلے اجماع کے بعد بھی کیا اس عقیدے میں کسی قسم کا کوئی شک ہو سکتا ہے؟ تمام اموات کے لیے زندگی ان کی قبروں میں ان کی ارواح و اجساد کے ساتھ ثابت ہے اس میں کوئی شک نہیں ہے۔

---

[1] شرح عقیدہ طحاویہ ص۳۳۰ [2] شفاء السقام ص۱۵۱ [3] ایضاً

قاضی عضد الدین الایجی (۷۵۶ھ) صاحب مواقف

احیاء الموتی فی قبورھم ومسئلہ منکر ونکیر وعذاب القبر للکافر والفاسق کلہا حق عنہ واتفق علیہ سلف الامۃ قبل ظہور الخلاف واتفق علیہ الاکثرون بعدہ۔[1]

ترجمہ۔ اموات کا اپنی قبروں میں زندہ کیا جانا۔ اور منکر ونکیر کے (وہاں) سوالات۔ اور عذاب قبر تمام کافروں اور فاسقوں کے لیے برحق ہے اور اس پر تمام اسلاف امت کا ظہور اختلاف سے پہلے اتفاق رہا ہے اور ظہور اختلاف کے بعد بھی اسلاف امت کی اکثریت اسی عقیدے کی رہی ہے

شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ (۷۲۸ھ)

الاحادیث الصحیحۃ المتواترۃ تدل علیٰ عود الروح الی البدن وقت السوال والسوال للبدن بلا روح قول طائفۃ من الناس وانکرہ الجمہور وقابلہم اٰخرون فقالوا السوال للروح بلا بدن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وکلاھما غلط والاحادیث الصحیحہ تردہ ولو کان ذلک علیٰ الروح فقط لم یکن للقبر بالروح اختصاص۔[2]

ترجمہ۔ اور احادیث صحیحہ متواترہ منکر ونکیر کے سوال وقت روح کے بدن میں لوٹائے جانے کی خبر دیتی ہیں اور سوال بدن سے بلا روح ہو یہ کچھ لوگوں کا قول ہے اور جمہور اہل اسلام نے اس کا انکار کیا ہے اور کچھ لوگ ان پہلے لوگوں کے بالکل الٹ اٹھے ہیں وہ کہتے ہیں منکر اور نکیر کا سوال صرف روح سے ہے بدن سے نہیں اور یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ احادیث صحیحہ ان کی تردید کرتی ہیں۔ اگر صورت یہی ہوتی کہ یہ سوال وجواب صرف روح ہو تو قبر کا روح سے کوئی اختصاص نہ ہوتا۔

---

[1] شرح مواقف ص۱۵ ج۲ مع الشرح [2] شرح حدیث النزول ص۵۱

بل العذاب والنعیم علی النفس والبدن جمیعاً باتفاق اھل السنۃ والجماعۃ۔[1]

ترجمہ۔ یہ قبر کا نعیم وعذاب باتفاق اہل سنت روح وبدن دونوں کے لیے ہے۔

غور فرمائیں اگر روح کا بدن مدفون سے کوئی تعلق نہ ہو تو قبر کے نعیم وعذاب پر کیسے ایمان لایا جاسکتا ہے۔

فقد صرح الحدیث باعادہ الروح الی الجسد وباختلاف اضلاعہ وھٰذا بیّن فی ان العذاب علی الروح والبدن مجتمعین۔[2]

ترجمہ۔ حدیث میں تصریح ہے کہ روح جسد میں لوٹائی جاتی ہے اسی طرح یہ بھی تصریح ہے کہ میت کی پسلیاں آپس میں ٹکراتی ہیں اور یہ اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ قبر کا عذاب روح اور بدن دونوں پر اکٹھے ہوتا ہے۔

حافظ ابن قیم (۷۵۱ھ)

ان مذھب سلف الامۃ وائمتھا ان المیت اذا مات یکون فی نعیم اوعذاب وان ذٰلک یحصل لروحہ وبدنہ۔[3]

ترجمہ۔ اسلاف امت اور ائمہ دین کا مذہب یہ ہے کہ انسان جب مرجائے تو وہ (قبر کے) نعیم یا عذاب میں رہتا ہے اور نعیم وعذاب اس کے روح وبدن دونوں کو ہوتا ہے۔

علامہ سعد الدین تفتازانی (۷۹۲ھ) معتزلہ کے مقابلے میں نکلے جو خبر واحد کو حجت نہیں مانتے تھے اور اعادہ روح کے منکر تھے۔ ان کے سامنے آپ نے یہ موقف اختیار کیا۔ کہ اگر حیات کے لیے اعادہ روح لازم نہ کیا جائے تو بھی تو حیات کا تحقق ہوسکتا ہے۔ پھر عذاب قبر کا انکار کیوں؟ فرماتے ہیں۔

ویجوز ان یخلق اللہ فی جمیع الاجزاء او فی بعضھا نوعاً من الحیوٰۃ

---

[1] شرح حدیث النزول صفحہ ۵۱ [2] فتاویٰ ابن تیمیہ جلد ۴ صفحہ ۲۸۹ [3] کتاب الروح صفحہ ۶۴

قدر ما يدرك الم العذاب ولذة النعيم وهذا لا يستلزم اعادة الروح الى بدنه ولا ان يتحرك ويضطرب۔[1]

ترجمہ۔ اور یہ جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ پورے بدن میں یا بعض اجزائے بدن میں ایک طرح کی حیات پیدا کر دے کہ میت اس سے عذاب کی تکلیف یا نعیم کی لذت پا سکے اور اس حیات کے لیے ضروری نہیں کہ روح بدن کی طرف لوٹے اور نہ یہ کہ وہ بدن متحرک ہو یا ہلے جُلے۔

یہ عامہ اموات کے بارے میں ہے ان میں مطلق حیات کا قول اختیار کیا جائے جس سے میت عذاب قبر یا نعیم قبر کا ادراک کر سکے تو یہ کافی ہے۔

علامہ تفتازانی یہاں اعادہ روح کا انکار نہیں کر رہے ہے، معتزلہ کو سامنے رکھ کر میت کے بدن میں زندگی کا ایک باریک انداز ثابت کر رہے ہیں جس سے بدن میں عذاب قبر یا اس کی راحت کا تحقق ہو سکے، علامہ تفتازانی کا اس سے مقصد احادیث کا انکار نہیں علی وجہ الالزام انہوں نے یہ بات کہی ہے۔

بدن میت میں زندگی کا آنا مسلمات میں سے ہے۔ یہ جس طرح سے بھی آئے ہو سکتا ہے اعادہ روح سے ہو یا تعلق روح سے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ چاہیں ان میں اتنی زندگی پیدا کر دیں کہ وہ الم یا راحت کو پا سکے۔ ہدایہ میں ہے:۔

ومن يعذب فى القبر يوضع فيه الحيوة فى قوله العامة۔[2]

ترجمہ۔ اور جس میت کو قبر میں عذاب دیا جاتا ہے اس میں جمہور کے عقیدہ کے مطابق ایک طرح کی زندگی ٹھہرائی جاتی ہے۔

اب ذرا نویں صدی میں چلیں۔ علامہ عضد الدین الایجی (۷۵۶ھ) کی عبارت آپ شرح مواقف میں دیکھ آئے ہیں۔ اب شارح علامہ سید شریف الجرجانی (۸۱۶ھ) کی عبارت بھی دیکھیں۔

---

[1] شرح عقائد ص۷۷ [2] ہدایہ جلد ۲ ص۴۸۴

و اذا ثبت التعذیب ثبت الاحیاء و المسئلہ لان کل من قال بعذاب القبر قال بھا[1]

ترجمہ۔ اور جب عذاب کا ثبوت ہو گیا تو زندگی کا ثبوت بھی ہو گیا اور قبر کے سوال و جواب کا ثبوت بھی مل گیا کیونکہ ہر وہ شخص جو عذاب قبر کا انکار کرے اسے قبر کی اس زندگی کا اقرار کرنا ہو گا۔

حافظ ابن حجر عسقلانی (۸۵۲ھ) پہلے کرامیہ کا رد کرتے ہیں جو واردات قبر صرف بدن پر لاتے ہیں اور پھر ان لوگوں کا رد کرتے ہیں جو انہیں صرف روح سے متعلق بتاتے ہیں۔ بغیر اس کے کہ وہ بدن کی طرف عود کرے۔ اور پھر لکھتے ہیں :-

وخالفھم الجمھور فقالوا تعاد الروح الی الجسد او بعضہ کما ثبت فی الحدیث ولو کان علی الروح فقط لم یکن للبدن بذٰلک اختصاص ولا یمنع من ذلک کون المیت قد تفرق اجزاءہ لان اللّٰہ تعالٰی قادر علٰی ان یعید الحیوٰۃ الٰی جزء من الجسد و یقع علیہ السوال کما ھو قادر علٰی ان یجمع اجزائہ[2]

ترجمہ۔ اور جمہور نے ان کی مخالفت کی ہے وہ کہتے ہیں کہ روح بدن کی طرف یا اس کے بعض حصوں کی طرف لوٹائی جاتی ہے جیسا کہ حدیث میں ثابت ہے اور اگر عذاب صرف روح پر ہوتا تو بدن کو اس سے کوئی اختصاص نہ تھا اور اس کے لیے میت کا اس حال میں ہونا کہ اس کے اجزاء متفرق ہو چکے ہوں عذاب قبر میں مانع نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اس پہ قادر ہے کہ جسم کے کسی حصے میں زندگی لوٹا دے اور فرشتوں کا سوال اس حصہ بدن پہ وارد ہو۔ جیسے کہ وہ اس پہ قادر ہے کہ اس کے تمام اعضائے بدن کو پھر سے جمع کر دے

---

[1] شرح مواقف ص۶۱۷ [2] فتح الباری جلد ۳ ص۲۷۴

پھر آگے جاکر لکھتے ہیں:۔

قد ثبتت الاحادیث بما ذھب الیہ الجمھور کقولہ (علیہ السلام) انہ یسمع خفق نعالھم و قولہ (علیہ السلام) تختلف اضلاعہ لضمۃ القبر و قولہ (علیہ السلام) یسمع صوتہ اذا ضرب بالمطراق و قولہ (علیہ السلام) یضرب بین اذنیہ وقولہ (علیہ السلام) فیقعدانہ وکل ذالک من صفات الاجساد۔[1]

ترجمہ۔ بے شک احادیث جمہور کے حق میں ثابت ہیں جیسے حضورؐ کا یہ ارشاد کہ مردہ (جنازہ پڑھنے والوں کے) جوتوں کی آواز سنتا ہے اور حضورؐ کا یہ ارشاد کہ قبر کے ملنے سے اس کی پسلیاں ایک دوسرے سے ٹکرا جاتی ہیں اور آپ کا یہ ارشاد کہ وہ ہتھوڑے چلنے کی آواز سنتا ہے اور آپ کا یہ ارشاد کہ اس کے دونوں کانوں کے مابین ضرب لگتی ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ فرشتے اسے سنبھالتے ہیں۔ اور یہ سب ابدان کی صفات (اور حرکات) ہیں۔ روح کی کیفیات نہیں۔

علامہ بدرالدین العینی (۸۵۵ھ)

ان الارواح تعاد الی اجساد عند المسئلۃ و ھو قول الاکثر من اھل السنۃ۔[2]

ترجمہ بے شک ارواح سوال وجواب کے وقت اجساد کی طرف لوٹائی جاتی ہیں اور یہی فیصلہ جمہور اہل السنۃ کا ہے

ولا بعد فی رد الحیوۃ الی بعض اجزاء البدن فیختص بالاحیاء و المسألۃ والعذاب وان لم یکن مشاھدا لنا۔[3]

---

[1] فتح الباری جلد ۳ ص ۲۳۷ [2] شرح صحیح بخاری جلد ۷ ص ۱۴۳ [3] ایضاً جلد ۸ ص ۱۴۷

ترجمہ. اور بعض حصہ بدن کی طرف حیات کا لوٹنا اور اس کا زندوں سے اختصاص اور قبر کا سوال و جواب اور قبر کا نعیم و عذاب ان میں سے کوئی چیز مستبعد نہیں کہ ہم ان حالات کو دیکھ نہ سکیں۔

محقق علی الاطلاق حافظ ابن ہمام (۸۶۱ھ)

الحق ان المیّت المعذّب فی قبرہ توضع فیہ الحیٰوۃ بقدر ما یحس بالالم والبنیۃ لیست بشرط عند اھل السنۃ حتیٰ لو کان متفرق الاجزاء بحیث لا تتمیز الاجزاء بل ھی مختلطۃ بالتراب فیعذب جعلت الحیٰوۃ فی تلک الاجزاء التی لا یأخذھا البصر وان اللہ تعالیٰ علیٰ ذلک لقدیر[1]

ترجمہ. حق یہ ہے کہ میت کو عذاب قبر ہوتا ہے اور اس کے لیے اس میں اس قدر حیات رکھ دی جاتی ہے کہ عذاب قبر کو وہ محسوس کر سکے اور میت کے سب اجزاء کا یک جا ہونا اہل السنۃ کے ہاں عذاب قبر کے لیے شرط نہیں ــ میت اگر متفرق الاجزاء بھی ہو یہاں تک کہ اجزاء باہم پہچانے نہ جا سکیں بلکہ مٹی کے ساتھ مل چکے ہوں تو بھی اسے عذاب قبر ہوتا ہے ــ حیات اس کے ان اجزاء میں ڈالی جاتی ہے جنہیں نظر پا نہ سکے اور بے شک اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے۔

توضیحہ انا نمنع اقتضاء ذلک عود الحیٰوۃ الکاملۃ الی جمیع البدن و غایۃ ما یقتضی اعادۃ الحیٰوۃ الی الجزء الذی بہ فھم الخطاب ورد الجواب والانسان قبل موتہ لم یکن یفھم بجمیع بدنہ بل بجزء من باطن قلبہ واحیاء جزء یفھم الخطاب ویجیب ممکن مقدور علیہ وامور البرزخ لا تقاس بامور الدنیا[2]

---

[1] فتح القدیر شرح ہدایہ جلد ۲ صفحہ ۹۹ [2] مسامرہ شرح مسایرہ جلد ۲ صفحہ ۱۱۶

ترجمہ ۔ اور اس کی توضیح یہ ہے کہ ہم عذاب قبر کے لیے بدن میں پوری حیات کے لوٹ آنے کا تقاضا نہیں کرتے. زیادہ سے زیادہ اتنی بات ہے کہ حیات اس جزو بدن میں لوٹ آئے جس سے وہ سوال و جواب دینے کو سمجھ سکے. اس سے پہلے بھی تو انسان پورے بدن سے بات کو نہ سمجھتا تھا صرف باطن قلب ایک حصے سے بات کو پالیتا تھا اور اب اس کے کسی ایک حصے کا زندگی پالینا اسے بات سمجھنے (سوال و جواب) کے لائق کر دیتا ہے اور جواب دینا اس کے لیے ممکن اور مقدور ہو جاتا ہے اور برزخ کے احوال کو دنیوی امور پہ قیاس نہیں کیا جاسکتا.

اب دسویں صدی کی شہادت بھی لیجیے :۔

امام سیوطیؒ (۹۱۱ ھ) حافظ ابن تیمیہؒ سے موافقت کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

وقال ابن تیمیه الاحادیث متواترة علی عود الروح الی البدن وقت السوال وسوال البدن بلا روح قول طائفة منهم ابن الزاغونی وحکی عن ابن جریر وانکره الجمهور وقابلهم اٰخرون فقالوا السوال للروح بلا بدن قاله ابن حزم واٰخرون منهم ابن عقیل و ابن الجوزی وهو غلط والا لم یکن للقبر بذلك اختصاص۔[1]

ترجمہ ۔ ابن تیمیہؒ نے کہا ہے متواتر احادیث سوال قبر کے وقت روح کے بدن کی طرف لوٹنے کی خبر دے رہی ہیں اور بدن سے بغیر روح سوال کیا جانا ایک گروہ کا خیال ہے ابن الزاغونی انہی میں سے ہے اور ابن جریر سے بھی اسی قسم کی بات حکایت کی جاتی ہے اور جمہور اہل اسلام اس کا انکار کرتے ہیں. اس گروہ کے مقابل ایک اور گروہ ہے جو روح سے بلا اتصال بدن سوال کا قائل ہے. یہ بات ابن حزم اور کچھ اور لوگوں نے بھی بتائی ہے. ابن عقیل اور ابن الجوزی اسی کے (عذاب

---

[1] شرح الصدور ص ۶۰

روح بلا بدن) قائل ہیں اور یہ بات بالکل غلط ہے بات اگر اس طرح ہوتی تو عذاب قبر کے قبر سے خاص ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی۔

دسویں صدی کی ایک اور شہادت لیجیے۔ علامہ جلال الدین الدوانی (۹۲۸ھ) لکھتے ہیں عذاب قبر کے وہی قائل ہیں جو بدن مدفون کے زندہ کیے جانے کے قائل ہوں۔ یہ زندہ کیا جانا اعادہ روح کے بغیر محض اتصال روح سے بھی ہو سکتا ہے صورتِ احیاء جو بھی ہو اس کی تفصیل اپنی جگہ۔ لیکن عذاب قبر کے لیے بدن یا ذرات بدن میں زندگی کا لوٹایا جانا برحق ہے۔ آپ لکھتے ہیں:۔

فمنهم من اثبت التعذيب وانكر الاحياء وهو خلاف العقل وبعضهم لم يثبت التعذيب ...... وهذا انكار لعذاب القبر ومنهم من قال باحيائه لكن من غير اعادة الروح ومنهم من قال بالاحياء باعادة الروح معًا ولا يلزم ان يرى اثر الحيٰوة فيه حتى ان الماكول فى بطن الحيوانات يحيى ويسأل وينعم ويعذب ولا ينبغى ان ينكر لان من اخفى النار فى الشجر الاخضر قادر على اخفاء العذاب والنعيم[1]

ترجمہ ایسے لوگ بھی ہیں جو عذاب قبر مانتے ہیں مگر بغیر میت کے زندہ کیے جانے کے اور یہ خلاف عقل ہے اور بعض ایسے ہیں جو سرے سے میت کے برزخ میں عذاب پانے کے قائل نہیں یہ عذاب قبر کا کھلا انکار ہے اور ایسے بھی جو میت کے زندہ کیے جانے کے قائل ہیں لیکن بغیر اعادہ روح کے اور ایسے لوگ بھی ہیں جو اعادہ روح سے میت کا زندہ کیا جانا مانتے ہیں اور عذاب قبر کے لیے یہ لازم نہیں کہ اس میں (اس میت میں) آثار حیات دیکھے بھی جا سکیں۔ وہ شخص جسے کسی جانور نے کھا لیا، وہ اس جانور کے پیٹ میں زندہ کیا جاتا ہے اور اس سے وہیں سوال ہوتا ہے۔ اس کی نعیم قبر یا عذاب قبر وہیں ہے اس کا انکار نہ کرنا چاہیے جو ذات باری سبز اور تر و تازہ درخت میں آگ کو چھپا سکتا ہے وہ اس پہ قادر ہے کہ عذاب قبر اور نعیم قبر کو اس طرح چھپا رکھے کہ یہاں کے زندوں کے حواس نہ اسے پا سکیں اور نہ اسے سُن سکیں۔

---

[1] حاشیہ عقائد عضدیہ ص۹۳ من طبع الہندی

علامہ عبدالوہاب الشعرانیؒ (۹۷۳ھ) اس پر بحث کرتے ہوئے کہ پورے بدن میں روح لوٹائی جاتی ہے یا اس کے بعض ماندہ حصے کی طرف ــــــ لکھتے ہیں علامہ حلیمی روح کے پورے بدن میں لوٹائے جانے کے قائل ہیں اور علامہ ابن جریر طبری اور امام الحرمین بدن کے ماندہ حصے میں اس کے لوٹنے کے قائل ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اہل حق روح کے بدن میں لوٹائے جانے کے سب قائل تھے وہ لوٹایا جانے پورے بدن میں ہو یا بعض اجزاء بدن میں :۔

ان الحلیمی یقول ترد الروح الی جسدہ کلہ وابن جریر الطبری و امام الحرمین یقولون ترد الروح الی مابقی منہ[1]

ترجمہ علامہ حلیمی اس کے قائل ہیں کہ روح پورے جسم میں لوٹائی جاتی ہے اور ابن جریر الطبری اور امام الحرمین اس کے بعض حصہ بدن میں روح کا لوٹایا جانا مانتے ہیں۔

فقہاء احناف میں علامہ شمس الدین القہستانی (۹۵۳ھ) سے کون واقف نہیں۔ آپ لکھتے ہیں :۔

والمعذب فی القبر حی بقدر ما یتالم بہ وھو اقرب الی الحق[2]

ترجمہ۔ اور جسے قبر میں عذاب ہو رہا ہے وہ اس درجہ زندہ ہے جو الم عذاب پا سکے اقرب الی الحق یہی بات ہے۔

دسویں صدی کے نصف آخر کے محدث جلیل علامہ عبدالرؤف المناوی (۱۰۰۳ھ) حدیث براء بن عازبؓ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ظاہر حدیث چاہتا ہے کہ روح سارے بدن میں لوٹائی جاتی ہے فتعاد روحہ فی جسدہ لیکن حافظ ابن حجرؒ اس کے صرف نصف اعلیٰ میں لوٹنے کے قائل ہیں جمہور کا مذہب پہلا ہے۔

پھر قاضی ابوبکر باقلانی سے تطبیق اس طرح نقل کرتے ہیں :۔

---

[1] الیواقیت والجواہر ص۱۷۹ جلد دوم [2] جامع الرموز جلد ۲ ص ۲۹۲

جمع بان مقرها في النصف الاعلیٰ ولها اتصال بباقيه وقيل

جزم به القاضي[1]

ترجمہ دونوں باتوں میں تطبیق یوں دی گئی ہے کہ روح کا قرار تو بدن کے اوپر

کے نصف حصے میں ہوتا ہے اور باقی حصہ بدن سے روح کا صرف اتصال

اور تعلق ہے اور کہا گیا ہے کہ قاضی عیاض بھی اسی پر یقین رکھتے تھے۔

دسویں صدی کے مجدد حضرت ملا علی قاریؒ (م ۱۰۱۴ھ) فقہ و حدیث کے جامع امام تھے۔

آپ نے حضرت امام ابو حنیفہؒ کی کتاب فقہ اکبر کی شرح لکھی ہے۔ آپ اس میں لکھتے ہیں:

واعلم ان اهل الحق اتفقوا على ان الله تعالى يخلق في الميت نوع حياة

في القبر قدر ما يتالم ويتلذذ ولكن اختلفوا هل يعاد الروح اليه

...... والمنقول عن ابي حنيفة التوقف الا ان كلامه ههنا يدل

على اعادة الروح اذ جواب الملكين فعل اختياري فلا يتصور

بدون الروح[2]

ترجمہ۔ اور جان لو اہل حق سب اس پر متفق ہیں کہ اللہ تعالیٰ قبر میں میت میں ایک ایسی حیات

پیدا کر دیتا ہے جس سے وہ عذاب قبر یا نعیم قبر کو پا سکے ان کا اس میں اختلاف ہے کہ یہ حیات

اعادہ روح سے ہوتی ہے یا اس کے بغیر... حضرت امام ابو حنیفہؒ سے اس میں توقف منقول ہے

مگر آپ کی عبارت یہاں اعادہ روح کی بات کہہ رہی ہے کیونکہ فرشتوں کو جواب دینا ایک

اختیاری فعل ہے اور وہ بدوں اعادہ روح کے تصور میں نہیں آسکتا۔

ملا علی قاریؒ نے اسے اہل حق کا اجماع بتایا ہے کہ قبر میں ہر میت کو زندگی ملتی ہے اور اس سے

سوال و جواب ہوتا ہے۔ اس سے خلاف کرنے والے کیا اہل حق میں سے ہو سکتے ہیں یہ آپ کے

سوچنے کی بات ہے۔

---

[1] [2] شرح فقہ اکبر

توقف امام اس میں نہیں کہ روح بدن میں آتی ہے یا نہیں، بلکہ اس میں ہے کہ روح پورے بدن میں آتی ہے یا بعض حصہ بدن میں۔ ملا علی قاری ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:۔

ولعل توقف الامام فی ان الاعادة متعلق بجزء البدن او کله۔[1]

ترجمہ۔ اور حضرت امام ابوحنیفہؒ سے جو توقف منقول ہے (وہ اس میں نہیں کہ قبر میں میت کو زندگی ملتی ہے یا نہ) وہ اس میں ہے کہ حیات اس کے پورے بدن میں لوٹائی جاتی ہے یا اس کے بعض حصہ بدن میں۔ پھر ملا علی قاریؒ نے اس دوسرے احتمال کو حدیث کی روشنی میں کلیۃً رد کر دیا ہے۔

تعاد روحه فی جسده ظاهر الحدیث ان عود الروح الی جمیع اجزاء البدن فلا التفات الی قول البعض بان العود انما یکون الی البعض ...... فانه لا یصح ان یقال من قبل العقل بل یحتاج الی صحة النقل۔[2]

ترجمہ۔ میت کی روح اس کے جسد میں لوٹائی جاتی ہے۔ اس حدیث کا ظاہر یہی ہے کہ یہ عود روح جمیع اجزائے بدن کی طرف ہوتا ہے۔ سو ان چند لوگوں کی بات کی طرف دھیان نہ کیا جائے جو روح کا بعض حصہ بدن کی طرف لوٹنا مانتے ہیں ...... کیونکہ ایسی بات محض عقل سے نہیں کہی جا سکتی۔ اس کے لیے صحت نقل درکار ہے۔

ملا علی قاریؒ کو اس سے انکار نہیں کہ روح و بدن کا کامل تعلق قیامت کو ہی ہو گا۔ اس دن کی بعثت بے شک برحق ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان احادیث صحیحہ کا یکسر انکار کر دیا جائے۔ جن میں عالم برزخ میں روح کا بدن کی طرف عود کرنا صراحت سے مذکور ہے۔ آپ لکھتے ہیں:۔

حتی یرجعه اللّٰه فی جسده ای یرده الیه کاملاً فی بدنه۔[3]

ترجمہ۔ حتی کہ اللہ تعالیٰ اس کی روح کو اس کے جسد میں پھر سے لے آئے اس سے مراد اس روح کا کامل طور پہ بدن میں لوٹنا ہے۔

---

[1] مرقات جلد ۱ ص ۱۹۸ [2] ایضاً جلد ۴ ص ۲۵ [3] ایضاً ص ۳۱

روح کا بدن سے ایسا کامل تعلق جیسا کہ اس دنیا میں ہے، یہ عامہ اموات کے لیے بیشک اسی دن ہو گا۔ واذا النفوس زوجت کا کامل اظہار قیامت کے دن ہی ہے لیکن برزخی زندگی کو محض روحانی ماننا اور بدن مادی سے کلیۃً بے تعلق رکھنا یہ عقیدہ اہل حق کا نہیں ہے۔

ملا علی قاریؒ ان ناقصان دین کے ساتھ نہیں ہیں، آپ ایک مقام پہ لکھتے ہیں :-

کما توھمہ بعض ارباب النقصان حتی جعلوا عذاب القبر روحانیاً لاجسمانیاً والصواب ان عذاب الاخرۃ ونعیمہا متعلقان بہما۔[1]

ترجمہ: جیسا کہ بعض ناقص علم کے لوگوں نے وہم کر رکھا ہے اور وہ عذاب قبر کو محض ایک روحانی چیز بتلاتے ہیں جسمانی نہیں مانتے ــــ صحیح بات یہ ہے کہ نعیم قبر اور عذاب قبر روح اور بدن دونوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

نعیم و الم تو ایک طرف رہے قبر میں تو اعمال کا ثبوت بھی ملتا ہے کیا اعمال بغیر جسد تقوم میں آتے ہیں؛ حضورؐ نے موسیٰ علیہ السلام کو قبر میں نماز پڑھتے پایا تو کیا وہ صرف روح کا عمل تھا؛ سنن نسائی کے حاشیہ میں منقول ہے:-

یہ حدیث حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حیات فی القبر کی صریح دلیل ہے اس میں آپ کو وصف نماز سے موصوف بتلایا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ آپ کھڑے تھے یہ وہ امور ہیں جن سے صرف روح موصوف نہیں ہو سکتی۔ یہ تو جسد کی شان ہے کہ وہ عمل نماز میں ہو اور اس کے قبر سے خاص ہونے میں بھی اس کی دلیل ہے اگر نماز صرف روح کے اعمال میں سے ہوتی تو اسے قبر سے خاص کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔[2]

---

[1] مرقات جلد ۱۰ صہ ۸۷ [2] زہر الربیٰ علی سنن النسائی جلد ا صہ

اب آیئے آپ کو گیارہویں صدی میں لے چلیں۔ اس دور کے علماء حق کو مسلک کیا تھا۔ اس دور کی مرکزی شخصیت حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ (۱۰۳۴ھ) ہیں۔ آپ بدن مثالی کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ عقیدہ تو اعتقاد تناسخ سے بھی بُرا ہے۔ اس کے بعد آپ یوں رقمطراز ہیں:۔

پس بدن اوّل را از حصول احکام برزخ چارہ نبود و از عذاب و ثواب قبر گزر نہ ــــ و بدن ثانی را چوں حیات ثانی اثبات مے نمائند حشر در حق او در دُنیا ثابت گشت۔ انگارم کہ معتقداں تعلق روح معلوم نیست کہ بعذاب وثواب قبر قائل باشند و بحشر ونشر معتقد بود۔ افسوس ہزار افسوس ایں قسم بطالاں خود را بمسند شیخی گرفتہ اند و مقتدائے اہل اسلام گشتہ اند ضلوا فاضلوا۔

ترجمہ۔ اس دنیا والے بدن کو احکام برزخ کا سامنا کرنے سے چارہ نہیں اور اس بدن کا عذاب ثواب قبر سے چھٹکارا نہیں اور اس مجوزہ بدن ثانی کے لیے جب یہ لوگ دوسری حیات ثابت کرتے ہیں تو اس کا حشر تو دنیا میں ہی واقع ہو گیا میں سمجھتا ہوں کہ روح کے منتقل کیے جانے کا عقیدہ رکھنے والے معلوم نہیں ہوتا کہ وہ عذاب ثواب قبر کے قائل ہوں گے اور حشر ونشر کا عقیدہ رکھتے ہوں گے۔ افسوس ہزار افسوس اس قسم کے جھوٹے لوگوں پر کہ اپنے آپ کو پیر طریقت بنا کے بیٹھے ہیں اور اہل اسلام کے مقتدا بنے ہوئے ہیں وہ خود گمراہ ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کر رہے ہیں۔

حضرت مجدد الف ثانی شیخ سرہندیؒ ایک دوسرے مقام پہ لکھتے ہیں:۔

وآنچہ او علیہ وعلیٰ آلہ الصلوات والتسلیمات از احوالِ آخرت خبر دادہ است ہمہ حق است از عذاب گور و ضغطہ آں و سوال منکر ونکیر دراں و فنائے عالم و انشقاق سموات و انتشار کواکب و برداشتن زمین و کوہہا و پارہ پارہ شدن اینہا و حشر ونشر و اعادہ روح بجسد و زلزلہ ساعت وہول قیامت

لہ مکتوب دفتر دوم مکتوب ۵۸ صہ لکھنؤ

ومحاسبہ اعمال وشہادت جوارح باعمال مکتسبہ[1]

ترجمہ۔ اور جو کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وسلم نے آخرت کے احوال کی خبر دی ہے برحق ہے جیسے عذاب قبر اور قبر کا دباؤ — اور منکر ونکیر کے قبر میں سوالات — اور پوری دنیا کا فنا ہونا — اور آسمان کا پھٹنا اور ستاروں کا انتشار — اور زمین کا پہاڑوں کو اٹھانا اور ان کا ریزہ ریزہ ہوجانا اور حشر ونشر اور روح کا جسد میں پھر سے لوٹ آنا — اور قیامت کا بڑا زلزلہ اور قیامت کی ہولناکی اور اعمال کا حساب — اور اعضاء جسمانی کی اپنے کیئے گئے اعمال پر شہادت یہ سب امور برحق ہیں۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ (۱۰۵۲ھ) بھی اسی دور کے بزرگ ہیں۔ حدیث میں آپ اپنے وقت کی سند تھے۔ آپ لکھتے ہیں:۔

واختلاف کردہ اند کہ عذاب قبر بزندہ گردانیدن میت است ودر مقابلہ داشتن روح باوے یا بنوعی دیگر کہ پروردگار تعالیٰ خواہد ومارا بدریافت کنہہ حقیقت آں راہ نباشد وحق آنست کہ باحیاء است۔ چنانکہ ظاہر احادیث دال است براں۔[2]

ترجمہ۔ اور اختلاف کیا ہے کہ عذاب قبر میت کو پھر سے زندہ کرنے سے ہوتا ہے یا روح کو میت کے سامنے لانے سے — یا کسی اور طریق سے جو اللہ تعالےٰ چاہے — اور ہمیں اس کی کنہہ معلوم کرنے کی کوئی راہ نہیں ہے۔ اور حق یہ ہے کہ عذاب قبر میت کو پھر سے زندہ کرنے سے ہوتا ہے۔ جیساکہ ظاہر احادیث اس کی شہادت دیتی ہیں۔

---

[1] مکتوبات دفتر ۲ مکتوب ۶۷ ص   [2] اشعۃ اللمعات شرح مشکوٰۃ جلد ا ص ۱۱۰

قطع مے کنم بعود حیات مر ہر میت را چنانکہ در احادیث ورود یافتہ۔[1]

ترجمہ مجھے یقین ہے کہ ہر میت کو پھر سے حیات ملتی ہے جیساکہ احادیث میں اس کی خبر دی گئی ہے۔

بارہویں صدی کے مجدد حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (۱۱۷۶ھ) اپنے مسلک پہ حضرت امام غزالیؒ (۵۰۵ھ) کو پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

امثال ہٰذہ الاخبار لہا ظواہر صحیحۃ واسرار خفیۃ ولکنہا عند ارباب البصائر واضحۃ فمن لم ینکشف لہ حقائقہا فلا ینبغی ان ینکر ظواہرہا بل اقل درجات الایمان التسلیم والتصدیق فان قلت فنحن نشاہد الکافر فی قبرہ مدۃ ونراقبہ ولا نشاہد شیأً من ذٰلک فما وجہ التصدیق علی خلاف المشاہدۃ فاعلم ان لک ثلث مقامات فی التصدیق بامثال ہٰذا احدہا وہو الاظہر والاصح والاسلم ان تصدق بانہا موجودۃ وہی تلدغ المیت لکنک لا تشاہد ذٰلک فان ہٰذہ العین لا تصلح لمشاہدۃ الامور الملکوتیۃ۔[1]

ترجمہ۔ اس طرح کی احادیث اپنے ظاہر معانی پہ وارد ہیں اور ان کے کچھ چھپے ہوئے حقائق بھی ہیں۔ گروہ اہل بصیرت کے ہاں چھپے نہیں بالکل واضح ہیں سو جس پہ یہ حقیقتیں مخفی ہوں اسے نہ چاہیئے کہ ان کے ظاہری معنی کا انکار کرے کم از کم یہ تو کرے کہ ان پہ ایمان لائے انہیں تسلیم کرے اور ان کی تصدیق کرے۔ اگر تجھے یہ خیال گذرے کہ ہم کافر مردوں کو قبروں میں پڑے مدت سے دیکھ رہے ہیں اور دھیان بھی رکھتے ہیں لیکن ان میں سے (کہ جیسے انہیں سانپ کاٹ رہے ہوں) کسی بات کو ان میں دیکھ نہیں پاتے۔ تو اس کھلی

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ جلد ا صـ مترجم صـ ۵۵

کیفیت کے مقابلہ میں ہم ان احادیث کی تصدیق کیسے کریں ؛ تو جان لے کہ
تیرے ان روایات کی تصدیق میں تین مقام ہیں جن میں سے ایک یہ ہے اور
وہی ظاہر معنی ہے اور وہی صحیح ہے اور وہی سلامتی والا ہے کہ تو تصدیق کرے
کہ سانپ وغیرہ واقعی موجود ہیں اور وہ واقعی (اس گڑھے میں پڑی) میت کو
ڈس رہے ہیں لیکن تو اسے دیکھ نہیں پاتا۔ کیوں اس دُنیا کی آنکھ امور ملکوتی
(برزخ کے حالات) کو دیکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔

حضرت شاہ صاحبؒ تاکید فرماتے ہیں کہ اگر ہم قبر میں ان حالات کا مشاہدہ نہ کر سکیں جن کی احادیث میں خبر دی گئی ہے تو انکار کے درپے ہرگز نہ ہوں۔ بلکہ ان احادیث کے ظواہر پر ایمان لائیں اور یقین کریں کہ کافر میت کو واقعی سانپ کاٹ رہے ہیں۔ اگرچہ ہم اسے دیکھ نہیں پاتے ۔۔۔۔ یہ کس میت کے بارے میں کہا جا رہا ہے ؛ جو اس گڑھے میں پڑی ہے۔
آپ یہ ان لوگوں کے بارے میں جن کی قوت بہیمیّہ قوی اور قوت ملکوتیہ کمزور ہوتی ہے فرما رہے ہیں اور زیادہ تر لوگ اسی قبیل کے ہیں :۔

فلا یکون الموت انفکاکًا لنفوسھم عن الابدان بالکلیۃ بل تنفک
تدبیرًا ولا ینفک وھمًا[1]

ترجمہ۔ ان کی موت میں انفکاک روح عن البدن (روح کا بدن سے جُدا ہونا)
کلی طور پر نہیں ہوتا۔ روح کا صرف تعلق تصرف (جس سے روح بدن میں
تدبیر کرتی تھی) ختم ہوتا ہے تعلق توجہ ختم نہیں ہوتا (دھیان اس کا ادھر
دائم رہتا ہے)۔

یہاں وہم سے مراد کوئی غیر موجود حقیقت نہیں۔ ورنہ شاہ صاحبؒ اس کا اعتبار کرتے ہوئے انفکاک روح عن البدن کی کلی نفی کا انکار نہ فرماتے۔ سو یہاں یہ لفظ تعلق توجہ کے معنی

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ص

میں ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ بتلاتے ہیں کہ نسمہ جو روح اور بدن کے مابین ایک برزخی درجہ ہے اس کی ایک توجہ روح کی طرف ہوتی ہے اور دوسری بدن کی طرف اور وہ روح و بدن میں ایک رابطہ ہے موت کے وقت نسمہ بدن سے جدا ہوتا ہے۔ لیکن اس کا ایک رُخ اُدھر ضرور رہتا ہے۔ ہم اسے ایک برزخی تعلق کہہ سکتے ہیں۔ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں :-

ولما کانت النسمة برزخًا متوسطًا بین الروح الالٰھی والبدن الارضی وجب ان یکون لھا وجه الیٰ ھٰذا و وجه الیٰ ذٰلك و الوجه المائل الی القدس ھو الملکیة و الوجه المائل الی الارض البھیمیة۔[1]

ترجمہ۔ اور جب نسمہ ایک برزخی چیز ہے جو روحِ الٰہی اور بدن ارضی کے مابین ہے تو ضروری ہے کہ اس کا ایک رُخ ادھر روح کی طرف ہو اور ایک رخ ادھر بدن کی طرف ہو اس کی جو جہت عالم قدس کی طرف جھکی ہو وہ ملکیت ہے اور جو جہت زمین کی طرف جھکی ہو وہ بہیمیت ہے۔

یہ ایک واقعی حقیقت ہے کہ حضرت شاہ صاحب کے ہاں عالمِ برزخ میں روح کا ایک تعلق (جس میں روح بدن میں نشو و نما کا کوئی تصرف نہ کرتی ہو) بدن ارضی سے ضرور قائم رہتا ہے۔ قاضی شمس الدین صاحب بھی اسے تسلیم کرتے ہیں :-

حضرت مرحوم نے عالم برزخ کا ایک سب سے کم درجے کا طبقہ ذکر فرمایا ہے جن کے ارواح کا تعلق ابدان کے ساتھ تسلیم کرتے ہیں۔[2]

محترم قاضی صاحب کہنا یہ چاہتے ہیں کہ کم درجے کے لوگوں میں تو روح و بدن کا کچھ تعلق قائم ہے لیکن انبیاء اور شہداء کے وجود قبروں میں بالکل بے جان پڑے ہیں۔ اُن کی ارواح کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ روح و بدن کا یہ علاقہ صرف چھوٹے لوگوں میں قائم ہوتا ہے :- ؎ بریں عقل و دانش بباید گریست

---

[1] حجة اللہ البالغہ جلد ا صـ۲۷ [2] مسالک العلماء صـ۵۸

قاضی صاحب کو یہ مغالطہ غالباً علامہ نسفی کی عبارت سے لگا ہے جو علامہ سیوطی نے اُن کی کتاب بحر الکلام سے نقل کی ہے۔ وہ واقعی نچلے طبقے کے بارے میں ہے:۔

هی متصله باجسادها فتعذب الارواح وتتالم الاجساد۔[1]

ترجمہ۔ وہ ارواح ان کے اجساد سے متصل رہتی ہیں (اس اتصال سے عذاب جو ارواح کو ہو رہا ہے ابدان کی تکلیف بنتا ہے) ارواح عذاب پاتی ہیں اور ابدان تکلیف اٹھاتے ہیں۔

یہ تعلق اتصال ہے جو نہایت قریب کا تعلق ہے۔ کاملین کے لیے یہ تعلق اشراق کا ہے جس میں ارواح ملاء اعلیٰ کی بلندیوں سے یا جہاں بھی وہ مصروفِ سیر ہوں ان کے ابدان پہ تاثیر کرتی ہیں نچلے طبقے کے لیے اتصال ہے اور کاملین کے لیے اشراق۔ اور یہ اشراق ہے جس سے ابدان زندگی کا شرف پاتے ہیں۔ ہاں کوئی بزرگ اتصال کو اشراق کے معنی میں لیں تو یہ اُس کی اپنی مراد ہوگی۔ اتصال اور اشراق دو مستقل حقیقتیں ہیں۔

یہاں ہم حیاتِ شہداء یا حیاتِ انبیاء سے بحث نہیں کر رہے۔ زیرِ بحث موضوع عذابِ قبر ہے۔ ہم صرف یہ کہہ رہے ہیں کہ ہمارے ان دوستوں کے بیان کے مطابق حضرت شاہ صاحبؒ نچلے طبقے کے لیے (اور اکثریت انہی کی ہوتی ہے) برزخ میں روح و بدن کے تعلق کے قائل ہیں۔ سو حضرت شاہ صاحبؒ بھی پچھلی گیارہ صدیوں میں آملے۔ جن کا متفقہ عقیدہ ہم آپ کے سامنے پیش کر آئے ہیں کہ قبر میں راحت والم صرف روح کے لیے نہیں، بدن کے لیے بھی ہے۔ عذاب روح پہ اُترتا ہے اور بدن اس سے تکلیف پاتا ہے۔ جیسا کہ علامہ نسفیؒ نے بحر الکلام میں اس کی تصریح کی ہے۔

اب اگر ابدان کاملین کے لیے یہ تعلق اشراق آپ کو حضرت شاہ صاحبؒ کے کلام میں نہ ملے تو اسے دلیلِ انکار بنانا کسی طرح درست نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو آپ ۱۱۴۴ھ میں روضہ رسول

---

[1] نقلاً من شرح الصدور للسیوطی صفحہ ۱۴۰

پر مجاورت نہ کرتے اور آپ کو اس دوران وہاں جو مشاہدات ہوئے ان کا آپ کے ہاں کوئی ذکر نہ ہوتا۔ ان شاء اللہ العزیز ہم اس پر آگے چل کر بحث کریں گے۔ واللہ ولی التوفیق۔

یہاں صرف یہ کہنا پیش نظر ہے کہ اگر ان حضرات کو عامہ اموات کے لیے تو یہ تعلق روح بالبدن (اتصال) حضرت شاہ صاحب کے کلام میں ملے اور کاملین کے لیے اشراق نہ ملے تو اسے دلیل انکار نہ بنائیں۔ جب ایک طبقے کے لیے ایک درجے کا یہ تعلق ان کے ہاں ثابت ہے تو دوسرے طبقے کے لیے ان کے حسب حال یہ تعلق کیوں نہ ہو گا۔ عدم ذکر کو یہاں ذکر عدم کے طور پر نہ لیا جائے اور اس بات کی گردان نہ کی جائے کہ حضرت شاہ صاحب کے کلام میں روح و بدن کے برزخی تعلق کا کہیں اشارہ تک نہیں ملتا۔

شہداء کی روحیں پرندوں کی صورت میں ہوں یا حواصل طیور میں ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اب ان کا تعلق کسی اور بدن سے ہو ہی نہیں سکتا۔ بدن کے عدم ذکر کو ذکر عدم کی دلیل نہ بنایا جائے۔ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں :۔

لا مانع من تعلقها ببدن برزخی مغائر لهٰذا البدن الکثیف[1]

ترجمہ۔ روح کا تعلق اس بدن کثیف (اس عنصری بدن) کے علاوہ اس کے مغایر کسی بدن برزخی سے بھی ہو تو اس میں کوئی امر شرعی مانع نہیں ہے۔

جب یہاں کوئی مانع شریعت میں موجود نہیں تو روح کا تعلق اگر بدن عنصری سے بھی کسی درجے میں مان لیا جائے تو اس کے لیے کون سی نص مانع ہے۔ پرندوں والی روایت سامنے رکھ کر اب بدنی تعلق کی کلی نفی کرتے چلے جانا کوئی دانائی نہیں ہے۔

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ جلد ۲ صفحہ ۲۱

اب آیئے بارہویں صدی کے دائرہ علم وعرفان میں آئیں اور حضرت شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی (۱۲۳۹ھ) کی طرف رجوع کریں. آپ اس مسئلہ میں کیا کہتے ہیں. شرح عقائد نسفی کی شرح میزان العقائد میں لکھتے ہیں :۔

فیعذب اللحم متصلاً بالروح والروح متصلاً بالجسد و کذا اذا صار ترابا یکون روحه بترابه والروح والتراب یتالمان.[1]

ترجمہ ہوا اس گوشت پوست کو (اس عنصری بدن کو) روح کے اتصال سے عذاب ہوتا ہے اور روح کو بدن کے اتصال سے عذاب ملتا ہے اور اگر میت کا بدن ریزہ ریزہ ہو جائے تو اس کی روح مٹی کے ان ذروں سے متصل ہوگی اور اگر روح اور یہ ذرات بدن دونوں عذاب قبر کی تکلیف اٹھائیں گے.

عقائد سنّت کا اثبات اور رافضیوں کا ابطال حضرت شاہ صاحب کا خاص موضوع رہا ہے. روافض عذاب قبر کی بجائے عذاب رجعت کے قائل ہیں کہ ایک دفعہ پھر اسی دنیا میں آنا ہے اور مجرموں نے اس کا عذاب یہاں پانا ہے. سو جس طرح انہوں نے توحید کے ساتھ عدل رسالت کے ساتھ امامت کی اختراع کی آخرت کے ساتھ رجعت کا مقدمہ لگایا. روافض اہل سنت کے عقیدہ عذاب قبر پر اسی طرح ہنستے ہیں جس طرح دیگر اقوام ہند —— حضرت شاہ عبدالعزیز ؒ ان کے اعتراض نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

ہم ایک شخص کو زمین پر مرا پڑا دیکھتے ہیں یا کسی کو مدتوں صلیب پر لٹکا پاتے ہیں یہاں تک کہ اس کے اجزائے بدن سب منتشر ہو گئے اور اس میں زندگی قیام وقعود، اور حرکت، اور سوال وجواب کی کوئی بات نہ پائی گئی.

آپ اس کے جواب میں لکھتے ہیں :۔

اللہ تعالیٰ روح آں میت را بقدریکہ ادراک متالم وتلذذ ازو حاصل شود وبہ بدنے از ابدان عنصریہ یامثالیہ مخترعہ متعلق مے سازد وایں کار سرانجام

---

[1] میزان العقائد صد ۹۸

مے فرماید و محسوس نبودن ایں حرکات دلالت بر عدم وقوع آنہا نمے کند زیرا کہ ذوات اشخاص ملائکہ و جن را بحواس ادراک نمے کنیم چہ جائے کہ حرکات معہذا واقع است بلا شبہ عند الملیین[1]

ترجمہ۔ اللہ تعالیٰ اس میت کی روح کو اس درجے میں کہ وہ اس سے تکلیف و راحت پاسکے کسی عنصری بدن یا کسی مثالی بدن سے جو اسی کے لیے بنا ہو جوڑ دیتے ہیں اور اس کام کو (عذاب قبر کو) پورا فرماتے ہیں اور ان حرکات کا ہمیں دکھائی نہ دینا ان کے مواقع نہ ہونے پر دلالت نہیں کرتا ہم فرشتوں اور جنات کی شخصیات کا بھی تو اپنے حواس سے ادراک نہیں کر پاتے چہ جائیکہ ان کی حرکات کو، حالانکہ یہ سب حقائق تمام اہل مذاہب کے ہاں مسلمات میں سے ہیں۔

یہاں آپ نے ابدانِ عنصریہ اور ابدانِ مثالیہ دونوں کی گنجائش رکھی ہے جن کو آپ جواب دے رہے ہیں ان کی نظر میں بعض صوفیوں کے ہاں ابدانِ مثالیہ کے اقوال موجود ہوں گے۔ آپ نے ہر پہلو کو ملحوظ رکھتے ہوئے رافضیوں کو کلامی انداز میں جواب دیا ہے لیکن آگے چل کر آپ اسی بات پر آجاتے ہیں جو اہل سنت کا مختار ہے۔ آپ مذکورہ عبارت کے چند سطر بعد لکھتے ہیں:۔

خدا تعالیٰ قادر است بر آنکہ ۔ ۔ ۔ ۔ روح آں میت را باوصف تعلقے کہ ببدن خود پیدا کردہ منعم و معذب کردہ اند[2]

ترجمہ۔ اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے کہ اس میت کی روح کو اس تعلق سے اس کا اپنے (عنصری بدن سے) قائم ہے (قبر میں) نعیم و عذاب دے۔

پھر ایک دوسرے مقام پہ لکھتے ہیں ارواح انبیاء و اولیاء کا مقر علیین ہے۔ لیکن ان ارواح کا اپنی قبروں سے بھی ایک تعلق ہوتا ہے جس سے وہ زائرین اور اپنے جاننے

---

[1] تحفہ اثناء عشریہ صد ۲۸۴ [2] ایضاً

والوں کے آنے سے مستانس ہوتے ہیں (ان سے اُنس پاتے ہیں) آپ لکھتے ہیں :۔

تعلقے بہ قبر نیز ایں ارواح را مے باشد کہ بہ حضور زیارت کنندگان واقارب و دیگر دوستاں بر قبر مطلع ومتانس مے گردند۔ زیرا کہ روح را قرب و بعد مکانی مانع ایں دریافت نمے شود[1]

ترجمہ: ان روحوں کا اپنی قبروں سے بھی ایک تعلق ہوتا ہے جس سے وہ زیارت کے لیے آنے والوں اور اپنے اقارب اور دوستوں کی حاضری کو پہچانتے ہیں اور مانوس ہوتے ہیں ___ یہ اس لیے کہ روح کا مکانی قرب وبعد اس دریافت میں مانع نہیں ہوتا۔

پھر ایک جگہ ہندوؤں کو جواب دیتے ہوئے کہ مُردوں کو جلانا صحیح طریقہ نہیں۔ دفن کرنا ہی درست ہے لکھتے ہیں :۔

در دفن کردن چوں اجزائے بدن ہمانہ یکجا مے باشند علاقہ روح با بدن از راہ نظر وعنایت بحال مے ماند وتوجہ روح بزائرین ومتانسین ومستفیدین بسہولت مے شود کہ بہ سبب تعیین مکانِ بدن گویا مکانِ روح ہم متعین است[2]

ترجمہ: میت کو دفن کرنے میں تمام اجزائے بدن یکجا رہتے ہیں روح کا تعلق بدن سے از راہ نظر وعنایت بحال رہتا ہے اور روح کی توجہ زیارت کرنے والوں اور مستفیض ہونے والوں پر بڑے آرام سے ہوتی ہے۔ بدن کی جگہ کے معین ہونے کے باعث گویا روح کو بھی ایک مقام معین مل گیا ہے۔

روح کا یہ تعلق کس بدن سے ہوتا ہے۔ بدن عنصری سے یا کسی بدنِ مثالی سے ؟

اس کا جواب بھی حضرت شاہ صاحبؒ سے لیں :۔

---

[1] فتاوےٰ عزیزی ج۱ ص۱۲۵ [2] ایضاً ص۱۲۱

ارواح را تعلق بہ بدن خود کہ در قبر مدفون است البتہ مے باشد زیرا کہ مدت دراز دریں بدن بودہ اند[1]

ترجمہ۔ ارواح کا تعلق اپنے بدن سے جو قبر میں مدفون ہوتا ہے قائم رہتا ہے کیونکہ ارواح مدتوں (اس دنیا میں) ان بدنوں میں رہ چکی ہیں۔

اور پھر لکھتے ہیں :-

ثابت شد کہ روح باقی است و اورا تعلقے خاص با جزاء بدن بعد مفارقت از وے و تغیر کیفیت وے نیز باقی است کہ بداں علم و شعور بزائران قبر و احوال ایشاں دارد[2]

ترجمہ۔ اور یہ بھی پتہ چلا کہ روح باقی ہے اور اس کا بدن سے مفارقت اور کیفیت کے تغیر کے باوجود اجزائے بدن سے ایک خاص تعلق قائم رہتا ہے اور تعلق سے قبر پر آنیوالوں کو اور ان کے حالات کو جانتی اور پہچانتی ہے۔

شیعہ اہلِ سنت کے اس عقیدے کے مقابل عذاب رجعت کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ اونچے درجے کے لوگ اور نہایت درجے کے مجرمین ایک دفعہ پھر اس دنیا میں لوٹیں گے اور ان کی یہ زندگی اس عالم دنیا میں ہوگی۔ یہ اس طرح کی دوبارہ زندگی ہوگی جو حضرت عزیر علیہ السلام کو سو سال کے بعد پھر جی اٹھنے پر ملی تھی اور یہ بالکل دنیوی زندگی تھی رجعت میں عالم برزخ کا نہیں دنیا کا سامنا ہوگا اور اس میں روح اور بدن کا وہی حقیقی تعلق ہوگا۔ جو ہم اب اس دنیا میں محسوس کرتے ہیں یا جیسے حضرت عزیر علیہ السلام نے دوبارہ زندہ ہو کر محسوس کیا تھا۔

شیعہ علماء نے اپنی کتابوں میں اپنے اس عقیدہ رجعت پر بڑی بحثیں کی ہیں شریف مرتضیٰ (۴۳۶ھ) نے مسائل ناصریہ میں لکھا ہے زمانِ مہدی میں ابوبکر و عمر کو پھر سے زندہ کیا جائے گا۔[3]

---

[1] فتاوٰی عزیزی جلد ۲ صفحہ ۲۴ [2] ایضاً جلد ۲ صفحہ ۱۰۸ [3] تحفہ اثنا عشریہ صفحہ ۲۴۲ فارسی صفحہ ۳۹۹ صفحہ ۵۰۱ اردو

اور ملا باقر مجلسی نے حق الیقین (طبع ایران) کے صفحہ ۳۸۴ سے ۳۸۸ تک اس پر مفصل بحث کی ہے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ ان کے خلاف عقابی نظر رکھتے تھے۔ آپ نے اہل سنت کے عقیدہ عذاب قبر کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ عالم برزخ میں روح کا اس عنصری بدن سے اس طرح کا تعلق نہیں ہوتا۔ جیسا کہ اس دنیا میں تھا۔ وہاں روح اور بدن کا ایسا تعلق ہے جو زیر پردہ ہے یہ کوئی کھلی زندگی نہیں جسے دوسرے بھی دیکھ سکیں یہ ایک نہایت لطیف ربط ہے جو روح کو بدن سے ملاتا ہے۔

قبر میں اعادہ روح بھی اس طرح کا نہیں جس طرح عُزیر علیہ السلام کو اس دنیا میں حاصل ہوا تھا۔ وہاں یہ صرف اس درجے میں ہے کہ میت کا علم و شعور لوٹ کر آئے اور وہ سوالوں کا جواب دے سکے یا پھر وہ وہاں کے الم و راحت کا ادراک کر سکے یہ ادراک اسی بدن (یا اس کے ذرات) کے واسطہ سے ہوتا ہے۔ بدن روح کے لیے بمنزلہ آلہ ہے۔ جس سے کسی تکلیف یا راحت کا ادراک ہو سکتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ وہاں کے حالات کو اس دنیا کے حالات پر قیاس نہیں کیا جا سکتا — آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرما دیا یا اس دین قیم کی جو وضاحتیں حضرات صحابہ کرامؓ اور ائمہ دین نے کیں اسے اسی طرح ماننا اور اسے اپنے عقیدے کی حصار جاننا ہمارے ذمہ ہے۔

دنیا اور برزخ میں ایک یہ فرق بھی ہے کہ یہاں کے امور اولاً بدن پر وارد ہوتے ہیں اور روح اس کے ذیل میں اَلم یا راحت پاتی ہے۔ اس کے لیے بدن کی بقا اور کلیاً سلامتی ضروری ہے۔ عالم برزخ میں اصل واردات روح پر ہوتی ہیں۔ بدن یا اجزائے بدن اس کے ذیل میں الم و راحت پاتے ہیں۔ سو وہاں عذاب قبر کے لیے بقائے بدن یا بدن کی سلامتی ضروری نہیں۔ شاہ صاحبؒ نے یہ بات اس عالم کے مناسب کہی ہے۔ یہ نہیں کہ روح کا اس بدن سے کوئی علاقہ ہی نہیں رہا — ہاں وہ علاقہ جو پہلے اس بدن سے تھا اس کا انقطاع ہو چکا ہے آپ شیعہ کو جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں :-

در قبر احیاء و اماتت حقیقتہ نیست بسبب انعکاس اشعہ روح بہ بدن تعلقے پیدا مے شود کہ تغذیہ و تنمیہ بدن ہمراہ آں نمے باشد تا معنی حیات متحقق باشد[1]

ترجمہ قبر میں میت کو زندہ کرنا اور مارنا ایسی حقیقی صورت میں نہیں ہوتا کہ اس کے لیے غذا کا تقاضا اور بدن کا نشو و نما ہو۔ یہ ہو تو حیات کے حقیقی معنی متحقق ہوتے ہیں یہاں صرف یہ ہے کہ روح کی شعاعوں کے انعکاس سے بدن سے ایک تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔

یعنی اتنی حیات قبر کے سوال و جواب اور تنعیم و عذاب کے لیے کافی ہے گو یہ حیات غذا اور نشو و نما والی نہ ہو۔

پھر آپ کا یہ کہنا کہ معذب روح ہے نہ کہ بدن ——— حضرت شاہ صاحبؒ کی دیگر تصریحات کی روشنی میں اس کا مطلب بھی یہ سمجھا جائے گا کہ براہِ راست عذاب روح پر ہے بدن پر نہیں ——— کہ اس کے لیے بدن کی سلامتی شرط ٹھہرے۔ اس کا یہ مطلب نہ سمجھا جائے گا کہ اب اس عذاب کا اس بدن یا اس کے ذراتِ منتشرہ سے کوئی برزخی علاقہ بھی نہیں ہے ——— کسی مصنف کی عبارت کی تشریح اس کے اپنے عقائد اور بیانات کی روشنی میں ہی ہونی چاہیئے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے جو وجہ لکھی ہے اس سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ بدن کی سلامتی عذاب قبر کے لیے لازمی نہیں۔

معذب روح است نہ بدن تا بقاے بدن شرط تعذیب باشد[1]

ترجمہ۔ معذب (اصالۃً) روح ہے نہ کہ بدن تاکہ بقائے بدن اس عذاب کے لیے ضروری ہو۔

اب اگر کوئی مجاہد اس آخری عبارت کو اس کی اس تشریح کے بغیر حضرت شاہ صاحبؒ کا موقف قرار دے اور سمجھے میں نے میدان مار لیا ہے اور ان صریح عبارتوں کو ایک نظر سے بھی نہ دیکھے جو ہم پہلے پیش کر آئے ہیں تو وہ خود سوچے کہ اللہ رب العالمین کے حضور اسے کیسے اپنے جہل کا عذر پیش کرنا ہوگا یا خیانت کا اقرار کرنا ہوگا۔ یہ تو کرامیہ کا عقیدہ ہے کہ وہ

---

[1] تفسیر عزیزی پ ۲۹ صـ ۱۳۳

اپنے مسلک کی خاطر جھوٹ بولنا جائز سمجھتے ہیں. آپ دیوبندی کہلاتے ہوئے اُن کے جال میں کیسے پھنس گئے.

ان کنت لا تدری فتلك مصیبة
وان کنت تدری فالمصیبة اعظم

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (۱۱۷۶ھ) کے جانشین حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ (۱۲۳۹ھ) کا موقف آپ کے سامنے آچکا ہے. آپ نے شیعہ کے عقیدہ رجعت کی تردید کرتے ہوئے قبر کی زندگی کو اس دُنیا کی سی نہیں تبلایا. تاہم اہلسنت کے اس عقیدے کی بھی پوری حفاظت کی ہے جو اسلام کی بارہ صدیوں کے اہل حق کی متفقہ آواز تھی کہ عذاب قبر برحق ہے اور یہ روح اور بدن (یا ذرات بدن) دونوں کو شامل ہے. اگر کہیں بدن مثالی کو بھی راہ دی ہے تو بھی بدن اصلی کو برزخ کی ان واردات سے کلی طور پہ فارغ نہیں کیا جا سکتا.

اب آیئے حضرت شاہ ولی اللہؒ کے تلمیذ رشید حضرت مولانا قاری ثناء اللہ صاحب پانی پتیؒ (۱۲۲۵ھ) کے مسلک کو بھی دیکھتے جائیں. یہ آپ تیرہویں صدی سے گزر رہے ہیں اور یہ اس وقت کے اہل سنت کی متفقہ آواز ہے.

آپ حضرت براء بن عازبؓ کی روایت کردہ حدیث کہ قبر میں روح بدن میں لوٹائی جاتی ہے اور یہ کہ مومنوں کی روحوں کا مقر علیین ہے تطبیق دیتے ہوئے لکھتے ہیں:-

وجه التطبیق ان مقرارواح المومنین فی علیین او فی السماء السابعة ونحو ذٰلك کما مرو مقرارواح الکفار فی سجین ومع ذٰلك لکل روح منها اتصال بجسده فی قبره لا یدرك کنهه الا الله تعالٰی وبذٰلك الاتصال یصح ان یعرض علی الانسان المجموع المرکب من الجسد والروح مقعده من الجنة اوالنار

ویحس اللذۃ اوالا لم ویسمع سلام الزائر ویجیب المنکر والنکیر و نحو ذلک مما ثبت بالکتاب والسنۃ۔ ۔ ۔ قال النسفی فی بحر الکلام ھی متصلۃ بالجساد ھامنھا کالشمس فی السماء و نورھا فی الارض۔[1]

ترجمہ۔ وجہ تطبیق یہ ہے کہ مومنین کی روحوں کا مقر علیین میں ہے یا ساتویں آسمان میں اور اسی طرح کہیں ہو جیسا کہ گزرا اور کافروں کی روحوں کا مقر مقام سجین ہے اس سب کے باوجود ہر روح کا اپنے قبر میں اسکے بدن سے بھی ایک تعلق ہے جس کی حقیقت کو اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں اور اسی تعلق سے یہ درست ہے کہ انسان پر جو جسم اور روح سے مرکب ہے اس کا ٹھکانہ جنت یا دوزخ کا پیش ہوتا رہے اور اسی حیات سے وہ قبر کے نعیم اور عذاب کو محسوس کرتا رہے۔ زائرین کے سلام کرنے اور منکر و نکیر کے سوالوں کا جواب دے اور اس طرح کی اور باتیں جو کتاب و سنت سے ثابت ہوئی ہیں۔

علامہ نسفی بحر الکلام میں لکھتے ہیں ارواح اپنے اجساد سے اسی طرح متصل ہیں جیسے سورج باوجودیکہ آسمان میں ہوتا ہے مگر اس کی روشنی زمین میں وسیع پھیلی ہوتی ہے۔

یہ صرف قارۂ ہند کی بات نہیں۔ علامہ ابن عابدین شامی (۱۲۵۲ھ) بھی اسی صدی سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

ولا یرد تعذیب المیت فی قبرہ لانہ توضع فیہ الحیوٰۃ عند العامۃ بقدر ما یحس بہ الالم والبنیۃ لیست بشرط عند اہل السنۃ بل تجعل الحیوٰۃ فی تلک الاجزاء المتفرقۃ لا یدرکھا البصر۔[2]

---

[1] تفسیر مظہری جلد ۱۰ صفحہ ۱۲۵ [2] رد المحتار جلد ۲ صفحہ ۲۰۱

ترجمہ۔ اور میت کے عذاب قبر کا انکار نہ کیا جائے کیونکہ جمہور اہل اسلام کے نزدیک اس میں اس قدر حیات رکھ دی جاتی ہے کہ وہ اس عذاب کو محسوس کر سکے اور عذاب کے لیے بدن کا یکجا ہونا اہل سنت کے نزدیک شرط نہیں ہے اس صورت میں (بدن کے ریزہ ریزہ ہونے کی صورت میں) زندگی اجزائے متفرقہ میں رکھ دی جاتی ہے اور یہاں کی آنکھ اس عذاب کو دیکھ نہیں پاتی۔

یہاں حیات کی نوع سے بحث نہیں۔ اتنا مان لیجیے کہ قبر میں میت کو اتنی حیات ضرور حاصل ہوتی ہے کہ وہ عذاب قبر کو پا سکے۔

قال اهل السنة والجماعة عذاب القبر حق وسوال المنكر والنكير حق وضغطة القبر حق ..... فيعذب اللحم متصلاً بالروح متصلاً بالجسم فيتالم الروح مع الجسد۔[1]

ترجمہ۔ اہل السنۃ والجماعۃ کہتے ہیں کہ عذاب قبر اور منکر و نکیر کا سوال برحق ہے اور قبر کا دباؤ بھی برحق ہے ..... جسد کو عذاب روح کے اتصال سے ہوتا ہے اور جسم بھی اس کے ساتھ شامل ہوتا ہے اور روح جسد کے اتصال سے تکلیف کا احساس کرتی ہے (اور یہی عذاب قبر ہے)۔

قاضی شوکانی (۱۲۵۵ھ) بھی اسی دور کے ہیں۔ آپ اس مسئلے کی روشنی میں کہ دفن کے بعد وہاں دعائے مغفرت کرنی چاہیئے اور اللہ سے میت کی ثابت قدمی مانگنی چاہیئے کہ وہ صحیح جوابات دے پائے۔ احادیث پیش کرنے کے بعد لکھتے ہیں:۔

فيه مشروعية الاستغفار للميت عند الفراغ من دفنه وسوال التثبيت له لانه يسئل فى تلك الحال وفيه دليل على ثبوت حياة القبر وقد وردت بذلك احاديث كثيرة بلغت حد التواتر

---

[1] شامی باب الجمعہ جلد ا صفحہ ۶۱

وفیہ ایضاً دلیل علیٰ ان المیت یسئل فی قبرہ وقد وردت بہ ایضاً احادیث صحیحۃ فی الصحیحین وغیرھما وورد ایضاً مایدل علیٰ ان السوال فی القبر المختص بھٰذہ الامۃ کما فی حدیث زید بن ثابت عند مسلم ان ھٰذہ الامۃ تبتلیٰ فی قبورھا و بذٰلک جزم الحکیم الترمذی۔[1]

ترجمہ: اس میں میت کے دفن سے فارغ ہونے کے بعد اس کے لیے دعائے مغفرت کی مشروعیت اور اس کے لیے ثابت قدمی کی استدعا ہے کیونکہ اس وقت اسے پوچھا جارہا ہوتا ہے ـــــ اور اس میں حیاتِ قبر کا ثبوت ہے اور اس پر اس کثرت سے احادیث وارد ہیں کہ وہ تواتر تک پہنچتی ہیں ـــــ اور اس میں اس کی بھی دلیل ہے کہ میت سے قبر میں سوال ہوتے ہیں اور اس پر بھی صحیحین اور دوسری کتابوں میں صحیح احادیث موجود ہیں اور یہ بھی وارد ہے کہ قبر میں سوال ہونا اس امت سے مختص ہے جیسا کہ صحیح مسلم میں حضرت زید بن ثابتؓ سے مروی ہے کہ اس امت کے لیے قبر کی ایک آزمائش ہے حکیم ترمذیؒ (م) بڑے جزم سے اس کے قائل ہیں۔

یہاں یہ بات خاص طور پر سامنے رہے کہ قاضی صاحب کے ہاں حیات فی القبر کا ثبوت حدِ تواتر کو پہنچتا ہے اور یہ بات اہل علم سے مخفی نہیں کہ اسلام میں تواتر سے ہونے والے امور کا انکار قطعیات اسلام کا انکار ہے۔

قاضی شوکانی نے دفن کے بعد قبر کے پاس بیٹھنے اور میت کے لیے دُعا کو صرف مشروعیت کی سند دی ہے۔ شافعیہ کے ہاں اسے سنت کا درجہ حاصل ہے فقہ شافعی کی مشہور کتاب منہاج میں ہے:۔

ویسن ان یقف جماعۃ بعد دفنہ عند قبرہ ساعۃ یسألون لہ التثبیت۔[2]

---

[1] نیل الاوطار جلد ۴ صفحہ ۱۳۹ [2] منہاج جلد ۱ صفحہ ۲۴

ترجمہ۔ اور مسنون ہے کہ ایک جماعت میت کو دفن کرنے کے بعد اسکی قبر کے پاس ٹھہری رہے جو اس کے لیے (میت کے لیے) ثابت قدمی کی دعا مانگتے رہیں۔

منہاج کی شرح زاد المحتاج میں اس پر صحیح مسلم کے حوالے سے حضرت عمرو بن العاصؓ کی یہ وصیت نقل کی گئی ہے[1]

اذا دفنتمونی فاقیموا بعد ذلک حول قبری ساعة قدر ما تنحر جزور و یفرق لحمھا حتی استانس بکم۔[2]

ترجمہ۔ جب تم مجھے دفن کر چکو تو اس کے بعد میری قبر کے گرد اتنا وقت ٹھہرو جتنے میں ایک اونٹ نحر کر کے اس کا گوشت بانٹا جا سکے (اتنا وقت اس لیے ٹھہریں) کہ میں تم سے مانوس ہوں۔

قاضی شوکانی نے جو بات کہی ہے کہ سوال فی القبر اور وہاں کا عذاب گو وہ ادنیٰ ہو اس امت کی خصوصیت ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی رائے بھی یہی ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:۔

اخبر النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان عذاب امته فی قبورھم۔[3]

ترجمہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے کہ آپکی امت کا عذاب ان کی قبروں میں ہے۔

اب آگے چلیں:۔

عمدۃ المحققین حضرت علامہ محمود آلوسی (۱۲۷۰ھ) بھی اسی صدی کے ہیں۔ آپ لکھتے ہیں:۔

واختلف فی ھذہ الحیوۃ فذھب کثیر من السلف الی انھا حقیقیة بالروح والجسد ولکنا لا ندری کما فی ھذہ النشأۃ۔[4]

---

[1] زاد المحتاج جلد ۱ صفحہ ۴۲۴ [2] صحیح مسلم جلد صفحہ [3] حجۃ اللہ البالغہ جلد صفحہ مترجم صفحہ ۱۰۱
[4] روح المعانی جلد ۲ صفحہ ۱

ترجمہ۔ اور اس قبر کی حیات میں اختلاف ہے سلف صالحین کی اکثریت اس طرف ہے کہ یہ روح وجسد کے ساتھ حیات حقیقی ہے لیکن ہم اسے اس دنیا میں دیکھ نہیں پاتے۔

حیات حقیقی ہو یا کسی اور نوع کی ہو حیات حیات ہے اور اسی سے میت کو عذاب قبر ہوتا ہے

والجمہور علیٰ عود الروح الی الجسد او بعضہ وقت السوال علیٰ وجہ لا یحس بہ اہل الدنیا الا من شاء اللہ تعالیٰ منہم۔[1]

ترجمہ۔ اور جمہور اہل اسلام اس کے قائل ہیں کہ روح سوال کے وقت بدن کی طرف یا اس کے بعض حصہ کی طرف لوٹائی جاتی ہے اور یہ ایسے انداز پہ ہوتا ہے کہ اہل دنیا اسے محسوس نہیں کرسکتے۔ مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اہل دنیا میں سے کسی پہ یہ باطن کھول دے۔

علامہ آلوسیؒ نے ان اجساد کی بحث میں جو یکجا نہ رہے ہوں اور متفرق جگہ پھیل چکے ہوں ایک یہ بات کہی ہے کہ اس کے جواب میں یہ موقف اختیار کرنا کہ اللہ تعالیٰ ان سب اجزاء کو پھر یک جا کر دے گا۔ اور اس پہ برزخ کی واردات ہوں گی۔ یہ کوئی مسئلے کا رخ نہیں ہے۔ جب ہم اسے (روح کو) کسی اور برزخی بدن سے متعلق کر سکتے ہیں تو کیا ضرورت پڑی ہے کہ ہم اس کے نئے سرے یکجا ہونے کا قول کریں۔

علامہ آلوسیؒ نے یہ بات صرف ان ابدان کے بارے میں کہی ہے جو ریزہ ریزہ ہو چکے ہوں اور وہ بھی صرف ایک سوال کا جواب دینے کے لیے اور آپ نے تعبیر بھی ایسی اختیار کی کہ بدن کے یکجا ہونے کا موقف اختیار کرنے کی کیا ضرورت پڑی ہے۔ جب اس کا ایک اور حل ممکن ہے تو ہم اس پیچیدگی میں کیوں پڑیں۔ یہ ترتیب کلام بتاتی ہے کہ یہاں علامہ آلوسیؒ محض ایک کلامی انداز میں بات کر رہے ہیں، ورنہ عقیدہ ان کا وہی ہے جسے آپ دوسرے مقامات پہ زیادہ واضح انداز میں کہہ آئے ہیں۔ آپ نے مذکورہ بات اسی انداز میں کہی ہے کہ وہ منکرین پہ حجت ہو سکے اور جس طرح بھی ہو وہ عذاب قبر اور سوال قبر کے عقیدہ پر آسکیں۔

---

[1] روح المعانی جلد ۱۲ ص ۵۰

اما القول بحیاۃ ہٰذا الجسد الرمیم مع عدم بنیۃ وتفرق اجزائہ وذھاب ھیئتہ وان لم یکن ذلک بعیدًا من قدرۃ من یبدء الخلق ثم یعیدہ لکن لیس الیہ کثیر حاجۃ ولا فیہ مزید فضل ولا عظیم منۃ۔[1]

ترجمہ۔ اور اس ریزہ ریزہ ہوئے جسم میں یکجانہ ہونے کے باوجود حیات کا عود کر آنا اگرچہ اللہ رب العزت کی قدرت سے بعید نہیں جو پہلی تخلیق بخشتا ہے اور پھر اسے لوٹائے گا۔ لیکن یہ موقف اختیار کرنے کی ہمیں کوئی زیادہ ضرورت نہیں۔ نہ اس میں کوئی خاص فضیلت ہے نہ کوئی بڑا احسان (کیونکہ قبر کا سوال وجواب اور اس کا نعیم وعذاب ایک دوسری صورت میں بھی قائم ہو سکتا ہے)۔

یہ پیرایۂ بیان کیا مسئلے کی صورت واضح کرتا ہے یا یہ محض ایک کلامی انداز جواب ہے یہ آپ فیصلہ کریں۔ عقیدہ کے بیان میں آپ نے جو پیرایہ اختیار فرمایا ہے۔ وہ یہ ہے:۔

اعلم ان اتصال الروح بالبدن لا یختص بجزؤ دون جزؤ بل ھی متصلۃ مشرقۃ علیٰ سائر اجزائہ الاصلیۃ لا نھا التی یقوم بھا الانسان من قبرہ یوم القیٰمۃ علی ما اختارہ جمع و اعلم ایضًا ان الروح علی القول بتجردھا لا مستقر لھا بل لا یقال انھا داخل العالم او خارجہ کما سمعت وانما المستقر حینئذ البدن الذی تتعلق وقد نص بعض الصوفیۃ علیٰ انہ لا مانع من ان تتعلق نفس ببدنین فاکثر بل ھو واقع عندھم و ذکر بعضھم ان احد البدنین ھو البدن الاصلی والاُخر مثالی یظھر للعیان علیٰ وجہ خرق العادۃ۔[2]

---

[1] روح المعانی جلد ۲ ص ۲۱ [2] ایضاً جلد ۱۵ ص ۱۶۳

ترجمہ: جان لو کہ روح کا بدن سے اتصال کسی ایک حصہ بدن سے مختص نہیں بلکہ یہ بدن کے سارے اجزائے اصلیہ سے متصل اور اس پر پرتو انداز ہے کیونکہ وہ اجزائے اصلیہ ہی ہیں جن کے ساتھ انسان قیامت کے دن اپنی قبر سے اٹھے گا بہت سے لوگوں کا یہی کہنا ہے اور یہ جانو کہ روح کا بصورت اس کے تجرد کے اعتقاد کے معین ٹھکانہ نہیں۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اس عالم میں ہے یا اس عالم سے خارج ہے جیسا کہ تم نے سنا اس صورت میں اس کا مستقر وہ بدن ہوگا جس سے وہ متعلق ہے اور بعض صوفیہ نے کہا ہے کہ اس میں کوئی علمی رکاوٹ نہیں کہ ایک روح دو بدنوں یا ان سے بھی زیادہ ابدان سے متعلق ہو۔ بلکہ (ان کے ہاں) ایسا واقع بھی ہے اور بعض صوفیہ نے کہا ہے کہ دو بدنوں میں ایک بدن اصلی (دنیا والا) ہے اور دوسرا مثالی۔ جو کبھی خرق عادت کے طور پر لوگوں کو نظر آتا ہے۔

اب آئیے ہم آپ کو چودھویں صدی میں لے چلیں۔ اس صدی کے اکابر علماء میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ (۱۳۳۹ھ) حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوریؒ (۱۳۴۶ھ) مفتی عزیز الرحمٰن (۱۳۴۶ھ) امام العصر حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ (۱۳۵۲ھ) حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ (۱۳۶۲ھ) اور مفتی اقلیم ہند حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ (۱۳۷۲ھ) سرفہرست ہیں۔ ان بزرگوں کے وقت میں دیوبند کے مفتی عزیز الرحمٰنؒ (۱۳۴۶ھ) تھے۔

جماعت اہلحدیث میں نواب صدیق حسن خاں (۱۳۰۷ھ) اور مولانا نذیر حسین دہلوی (۱۳۲۰ھ) اس دور کے اکابر علماء میں سے سمجھے جاتے ہیں۔

حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ (۱۳۵۲ھ)

ثم السوال عندی یکون بالجسد مع الروح[1]

ترجمہ: قبر کے یہ سوال میری تحقیق کے مطابق جسد سے ہوتے ہیں جس کے ساتھ روح شامل ہے۔

فان البدن بدون الروح جماد لا حراک له والروح بدون البدن معطلة عن الافعال فاحتاج احدھما الی الاخر فلما اشترکا فی الکسب اشترکا فی الاجر والوزر[2]

ترجمہ: بدن بغیر روح کے ایک جمادی چیز ہے جس میں حرکت نہیں ہوتی اور روح بغیر بدن کے عمل سے خالی ہے ان دونوں میں سے ہر ایک دوسرے کا محتاج ہے پس جب یہ دونوں کسب عمل میں ایک دوسرے کے ساتھ شریک ہیں تو یہ دونوں (نیک اعمال کے) اجر اور (برے اعمال کی) پکڑ میں بھی شریک ہونے چاہئیں۔

ثم لا حاجة فی اثبات عذاب القبر الی ما قاله الصوفیه ان العذاب علی البدن المثالی دون المادی وحینئذ لا بعد ان لم نشاهد احدا یعذب فی قبره فان الاسهل ان یقال انه من عالم الغیب واقامة الدلائل العقلیه علیه جهل ومن یطیق ذلک[3]

ترجمہ: عذاب قبر ثابت کرنے کے لیے اس طرف جانے کی حاجت نہیں جو صوفیہ کرام نے تجویز کی ہے کہ عذاب کسی بدن مثالی پر ہوتا ہے اس دنیا والے مادی بدن پر نہیں اور اس صورت میں (بدن مثالی کی تجویز پر) استبعاد نہیں رہتا۔ اگر ہم کسی کو قبر میں عذاب پاتے نہ دیکھ سکیں۔ اس سے زیادہ سہل بات تو یہ ہے کہ اسے عالم غیب کا ایک عمل کہیں (جو ہماری نظر سے اوجھل ہے) اور عالم غیب کی حقیقتوں پر دلائل عقلیہ قائم کرنا یہ خود ایک جہالت ہے اور ایسا کر بھی کون سکتا ہے۔

---

[1] فیض الباری جلد ۲ ص ۱۸۵ [2] ایضاً ص ۱۱۵ [3] ایضاً جلد ۱ ص ۴۷۶

فیصلہ مفتی اعظم دیوبند حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانیؒ (۱۳۴۶ھ)

۱۔ قبر میں بھی روح کا تعلق رہتا ہے اور مستقر اصلی اس کا علیین ہے یا سجین۔

۲۔ عذاب روح پر مع الجسم ہوتا ہے۔[1]

حضرت مولانا حسین علی صاحب (۱۳۶۲ھ)

اس بات پر کہ قبر کے سوال کے وقت روح بدن میں عود کرتی ہے اور تعلق ہمیشہ رہتا ہے۔ گو بدن ریزہ ریزہ اور متفرق و منقسم ہو چکا ہو احادیث متواترہ وارد ہیں۔[2]

یہ چودہ سو سال کی شہادت آپ کے سامنے ہے ہم نے ہر صدی کے علماء کے بیانات آپ کے سامنے رکھ دیئے ہیں۔ سنتِ الٰہی یہ رہی ہے کہ سو سال سے زیادہ اس امت میں کسی غلطی کو قرار نہیں، نہ امت کو اس پر رہنے دیا جاتا ہے۔ اس امت میں صدی وار مجددین آتے رہے جو اس کے دین کو بیرونی آمیزشوں سے پاک کرتے رہتے ہیں۔ سو جو شہادت چودہ سو سال سے ایک ہی نہج پر آرہی ہو اور جمہور علمائے اسلام اس بات پر متفق ہوں کہ عذاب قبر برحق ہے اور یہ بدن اور روح دونوں کو شامل ہے اور کہیں بدن مثالی ہو بھی تو اس عذاب یا راحت کو اس بدن عنصری سے بالکل لاتعلق نہیں رکھا جا سکتا۔ اور ان واردات برزخی میں جملہ اموات ایک ہیں۔

نواب صدیق حسن خاں صاحب (۱۳۰۷ھ) لکھتے ہیں:۔

احادیث متواترہ اند بر آنکہ عود مے کند روح بسوئے بدن وقت سوال و ایں تعلق ہمیشہ میماند اگرچہ جسد جان دریدہ و متفرق و منقسم گردد۔[3]

ترجمہ۔ روح بوقت سوال بدن میں آتی ہے اس پر احادیث متواترہ وارد ہیں اور یہ تعلق بعد میں بھی رہتا ہے۔

---

[1] فتاویٰ دارالعلوم دیوبند جلد ۵ صفحہ ۴۲۷ مطبوعہ دیوبند [2] تحریرات حدیث صفحہ ۲۵۷ [3] التنکیت صفحہ ۳۲

وجملہ اموات از مومنین وکفار از حصول علم وشعور وادراک وسماع وعرض اعمال ورد جواب بر زائر برابر اند تخصیص بانبیاء وصلحاء نیست۔[1]

ترجمہ جملہ اموات خواہ مومن ہوں یا کافر برزخ کے علم وشعور اور ادراک سماع اور عرض اعمال میں اور زائر کے سلام کا جواب دینے میں برابر ہیں۔ برزخ کی زندگی میں انبیاء وصلحاء کی تخصیص نہیں۔ برزخ کی یہ حیات سب کو حاصل ہے گو ہر ایک کی یہ حیات اس کے اپنے حالات اور مقامات کے مطابق ہو۔

امید ہے نواب صاحب کی اس تصریح کے بعد غیر مقلد حضرات مولانا محمد اسماعیل صاحب (گوجرانوالہ) کے اس بیان کو کوئی اہمیت نہ دیں گے۔

ہم نے اب تک یہاں جو بحث کی ہے وہ عذاب قبر کے باب میں اس عقیدے کو شامل ہے کہ قبر کا یہ عذاب یا اس کی راحت روح اور اس کے جسد عنصری دونوں کو شامل ہے۔ اللہ رب العزت جسد میت میں ایک ایسی برزخی حیات پیدا کر دیتے ہیں جس سے وہ قبر کے الم و لذت کا ادراک کر سکے۔

یہ حیات روح کے تعلق سے قائم ہوتی ہے یا اعادہ روح سے یہاں دونوں صورتوں کی گنجائش ہے جو چیز مطلوب ہے وہ اس بدن عنصری کی اس درجہ کی حیات ہے کہ اس پہ عذاب قبر یا اس کی راحت مرتب ہو سکے۔ وہ جس راہ سے بھی ہو اہل سنت کو کسی ایک پر اصرار نہیں۔

ہاں مطالعہ کتب سے ہمیں دونوں مسلک ملتے ہیں اور ان میں سے کوئی بھی اہل سنت سے باہر نہیں۔ ہاں جو نہ اعادہ روح کا قائل ہو نہ تعلق روح کا وہ بے شک معتزلہ یا کرامیہ کی گود میں جا چکا ہے۔ ان دو مسلکوں میں پہلا مسلک محدثین کا ہے اور دوسرا متکلمین کا۔۔۔۔ محدثین ان حدیثوں پہ اعتماد کرتے ہیں جن میں قبر میں روح کے دوبارہ لوٹائے جانے کا ذکر ہے۔ گو یہ لوٹایا جانا دنیا کی طرح کا نہ ہو۔ اور متکلمین ہر اس طریق کو تسلیم کرتے ہیں جس سے بدن مدفون میں اتنی حیات مانی جا سکے جو وہاں کی الم و راحت کا ادراک کرے۔

مسلکِ محدثین — بحث اعادۂ روح

محدثین علم نبوت کے امین ہیں اور متکلمین اس کے پہرہ دار — اسلام پر جب کسی نے فکری حملہ کیا متکلمین نے انہیں انہی کے ہتھیاروں سے عقل، تجربات، مشاہدات اور ان کی روایات سے شکست دی لیکن دائرہ امت کے اندر علم کے جو چراغ جلے وہ محدثین نے ہی جلائے ہیں۔ فقہاء نے یہ کوشش کی کہ ان چراغوں کی روشنی جتنی دور تک لے جا سکیں لے جائیں اور کتاب و سنت کے منصوص مسائل کو غیر منصوص حدود تک پھیلا دیں۔

زندگی کے مسائل سمجھنے اور سمجھانے آسان ہیں۔ مابعد الموت حقیقتوں پر دبیز پردے پڑے ہیں۔ انہیں جب بھی کسی نے اٹھانے کی کوشش کی عقلِ انسانی ان کی اتھاہ گہرائیوں میں گم ہو کر رہ گئی۔ متکلمین نے اپنے انداز میں فکرِ اسلامی کا پہرہ دیا لیکن احادِ امت نے ہمیشہ محدثین کے سایہ میں پناہ لی۔ یہ سارا کاروبار مجتہدین کے سایوں میں چلتا ہے اور یہی آج امت کے لیے صراطِ مستقیم ہے اور یہ وہی راہ ہے جس پر پہلے انعام یافتہ لوگ چلے۔ وہ نہ موردِ غضب ہوئے نہ راہ سے بہکے اور بھٹکے۔

جب ہم میت کو دفن کر آتے ہیں تو اس پر کیا گزرتی ہے اس پر تباینِ عالم کے پردے پڑے ہیں۔ قبر کے اندر جھانکتے بھی رہیں تو اس عالم کی آنکھیں عالمِ برزخ کی واردات کو پا نہ سکیں گی اور ان پر یہ پردہ قیامت تک پڑا ہے۔ الا یہ کہ اللہ تعالیٰ کسی صاحبِ مقام پر یہ پردہ کھول دیں۔ علمی زبان میں اسے کشف کہا جاتا ہے۔

پردے کے پیچھے کی حقیقتوں کو جاننے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ وہ یہ کہ ہم لسانِ نبوت پر اعتماد کریں اور جو بات سمجھ میں نہ آئے اسے حضرت خضر کے سپرد کر دیں۔ آخر ہر بات کا جاننا

بھی تو ہمارے لیے ضروری نہیں. کوئی بیرونی فکری حملہ ہو تو متکلمین کے حصار میں رہ کر اس کا جواب دیا جا سکتا ہے۔

حقیقت تک پہنچنے کے دو علمی زینے

پیشتر اس کے کہ ہم اعادۂ روح کی روایات کی تصحیح میں محدثین کے عمومی موقف پر بحث کریں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے روایت کے عمومی مزاج پر کچھ بات کھل جائے اور پھر یہ بات سمجھی جائے کہ ہم لوگوں (متاخرین) کے لیے تصحیحِ روایت کے کیا کیا طریق ہیں۔

روایت کا مدار اس کے راویوں پر ہوتا ہے۔ ان راویوں کے حالات اسماء الرجال سے ملتے ہیں۔ دیانت اور یادداشت راویوں کی بنیادی صفات ہیں، یہ لائقِ اعتماد ہوں تو روایت قابلِ قبول ہو جاتی ہے۔ راوی فاسق بھی ہو تو اس کی روایت واجب الرد نہیں لائق تبیین ہے ممکن ہے اور قرائن (دیگر قریب کے حالات) سے یہ پختہ ہو جائے۔ قرآن کریم نے ہمیں یہ اصولی تعلیم دی ہے۔

یا ایھا الذین اٰمنوا ان جآءکم فاسق بنبأ فتبینوا ان تصیبوا قوم بجھالۃ فتصبحوا علیٰ ما فعلتم نادمین ۝

ترجمہ: اے ایمان والو! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق شخص کوئی خبر لے آئے تو تم اس کا تبین کرو (اس کی دوسرے ذرائع سے پڑتال کرو) کہیں ایسا نہ ہو کہ تم ناواقفی میں کسی قوم سے جا الجھو اور پھر اپنے کیے پر تمہیں ندامت اٹھانی پڑے۔

منکرینِ حدیث کا طریقِ واردات یہ ہے کہ جونہی کسی راوی پر کوئی کلمہ اختلافِ نظر سے گزرا جھٹ لیا کہ یہ روایت تو کسی درجے میں لائق اعتماد نہیں ہے اہل علم کہیں گے اصل ہر شخص میں تعدیل ہے بشرطیکہ وہ خود مجہول نہ ہو۔ جب تک اس کے خلاف واضح السبب

جرح نہ آجائے اسے مجروح نہ سمجھا جائے اور جب جرح کرنے والے اور تعدیل کرنے والے دونوں طرف ہوں تو اگر جرح مبین السبب نہیں تو دونوں طرف کے ائمہ جرح و تعدیل میں وزن اور غلبہ کو دیکھا جائے گا —— جرح کا لفظ دیکھتے ہی اچھل پڑنا اور قواعد علم سے اس کا جائزہ نہ لینا یہ منکرین حدیث کا طریق واردات ہے اہل تحقیق کا نہیں۔

اگر صرف الفاظ جرح کی ہی تلاش ہے تو کیا ایسے الفاظ امام الائمہ حضرت امام ابو حنیفہؒ اور حضرت امام بخاریؒ کے خلاف موجود نہیں کیا حضرت امام شافعیؒ پر یحییٰ بن معینؒ کی جرح نہیں کیا امام ترمذیؒ کو مجہول کہنے والے اہل علم یہاں نہیں گزرے۔

مامن الائمة الا وقد طعن فيه طاعنون وهلك فيه هالكون.

ترجمہ: ائمہ میں کوئی ایسا نہیں گزرا مگر یہ کہ طعنہ کرنے والے اس پر طعن کرتے رہے اور ہلاک ہونے والے (ان کی مخالفت میں) ہلاک ہوتے رہے۔

سو ضروری ہے کہ رواۃ کا اصول حدیث کی روشنی میں جائزہ لیا جائے اور جرح قوی نہ ہو تو جارحین اور معدلین میں قوت اور غلبہ دیکھا جائے۔ اندھے کی لاٹھی سے ہر ایک کو ہانکتے چلے جانا یہ پورے علم حدیث سے اعتماد اٹھانے کی خوفناک حرکت ہے۔

دوسری بات یہ پیش نظر رہے کہ تصحیح حدیث صرف تعدیل رواۃ سے نہیں ہوتی۔ ائمہ فن کی تصحیح و تصدیق سے بھی ہوتی ہے۔ اور اس طرح سے بھی حدیث لائق قبول ہو جاتی ہے۔

حافظ شمس الدین الذہبی (۷۴۸ھ) لکھتے ہیں:۔

اذا العمدة في زماننا ليس على الرواة بل على المحدثين والمفيدين والذين عرفت عدالتهم وصدقهم في ضبط اسماء السامعين[1]

ترجمہ: ہمارے زمانے میں لائق اعتماد راویوں کی تحقیق نہیں بلکہ محدثین اور اساتذہ فن پر اعتماد ہے اور ان لوگوں پر جن کی عدالت جانی جا چکی

---

[1] میزان الاعتدال جلد ۱ ص۴

اوران کا صدق راویوں کے ضبط اعتماد میں جانا جا چکا۔

فن کے عارفین اور علماء بارعین جو بات کہتے ہیں اس تک رسائی ہر اجنبی کی نہیں ہو سکتی۔ ان سے خود بھی پوچھا جائے تو وہ اپنی صداقت کو دو سطروں میں اُگل سکیں گے۔ جرح و تعدیل کے متقدر امام عبدالرحمن بن مہدی (۱۹۸ھ) کہتے ہیں:۔

ومعرفة الحديث الهام فلو قلت للعالم بعلل الحديث من اين قلت هذا؟ لم يكن له حجة۔[1]

ترجمہ۔ اور حدیث کی معرفت ایک دل میں اتری صداقت ہے آپ اگر کسی علل حدیث کے عالم سے پوچھیں کہ یہ بات تم نے کہاں سے کہی ہے تو شاید وہ بھی اپنی بات پر حجت قائم نہ کر پاتے۔

حافظ جلال الدین سیوطی (۹۱۱ھ) لکھتے ہیں:۔

ان الجرح انما جوز فی الصدر الاول حیث کان الحدیث یوخذ من صدور الاحبار لا من بطون الاسفار ..... اما الآن فالعمدة علی الکتب المدونة۔[2]

ترجمہ۔ جرح پہلے دور میں اس لیے جائز رکھی گئی تھی کہ حدیث علماء کی یادداشتوں سے حاصل کی جاتی تھی کتابوں کے ذخیرہ سے نہیں ..... لیکن ان دنوں (بعد کے ادوار میں) اعتماد ان کتابوں پہ ہے جو (اس فن پہ) مدون ہو چکی ہیں۔

سو ہم اپنے قارئین کو اس طرف بھی متوجہ کریں گے کہ وہ دیکھیں کہ اعادۂ روح کی حدیث کو کن کن ماہرین فن نے قبول کیا ہے۔

آئیے اب ہم وہ روایت حضرت امام احمد بن حنبلؒ (۲۴۱ھ) جو حضرت امام بخاریؒ

---

[1] معرفۃ علوم الحدیث صـ۱۱۳ [2] الکاوی فی تاریخ السخاوی کما فی الرفع والتکمیل صـ۵۰

اور امام مسلمؒ کے اُستاد ہیں کے حوالہ سے پیش کرتے ہیں.

حدیث اعادۂ روح

حضرت امام احمدؒ نے یہ حدیث محمد بن خازم ابو معاویہ سے لی. وہ کہتے ہیں ہم نے یہ حدیث اعمش سے لی. وہ اسے منہال بن عمرو سے اور وہ اسے زاذان تابعی سے روایت کرتے ہیں. زاذان اسے براء بن عازب سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مومن کی روح جب قبض ہونے کے بعد ساتویں آسمان پر پہنچائی جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ حکم دیتے ہیں کہ میرے اس بندے کا نام علیین میں لکھو اور پھر اسے زمین کی طرف لوٹا دو. کیونکہ:-

منها خلقتهم وفيها اعيدهم ومنها اخرجهم تارة اخرى.[1]

ترجمہ. میں نے انہیں اسی سے (مٹی سے) پیدا کیا اور اسی میں انہیں لوٹاؤں گا اور اسی سے انہیں پھر اٹھاؤں گا.

اس کے بعد کیا ہوتا ہے اُسے حدیث کے الفاظ میں پڑھیں:-

فتعاد روحه فی جسده فيأتيه ملكان فيجلسانه فيقولان له من ربك.[2]

ترجمہ. سو اس کی روح پھر اس کے جسد میں لوٹائی جاتی ہے اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں اسے بٹھلاتے ہیں اور اسے کہتے ہیں تیرا پالنے والا کون ہے؟

صحاح ستہ کی مرکزی کتاب سنن ابی داؤد میں بھی یہ حدیث[3] موجود ہے اور اسے ابو داؤد طیالسی نے بھی روایت کیا ہے. سو قبر میں میت روح کا پھر سے آنا اس کے علیین یا سجین میں جانے کے منافی نہیں.

---

[1] ماخوذ من مشکوٰۃ صفحہ ۱۴۲ [2] مسند امام احمد جلد ۴ صفحہ ۲۸۷ تفسیر ابن کثیر جلد ۲ صفحہ ۵۳۱ ابن جریر جلد ۱۳ صفحہ ۲۱۴ [3] سنن ابی داؤد جلد ۲ صفحہ ۲۹۸ مسند ابی داؤد الطیالسی صفحہ ۱۰۲ میں ہے فیرد الی الارض وتعاد روحہ فی جسدہ.

محدث حاکم نے بھی اسے مستدرک میں روایت کیا ہے۔ حافظ ذہبیؒ نے اس کی تصحیح کا اقرار کیا ہے ـــــ حاکم نے ساتھ ہی یہ الفاظ بھی لکھے ہیں:۔

وفی ھذا الحدیث فوائد کثیرۃ لاھل السنۃ وقمع المبتدعۃ۔[1]

ترجمہ۔ اور اس حدیث اہل السنۃ کی بہت تائید ہے اور بدعتیوں کی خوب اکھاڑ ہے۔

حاکم (۴۰۵ ھ) نے پانچویں صدی دیکھی ہے۔ اس وقت معتزلہ اور کرامیہ پیدا ہو چکے تھے جو عذاب قبر کے منکر تھے۔ ابن حزم (۴۵۶ ھ) بھی اس کے قریب قریب ہوئے جو عذاب قبر کو صرف روح سے متعلق مانتے تھے۔ حاکم حدیث براء روایت کر کے اہل سنّت کے عقیدہ کی تائید کر رہے ہیں اور دوسروں کو بدعتی کہہ رہے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دنوں تک عذاب قبر اور اس کے روح و جسد دونوں کو شامل ہونے کے خلاف بدعتیوں کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ کل بھی یہ بدعتی تھے اور آج بھی بدعتی ہیں۔

حدیث کے راویوں پر کلام

اس کا پہلا راوی ابومعاویہ ثقہ ہے (تقریب للحافظ ابن حجر ص) دوسرا راوی سُلیمان بن مہران الاعمش بھی ثقہ ہے (تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص۱۴۵) تیسرا راوی منہال بن عمرو ہے یحیٰی بن معین کہتے ہیں یہ ثقہ ہے (تہذیب جلد ۱۰ ص۳۲۰) شعبہ اس کی روایت نہ لیتے تھے۔ وہ یہ کہتے تھے کہ اُن کے گھر سے ساز کی آواز سنی گئی تھی۔ یہ پتہ نہیں چل سکا کہ کس نے سُنی۔ یہ ہو سکتا ہے کسی نے بے پَر کی اُڑا دی ہو۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے اس الزام کے بارے میں لکھا ہے:۔

لم یصح عنہ ذلک وجرحہ بھذا تعسف ظاھر وقد وثقہ ابن معین والعجلی وغیرھما۔[2]

---

[1] مستدرک حاکم جلد ۱ ص۳۹ [2] تہذیب التہذیب جلد ۱۰ ص۳۲۰

ترجمہ: گھر سے ساز کی آواز کا سنا جانا ان سے صحیح طریق سے ثابت نہیں اور انہیں اس وجہ سے مجروح ٹھہرانا ایک کھلی زیادتی ہے یحییٰ بن معین اور عجلی نے اس کی توثیق کی ہے۔

اگر کسی نے انہیں سیئ المذہب کہا ہے تو وہ اسی ذہن سے ہوگا کہ یہ ساز کو جائز سمجھتے ہیں جب یہ کہانی ہی غلط ہوگئی تو اس قبیل کی سب جرحیں جو ابن حزم نے پیش کی ہیں یکسر اڑگئیں

اگلا راوی ابو عبداللہ زاذان الکندی ہے۔ یحییٰ بن معینؒ کہتے ہیں۔ ثقة لا یسئل عن مثله. (تہذیب جلد ۳ ص۲۶۱) ایسا ثقہ ہے کہ ان جیسے راویوں کے بارے میں سوال ہی نہیں کیا جاسکتا۔ ابن حبان اسے کثیر الخطا کہتے ہیں۔ لیکن علماء سے پوشیدہ نہیں کہ ابن حبان ان علماء میں سے ہے جنہیں جرح میں متشدد کہا جاتا ہے سو ان کی جرح معتبر نہیں۔ اس کے بعد حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ صحابی رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں اور آپ اسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں۔

شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ منہال بن عمرو اور زاذان کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

اما المنهال فمن رجال البخاری وحدیث زاذان مما اتفق السلف والخلف علی روایته وتلقیها بالقبول.[1]

ترجمہ: منہال بن عمرو صحیح بخاری کے رجال میں سے ہے اور حدیث زاذان پر اس کی روایت پر اور اس کی تلقی بالقبول پر سلف وخلف سب جمع ہیں۔

حافظ ابن قیمؒ کہتے ہیں:۔

ولم یصنع من قدح فی صحة هذا الحدیث شیأ کابن حزم للنصرة لمذهبه الباطل.[2]

ترجمہ: جس نے اس حدیث کی صحت میں کوئی عیب ڈھونڈا اس نے کوئی چیز ثابت نہیں کی جیسے ابن حزم اپنے باطل نظریے کی نصرت میں اس حدیث پر جرح کرتے ہیں۔

یہاں بدن میں روح کے نہ لوٹنے کے عقیدہ کو مذہب باطل کہا گیا ہے۔

---

[1] شرح حدیث النزول ص۵ [2] اغاثة اللهفان جلد ۱ ص۱۲۷

حدیث کی تصحیح کرنیوالے اور اُسے قبول کرنے والے محدثین

حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نامور شاگرد حضرت عبداللہ بن مبارکؒ (۱۸۱ھ) اسے اپنی کتاب کتاب الزہد والرقاق کے ص۴۲۱ پر لائے ہیں. یہ دوسری صدی ہجری کی بات ہے۔

تیسری صدی میں آپ اسے مسند امام احمد (۲۴۱ھ) اور سنن ابی داؤد (۲۷۵ھ) میں دیکھیے. علماء حدیث جانتے ہیں کہ امام ابو داؤد جس حدیث پر سکوت کریں وہ ان کے نزدیک معتبر اور لائق احتجاج ہوتی ہے۔

آیئے اب چوتھی صدی میں دیکھیں. امام ابن جریر الطبری (۳۱۰ھ) نے اپنی تفسیر جلد ۱۳ ص۲۱۴ پر اس کی چار سندیں نقل کی ہیں. حافظ ابن ابی شیبہؒ (۲۳۵ھ) نے بھی اسے المصنف میں روایت کیا ہے۔

امام بیہقیؒ فرماتے ہیں :-

ھٰذا حدیث صحیح الاسناد[1]

پانچویں صدی کے امام حاکم (۴۰۵ھ) اسے مستدرک میں لاکر اس کی تصحیح فرماتے ہیں اور کہتے ہیں اس کی سند امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ کی شرطوں کے مطابق صحیح ہے گو انہوں نے اس کی تخریج نہیں کی —— و وافقه الذهبي في تلخيصه على المستدرك.

علامہ ابو المظفر الاسفرائنی (۴۷۱ھ) بھی لکھتے ہیں :-

واخبرانهم يحيون في القبور وقد ورد في معنى احياء الموتى في القبور مالا يحصى من الاى والاخبار والآثار[2]

ترجمہ: اور آپ نے خبر دی ہے کہ اموات کو انکی قبروں میں زندہ کیا جاتا ہے اور اموات کے قبروں میں زندہ کیے جانے پر اس قدر آیات احادیث اور آثار وارد ہیں کہ انہیں شمار نہیں کیا جا سکتا۔

---

[1] الترغیب والترہیب جلد ۲ ص۲۰۵ [2] التبصیر ص۱۵۸

ساتویں صدی کے علامہ قرطبی (۶۷۱ ھ) بھی اس کی تصیح کرتے ہیں:۔

ورویٰ الامام احمد و ابوداؤد باسناد صحیح عن البراء۔[1]

ترجمہ۔ امام احمد بن حنبل اور امام ابوداؤد السجستانی نے سند صحیح سے اسے حضرت براء بن عازبؓ (صحابی) سے نقل کیا ہے۔

آٹھویں صدی کے حافظ ابن تیمیہؒ (۷۲۸ ھ) لکھتے ہیں:۔

ورواه الامام احمد وغيره وهو حديث اجمع رواة الحديث على شهرته و استفاضته وقال الحافظ ابو عبد الله بن منده هذا الحديث اسناد متصل مشهور رواه جماعة عن البراء۔[2]

ترجمہ۔ اور اس حدیث کو امام احمد اور دوسرے ائمہ نے روایت کیا ہے اور یہ ایسی حدیث ہے کہ تمام محدثین اس کی شہرت اور اس کے استفاضہ عام پر جمع ہوئے ہیں اور حافظ ابوعبداللہ بن منده نے کہا ہے اس حدیث کے سب رواۃ آپس میں متصل ہیں اور یہ حدیث درجہ شہرت کو پہنچی ہے اسے حضرت براء بن عازبؓ سے ایک جماعت تابعین نے روایت کیا ہے۔

الاحاديث الصحيحة المتواترة تدل على عود الروح الى البدن وقت السوال۔[3]

ترجمہ۔ صحیح اور متواتر احادیث منکر و نکیر کے سوال کے وقت روح کے بدن میں دوبارہ آنے پر دلالت کرتی ہیں۔

حافظ ابن قیمؒ (۷۵۱ ھ) فرماتے ہیں:۔

وهو حديث صحيح صححه جماعة من الحفاظ۔[4]

ترجمہ۔ یہ حدیث صحیح ہے۔ حدیث میں جو علماء حافظ کے درجے میں ہیں ان کی ایک جماعت کی جماعت نے اس کی تصیح کی ہے۔

پھر ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

---

[1] مختصر تذکرہ قرطبی للشعرانی ص۳۴ [2] شرح حدیث النزول ص۴۷ [3] ایضاً ص۵۱ [4] اجتماع جیوش الاسلامیہ ص۳۵

هذا حديث مشهور مستفيض صححه جماعة من الحفاظ ولا نعلم احداً من ائمة الحديث طعن فيه بل رووه فی کتبهم وتلقوه بالقبول وجعلوه اصلاً من اصول الدین فی عذاب القبر و نعیمه ومسئله منکر ونکیر وقبض الارواح وصعودها الی بین یدی الله ثم رجوعها الی القبر۔[1]

ترجمہ۔ یہ حدیث درجہ شہرت کو پہنچی ہوئی ہے اور خبر مستفیض ہے اسے حفاظ حدیث کی ایک جماعت نے صحیح کہا ہے اور ہم نہیں جانتے کہ ائمہ حدیث میں سے کسی نے اس پر کوئی طعن کیا ہو بلکہ انہوں نے اسے اپنی کتابوں میں روایت کیا ہے اور اسے قبول کیا ہے اور اسے اصول دین میں سے قبر کے عذاب و ثواب اور سوال نکیرین اور قبض ارواح اور ان ارواح کے اللہ کے حضور حاضر ہوئے اور پھر سے قبر میں چلے آنے کے باب میں ایک اصل ٹھہرایا ہے۔

فالحدیث صحیح لا شك فیه۔[2]

ترجمہ۔ یہ حدیث صحیح ہے جس میں شک نہیں کیا جاسکتا۔

علامہ سبکیؒ (۷۵۶ھ) لکھتے ہیں:۔

ورجال اسناده کلهم ثقات۔

ترجمہ۔ اور اس کے رجال سارے کے سارے ثقہ ہیں۔

آٹھویں صدی کے آخر میں علامہ نورالدین الہیثمی (۸۰۷ھ) جو حافظ ابن حجر عسقلانیؒ کے استاد ہیں نے بھی اس حدیث کو صحیح کہا ہے، آپ لکھتے ہیں:۔

رواه احمد ورجاله رجال الصحیح۔[4]

---

[1] کتاب الروح صفہ ۵۹ [2] ایضاً صفہ ۵۶ [3] شفاء السقام صفہ ۱۵۰ [4] مجمع الزوائد جلد ۳ صفہ ۵۰

ترجمہ. اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے اور اس کے رجال سند سب صحیح کے رجال ہیں.

نویں صدی کے حافظ ابن حجر عسقلانیؒ (۸۵۲ھ) بھی اسے ثابت حدیث قرار دیتے ہیں.[1]

تعاد الروح الی الجسد او بعضہ کما ثبت فی الحدیث.[2]

ترجمہ. روح جسد کی طرف یا اس کے ایک حصے کی طرف لوٹائی جاتی ہے جیسا کہ حدیث سے ثابت ہو چکا.

دسویں صدی کے امام سیوطیؒ (۹۱۱ھ) لکھتے ہیں:-

وقال ابن تیمیۃ الاحادیث متواترۃ علی عود الروح بالبدن وقت السوال.[3]

ترجمہ. اور ابن تیمیہؒ کہتے ہیں متواتر درجے کی احادیث سوال قبر کے وقت روح کے بدن میں لوٹنے پر موجود ہیں.

علامہ عبدالرؤف المناویؒ (۱۰۰۳ھ) لکھتے ہیں:-

زاد فی حدیث البراء فتعاد روحہ فی جسدہ.[4]

ترجمہ. اور حدیث براء میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ اس کی روح جسد میں پھر سے لائی جاتی ہے.

سیدنا ملا علی قاریؒ (۱۰۱۴ھ) لکھتے ہیں:-

فتعاد روحہ فی جسدہ ظاہر الحدیث ان عود الروح الی جمیع اجزاء بدنہ.[5]

ترجمہ. یہ جو حدیث میں ہے کہ اس کی روح جسد کی طرف لوٹائی جاتی ہے اس کا ظاہر یہ ہے کہ روح کا یہ لوٹنا پورے جسد میں ہوتا ہے (بعض حصہ بدن میں نہیں).

حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ (۱۰۳۴ھ) نے بھی اعادہ روح بجسد کی تصدیق فرمائی ہے.[6]

---

[1] دیکھئے فتح الباری جلد ۵ صفحہ ۵۰۴ [2] فتح الباری جلد ۳ صفحہ ۱۷۴ [3] شرح الصدور صفحہ ۶۰ مصر
[4] فیض القدیر جلد ۱ صفحہ ۴۷۲ [5] مرقات جلد ۴ صفحہ ۲۵ [6] مکتوبات دفتر ۲ مکتوب ۶۷ ص

واختلف فی ان المیت یعذب باحیاءہ فی القبر او بجعل الروح فی مقابلته او بنوع اٰخر مایعلمه الله ولا نعلمه والاظہر الاصوب انه بالاحیاء واعادۃ الروح وھو ظاھر الاحادیث۔[۱]

ترجمہ۔ اس بات میں اختلاف کیا گیا ہے کہ میت کو عذاب قبر میں اسے زندہ کر کے ہوتا ہے یا روح اس کے جسد کے مقابل ٹھہرائی جاتی ہے (کہ وہ جسد اس کے تعلق سے عذاب پائے) یا کسی اور طریقے سے جسے خدا ہی جانتا ہے اور ہم نہیں جانتے اس میت کو عذاب دیا جاتا ہے جو چیز زیادہ ظاہر اور زیادہ درست ہے وہ یہ ہے کہ میت کو عذاب زندہ کر کے اور اس میں روح پھر لوٹا کے دیا جاتا ہے اور ظاہر احادیث یہی ہے۔

تیرھویں صدی کے حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی (۱۲۲۵ھ) بھی لکھتے ہیں:۔

فیعاد روحه فی جسدہ وکذا قال فی الکافر فیعاد روحه فی قبرہ قال ابن عبد البر ھذا اصح ما قیل۔[۲]

ترجمہ۔ پس میت کی روح اس کے جسد میں پھر سے داخل کی جاتی ہے اور اسی طرح کافر کے بارے میں کہا گیا ہے اس کی روح اس کی قبر میں لوٹائی جاتی ہے۔ ابن عبد البر مالکی کہتے ہیں کہ اس سلسلے میں جتنی باتیں بھی کہی گئی ہیں ان میں یہ سب سے زیادہ صحیح ہے۔

قاضی شوکانیؒ (۱۲۵۰ھ) نے تو اس کے تواتر کا دعوے کیا ہے کہ اب کسی کو اس مسئلہ میں قیل وقال کی حاجت نہیں:۔

وقد وردت بذٰلك احادیث کثیرۃ بلغت حد التواتر۔[۳]

ترجمہ۔ اور اس پر احادیث کثیرہ وارد ہیں اور اس قدر ہیں کہ حد تواتر کو پہنچ رہی ہیں۔

مفتی بغداد حضرت علامہ آلوسیؒ (۱۲۷۰ھ) فرماتے ہیں:۔

والجمھور علی عود الروح الی الجسد۔[۴]

ترجمہ۔ جمہور اہل اسلام اسی کے قائل ہیں کہ قبر میں روح جسد میں لوٹائی جاتی ہے۔

---

[۱] تنقیح اللمعات جلد ۱ ص ۱۸۹ [۲] تفسیر مظہری جلد ۱ ص ۱۱۴ [۳] نیل الاوطار جلد ۴ ص ۹۷ [۴] روح المعانی جلد ۲۱ ص ۵۷

نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ (۱۳۰۷ھ) بھی رقمطراز ہیں۔

احادیث متواترہ اند بر آنکہ عود کند روح بسوئے بدن وقت سوال وایں تعلق ہمیشہ می ماند اگر جسد جاں دریدہ ومتفرق ومنقسم گردد۔[1]

ترجمہ۔ روح سوال نکیرین کے وقت بدن کی طرف عود کرتی ہے اس پر متواتر احادیث وارد ہیں اور روح کا بدن سے یہ تعلق ہمیشہ رہتا ہے۔ اگرچہ انسان کا جسم ٹکڑے ٹکڑے ریزہ ریزہ اور مختلف حصوں میں بٹ چکا ہو۔

چودھویں صدی کے مولانا السید احمد حسن (ھ) لکھتے ہیں:۔

وقال البیہقی ھٰذا حدیث صحیح الاسناد۔[2]

ترجمہ۔ امام بیہقی کہتے ہیں کہ یہ حدیث باعتبار سند بالکل صحیح ہے۔

والحدیث صحیح۔[3]

ترجمہ۔ اور یہ حدیث صحیح ہے۔

یہ چودہ سو سال کا تاریخی سرمایہ ہم نے آپ کے سامنے رکھ دیا ہے۔ اس کی روشنی میں کوئی منصف مزاج اس حقیقت سے انکار نہ کر سکے گا کہ دنیا اور آخرت کے مابین ایک برزخی زندگی ہے جس میں روح کا ایک نہایت خاموش اور باریک تعلق بدن عنصری یا اس کے ذرات منتشرہ سے قائم رہتا ہے۔ یہ تعلق اعادۂ روح سے ہوتا ہے مگر یہ اعادہ اس طرح کا نہیں، جیسا کہ ہم اس دنیا میں محسوس کرتے ہیں۔ یہاں زندگی دو طرف سے قائم ہے اندر روح سے اور باہر غذا اور نشو و نما سے ——— وہاں زندگی اس تغذیہ و تنمیہ کے بغیر قائم ہوتی ہے اسے دنیوی حیات کہنا درست نہیں۔ الا یہ کہ یہ مراد ہو کہ یہ برزخی زندگی دنیا والے اجساد میں ہے کسی اور مثالی بدن میں نہیں۔ قبر کا عذاب وہی بدن برداشت کرے جس نے گناہ کئے ہیں۔

---

[1] التنکیت ص ۲۳ [2] تنقیح الرواۃ جلد ا ص ۳۱۴ [3] ایضاً ص ۳۱۷

ایک سوال اور اُس کا جواب

علامہ ابن حجر مکیؒ (۹۷۳ھ) سے پوچھا گیا میت کے بدن نے جب بوسیدہ ہی ہونا ہے تو اس پر کافور ملنے کا کیا فائدہ؟ —— حضرت علامہ نے جواب دیا:

الحکمة ماھو مقرر عند اھل السنة والجماعة من ان البدن ینعم بانواع النعیم کالروح وحیثما بقی اتصل به النعیم الیٰ ان —— فان البدن بینه و بینها عنایة الارتباط والمناسبة[1]

ترجمہ: جو چیز اہل السنۃ والجماعۃ کے ہاں طے ہے حکمت اس میں یہ ہے کہ بدن بھی روح کی طرح مختلف طرح کی نعمتوں سے بہرہ ور ہے اور جب تک یہ باقی رہے نعمت برزخ اس کے شامل حال ہوگی یہاں تک کہ اس کا نشان نہ رہے. کیونکہ بدن اور روح کے مابین ایک تعلق اور ربط کی عنایت قائم ہے۔

پھر اُن سے پوچھا گیا کہ قبر میں میت کو بٹھا کر سوال کرتے ہیں یا لیٹے ہوئے پوچھ لیتے ہیں؟

فاجاب بالذی فی البخاری انه یسئل قاعدًا وکذا فی ابن ماجه[2]

ترجمہ: آپ نے جواب دیا. جو بات صحیح بخاری سے ملتی ہے یہی ہے کہ اسے بٹھا کر اس سے سوال کیا جاتا ہے اور سنن ابن ماجہ میں بھی یہی ہے۔

اور ظاہر ہے کہ اگر شہید کا بدن کرامۃً بوسیدہ نہ ہو تو نعیم روح اس بدن سے بھی مرتبط رہے گی. برزخ کی واردات صرف روح سے متعلق کرنا یہ اہل حق کا موقف نہیں اہل بدعت کا موقف ہے. حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں:

وچوں قومے از مبتدعہ واہل ہوا کہ اکثر معتزلہ و بعضے روافض باشند انکار کردہ اند عذاب قبر را و احادیث مشہورہ کہ قدر مشترک ازاں بحد تواتر رسیدہ

---

[1] فتاوٰی کبریٰ جلد ۲ ص ۷ [2] ایضاً

دراں ورود یافتہ است وسلف صالح پیش از ظہور اہلِ بدعت وانکار ایشاں ہمہ اتفاق داشتہ اند بہ ثبوت آں و اعتقاد بداں . . . . واختلاف کردہ اند کہ عذاب در قبر بزندہ گردانیدن میت است یا در مقابلہ داشتن روح با وے یا بنوعی دیگر کہ پروردگار خواہد مارا بدریافت کہنہ حقیقت آں راہ نباشد وحق آں ست کہ باحیاء است. چنانکہ ظاہر احادیث دال ست بر آں.[1]

ترجمہ. اور چونکہ بدعتی لوگ اور خواہشات کی پیروی کرنے والے کہ بیشتر ان میں معتزلہ ہیں اور کچھ رافضی بھی ہیں عذابِ قبر کا انکار کرتے ہیں اور شہرت کے درجہ میں پہنچی ہوئی احادیث کہ ان کی قدر مشترک تواتر کے درجہ کو پہنچتی ہے اس باب میں وارد ہیں اور سلف صالحین بدعتیوں کے ظاہر ہونے اور ان کے انکار عذاب قبر سے پہلے سب اسی اعتقاد پر تھے

ہاں ان میں یہ اختلاف ہے کہ عذاب قبر میت کو زندہ کرنے سے دیا جاتا ہے یا روح کو اس کے جسد کے سامنے کرنے سے یا کسی اور طریقے سے یا جو خدا چاہتے ہیں اس کی حقیقت معلوم نہیں اور حق یہ ہے کہ قبر میں سارا معاملہ میت کو دوبارہ زندہ کرنے سے ہوتا ہے ظاہر حدیث اسی پر دلالت کرتی ہیں.

اگر اتنا بھی تسلیم کر لیں کہ اللہ تعالیٰ میت میں ایسی حالت پیدا کر دیتے ہیں کہ وہ الم و راحت کا ادراک کر سکے تو اہل بدعت سے نکلنے کے لیے اتنی بات بھی کافی ہے. لیکن یہ حضرات اگر اسی پہ مصر رہیں کہ قبر میں میت یا اس کے اجزاء بے حس محض ہیں اور اس میں الم و راحت کا ادنیٰ ادراک نہیں تو پھر کوئی عالم انہیں بدعتی ہونے کے زمرہ سے نہیں نکال سکے گا. انہیں چاہیئے کم از کم اتنا تو مان لیں کہ عذاب قبر بدیں قدر الم وراحت در میت برحق ہے. حضرت شیخؒ لکھتے ہیں :-

---

[1] اشعۃ اللمعات جلد ۱ صفحہ ۱۱۴

اگر ہمیں قدر بدانند کہ پروردگار تعالیٰ در مردہ حالتی پیدا کند کہ بداں چیزے اَلم وراحت دریابد دراعتقادِ صحیح کفایت است[1]

ترجمہ۔ اگر اتنا ہی جان لیں کہ اللہ تعالیٰ مردے میں ایک ایسی حالت پیدا فرمادیتا ہے کہ وہ اس سے الم وراحت کا ادراک کرسکے تو عقیدہ صحیحہ کے لیے یہ بات بھی کافی ہوسکتی ہے۔

لیکن اگر بدن کو بالکل بے جان مردہ بالکل بے حس و شعور مانیں تو پھر اسکے جنتی عقیدہ ہونے میں کوئی شک نہیں رہ جاتا۔ ہم نے اپنے کرم فرماؤں سے اہل حق کے ساتھ ملنے کی یہ آخری تجویز عرض کردی ہے اور اگر آپ نے ارادہ ہی کرلیا ہے کہ آپ کا انجام معتزلہ اور شیعہ کے ساتھ ہو تو ہم اس پر سوائے اظہارِ تاسف کے اور کیا کرسکتے ہیں۔

قال شیخ الاسلام ابن تیمیۃؒ فی بعض مناسکہ۔

ثم یاتی الروضۃ بین القبر والمنبر فیصلی بھا ویدعوا بما شاء ثم یأتی قبر النبی صلی اللہ علیہ وسلم فیستقبل جدار القبر ..... ویقف متباعداً کما یقف لو ظھر فی حیاتہ بخشوع وسکون منکس الرأس غاض الطرف مستحضراً بقلبہ جلالۃ موقفہ ثم یقول السلام علیک یا رسول اللہ و برکاتہ السلام علیک یا نبی اللہ وخیرتہ من خلقہ السلام علیک یا سید المرسلین وخاتم النبیین وقائد غر المحجلین اشھد ان لا الہ الا اللہ واشھد انک رسول اللہ[2]

---

[1] اشعۃ اللمعات جلد ا صفحہ ۱۱۴ [2] الصارم المنکی صفحہ ۹

وفات کے بعد دُنیوی زندگی کسی کی نہیں

موت کے بعد عالم برزخ شروع ہوتا ہے۔ برزخی زندگی دنیوی زندگی سے بہت مختلف ہے۔ دنیوی زندگی کیا ہے؟ جو روح و بدن کے تعلق اور دنیوی آب و ہوا کے تعرف سے قائم ہوتی ہے۔ اندر روح کی بقا اور باہر مادی غذا ہو تو یہ سلسلہ قائم رہتا ہے اور نشو ونما اس کے آثار میں سے ہے

اس جہاں سے جانے کے بعد اس قسم کی حیات باقی نہیں رہتی۔ برزخی حیات کتنی اعلیٰ و اعلیٰ کیوں نہ ہو اسے علی الاطلاق دنیوی حیات کہنے سے بہت سی غلط فہمیاں جنم لے لیتی ہیں۔ ہمیں اس خطرے کا شروع سے ہی احساس تھا کہ حیات النبی کی بحث میں عوام کے لیے اس تعبیر کا تحمل خاصا مشکل ہو گا۔ ہم نے اس کتاب کے ٹائیٹل پر یہ الفاظ علی حدہٖ لکھ دیئے۔ مکینِ گنبدِ خضرا کی حیاتِ برزخی کا بیان۔ مبادا کوئی اس حیات طیبہ سے بالکل دنیا کی زندگی مراد نہ لے لے۔

وفات کے بعد پھر اس دنیوی زندگی میں آنا یہ شیعہ عقیدہ ہے جسے وہ عقیدہ رجعت کہتے ہیں۔ اہل السنۃ کے ہاں وعدہ موت پورا ہوتے کے بعد کسی کو اس دُنیا میں نہیں آنا۔

—— حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کو دنیویہ صرف اس پہلو سے کہتے ہیں کہ یہ دُنیا والے جسد اطہر سے ہے۔ گو یہ اس عالم کے لیے کھلی زندگی نہیں۔ آپ برزخ میں اسی جسدِ اطہر سے نمازیں پڑھتے ہیں اور آپ کی وہ حیات آپ کے لیے بے شک حسی ہے۔ لیکن ہم اسے محسوس کر نہیں پاتے۔ نہ ہمیں اس عالم کی نماز کے رکوع و سجود نظر آتے ہیں۔

ایک سویا ہوا آدمی خواب کی دُنیا میں بیٹے کو ذبح کر رہا ہے۔ مگر اس کے پاس بیٹھنے

والے اس کے جسد میں کوئی آنا جانا اور نقل و حرکت نہیں دیکھتے۔ جو خدا اس پہ قادر ہے کہ عالم خواب کا ایسا سلسلہ بنا دے کہ اُدھر پورا عمل ہو اور اِدھر حرکت تک محسوس نہ ہو۔ کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جسدِ اطہر یہاں (اس دُنیا) کے لوگوں کو بالکل سکون میں دکھائی دے اور آپ اس برزخی حیات میں نمازیں بھی پڑھیں اور آپ کی وہ حیات آپ کے حق میں پوری حسی ہو آپ اسے اسی طرح طرح محسوس کریں۔ جیسا کہ اس عالم میں آپ نمازیں پڑھتے تھے بغیر اس کے کہ وہ جہاں عالمِ تکلیف ہو اللہ رب العزت بے شک اس پہ قادر ہے کہ اس جسدِ اطہر کو عالمِ برزخ میں ان تمام واردات سے نوازے، جن کا احادیث میں ذکر ملتا ہے اور اس دُنیا والوں کو اس بدنِ اطہر میں کوئی حرکت محسوس نہ ہو۔

اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ جسدِ اطہر قبر مبارک میں صرف محفوظ ہوتا۔ اس طرح نرم و نازک اور تازہ نہ رہتا۔ جیسا کہ وہ روضہ پاک میں دفن کرنے کے وقت تھا۔ ہدایہ میں ہے کہ وہ آج بھی اسی طرح ہے۔ جیسا کہ رکھا گیا تھا:-

وھو الیوم کما وضع[1]

ترجمہ:- اور وہ آج بھی اسی طرح تر و تازہ ہے جیسا کہ رکھا گیا تھا۔

حق یہ ہے کہ آج بھی وہ جسدِ اطہر اسی طرح نرم اور تازہ ہے۔ جیسے آج سے چودہ سو سال پہلے قبر مبارک میں رکھا گیا تھا۔ اس جسدِ پاک کو وہاں برزخی حیات حاصل ہے۔ جس سے آپ نمازیں بھی پڑھتے ہیں اور سلام پیش کرنے والوں کا سلام بھی سُنتے ہیں۔ آپ عالمِ برزخ میں اپنے جسدِ اطہر میں حیات کے تمام آثار محسوس کرتے ہیں۔ آپ اپنی قبر مبارک میں نمازیں بھی پڑھتے ہیں اور آپ کے لیے قبر مبارک کی وہی وسعتیں نہیں جو ہمیں روضۂ مبارکہ کی دکھائی دیتی ہے۔ اس کی مسافتوں اور لطافتوں کو یا عالمِ برزخ میں رہنے والے جانیں یا اللہ رب العزت

---

[1] ہدایہ باب الجنائز جلد ۱ صفحہ ۱

جو ان عجائب اور کوائف کو پیدا کرنے والا ہے۔

اس وقت ہمارا موضوع حیات انبیاء نہیں یہ بحث ضمناً آگئی ہے۔ حیات انبیاء پر ہم انشاء اللہ العزیز حیات شہداء کے بعد بحث کریں گے۔ یہاں ہم صرف یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ دنیا اور آخرت کے مابین جو برزخی زندگی ہے وہ دنیوی زندگی نہیں۔ نہ اس میں تصرف آب وہوا ہے نہ مادی نشو ونما ہے۔ برزخی زندگی اس دنیوی زندگی سے بہت مختلف ہے

بدن عنصری سے ایک لطیف تعلق کے باوجود اسے دنیوی زندگی کہنا خطرات سے خالی نہیں اسے علی الاطلاق دنیوی حیات کہنا بقول حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ خلاف اہل السنۃ والجماعۃ ہے۔

حافظ ابن قیمؒ (۵۱۰ ، ۵) صراحت سے کہتے ہیں کہ عالم برزخ میں روح کا عود کر آنا اس طرح نہیں جس طرح روح یہاں بدن میں داخل ہے۔ روح و بدن کے تعلق کی یہ ایک جدی نوع ہے۔ یہ تعلق ایسا نہیں جیسا کہ اس دنیا میں تھا۔

ان الروح تعاد بین الجسد و اکفان و ھذا عود غیر التعلق الذی کان لھا فی الدنیا بالبدن وھی نوع اٰخر وغیر تعلقھا بہ حال النوم وغیر تعلقھا بہ وھی فی مقرھا بل ھو عود خاص للمسئلۃ۔[1]

ترجمہ بیشک روح جسد اور کفن میں لوٹائی جاتی ہے اور اس کا پھر لوٹ آنا اس تعلق سے مختلف ہے جو اسے اس دنیا میں بدن میں حاصل تھا یہ تعلق کی اور قسم ہے اور یہ اس تعلق سے بھی مختلف ہے جو اس کے بدن کو روح سے نیند میں حاصل تھا اور یہ اس تعلق سے بھی مختلف ہے جو روح کو جسد سے اپنے مقر میں موجود ہوتے ہوئے بدن سے حاصل تھا یہ سوال نکیرین کی خاطر روح کا بدن کی طرف پھر پلٹنا ہے اور یہ ایک خاص قسم کی پلٹ ہے (جو ان تمام پہلے تعلقات سے مختلف ہے اور اسی کے مطابق روح قبر میں بدن میں لوٹتی ہے۔

شرح عقائد میں ہے :-

---

[1] کتاب الروح صد ۶۱ ، صد ۲۴۸

ویجوز ان یخلق اللہ تعالیٰ فی جمیع الاجزاء او فی بعضہا نوعاً من الحیٰوۃ قدر مایدرک الم العذاب ولذۃ النعیم وھٰذا لا یستلزم اعادۃ الروح الی بدنہ ولا یتحرک ویضطرب۔[1]

ترجمہ۔ اور یہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ میت کے پورے بدن میں یا اس کے کسی حصے میں ایک طرح کی حیات پیدا کرے جس سے وہ قبر کے عذاب کی تکلیف یا وہاں کی راحت کی لذت پا سکے اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ روح بدن کی طرف (کاملۃً) لوٹے اور نہ ضروری ہے کہ وہ حرکت کرے اور ہلے جُلے۔

یعنی عذاب قبر کے لیے مطلق حیات چاہیئے اعادہ روح سے ہو یا بغیر اس کے۔
یہاں صرف حیات کا اقرار ہے اعادہ روح کا نہیں۔ مگر علامہ عبد العزیز پرہاڑ وی ؒ لکھتے ہیں:۔

ان الحیٰوۃ للمیت لیست کحیٰوۃ غیرہ باعادۃ الروح فی الجسد اعادۃ کاملۃ۔[2]

ترجمہ۔ میت کی یہ حیات دوسروں کی حیات کی طرح نہیں جس میں روح جسد میں کامل طور پر عود کرتی ہے۔

یہاں اعادۂ کاملہ کا انکار ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں حیات کا حصول روح کے تعلق سے ہے گو یہ روح کا پوری طرح عود کرنا نہ ہو۔ روح و بدن کے تعلق کی ایک جدی نوع ہو۔
حافظ ابن حجر عسقلانی (۸۵۲ھ) صریح لفظوں میں کہتے ہیں:۔

ھٰذہ الحیٰوۃ لیست دنیویۃ انما ھی اخرویۃ۔[3]

ترجمہ۔ قبر کی یہ زندگی عالم دنیا کی نہیں عالم آخرت کی ہے۔

لا تشبہ حیٰوۃ الدنیا۔ وہ حیات دُنیوی زندگی کی سی نہیں۔[4]

---

[1] شرح عقائد للتفتازانی ص ۹۲ [2] نبراس ص ۳۲۳ [3] فتح الباری جلد ۲ ص ۲۱۳ [4] ایضاً جلد ۳ ص ۲۶

الحیوٰۃ فی القبر للمسئلۃ لیست الحیاۃ المستقرۃ للمعہودۃ فی الدنیا التی تقوم فیہا الروح بالبدن وتدبرہ وتصرفہ وتحتاج الی ما یحتاج الیہ الاحیاء بل ھی مجرد اعادۃ لفائدۃ الامتحان الذی وردت بہ الاحادیث الصحیحۃ۔[1]

ترجمہ: قبر میں سوال وجواب کے لیے زندگی اس دائمی حیات کی طرح نہیں جس کا وہ دنیا میں عادی تھا جس میں روح بدن کے ساتھ قائم ہوتی ہے اور روح ہی بدن میں تدبیر کرتی ہے اور وہ ہر اس چیز کی محتاج ہوتی ہے جس کے زندے محتاج ہوتے ہیں (جیسے غذا اور نشوونما) بلکہ یہ قبر کی زندگی محض ایک اعادۂ روح ہے جس سے سوال وجواب کا وہ فائدہ پورا ہوتا ہے جو احادیث صحیحہ میں وارد ہے۔

حافظ ابن ہمام کے مشہور شاگرد امام قاسم بن قطلوبغا (۸۷۹ھ) امام قونوی سے نقل کرتے ہیں:۔

قال الامام القونوی اختلفوا فی انہ یخلق فیہ حیوٰۃ مطلقۃ کحیوٰۃ قبل الموت اوحیوٰۃ بقدر ما یحس الالم والصحیح ھذا۔[2]

ترجمہ: علامہ قونوی فرماتے ہیں اس میں اختلاف ہے کہ میت میں مطلق حیات پیدا کر دی جاتی ہے جیسا کہ موت سے پہلے اسے حاصل تھی یا اسے حیات صرف اسی قدر ملتی ہے جس سے وہ عذاب قبر کو محسوس کر سکے اور یہ دوسری بات صحیح ہے۔

سیدنا ملا علی قاری (۱۰۱۴ھ) بھی کہتے ہیں:۔

ولکل روح بجسدھا اتصال معنوی لایشبہ الاتصال فی الحیوٰۃ الدنیا بل اشبہ شیٔ بہ حال النائم وان کان ھو اشد من حال النائم اتصالاً وبھذا یجمع بین ما ورد ان مقرھا فی علیین او سجین

---

[1] فتح الباری جلد ۳ صفحہ ۱۸۴ [2] مسامرہ شرح مسایرہ جلد ۲ صفحہ ۱۱۶

وبين مانقله ابن عبد البر عن الجمهور انما عند افنية القبور[1]

ترجمہ: اور ہر روح کا اپنے جسد کے ساتھ ایک اتصال ہوتا ہے جو اس اتصال سے جو اسے پہلے دنیا میں تھا مشابہ نہیں بلکہ جو بات اس کے سب سے زیادہ قریب ہے، وہ سونے والے کا حال ہے۔ اگرچہ یہ قبر کی زندگی روح کے اتصال میں سونے والے کے حال سے زیادہ مضبوط ہے اور اس تشریح سے تطبیق ہو جاتی ہے اس میں کہ روحوں کا مقر علیین میں یا سجین میں ہے اور اس میں جو ابن عبد البر نے جمہور سے نقل کی ہے کہ ارواح افنیہ قبور میں ہوتی ہیں۔

حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ (۱۲۲۹ھ) اس سے بھی زیادہ وضاحت سے کہتے ہیں:۔

در قبر احیاء اماتت حقیقیہ نیست ..... کہ تغذیہ و تنمیہ بدن ہمراہ آں نمے باشد۔[2]

ترجمہ: قبر میں میت کو زندہ کرنا اور مارنا حقیقی نہیں۔ اس قبر کی زندگی میں نہ بدن کو یہاں کی غذا کی حاجت ہے نہ بدن کی اس میں نشوونما ہوتی ہے۔

اہل علم کی تصریحات سے پتہ چلتا ہے کہ قبر کی زندگی دنیوی زندگی نہیں، وہ جہان دوسرا ہے۔ قبر میں بدن عنصری سے بے شک روح کا ایک لطیف تعلق ہوتا ہے۔ لیکن صرف بایں قدر کہ اس سے کسی قدر الم یا راحت کا ادراک ہو۔ یہ برزخی زندگی ہے۔ جس میں روح نہایت لطیف پیرایہ میں بدن عنصری پر سایہ فگن ہوتی ہے۔ اس عالم میں رد الروح الی الجسد اسی درجہ میں ہے نہ کہ کاملاً جیسا کہ اس دنیا میں تھا۔

انبیاء علیہم السلام کی حیات جسمانی عام اموات سے قوی ہے۔ یہ ابدان شروع سے محفوظ ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کی برزخی حیات نہایت قوی درجے کی ہے اور چونکہ یہ اسی

---

[1] مرقات جلد ۴ صہ ۲۵ [2] تحفہ اثنا عشریہ صہ ۲۸۲

بدن سے متعلق ہے جو اس دنیا میں تھا۔ اس لیے اس کو بعض علماء نے حیاتِ برزخی دُنیوی سے بھی تعبیر کیا ہے۔ تاہم ان کی یہ حیات باعتبار ظرفیت حیاتِ دنیوی نہیں، برزخی ہے۔ یہاں نہیں عالم برزخ میں ہے۔ یہاں ان کا دفن بھی صحیح ہے کفن بھی صحیح ہے اور ان کی خلافت اور جانشینی بھی صحیح ہے۔

نہایت تعجب سے دیکھا اور سُنا گیا کہ بعض علماء ان دنوں ایسا پیرایہ بیان اختیار کیے ہوتے ہیں گویا علماء دیوبند انبیاء کرام کو اس جہان میں زندہ مانتے ہیں اور وہ ان کی وفات اور اس عالم سے مفارقت کے قائل نہیں (معاذ اللہ) ان میں سے ایک صاحب کا ایک خطاب ہم یہاں نقل کرتے ہیں:۔

(۱) ـــــ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اگر زندہ ہیں تو بتائیں صحابہ کرامؓ نے کیوں انہیں زندہ قبر میں اتار دیا، کیا یہ حضورؐ کی گستاخی نہیں کہ انہیں زندہ درگور کر دیا جائے۔ اگر آپؐ زندہ ہوتے تو صحابہؓ آپ کو دفن کیوں کرتے؟

تبصرہ

جب یہ کسی کا عقیدہ ہی نہیں تو یہ پیر طریقت کن لوگوں کی تردید کر رہے ہیں اور کن کو یہ وعظ کر رہے ہیں، یہ شاید انہیں خود بھی پتہ نہ ہو۔ قاضی صاحب! آپ ہی انہیں کچھ سمجھائیں۔

(۲) ـــــ اگر صحابہؓ حضورؐ کو زندہ سمجھتے تھے تو جب خلافت پر انصار اور مہاجرین میں سقیفہ بنی ساعدہ میں اختلاف ہوا تو کسی صحابیؓ نے یہ کیوں نہ کہا، چلو حضورؐ سے یہ مسئلہ پوچھ لیں۔ معلوم ہوا وہ آپ کو زندہ نہیں سمجھتے تھے۔

تبصرہ

یہ مشورہ لینا اور دینا اس دُنیا کے احکام ہیں اگلے جہان کے نہیں۔ حیاتُ النبی کے

قائلین آپ کو عالمِ برزخ میں زندہ مانتے ہیں نہ کہ عالمِ دُنیا میں ـــــ اگر کسی عالم نے آپ کی اس حیات کو دُنیوی کہا ہے تو یہ باعتبار ظرفیت دنیوی نہیں ہے۔ اسے جسمانی ہونے کے پہلو سے دُنیوی کی سی کہا ہے کہ آپ اسے اپنے حق میں اس طرح محسوس کرتے ہیں. گو ہم یہاں اسے اس طرح نہ دیکھ سکیں.

(۳) ـــــ حضرات آپ بتائیں کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کھلی ہو اور میں آپ کے بدن کو ہاتھ لگاؤں تو آپ کیا اس پر کسی تکلیف کا اظہار فرمائیں گے؟ اگر آپ کی آواز سُنائی دے تو تم بے شک سچے ہو۔ ورنہ مان لو کہ آپ قبر میں زندہ نہیں ہیں۔ (استغفراللہ)

تبصرہ

یہاں کے لوگ صرف وہی آواز سُن سکتے ہیں جو اس عالم کی ہو۔ اگلے جہان کی آواز یہاں سُنی جائے یہ بدوں اسماع باری ممکن نہیں. تمہارا یہ سوال ان لوگوں سے تو ہو سکتا ہے جو آپ کو اس جہان میں زندہ مانتے ہوں اور انتقالِ دارین (من الدنیا الی البرزخ) کے قائل نہ ہوں.

(۴) ـــــ یہ میں کار میں بیٹھا ہوں. شیشے بند ہیں. میں باہر کے منظر کو دیکھ تو رہا ہوں سُن نہیں رہا. جب میں اتنے قریب کے فاصلے سے باہر کی آواز سُن نہیں پاتا. تو سوچو! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اتنی مٹی کے فاصلے سے اپنی قبر میں کسی کا سلام کیسے سُنتے ہوں گے.

تبصرہ

شیشے یا مٹی کے یہ فاصلے اس جہان کے داخلی فاصلے ہیں. اس سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ

آپ کے خیال میں علمائے دیوبند حضورؐ کو اس دُنیا میں رہنے والا مانتے ہیں — نہیں. علمائے دیوبند آپ کے انتقالِ دارین کے قائل ہیں. حضورؐ کے سننے کی قوت اس جہان کے مادی فاصلوں سے بالا ہے. شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ لکھتے ہیں :-

آپ کی حیات نہ صرف روحانی ہے جو کہ عام شہداء کو حاصل ہے بلکہ جسمانی بھی — اور از قبیل حیات دُنیوی بلکہ بہت وجوہ سے اس سے قوی تر[1]

یہاں دنیوی سے مراد علاقہ ظرفیت نہیں آپ یقیناً عالم برزخ میں ہیں اس جہان میں نہیں لیکن آپ کے اپنے حق میں وہ حیات حسی جسمانی ہے اور اسی جسد اطہر میں ہے جو اس دُنیا کا تھا. البتہ وہ حیات یہاں کے لوگوں کے لیے مدرک اور مشاہد نہیں. الا یہ کہ خدا تعالیٰ کسی کو کشف کے ذریعہ اگلے جہان کا نقشہ دکھا دے.

پیر طریقت کی یہ چار طریقوں کی رپورٹ ہمیں ملی ہے ان پر مجموعی غور سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے مخالفین ابھی تک یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ہم آں سرور صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی دُنیا میں زندہ مانتے ہیں اور اسی پہلو سے آپ کی دنیوی زندگی کا عقیدہ رکھتے ہیں — حاشا وکلا ایسا ہرگز نہیں. اس پہلو سے آپ کی حیاتِ دنیوی کا اعتقاد ہرگز اہل سنت کا مذہب نہیں ہے.

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے اس بیان کو اگر پورے علمائے دیوبند کا عقیدہ سمجھ لیا جائے تو کیا ہم بہت سے لفظی اختلاف سے بچ نہیں جاتے

حیاتِ دنیوی ظاہری کا تو دُنیا میں کوئی بھی قائل نہیں. قرآن پاک کی اتنی صریح مخالفت کون مسلمان کر سکتا ہے ؛ جو بھی قائل ہیں حیات برزخی

---

[1] مکتوبات شیخ الاسلام جلد ا صـ۱۳۰ امام فخر الدین رازی المطالب العالیہ کے تیسرے مقالہ کی فصل ۵ میں لکھتے ہیں فوجب القطع بان النفس بعد مفارقة البدن مدركة للجزئيات. سو یہ ادراک اگر عالم برزخ میں بڑھ جائے تو کوئی تعجب کی بات نہیں.

ہی کے قائل ہیں[1]۔

موجودہ حالات میں احتیاط اسی میں ہے کہ عام عرفی معنی میں اسے حیاتِ دُنیوی نہ کہا جائے۔ لیکن اگر کوئی اس حیات کو دنیوی کے نام سے تعبیر کرے اور آپ کی حیاتِ برزخیہ سے بھی انکار نہ کرے تو اسے اس کا ملزم نہیں سمجھنا چاہیئے کہ وہ حضورؐ کو اس دُنیا میں زندہ مانتا ہے اور انتقالِ دارین کا قائل نہیں۔ (استغفراللہ) ایسا شخص اہل السنۃ والجماعۃ میں سے ہے۔ وہ ہرگز اہلِ حق سے باہر نہیں۔ قبر کی زندگی کو بھی کسی دوسرے اعتبار سے دنیوی زندگی کہا جاسکتا ہے۔

یہ کچھ تفصیل محض اس لیے گذارش کی گئی ہے کہ مسئلہ حیات النبی میں اصل اختلاف کو زیادہ نہ کیا جائے ایک دوسرے کو قریب سے سمجھا جائے۔ المہند میں حیاتِ برزخیہ دنیویہ کے الفاظ کو انہی معنی میں سمجھا جائے جو علماء دیوبند اس سے مراد لیتے ہیں۔ ہمارے ذمہ یہ بات نہ لگائی جائے کہ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس دنیا میں زندہ مانتے ہیں اور انتقالِ دارین کے قائل نہیں ہیں۔

اگر یہ صحیح ہے اور یہ یقیناً ہمارے دل کی آواز ہے تو پیرِ طریقت کو بھی وہ تقریریں نہ کرنی چاہئیں جنہیں ہم ابھی مختصر تبصروں کے ساتھ ہدیہ قارئین کر آئے ہیں۔ اس قسم کی بے محل تقریریں تشغیب عوام کا سبب تو ہو سکتی ہیں لیکن ان میں دین کی ہرگز کوئی خدمت نہیں ہے اور یہ نفرت کو بڑھانے والی ہیں ایک دوسرے کو قریب کرنے والی نہیں ہیں وکفیٰ باللہ شہیدا۔

قبر کی زندگی کو کیا کسی پہلو سے دُنیوی زندگی کہا جاسکتا ہے؟

اس بات کے تسلیم کرنے سے چارہ نہیں کہ قبر کی یہ زندگی ایک پہلو سے دنیوی زندگی

---

[1] منقول از رسالہ تعلیم القرآن راولپنڈی صد۳۲ ماہ جنوری ۱۹۶۰ء

بھی ہے اور خود قرآن کریم نے ایک تفسیر کے اعتبار سے اسے دُنیوی زندگی کہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

یثبت اللّٰہ الذین اٰمنوا منکم بالقول الثابت فی الحیٰوۃ الدنیا و فی الاٰخرۃ۔ (پ ۱۳: ابراہیم: ع ۴ آیت ۲۷)

ترجمہ: مضبوط رکھتا ہے اللہ ایمان والوں کو مضبوط بات سے دُنیا کی زندگی میں اور آخرت میں۔

حضرت براء بن عازبؓ کہتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب مومن کو قبر میں سوال کے لیے بٹھایا جاتا ہے اور وہ لا الٰہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ کی شہادت دے لیتا ہے تو یہ وہ ثابت قدمی ہے جو اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو عطا فرماتا ہے۔[1]

یہ قبر کے سوال اور ایمان پہ ثابت قدمی پہلی منزل ہے اور دوسری منزل قیامت کے دن کا سوال وجواب ہے۔ قرآن کریم نے پہلی منزل کو حیاتِ دنیوی کی ثابت قدمی کہا ہے اور دوسری منزل کو آخرت کی ثابت قدمی کہا ہے۔ سو اس اعتبار سے قبر کی زندگی کو دنیوی زندگی میں بھی شمار کیا جا سکتا ہے یہ ایک کھُلی دنیوی زندگی ہے جو یہاں ہے اور ایک پردے کی دنیوی زندگی ہے اسے برزخی زندگی بھی کہتے ہیں۔ حافظ ابن جوزی (۵۱۷ ھ) قرآن کریم کی اس آیت میں دنیوی زندگی کا یہی معنی کرتے ہیں:۔

الحیٰوۃ الدنیا من السوال فی القبر والاٰخرۃ السوال فی القیامۃ۔[2]

ترجمہ: یہ دنیا کی زندگی اس وقت کو کہا ہے جب قبر میں سوال کی گھڑی ہو اور آخرت اس وقت کو جب قیامت کے دن سوال وجواب ہوں گے۔

تفسیر خازن میں ہے:۔

---

[1] دیکھئے صحیح بخاری جلد ۱ ص ۱۸۳ جلد ۲ ص ۶۸۲ [2] تفسیر زاد المسیر جلد ۴ ص ۳۶۱

الحیٰوۃ الدنیا معنی حیاۃ فی القبر عند السوال[1]

ترجمہ یہاں حیاۃ دنیا حیات فی القبر کے معنی میں ہے جو قبر کے سوال کے وقت ہوگی۔

بعض مفسرین نے قبر اور قیامت دونوں منزلوں کے سوال وجواب کو وفی الآخرۃ سے متعلق کہا ہے۔ لیکن ہم یہاں صرف اس بات پر متنبہ کرنا چاہتے ہیں کہ حیات فی القبر کو دنیوی حیات کی ایک قسم کہنا کوئی ایسا گناہ نہیں جو علمائے دیوبند نے ہی کیا ہو۔ بلکہ پہلے مفسرین بھی اسے دنیوی حیات میں داخل کرتے آئے ہیں۔ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی لکھتے ہیں:۔

قبر کی منزل جو دنیا اور آخرت کے درمیان برزخ ہے اس کو ادھر (حیوٰۃ دنیا میں) یا ادھر (حیوٰۃ آخرت میں) ہر طرف چاہیں شمار کر سکتے ہیں۔ چنانچہ سلف سے دونوں قسم کے اقوال منقول ہیں[2]

حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ بھی فرماتے ہیں کہ برزخ ایک اعتبار سے مواطن دنیوی میں سے ہے اور اس میں اعمال کے بڑھنے کی بھی بہت گنجائش ہے[3]

برزخِ صغرٰے چوں از یک وجہ از مواطن دنیوی است گنجائش ترقی دارد واحوال ایں وطن نظر باشخاص متفاوتہ تفاوت فاحش دارد الانبیاء یصلون فی القبور شنیدہ باشند و حضرت پیغمبر ما علیہ وعلی آلہ الصلوٰۃ والسلام شب معراج چوں بر قبر حضرت کلیم علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام گزشتند دیدند کہ در قبر نماز مے گزارد۔

ترجمہ برزخ صغرٰی ایک پہلو سے مواطن دنیوی میں سے ہے۔ یہ اس طرح کہ اس میں اعمال میں ترقی کی گنجائش ہے اور برزخ کے حالات مختلف درجوں کے لوگوں میں بہت تفاوت رکھتے ہیں آپ نے حدیث الانبیاء احیاء یصلون فی قبورھم سنی ہوگی اور حضور نبی صلی اللہ علیہ وسلم معراج کی رات جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قبر کے پاس سے گزرے تو انہیں اپنی قبر میں نماز پڑھتے پایا۔

---

[1] تفسیر خازن جلد ۳ صفحہ ۸۰، قرطبی جلد ۹ صفحہ ۳۶۳ [2] تفسیر عثمانی صفحہ ۳۲۵ [3] مکتوبات دفتر ۲ مکتوب ۱۶، صفحہ ۲۹

بر سرِ مطلب آمدیم

اصل بحث عامہ اموات کی برزخی زندگی کی ہو رہی تھی اور ہم عذابِ قبر پر بحث کر رہے تھے حیاتِ نبی کا مسئلہ ضمناً آگیا، کیونکہ یہ حیاتِ طیبہ بھی قبر ہی کی بہار ہے. اب ہم پھر اصل بات کی طرف لوٹتے ہیں۔ جمہور اہل السنۃ والجماعۃ عذابِ قبر اور نعیمِ قبر کو روح اور بدن دونوں سے متعلق مانتے ہیں اور روح کا یہ تعلق بدنِ عنصری سے ہے محض بدنِ مثالی سے نہیں. وہ جتنے بھی ہوں مقدورِ باری ہیں لیکن حکمتِ الٰہی اسی میں ہے کہ عذابِ قبر اسی بدن سے متعلق ہو جس نے دنیا میں گناہ کئے اور یہ وہی جسد ہو (یا اس کے ذرّات منتشرہ ہوں) جو کامل صورت میں آخرت میں معذب ہوگا ــــ دُنیا میں بھی گناہ اسی بدن نے کیے. عذابِ برزخ بھی اسی بدن یا اس کے ذرات سے متعلق ہونا چاہیئے اور ضرور ہے آخرت کا عذاب بھی اسی بدن پر ہو. عالمِ دُنیا، عالمِ برزخ اور عالمِ آخرت تینوں روح اور بدن کے تعلق سے چلیں ــــ جمہور اہل السنۃ کا مختار یہی ہے کہ عذابِ قبر روح اور بدن کو شامل ہے. یہ حقیقت اعادۂ روح سے قائم ہو یا تعلقِ روح سے. اسمیں دونوں طرف اہلِ حق کی تصریحات ہیں. محدثین اعادۂ روح کے قائل ہیں اور متکلمین معتزلہ، کرامیہ اور شیعہ کو جواب دینے کے لیے وسعتِ تعبیر کے قائل ہیں اور ہمیں اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔

یہ نہ سمجھا جائے کہ اس حیاتِ برزخی میں دنیوی زندگی کا کوئی پہلو راہ نہیں پا سکتا برزخ میں کئی ایسے پہلو ملیں گے جن کی سرحدیں دنیوی زندگی کو چھوتی ہیں. بایں ہمہ ان سے دُنیوی زندگی مراد نہیں، جو اس جہاں سے چل بسا وہ برزخی زندگی میں ہے دنیوی میں نہیں. گو یہ برزخی زندگی بھی بعض پہلوؤں سے وطنِ دُنیوی میں سے ہو۔

حیاتِ برزخی کا دُنیوی پہلو

یہ دُنیا دارالعمل ہے موت پر زنجیرِ عمل کٹ جاتی ہے۔ انبیاء کی یہ خصوصیت ہے کہ ان کا سلسلہ عمل کٹتا نہیں۔ برزخ میں بھی ان کا سلسلہ عمل جاری رہتا ہے اور وہ اللہ کی عبادت میں لذت پاتے ہیں۔ وہ بایں معنی بھی زندہ ہیں کہ ان کے اعمال ابھی قائم ہیں۔ یہ انبیاء کی حیاتِ برزخی کا دنیوی حصہ ہے۔ حضرت مولانا انور شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں :-

فنبی اللہ حی یرزق واحیاء فی قبورھم یصلّون تسرد فی ذکر الحیٰوۃ افعالھا لا اصلھا او راد مع الاجساد فان اجساد ھم حرمت علی الارض [1]

ترجمہ۔ سو اللہ کا نبی زندہ ہے اسے رزق دیا جاتا ہے اور حدیث الانبیاء احیاء فی قبورھم یصلون اصل حیات کے بیان میں نہیں۔ افعال حیات کے بیان میں نقل کی جاتی ہے یا مراد یہ ہے کہ وہ اپنے اجساد سے زندہ ہیں کیونکہ ان کے جسموں کو مٹی نہیں کھاتی۔

اعمالِ حیات مراد ہوں یا اجسادِ حیات یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ عالمِ برزخ عالمِ تکلیف نہیں۔ یہاں انسان اسی وقت تک مکلف ہے جب تک موت نہ آجائے۔ واعبد ربک حتٰی یاتیک الیقین (پ۱۴ حجر آیت ۹۹) حکم الٰہی ہے اور اسی وقت تک کے لیے ہے جب تک موت نہ آجائے۔

سو عالمِ برزخ میں عبادت مکلف ہونے کی صورت میں نہیں۔ قربِ الٰہی میں اور بڑھنے کے لیے ہے۔ یہ ذوقِ عبادت کی مزید لذت پانے کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس روحانی لذت سے محروم نہیں کرنا چاہتے۔ جسد کی سلامتی اس عمل کا ایک آلہ ہے۔

---

[1] تحیۃ الاسلام صہ ۳۶

اعمالِ طاعت اس دنیا کا حصہ ہیں اور ان پر عمل پیرائی یہاں کی زندگی ہے. انبیاء کی حیات برزخی اس پہلو سے دنیوی زندگی ہے کہ اس کا سلسلہ عمل باقی ہے اور جسد کی سلامتی انہیں اس لیے ملی ہے کہ عمل اس کے بغیر قیام نہیں پکڑتا. انبیاء وہاں اپنی نقل و حرکت اسی طرح محسوس کرتے ہیں جیسے کہ وہ اس دنیا میں محسوس کرتے تھے. یہاں کی آنکھیں نہ اس برزخی زندگی کو دیکھ سکتی ہیں نہ یہاں کے کان اسے سن سکتے ہیں. الا یہ کہ اللہ تعالیٰ خود کسی کو دکھادیں یا سنادیں.

اس دنیوی زندگی کا امتداد محالات میں سے نہیں. اللہ تعالیٰ چاہتے تو آپ کو برزخ میں جانے نہ دیتے. آپ یہیں تا قیامت رہتے اور پھر قیامت کو آپ پر اللہ تبارک و تعالیٰ کا وعدہ انک میت وانھم میتون پورا ہوتا اور آپ پھر براہِ راست آخرت میں چلے جاتے یہ بدون برزخ آخرت میں جانا کوئی ناممکن بات نہ تھی.

برزخ کی کلی نفی اور حیاتِ دنیوی کا امتداد

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو امتدادِ حیات کا موقع دیا گیا تھا اور آپ نے اسے پسند نہ فرمایا. آپ نے اللہ رب العزت سے ملنے کو حیاتِ دنیوی پر ترجیح دی. حضرت ابو مویہبہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں. حضورؐ نے مجھے فرمایا:-

ولاحمد ایضا من حدیث ابی مویھبۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انی اوتیت مفاتیح خزائن الارض والخلد ثم الجنۃ فخیرت بین ذلک وبین لقاء ربی والجنۃ فاخترت لقاء ربی والجنۃ.[1]

مجھے زمین کے خزانوں کی کنجیاں دی گئیں اور یہ کہ میں قیامت تک رہوں. پھر آگے جنت ہے مجھے اختیار دیا گیا کہ قیامت تک یہاں رہوں یا اللہ کی ملاقات اور جنت میں جانے کی ہاں کرلوں. میں نے لقاء رب اور جنت کو اختیار کیا ہے.[2]

---

[1] دیکھیے صحیح بخاری صـ۲۴۱/۲ [2] فتح الباری جلد ۸ صـ۱۱۲ عن احمد

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ روایت کرتی ہیں :۔

انہ لم یقبض نبی حتی یری مقعدہ من الجنۃ ثم یخیر فلما نزل بہ و رأسہ علی فخذی غشی علیہ ثم افاق فاشخص بصرہ الی سقف البیت ثم قال اللھم الرفیق الاعلی فقلت اذا لا یختارنا وعرفت انہ الحدیث الذی کان یحدثنا وھو صحیح[1]

ترجمہ: کوئی نبی وفات نہیں پاتا مگر یہ کہ وہ اپنا مقام جنت میں دکھا دیا جاتا ہے پھر اسے اختیار دیا جاتا ہے (کہ دنیا میں رہے یا آخرت کو اختیار کرے) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اللھم الرفیق الاعلیٰ فرمایا تو میں نے سمجھ لیا کہ اب آپ ہمارے پاس نہ رہیں گے۔ میں نے جان لیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو فرمایا کرتے تھے کہ نبی کو (دنیا میں رہنے کا) اختیار دیا جاتا ہے وہ سچ ہے اور یہ کہ آپ کو اختیار دیا گیا ہے۔

سو اگر آپ قیامت تک کی دُنیوی زندگی پالیتے اور برزخی زندگی سے بالکل نہ گزرتے تو بھی ایسا ممکن تھا اور قواعدِ شرع اس کا کہیں انکار نہیں کرتے۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ آپ کی دنیوی زندگی کا امتداد تھا۔

آپ نے اللہ تعالیٰ کے پاس حاضری کو پسند کیا تو اللہ تعالیٰ نے بھی ایک پہلو سے آپ کی دنیوی زندگی باقی رکھی کہ آپ کے اعمال کا سلسلہ باقی رہے اور آپ قربِ الٰہی میں اور آگے بڑھتے رہیں اور اب تک اور پھر قیامت تک آپ کے سلسلہ طاعات میں تسلسل ہے اور یہ برزخ کے پردے میں دنیوی زندگی کا امتداد ہے گو یہاں کی آنکھوں سے استتار ہے۔

سو اگر آپ قیامت تک کی دُنیوی زندگی پائے ہوتے اور برزخی زندگی سے بالکل نہ گزرتے تو یہ عین ممکن تھا۔ اس صورت میں آپ صفتِ اولیٰ میں انک میت و انھم میتون کا وعدہ

---

[1] صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۶۴۱

پُورا کرتے اور صعقۂ ثانیہ پر پھر اُٹھ کھڑے ہوتے اور جنت میں داخل ہو جاتے. اس صورت میں آپ کی قیامت سے پہلے جو زندگی ہوتی وہ دنیوی زندگی ہی تو ہوتی اور اس میں کوئی شرک کا پہلو نہ تھا. معلوم نہیں آپ پہ وفات ہو چکنے کا اقرار عقیدہ توحید کا جزو کیسے بن گیا. آپ کی وفات ایک تاریخی حقیقت ہے لیکن یہ توحید کا جزو نہیں. وعدۂ وفات کبھی بھی پورا ہو سکتا تھا.

دنیوی زندگی اور برزخی زندگی میں فرق

دنیوی زندگی ایک پہلو سے برزخی زندگی سے اعلیٰ و اولیٰ ہے ورنہ دوسرے اعتبارات سے برزخی زندگی افضل ہے. دنیوی زندگی میں قربِ الٰہی میں بڑھنے والے اعمال میسر ہیں. یہ اعمال کی وہ قوت ہے جو برزخی زندگی میں نہیں. وہاں اعمال صرف روحانی لذت اور ذوقِ حیات کے لیے ہیں.

شہید برزخ میں اور پھر آخرت میں جسمانی حیات پانے کے باوجود اس دنیا میں پھر آنے کی تمنا کرے گا. تاکہ ایک دفعہ پھر وہ خدا کی راہ میں مارا جائے اور وہ یہ لذت ایک دفعہ پھر پائے. جو اس نے پہلی دفعہ قتل ہونے پر محسوس کی تھی.

برزخی زندگی کی شان یہ ہے کہ وہاں ایک دفعہ کا کیا وضوء (جو انبیاء کو بعد الوفات غسل کی صورت میں کرایا جاتا ہے) قیامت تک کی نمازوں کے لیے کافی ہے.

جس اعتبار سے دنیوی زندگی بہتر و برتر تھی اس اعتبار سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی زندگی میں ہیں اور جس اعتبار سے برزخی زندگی اعلیٰ و الطف ہے. اس اعتبار سے آپؐ برزخی زندگی میں ہیں. تاہم آپ کی اس زندگی کو ہم دنیوی بالمعنی المتبادر نہیں کہتے. اگر دنیوی کہتے بھی ہیں تو بالعمل المتواترِ کے اعتبار سے کہتے ہیں جو آپ کو عالم برزخ میں بے شک حاصل ہے.

برزخی زندگی کی یہ آہٹ کہاں تک پہنچتی ہے

شہداء اللہ کی راہ میں کٹ کر ہمیشہ کی زندگی پا چکے ہیں۔ انہیں اموات کہنا اب منع ہے۔ وہ احیاء (زندہ) ہیں۔ عالم برزخ میں وہ زندوں والے اعمال کا تسلسل دیئے گئے ہیں انبیائے کرام بھی عالم برزخ میں جسمانی حیات رکھتے ہیں اور ان کے اعمال بھی باقی ہیں اور اُن کی حیات کا بھی کسی تاویل سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ شہداء کی روحوں کو سبز پرندوں کا سا جسد ملتا ہے اور وہ آسمانوں میں سیر کرتی ہیں۔ ملاء اعلیٰ میں گھومتی ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا وہ برزخی پردے میں کبھی زمین تک آسکتی ہیں یا نہیں؟ اس کے انکار پر کوئی دلیل ہماری نظر سے نہیں گزری۔ ہاں کسی جانے والے کا اس عالم (دُنیا) میں آنا ممکن نہیں۔ عالم ان کا دوسرا ہے تو پھر کسی کا یہاں آنا منع نہیں۔ جسے اللہ تعالیٰ چاہے یہاں تک کی سیر بھر کرا دے۔

پھر انبیاء علیہم السلام کا مرتبہ تو ان سے بھی اونچا اور اعلیٰ ہے۔ کیا برزخی سیر کے لیے ان کی روحوں پر آسمان و زمین کے دروازے بند ہیں؟ اور کیا حضورؐ نے اس دنیوی زندگی میں دو قبروں کے پاس سے گزرتے ہوئے اُن کی برزخی آوازیں نہ سُنی تھیں؟ کیا اعمالِ برزخ کا ظہور کبھی اس زمین پر نہیں ہو سکتا؟ کیوں نہیں۔

سو اگر روایات میں انبیاء علیہم السلام کا برزخی پردے میں یہاں آنا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا انہیں دیکھ پانا مل جائے تو ہمارے پاس کوئی ایسی شرعی دلیل نہیں جو اس کے تسلیم کرنے میں ہمیں مانع ہو۔ یہ ان کا اس عالم میں آنا شمار نہیں ہوگا۔ یہ اس زمین کی ایک برزخی سیر ہے جو عالم برزخ میں وقوع میں آرہی ہے۔

انبیاء کا سلسلۂ عمل رُکا نہیں

احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا سلسلۂ عمل رُکا نہیں۔ ان کی طاعات برابر جاری ہیں۔ صرف یہ ہوا کہ وہ موت کا پُل عبور کرنے سے ہماری آنکھوں سے اوجھل کر دیئے گئے ہیں اور اب ان کے چلنے پھرنے کا جہاں یہ دُنیا نہیں عالم برزخ ہے وہ ایک انداز سے ان قبروں میں ہیں اور ایک جہت ان کی برزخی وسعت ہمارے ادراک سے بالا ہے۔ وہ کبھی اس زمین پر دکھائی بھی دیں تو یاد رکھیے اللہ رب العزت نے ان پر برزخی سیر کے دروازے کھول رکھے ہیں۔ شہداء کے لیے اگر سیرگاہیں کھلی ہیں تو انبیاء کے لیے اس وسعت میں کونسا شرعی قاعدہ مانع ہے۔

انبیاء کا برزخی پردے میں یہاں آنا

حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں:۔

سرنا مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بین مکہ والمدینة فمررنا بواد فقال ای واد ھذا فقالوا وادی الازرق فقال کانی انظر الی موسیٰ فذکر من لونہ وشعرہ شیاء[1]

ترجمہ۔ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکہ اور مدینہ کے درمیان گزر رہے تھے۔ ہم ایک وادی کے پاس سے گزرے تو آپ نے پوچھا یہ کون سی وادی ہے۔ صحابہؓ نے عرض کی وادی ازرق۔ آپ نے فرمایا میں گویا یہاں موسےٰ کو دیکھ رہا ہوں۔ آپ نے پھر ان کے رنگ اور ان کے بال بھی بتائے کہ وہ کیسے ہیں۔

---

[1] صحیح مسلم جلد ۱ صفحہ ۹۵

حضورؐ کا حضرت موسٰے کے رنگ اور بالوں کا ذکر کرنا اس تاکید میں تھا کہ آپ نے واقعی انہیں ہی دیکھا ہے۔ عارضی اور مثالی ابدان کے حلیے اور نقشے اس طرح بیان نہیں کئے جاتے اور انبیاء سابقین کا اپنے اصلی اجساد سے یہاں آنا محدثین کے ہاں کوئی امر ممنوع نہیں ہے وہ برابر اس احتمال کو جگہ دیتے ہیں۔[1]

صحیح بخاری میں ہے:۔

اما موسی کانی انظر الیه اذا انحدر فی الوادی یلبی۔[2]

ترجمہ: موسٰے کو تو گویا میں دیکھ رہا ہوں۔ آپ وادی میں اترتے لبیک کہہ رہے ہیں۔

یہ لبیک کہنا اعمال عمرہ و حج میں سے ہے۔ ظاہر ہے کہ ان اعمال کی زمین یہ دنیوی زمین ہی ہے۔ حمد و ثنا کے نغمے تو جنت میں بھی ہوں گے۔ لیکن طواف عمرہ کعبہ کے سوا کہیں نہیں اور حج عرفات کے سوا کہیں نہیں۔ حضرت موسٰے علیہ السلام کا لبیک کہتے ہوئے دکھائی دینا بتلاتا ہے کہ اس برزخی زندگی میں اُن کے یہاں کے بعض اعمال برابر جاری ہیں اور ان کی ہمیں مخبرِ صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے۔ انبیاء علیہم السلام اپنے ان اعمال کو پورے حسی طور پر عمل میں لاتے ہیں اور گو وہ اپنی قبر کی زندگی میں ہیں۔ لیکن اس کی وسعت انہیں ان اعمال سے مانع نہیں ہے۔

دسویں صدی کے مجدد سیدنا ملا علی القاری علیہ رحمۃ ربہ الباری دوسری حدیث فاذا موسٰی قائم یصلی فی قبرہ کی شرح میں لکھتے ہیں:۔

فان حقیقة الصلٰوة وهی الاتیان بالافعال المختلفة انما تكون بالاشباح لا بالارواح فقط۔[3]

ترجمہ: نماز کی شرعی حقیقت مختلف کاموں کو عمل میں لانا ہے اور اعمال بجالانا ابدان

---

[1] دیکھئے فتح الباری جلد ۷ صفحہ ۱۴۷ [2] صحیح بخاری جلد ا صفحہ ۲۱۰ [3] مرقات جلد ۱۱ صفحہ ۱۵۶

سے ہوتا صرف ارواح سے نہیں۔

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت یونس علیہ السلام کے بعد الموت حج کرنے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

الانبیاء احیاء عند ربھم یرزقون فلا مانع ان یحجون قال القرطبی حببت الیھم العبادۃ فھم یتعبدون بما یجدون من دواعی انفسھم[1]

ترجمہ۔ انبیاء اپنے رب کے ہاں زندہ ہیں انہیں رزق بھی دیا جاتا ہے ——— تو یہ بات ناممکن نہیں کہ وہ حج بھی کرتے ہوں۔ علامہ قرطبی کہتے ہیں عبادت کی محبت ان کے دلوں میں ڈال دی گئی ہے اور اب وہ اپنے داعیہ نفس سے اپنے خدا کی عبادت میں لگے رہتے ہیں۔

حضرت امام احمد بن حنبلؒ روایت کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حج کے موقعہ پر وادیٔ عسفان کے پاس سے گزرے تو آپ نے وہاں سے حضرت ہود علیہ السلام اور حضرت صالح علیہ السلام کے گزرنے کی خبر دی۔ آپؐ نے کہا :۔

مر بہ ہود وصالح علیھما السلام علی بکرات خطمھا اللیف ازرھم العباء واردیتھم النمار یلبون یحجون البیت العتیق[2]

ترجمہ۔ حضرت ہود اور حضرت صالح علیہما السلام اونٹوں پہ سوار آپ کے پاس سے گزرے ہیں۔ ان اونٹوں کی مہاریں کھجور کی چھال کی ــــ ان کی لنگیاں ــــ عبار ــــ اور چادریں ــــ اون کی تھیں۔ تلبیہ کہتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے بیت قدیم کا طواف کرنے جا رہے تھے۔

حافظ ابن کثیرؒ (۷۷۴ھ) لکھتے ہیں :۔

اسنادہ حسن۔[3]

---

[1] فتح الملہم جلد ا صـ۳۳۰ [2] رواہ ابو یعلیٰ والطبرانی ایضاً [3] البدایہ والنہایہ جلد ا صـ۱۳۸

محدث شہیر حافظ ابو یعلیٰ (م ۳۰۷ھ) حضرت نوح علیہ السلام کا نام بھی ذکر کرتے ہیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نام بھی لیتے ہیں[۱]

ان روایات سے پتہ چلتا ہے کہ انبیاء کرام کے اعمال طاعت جاری ہیں اور وہ کبھی اپنی برزخی سیر میں اس زمین پر بھی آنکلتے ہیں۔ تاہم ان کا جہاں عالم برزخ میں رہتا ہے نہ کہ یہ جہان معراج کی رات جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سرخ ٹیلے کے پاس حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی قبر میں نماز پڑھتے دیکھا تو آپ خود حیرت میں تھے۔ آپ اس عالم (برزخ) میں ــــ نگاہوں کو تردد ہو رہا تھا کہ وہ واقعی وہی ہیں یا اور ــــ کبھی فرماتے کانی انظر الیہ۔ گویا میں انہی کو دیکھ رہا ہوں۔

اللہ رب العزت نے فرمایا:۔

ولقد اٰتینا موسی الکتٰب فلا تکن فی مریۃ من لقآئہ۔

(پ ۲۱، السجدہ۔ آیت ۲۳)

ترجمہ۔ اور ہم نے دی موسیٰ کو کتاب سو آپ اس کی ملاقات میں کسی شک میں نہ پڑیں۔

شیخ الاسلام حضرت علامہ عثمانیؒ لکھتے ہیں:۔

تم جو موسیٰ سے شب معراج میں ملے تھے وہ سچی حقیقت ہے کوئی دھوکہ یا نظر بندی نہیں[۲]

یہ اس صورت میں ہے کہ یہ آیت واقعہ اسراء کے بعد نازل ہوئی ہو۔ اگر پہلے نازل ہوئی تو یہ ایک وعدہ ہے جو آپ کو دیا گیا اور لیلۃ الاسراء میں اسے پورا کیا گیا۔

جب آپ کی ملاقات حضرت موسیٰؑ سے ہوئی تو اس کے بعد آپ کی ملاقات پوری جماعت انبیاء سے بھی ہوئی۔ مگر قبر میں نماز پڑھتے آپ نے حضرت موسیٰؑ کو ہی پایا تھا۔

---

[۱] دیکھئے البدایہ جلد ۱ صفحہ ۱۱۹ [۲] تفسیر عثمانی صفحہ ۵۴۷

حضرت علامہ انور شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:۔

ان کثیراً من الاعمال قد ثبتت فی القبور کالاذان والاقامۃ عند الدارمی و قراءۃ القرآن عند الترمذی[1]

ترجمہ۔ بہت سے اعمال قبروں میں بھی ثابت ہیں سنن دارمی کی روایت میں اذان اور اقامت کا قبر میں ہونا مذکور ہے اور ترمذی کی روایت میں قبر میں سے قرآن کی آواز سنائی دے رہی ہے۔

حیاتِ انبیاء کا معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

اراد بالحیوۃ فعل الاعمال واکثر من فی القبور فی العطلۃ بخلاف المقربین[2]

ترجمہ۔ حدیث میں حیات سے مراد فعل اعمال ہے (زندوں کے سے اعمال کا باقی رہنا) اور اکثر لوگ جو قبروں میں ہیں ان کے اعمال تعطل میں ہیں بخلاف مقربین۔

اعمال کے بارے میں ملا علی قاریؒ تصریح فرما چکے ہیں کہ وہ ابدان سے وقوع میں آتے ہیں صرف ارواح سے نہیں مگر ان اعمالِ حیات سے خالی ہیں لیکن مقربین کی یہ بات نہیں:۔

الاتیان بالافعال المختلفۃ انما تکون بالاشباح لا بالارواح[3]

ترجمہ۔ یہ مختلف قسم کے افعال بجالانا ابدان سے ہی ہو سکتا ہے — صرف ارواح سے نہیں۔

حیاتِ شہداء کی بحث میں حیاتِ انبیاء کی یہ بحث ضمناً آگئی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ حیاتِ انبیاء ایک برزخی حقیقت ہے جس کا انکشاف بارہا یہاں کی تیز آنکھوں کو ہوا اور انہوں نے جو کچھ دیکھا بتا دیا اور پھر قرآن کریم نے بھی ان کی تصدیق کر دی۔ اس کے بعد ہمارے

---

[1] فیض الباری جلد ۱ ص ۱۸۳ [2] تحیۃ الاسلام ص ۳۶ [3] مرقات جلد ۱ ص ۱۵۷

یہ کرم فرما معلوم نہیں اور کس دلیل پر ایمان لائیں گے۔ فبای حدیث بعدہ یؤمنون۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پہلے انبیاء سے ملاقات

ہم حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت ابراہیم علیہم السلام کا برزخی پردے میں زمین پر آنا اور حضورؐ کا انہیں دیکھ پانا پہلے ذکر کر آئے ہیں۔ ان میں موسےٰ علیہم السلام کی ملاقات بہت اہم ہے۔ کیونکہ اس کے بارے میں قرآن کریم میں صراحت سے کہا گیا ہے:۔

فلا تکن فی مریۃ من لقآئہ۔ (پ ۲۱: السجدہ۔ آیت ۲۳)

ترجمہ۔ آپ ان سے ملاقات کے بارے میں کسی شک و تردد میں نہ پڑیں۔

بیت المقدس میں معراج کی رات انبیاء کرام اسی طرح لائے گئے تھے جس طرح ارواح الشہداء سبز پرندوں کے قالب میں آسمانوں پر سیر کرتی ہیں۔ برزخی سیر میں کبھی زمین پر آجاتے ہیں۔ پھر جب ان انبیاء نے حضورؐ کے ساتھ نماز بھی پڑھی اور نماز زندہ جسد کو چاہتی ہے اور بدن کے بغیر یہ عمل ترتیب نہیں پا سکتا۔ تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کے اجساد کون سے تھے۔

جس طرح شہداء کی روحیں سبز پرندوں کے قالب میں متجسد ہوتی ہیں۔ انبیاء کی ارواح ان نبیوں کی اصلی صورت میں متجسد ہوئیں یا انبیاء کرام کی اس رات تشریف آوری اپنے ارواح و اجساد کے ساتھ تھی۔

محدثین نے یہاں دونوں احتمال ذکر کئے ہیں۔ ہو سکتا ہے صرف ارواح کی آمد ہو اور ہو سکتا ہے انبیاء کرام اپنے اجسادِ اصلیہ کے ساتھ برزخ کے پردے میں یہاں پہنچے ہوں اور ان کی تشریف آوری ارواح و اجسام دونوں سے ہو۔

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ (۸۵۲ھ) لکھتے ہیں:۔

واما الذین صلوا معہ فی البیت المقدس فیحتمل الارواح خاصۃ ویحتمل الاجساد بارواحہا۔[1]

---

[1] فتح الباری جلد ۷، ص ۱۴۷

ترجمہ. وہ انبیاء جنہوں نے اس رات حضورؐ کے ساتھ بیت المقدس میں نماز پڑھی ہو سکتا ہے کہ وہاں صرف روحیں متجسد ہوئی ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ارواح مع الاجساد یہاں آئی ہوں.

ان ارواحهم تشكلت بصورة اجسادهم او احضرت اجسادهم لملاقاة النبي صلى الله عليه وسلم تلك الليلة تشريفاً و تكريماً و يؤيده حديث عبدالرحمٰن بن هاشم عن انس نفيه و بعث له آدم و من دونه من الانبياء.[1]

ترجمہ. ان کی روحیں ان کی صورتوں میں متشکل ہوئی ہوں یا اس رات ان کے اصل اجساد ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات کے لیے حاضر کر دیئے گئے ہوں دونوں باتیں ہو سکتی ہیں ایسا حضورؐ کی تشریف و تکریم کے لیے ہوا اور اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے. حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ آپ کے لیے حضرت آدم اور دوسرے سب انبیاء اٹھائے گئے (حاضر کئے گئے).

اس سے پتہ چلتا ہے کہ حافظ ابن حجرؒ دوسرے احتمال کے مؤید ہیں کہ اس رات انبیاء کرام حضورؐ کے اعزاز و اکرام میں اپنے اصل اجساد کے ساتھ یہاں آئے. عالم برزخ میں ان اجساد کو اتنی لطافت ملی ہوئی ہے کہ وہ لمحوں میں یہ فاصلے طے کر پاتے ہیں. یہ کوئی تعجب کی بات نہیں جو لوگ تختِ بلقیس کا آنکھ جھپکنے میں آ پہنچنا مان سکتے ہیں. وہ قدرتِ ایزدی سے ان انبیاء کے یہاں آنے اور جانے میں کبھی کوئی شک نہیں کر سکتے. تخت تو لکڑی کا تھا جس میں نہ کبھی کوئی روح رہی نہ اس نے کوئی لطافت پائی اور وہ آنا بھی عالم دنیا میں تھا. لیکن انبیاء کرام کی یہ آمد تو برزخی پردے میں ہے کیا برزخ میں بھی ان کے اجساد ایسی لطافت نہیں پا سکتے کہ آنکھ جھپکنے میں وہ اپنی قبور سے آئیں بھی اور باذنِ الٰہی پھر وہاں جا بھی پہنچیں — اللہ

---

[1] فتح الباری جلد ۷، ص۱۴۷

یہ فاصلہ اور آنا جانا یہاں کے کسی دوسرے شخص کو محسوس و مشاہد نہ ہو. جن کی برزخ کے عجائب پر نظر ہے وہ کبھی ان امور کا انکار نہیں کر سکتے۔

انبیاء کا اصلی اجساد کے ساتھ یہاں آنا کوئی ایسی بات نہیں کہ محدثین نے لسے اپنے ہاں کوئی جگہ نہ دی ہو. جو لوگ ان حقائق کو استہزاء سے ٹھکراتے ہیں وہ آخرت کی جوابدہی کے لیے تیار رہیں. یاد رہے کہ بیت المقدس میں ان کی ملاقات کے لمحے تھے ——— اور آسمانوں پر ان کی ملاقات کے لمحے اور تھے ——— تو ان میں سے کوئی بات خلافِ عقل نہیں اور احادیث میں یہ ملاقاتیں ثابت ہیں تو ان واردات کا کیسے انکار کیا جا سکتا ہے:۔

صلوٰتھم فی اوقات مختلفۃ وفی اماکن مختلفۃ لایردہ العقل وثبت بہ النقل فدل ذلک علی حیاتھم۔[1]

ترجمہ. ان کی (بیت المقدس میں) نماز اور وقتوں میں تھی اور (یہ امور) مختلف مقامات سے تعلق رکھتے ہیں عقل ان کا انکار نہیں کرتی اور نقل سے یہ بات ثابت ہے تو یہ اس پر دلالت ہے کہ انبیاء علیہم السلام زندہ ہیں.

ملاقاتِ انبیاء پر قرآن کی شہادت

اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک ایسا حکم دیا جس پہ بدوں اس کے عمل نہیں ہو سکتا کہ آپ کی ان اپنے سے پہلے کے انبیاء کے ساتھ ملاقات ہو اور آپ ان سے اپنے عقیدہ کی تائید حاصل کریں. ارشاد ہوتا ہے:۔

واسئل من ارسلنا من قبلک من رسلنا أجعلنا من دون الرحمٰن اٰلھۃ یعبدون۔ (پ ۲۵ : زخرف. ع ۴ آیت ۴۵)

ترجمہ. اور پوچھ دیکھ ان سے جن کو ہم نے تجھ سے پہلے رسول بنا کر بھیجا کیا ہم

---

[1] فتح الباری کتاب الانبیاء ۱۳پ ص مصر ص۲۷۸ دہلی

نے بنائے ہیں رحمٰن کے سوا اور معبود جو پوجے جائیں۔

حضورؐ کو جب ان سے پوچھنے کا مکلف فرمایا تو لازم ہوا کہ آپ کی کبھی نہ کبھی ان سے ملاقات ہو۔ یہ اس آیت کا ظاہر ہے۔

کچھ دوسرے علماء ہیں جنہوں نے آیت کو مجازی معنی پر لاکر یہ تفسیر کی کہ اس میں خود ان انبیاء سے پوچھنا مطلوب نہیں۔ ان کی کتابوں اور امتوں سے دریافت کرنا مراد ہے کہ کبھی کسی پیغمبر نے بھلا شرک کی اجازت دی ہے۔

شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے اس کے حقیقی اور مجازی دونوں معنی بیان کیے ہیں:۔

یہ ارشاد کہ پوچھ دیکھو یعنی جس وقت ان سے ملاقات ہو جیسے شب معراج میں ملاقات ہوئی یا اُن کے احوال کتابوں سے تحقیق کرو جو ذرائع تحقیق و تفتیش کے ہوں اُن کو استعمال میں لانے سے صاف ثابت ہو جائے گا کہ کسی دین سماوی میں کبھی شرک کی اجازت نہیں ہوئی۔[1]

اول معنی حقیقی اور ظاہر معنی ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے بھی اُنہی کی تائید ہوتی ہے۔ دوسرے معنی مجازی ہیں جن میں صرف عن الظاہر کرنا پڑتا ہے۔ علامہ قرطبی (۶۷۱ھ) نے بعض روایات نقل کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے انبیاء علیہم السلام کی امامت کرنے کے بعد اُن سے یہی بات پوچھی[2] ـــــ ان روایات کی سند ہمیں معلوم نہیں ہو سکی۔

جلالین میں بھی پہلے معنی کو ہی ظاہر معنی کہا گیا ہے:۔

قیل ھو علی ظاھرہ بان جمع لہ الرسل لیلۃ الاسراء وقیل المراد امم من ای اھل الکتابین۔[3]

ترجمہ۔ کہا گیا ہے کہ آیت اپنے ظاہر پر ہے وہ یہ کہ تمام پیغمبر آپ کے لیے معراج کی رات

---

[1] تفسیر عثمانی ص ۶۲۹ [2] دیکھیے تفسیر قرطبی جلد ۱۶ ص ۹۴ [3] تفسیر جلالین ص ۶۵۱ مصر

جمع کئے گئے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد اہل کتاب کی امتیں ہیں یعنی یہ کہ آپ ان کی امتوں سے پوچھ دیکھیں۔

جلالین میں دوسرے مقام پر صریح لفظوں میں اسے لیلۃ الاسراء کی ملاقات قرار دیا ہے۔

فلا تکن فی مریۃ (شک) من لقائہ وقد التقیا لیلۃ الاسراء۔[1]

ترجمہ۔ سو آپ موسیٰ کی ملاقات میں شک نہ کریں اور یہ دونوں (حضورؐ اور حضرت موسیٰ) لیلۃ الاسراء میں ملے تھے۔

حافظ ابن کثیرؒ بھی اسی کی تائید کرتے ہیں۔

وفی الجلالین قیل ھو علی ظاھرہ بان جمع لہ الرسل لیلۃ الاسراء[2]

ترجمہ۔ اور جلالین میں ہے کہ اسے اپنے ظاہر پر بتلایا گیا ہے یہ کہ معراج کی رات آپ کے لیے تمام پیغمبر اکٹھے کیئے گئے تھے۔

پرانے ادیان میں غور کرنے کا حکم یہ پہلی آیت کے مجازی معنی ہیں۔ حقیقی معنی مراد لیا جا سکے تو مجازی معنی اختیار نہ کرنے چاہیئں۔ شیخ محمد علی الصابونی اس دوسرے معنی کو مجازی قرار دیتے ہیں یہ ظاہری معنی نہیں ہیں:

والسوال ھٰھنا معجاز عن النظر فی ادیان الانبیاء۔[3]

ترجمہ۔ انبیاء سے سوال کرنا ان کے ادیان میں غور کرنے کی ایک مجازی تعبیر ہے۔

تفسیر قرآن کا ایک اصول یاد رکھیئے۔ امام فخرالدین رازیؒ (۶۰۶ھ) لکھتے ہیں:۔

القانون انہ یجب حمل کل لفظ ورد فی القرآن علی حقیقتہ الا اذا قامت دلالۃ عقلیۃ قطعیۃ توجب الانصراف عنہ ومن لم یعرف شیئا لم یخض فیہ۔[4]

---

[1] تفسیر جلالین صفحہ ۵۵ [2] جلد صفحہ ۷۹ [3] تفسیر صفوۃ التفاسیر جلد ۲ صفحہ ۱۵۹
[4] تفسیر کبیر جلد ۲ صفحہ ۵

ترجمہ۔ اصول یہی ہے کہ قرآن کریم میں جو لفظ وارد ہوا اسے اس کے حقیقی معنوں پر محمول کیا ہے جب تک کہ ایسی قطعی دلالت قائم نہ ہو جو اسے اس کے اصلی معنوں سے ہٹانا ضروری قرار دے اور جو کسی چیز کو سمجھا ہی نہیں وہ اس کی گہرائی میں کیسے اُترے گا۔

علامہ بغویؒ (۵۱۶ھ) لکھتے ہیں:۔

فلما فرغ من الصلوٰۃ قال له جبریل اسئل یا محمد من ارسلنا فهکذا قول الزهری وسعید بن جبیر وابن زید قالوا جمع له الرسل لیلة الاسراء وامران یسأل۔[1]

ترجمہ۔ جب آپ نماز سے فارغ ہوتے تو جبریل نے آپ سے (خدائی حکم پہنچاتے ہوئے) کہا اے میرے رسول! جو رسول ہیں نے پہلے بھیجے ہیں آپ ان سے پوچھ دیکھیں۔ زہری، سعید بن جبیر، ابن زید کی یہی رائے ہے یہ کہتے ہیں آپ کے لیے تمام رسول معراج کی رات جمع کئے گئے اور آپ کو کہا گیا کہ آپ ان سے پوچھ دیکھیں۔

عن سعید بن جبیر قال لیلة اسری به لقی الرسل وفیه........ واسئل من ارسلنا۔[2]

ترجمہ۔ حضرت سعید بن جبیر سے روایت ہے وہ کہتے ہیں جس رات حضورؐ کو معراج کی سیر کرائی گئی آپ سب رسولوں سے ملے اور اس آیت میں ہے آپ ان سے جو ہم نے پہلے بھیجے، پوچھ دیکھیں۔

قاضی ثناء اللہ صاحبؒ (۱۲۲۵ھ) بھی یہی معنی کرتے ہیں:۔

---

[1] معالم التنزیل جلد ۔ [2] درمنثور ۱۹

عن ابن عباسؓ قال لما اسریٰ بالنبی صلی اللہ علیہ وسلم بعث اللہ لہ آدم واولادہ من المرسلین الیٰ ان قال جبریل تقدم یا محمد فصلّ بہم فلما فرغ من الصلوٰۃ قال جبریل سل یا محمد من ارسلنا[1]

ترجمہ۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج کی سیر کرائی گئی تو حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد میں سے کے تمام انبیاء بھیجے گئے یہاں تک کہ جبریل نے کہا حضورؐ! آگے بڑھیں۔ پس آپ نے انہیں نماز پڑھائی جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو جبرئیل نے حضورؐ سے کہا۔ آپ ان سے پوچھ دیکھیں۔

قاضی شوکانیؒ (۱۲۵۵ھ) کی تصریح بھی سُن لیجئے:۔

واسئل من ارسلنا..... الاٰیۃ قال الزہری وسعید بن جبیر وابن زید ان جبریل قال ذلک للنبی صلی اللہ علیہ وسلم لما اسریٰ بہ فالمراد سوال الانبیاء فی ذٰلک الوقت عند ملاقاتہ بہم صلی اللہ علیہ وسلم وبہ قال جماعۃ من السلف[2]

ترجمہ۔ اور آپ پوچھ دیکھیں ان سے جنہیں ہم نے رسول بنا کر بھیجا زہری۔ سعید بن جبیر اور ابن زید کہتے ہیں جب حضورؐ کو معراج کی سیر کرائی گئی تو جبریل نے حضورؐ سے یہ بات کہی سو اس سے مراد ان پیغمبروں سے ملاقات کے وقت آپ کا ان سے سوال کرنا ہے اور یہی تفسیر سلف کی ایک جماعت نے کی ہے۔

علامہ محمود آلوسیؒ (۱۲۷۰ھ)

---

[1] تفسیر مظہری جلد ۸ ص۳۲۵ [2] فتح القدیر ص۵۵۷

اخرج الطبرانی و ابن مردویہ وایضًا فی المختارۃ بسند صحیح عن ابن عباس انہ قال فی الایۃ ای من لقاء موسیٰ واخرج ابن ابی حاتم عن ابی العالیہ انہ قال کذٰلک فقیل لہ اوتی علیہ الصلوٰۃ والسلام موسیٰ قال نعم الا تریٰ الی قولہ تعالیٰ واسئل من ارسلنا ... اراد بذٰلک لقاءہ صلی اللہ علیہ وسلم ایاہ لیلۃ الاسراء کما ذکر فی الصحیحین و غیرھما وروی نحو ذٰلک عن قتادۃ وجماعۃ من السلف وقال لہ المبروحین امتحن الزجاج بھٰذہ الاٰیۃ وکان المراد من قولہ فلا تکن فی مریۃ من لقائہ علیٰ وعدہ تعالیٰ بنبیہ علیہ الصلوٰۃ والسلام بلقاء موسیٰ وتکون الاٰیۃ نازلۃ قبل الاسراء[1]

ترجمہ طبرانی اور ابن مردویہ حضرت ابن عباسؓ سے سند صحیح سے نقل کرتے ہیں آپ نے اس آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ملاقات تسلیم کی ہے اور ابن ابی حاتم ابو العالیہ (۹۰ھ) سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے بھی ایسا ہی کہا ہے۔ آپ سے پوچھا گیا کیا واقعی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ملاقات ہوئی؟ آپ نے کہا ہاں کیا تم قرآن کریم میں اس آیت کو نہیں دیکھتے واسئل من ارسلنا اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ان سے معراج کی رات ملاقات کرنا مراد ہے جیسا کہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم اور دوسری کئی کتابوں میں مذکور ہے۔ حضرت قتادہ (۱۱۸ھ) اور سلف صالحین کی ایک جماعت یہی کہتی ہے۔ علامہ مبروکی رائے بھی یہی ظاہر ہوئی۔ جب آپ نے زجاج کا اس آیت میں امتحان لیا اور یہی مراد الٰہی ہے اور اس آیت میں فلا تکن فی مریۃ من لقائہ (آپ ان کی ملاقات میں شک نہ کریں یہ ہو کر رہے گی) اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو موسیٰ سے ملاقات کرانے کا وعدہ دیا تھا۔ یہ آیت واقعہ معراج سے پہلے نازل ہوئی تھی (سو یہ ایک وعدہ تھا جو معراج کی رات پورا ہوا)۔

---

[1] روح المعانی جلد ۲۱ ص ۱۳۷

عن قتادة قال سألهم ليلة اسریٰ به لقی آدم وخازن النار قلت هذا هو الصحیح فی تفسیر هذه الآیه.[1]

ترجمہ۔ حضرت قتادہ سے مروی ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ان انبیاء سے سوال کرنا معراج کی رات وقوع میں آیا تھا۔ آپ آدم علیہ السلام سے ملے میں (فخرالدین الرازی) کہتا ہوں اس آیت کی تفسیر میں صحیح بات یہی ہے

ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی تفسیر اس ملاقات کا پتہ دیتی ہے اور آیت بھی اپنے ظاہری اور حقیقی معنی پر رہتی ہے۔

قتادہ (۱۱۸ھ) سعید بن جبیر (۹۵ھ) زہری (۱۲۴ھ) ابو العالیہ (۹۰ھ) جیسے اکابر جو تفسیر میں صحابہ کرامؓ کے براہ راست شاگرد ہیں وہ اسی تفسیر کو ترجیح دیتے ہیں۔

تیسری صدی کے محدثین امام احمد (۲۴۱ھ) امام بخاری (۲۵۶ھ) امام مسلم (۲۶۱ھ) وغیرہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ان انبیاء سے ملاقات سند صحیح سے روایت کرتے ہیں۔

چوتھی صدی کے امام طحاوی (۳۲۱ھ)

پھر امام بیہقی (۴۵۸ھ) بغوی (۵۱۶ھ) امام نسفی (۵۳۷ھ) امام رازی (۶۰۶ھ)

پھر ساتویں صدی کے امام نووی (۶۷۶ھ) قرطبی (۶۷۱ھ)

پھر آٹھویں صدی کے علامہ خازن (۷۴۱ھ) اور حافظ ابن کثیر (۷۷۴ھ)

نویں صدی کے حافظ ابن حجر (۸۵۲ھ)

دسویں صدی کے امام سیوطی (۹۱۱ھ) اور ملا علی قاری (۱۰۱۴ھ)

گیارہویں صدی کے شیخ عبدالحق محدث دہلوی (۱۰۵۲ھ)

بارہویں صدی کے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (۱۱۷۶ھ)

تیرہویں صدی کے قاضی ثناء اللہ (۱۲۲۵ھ) شوکانی (۱۲۵۵ھ) اور علامہ آلوسی (۱۲۷۰ھ)

---

[1] تفسیر کبیر امام رازی جلد ۷ صفحہ ۴۳ مدارک صہ قرطبی جلد ۱۲ صفحہ ۹۴

اور چودھویں صدی کے جلیل القدر مفسر شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی[1]

یہ مفسرین حضرات قرآن کی آیت واسئل من ارسلنا کے اس ظاہر معنی کو مسلسل اور متواتر نقل کرتے چلے آ رہے ہیں اور بیشتر حضرات اس کی بھی صراحت کرتے جاتے ہیں کہ انبیاء کرام کی یہ اقتداء اور حضورؐ سے ملاقات صرف ان کی ارواح سے نہیں ارواح و اجساد سے بھی اور برزخ میں ان کے اجسادِ کریمہ پیرایہ اطاعت میں وہاں پہنچے ہوئے تھے۔

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ متاخرین میں کچھ ایسے مفسر بھی ہوئے جو اس آیت کو اس کے ظاہر معنی سے پھیر کر اسے مجازی معنوں پر محمول کرتے ہیں لیکن اس سے آپ کو اتنی بات تو تسلیم کر لینی چاہیئے کہ اگر انبیاء کرام اپنے ارواح و اجساد کے ساتھ اس رات حضورؐ سے ملے ہوں اور یہ سب اللہ رب العزت کی قدرت سے ظہور میں آیا ہو تو یہ کوئی شرک کی بات نہیں ہے کہ اس کی تردید اور اس مُوقف سے استہزاء کیئے بغیر ان معتزلہ کا عقیدہ توحید ہی قائم نہ ہوتا ہو۔ اسلاف کے کسی موقف سے گو اس میں آپ کو ان سے اختلاف ہی کیوں نہ ہو اس قدر وحشت کا اظہار صحیح نہیں کہ آپ کو ان کا عقیدہ توحید ہی متزلزل دکھائی دے۔

الحذر الحذر اے چیرہ دستاں الحذر

جو علماء انبیاء علیہم السلام کی اس رات ابدان سے حاضری کے قائل ہیں جب وہ بھی دوسرا قول کہ ان کی ارواح متشکل ہوئی ہوں اسے ساتھ نقل کرتے ہیں تو تعجب ہے کہ آج دوسرے موقف کا عقیدہ رکھنے والے اس ظاہر معنی قرآن کے نقل تک کی جرأت وہمت نہیں کرتے؟ محض اس لیے کہ کہیں ان کے معتقد ان سے بگڑ نہ جائیں۔

دسویں صدی کے علامہ سیوطیؒ (۹۱۱ھ) اور ملا علی قاریؒ (۱۰۱۴ھ) کا پیرایہ بیان ملاحظہ

---

[1] ولقد آتینا موسی الکتاب فلا تکن فی مریة من لقائه قال قد کان قتادہ یفسرھا ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال قد لقی موسیٰ لیلة الاسراء . . . ووافقه علیه جماعة منھم المجاھد والکلبی والسدی۔ (فتح الملھم جلد ۱ صفحہ ۳۲۹)

فرمائیں. کیا انہوں نے دونوں قول ذکر نہیں کیئے. ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں :-

قال الحافظ السیوطی استشکل رؤیة الانبیاء فی السموات مع ان اجسادهم مستقرة فی قبورهم واجیب بان ارواحهم تشکلت بصور اجسادهم اذا حضرت اجسادهم لملاقاة النبی صلی الله علیه وسلم تلك اللیلة تشریفا وتکریما له.[1]

ترجمہ. حافظ جلال الدین سیوطی کہتے ہیں (حضور کی) ان انبیاء کرام سے آسمانوں پہ ملاقات پر ایک اشکال وارد ہے. ان کے اجساد عنصری تو ان کی قبور میں ہیں (پھر ان سے آسمانوں پر ملاقات کیسے) اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ ہو سکتا ہے ان کی ارواح خود ان کے اجسام کی صورتیں متشکل ہو گئی ہوں یا ان کے اجساد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات کے لیے اور آپ کی تشریف و تکریم کے لیے (ان کی قبروں سے) یہاں لا حاضر کیے گئے ہوں.

کیا یہ اللہ رب العزت کی قدرت سے بعید ہے کہ انہیں ان کی قبروں سے یہاں لا حاضر کرے؟ پھر ذرا آگے جا کر لکھتے ہیں :-

الذین صلوا معه فی بیت المقدس ..... ثم اجسادهم کارواحهم لطیفة غیر کثیفة فلا مانع لظهورهم فی عالم الملك والملکوت علی وجه الکمال بقدرة ذو الجلال ..... فان حقیقة الصلوٰة وهی الاتیان بالافعال المختلفة انما تکون بالاشباح لا بالارواح.[2]

ترجمہ. جن حضرات نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس رات نماز پڑھی ..... پھر ان کے اجسام بھی تو ان کے ارواح کی طرح لطیف ہیں کچھ کثیف نہیں ہو یہ نا ممکن نہیں کہ وہ اس عالم ملکوت میں اللہ ذوالجلال کی قدرت سے اس کامل پیرایہ میں (روح و بدن کے ساتھ) وہاں پہنچیں ..... نماز کی حقیقت

---

[1] مرقات جلد ۱۱ صفحہ ۱۵۶ [2] صفحہ ۱۵۷

اس کے مختلف افعال کو وجود میں لانا ہے اور یہ اجسام سے ہی ہو سکتا ہے نہ کہ صرف ارواح سے۔

یہ حضورؐ کی پہلے انبیاء سے شفاھًا ملاقات تھی یہ کوئی خواب کی بات نہیں حضورؐ کی دنیوی زندگی تھی اور ان کی برزخی (ماسوائے حضرت عیسیٰ کے) اور یہ قدرتِ خداوندی کے عجائب ہیں جنہیں حق سبحانہ وتعالیٰ جب چاہتے ہیں اپنے کسی بندہ پر ظاہر فرما دیتے ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پہلے انبیاء سے ملاقات

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی معراج کی رات جو دوسرے انبیاء سے ملاقات ہوئی اس میں آپ اپنی دنیوی زندگی میں تھے اور وہ حضرات اپنی برزخی زندگی میں، پھر آپ جب نزول فرمائیں گے تو کیا اُن کی پہلے انبیاء کرام سے کوئی اور ملاقات بھی ہوگی؟

حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب دُنیا میں دوبارہ آئیں گے تو اُن کی بھی پہلے انبیاء سے اس طرح کی ملاقات ہوگی جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت ابراہیم اور حضرت یونس علیہم السلام سے ملاقات فرمائی اور ممکن ہے ان کی یہ ملاقاتیں ان کی قبور پہ ہوں۔ جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کثیبِ احمر کے پاس حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ملاقات ہوئی تھی۔

حافظ سیوطیؒ (۹۱۱ھ) اپنے فتاویٰ میں لکھتے ہیں:-

فکذلك عیسیٰ اذا نزل الی الارض یری الانبیاء ویجمع بھم ومن جملتھم النبی صلی اللہ علیہ وسلم فیاخذ عنہ ما احتاجہ الیہ من احکام الشریعۃ [1]

ترجمہ۔ اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام جب زمین پر اُتریں گے آپ بھی انبیاء علیہم السلام کو دیکھ پایا کریں گے ان کے ساتھ ملیں گے اور انہی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی

---

[1] الحاوی للفتاویٰ جلد ۲ صـ ۲۹۱

ہیں. سو آپ (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے حسب ضرورت آپ کی شریعت کے احکام بھی لیں گے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی روضہ اطہر پر حضورؐ سے ملاقات

حافظ ابو یعلیٰ (۳۰۷ ھ) حضرت ابو ہریرہؓ سے مرفوعاً روایت کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

والذی نفسی بیدہ لینزلن عیسیٰ بن مریم ثم لئن قام علی قبری فقال یا محمد لاجیبتہ۔[1]

ترجمہ. قسم اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے عیسیٰ بن مریم ضرور نازل ہوں گے پھر اگر وہ میری قبر پر آئیں اور مجھے مخاطب کریں تو میں انہیں جواب بھی دوں گا.

علامہ محمود آلوسیؒ (۱۲۷۰ ھ) بھی اسے حافظ ابو یعلیٰؒ سے انہی الفاظ میں نقل کرتے ہیں:-

انہ علیہ السلام یاخذ الاحکام من نبینا صلی اللہ علیہ وسلم شفاھاً بعد نزولہ وھو صلی اللہ علیہ وسلم فی قبرہ الشریف وایدہ بحدیث ابی یعلیٰ والذی نفسی بیدہ لینزلن عیسیٰ بن مریم ثم لئن قام علی قبری وقال یا محمد لاجیبنّہ۔[2]

ترجمہ. حضرت عیسیٰ علیہ السلام بعد نزول ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہو کر آپ سے مواخذہ احکام کریں گے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قبر شریف میں ہیں اور اس کی تائید محدث ابی یعلیٰ کی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے. آپ نے فرمایا. قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے عیسیٰ بن مریم ضرور نازل ہوں گے. پھر آپ اگر میری قبر پر آئیں اور (سلام کہیں)

---

[1] مسند ابی یعلیٰ جلد ۶ صد ۱۰۱ الحاوی جلد ۲ صد ۲۹ [2] روح المعانی جلد ۲۲ صد ۳۵

یا محمد کہیں تو میں ان کو جواب بھی دوں گا۔

حضرت عیسیٰ کی روحانیت اتنی اونچی ہوگی کہ آپ جب چاہیں حضورؐ سے مسئلہ پوچھ لیا کریں گے۔

امام سیوطیؒ نے حافظ ابن عساکرؒ کی یہ روایت بھی نقل کی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا:۔

فلیسلکن فج الروحاء حاجًا او معتمرًا فلیقفن علیٰ قبری فلیسلمن علی ولارُدن علیه۔[1]

ترجمہ۔ حضرت عیسیٰ روحاء کے رستے حج یا عمرے پر چلیں گے اور میری قبر پہ بھی ضرور ٹھہریں گے اور مجھ پر سلام کریں گے اور میں آپ پر سلام لوٹاؤں گا۔

صحیح مسلم میں ہے کہ آپ فج روحاء سے حج یا عمرے کا احرام باندھیں گے۔

لیهلن ابن مریم بفج الروحاء حاجًا او معتمرًا او لیثنیهما[2]

ترجمہ۔ حضرت عیسیٰ فج روحاء کے مقام سے حج یا عمرے کا (احرام باندھیں گے) تلبیہ پکاریں گے یا دونوں کا قران کریں گے۔

اس ملاقات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی دنیوی زندگی میں ہوں گے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی برزخی زندگی میں —— البتہ لیلۃ الاسراء کی ملاقات میں یہ دونوں حضرات اپنی دنیوی زندگی میں تھے —— اور بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ اس رات شرف صحابیت بھی پا گئے۔ کیونکہ صحابی وہ ہے جس نے اپنی دنیوی زندگی میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو (جب کہ آپ بھی اپنی یہاں کی زندگی میں تھے) ایمان کی حالت میں بیداری میں دیکھا ہو اور ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے لیلۃ الاسراء میں حضورؐ کو دیکھا تھا —— مگر آپ چونکہ پھر اپنے آسمانی سفر پہ چلے گئے اس لیے زمین پر افضل الصحابہ کا درجہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا ہی رہا۔

---

[1] الحاوی جلد ۲ ص ۲۹ [2] صحیح مسلم جلد ۱ ص ۴۰۸

نوٹ

حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب نازل ہوں گے تو اس وقت بھی وہ اللہ کے رسول ہوں گے اللہ تعالیٰ کسی کو اعزاز دے کر اس سے اسے چھینتے نہیں. ہاں اس وقت ان کی رسالت یہاں نافذ نہ ہوگی کیونکہ یہ دور دورِ محمدی ہے اور قانون شریعتِ محمدی ـــــ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خود اسی شریعت پر عمل پیرا ہوں گے.

آپ پر انتظامی اُمور میں تو کبھی وحی آئے گی لیکن وحی شریعت (جس کو دینی طور پر قانونی حیثیت حاصل ہو کہ اس کا ماننا فرض ہو اور اس کا انکار کفر ہو گو اس میں کوئی نیا دینی حکم نہ ہو) نہ آسکے گی. یہ سلسلہ وحی منقطع ہو چکا اور دین کامل ہو چکا.

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی یہ ملاقاتیں جو پہلے انبیاء اور حضور خاتم الانبیاء سے ہوں گی اور حضورؐ ان کے سلام کا جواب دیں گے. اس سے اس بات کا پتہ ملتا ہے کہ ان حضرات قدسیہ کی برزخی زندگی کی کچھ جھلکیاں قیامت تک اس دنیا میں ظاہر ہوتی رہیں گی ـــــ لیکن کب؟ جب اللہ چاہے ان کی دنیوی زندگی بالمعنی المتبادر یہاں نہیں ہے.

یہ صرف حنفیہ کا ہی موقف نہیں. فقہ شافعی کے جلیل القدر امام علامہ یوسف الاردبیلی (م ۷۹۹ ھ) فقہ شافعی کی مشہور کتاب، کتاب الانوار لاعمال الابرار میں لکھتے ہیں،

وکان صلی اللہ علیہ وسلم یوخذ عن الدنیا عند تلقی الوحی ولا تسقط عنہ الصلوٰۃ وغیرھا ومن یراہ فی المنام فقد راٰہ حقًا ولکن لایجب العمل بما یسمعہ الرای منہ لعدم ضبطہ و یخاطب بعد الموت بقول السلام علیک ایھا النبی ورحمۃ اللہ وبرکاتہ لان الانبیاء احیاء فی قبورھم یصلون و یحجون کما ورد۔[1]

---

[1] کتاب الانوار جلد ۲ صفحہ ۱۷ مطبوعہ مصر ۱۳۶۲ ھ.

جب برزخ مواطنِ دنیوی میں سے ہے تو عالم برزخ میں انبیاء علیہم السلام کا سلسلۂ عمل باقی ہے اور جس طرح شہداء کی ارواح سبز پرندوں کے قالب میں آسمانوں کی پرواز کرتی ہیں. انبیاء کرام کا آسمانوں پہ جانا جیسا کہ وہ وہاں معراج کی رات حضورؐ سے ملے کوئی امر بعید نہیں ہے. اجسام لطافت میں ارواح کے درجے میں آجائیں تو یہ بھی کوئی امرِ مستبعد نہیں اکابر علماء نے دین کو جس پیرائے میں ہم تک نقل کیا ہے. اگر کرامیہ ان سے پورا اتفاق نہیں کر سکتے تو کم ازکم اس عظیم سلسلہ اسلاف سے استہزاء کا پیرایہ بھی تو اختیار نہ کریں. کاش! ہماری یہ صدا ان کے کانوں کے پردوں سے نیچے اُتر کر ان کی دل کی کھڑکی پہ دستک دے سکے. لیکن ضروری ہے کہ دل زندہ ہو یا وہ کان اس طرف لگادیں. لمن کان له قلب او القی السمع وھو شھید.

ان اعمال کو (جو ان حضرات کے عالم برزخ میں جاری ہیں) ہم دنیوی حیات کا باقی حصہ کیوں کہہ رہے ہیں؟ یہ اس لیے کہ ان اعمال سے ان کا ارتقاء رکا نہیں. اس جہت سے قبر کی برزخی منزل مواطنِ دنیوی میں سے ہے. حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ لکھتے ہیں:-

برزخِ صغرلے چوں از یک وجہ از مواطن دنیوی است گنجائش ترقی دارد و احوال ایں وطن نظر باشخاص متفاوتہ تفاوت فاحش دارد الانبیاء یصلون فی القبور شنیدہ باشند وحضرت پیغمبر ما علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰۃ والسلام شب معراج چوں بر قبر حضرت کلیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام گزشتند دیدند کہ در قبر نماز مے گزارد[1]

ترجمہ. برزخ صغریٰ ایک پہلو سے مواطنِ دنیوی میں سے ہے یہ اس طرح کہ اس میں اعمال میں ترقی کی گنجائش ہے اور برزخ کے حالات مختلف درجوں کے لوگوں میں بہت تفاوت رکھتے ہیں آپ نے حدیث الانبیاء احیاء یصلون فی قبورھم سنی ہوگی اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم معراج کی رات جب موسیٰ علیہ السلام کی قبر کے پاس سے گزرے تو انہیں اپنی قبر میں نماز پڑھتے پایا.

---

[1] مکتوبات جلد ۲ صـ ۲۹/۳۰ نمبر ۱۲

ہائے ہم کس کے سامنے یہ داغ دل لے جائیں کہ ہم جب کوئی مضمون کسی حدیث سے بیان کریں تو کرامی حضرات منکرین حدیث کے اندازِ گفتگو پر آجاتے ہیں کہنے لگتے ہیں قرآن کریم عبادت کی آخری حد موت قرار دیتا ہے۔ واعبد ربک حتی یاتیک الیقین (پ ۱۴ الحجر آیت ۹۹) تو تم قرآن کے مقابلے میں احادیث پیش کرتے ہو؟

قرآن کریم نے مکلف کی حیثیت میں عبادت کی آخری حد موت بتائی ہے اور عالم برزخ کی یہ عبادات تکلیفی نہیں یہ حضرات انبیاء تلذذاً مصروف عبادت رہتے ہیں اور ان کی اس عبادت میں بھی ایک شانِ ارتقائی ہے۔ یہ قرب عالم خلق کے قبیل سے ہے۔ قرب عالم امر محض اس کا ایک سایہ ہے۔ ہم ان شاء اللہ العزیز اس پر کچھ آگے چل کر بحث کریں گے۔ اگر عبادت صرف موت تک کے لیے ہے تو پھر یہ جنت میں یادِ الٰہی کی صدائیں کیوں اٹھ رہی ہیں؟

قرآن پاک سے جنت میں یادِ الٰہی کا ثبوت

وقالوا الحمد للہ الذی ھدانا لھذا۔ (پ ۸ الاعراف : ع ۵ آیت ۴۳)

ترجمہ۔ اور وہ کہیں گے سب تعریفیں اس ذات کے لیے ہیں جس نے ہمیں ادھر ہدایت بخشی۔

وقالوا الحمد للہ الذی صدقنا وعدہ واورثنا الارض (پ ۲۴ زمر: آیت ۷۴)

ترجمہ سب تعریفیں اس ذات کے لیے ہیں جس نے اپنا وعدہ ہم پر پورا کیا اور ہمیں اس زمین کا وارث کیا۔

ولہ الحمد فی الاخرہ۔ (پ ۲۲ : السبا۔ ع۔ الآیت ۱)

ترجمہ۔ اور اسی ذات کے لیے آخرت میں حمد ہے۔

دعواھم فیھا سبحانک اللّٰھم۔ (پ ۱۱ یونس : ع ۱ آیت ۱۰)

ترجمہ۔ اُن کی پکار جنت میں ہو گی سبحانک اللّٰھم وبحمدک۔

وقیل الحمد للہ رب العلمین۔ (پ ۲۴ : زمر: ع ۸ آیت ۷۵)

ترجمہ۔ اور وہاں آواز سُنی جائے گی الحمد للہ رب العلمین۔

یہ آیات پتہ دے رہی ہیں کہ وہ حمد باری کی صدائیں ہوں گی یا ذِالٰہی کے نغمے ہوں گے وہ جہاں عالم تکلیف نہیں لیکن عالم لذت ضرورت ہے اور مقربین ایذدی وہاں بھی قرب الٰہی کی لذت پاتے ہیں۔

اگر وہاں سبحانک اللھم بھی پڑھیں الحمد للہ رب العلمین بھی پڑھیں تحیات سلام بھی ہوں تو کیا نمازیں وہاں ذوقِ عبادت کے لیے نہیں پڑھی جا سکتیں۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ حضورؐ سے نقل کرتے ہیں کہ وہاں اہل جنت کو الہاماً تسبیح و تحمید پر لگایا جائے گا۔

یلھمون التسبیح و التحمید[1]

ترجمہ۔ ان کے دل میں یہ بات ڈال دی جائے گی کہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تحمید کریں۔

عالمِ برزخ کے اعمال تکلیفی نہیں یہ قرب الٰہی میں مزید سبقت کے لیے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وہاں امت کے لیے استغفار بھی جاری ہے۔

حیاتی خیر لکم و مماتی خیر لکم تعرض علی اعمالکم فما کان من حسن حمدت اللہ علیہ وما کان من سئ استغفرت اللہ لکم۔[2]

ترجمہ میری زندگی بھی تمہارے لیے بہتر ہے اور میری موت بھی تمہارے لیے بہتر ہے مجھ پر تمہارے اعمال پیش کیے جاتے ہیں جو اچھے ہوں۔ ان پر میں حمد باری بجا لاتا ہوں جو بُرے ہوں ان پر میں اللہ کے حضور استغفار کرتا ہوں۔

معلوم ہوا آپ کی وفات ایک امر آنی نہیں بلکہ ایک پورا مرحلہ ہے جس میں آپ کے اعمال جاری ہیں۔

یہاں سلام کہنا سنت ہے جواب دینا واجب ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم زائرین کے سلام کا جواب دیتے ہیں تو یہ وجوباً نہیں۔ امت پر شفقت اور رحمت کے لیے ہے۔ یہ بھی پتہ چلا کہ آپ بعد وفات میت نہیں، برابر امت کے لیے دُعائیں فرماتے ہیں۔

---

[1] رواہ مسلم ص۳۷۹ ج۲ [2] رواہ البزار باسناد جید فتح الملہم جلد ا ص۴۱۳

انبیاء کے اعمال باقی ہیں اور املاک بھی باقی۔

انسان کے تصرف میں یا اس کا بدن ہے یا مال ہو۔ اس پہ بدنی اور مالی دونوں قسم کی عبادت فرض کی گئی۔ موت پر انبیاء کے بدن محفوظ رکھے گئے تو موت پر اُن کے اموال بھی آگے تقسیم نہ ہوئے محفوظ رہے اور ان کا تصرف وہی رہا جو ان کی زندگی میں ان اموال کا ہوتا تھا جس طرح کوئی انسان اپنی زندگی میں مال صدقہ کرے تو وہ اس کے اپنے نامۂ اعمال میں سے ہے۔ پیغمبروں کا مال اُن کے اس دُنیا سے جانے کے بعد صدقہ کیا جائے تو وہ اُن کا اپنا صدقہ شمار ہوگا۔ کیونکہ ان کا سلسلۂ عمل اس جہان سے کٹا نہیں۔ پس اس درجے تک ان کے اموال ان کی اپنی مِلک پہ ہی باقی رہیں گے۔

جب ان کے اموال باوجود وفات کے ان کی ملک پہ باقی رہیں گے تو اگر ان کا ملکِ یمین (باندیاں) باقی ہو تو ظاہر ہے کہ اس کی بھی نہ توریث ہوگی نہ تملیک۔

ان کی ازواج ہوں تو اُن کی زوجیت قائم رہے گی۔ عدتِ وفات سے ان کے نکاح کا خاتمہ[1] نہ ہوگا۔ اس پہ حنفیہ۔ شافعیہ۔ مالکیہ اور حنابلہ کا اتفاق ہے:۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقامِ حیات کو حکیم الامت حضرت مولانا تھانویؒ کے کے الفاظ میں پڑھیئے:۔

> آپ زندہ ہیں اور آپ کی حیات بہت قوی ہے جو کہ دوسروں کو حاصل نہیں ان کی حیات ایسی قوی ہے کہ ان کی بیبیوں سے نکاح کرنا بعد ان کی وفات کے بھی جائز نہیں۔ جیسے کسی زندہ خاوند کی بیوی سے نکاح جائز نہیں اور سب کی بیبیوں سے بعد خاوند کی وفات کے شادی کرنا جائز ہے حتیٰ کہ شہداء جن

---

[1] لاعدة على ازواجه لانه حیّ فتزوجهن باقیه (زرقانی علی المواهب جلد ۵ ص ۲۳۲) لاعدة علیهن لانه صلی الله علیه وسلم حی فی قبره وکذلک سائر الانبیاء (مرقات جلد ا ص ۲۵۶)

کی حیات بعد شہید ہونے کے اموات مومنین سے قوی ہوتی ہے کہ ان کے بدن کو زمین نہیں کھا سکتی. مگر ان کی بھی بیبیوں سے بعد مرجانے کے نکاح جائز ہے معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام کی حیات شہداء کی حیات سے قوی تر ہے. حدیث ابن ماجہ میں ہے ان نبی اللہ حی یرزق۔[1]

یہ نکاح اس لیے ناجائز نہیں کہ وہ امت کی مائیں ہیں. مائیں ہونا حقیقی نہیں یہ ان کا اعزاز اور احترام ہے ورنہ ازواج مطہرات پر اپنے روحانی فرزندوں سے پردہ کرنا واجب نہ ہوتا ــــــ حالانکہ انہوں نے تاحیات احاد امت سے پردہ کیا ہے. سو اس بات کو عدمِ نکاح کی علت نہیں بنایا جاسکتا. صحیح بات یہ ہے کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح سے نہیں نکلیں. آپ کی وفات اوروں کی وفات جیسی نہیں ــــــ آپ شہداء سے نہایت اعلیٰ درجہ کی حیات سے زندہ ہیں. اس کی تفصیلی بحث انشاء اللہ ہم آگے جاکر حیاۃ انبیاء میں کریں گے

انبیاء کے برزخی اعمال اور ان کی برزخی سیر کی ایک جھلک آپ کے سامنے آچکی ہے اب ایک سوال یہ ابھرتا ہے کہ سیر کا درجہ جو ارواح شہداء اور کئی دوسرے مومنین کو آسمان پر حاصل ہے کیا اس کی آہٹ کبھی زمین پر سنی جاتی ہے؟

حافظ ابن قیمؒ (۷۵۱ھ) لکھتے ہیں:۔

جمعہ کے دن مومنین کی روحیں اُن کی قبروں کے قریب آتی ہیں[2]

حافظ ابن تیمیہؒ (۷۲۸ھ) بھی اقتضاء الصراط المستقیم میں لکھتے ہیں:۔

جب کوئی مسلمان کسی شہید یا کسی دوسرے مومن کی زیارت کرتا تو اسے وہ روحیں پہچان لیتی ہیں۔

اس پر علامہ سمہودیؒ (۹۱۱ھ) لکھتے ہیں:۔

جب احاد مومنین کا یہ حال ہے تو سید المرسلین علیہ الصلوٰۃ والسلام کا کیا حال ہوگا[3]

---

[1] تعظیم الشعائر صـ۱۸ [2] زاد المعاد جلد ۱ صـ۱۴۴ [3] وفاء الوفاء صـ۱۳۵

حیات شہداء کی بھی برحق ہے اور انبیاء کی بھی ــــــ برزخ میں دونوں کے اعمال طاعت جاری ہیں۔ وہاں کے مناسب حال رزق بھی دونوں کو ملتا ہے اور سیر کے مواقع بھی دونوں کو دیئے جاتے ہیں۔ ہاں شہداء کے املاک ان کی ملک میں نہیں رہتے اور انبیاء کی حیات ان سے بھی قوی ہے ان کے املاک ان کی ملکیت سے نہیں نکلتے۔

اتصال روح سے جسد مدفون میں حیات کیسے مانی جاسکتی ہے؟ حضرت مولانا عبدالحکیم سیالکوٹیؒ لکھتے ہیں:۔

لیس المراد بالحيّ ههنا مایعاد فیه الروح ویصدر عنه الافعال الاختیاریة بل مایدرك الالم واللذة فاذا خلق الله فیه ادراکًا ۔ ۔ ۔ ۔ یکون حیًا لاجمادًا۔[1]

ترجمہ: یہاں زندہ سے ایسا زندہ مراد نہیں جس میں رُوح (کاملہ) لوٹائی گئی ہو اور اس سے افعال اختیاریہ صادر ہوتے ہیں بلکہ ایسی زندگی مراد ہے جس میں وہ قبر کی تکلیف یا راحت قبر پا سکے۔ سو جب خدا تعالیٰ نے اس میں اتنا ادراک پیدا کر دیا تو اب یہ جسد محض جماد نہیں ہوگا زندہ ہوگا (گو کسی درجے میں زندہ ہو)۔

بات صرف بطور جواب کہی گئی ہے۔ معتزلہ خبر واحد کی حجیت کے قائل نہ تھے اور حدیث براء بن عازبؓ گو علماء اہل سنت کے ہاں تواتر کو پہنچ چکی تھی۔ تاہم اس کے تواتر پر بحث مسئلے کو اور طوالت میں ڈالتی۔ متکلمین نے اعادۂ روح کی بجائے اتصال روح کا موقف اختیار کر لیا اور معتزلہ پہ حجت تمام کر دی۔ حضرت مولانا عبدالعزیز پرہاڑوی لکھتے ہیں یہ موقف صرف معتزلہ کے جواب میں اختیار کیا گیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:۔

هذا جواب اشکال اوردہ المعتزلہ۔[2]

ترجمہ۔ یہ ایک اشکال کا جواب ہے جو معتزلہ پیش کرتے ہیں (یہ صورت جواب الزامًا ہے)۔

---

[1] عبدالحکیم علی الخیالی ص۱۱۸ [2] نبراس علی شرح العقائد ص۲۲۲

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ (۱۰۵۲ھ) لکھتے ہیں:۔

بسیارے از اشاعرہ و حنفیہ در اعادہ روح تردد کردہ اند و تلازم روح وحیات را منع نمودہ [1]

ترجمہ: بہت سے اشاعرہ اور حنفیہ بھی روح کے میت میں لوٹنے میں تردد کرتے ہیں اور اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ زندہ ہونے کے لیے روح کا عود کر آنا ضروری ہے۔

اعادۂ روح کی بحث اور یہ تفصیل کہ یہ اعادہ کاملہ نہیں یہ مباحث آپ کے سامنے آچکے یہ اعادہ مستمرہ نہیں، اتنا ہے کہ الم ولذت کا ادراک ہوتا ہے اس پر بھی تصریحات موجود ہیں اب ہم صرف اس تعارض کو اٹھانا چاہتے ہیں جو بعض ذہنوں میں حدیث اعادہ روح کے خلاف پایا جاتا ہے۔

قرآن کریم پ۲۴ الزمر آیت ۴۲ میں ہے:۔

اللہ یتوفی الانفس حین موتہا والتی لم تمت فی منامہا فیمسک التی قضیٰ علیہا الموت و یرسل الاخریٰ الیٰ اجل مسمی۔

ترجمہ: اللہ کھینچ لیتا ہے جانوں کو جب وقت ہو ان کے مرنے کا اور جو نہ مریں ان کی کھینچتا ہے ان کی نیند میں پھر روک لیتا ہے ان کو جن کا مرنا ٹھہرایا اور دوسروں کی بھیج دیتا ہے ایک وقت مقرر تک۔

اس سے پتہ چلا اللہ تعالیٰ موت اور نیند دونوں میں روح قبض کرتا ہے موت والے کی روکے رکھتا ہے اور نیند والے کی واپس بھیج دیتا ہے۔ موت والے کا تعلق بدن سے کٹ جاتا ہے مگر نیند والے کی روح بدن پر برابر اثر ڈالتی ہے جس سے اس کی سانس چلتی ہے اور نبضیں اچھلتی ہیں۔

پس موت کے لیے دو چیزیں لازم ہوئیں۔ ۱۔ روح کا بدن سے نکلنا اور ۲۔ آثار حیات

---

[1] جذب القلوب ص۱۸۶ نقلاً عن المسائرہ

کا باقی نہ رہنا — نیند والے سے آثار حیات منتفی نہیں ہوتے اور روح کے واپس آنے پر وہ پھر زندہ ہو جاتا ہے۔

شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ لکھتے ہیں:۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغوی نے نقل کیا ہے کہ نیند میں روح نکل جاتی ہے مگر اس کا مخصوص تعلق بدن سے بذریعہ شعاع کے قائم رہتا ہے جس سے حیات باطل ہونے نہیں پاتی جیسے آفتاب لاکھوں میل سے بذریعہ شعاعوں کے زمین کو گرم رکھتا ہے[1]۔

اگر کسی کی روح بدن سے اس طرح نکلے کہ پھر وہ اس دنیا میں اس بدن میں نہ لوٹے مگر اس کے آثار اس بدن سے گمنٹوں کے طویل فاصلوں کے باوجود منتفی نہ ہوں تو یہ ایک حدی قسم کی موت ہوگی کہ موت آئی روح بدن سے جدا ہوئی مگر آثار حیات کچھ باقی رہے تو اس کے بارے میں کہا جا سکے گا میت ہونے کا وعدہ بھی پورا ہو گیا اور حیات کلیۃً زائل بھی نہ ہوئی اس پر ہم انشاء اللہ آگے بحث کریں گے۔

یہاں صرف یہ بتلانا ہے کہ روح نیند کے وقت بھی نکلتی ہے اور موت کے وقت بھی نیند والی واپس بھیج دی جاتی ہے اور موت والی کو اللہ تعالیٰ روک کے رکھتے ہیں۔ یہ امساک کب تک رہتا ہے؟ یہ بات غور طلب ہے۔

استدلال معتزلہ

معتزلہ کہتے ہیں یہ امساک (روح کا بدن سے روکے رکھنا) قیامت تک کے لیے ہے۔ سو قبر میں تعاد الی جسدہ (اعادہ روح) کی روایت اس آیت کے خلاف ہے۔ اس تعارض میں قرآن پاک کو ترجیح حاصل ہوگی۔ کرامیہ اور ظاہریہ بھی اس میں معتزلہ کے ساتھ ہیں۔

---

[1] تفسیر عثمانی صفحہ ۶۱۲

جواب اہل سنّت

(۱) ـــــ قرآن کریم میں قبض روح کا جو بیان اس آیت میں دیا گیا ہے وہ اس عالم (دُنیا) کے اعتبار سے ہے۔ امساک (موت والے کی روح روکے رکھنا) اور ارسال نیند والے کی کچھ دیر بعد چھوڑ دینا دونوں اسی جہان کے عمل ہیں۔ جہاں ارسال کا تحقق ہوتا ہے وہیں تک امساک کی مدت ہے۔ یہ حالتیں اسی دُنیا کی ہیں قبر میں روح کا لوٹنا یہ عالم برزخ کے حالات میں سے ہے دُنیا کے حالات میں سے نہیں۔

عالم آخرت میں روح کا بدن میں لوٹنا تو کرامیہ کے ہاں بھی مسلّم ہے۔ سو امساک اُن کے ہاں بھی ہمیشہ کے لیے نہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ اِمساک قیامت پر ختم کرتے ہیں اور اہل سنّت اسے دفن پر ختم سمجھتے ہیں ـــــ پھر قبر میں روح و بدن کا یہ تعلق صرف سوال و جواب تک رہے گا یا مستمر (دائمی طور پر) اس میں بھی تفصیل ہے۔

(۲) ـــــ موت والے کی روح کو بدن سے صرف اس انداز میں روکا جاتا ہے کہ وہ بدن میں کوئی تصرف کرے موت سے روح کا بدن سے تعلق تصرف کٹتا ہے اور اسے وہ زندگی نہیں ملتی جو اسے پہلے اس دُنیا میں حاصل تھی۔ قبر میں اگر روح کا اس انداز میں اعادہ مان لیا جائے جس سے روح کو بدن میں تصرف اور اختیار حاصل نہ ہو تو اس سے آیت مذکورہ سے ٹکراؤ لازم نہیں آتا۔ یہاں امساک صرف تعلقِ تصرف کا ہے اور یہ اہل سنّت کے عقیدہ حیات قبر کے خلاف نہیں۔ حضرت علامہ محمود آلوسیؒ (۱۲۷۰ھ) لکھتے ہیں:۔

ای یقبضها عن الابدان بان یقطع تعلقها تعلق التصرف فیها عنها۔[۱]

ترجمہ۔ اللہ تعالیٰ روح کو بدنوں سے قبض کرتا ہے بایں طور کہ ارواح کا ابدان سے تعلق تصرف قطع کر دیتا ہے کہ اس حیات میں غذا اور تغذیہ و تمنیہ کی صورت نہیں ہوتی۔

---

[۱] روح المعانی جلد ۲۴ ص ۷

حضرت مولانا تھانوی (۱۳۶۲ھ) بھی لکھتے ہیں:۔

ان جانوں کو تو تصرف فی الابدان کی طرف عود کرنے سے روک لیتا ہے جن پر موت کا حکم فرما چکا ہے اور باقی جانوں کو جو کہ نوم میں معطل ہو گئیں تھیں اور ابھی ان کی موت کا وقت نہیں آیا ایک میعاد معین تک کے لیے رہا کر دیتا ہے کہ جاگ کر پھر بدستور ابدان میں تصرف کرنے لگتی ہیں[1]

اس تشریح سے اس آیت میں اور حدیث اعادۂ روح بہ بدن میں کوئی تعارض نہیں رہتا۔ اس حدیث کو جمہور علماء اسلام نے پورے یقین سے قبول کیا ہے اور حق یہ ہے کہ یہ تواتر کے درجے کو پہنچتی ہے۔

حافظ ابن قیم (۷۵۱ھ) لکھتے ہیں:۔

فامساکہ سبحانہ التی قضٰی علیہ الموت لا ینافی ردھا الیٰ جسدھا المیت فی وقت ما رداً عارضاً لا یوجب لہ الحیٰوۃ المعھودۃ فی الدنیا واذا کان النائم روحہ فی جسدہ وھو حی وحیاتہ غیر حیاۃ المستیقظ فان النوم شقیق الموت فھکذا المیت اذا اعیدت روحہ الیٰ بدنہ کحال النائم المتوسطۃ بین الحی والمیت فتامل ھٰذا یزیح عنک اشکالات کثیرۃ[2]

ترجمہ۔ اللہ تعالیٰ کا اس روح کو روکے رکھنا جس کے بارے میں موت کا فیصلہ تھا۔ اس کے کسی وقت اس جسد میت کی طرف لوٹانے کے منافی نہیں۔ بشرطیکہ یہ لوٹنا اس کی اس دنیا میں وہ زندگی لازم نہ کرے جو اسے یہاں پہلے حاصل تھی ——— اور جب سوئے ہوئے کی روح باوجودیکہ اس کے جسد میں ہوتی ہے مگر اس کی زندگی جاگنے والے کی زندگی جیسی نہیں۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ نیند موت کی

---

[1] بیان القرآن جلد ۱۰ [2] کتاب الروح صد ۵۴

بھی ہے سو میت کی طرف جب روح اس کے بدن میں لوٹائی جائے تو اس کا حال سونے والے کی طرح ہو جاتا ہے جو زندہ اور مردہ کے ایک درمیان کی منزل ہے ـــــ اس پر غور کرو یہ (انشاء اللہ العزیز) تمہارے بہت سے اشکالات زائل کر دے گا۔

روح و بدن کے ہر تعلق کو ان کے دنیا کے سے تعلق کو لازم سمجھنا ہرگز صحیح نہیں۔

یہ صحیح ہے کہ ہمارے گرامی دوستوں کی اصل مخالفت ان عام گڑھوں سے نہیں جن میں یہ عامہ اموات دفن ہوتے ہیں۔ ان کی اصل ضد انبیاء کی قبور سے ہے۔ ان کے مزارات کو جہاں زائرین حاضری دیتے ہیں یہ کسی درجے میں روضہ جنت ماننے کے لیے تیار نہیں۔

حدیث میں جس طرح مومن کی قبر کے لئے روضۃ من ریاض الجنۃ کے الفاظ وارد ہیں حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر (جو مدینہ منورہ کے حرم نبوی میں ہے) اور آپ کی قبر تک کے فاصلے کو بھی ریاض الجنۃ کہا گیا ہے۔ حاجی صاحبان سے پوچھیئے وہ کس قدر جد و جہد اور جوش و ولولہ سے مسجد نبوی میں ریاض الجنۃ کی جگہ تلاش کرتے ہیں ـــــ اگر یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر نہیں وہ عالم بالا میں کسی اور مقام پر ہے تو یہ ریاض الجنۃ یہاں کیسے آ گیا ـــــ جب یہ بقعہ مبارکہ واقعی ریاض الجنۃ ہے تو یہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ظاہری قبر ہے یہی حضور کی حقیقی قبر ہے ـــــ اگر یہ حضور کی حقیقی قبر نہ ہوتی تو حضرت عمرؓ کبھی گنبد خضریٰ میں دفن ہونے کی خواہش نہ کرتے ـــــ یہی وہ قبر ہے جس کی مٹی روئے زمین کے تمام بقاع سے برتر و افضل ہے اور یہی وہ جگہ ہے کہ پوری کائنات میں کوئی جگہ اس کی برابری نہیں کر سکتی۔

قبر کی وسعت و نعمت کو اس ظاہری قبر سے کلیۃً جدا رکھنا اور من وجہ بھی اس ظاہری قبر سے متعلق نہ ہونے دینا یہ ایک اصولی غلطی ہے اور مفہوم قبر نہ جاننے کی وجہ سے ہے ـــــ دعا کیجئے اللہ تعالیٰ حق سمجھانے کی توفیق عطا فرمائے۔

اب ہم کچھ قبر کی حقیقت عرض کرتے ہیں لیکن پہلے معتزلہ کے انکار پر ایک نوٹ ملاحظہ فرمالیں۔

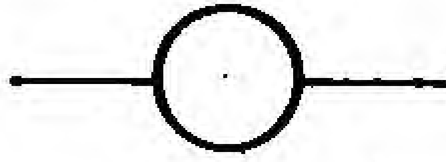
معتزلہ کی ظاہری قبر سے گریز پائی

جب ہمارے دوستوں کو ان حقائق سے بھاگنے کی کوئی راہ نہیں ملتی تو اقرار کر لیتے ہیں کہ میت کی قبر میں برزخی زندگی برحق ہے اور اس پر الم وراحت کی کیفیتیں بھی حق ہیں لیکن قبر سے مراد یہ گڑھا نہیں جو دفنِ میت کے لیے یہاں کھودا جاتا ہے۔ یہ کوئی عالم برزخ کا مقر ہے یہاں کوئی نہیں جانتا کہ کس کی قبر کہاں ہے ـــــ سو ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ حیات فی القبر کی بحث میں مفہوم قبر پر بھی کچھ عرض کر دیا جائے۔

فقہاء اور محدثین علم دین کے امین ہیں اور متکلمین اسلام اس کے پہرہ دار ـــــ متکلمین جب کوئی بات کہتے ہیں تو کسی اعتراض کا جواب دینے کے لیے یا مخالف کا منہ بند کرنے کے لیے ـــــ اثبات شریعت کے لیے فقہاء و محدثین ہی امت کے امناء ہیں ـــــ ہم کوشش کریں گے کہ اولاً قبر کا مفہوم قرآن وحدیث کے اطلاقات سے پیش کریں اور اس بات کو سامنے رکھیں کہ اس باب میں نعیم قبر پہ یا عذاب قبر پہ مسلکِ محدثین کیا ہے اور وہی برحق ہے؛

اس ظاہری معنی پر عقلاً ایک اعتراض واقع ہوتا تھا وہ یہ کہ جن اموات کو یہ گڑھے کی صورت میں قبر نہیں ملتی یا یہ کہ وہ ہوا میں بکھر جائیں ان کے ساتھ وہ معاملات جو شریعت نے اموات کے ساتھ ہونے والے بتائے ہیں کیسے پورے ہوں گے؟ اس کا جواب دینے کے لیے متکلمین اُٹھے اور انہوں نے اس گڑھے کی صورت کے علاوہ قبر کی ایک اور صورت بھی تجویز کر دی قبر کی یہ دوسری صورت پہلی صورت سے کوئی ٹکراؤ نہ تھا۔ اس کے ایک پردے کی پہلو کی خبر مزید تھی۔ افسوس کہ نادان دوستوں نے اسے ایک ٹکراؤ سمجھ لیا اور محدثین کے مقابلہ میں متکلمین کو ایک نئے مسلک کی صورت میں سامنے لے آئے اور ایک مسلک نہیں مسالک العلماء کے مدعی ہوتے۔

حالانکہ ان میں کوئی ٹکراؤ نہ تھا۔ قبر کا ایک باطنی پھیلاؤ تھا جسے معتزلہ اور کرامیہ کو لاجواب کرنے کے لیے پیش کیا گیا۔ افسوس کہ ہمارے یہ دوست اسے سمجھ نہ سکے۔



قرآن کریم میں مسئلہ حیات انبیاء کے کئی اقتضاء موجود ہیں۔

۱۔ واسئل من ارسلنا من قبلک من رسلنا (پ۲۵ الزخرف) ۲۔ ولقد اتینا موسی الکتاب فلا تکن فی مریۃ من لقائہ (پ۲۱ الم سجدہ)

۳۔ ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات (پ۲ البقرہ) ۴۔ بل احیاء عند ربھم یرزقون (پ۴ آل عمران)

یہ آیات گو اس موضوع پر عبارۃ النص نہیں لیکن ان میں اس پر دلالۃ النص موجود ہے۔

پانچ باتیں معلوم ہوئیں :۔

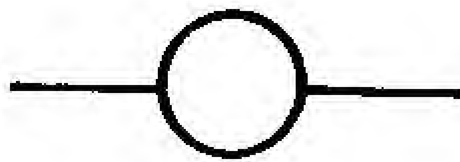
(۱) قرآن کریم کی رو سے انبیاء کرام حالاً زندہ ہیں یہ مسئلہ دلالۃ النص سے ثابت ہے

(۲) انبیاء کرام کو حالاً زندہ ماننا ایمانیات میں سے ہے۔ اتنا ایمان رکھنا کہ وہ زندہ ہیں اہل سنت ہونے کے لیے کافی ہے

(۳) انبیاء کی یہ حیات بعد الوفات ہے اس میں کسی کا اختلاف نہیں وفات آنے کے سب علماء حق قائل گزرے ہیں۔

(۴) جن علماء نے قرآن سے حیاۃ الانبیاء ثابت کی ان کے لیے دعا ہے زادھم اللہ شرفاً ان علماء حق کا یہ شرف علمی ہے۔

(۵) ہمیں اس زندگی کا شعور نہیں (لا تشعرون) نہ کہ ان کے لیے پرندوں کی سی زندگی پہ غور کریں۔



قبر کی حقیقت

الحمد للہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ اما بعد :-

قبر کا شریعت نے اس کی دلالتِ لغوی کے وراء کوئی علیحدہ مفہوم مقرر نہیں کیا۔ یہ تو بتایا کہ قبر آخرت کی منزلوں میں سب سے پہلی منزل ہے[1] لیکن یہ اسی گڑھے کو کہا جس میں میت اُتاری جاتی ہے۔

ہاں شریعت نے اس کی ایک وسعت وضحت بتائی جو اس دُنیا سے پردۂ غیب میں ہے۔ سو اس سے اس ظاہری گڑھے کا قبر نہ ہونا لازم نہیں آتا۔ زیادہ سے زیادہ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ قبر کا ایک کنارہ تو ہمارے سامنے ہے اور دوسرا خُدا ہی جانے۔ غیب کے پردوں میں کہاں تک وسیع یا تنگ ہے۔ اگر میت کی پسلیاں[2] اس میں آپس میں ٹکرائیں تو یہ قبر اس میت پہ تنگ ہو چکی۔ ورنہ یہی گڑھا عالم غیب[3] میں ایک پُورا باغ ہے ـــــ تاہم یہ کسی طرح صحیح نہیں کہ اس قبر کو کہا جائے کہ شرعاً یہ قبر نہیں ہے شریعت کی[4] اصطلاح میں قبر کچھ اور ہے۔ صحیح یہ ہے کہ قبر کا دونوں سے تعلق ہے اس دُنیا سے بھی اور برزخ سے بھی۔

---

[1] رواہ ابن ماجہ صفحہ ۳۱۵ [2] فیقال للارض التئمی علیہ فتختلف اضلاعہ فلا یزال فیہا معذباً حتٰی یبعثہ اللہ من مضجعہ ذٰلک رواہ الترمذی جلد ۲ صفحہ ۱۲۷ [3] القبر روضۃ من ریاض الجنۃ او حفرۃ من حفر النیران [4] حضرت شیخ محدث دہلوی لکھتے ہیں۔ والمراد بالقبر عالم البرزخ وھو عالم بین الدنیا والاٰخرۃ لہ تعلق بکل منہما (تنقیح اللمعات جلد ۱ صفحہ ۱۸۹) قبر عالم برزخ است کہ واسطہ است میان دنیا و آخرت و تعلق دارد بہر دو مقام نہ آں گوئی کہ مردہ را در و گور کنند۔ (اشعۃ اللمعات جلد ۱ صفحہ ۱۱۴) قبر ایک درمیانی جہان ہے جو دنیا اور آخرت کے مابین ہے اور اس کا دُنیا سے بھی تعلق ہے اس گڑھے سے جس میں میت کو

صلوٰۃ (نماز) کے ایک لغوی معنی ہیں اور ایک اس کی شرعی حقیقت ہے۔ زکوٰۃ کے ایک لفظی معنی ہیں اور اس کی ایک شرعی حقیقت ہے۔ حج ایک لفظی معنی ہیں اور اس کی ایک شرعی حقیقت ہے۔ پھر شرعی تخاطب میں بھی اسی طرح حقیقت و مجاز کے دائرے ہیں جس طرح لغوی تخاطب میں حقیقت لغوی اور مجاز لغوی کی معرکہ آرائی ہے ــــــ لیکن قبر کی کوئی علیحدہ شرعی اصطلاح نہیں، قبر وہی ہے جسے سب قبر کہتے ہیں۔ ہاں اس کی وسعت و فسحت اور اس کے عجائب و کوائف کو اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں۔ میت کی روح جہاں بھی ہو اس کا اس گڑھے کے مدفون (یا اس کے ذراتِ منتشرہ) سے اشراف و اشراق کا کوئی لطیف رابطہ ضرور ہوتا ہے

قرآن و حدیث میں قبر کسے کہا گیا ہے؟ یہی جو گڑھا ہر ایک کو سامنے نظر آتا ہے۔ ملنگوں کی طرح دُور کے چکر دینا ــــ دُور ــــ دُور ــــ کہ معلوم نہیں قبر کہاں کی کہاں ہے۔ یہ بات باطنی فرقے کے لوگوں کو توجچتی ہے۔ اہل علم کے لیے یہ زیبا نہیں کہ قرآن و حدیث کے عام اطلاقات کو چھوڑ کر خود غیب کے پردوں میں کھو جائیں۔ جب شریعت نے قبر کی وسعت و فسحت کے بارے میں برزخی حقیقت کو پورا تحفظ دیا ہے تو اس بحث میں علماء صادقین کو ملنگ بننے

دفن کرتے ہیں اور اس جہان سے بھی۔ جہاں تک قبر کا پھیلاؤ ہے۔ یہی نہ سمجھو کہ یہ صرف اسی گڑھے کا نام ہے جس میں میت کو دفن کرتے ہیں۔ کئی میتیں تو ذرات میں بکھری ہیں ان کی قبر وہی ہے جہاں ان کے بدن کے اجزائے اصلیہ آپس میں مرتبط ہوتے ہوں اس کا برزخی کنارا دوسرا ہے سو عالم برزخ دنیا اور آخرت دونوں سے مرتبط ہے۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ قبر اس گڑھے کا نام نہیں تو یہ تعبیر صرف ان مُردوں کے لیے اختیار کی جاتی ہے جنہیں کسی جگہ دفن نہیں کیا جا سکا۔ اس میں اس پر متنبہ کرنا ہوتا ہے کہ اس کی بھی قبر ہے اور اس سے سوال و جواب اور نعیم و عذاب اسی غیر محسوس قبر میں ہو گا۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں۔ لیس المراد به الحفرة التي يدفن فيه الميت فرب ميت لا يدفن كالغريق والمحروق والماكول في بطن الحيوانات يعذب وينعم۔ (تنقیح اللمعات جلد ا صد ۱۸۹)

کی کیا ضرورت ہے۔

آیئے اب قرآن و حدیث کی روشنی میں مفہوم قبر متعین کریں اور تلاش کریں کہ یہ لفظ کبھی کہیں کسی اور غیب کی وادی پر بھی بولا گیا ہے۔

قرآن کریم میں ایک آنیوالے وقت کی خبر دی گئی ہے ـــــ فرمایا:-

اذا القبور بعثرت۔ (پ۳۰ : الانفطار آیت ۴)

جب قبریں کریدی جائیں گی اور اندر سے باہر آنے والی ہر جان جان لے گی. اس نے کیا آگے بھیجا اور کیا پیچھے چھوڑا.

مُردے قبریں کھلنے سے پہلے زندہ ہوں گے یا کھلنے کے بعد. یہ بات بحث طلب ہے لیکن یہ بات یقینی ہے کہ قبروں سے مراد یہی گڑھے ہیں اور انہی گڑھوں سے مُردے زندہ کرکے نکالے جائیں گے اور جو چیز زمین کی تہہ میں ہے اُوپر آجائے گی. سب قبریں زیر وزبر کر دی جائیں گی۔

یہ قبریں کیا عالمِ غیب کی کسی وادی کا نام ہے یا انہیں گڑھوں کا جنہیں آنکھیں دیکھتی ہیں اور انسان کھودتے ہیں۔ اور پھر کبھی کبھی ان پہ حاضری دیتے ہیں۔

ایک دوسرے مقام پہ بھی یہ بات کہی:-

اذا بعثر ما فی القبور۔ (پ۳۰ : العادیات آیت ۹)

ترجمہ. جب اُٹھائے جائیں گے جو قبروں میں ہیں۔

اب تو نہ کہیں یہ قبر کے حقیقی معنی نہیں. موت کے بعد مُردے کو کہاں پہ دہ ملتا ہے؟

قرآن پاک میں ہی دیکھیئے :-

فاماته فاقبره۔ (پ۳۰ : عبس آیت ۲۱)

ترجمہ. پھر اُسے موت دی اور قبر میں رکھوا دیا۔

قرآن میں یہاں قبر اسی گڑھے کو کہا گیا ہے جہاں مُردے کو پردے میں کیا جاتا ہے. یہ

یہ پردہ اس جہان سے ہے اور اگلے جہان کے کنارے اللہ رب العزت کو ہی معلوم ہیں۔

یہ بھی فرمایا کہ کسی منافق کی نماز جنازہ نہ پڑھیں نہ اس کی قبر پر کھڑے ہوں —— وہ اس لائق ہی نہیں کہ ان کے لیے کوئی دعا کی جائے۔

لاتصل علی احد منہم مات ابدا ولاتقم علی قبرہ۔ (پ: التوبہ آیت ۸۴ ع ۱۱)

اور یہی اسی وقت کہا گیا تھا جب آپ اس کی قبر پر کھڑے تھے۔

وقام علی قبرہ۔[1]

ترجمہ۔ اور آپ اس کی قبر پر ٹھہرے۔

یہ جو حکم ہوا کہ کسی منافق کی قبر پر کبھی کھڑے نہ ہوں کہ اس کے لیے دعا کریں۔ یہ قبر اسی گڑھے کا نام ہے یا یہ کوئی عالم غیب کی جگہ ہے جسے ہم نہ یہاں محسوس کر سکیں نہ جان سکیں نہ وہاں جا سکیں۔

قرآن کریم میں جہاں بھی یہ لفظ آیا ہے اسی گڑھے پر آیا ہے۔ یہ گڑھا عالم غیب میں جہنم کا ایک دائرہ بنے یا جنت کا کوئی باغیچہ، اس کی وسعت و فسحت اللہ ہی کو معلوم ہے۔ قبر اسی کا نام ہے۔ قرآن کریم میں قبر اس گڑھے کے سوا اور کسی چیز کو نہیں کہا گیا آگے اسکی ایک برزخی وسعت ہے مخالفین کی یہ رٹ کہ قبر اس گڑھے کا نام نہیں۔ کیا قرآن کریم کی کھلی مخالفت نہیں ہے؟

بعض صوفیوں نے اگر مجازی رنگ میں قبر کے کسی اور عالم کی خبر دی تو اس سے قبر کے قرآنی معنوں کا انکار کیسے جائز ہو گیا۔ قرآن کے مقابلے میں صوفیوں کی بات کو اصل ٹھہرانا یہ راہ بدعت نہیں تو کون سی سنت ہے۔

جب اس قبر کا برزخی کنارہ اللہ ہی کے علم میں ہے تو اگر کسی صوفی کی کشفی نظر اس کے (قبر کے) کسی دوسرے حصے پر پڑ گئی اور اس نے قبر کے وہاں کے حالات ذکر کر دیئے تو اس سے اس ظاہری قبر کا انکار کیسے نکل آیا؟ برزخی وسعت ماننے کا مطلب اس قبر کا انکار تو نہیں ہے۔ پھر صوفیہ کرام کے مشاہدات پر عقائد کی بنیاد رکھنا کیا اس کی کوئی اصل شرعی ہے؟

---

[1] سنن ابن ماجہ صـ ۱۰۹

قبر احادیث کی روشنی میں

(۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

کنت نہیتکم عن زیارۃ القبور فزوروھا۔[1]

ترجمہ: میں تمہیں پہلے قبروں پر جانے سے روکا کرتا تھا۔ اب کے بعد اجازت ہے تم انہیں دیکھنے جایا کرو یہ تمہیں آخرت کی یاد دلاتی ہیں۔

(۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب فرمایا:-

ان المیّت اذا وضع فی قبرہ۔[2]

کہ میت جب قبر میں اُتاری جائے..... الحدیث۔

تو قبر سے یہاں کون سی جگہ مراد ہے ــــــ یہی جو نظر آتی ہے یا یہ کوئی اعلیٰ علیین کی جگہ کے لیے ہے۔

(۳) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اور موقعہ پر فرمایا:-

یھود تعذب فی قبورھا۔[3]

یہاں قبور کیا انہی گڑھوں کو نہیں کہا گیا ہے ــ کیا یہ کوئی عالم غیب کی جگہ تھی۔

(۴) آپؐ نے جب ارشاد فرمایا تو آپ نے قبر سے کون جگہ مراد لی؟

ان اولئك اذا كان فيهم الرجل الصالح فمات بنوا على قبره مسجدًا۔[4]

ترجمہ۔ ان لوگوں میں جب کوئی نیک آدمی مرتا تو وہ اس کی قبر پہ (کے پاس) جائے عبادت بنا دیتے۔

---

[1] سنن ابن ماجہ صفحہ ۱۱۴ کما فی المشکوٰۃ صفحہ ۱۵۴ [2] صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۳۸۶ [3] ایضاً جلد ۲ صفحہ ۳۸۶

[4] صحیح مسلم جلد ۱ صفحہ ۲۰۱ صحیح بخاری جلد ۱ صفحہ ۶۱

(۵) جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ دیکھئے صحیح مسلم جلد ۱ ص۴۴۶ کا باب، ما بین قبرہ صلی اللہ علیہ وسلم ومنبرہ ـــــ الفاظ حدیث جامع صغیر کے ایک نسخہ میں اس طرح ہیں :-

ما بین قبری ومنبری روضۃ من ریاض الجنۃ۔ متفق علیہ[1]

ترجمہ۔ جو جگہ میری قبر اور میرے منبر کے مابین ہے وہ جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے۔

تو اس میں قبر کس جگہ کو کہا گیا ہے۔ کیا یہ جگہ اعلیٰ علیین میں ہے یا یہیں مدینہ منورہ میں۔

(۶) پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی ملاحظہ فرمائیے :-

قاتل اللہ الیھود اتخذوا قبور انبیائھم مساجد۔[2]

ترجمہ۔ اللہ یہود کو برباد کرے انہوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو سجدہ گاہیں بنالیا۔

(۷) ایک اور جگہ ارشاد ہے :-

(عن ابن عمر مرفوعاً) من حج فزار قبری بعد موتی کان کمن زارنی فی حیاتی۔[3]

ترجمہ۔ جس نے حج کیا اور میری وفات کے بعد میری قبر کی زیارت کی ایسا ہی ہے جیسے اس نے میری زندگی میں میری زیارت کی ہو۔

یہ تشبیہ کے طور پہ فرمایا گیا ہے جس پہ ہر بات میں مشابہت ضروری نہیں۔

(۸) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اذخر گھاس کو کاٹنے کی اجازت دی تو فرمایا۔ اس کی ضرورت ہے۔ مگر کس لیے ؟

---

[1] متواتر السراج المنیر جلد ۳ ص۱۹۶ [2] صحیح بخاری جلد ۱ ص۶۲ صحیح مسلم جلد ۱ ص۲۰۱ [3] رواہ البیہقی فی فی شعب الایمان کذا فی المشکوٰۃ ص۲۴۹

لقبورنا و بیوتنا "ہماری قبروں کے لیے اور گھروں کے لیے۔"[1]

یہاں قبور انہی جگہوں کو کہا گیا جن میں میت اُتاری جاتی ہے اور اسے اس میں دفن کیا جاتا ہے نہ کسی پڑے کے جہان کو۔

(۹) پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی پیش نظر رہے:۔

یا اهل القبور یغفر الله لنا ولکم وانتم سلفنا ونحن بالاثر۔[2]

آپ نے قبرستان جاکر یہ کہنے کی تعلیم دی ہے۔ کیا وہاں قبریں نہ تھیں؟ سوا نہی قبروں کے پاس ہمیں یہ کہنے کا حکم دیا گیا۔

(۱۰) ایک شخص کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبر پہ بیٹھے دیکھا تو ارشاد فرمایا:۔

لا تؤذ صاحب القبر ولا یؤذیك۔[3]

ترجمہ: تم اس قبر والے کو اذیت نہ دو نہ وہ تجھے نقصان دے۔

اب آپ ہی کہیں یہاں قبر سے مراد اگر یہ ظاہری قبر نہیں جسے مخالفین بار بار گڑھا کہہ رہے ہیں تو اور اس سے کیا مراد ہے۔ کیا کوئی شخص اعلیٰ علیین میں کسی قبر کی بے ادبی یا ایذاء رسانی کے لیے جا سکتا ہے؟

(۱۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

ان هذه الامة تبتلی فی قبورها فلولا ان لا تدافنوا لدعوت الله ان یسمعکم من عذاب القبر۔[4]

ترجمہ۔ یہ امت اپنی قبروں میں آزمائش سے گزرتی ہے۔ مجھے یہ ڈر نہ ہوتا کہ تم اپنی میتوں کو دفن کرنا چھوڑ دو گے تو میں خدا سے دعا کرتا کہ وہ تمہیں بھی عذاب قبر کی یہ آوازیں سنا دے۔

---

[1] صحیح بخاری جلد۱ صفحہ۱۸۰ [2] رواہ الترمذی کذا فی المشکوٰۃ صفحہ۱۵۴ [3] رواہ الطحاوی جلد۱ صفحہ۲۹۶
[4] صحیح مسلم جلد۲ صفحہ۳۸۶

(۱۲) آپ کا یہ بھی ارشاد ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ لسانِ شریعت میں قبریں کن جگہوں کو کہا جاتا تھا؟ انہی قبروں کو جو سامنے نظر آتی ہیں۔ یہی گڑھے ہیں۔

لا تجلسوا على القبور ولا تصلوا اليها۔[۱]

ترجمہ۔ تم نہ قبروں پر بیٹھا کرو اور نہ ان کی طرف منہ کر کے نمازیں پڑھا کرو۔

(۱۳) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا:۔

اذا وضعتم موتاکم فی قبورھم فقولوا بسم اللہ وعلی ملۃ رسول اللہ۔[۲]

ترجمہ۔ جب تم اپنی میتوں کو قبروں میں رکھو تو یہ کہہ کر رکھو بسم اللہ وعلی ملۃ رسول اللہ۔

بھلا کیا اس کا مطلب یہ لیا جا سکتا کہ تم اپنی میتوں کو لے کر اعلیٰ علیین پہنچا کرو کیونکہ قبر تو اس جگہ میں ہے۔ یہاں کے ان گڑھوں کو تو قبر نہیں کہا جاتا۔ استغفر اللہ

(۱۴) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک اور جگہ پر ارشاد ہے:۔

لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زائرات القبور والمتخذین علیھا المساجد والسرج۔[۳]

ترجمہ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں پر گھومنے والی عورتوں اور وہاں جائے عبادت بنانے والے مردوں اور ان دیئے جلانے والوں پر لعنت فرمائی ہے۔

کیا یہاں ان زائراتِ قبور پر لعنت کی گئی ہے جو عالم غیب کی کسی بستی میں زیارتِ قبر کرنے جایا کرتی تھیں یا وہ ان ظاہری قبروں پر ہی جاتی تھیں جنہیں قبریں کہنے سے مخالفین نے انکار کیا ہے۔

(۱۵) جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام

---

[۱] جامع ترمذی جلد ۱ ص ۱۲۵ [۲] مستدرک حاکم جلد ۱ ص ۳۶۶ [۳] رواہ ابوداؤد جلد ۲ ص ۱۰۵ سنن نسائی جلد ۱ ص ۲۲۲ طیالسی ص ۳۵۷ اولہ فی المشکوٰۃ ص ۱۵۴ وتمامہ فی ص ۷۱

بعد نزول وفات پاکر میرے مقبرے میں دفن ہوں گے۔ تو آپ نے لفظ قبر سے کون سی جگہ مراد لی تھی یہی مدینہ منورہ کا روضہ اطہر یا اعلیٰ علیین کی کوئی وادی ــــ اس پہ کبھی فرصت میں غور فرمالیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :-

ینزل عیسیٰ ابن مریم الی الارض فیتزوج ویولد له ویمکث خمسا واربعین سنة ثم یموت فیدفن معی فی قبری فاقوم انا وعیسیٰ ابن مریم فی قبر واحد بین ابی بکرؓ وعمرؓ۔[1]

ترجمہ : حضرت عیسیٰ بن مریم نیچے اتریں گے آپ نکاح کریں گے آپ کے اولاد بھی ہوگی پینتالیس سال یہاں ٹھہریں گے پھر آپ کی وفات ہوگی اور میری قبر کے پاس میرے ساتھ دفن ہوں گے۔ میں اور عیسیٰ بن مریم ایک قبر (مقبرے) سے اٹھیں گے اور ہم دونوں ابوبکرؓ اور عمرؓ کے مابین ہوں گے۔

(۱۶) ایک اور جگہ ارشادِ نبوی ہے :-

لینزلن عیسیٰ ابن مریم ثم لئن قام علی قبری ... لاجیبنه۔[2]

ترجمہ : حضرت عیسیٰ بن مریم ضرور اتریں گے پھر اگر وہ میری قبر پہ (سلام کے لیے) ٹھہرے اور سلام کہا تو میں ضرور اس کا جواب دوں گا۔

(۱۷) حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب یہ حدیث فرما رہے تھے تو آپ قبر کسے کہہ رہے تھے؟

اللّٰھم لا تجعل قبری وثنا یصلّی الیه فانه اشتد غضب اللّٰہ علیٰ قوم اتخذوا قبور انبیاءھم مساجد۔[3]

ترجمہ : اے اللہ! میری قبر کو معبود نہ بننے دینا جس کی طرف لوگ سجدے کریں۔ اس قوم پر اللہ کا غضب بھڑکا جس نے اپنے نبیوں کی قبروں کو جائے عبادت بنالیا۔

---

[1] مشکوٰۃ صفحہ ۴۸۰ [2] روح المعانی جلد ۲۲ صفحہ ۳۵ الحاوی للسیوطی جلد ۲ صفحہ ۲۹ [3] المصنف لعبدالرزاق جلد ۱ صفحہ ۴۰۶ ونحوہ فی جلد ۸ صفحہ ۴۶۴

من زار قبری وجبت له شفاعتی۔[1]

ترجمہ: جس نے میری قبر کی زیارت کی اس کے لیے میری شفاعت لازم ہوگئی۔

اس میں کس قبر کی زیارت کے لیے کہا جارہا ہے۔ یہی نا کہ جسے ہم روضۂ رسول کہتے ہیں

(۱۸) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ فرمایا تو آپ کے ذہن میں قبر کے کیا معنی تھے؟

الارض کلھا مسجد الا القبر والحمام۔[2]

ترجمہ: کل صفحۂ زمین (میرے دین میں) مسجد ہے سوائے قبر اور حمام (جائے غسل) کے۔

(۱۹) پھر آپ جب حضرت موسٰے علیہ السلام کی قبر کے پاس سے گزرے تو وہ قبر کیا آپ نے اعلیٰ علیین میں پائی تھی یا اسی زمین کے ایک سُرخ ٹیلے کے پاس آپ نے اُس کا مشاہدہ کیا تھا؟

مررت علیٰ موسیٰ لیلۃ اسریٰ بی عند الکثیب الاحمر وھو قائم یصلی فی قبرہ۔[3]

ترجمہ: جس رات مجھے معراج کی سیر کرائی گئی میرا گزر موسٰے پر ہوا وہ سرخ ٹیلے کے پاس تھی میں نے آپ کو اپنی قبر میں نماز پڑھتے پایا۔

ہم یہ کیسے مان لیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جسد اصلی تو قبر میں صرف محفوظ پڑا تھا اور اس پر ایک مثالی جسد کھڑا نماز پڑھ رہا تھا۔ ہمیں ان لوگوں پر تعجب آتا ہے جو اس قسم کا عقیدہ رکھ کر خود بھی بھٹکے اور اوروں کو بھی بھٹکا رہے ہیں اللہ اُن پہ رحم کرے۔

(۲۰) حضورؐ کے نماز جنازہ پڑھانے سے اللہ تعالیٰ قبروں کو اموات پر منور اور روشن فرما دیتے ہیں۔[4]

اس سے پتہ چلتا ہے کہ میت کو قبر میں اس قدر ادراک اور احساس ضرور ملتا ہے کہ وہ اس کی روشنی اور اندھیرے میں فرق کر سکے اور میت پر اس کا اثر پڑے ورنہ مردہ لاش اور جماد محض کو روشنی اور اندھیرا دونوں برابر ہیں۔ پھر حضورؐ نے وہاں کی روشنی کو کیوں اہمیت دی کچھ سوچیں۔

---

[1] رواہ البزار والدارقطنی عن ابن عمر مرفوعًا۔ قال القاری فی شرح الشفاء صححہ جماعۃ من ائمۃ الحدیث جلد ۸ صفحہ ۲۶۴

[2] المصنف جلد ۱ صفحہ ۴۰۵ [3] سنن کبریٰ جلد ۳ صفحہ ۲۴۸ صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۲۶۸ [4] صحیح مسلم جلد ۱ صفحہ ۳۱۰ سنن کبریٰ جلد ۴ صفحہ ۴۶

قبر کا اطلاق ــــ صحابہ کرامؓ کے بیانات میں

(۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب صحابہؓ کے ساتھ دو قبروں کے پاس سے گزرے تھے جن میں مردوں کو عذاب ہو رہا تھا تو وہاں قبر سے یہ گڑھے ہی نہیں تو اور کیا مراد تھی؟ اور کھجور کی ٹہنی اس گڑھے پر رکھی تھی یا عالمِ غیب کی کسی اور وادی کے مقام پر ــــ اس پہ غور فرماویں اور کبھی یہ نہ کہیں کہ شریعت میں قبر اس گڑھے کا نام نہیں. حدیث میں صاف طور پہ انہیں قبر کہا گیا ہے. سیدنا حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں:۔

مر النبی صلی اللہ علیہ وسلم بقبرین فقال انہما لیعذبان۔[۱]

ترجمہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دو قبروں کے پاس سے گزرے. آپ نے فرمایا. ان دونوں کو عذاب ہو رہا ہے (یہ قبریں کہاں تھیں؟ اسی زمین پہ تو تھیں).

(۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ اُحد کے بعد جب شہداء کو دفن کرنے لگے تو حضرت فرماتے ہیں:۔

کان یجمع الثلاثۃ والاثنین فی قبر واحد۔[۲]

ترجمہ: حضورؐ تین تین اور دو دو شہیدوں کو ایک قبر میں دفن کرتے رہے۔

(۳) حضرت عمرؓ نے ایک شخص کو ایک قبر کے پاس نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو فرمایا:۔

القبر القبر۔[۳] یہ سامنے قبر ہے قبر ہے

یعنی قبر سامنے ہو تو نماز نہ پڑھنی چاہیئے۔

(۴) حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کہتے ہیں کہ:۔

---

[۱] مشکوٰۃ ص۴۲ صحیح بخاری جلد ۱ ص۲۵ صحیح مسلم جلد ۱ ص۱۴۱ [۲] مستدرک حاکم جلد ۱ ص۳۶۵ [۳] صحیح بخاری جلد ۱ ص۶۱

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ادخل رجلاً قبرہ لیلاً واسرج فی قبرہ۔[1]

ترجمہ۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو رات کے وقت قبر میں اُتارا اور اس کی قبر میں روشنی کی۔

(۵) حضرت بریدہؓ نے وصیت کی کہ میری قبر پہ کھجور کی دو ٹہنیاں گاڑ دینا۔ حضرت امام بخاریؒ نقل فرماتے ہیں کہ:۔

واوصٰی بریدۃ الاسلمی ان یجعل فی قبرہ جریدا۔[2]

ترجمہ۔ حضرت بریدۃ الاسلمیؓ نے وصیت کی کہ ان کی قبر میں کھجور کی ٹہنی رکھ دینا۔

یہاں قبر سے اُن کی کیا مراد تھی؟ یہی گڑھا یا کچھ اور۔

(۶) حضرت عمرو بن عاصؓ (۴۳ھ) نے بھی اپنے بیٹے کو وصیت کی کہ مجھے دفن کرنے اور میری قبر پہ مٹی ڈالنے کے بعد وہاں اتنا کھڑا رہنا جتنے میں اُونٹ ذبح کرکے بانٹا جا سکتا ہے تاکہ میں تم سے مانُوس رہ کر خدا کے بھیجے ہوؤں (منکر نکیر) کا جواب دے سکوں۔ آپ نے فرمایا:۔

ثم اقیموا حول قبری قدر ما ینحر الجزور ویقسم لحمہا حتی استانس بکم واعلم ماذا اراجع بہ رسل ربی۔[3]

ترجمہ۔ پھر تم میری قبر کے گرد ٹھہرنا اتنا وقت کہ اونٹ ذبح کیا جائے اور اس کا گوشت تقسیم ہو جائے میں تم سے (اس دوران) مانوس رہوں گا اور جان لوں گا کہ اپنے رب کے بھیجے ہوؤں کو کیا جواب دوں۔

(۷) حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں:۔

من السنۃ ان تأتی قبر النبی صلی اللہ علیہ وسلم من قبل القبلۃ وتجعل ظہرک الی القبلۃ وتستقبل القبر بوجہک۔[4]

---

[1] سنن ابن ماجہ ص۱۱۰ جامع ترمذی جلد ا ص۱۲۵ [2] صحیح بخاری جلد ا ص۱۸۱ [3] صحیح مسلم جلد ا ص۷۶ [4] مسند امام اعظم ص۱۲۶

ترجمہ۔ سنت یہ ہے کہ تم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پہ قبلہ کی طرف سے آؤ پھر تمہاری پشت قبلہ کی طرف رہے اور تمہارے چہرے کا رخ قبر کی طرف رہے

(۸) حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں :۔

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم صلی علی قبر امرأۃ بعد ما دفنت۔[1]

ترجمہ۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عورت کی قبر پہ اس کی نماز (جنازہ) پڑھی یہ اس کے دفن کے بعد ہوا۔

قرآن کریم۔ احادیث نبویہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام اور آثارِ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی شہادتیں آپ نے سن لیں کہ وہ کن جگہوں کو قبر کہتے تھے اور ان میں سے بیشتر حوالے اسی زندگی کے ہیں جو اس عالم دنیا اور عالم آخرت کے درمیان کی زندگی ہے اور دونوں کے مابین برزخ ہے۔ اس کی بحث میں قبر اسی جگہ کو کہا گیا ہے جو یہاں زمین پہ ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اسی زمین کو حکم دیتے ہیں کہ فلاں میت پر سمٹ کر اکٹھی ہو جا اور پھر اس کی پسلیاں آر پار ہو جاتی ہیں یہ واقعہ عالم غیب کی کسی علیحدہ وادی میں پیش نہیں آتا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :۔

فیقال للارض التئمی علیہ فتلتئم علیہ فتختلف اضلاعہ۔[2]

ترجمہ۔ پھر اس زمین کو حکم ہوتا ہے اس میت پہ سمٹ کر اکٹھی ہو جا سو زمین اس پہ سمٹتی ہے اور اس کی پسلیاں آر پار ہو کر دب جاتی ہیں۔

یہ عذاب یہاں دیکھنے والوں کو نظر نہیں آرہا۔ اس اعتبار سے یہ بے شک عالم غیب ہے۔ لیکن یہ کہنا کہ یہ قبر حقیقت میں قبر ہی نہیں۔ لسانِ شریعت کے ان عام اطلاقات کا کھلا انکار اور تواترامت سے ایک کھلا ٹکراؤ ہے۔ مخالفین جس دیدہ دلیری سے ظاہر شریعت کا انکار کر رہے ہیں اس میں وہ قبروں کے پاس پڑے ملنگوں کو بھی پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔

---

[2] رواہ الترمذی جلد ا صہ۱۲۷

معنیٰ قبر پر حضرت امام ابو حنیفہؒ کی شہادت

اب آئیے یہی اطلاق حضرت امام ابو حنیفہؒ (۱۵۰ھ) سے سن لیں صحابہؓ کے بعد انہی کا درجہ ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔ حافظ ابن الہمام الاسکندریؒ (۸۶۱ھ) سے منقول ہے:۔

عن ابی حنیفة ان الزائر یستقبل القبر ویستدبر القبلة۔[1]

ترجمہ۔ امام ابو حنیفہؒ سے مروی ہے کہ (روضہ پر) حاضری دینے والا زائر قبر کے سامنے سے آئے اور قبلہ کو پس پشت رکھے۔

فقہ کی کتابوں سے ہمیں مزید شواہد پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ حدیث اور فقہ میں قبر سے مراد یہی گڑھے ہیں۔ حدیث و فقہ سے دین کی اصل مراد معلوم ہوتی ہے۔ دین کلام میں متوازی نظریات کا رد اور استدلال میں عقل و امکان کا دخل ساتھ ساتھ رہتا ہے۔ قبر کے جو معنی ہم نے بیان کئے ہیں وہ حدیث و فقہ کی اصطلاح میں ہیں اور متکلمین جب معتزلہ کے امکانی سوالات کو اپنے جواب میں لپیٹتے ہیں تو قبر کے معنی وسیع کرتے ہیں۔ اسے اس گڑھے تک نہیں رہنے دیتے جو زمین میں دکھائی دیتا ہے۔ ان مردوں کے لیے جو ڈوب جائیں یا جل جائیں یا جانوروں کے پیٹ میں چلے جائیں انہیں ایک قبر کا پتہ دینا ہوتا ہے۔ اس موقعہ پہ وہ کہتے ہیں کہ قبر صرف اس گڑھے کو ہی نہیں کہتے۔ یہ عالم برزخ کی ایک منزل ہے۔ محدثین جب ان کی بات نقل کرتے ہیں تو وہ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے، نہ یہ کہ یہ حدیث و فقہ کی اصطلاح ہے:۔

ولیس المراد به الحفرة التی یدفن فیه المیت فرب میت لا یدفن کالغریق والمحروق والماکول فی بطن الحیوانات یعذب وینعم ویسأل۔[2]

ترجمہ۔ قبر سے مراد یہی جگہ نہیں جس میں میت دفن کی جاتی ہے کئی اموات کو تو دفن ہونے تک کی نوبت نہیں آتی جیسے کوئی ڈوب جائے یا جل جائے یا جیسے جنگل کے حیوانات

---

[1] العرف الشذی ص ۲۰۲ [2] تنقیح اللمعات جلد ۱ ص ۱۸۹

کھالیں اور وہ آن کے پیٹ میں ہو اسے بھی تو عذاب قبر ہوتا ہے اور سوال وجواب کی نوبت آتی ہے۔

قاضی شمس الدین صاحبؒ بھی اقرار کرتے ہیں :۔

اس میں شک نہیں کہ اس محسوس محفور فی الارض کو ہی عرف عام اور فقہ کی اصطلاح میں قبر کہتے ہیں اور کتب فقہ کے باب الجنائز میں جس قبر کے احکام مذکور ہیں وہ یہی محسوس محفور فی الارض ہے۔ مگر علم کلام میں جہاں قبر کے ثواب۔ حساب اور عذاب کا ذکر ہے اس سے مراد عالم برزخ ہے۔[1]

ہمیں متکلمین کی اس اصطلاح سے انکار نہیں لیکن ہم اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ مراد حدیث کو فقہاء ہی زیادہ جانتے ہیں اور اس کا خود محدثین کو اعتراف ہے۔ امام ترمذی باب غسل میت میں۔ اس کی تصریح کر چکے ہیں۔

قارئین یہاں دیکھ لیں حدیث و فقہ کے سہارے کون لوگ چل رہے ہیں اور کون لوگ متکلمین کی اصطلاحات سے احادیث کی تشریح کے درپے ہیں۔ حدیث و فقہ کو علم کلام کے تابع کرنا ہمیں سمجھ میں نہیں آتا۔ علم کلام تو مرتب ہی حضورؐ کے بہت بعد ہوا ہے۔

الانبیاء احیاء فی قبورھم یصلّون الفاظ حدیث کے ہیں۔ ان میں قبر کا معنی علم کلام سے لینا اور فقہ کی اصطلاح سے کھیلنا یہ کون سا انصاف ہے اور کون سی شان علم ہے۔

شہداء اُحد کی قبریں اسی زمین پر ہیں اُن پر سے حضورؐ گزرے اور فرمایا :۔

اللّٰھم ان عبدک و نبیّک یشھد ان ھٰؤلاء شھداء وانھم من زارھم او سلم علیھم الٰی یوم القیٰمۃ ردّوا علیہ[2]

ترجمہ۔ اے اللہ! تیرا نبی اور تیرا بندہ گواہی دیتا ہے کہ یہ شہداء ہیں (اشارہ انہی زمین کی قبروں کی طرف ہے اور) جو اُن کی زیارت کرتا ہے یا اُن پر سلام بھیجتا ہے قیامت تک یہ اُن کو جواب دیتے رہیں گے۔

---

[1] مسالک العلماء صفحہ ۶۶ [2] وفاء الوفاء صفحہ ۹۳۲

پھر آپ حضرت مصعب بن زبیرؓ کی قبر پر ٹھہرے اور فرمایا :-

اللھم ان عبدك ونبيك يشهد ان هؤلاء شهداء فأتوهم وسلموا عليهم فلن يسلم عليهم احد ما قامت السموات والارض الا ردوا عليه[1]

اے اللہ! تیرا نبی اور تیرا بندہ گواہی دیتا ہے کہ یہ شہداء ہیں. لوگو! ان کے پاس آؤ (انہی قبروں کے پاس نہ کہ علیین میں) اور ان پر سلام پڑھو. جب تک زمین و آسمان قائم ہیں تو یہ سلام پڑھنے والوں کا جواب دیتے ہیں.

آپ کا یہ فرمانا کہ لوگو! ان کے پاس آؤ. عالم برزخ کی کسی نادیدہ بستی میں آنے کی تلقین نہ تھی. اعلیٰ علیین یا سجین نیکوں اور بروں کے قبرستان نہیں ہیں. یہ تو ملأ اعلیٰ کے دفتر کا نام علیین ہے جہاں مقربین نام لکھانے کے لیے حاضری دیتے ہیں یہ قبریں نہیں ہیں.

قبر اعلیٰ علیین یا سجین کا کوئی مقام نہیں. یہ اسی زمین کی جگہ اور مٹی کا گھر ہے. جسے متعارف زبان میں قبر کہتے ہیں. احادیث نبویہ اطلاقات صحابہؓ اور امام ابوحنیفہؒ کی شہادت آپ کے سامنے ہے. اگر اس پر بھی تسلی نہیں تو خود قبر سے ہی سن لیں. وہ کیا کہتی ہے. حضرت ابوسعید الخدریؓ کہتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ قبر کا ذکر فرماتے ہوئے کہ وہ تمام لذتوں کو مٹا دیتی ہے قبر کی اپنی فریاد ان لفظوں میں نقل فرمائی :-

انا بيت الغربة وانا بيت الوحدة وانا بيت التراب وانا بيت الدود رواه الترمذى[2]

ترجمہ. میں غربت کا گھر ہوں، تنہائی کا گوشہ ہوں، میں مٹی کا ٹھکانہ اور کیڑوں کی زد میں ہوں.

کیا مٹی کا ٹھکانا علیین میں ہو سکتا ہے اور کیا علیین تنہائی کا گوشہ ہے یا وہاں ارواح کے مسکن ہیں ـــــ یاد رکھیے قبر آخر قبر ہے. اور وہ یہی ہے

---

[1] وفاء الوفاء ص ۹۳۱ [2] مشکوٰۃ ص ۴۵۷

معنی قبر پر فریقین کا اتفاق

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب دامت برکاتہم مہتمم دار العلوم دیوبند نے ۲۲ جون ۱۹۶۲ء کو جامعہ عثمانیہ حنفیہ راولپنڈی میں شیخ القرآن مولانا غلام اللہ خاں صاحب اور قاضی شمس الدین صاحب اور حضرت مولانا قاضی نور محمد صاحبؒ کے سامنے یہ تحریر لکھی۔ اور حضورؐ کی مدینہ منورہ کی قبر مبارک کو ہی آپ کی برزخی زندگی کا محل قرار دیا۔ حضرت قاری صاحب دامت برکاتہم نے یہ تحریر لکھی اور اس پر ان تینوں حضرات نے دستخط کئے:۔

وفات کے بعد نبی کریم کے جسد اطہر کو برزخ قبر شریف میں بہ تعلق روح حیات حاصل ہے اور اس حیات کی وجہ سے روضہ اطہر پر حاضر ہونے والوں کا صلوٰۃ وسلام سنتے ہیں[1] محمد طیب حال وارد راولپنڈی ۲۲ جون ۱۹۶۲ء

اس سے یہ نزاع ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی کہ یہ ظاہری قبریں برزخی منازل نہیں ہیں اب اس پر سب کا اتفاق ہو گیا ہے کہ یہاں کی قبر ہی آخرت کی پہلی منزل ہے جس میں میت کو اتارا جاتا ہے۔ رہیں برزخ کی واردات، تو یہ یہاں کی آنکھوں سے پوشیدہ ہیں۔

قبر اگر صرف گڑھا ہے تو اس پر دعا کیوں؟

اگر یہ گڑھا جس میں میت رکھی گئی، قبر نہیں۔ وہاں صرف ایک محض بے جان لاش دھری ہے، جس سے قیامت تک روح کا تعلق نہیں تو اس پر میت کے لیے دعا کرنا کس لیے ہے؟ وہاں تو مرنے والا نہیں ہے۔

ہمارے یہ کرم فرما کہتے ہیں زیارت قبور صرف اس لیے ہے کہ یہ تمہیں آخرت یاد کرائیں۔ ہم عرض کرتے ہیں یہ صرف کی قید آپ نے کہاں سے لگائی ہے۔ تذکیر آخرت سے ہمیں

---

[1] دیکھئے ماہنامہ تعلیم القرآن راولپنڈی ص ۵۳ ماہ اگست ۱۹۶۲ء

انکار نہیں۔ یہ تو اپنے فائدے کے لیے ہے۔ لیکن کیا مرحوم کے فائدے کے لیے وہاں جانا اور اس کے لیے دعا کرنا کیا یہ شریعت میں ثابت نہیں؟

اگر وہاں ایک محض بے جان ڈھیر پڑا ہے اور یہ قبر نہیں جس پہ ایلام وتنعیم کی کیفیات گزرتی ہوں تو پھر وہاں حاضری اور اس کے لیے دعا، اس کا کیا معنیٰ رہ جاتا ہے۔

قبر پہ دعا کے لیے حاضری کا ذکر تو قرآن کریم میں بھی ملتا ہے:۔

ولا تصل علی احدٍ منھم مات ابداً ولا تقم علی قبرہ۔

(پ۱۰: التوبہ: ع ۱۱)

ترجمہ۔ اور آپ ان میں کسی کی جو مر جائے کبھی نماز جنازہ نہ پڑھیں اور نہ اس کی قبر پر کبھی دعا کے لیے کھڑے ہوں۔

یہ قبر پر کھڑا ہونا نماز جنازہ کے علاوہ ہے —— کس لیے؟ دعا کے لیے —— حافظ ابن کثیرؒ (۷۷۴ھ) لکھتے ہیں اس آیت کے نازل ہونے کے بعد حضورؐ نے کسی منافق کی نماز جنازہ نہ پڑھی، نہ کبھی اس کی قبر پہ دعا کی —— یہاں قبر سے کون سی قبر مراد ہے؟

فما صلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعدہ علی منافق ولا قام علی قبرہ حتی قبضہ اللہ[1]

سیدنا حضرت عثمان روایت کرتے ہیں:۔

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا فرغ من دفن المیت وقف علیہ فقال استغفروا لاخیکم ثم سلوا لہ التثبیت فانہ الآن یسئل[2]

ترجمہ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب دفن میت سے فارغ ہوتے تو اس کی قبر پہ کھڑے ہوتے اور فرماتے اپنے بھائی کے لیے مغفرت کی دعا مانگو اور اس کے لیے اللہ سے ثابت قدمی مانگو اسے اب پوچھا جا رہا ہے۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر جلد ۲ صفحہ ۳۸۶ [2] سنن ابی داؤد، مشکوٰۃ صفحہ ۲۶

اگر یہ سوال و جواب اسی قبر میں نہیں تو اس قبر پہ کھڑے ہو کر اس کے لیے دُعا کیوں؟
کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بقیع کے قبرستان میں جانا اور وہاں ان لوگوں کے لیے ہاتھ اٹھا کر دُعا کرنا کیا حدیث سے ثابت نہیں؟

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ حضرت عبداللہ ذوالجنادین کے جنازہ میں موجود تھے۔ آپ کہتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب اُن کے دفن سے فارغ ہوئے تو وہیں قبلہ رُخ ہوئے اور مرحوم کے لیے دعا فرمائی :-

فلما فرغ من دفنه استقبل القبلة رافعًا يديه[1]

ترجمہ: جب آپ اس کے دفن سے فارغ ہوئے تو قبلہ رخ ہوئے اور ہاتھ اُٹھا کر دعا فرمائی۔

اگر قبر میں محض ایک بے جان لاشہ پڑا ہے تو فاتحِ مصر سیدنا حضرت عمرو بن عاصؓ اپنے بیٹے جلیل القدر محدث حضرت عبداللہ بن عمروؓ (۶۷ھ) کو یہ کیوں کہہ رہے ہیں کہ جب تم میرے دفن سے فارغ ہو جاؤ، تم سب میری قبر کے ارد گرد کچھ عرصہ ٹھہرے رہنا۔ تاکہ میں تمہاری حاضری سے انس پکڑوں اور اپنے رب کے بھیجے ہوؤں (منکر و نکیر) کو بات لوٹا سکوں، جواب دے سکوں :-

ثم اقيموا حول قبري قدر ما ينحر جزور ويقسم لحمها حتى استانس بكم واعلم ماذا اراجع به رسل ربي۔[2]

یہاں حضرت عمرو بن العاصؓ اپنی کس قبر کے گرد ٹھہرنے کی نصیحت فرما رہے ہیں؟ اسی قبر پر جس میں لوگوں نے اس وقت آپ کو اتارا ہے۔ یہ سوال و جواب جس پر پورا اترنے کی آپ کی تمنا ہے کہاں ہوں گے؟ اعلیٰ علیین میں یا اس قبر میں — اگر اس قبر میں نہیں یہ محض ایک گڑھا ہے تو خدارا انصاف کیجیے حضرت عمرو بن العاصؓ انہیں اس قبر کے گرد کھڑا کر کے کس طرح ان سے مانوس ہونے کے طلب گار ہیں۔

---

[1] رواہ ابو عوانہ فتح الباری جلد ۱۱ ص ۱۲۲ [2] صحیح مسلم جلد ۱ ص ۷۶، مسند احمد جلد ۴ ص ۱۹۹

سوال وجواب اسی قبر میں

قبر کا سوال وجواب عالم برزخ میں ہے یا اسی قبر میں ؟ پھر بعض اوقات یہ صورت بھی ہوتی ہے کہ مرنے والے کی ظاہری قبر بنی ہی نہیں. سو اس سے سوال کہاں ہو گا ؟ حضرت ملا علی قاریؒ اس حدیث کی بحث میں کہ میت سے سوال قبر میں ہوتا ہے (اذا اسئل فی القبر) لکھتے ہیں کہ حضورؐ نے لفظ قبر کی تخصیص اس لیے کی کہ عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے قبریں بنتی ہیں اور میتیں ان میں اُتاری جاتی ہیں. سو لفظ قبر کی تخصیص اس عام عادت کی بنا پر ہے. ورنہ جس جگہ میت یا اس کے بدن کے اجزاء ہوں (جیسے مچھلیوں کے پیٹ یا درندوں کے پیٹ) وہی اس کی قبر ہو گی اور وہیں اس سے سوال ہو گا. ملا علی قاری لکھتے ہیں:-

اذا سئل فی القبر التخصیص للعادة او کل موضع فیه مقره فهو قبره[1]

ترجمہ. جب قبر میں سوال ہو قبر کی تخصیص اس لیے ہے کہ عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے یا ہر وہ جگہ جہاں اس میت کا مقر ہے وہی اس کی قبر ہے (وہاں یہ سوال وجواب ہوتے ہیں).

یہاں لفظ او (حرف تردید) عام قبروں کے مقابلے میں ہے کہ کبھی قبر کی صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ عادتِ عام میں قبر دکھائی نہ دے.

افسوس کہ بعض نادان اس عبارت کو سمجھ نہیں پائے اور انہوں نے اس سے علیین اور سجین کے مقامات مراد لے لیے. کاش! کہ یہ لوگ اسی صفحہ پہ ملا علی قاریؒ کے یہ الفاظ بھی پڑھ لیتے کہ اللہ تعالیٰ مومنین کو آخرت میں سوال وجواب کے وقت ثابت قدم رکھتا ہے. آپ اس بحث میں لکھتے ہیں:-

(وفی الآخرة) ای البرزخ وغیره وقیل فی القبر عند السوال وهو الصحیح کما وقع به التصریح[2]

---

[1] مرقات جلد ا ص۱۹۷ [2] ایضاً

ترجمہ: آخرت سے مراد عالم برزخ یا کوئی اور جگہ ہے جہاں سوال ہوتا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا برزخ یعنی قبر اور یہ دوسری بات صحیح ہے۔

اس سے یہ بھی پتہ چلا کہ قیل ہمیشہ ضعف مقولہ کے لیے نہیں آتا کبھی صورت برعکس بھی ہوتی ہے جیسا کہ یہاں ہے۔ قبر کا سوال و جواب برحق ہے اور میت کے لیے ثابت قدمی کی دعا بھی بلاشبہ درست ہے۔

قاضی شوکانی ؒ (۱۲۵۵ھ) بھی ایک مقام پر لکھتے ہیں:۔

فیہ مشروعیۃ الاستغفار للمیت عند الفراغ من دفنہ وسوال التثبیت لہ لانہ یسئل فی تلک الحال وفیہ دلیل علی ثبوت حیاۃ القبر وقد وردت بذلک احادیث کثیرۃ بلغت حد التواتر وفیہ ایضاً دلیل علی ان المیت یسئل فی القبر وقد وردت بہ ایضاً احادیث صحیحۃ فی الصحیحین وغیرہما وورد ایضاً ما یدل علی ان السوال فی القبر مختص بھذہ الامۃ کما فی حدیث زید بن ثابت عند مسلم ان ھذہ الامۃ تبتلی فی قبورھا وبذلک جزم الحکیم الترمذی۔[1]

ترجمہ: اس میں میت کے لیے دفن سے فراغت کے مغفرت طلب کرنے کی مشروعیت اور اس کے لیے ثابت قدمی کی دعا ہے کیونکہ اس وقت اس سے سوال کیا جا رہا ہوتا ہے اور یہ حیات فی القبر کے ثبوت کی بھی دلیل ہے اور اس موضوع (حیات فی القبر) پر اس قدر احادیث وارد ہیں کہ وہ تواتر کی حد کو پہنچتی ہیں اور اس میں اس پر بھی دلیل ہے کہ میت سے سوال و جواب قبر میں ہوتے ہیں اور اس پر بھی صحیح احادیث صحیح بخاری، صحیح مسلم اور دوسری کتابوں میں وارد ہیں اور ایسی روایات بھی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ قبر میں سوال اسی امت سے خاص ہے جیسا کہ صحیح مسلم میں زید بن ثابت ؓ کی روایت میں ہے کہ اس امت کو ان کی قبروں میں ایک ابتلاء کا سامنا ہے اور حکیم ترمذی (صاحب نوادر الاصول) اسی کے قائل تھے۔

---

[1] نیل الاوطار جلد ۴ ص ۱۳۹

مقر اموات بھی زمین ہے

جس طرح زندوں کی بہاریں اس زمین پر آتی ہیں اموات کے جملہ حالات بھی اسی زمین پہ واقع ہوتے ہیں۔ یہ زمین زندوں اور مردوں دونوں کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔

قرآن کریم میں ہے:۔

الم نجعل الارض کفاتاً ○ احیاء و امواتاً ○ (پ ۲۹ المرسلات آیت ۲۵-۲۶)

ترجمہ۔ کیا ہم نے زمین کو سمیٹ کر رکھنے والی نہیں بنایا؟ (کن کو سمیٹ کر رکھنے والی) زندوں اور مُردوں کو۔

یہ آیت بتلاتی ہے کہ جس طرح زندوں پہ راحت و تکلیف اسی زمین پر آتی ہے، اموات پر تکلیف و راحت بھی اسی زمین پر اُترتی ہے۔ عذابِ قبر اسی زمین میں ہوتا ہے۔ قیامت تک کے جملہ حالات اسی پر یہیں گزریں گے اور پھر یہیں سے حشر کے لیے اُٹھنا ہو گا۔

حضرت شیخ الاسلامؒ لکھتے ہیں:۔

زندہ مخلوق اسی زمین میں بسر کرتی ہے اور مُردے بھی اسی مٹی میں پہنچ جاتے ہیں۔ انسان کو زندگی بھی اسی خاک سے ملی اور موت کے بعد بھی یہی اس کا ٹھکانہ ہوا تو دوبارہ اسی خاک سے اُٹھا دینا کیوں مشکل ہوا ..... جو خدا اس حقیر زمین میں اپنی قدرت کے متضاد نمونے دکھلاتا ہے اور موت و حیات اور سختی و نرمی کے مناظر پیش کرتا ہے۔ کیا وہ میدانِ حشر میں سختی و نرمی اور نجات و ہلاکت کے مختلف مناظر نہیں دکھلا سکتا۔[1]

جب انسانوں کی تکلیف و راحت اسی زمین پہ ہے اور آخرت کی نجات و ہلاکت بھی اسی زمین پہ واقع ہو گی تو انسان کی درمیانی منزل (موت کے بعد اور قیامت سے پہلے کی)

---

[1] تفسیر عثمانی صفحہ ۵۵۰

کیا اس زمین سے جُدا کسی اور زمین پر واقع ہے؟ کیا خدا اس منزل کے مختلف مناظر راحت قبر ہو یا عذاب قبر اس زمین میں واقع نہیں کر سکتا۔ جسے اس دُنیا والوں کی آنکھیں نہ دیکھ سکیں اور نہ یہاں کے کان سُن سکیں۔

آپ ارواح کے مقر علیین یا سجین کو ٹھہرالیں آپ کو کون روکتا ہے۔ لیکن ابدان یا ابدان کے منتشر ذرات پر جو کچھ گزرتی ہے اُسے زمین سے جوڑے رکھیں تو اس کے لیے آپ اپنے آپ کو اتنی بات نہیں سمجھا سکتے کہ ارواح جہاں بھی ہوں اُن کے زیر اثر یہ زیر زمین ابدان ان برزخی حالات سے یقیناً گزر رہے ہیں جن کی قرآن وحدیث میں خبریں دی گئی ہیں۔ کیا مرنے کے بعد یہی زمین ہمارا ٹھکانہ نہیں اور کیا یہیں سے ہمیں حشر کے لیے نہیں اٹھنا؟ کیا قرآن نے نہیں کیا؟

منها خلقنا کم و فیها نعید کم و منها نخرجکم تارۃً اخری[۱]

ترجمہ: ہم نے تمہیں اسی مٹی سے پیدا کیا اور اسی میں ہم تمہیں لوٹائیں گے اور پھر اسی سے دوبارہ نکالیں گے۔

جو انسان ہوائی جہاز کے حادثے میں جلے وہ بھی اسی زمین سے اُٹھیں گے اور جو دریاؤں میں ڈوبے وہ بھی اسی زمین سے نکلیں گے، جنہیں جانور کھا گئے وہ بھی اسی زمین سے نکلیں گے، جنہیں باقاعدہ قبریں نصیب ہوئیں وہ بھی اسی زمین سے نکلیں گے۔ قرآن پاک کی یہ آیات بتلاتی ہیں کہ مرنے کے بعد انسان کا ٹھکانہ اسی زمین میں ہے اور اسی زمین پر انسان پر راحت والم کے جملہ حالات گزرتے ہیں۔

گو ہمارے اور ان حالات کے مابین ایک پردہ ہے جو نہ ہٹتا ہے، نہ پھٹتا ہے، مگر بعض خاصان خدا کے لیے وہ کبھی کرامۃً اٹھتا بھی ہے یہ یہاں رہتے ہوئے بھی وہاں کی کوئی جھلک دیکھ پاتے ہیں۔

عالمِ برزخ کے لیے کسی اور زمین کی تلاش نہ کرو

احبابِ گرامیِ قدر! تم اس برزخی زندگی کے لیے کسی اور زمین کی تلاش میں کیوں کھو گئے۔ خدا نے جب ہمیں اسی زمین سے اُٹھانا ہے تو اس سے پہلے کی پردے کی زندگی کیا اسی زمین میں نہیں ہو سکتی؟ کیا تم اسی لیے کسی اور زمین کی تلاش میں نکلے ہو کہ یہ زندگی تمہیں نظر نہیں آ سکتی پردے میں ہے اس لیے اس کا ماننا مشکل ہے کیا یومنون بالغیب (وہ بن دیکھے ایمان لاتے ہیں) اس امت کی شان نہیں؟ قرآن و حدیث چھوڑ کر تم کس فلسفی یا صوفی کے دامن میں پناہ لو گے کہ قبر اس زمین پر نہیں کسی اور جگہ کا نام ہے۔

اگر کسی صوفی نے یہ کہہ دیا کہ قبر اس گڑھے کا نام نہیں تو تم نے اس سے یہ کیسے سمجھ لیا کہ قبر اس پوری زمین میں ہی کہیں نہیں۔ اگر کسی جلنے والے یا ڈوبنے والے کی قبر کہیں گڑھے کی صورت میں نہیں تو اس سے یہ کیسے نکل آیا کہ وہ پوری زمین میں کسی غیر مرئی صورت میں بھی کہیں نہیں؟ کیا تم کسی حدیث سے دکھلا سکتے ہو کہ حشر کے دن کچھ مردے جانوروں کے پیٹوں سے نکلیں گے یا دریاؤں اور سمندروں سے اٹھیں گے یا بجلی کے کھمبوں سے اتریں گے جہاں وہ جل کر بالکل بے نشان ہو گئے تھے، اگر آپ کو یہ بات کسی حدیث میں نہیں ملتی تو محض اس لیے کہ ان قبروں کے قبر ہونے کا انکار نہ کریں کہ بعض اموات کو ظاہراً کسی گڑھے میں جگہ نہیں ملتی تھی۔

قرآن و حدیث میں قبر کے معنی وہی ہیں جو عام عرب اپنی زبان کے معروف محاورے میں سمجھ سکتے تھے۔ کسی فوق الادراک منزل میں قبر کی نشاندہی کرنا اس کتاب کی شان نہیں جس کا اپنا دعوٰی یہ ہو:-

ولقد یسرنا القراٰن للذکر فھل من مدکر۔

(پ ۲۷: القمر آیت ۱۷)

ترجمہ: قرآن کو نصیحت پکڑنے کے لیے ہم نے آسان کر دیا ہے۔ سو کیا ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا؟

قرآن کے اسرار و دقائق اپنی جگہ ——— کوئی ان کا انکار نہیں کر سکتا لیکن اس کے اصول ہدایت بہت آسان ہیں۔

دین فطرت عام انسانی سمجھ سے کلیۃً بالا نہیں کہ کسی طرح سمجھ میں ہی نہ آ سکے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے نصیحت حاصل کرنے کے لیے بہت آسان کر دیا ہے۔ سو اس کے الفاظ انہیں معنوں پر محمول ہوں گے۔ جو عرب اس سے اپنے محاورے کے مطابق سمجھ سکتے تھے۔ اگر کچھ باتیں اس سے وراء ہیں تو اللہ تعالیٰ نے خود متشابہات کی نشان دہی کر دی ہے اور بتا دیا ہے کہ کہاں الفاظ اپنی ظاہری معنی میں نہ ہوں گے۔

قبر کے بارے میں قرآن و حدیث میں کہیں نہیں کہ اس سے اس کا ظاہری معنی مراد نہیں ہے اور یہ کہ قبر کسی اور جگہ ہے اس گڑھے میں نہیں۔

بلغنا انه من وقف عند قبر النبی صلی اللہ علیہ وسلم فتلا ھذہ الآیۃ[1]

ان اللہ وملٰئکته یصلون علی النبی یا ایھا الذین اٰمنوا صلوا علیه وسلموا تسلیما

ترجمہ: ہمیں یہ بات پہنچی ہے کہ جو شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پر آئے اور یہ آیت پڑھے۔ اے ایمان والو! اس نبی پر درود و سلام بھیجو۔

پ ۲۲ الاحزاب آیت ۵۶

یہاں ایک عرب قبر کا کیا معنی سمجھ سکتا ہے اور مسلمانوں کے ذہن میں لفظ قبر سے مدینہ منورہ کا روضۂ اطہر ہی آئے گا۔ یا مومن اپنے خیال کی دنیا میں مقام علیین تک اڑے گا۔ آخر کچھ تو سوچئے کہاں تک بہکے چلے جاؤ گے۔

---

[1] قال القاری فی شرحه رواه البیهقی وابن ابی حذیك وثقه جماعة واحتج به اصحاب کتب الستة ومعنی قوله بلغنا،

معنی قبر پر سعودی پیشوا امام عبد العزیز اول کی شہادت

قبر کے جو معنی ہم قرآن و حدیث اور حضرت امام ابو حنیفہؒ کے بیانات سے نقل کر آئے ہیں اس دور متاخرین بھی علماء اسلام نے قبر سے یہ ظاہر قبر ہی مراد لی ہے۔ نجد کے شیخ محمد بن سعود کے بیٹے امام عبد العزیز اول لکھتے ہیں :-

> صحابہ کرامؓ ایک دفعہ قحط سالی کے موقع پر دعاء استسقاء کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا عباس رضی اللہ عنہ کو ساتھ لے کر گئے تھے کہ وہ بارش کے لیے دعا مانگیں۔ جیسا کہ بخاری شریف میں انس بن مالکؓ سے روایت موجود ہے صحابہ کرامؓ نہ تو آپ کی قبر کے پاس آئے نہ وہاں انہوں نے کھڑے ہو کر دعا مانگی۔ حالانکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قبر میں حیات برزخی حاصل ہے۔[1]

یہاں اس بات میں کہ صحابہؓ آپ کی قبر کے پاس نہ آئے کون سی قبر مراد ہے؟ یہی ناکہ جو مدینہ منورہ میں گنبد خضراء میں ہے اور پھر اس کے ساتھ موصوف کا یہ کہنا کہ حضور کو قبر میں حیات برزخی حاصل ہے۔ کیا یہی قبر مراد نہیں؟ علماء نجد کے عقیدہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اسی قبر میں جو زیارت گاہ عوام و خواص ہے برزخی حیات سے زندہ ہیں اور برزخی حیات سے مراد یہ ہے کہ حیات آپ کے جسد اطہر میں پردے میں ہے ہر کوئی اسے نہیں دیکھ پاتا علماء اسلام میں سے آپ کی اس قبر میں حیات کا کسی نے انکار نہیں کیا اور آپ اسی حیات سے (اسے دنیا والے بدن کے اعتبار سے دنیوی کہیں یا پردے میں ہونے کے باعث برزخی کہیں) قبر پہ آنے والوں کا صلوٰۃ و سلام سنتے ہیں۔

ہمیں افسوس اس پہ ہے کہ ہمارے مخالفین حضور کو اس قبر مبارک میں نہ حیات دنیوی سے زندہ مانتے ہیں نہ حیات برزخی سے۔ اس قبر کو وہ محض ایک گڑھا سمجھتے ہیں جس میں آپ کا بدن مبارک

---

[1] رسالہ مذکورہ ص۴۱ مترجم مولانا اسماعیل غزنوی ۱۹۲۷ء مطبوعہ امرتسر

بالکل پتھر کی طرح بے جان اور بے شعور پڑا ہے۔ استغفر اللہ العظیم — جب یہ کہتے ہیں کہ ہم حیات برزخی کے قائل ہیں تو ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ آپ آسمانوں ہی کسی دور کی جگہ میں برزخی حیات سے زندہ ہیں اس قبر میں آپ کو برزخی حیات بھی ہرگز حاصل نہیں ولم یقل بہ احد من السلف و الخلف من علماء اھل السنۃ والجماعۃ۔

شیخ محمد بن عبدالوہاب کے بیٹے امام عبداللہ کی شہادت

اور حضور کی زندگی قبر میں برزخی زندگی ہے جو شہداء کی زندگی سے بہت اعلیٰ ہے قرآن شریف کی آیات اس پر منصوص ہیں کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم شہداء سے بلاشک و ریب افضل ہیں۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ جب کوئی مسلمان آنحضرتؐ پر (قبر پر) سلام کہے تو آپ اس کا سلام سنتے ہیں۔[1]

اب آپ ہی کچھ غور کریں کہ یہاں قبر سے کون سی قبر مراد ہے اور آپ کا قبر مبارک کے پاس سماع کہاں مانا گیا ہے۔ آپ زائرین کے صلوٰۃ و سلام کو کہاں سن رہے ہیں۔

سرخیل علماء نجد شیخ محمد بن عبداللطیف کی شہادت

علماء آل شیخ میں جو مقام شیخ محمد بن عبداللطیف کا تھا اس سے اہل علم ناآشنا نہیں آپ نے مسئلہ عذاب قبر اور مقام قبر بڑی وضاحت سے لکھا ہے:۔

(۱) شہادت دربارۂ عذاب قبر

ہم قبور کے فتنہ (آزمائش)، اور اس کے عذاب اور اس میں راحت اور یہ کہ جسموں میں روحوں کو ڈالا جائے گا ایمان لاتے ہیں۔[2]

(۲) شہادت دربارہ مقام قبر اور حیات قبر

آپ اپنی قبر میں زندہ ہیں لیکن برزخی حیات کے ساتھ — اور آپ کی زندگی شہداء کی زندگی سے کہیں بہتر ہے — اور آپکی قبر پر جو آپ کو سلام کہتا ہے آپ سنتے ہیں۔[2]

---

[1] دوسرا رسالہ مذکورہ بالا ص ۶۵ مرقومہ ۱۲۸۱ھ [2] چوتھا رسالہ از رسائل مذکورہ ص ۱۱۹

برزخ کے حالات یہاں مشاہدہ میں نہیں آتے

قرآن کریم ہمیں بعض ایسے برزخی حالات کی خبر دیتا ہے جو ہمارے سامنے واقع ہوتے ہیں مگر ہمیں نظر نہیں آ رہے ہوتے۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

ولو تری اذ الظالمون فی غمرات الموت والملٰئکة باسطوا ایدیھم

اخرجوا انفسکم۔ (پ الانعام ع ۱۱ آیت ۹۴)

ترجمہ۔ اور اگر آپ دیکھیں جب ظالم لوگ موت کی سختیوں میں گھرتے ہیں اور فرشتے اپنے ہاتھ پھیلاتے ہیں نکالو اپنی جانیں آج تمہیں خواری کا عذاب دیا جائے گا۔

فرشتوں کی ایک یہ بات بھی قرآن کریم نے نقل کی ہے:۔

یضربون وجوھھم وادبارھم۔ (پ الانفال ع ۷ آیت ۵۰)

ترجمہ۔ فرشتے پٹختے ہیں ان کے چہروں پہ اور ان کی پیٹھ پہ۔

فرشتوں کا جو معاملہ اس مرنے والے سے ہو رہا ہے اس سے اس کے برزخ کا آغاز ہو چکا۔ اسے اب وہ دیکھ بھی رہا ہے اور چھو بھی رہا ہے۔ مگر پاس بیٹھنے والوں کو وہ فرشتے نظر نہیں آ رہے۔ مرنے والا اس وقت دنیا اور آخرت کے درمیان ہے۔ اس وقت ہر نیک و بد فرشتوں کو دیکھتا ہے مگر دوسروں سے وہ پردے میں ہوتے ہیں۔

ہاں اللہ کے کچھ نیک بندے ایسے بھی ہیں جو اس دنیا میں رہتے ہوئے بھی ملاء اعلیٰ اور عالم بالا سے آشنا ہوتے ہیں۔ فرشتوں کا ان کے ہاں آنا جانا ہوتا ہے۔ عالم ناسوت (انسانوں کی دنیا) اور عالم ملکوت (فرشتوں کا جہاں) کے درمیان برزخ کا پردہ نہیں لیکن ایک حجاب ضرور ہے جو کبھی اٹھ بھی جاتا ہے۔ آنحضرتؐ نے ایک دفعہ یہیں مدینہ میں بیٹھے ملاء اعلیٰ میں فرشتوں کا اختصام سنا۔ آپ کے سامنے اس وقت تمام جہان روشن ہو گیا تھا۔

عالمِ بالا اور کرّہ ارضی کے حجابات اور ارتباطات

ہم اہلِ زمین ملاءِ اعلیٰ سے پردے میں ہیں۔ فرشتوں کی آمد یہاں زمین پر ہوتی ہے مگر ہمارا وہاں آنا جانا نہیں ہوتا۔ ہم جب تک اس دُنیوی زندگی میں ہم سے فرشتے حجاب میں رہتے ہیں۔ وہ یہاں بھی آجائیں تو جب تک اذنِ الٰہی نہ ہو ہم انہیں دیکھ نہیں سکتے۔

سوال یہ ہے کہ انبیاءِ کرام اور اُونچے درجے کے اولیاء کیا وہ بھی ملاءِ اعلیٰ سے اسی پردے میں ہیں؟ نہیں ــــ اُن سے اللہ تعالیٰ نے بارہا یہ پردے ہٹائے ہیں۔ انہیں اس ملاءِ اعلیٰ سے ایک خاص اُنس اور ارتباط ہو جاتا ہے۔ ملائکہ یہاں اُتر کر بھی اُن سے مل جاتے ہیں جب اللہ تعالیٰ چاہیں زمین پر بھی کبھی ملاءِ اعلیٰ کی سیر و سیاحت ہوتی رہتی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا تدخل الملئكة بيتاً فيه كلبٌ ولا صورة يريد صورة التماثيل التي فيها الارواح۔[1]

ترجمہ۔ فرشتے اس گھر میں نہیں آتے جس میں کتا ہو یا کوئی تصویر ہو۔ تصویر سے آپ کی مراد ذوی الارواح کی تصاویر ہیں جن میں روح ہو۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ کہتی ہیں ایک دفعہ حضرت جبریل دروازے پر کھڑے رہے اور اندر نہ آئے۔ آپ نے آہٹ سُنی تو باہر نکلے:۔

فخرج النبی صلی اللہ علیہ وسلم فاذا هو بجبریل قائم علی الباب فقال مامنعك ان تدخل قال ان فی البیت كلبا وانا لا ندخل بيتاً فيه كلب ولا صورة۔[2]

ترجمہ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیا دیکھتے ہیں کہ جبریل دروازے پر کھڑے ہیں

---

[1] صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۵ [2] سنن ابن ماجہ صفحہ ۲۶۰

آپ نے کہا آپ کو گھر آنے سے کس چیز نے روکا ہے۔ انہوں نے کہا گھر میں ایک کتا ہے اور ہم اس گھر میں نہیں آتے جس میں کتا یا تصویر ہو۔

ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ جب حضورؐ محاذِ خندق سے واپس آئے ہتھیار اُتارے اور غسل فرمایا تو آپ کے پاس جبریل آئے اور کہا:

اتاہ جبریل فقال قد وضعت السلاح واللہ ما وضعناہ اخرج الیہم قال فالی این قال ھٰھنا واشار الی بنی قریظہ فخرج النبی صلی اللہ علیہ وسلم الیھم[1]

ترجمہ: آپ کے پاس جبریل آئے اور کہا آپ نے ہتھیار اُتار دیئے ہیں بخدا ہم نے تو نہیں اتارے آپ ان کی طرف چلیں۔ آپ نے کہا کدھر حضرت جبریل نے کہا۔ ادھر اور بنو قریظہ کی طرف اشارہ کیا۔ اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ادھر ہوئے۔

انبیاء کے سوا دوسرے کاملین کے لیے بھی فرشتوں کی یہ رویت ممکن ہے۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کہتے ہیں میں نے جنگِ اُحد کے دن حضورؐ کے دائیں بائیں دو شخص دیکھے جن کے کپڑے سفید تھے۔

رایت یوم احدٍ عن یمین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وعن یسارہ رجلین علیھما ثیاب بیض یقاتلان عنہ کاشد القتال ما رأیتھما قبل ولا بعد[2]

ترجمہ: میں نے جنگ اُحد کے دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں اور بائیں دو شخصوں کو دیکھا جن کے کپڑے سفید تھے اور وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے سخت جنگ لڑ رہے تھے۔ میں نے انہیں کبھی ان سے پہلے دیکھا نہ بعد میں

---

[1] صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۵۹۰ [2] ایضاً جلد ۲ صفحہ ۵۸۰ صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۲۵۲

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع ؒ فرماتے ہیں :-

فرشتہ اپنی اصل ہیئت و صورت میں سامنے آجائے تو اس کی ہیبت کو کوئی انسان برداشت نہیں کرسکتا ..... دوسری صورت یہ ہے کہ فرشتہ انسان کی شکل میں آئے جیسے جبریل امین نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بہت مرتبہ بشکلِ انسانی آتے۔[1]

حضرت شاہ ولی اللہ محدثِ دہلوی ؒ لکھتے ہیں :-

وانھم قد یظھرون لافاضل الآدمیین فیبشرونھم وینذرونھم[2]

ترجمہ۔ اور فرشتے اس زمین پہ اونچے درجے کے لوگوں کے لیے کبھی ظاہر بھی ہو جاتے ہیں اور انہیں بشارت اور کبھی نذارت کی باتیں بھی کہہ جاتے ہیں۔

ایک اور جگہ پھر لکھتے ہیں :-

اذا بھم اجتماعات کیف شاء اللّٰہ وحیث شاء اللّٰہ[3]

اور ان کے لوگوں سے کبھی اجتماعات بھی ہو جاتے ہیں جیسے اللہ تعالیٰ چاہے اور جہاں چاہے۔

یہ سب آمد اور ظہور کسی دوسری شکل میں ہوتا ہے۔ اصل شکل میں وہ دکھائی دیں تو پھر حجت تمام ہو جاتی ہے اور انکار پہ فوراً عذاب اُترتا ہے ——— اس لیے الٰہی حکمت مقتضی ہوئی کہ خدا کا پیغام انسانوں پہ اُترے اور فرشتے بھی نازل ہوں تو انسانی ادا میں۔

وقالوا لولا انزل علیہ ملک ؕ ولو انزلنا ملکاً لقضی الامر ثم لا ینظرون ○ ولو جعلنٰہ ملکاً لجعلنٰہ رجلاً وللبسنا علیھم ما یلبسون ○ (پ : الانعام ع ۱ آیت ۹)

ترجمہ۔ اور کہا انہوں نے کیوں نہیں اترا اس پہ کوئی فرشتہ اور اگر ہم فرشتہ

---

[1] معارف جلد ۲ صد ۲۸۷ [2] حجۃ اللہ البالغہ جلد ۱ صد ۳۰۹ [3] ایضاً صد ۵۹

اُتارتے تو اسی وقت فقصلے ہو جاتا۔ پھر وہ مہلت نہ پا سکتے اور اگر ہم فرشتے کو بھی بھیجتے تو بھی انسانی شکل میں بھیجتے۔ تو ہم ان کو شبہ میں ہی رکھتے جس شبہ میں وہ اب پڑے ہوئے ہیں۔

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی ؒ لکھتے ہیں:-

اگر فرشتہ اپنی اصلی صورت میں آئے تو یہ لوگ ایک منٹ کے لیے بھی اس کا تحمل نہ کر سکیں۔ اس کے رعب و ہیبت سے دم نکل جائے۔ یہ صرف انبیاء کا ہی ظرف ہوتا ہے جو اصل صورت میں فرشتہ کی رویت؛ کا تحمل کر سکیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر بھر میں دو مرتبہ حضرت جبریل کو اپنی اصلی صورت میں دیکھا ہے اور کسی نبی کی نسبت ایک مرتبہ بھی ثابت نہیں[1]

اس سے پتہ چلتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ظرفِ طبعی دوسرے عام انسانوں کا سا نہ تھا۔ آپ میں اتنی روحانی قوت تھی کہ فرشتوں کو اُن کی اصلی ہیئت میں دیکھنے کے متحمل تھے۔ یہاں رہتے ہوئے ملاءِ اعلیٰ سے یہ مناسبت ہو جائے تو پھر یہ تسلیم کرنے میں کیا رکاوٹ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی دنیوی حیات میں آپ پہ ملاءِ اعلیٰ کے کچھ جلبے اُتار دیئے تھے۔ سو اگر کوئی یہ سمجھ جائے کہ جب آپ خود عالمِ برزخ میں پہنچے تو وہاں بھی یہ دو جہانوں کا ارتباط قائم رہا اور وہاں آپ کا یہی دنیوی بدن جسدِ اطہر ایک برزخی پیرائے میں فائزِ حیات ہوا تو اس میں کیا شرعی استحالہ لازم آتا ہے۔

آپ کے برزخ کو دوسرے عام انسانوں کے برزخ کے درجہ میں لانا یہ کونسا علم و دانش کا تقاضا ہے۔ یہ کہتے ہیں یہ مثلیت فی البشریت کا تقاضا ہے۔ ہم پوچھتے ہیں یوحیٰ الیّ کے بھی تو آخر کچھ مقتضیات ہیں یا نہیں؟ وکفیٰ باللہ شہیدا۔ برزخ کے بعد عالمِ آخرت ہے۔ اور یہ بھی نبی پاک کا ان کی اپنی شان کے مطابق ہے۔

---

[1] تفسیر عثمانی ص ۱۶۶

ان چار جہانوں کے سوا کیا کوئی اور جہان بھی ہے

یہ چار جہانوں کا بیان تھا ــــــ ان کے سوا ایک اور جہان ہے جو رہنے کی جگہ نہیں صرف دیکھنے کی چیز ہے۔ اس میں حقائق و معانی حسبِ حال مختلف صورتوں میں دکھائی دیتے ہیں اور نادیدہ حقیقتیں دیدہ بن جاتی ہیں اسے عالمِ مثال کہتے ہیں۔

عالمِ مثال

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے بہت سی احادیث سے استنباط کر کے ایک ایسے عالم کا پتہ دیا ہے، جو عالمِ ارواح کے سوا حیاتِ انسانی کے باقی ادوار میں انسان کے ساتھ متوازی چلتا ہے یہ عالمِ عنصری نہیں[1] اسے عالمِ مثال کہتے ہیں:۔

دلت احادیث کثیرة علی ان فی الوجود عالماً غیر عنصری یتمثل فیہ المعانی باجسام مناسبة لھا فی الصفة۔[2]

ترجمہ۔ بہت سی احادیث دلالت کرتی ہیں کہ ایک اور جہان موجود ہے جو عنصری نہیں۔ اس میں معانی صفات اور اعراض اُس اُس صورتِ اجسام میں متمثّل ہوتے ہیں جو صفات میں اُن کے مناسب ہو۔

یہ گویا ایک صاف پانی کی غیر محدود نہر یا شیشہ ہے جس میں عالمِ شہادت[3] کی وہ چیزیں جو جاندار

---

[1] سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران کا قیامت کے دن آنا اعمال کا، جو اعراض میں متجسد ہونا، دُنیا کا بوڑھی عورت کی شکل میں آنا موت کا مینڈھے کی شکل میں ظاہر ہونا وغیرہ وغیرہ اسی کی مثالیں ہیں۔ [2] حجۃ اللہ البالغہ ص۱۳ مصر

[3] عالمِ شہادت اور عالمِ غیب ایک دوسرے اعتبار سے عالم کی تقسیم ہے۔ ان دونوں کو عالم الغیب والشھادة (پ۲۸ الحشر آیت ۲۲) ہی جانتے ہیں۔ عالمِ شہادت ہمارے سامنے ہے اور عالم الغیب کی چابیاں تو ہیں اسی کے پاس ــــ اس نے خود جن جزئیات کا پتہ دیا۔ ان کے سوا ان کی خبر غیب بھی کسی کے سوا نہیں۔

یا مجسم material body نہیں ہیں۔ اپنی مناسب اور موزوں شکلوں Modes میں جاندار اور مجسم ہو کر نظر آتی ہیں مثلاً نیکی virtue جو ایک مرئی visible چیز نہیں، ایک حسین جمیل شخص کی شکل میں بدی Evil ایک کریہہ المنظر صورت میں، ایمان آفتاب بن کر علم دریا کے طور پر جلوہ گر ہوتا ہے۔ یہ حقائق و معانی ہیں جو مختلف صورتوں کا لباس پہن رہے ہیں۔ یہ عالم مثال کی شبیہیں اور تصویریں ہیں۔ دُنیا کا ایک بُوڑھی عورت کی شکل میں آنا، موت کا مینڈھے کی شکل میں ظاہر ہونا، اسی کی مثالیں ہیں۔

یہ معانی کی تصویریں ہیں۔ اس جہان میں کبھی اگلے جہان کے حقائق کی تصویریں بھی ملتی ہیں جضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ کہنا کہ صورت لی الجنۃ والنار[1] اسی قبیل سے ہے۔ جنت و جہنم اپنی جگہ محسوس حقیقتیں ہیں۔ یہ کوئی معانی کا اجتماع نہیں۔

عالم مثال کا لفظ معانی کی تصویروں کے لیے بھی آتا ہے اور حقائق کی تصویروں کے لیے بھی لیکن صرف ان حقیقتوں کے لیے جو اُس جہان سے اس جہان میں جلوہ ریز ہوں۔ جیسے کہ جنت و دوزخ جو حضورؐ کو یہاں دکھائی گئی یا حضرت جبرئیل جو ملاء اعلیٰ سے اس جہان میں دحیہ کلبی کی صورت میں ظاہر ہوتے رہے۔

ہاں اس جہان میں چیزوں کی شکلیں بدلیں۔ جیسے لاٹھی کا سانپ بن جانا، آگ کا باغ بن جانا، تو یہ عالمِ مثال کی باتیں نہیں معجزات میں حقیقت بدلتی ہے اور یہ فعلِ خداوندی سے وجود میں آتے ہیں۔

حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ خلیفۂ ارشد حضرت حکیم الامتؒ عالم مثال کو عالم غیب اور عالم شہادت کی ایک برزخی منزل بتاتے ہیں۔ ان کے ہاں یہ عالم ملکوت اور عالم جسمانیات کے درمیان ایک تیسری منزل کا نام ہے۔ یہ برزخ اس برزخ سے جُدا ہے جو عالم دُنیا اور آخرت کے مابین ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے اپنے حالات ہیں اور ہر ایک کا اپنا مقام ہے حضرت سید صاحب

---

[1] صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۹۴

اس بحث کو سمیٹتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

اس عالم کا مستقل وجود ہو یا نہ، مگر اس میں شک نہیں کہ قرآن پاک اور احادیث صحیحہ میں ایسے واقعات، حالات، مشاہدات اور کیفیات مذکور ہیں جن کی تشریح اس عالم میں بخوبی کی جا سکتی ہے۔[1]

معراج کی رات حضورؐ نے عالم برزخ کے مسافروں کو عالم مثال میں دیکھا جیسا کہ بیضاوی کی رائے ہے یا ہو سکتا ہے جیسا کہ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ واقعی اصل اجسام تھے جو بقدرتِ الٰہیہ وہاں لا جمع کئے گئے۔ ان میں کوئی بات ہو اس میں شرک کی کوئی آلائش نہیں ہے۔ جہاں علماء کا اختلاف ہے وہاں ہر پہلو کا ایک احترام ہے۔ جو علماء وہاں اصل اجساد کی حاضری کو قدرتِ خداوندی کا جلوہ نہیں ایک لائق استہزاء منظر سمجھتے ہیں وہ اللہ رب العزت کی پکڑ سے ڈریں۔[2]

چوں خدا خواہد کہ پردہ کس درد　　　میلش اندر طعنہ پاکاں برد

ہاں آپؐ نے اس رات جو غیبت کرنے والوں کو انسانی گوشت کھاتے دیکھا یا دیکھا کہ لوگ سامنے رکھا اچھا صاف ستھرا گوشت نہیں کھا رہے اور گندہ اور بدبودار گوشت کھا رہے ہیں۔ یا کچھ ایسے لوگ دیکھے جن کے ہونٹ اونٹ کے سے تھے اور ان میں آگ ڈالی جا رہی تھی۔ یا زانیہ عورتیں دیکھیں جو چھاتیوں کے بل لٹکی تھیں۔ یہ سب واقعات[3] بے شک ان اشخاص و اعمال کی مثالی صورتیں تھیں۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ دیکھنے والے کی نظر عالم مثال کی نہیں اس دنیا کی تھی جس نے ابھی موت کو نہ دیکھا تھا اور یہ خدا کا نشان اور اس کا جلوہ تھا کہ عالم دنیا اور عالم برزخ اس رات مل رہے تھے۔ لنریہ من آیاتنا انہ ھو السمیع البصیر کی شان ظاہر ہو رہی تھی۔

باقی انبیاء کو درمیانی حیثیت میں رکھیئے ہو سکتا ہے اجساد اصلیہ ہوں اور ہو سکتا ہے

---

[1] سیرت النبی جلد ۳ صفحہ ۳۹۰　[2] و تمثیل الانبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام لہ (تفسیر بیضاوی صفحہ ۲۸۳ مصر) مثل لی النبیون فصلیت بھم (تفسیر مظہری جلد صفحہ —)　[3] ان کی تفصیل تفسیر ابن کثیر جلد ۳ صفحہ ۱۲ میں سے دیکھیئے۔

مثالی صورتیں ہوں اور اُن میں سے ہر ایک طرف علماء کی ایک جماعت موجود ہے لیکن یہ قول کسی کا نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس سیرِ برزخی میں اپنے اصل جسد کے ساتھ نہ تھے۔ یہ جسد اس برزخی سیر میں روح کی لطافت میں تھا تو اب وہ جسد عالم برزخ میں کیوں روح کے حکم میں نہیں (معاذ اللہ) بے جان و بے حس پڑا ہے۔ استغفر اللہ۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ کا مسلک

حضرت شاہ ولی اللہؒ کے ہاں یہ ایک عالم برزخ کی سیر تھی جہاں آپؐ کے جسدِ اطہر پر روح کے خواص طاری کیئے گئے اور معانی و واقعات آپ کو مختلف اشکال و صور میں مشاہدہ کرائے گئے آپ نے متعدد حقائق و معانی اور مجرمین و منعمین کو مختلف اشکال و صور میں دیکھا۔ لیکن یہ سو فی صد حقیقت ہے کہ آپ خود اس سیرِ برزخی میں اپنے اصلی جسد اطہر کے ساتھ تھے اور وہ جسدِ اطہر اس برزخی سیر میں روح کے حکم میں تھا۔ اور جس طرح روح پرواز کرتی ہے آپ آن کی آن میں پہلے آسمان پر تھے۔ حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں :۔

کل ذٰلک لجسدہ صلی اللہ علیہ وسلم فی الیقظۃ ولکن ذلک فی مواطن هو برزخ بین المثال والشہادۃ جامع لاحکامهما فظهر علی الجسد احکام الروح[1]

ترجمہ۔ آپ کا یہ سارا سفرِ معراج جاگتے ہوئے آپ کے جسد اطہر کے ساتھ تھا لیکن یہ ان مقامات میں تھا جو عالم شہادت (اس کھلی دنیا) اور عالم مثال کے مابین ایک برزخی درجے کے ہیں۔ اس میں عالم شہادت اور عالم مثال دونوں جمع تھے اور جسد اطہر پر روح کے احکام ظاہر ہوئے تھے۔

آپ کی یہ سیرِ معراج بتلاتی ہے کہ مکہ مکرمہ میں یہ جسدِ اطہر کس درجہ لطافت پا چکا تھا اور کہاں کہاں جا چکا تھا۔ جہاں جاتے جبریل کے نوری پر جلتے تھے۔ یہ خاکی جسد اطہر اس سرحد کو ایک

[1] حجۃ اللہ البالغہ صـ۲۰۶ جلد ۲:

آن میں پار کر گیا۔ اب وہ جسدِ اطہر جب مدینہ میں منتقل ہوا، یہاں کی آنکھوں سے پردے میں ہوا تو اب اس میں کوئی لطافت اور جلاء نہیں کہ روحِ اقدس کے تعلق سے فائز حیات ہو وہ تاقیامت قبر میں بے جان و حس پڑا رہے گا اللہ تعالیٰ نے کیا اس کے لیے وللآخرۃ خیر لک من الاولیٰ کی بشارت نہ دی تھی کہ ہر بعد کی منزل آپ کے لیے پہلے سے بہتر ہو گی۔

ہم نے اس تمہید میں عالمِ ارواح، عالمِ دُنیا، عالمِ برزخ اور عالمِ آخرت کا کچھ مختصر تعارف عرض کیا ہے۔ عالمِ مثال کی کچھ تفصیل بھی عرض کر دی ہے۔ عالمِ مثال کے دو پہلوؤں میں سے دوسرا پہلو بے شک علماء کے ہاں ملتا ہے۔ لیکن پہلا پہلو اُن کے ہاں عالمِ ارواح کا ایک جلوہ ہے وہ اسے عالمِ ارواح کے کھاتے میں اور دوسرے پہلو کو برزخ کے کھاتے میں ڈالتے ہیں۔ گویا اُن کے ہاں یہ کوئی مقام نہیں۔ لیکن یہ نہ سمجھا جائے کہ انہیں ان حقیقتوں سے انکار ہے جو ہم اُوپر ذکر کر آئے ہیں۔

حضرت مولانا انور شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں :۔

اما عند علماء الشرع فلیس ھناك الا العالمان عالم الارواح وعالم الاجسام وقد یخطر بالبال ان ما سماہ الصوفیۃ عالم المثال ھو الذی سماہ اھل الشرع عالم المثال ۔ ۔ ۔ ۔ ولم یبق فرق الا فی التسمیۃ واما ما سماہ الصوفیۃ الارواح المجردۃ فلم یبحث عنہ العلماء[1]

ترجمہ۔ لیکن علماء شرع کے ہاں یہاں دو ہی جہان ہیں، عالمِ ارواح اور عالمِ اجساد ہاں کبھی دل میں یہ بات گزرتی ہے کہ صوفیہ جس کا نام عالمِ مثال رکھتے ہیں یہ وہی نہ ہو جس کا نام علماء شرع عالمِ برزخ رکھتے ہیں۔ اس صورت میں فرق صرف نام کا رہ جائے گا۔ اور صوفیہ جس کا نام ارواح مجردہ رکھتے ہیں علماء شرع نے اس سے بحث نہیں کی۔

---

[1] فیض الباری جلد ۱۷

اسلام میں ابدانِ مثالیہ کا تصوّر

جو مہربان کوائف برزخیہ کو اس قبر کے احوال نہیں مانتے اور قبر کی نشاندہی عالمِ غیب کی کسی چھپی وادی سے کرتے ہیں انہیں مشکل یہ پیش آتی ہے کہ وہاں میت کو لے جائیں کیسے؟ میت تو اس قبر میں دفن ہے جسے یہ لوگ قبر ہی نہیں جانتے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ (۱۲۳۹ھ) لکھتے ہیں:۔

دفن کرنے میں اجزاء بدن کے اپنے مقام پر سب کے سب اپنے حال پر برقرار رہتے ہیں تو روح کا علاقہ بدن سے ازراہِ نظر و عنایت بحال رہتا ہے۔۔
۔۔۔ بدن کا مقام معین ہونے سے گویا روح کا مقام بھی معین ہے۔[1]

اس قبر کو قبر نہ ماننے والے عذاب قبر کے لیے اب کسی اور بدن کی تلاش میں نکلے جو اس دور کی قبر میں پہنچ کر عذاب وصول کر سکے۔ اب انہیں اس بدن مثالی سے یہ عقیدہ اختیار کرنا پڑا کہ یہ دور کا بدن اس دور کی جگہ میں عذاب پا رہا ہے اور جس جسم نے گناہ اور جرم کئے تھے وہ قیامت تک قبر میں بے حس و حرکت عذاب سے محفوظ پڑا ہے ـــــ یہ عجیب عقیدہ ہے جو قبروں پر ہونے والے شرک کو رد کرنے کے لیے ان لوگوں نے بنا رکھا ہے اس کے بغیر اشاعتِ توحید و سنت ہو ہی نہیں سکتی۔

یہ عقیدہ انہوں نے قرآن و حدیث سے لیا ہے یا صوفیوں سے، یہ آپ ان سے تحقیق کریں۔ ہم صرف یہ کہیں گے کہ قرآن و حدیث میں ہمیں یہ مثالی دنیا کہیں نہیں ملی۔ شریعت میں عالم ارواح اور عالمِ اجساد کے وراء ہمیں کسی مثالی دنیا کا پتہ نہیں ملا۔ مثالی صورتیں تو ملیں، لیکن مثالی ابدان ہم کہیں دیکھ نہ پائے۔ معراج کی رات آپ نے جو کچھ ابدان کو ہوتے دیکھا وہ ابدانِ معذبہ کی مثالی صورتیں تھیں۔ اصل عذاب قبرِ اصلی (وہ ایک جگہ ہو یا متعدد ذرات میں منقسم) کو ہو رہا تھا۔

---

[1] تفسیر عزیزی پ ۳۰ ص ۷۹

علمائے شریعت کے ہاں جیسا کہ حضرت شاہ صاحبؒ کی رائے آپ مطالعہ کر چکے ایسے بدن مثالی کا کوئی تصور نہیں جو عذاب پانے کے لیے بتایا گیا ہو۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے جو عالمِ مثال کا پتہ دیا ہے وہ اپنے کشف سے دیا ہے۔ حضراتِ صوفیۂ کرام کے ان نظریات کی بنیاد اُن کے مشاہدات ہیں۔ انہیں اپنی جگہ رکھتے ہوئے ہمیں اپنے عقائد کتاب و سنت سے لینے چاہئیں۔ کرامیہ اور اہل سنت میں یہ بحث تو چلی کہ عذابِ برزخ صرف روح پر ہے یا روح اور بدن دونوں پر۔ لیکن یہ بحث خیر القرون میں کہیں نہیں ملتی کہ کسی نے عذابِ قبر کے لیے کوئی مثالی بدن تلاش کیا ہو اور اس جسدِ عنصری کو نہایت احتیاط سے بچالیا ہو۔

سُنا ہے ہمارے یہ کرم فرما حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مثال پیش کرتے ہیں کہ وہاں عدالت کی سزا ایک مثالی بدن پہ وارد کی گئی اور اصل بدن عنصری کو اللہ تعالیٰ نے نہایت احتیاط سے محفوظ کر لیا۔ یہ جوابِ عذرِ گناہ بدتر از گناہ ہے۔ ؎

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہیم

جن لوگوں نے یہ سمجھا کہ عذابِ قبر کی طرح نعیمِ قبر بھی مثالی جسموں سے متعلق ہے۔ وہ شہداء کرام کی حیاتِ برزخی کو پرندوں کی صورت میں لے آئے اور انہوں نے اتنا بھی نہ سوچا کہ مثالی بدن کسے کہتے ہیں اور یہ کہ پرندے کن کی مثالی صورت ہیں، انسانوں کی؟ مثالی بدن تو وہ ہے جو اصل بدن جیسا ہو اور اس کی مثال ہو ـــــ روح متجسد ہو تو یہ وہی شکل اختیار کرے گی جو اصل جسم کی ہو پرندوں کو اجسادِ مثالی کہنا یہ کون سا علم کلام ہے۔

روح اس شکل میں متجسد ہو تو یہ عالمِ ارواح کی ایک صورت ہو گی کوئی علیحدہ عالمِ مثال نہ ہو گا ـــــ اور پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ روح ایک ہی صورت میں متجسد ہو، اس کی متعدد صورتیں بھی ہو سکتی ہیں۔ یہ متعدد صورتیں صورِ مثالی ہوں گی، اجسامِ مثالی نہ ہوں گے جیسا کہ وہم کر لیا گیا ہے بعض اولیاء جو کبھی کئی صورتوں میں دیکھے گئے وہ محض اُن کی مثالی صورتیں تھیں۔ یہ کوئی مثالی اجسام نہ تھے۔

یہ مشاہدات اور عجائب وکوائف اپنی جگہ، لیکن ظاہر ہے کہ عقائد کی اساس صوفیہ کے یہ مشاہدات نہیں ہو سکتے. صوفیہ گو محققین ہی ہوں عقائد کی اساس نہیں بن سکتے. عقائد کی بنا، دلائل قطعیہ پر ہونی چاہیے صوفیوں کے مشاہدات پر نہیں. اور مسائل کی بنا بھی مجتہدین کے فیصلوں پر ہونی چاہیے نہ کہ صوفیوں کے اقوال پر ——— حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ (۱۰۳۴ھ) لکھتے ہیں :-

صوفیہ کا عمل حلت وحرمت میں سند نہیں ہے ہمیں اتنا کافی ہے کہ ان کو معذور سمجھیں اور ملامت نہ کریں اس میں امام ابو حنیفہؒ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے قول کا اعتبار ہے نہ کہ ابو بکر شبلیؒ اور ابو الحسن نوریؒ کے عمل کا۔ اس زمانہ کے کچے صوفیوں نے اپنے پیروں کے عمل کو بہانہ بنا کر رقص و سرود دین وملت میں داخل کر لیا ہے اور اس کو نیکی اور عبادت سمجھتے ہیں[1]

اس بحث کا حاصل یہ ہے کہ قبر، میت، روح، جسد، الم، راحت اور ادراک کے وہ اطلاقات جو کتاب وسنت میں ملتے ہیں، انہیں چھوڑ کر اور ان کے ظاہری معنوں سے منہ موڑ کر عقائد کی بنا صوفیہ کے مشاہدات اور ابدانِ مثالیہ پر رکھنا اور اشاعتِ توحید وسنت اسے ہی سمجھنا کہ عالمِ برزخ کا عذاب وثواب کسی مثالی جسد کو گھیرے میں لیے ہوئے ہے کوئی صحیح علمی موقف نہیں. کرے کوئی اور بھرے کوئی۔ یہ بات کہیں قرینِ عقل نہیں۔

صوفیہ نے جو دیکھا ضروری نہیں کہ اُسے صحیح سمجھا ہو۔

صرف انبیاء کرام ہیں جن کا خواب بھی وحی ہے. ان کے فہم پر خدا کی حفاظت کا سایہ ہوتا ہے جو ان کی خطا اور بقاء علی الخطا سے حفاظت کرتا ہے. مجتہد کی یہ شان نہیں کہ اس کی خطا سے حفاظتِ موعود ہو. جب وہ گہرائی میں اترتا ہے تو بات کبھی درست بیٹھتی ہے اور کبھی خطا ——— عارف کشف سے دیکھتا ہے یا غیب کے پردے میں جھانکتا ہے تو ضروری نہیں کہ وہ بات کو صحیح پالے. کیا مشاہدے اور ادراک میں کبھی غلطی نہیں ہو سکتی.

---

[1] مکتوبات حضرت امام ربانی دفتر اول صـ ۲۰۲

عارف جامی لکھتے ہیں انسان جو روح اور بدن کا مجموعہ ہے۔ اس کے دنیا اور برزخ کے حالات مختلف ہیں۔ یہاں بدن کے احکام غالب ہیں روح اس کے ضمن میں متاثر ہوتی ہے ــــــ وہاں روح کے احکام غالب ہیں اور بدن اس کے ضمن میں متاثر ہوتا ہے۔ اس مشاہدے میں عذاب روح پر اُترتا ہے اور بدن اس سے متاثر ہوتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ وہاں عذاب کے جھونکے یا راحت کی لہریں پہلے روح پر ہی اُتریں اور چونکہ جسم اس کے لیے بمنزلہ آلہ ہے اس لیے وہ بدن پر آکر رہیں گی اور یہ قول صحیح قرار پائے گا کہ قبر کی واردات روح اور بدن دونوں پر ہوتی ہیں۔ سو کسی عارف نے پہلی منزل مشاہدہ کی اور بتایا کہ عذاب روح کو ہو رہا ہے۔ تو ہمارے یہ کرم فرما چڑھ دوڑے کہ دیکھو کرامیہ کی بات درست نکلی ــــــ عزیزانِ گرامی اس صورتِ حال میں بدن کے ادراک کی نفی نہیں ہے۔ بات صرف یہ ہے کہ عذاب روح پر اُتر رہا ہے اور اس کے تعلق سے بدن متالم ہو رہا ہے یہی روح و بدن کا عذابِ قبر ہے۔

اگر روح خود مثالی صورت میں یا کسی پرندے کی صورت میں متجسد ہو اور اس پر عذاب یا راحت اُترے (گو اس کے ضمن میں بدن اصلی بھی عذاب و راحت کا ادراک کرے) اور وہ عارف کہہ دے کہ عذاب اس جسدِ برزخی کو ہو رہا ہے تو اس میں شریعت کی کسی بات سے ٹکراؤ نہیں ہے۔

ہمیں اپنے کرم فرماؤں سے یہ گلہ نہیں کہ وہ صوفیہ کرام کے ان مشاہدات کی خبر کیوں دیتے ہیں۔ ہمارا شکوہ صرف یہ ہے کہ بزرگوں کے ان مشاہدات کو قرآن و حدیث کے کھلے اطلاقات کے انکار کا زینہ تو نہ بنائیں۔

مسئلہ عذابِ قبر کی اساسی حیثیت

عذابِ قبر کا مسئلہ اہل السنۃ کے اساسی عقائد میں سے ہے۔ کتبِ حدیث اور عقائد کی کتابوں میں اس کے باب بندھے ہیں۔ جمہور اہلِ سنت اس میں روح و بدن دونوں کے اَلم و

راحت کا عقیدہ رکھتے ہیں. کوئی عود روح نہ بھی مانے، تعلق روح مان لے. عذاب و راحت دونوں پر جلنے تو وہ ہمارے ہاں منکرینِ عذاب قبر میں سے نہیں ہے. بدن یکجا نہ ہو، ذراتِ منتشرہ میں منقسم ہو اور ان پر ایک باریک رابطے سے عذاب اُترنا مانے تو اُسے بھی منکرینِ عذاب قبر میں سے نہ جانا جائے. بدن کا یکجا ہونا ہمارے ہاں اس کے لیے شرط نہیں ہے.

لیکن اگر وہ ان تمام کیفیات کو اصل بدن سے بالکل لاتعلق کر دیں اور سارا عذاب کسی اور بدن پہ ڈال دیں تو پھر آپ ہی فیصلہ کریں کہ انہیں اہل سنت میں شمار ہونے کا کیا حق باقی رہ گیا ہے ــــــ ہم کہیں گے تو شکایت ہوگی ــــــ محض ضد و عناد سے معتزلہ کرامیہ شیعہ اور ظاہریہ کے دامنوں میں پناہ لینا اور قرآن و حدیث کے مقابلے میں صوفیوں کے مشاہدات سے تمسک کرنا سخت ناعاقبت اندیشی ہے.

انکار عذابِ قبر کی ضرورت کیوں پڑی

کرامیہ کا اصل اختلاف حیاتُ النبی کے موضوع پر تھا. وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بعد وفات حقیقی نبی نہ مانتے تھے، آپ کی حکمی رسالت کے قائل تھے. اس مہم کو سر کرنے کے لیے انہیں ابتداء سے روح و بدن کی لاتعلقی کی ضرورت تھی. عذابِ قبر میں وہ صرف روح کے عذاب کے قائل ہوئے، شہداء کی حیات مانی تو صرف پرندوں کے قالب میں ــــــ الغرض اس موضوع کا جہاں تک پھیلاؤ تھا. یہ لوگ عقیدہ اہل سنت کی تمام کڑیوں کو ایک ایک کرکے توڑتے گئے.

ہمارے عہد میں بھی اختلافِ عقیدۂ حیات النبی سے شروع ہوا. یہ حضرات ابتداء میں عذابِ قبر سے منکر نہ تھے. لیکن مسئلہ جب اطراف و جوانب میں پھیلا تو انہیں بھی عذابِ قبر میں معتزلہ کے ساتھ جانا پڑا.

آپس میں یہ کہتے ہیں کہ اگر ہم عامہ اموات میں کسی درجے کی حیات کا اقرار کرلیں تو پھر ہمیں شہداء کی بھی حیات جسمانی کا اقرار کرنا پڑے گا. اس لیے ہم ابتداء سے ہی انکار ضروری سمجھتے ہیں.

کہ عامہ اموات کے لیے عذابِ قبر روح و بدن کے تعلق سے نہیں ہے۔ یہ اس لیے کہ ہمیں انتہا میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات فی القبر کا کسی درجے میں اقرار نہ کرنا پڑے۔

جب کسی نے گڑھے میں گرنے کی ہی نیت کر رکھی ہو تو اُسے کون روک سکتا ہے۔ اختلاف ہو تو حل ہو سکتا ہے ضد اور عناد کا کوئی علاج نہیں۔

یہ گمراہی جس ترتیب سے اُٹھی ہے ہم چاہتے ہیں کہ ہم بھی اسی ترتیب سے چلیں پہلے اسلام کے عقیدۂ برزخ پر کچھ بحث ہو جائے۔ اس کے ضمن میں مسئلہ عذابِ قبر پر کچھ بحث ہو جائے ـــ پھر حیات الشہداء پر کچھ بحث ہو جائے ـــ اور آخر میں مسئلہ حیات انبیاء پر عقائد اہل السنۃ والجماعۃ کی روشنی میں حق بات کہہ دی جائے۔

ہم نے حق بات کہنی تھی کہہ دی۔ اب اسے دلوں میں اُتارنا یہ ہمارے بس کی بات نہیں۔ دل اللہ رب العزت کی دو انگلیوں کے درمیان ہیں۔ جس طرح وہ چاہتا ہے وہ انہیں پھیرتا ہے۔

احباب سے گذارش ہے کہ وہ ہماری معروضات کو ضد و عناد اور تعصّب کی عینک اُتار کر پڑھیں۔ ان شاء اللہ بہت سے بیمار دلوں کو شفا ہو گی۔ وھو المستعان وعلیہ التکلان۔

یا قوم الیس ـــ منکم رجلٌ رشید۔

عالمِ ارواح، عالمِ دُنیا، عالمِ برزخ، عالمِ آخرت اور عالمِ امثال کے حالات اور ان کی صفات آپ کے سامنے ہیں ان میں عالمِ برزخ میں قبر کے اَلم و لذّت کی کیفیت اور اس کا ادراک اُس چھپے جہان (برزخ) کا سب سے بڑا نازک مسئلہ ہے۔ اس کھلے جہان میں ہم اس پر ایمان لانے کے تو مکلف ہیں۔ کیونکہ قرآن پاک اور احادیث میں اسے ان مختلف پیرایوں میں بیان کیا گیا ہے کہ ان کی قدرِ مشترک اسے تواتر کا درجہ دیتی ہے۔ لیکن اسے یہاں پوری طرح جان لینا ہمارے بس میں نہیں۔ تاہم اپنے قارئین کی سہولت کے لیے ہم اسے کچھ سہل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ واللہ ولی ـــ التوفیق۔

عذاب القبر

① ثم السؤال عندی یکون بالجسد مع الروح کما اشار الیہ صاحب الهدایہ۔[1]

ترجمہ۔ میرے نزدیک قبر کا سوال و جواب روح و جسد کے مجموعہ سے ہوگا اور صاحب ہدایہ نے بھی اسی طرف اشارہ کیا ہے۔

② یصح ان یعرض علی الانسان المجموع المرکب من الجسد والروح مقعدہ من الجنۃ او النار ویحس اللذۃ والالم۔[2]

ترجمہ۔ یہ صحیح ہے کہ قبر میں جنت اور دوزخ کے ٹھکانے روح و جسد کے مجموعہ پر پیش ہوتے ہیں اور روح و جسد سے مرکب انسان ہی قبر کے لذت و الم کا ادراک کرتا ہے۔

③ ولا یرد تعذیب المیت فی قبرہ لانہ توضع فیہ الحیات عند العامۃ بقدر ما یحس بالالم والبنیہ لیست بشرط عند اھل السنۃ بل تجعل الحیاۃ فی تلک الاجزاء المتفرقۃ لا یدرکھا البصر۔[3]

ترجمہ۔ عذاب قبر کا انکار نہ کیا جائے، کیونکہ جمہور اہل سنت کے نزدیک میت میں اس قدر حیات رکھی جاتی ہے کہ وہ لذت و الم کا ادراک کر سکے، اور جسم کا یکجا ہونا اس ادراک الم کے لیے اہل سنت کے ہاں کوئی شرط نہیں، بلکہ وہ حیات اجزائے منتشرہ میں بھی اس طرح رکھی جا سکتی ہے کہ یہ ظاہری آنکھیں اسے نہ پا سکیں۔

---

[1] فیض الباری مولانا السید انور شاہ صاحبؒ جلد ۲ ص ۱۸۲
[2] مظہری جلد ۱۰ ص ۲۲۵ [3] رد المحتار شامی باب الیمین فی الضرب والقتل جلد ۳ ص ۲۰۱

④ — واعلم ان اهل الحق اتفقوا علی ان اللہ تعالیٰ یخلق فی المیت نوع حیاۃ فی القبر قدر ما یتألم او یتلذذ۔[1]

ترجمہ۔ یہ جان لیجئے کہ اہل حق (اہل سنت) کا اس پر اتفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ میت میں بحالتِ قبر ایک اس طرح کی حیات ضرور پیدا فرما دیتے ہیں کہ وہ (معاملاتِ قبر میں) اَلم یا لذت کا ادراک کر سکے۔

⑤ — ان مذهب سلف الائمۃ وائمتها ان المیت اذا مات یکون فی نعیم او عذاب وان ذالک یحصل لروحه و بدنه۔[2]

ترجمہ۔ سلفِ امت اور ائمہ اہل سنت کا فیصلہ یہی ہے کہ مرنے کے بعد میت کے لیے نعیم و عذاب کے معاملات برحق ہیں اور (قبر میں لذت و اَلم کا) یہ ادراک روح و بدن کے مجموعہ کے ساتھ ہوتا ہے۔

⑥ — ان النعیم والعذاب لایکون الّا علی الروح وان البدن لاینعم ولا یعذب وهٰذا تقوله الفلاسفۃ المنکرون لمعاد الابدان و هٰؤلاء کفّار باجماع المسلمین ویقوله کثیر من اهل الکلام من المعتزلۃ وغیرهم الذین یقرون بمعاد الابدان لکن یقولون لایکون ذالک فی البرزخ وانما یکون عند القیام من القبور لکن هٰؤلاء ینکرون عند البدن فی البرزخ۔[3] فقط

ترجمہ۔ قبر کا ثواب و عذاب صرف روح کو ہوتا ہے اور بدن کو اس سے کوئی تعلق نہیں، یہ اُن فلاسفہ کا قول ہے، جو "معادِ ابدان" کے بھی منکر ہیں اور یہ لوگ بالاجماع مسلمان نہیں معتزلہ کے متکلمین کا جو "معادِ ابدان" کا اقرار کرتے ہیں، بھی قبر کے ثواب و عذاب کے متعلق یہی عقیدہ ہے۔ وہ معاملہ ابدان کو صرف

---

[1] شرح فقہ اکبر ص ۱۲۱ [2] کتاب الروح ص ۶۳ [3] ایضاً ص ۶۳

حشر میں تسلیم کرتے ہیں، برزخ میں اس کے قائل نہیں۔ ان معتزلہ کا عقیدہ ہے کہ عذابِ قبر صرف روح سے متعلق ہے۔ بدن کو اس سے کوئی تعلق نہیں۔

(۷)— بدنِ اوّل را از حصولِ احکامِ برزخ چارہ نبود و از عذاب و ثوابِ قبر گزیر نہ۔ ...

..... افسوس، ہزار افسوس، ایں قسمِ بطالاں خود را بمسند شیخی گرفتہ اند و مقتدائے اہلِ اسلام گشتہ ضلوا و اضلوا۔[1]

ترجمہ۔ اس سے پہلے بدن (عنصری) پر احکامِ برزخ ضرور وارد ہوتے ہیں اور اس بدنِ اوّل کو عذابِ قبر اور ثوابِ قبر کے معاملات سے ہرگز چھٹکارا نہیں۔ افسوس ہزار افسوس، ان فریب کاروں پر جو شیخ ہونے کی مسند بچھائے ہوئے ہیں مسلمانوں کے مقتدا بنتے ہیں (اور پھر ان امور کا انکار کرتے ہیں) یہ خود بھی گمراہ ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کر رہے ہیں۔

تنقیح المبحث

مختلف ادوارِ حیات کی تفصیل اس لیے کی گئی ہے کہ اصل موضوع جس پر پورے سوادِ اعظم کا اجماع ہے مشتبہ ہو کر نہ رہ جائے۔ برزخی کیفیات کی تفصیل اس لیے ہے کہ اس دنیا والے بدن یا اس کے اجزاء کو عالمِ برزخ میں روح سے کُلّی طور پر جُدا نہ سمجھا جائے۔ بلکہ ہر کسی کے لیے اس کے مقام کے مطابق روح و بدن کا تعلق قائم تسلیم کیا جائے۔

جملہ اہلِ اسلام کا اتفاق اور اجماع ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وفاتِ شریفہ وارد ہوئی اور طریانِ موت سے "کل نفسٍ ذائقۃ الموت" کا وعدہ پورا ہوا آپ کے لیے جس قسم کی وفات مقدر تھی اُس کا وُرود ہوا، اور آپ نے یقیناً اس عالمِ دُنیا سے عالمِ برزخ میں انتقال فرمایا۔ روضۂ منورہ برزخ کا محل اور آخرت کی پہلی منزل ہے۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ ارشاد فرماتے ہیں:۔

---

[1] مکتوبات امام ربانی دفتر دوم صـ ۱۱۶

حسب ہدایت کل نفس ذائقۃ الموت اور انک میت و انھم میتون
تمام انبیائے کرام علیہم السلام خاص کر حضرت سرورِ انام صلی اللہ علیہ وسلم کی
نسبت موت کا بھی اعتقاد ضرور ہے۔[1]

بالجملہ موتِ انبیاء اور موتِ عوام میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔[1]

اس پر بھی پورے سوادِ اعظم کا اجماع ہے کہ حضورؐ کے پردۂ قبر میں جانے کے بعد پھر آپ کے جسدِ اطہر میں حیات لوٹا دی گئی۔ دخولِ روح سے اس دنیا والے جسمِ عنصری میں اعادۂ حیات ہوا یا تاثیرِ روح سے آپ کے جسدِ عنصری میں حیات لوٹ آئی؟ اس میں کچھ خفیف سا اختلاف ہوا، لیکن انجامِ کار سب کا اتفاق ہے کہ آپؐ کا جسدِ اطہر روضۂ منورہ میں محض بے حس و بے شعور نہیں، بلکہ فائز الحیات ہے۔ آپؐ کی یہ حیاتِ قدسیہ باعتبار تعلق بالبدن جسمانی، باعتبار تعلق بالرزق روحانی اور باعتبارِ تعلق بالعالم برزخی ہے۔

ان سطور سے یہ حقیقت بے غبار ہو گئی کہ اصل مبحث مطلق حیات نہیں، بلکہ حیات بعد الوفات ہے۔ پس وہ آیات یا روایات جن سے ثبوتِ وفات سید الکائنات کا استدلال ہوتا ہو، ہمارے مدعا کے قطعاً خلاف نہیں۔ مسئلہ زیرِ بحث میں انہیں بار بار دہرانا اور محلِ نزاع بنانا یقیناً خروج عن المبحث ہے۔ اہلِ سنت کا عقیدۂ حیاتُ النبیؐ کے مسئلہ میں یقیناً "حیات بعد الوفات" کا ہے۔ پہلے وفات کا ورود بعد کے زندہ ہونے کے ہرگز منافی نہیں۔ خطبۂ صدیقی صرف ان لوگوں کے خلاف ہی پیش ہو سکتا ہے، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کسی قسم کے طریانِ موت کے قائل نہ ہوں۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ طریانِ موت کی کیفیت میں تو اختلاف کر سکتے ہیں، لیکن ورودِ موت سے انہیں بھی اختلاف نہیں۔ یہ حقیقت ان کو بھی تسلیم ہے کہ جس قسم کی وفات آپؐ کے لیے مقدر تھی وہ آپ پر وارد ہوئی۔ اور وعدۂ الٰہیہ حضورؐ پر بھی پورا ہوا۔

---

[1] لطائفِ قاسمی ص۴ مطبع مجتبائی [1] آبِ حیات ص۲۱۹

طریانِ موت اور اعادۂ حیات کے احتمالاتِ ثلٰثہ

صورتِ واقعہ — کچھ بھی ہو

روضۂ منورہ کی حیاتِ جسمانی پھر بھی قدرِ مشترک ہے

احتمالِ اوّل

آپؐ کی وفاتِ شریفہ بمعنی ابانۃ الروح عن الجسد ہے۔ لیکن روحِ مبارک جسدِ اطہر سے جُدا ہونے اور رفیقِ اعلیٰ اور علیین کی سیر کرنے کے بعد[1] پھر قبرِ شریف میں رکھے ہوئے جسدِ اطہر

---

[1] اعلیٰ علیین میں اس وقت داخلے اور تعلق قائم کر کے پھر روح کے واپس ہو جانے پر تعجب نہ ہو۔ اس لیے کہ جب حضرت جبریلؑ اور میکائیل علیہما السلام نے ایک خواب میں حضورؐ کو اس عالم کی سیر کرائی تھی۔ اور حضورؐ اکرم نے وہاں اپنی منزل دیکھی تھی، تو آپ اس میں داخل ہونے لگے تھے۔ ظاہر ہے کہ آپؐ کا داخل ہونے کا ارادہ وہاں رہنے کے لیے نہ تھا۔ بلکہ آپ محض سیر کے طور پر وہاں داخل ہونا چاہتے تھے۔ اس پر حضرت جبریلؑ اور حضرت میکائیلؑ نے کہا تھا۔ انہ بقی لک عمر لم تستکملہ فلو استکملت اتیت منزلک (بخاری کتاب الجنائز جلد ا ص۱۸۵) آپ کی عمرِ شریف میں سے کچھ حصہ باقی ہے۔ جب آپ اس کی تکمیل فرمالیں گے تو پھر آپ اپنی اس منزل میں آئیں گے۔" جب یہ کلام اس وقتی داخلے کے جواب میں تھا تو متبادر ہوتا ہے کہ استکمالِ عمر کے بعد وہاں جو داخلہ میسر ہوگا وہ بھی بطورِ سیر اور کچھ وقت کے لیے ہی ہوگا۔ بعد میں کیا ہوگا، یہاں اس کی تفصیل نہیں اور نہ یہ اس کا مقام تھا۔ ہاں اس روایت کے کسی طریق میں ہمیں یہ الفاظ کہیں نہیں مل سکے کہ آپ استکمالِ عمر کے بعد اس منزل ہی میں ہمیشہ رہیں گے۔ من ادعیٰ فعلیہ البیان۔ بہرحال یہ ایک خواب تھا جس کی تحقیق اس وقت مقصودِ کلام نہیں۔ ممکن ہے اس کی تعبیر کچھ اور ہو۔

میں لوٹادی گئی۔ روحِ اقدس کا اعلیٰ علیین سے تعلق بھی رہا اور روضۂ منورہ میں رکھے جسدِ اطہر میں بھی حیات لوٹ آئی اور اس طرح روح و بدن میں ویسا ہی قوی تعلق قائم ہوگیا جو اس دُنیا میں تھا بلکہ اس سے بھی قوی تر، کیونکہ یہ حیاتِ دُنیوی رزقِ مادی کی محتاج ہے۔ لیکن اس عالمِ برزخ کی حیاتِ عنصری جسمانی اس دُنیا کے رزقِ مادی پہ مبنی نہیں۔ اس کا تقوم رزقِ روحانی پہ ہے اور یہ ہمارے شعور سے بالاتر ہے۔

احتمالِ دوم

آپ کی وفاتِ شریفہ بمعنی ابانۃ الروح عن الجسد ہی ہے لیکن بعد کا اعادۂ حیات دخولِ روح سے نہیں، اتصالِ روح سے ہے۔ روحِ مبارک جسدِ اطہر سے جُدا ہوکر رفیقِ اعلیٰ اور خطیرۂ قدسیہ میں پہنچی پھر اسی مستقر سے اس کا پَرتو قبر شریف میں رکھے ہوئے جسدِ اطہر پہ پڑنے لگا۔ اس سے جسدِ عنصری کا شعور بیدار ہوا اور روح و بدن میں نہایت قوی علاقہ قائم ہوگیا۔ روح و بدن کے اس تعلق سے حیاتِ جسمانی قائم ہوئی اور روضۂ منورہ پہ عرض کیے گئے صلوٰۃ وسلام کو آپ خود سنتے ہیں۔

احتمالِ سوم

آپ کی وفاتِ شریفہ بمعنی ابانۃ الروح عن الجسد نہیں، بلکہ بمعنی قبضِ رُوح ہے۔ انقباض الروح فی القلب سے روحِ اقدس سارے جسد سے یہ موجُودہ تعلق منقطع کر کے قلبِ مُبارک میں مستور ہوگئی۔ پھر وہاں روح اور حیات میں تلازم ہٹ گیا۔ آثارِ حیات قلبِ منور سے پھر پھیل گئے اور روحِ مبارک اس تعلق کے باوجود علیین سے بھی متعلق ہوگئی۔

خلاصہ یہ کہ حیات ایک لحہ کے لیے بھی مرتفع نہ ہوئی اور "روح بمعنی حیات" کا کلی انقطاع نہ ہوا۔ گو انقباض الروح فی القلب سے موت کا وعدہ بھی پُورا ہوگیا۔ اس عالم

میں روح و حیات میں تلازم نہیں، آثارِ حیات سلب ہو کر قلب میں اس لیے منتقل ہوئے کہ اختلافِ دارین کا تحقق ہو سکے، کیونکہ موت ذریعہ ہے اس عالم میں منتقل ہونے کا۔ اور قاعدہ ہے حریمِ اسرار میں بغیر آئینِ دربار کے کوئی شخص داخل نہیں ہو سکتا۔ اس قسم کے ورودِ وفات پر صحابہ کرام رضی نے آپ کو دفن کر دیا اور روضۂ منورہ میں پھر آپ کے جسدِ اطہر میں حیات پھیلا دی گئی اور روح و بدن کا ویسا ہی تعلق قائم ہو گیا جیسا کہ اس دُنیا میں تھا۔ ماسوا اس کے کہ لوازمِ حیات وہاں صرف وہی ہیں۔ جن کا پتہ ہمیں شریعت کی طرف سے ملتا ہے۔ اس دُنیا کی زندگی کے جمیع لوازمات کا تحقق وہاں ضروری نہیں۔

تبصرہ: طریانِ موت اور اعادۂ حیات کی ان تین صورتوں میں سے کوئی ایک محلِ نزاع نہیں اور نہ اُن میں سے کسی ایک کے امرِ واقع ہونے پر ہمیں اصرار ہے۔ بحث و تحیص وہیں ہونی چاہیئے، جہاں ترتبِ احکام مختلف کروٹیں لے رہا ہو اور جہاں بہر صورت قدرِ مشترک ایک ہی ہو اور ترتبِ آثار و احکام میں، خواہ کوئی بھی احتمال اختیار کر لیں، نتیجہ ایک ہی ہو، وہاں ان مباحث میں اُلجھ کر رہ جانا خود ایک اندازِ جنون ہے۔

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رح نے طریانِ موت اور اعادۂ حیات کے لیے جس صورت کو امرِ واقع قرار دیا ہے، اس کے متعلق لکھتے ہیں:۔

> ہم بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات کے لیے ایسے یقین کے خواستگار نہیں کہ وہ ہم سنگ یقین توحید و رسالت ہو، فقط اس قدر کافی ہے کہ منشا ترتبِ آثار و احکام ہو سکے۔[1]

> گو عقیدہ تو یہی ہے اور میں تو جانتا ہوں، انشاء اللہ العزیز ایسا ہی رہے گا، مگر اس عقیدہ کو عقائدِ ضروریہ سے نہیں سمجھتا۔[2]

پس جب حضرت حجۃ الاسلام رح نے اپنی اختیار کردہ صورت سے اختلاف کرنے کا خود

---

[1] آبِ حیات ص ۲۸ [2] لطائفِ قاسمیہ ص ۵ مطبع مجتبائی

دوسروں کو حق دیا ہے، تو اب اس خاص جزئیہ میں حضرتؒ سے اختلاف خود ان کے مسلک سے خروج نہیں۔ ہاں اگر قدرِ مشترک ہی کا کہ روضۂ منورہ میں جسدِ اطہر محض بے حس و شعور نہیں، بلکہ اس میں حیات عنصری بہر صورت کیفیت موت موجود ہے۔ انکار کر دیا جائے تو پھر اس اصل کے انکار کو ایک خاص صورتِ موت کے انکار پر قیاس نہیں کر سکتے۔ یہ یقیناً اکابر اہلِ سنت کے مسلک سے گریز پائی ہو گی۔

روحِ مبارک نے علیین سے پرتو ڈال کر جسدِ اطہر میں حیات لوٹائی ہو یا قدرتِ ایزدی سے خود روح ہی بدن میں داخل ہو چکی ہو یا قلبِ منور میں مستور حیات پھر سارے بدن میں پھیلا دی گئی ہو۔ صورتِ واقعہ خواہ کچھ ہو، مآل کار سب کا ایک ہے اور وہ یہ کہ روضۂ منورہ کی حیاتِ جسمانی تمام احتمالات اور مسالکِ فکر کی قدرِ مشترک ہے۔

تفصیل مذکور سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ مسئلہ زیرِ بحث فقط یہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے روضۂ شریفہ میں حیاتِ عنصری سے زندہ ہیں یا جسدِ اطہر محض بے جان پڑا ہے۔ یہ بحث ہرگز نہیں کہ:۔

(۱) ——— حضورؐ پر وفاتِ شریفہ کا ورود ہوا تھا یا نہیں یا

(۲) ——— یہ طریانِ موت انقطاع الروح عن الجسد کے معنی میں تھا یا قبضِ روح کے معنی میں یا

(۳) ——— روحِ مبارک کا مستقر مقامِ علیین ہے اور وہ وہاں سے روضۂ منورہ میں رکھے گئے۔ جسدِ اطہر پر پرتوِ حیات ڈال رہی ہے یا خود روح ہی دوبارہ جسدِ اطہر میں داخل ہے۔ اور رفیقِ اعلیٰ سے فقط ایک تعلق باقی ہے، وغیرہ ذٰلک من المدارک۔ ان کیفیات کو موضوع بنا لینا یقیناً خروج من المبحث ہوگا اور یہ امور قطعاً نقطۂ اشتراک۔ قبر شریف کی حیاتِ عنصری کے عوارضِ ذاتیہ میں سے نہیں، ان احتمالاتِ ثلثہ میں سے کسی ایک یا دو کے بالکل خلافِ واقعہ ثابت ہو جانے سے بھی اصل مسئلے کا انکار یا ابطال لازم نہیں آتا۔

اصل مبحث حیاتُ النبیؐ

باعتبار تعلق بالبدن ـــــ حیاتِ جسمانی		
باعتبار تعلق بالعالم ـــــ حیاتِ برزخی	}	مشترک مفاد حیاتِ جسمانی برزخی ہے۔
باعتبار تعلق بالرّزق ـــــ حیاتُ روحانی		

(ولولا الاعتبارات لبطل الحکمۃ)

حیاتِ جسمانی

زندہ اُسے ہی کہتے ہیں جس کے بدن میں حیات ہو، خواہ دخولِ روح سے، خواہ اتصال روح سے۔ فقط روح کے زندہ ہونے سے کسی کو زندہ نہیں کہا جاتا، اس لیے کہ روح تو ہوتی ہی زندہ ہے، خواہ مسلمان کی ہو یا کافر کی ـــــ روح جہاں بھی ہوگی، زندہ ہی ہوگی پس کسی شخصیت کے زندہ ہونے یا نہ ہونے کا معیار جسم ہے اور یہی زندگی کا محل ہے۔ جس کے بدن میں حیات ہو وہ زندہ ہے اور جس کی رُوح یا حیات اس کے بدن سے منقطع ہے وہ زندہ نہیں اور نہ اُسے کوئی شخص زندہ سمجھتا ہے۔

قرآن عزیز میں جہاں بھی انسانی حیات کا تذکرہ ہے، اس کا محل جسم ہی ہے۔ شہداء کے متعلق ارشاد فرمایا:۔

① ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ امواتٌ بل احیاءٌ ولکن لا تشعرون۔

(پ۲ البقرہ آیت ۱۵۴)

ترجمہ۔ اور تم اُنہیں، جو اللہ کی راہ میں مارے جاتے ہیں، مُردے نہ کہو، بلکہ وہ زندہ ہیں، لیکن تمہیں پتہ نہیں چلتا۔

یہاں احیاء اُنہی کو فرمایا، جو من یقتل کے ماتحت آتے تھے اور ظاہر ہے قتل کا محل

جسم ہے نہ کہ روح ——— پس حیات کا محل بھی جسم ہی ہے نہ کہ روح ——— اگر جسم میں زندگی ہو تو وہ زندہ ہے۔ اگر جسم زندہ نہیں تو کوئی زندگی نہیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ شہداء کے اجسام سامنے بالکل مُردہ نظر آتے ہیں، بلکہ بعض اوقات لاش بھی ایک جگہ نہیں ہوتی۔ تو کس طرح تسلیم کر لیا جائے کہ وہ جسدی طور پر زندہ ہیں؟

جواباً عرض ہے کہ اسی لیے تو اللہ رب العزت نے ارشاد فرما دیا تھا ——— ولکن لا تشعرون "لیکن تمہیں پتہ نہیں چلتا" ——— اگر ہمیں اس حیات کا پتہ نہیں چلتا، تو یہ ایک پردہ ہے، حق یہی ہے کہ حیات ثابت ہے اور وہ جسدی حیات ہے

قاضی شوکانی ؒ (۱۲۵۰ھ) لکھتے ہیں:۔

ورد النص فی کتاب اللہ فی حق الشہداء انہم احیآء یرزقون وان الحیاۃ فیہم متعلقۃ بالجسد فکیف بالانبیاء المرسلین۔[1]

ترجمہ: نص قرآن وارد ہے کہ شہداء زندہ ہوتے ہیں، انہیں رزق بھی دیا جاتا ہے اور یہ کہ اُن کی حیاتِ جسمانی ہوتی ہے (خواہ ہمیں اس کا ادراک نہ ہوتا ہو) پس انبیائے مُرسلین کی حیاتِ اطہر کس طرح جسمانی نہ ہوگی۔

(۲) واذ قال ابراھیم رب ارنی کیف تحی الموتٰی۔

(پ۳، البقرہ آیت ۲۶۰)

ترجمہ۔ اور جب ابراہیمؑ نے کہا۔ اے پروردگار! مجھے دکھایئے کہ آپ کس طرح مُردوں کو زندہ فرماتے ہیں۔

یہاں حیات کا محل اسے ہی بتایا ہے جسے کہ "موتٰی" کہا گیا ہے اور ظاہر ہے رُوح ہمیشہ زندہ ہوتی ہے اسے میت کبھی بھی نہیں کہا جاتا۔ موت کا محل جسم ہی ہے اور "موتٰی" اجسام ہی کو کہا گیا ہے۔ پس حیات کا محل بھی جسم ہی ہے نہ کہ رُوح۔

---

(۱) نیل الاوطار جلد ۳ صد ۲۱۱ مصر

(۳) فاماته الله مائة عام۔ (پ۳ البقرہ ع ۳۵ آیت ۲۵۹)

ترجمہ۔ حضرت عزیرؑ کو سو سال تک موت سے رکھا

اس میں بھی اماتت کا محل جسم ہی ہے نہ کہ روح۔ حضرت عزیرؑ کی روح پر تو موت قطعاً نہ آئی تھی۔ پس جس طرح موت کا محل جسم ہے نہ کہ روح، اسی طرح حیات کا محل بھی جسم ہی ہے۔ جب حیات جسم میں ہو تو زندہ ہے جب نہ ہو تو زندہ نہیں۔

(۴) انّی یحی هذه ــــــ میں بھی محلّ حیات جسم ہی ہے نہ کہ روح۔

ان حقائق سے واضح ہے حیات ہوتی ہی جسمانی ہے۔ اگر روح کا تعلق بدن کے ساتھ نہ ہو تو اسے کوئی حیات نہیں کہتا اور نہ ہی یہ حیات کی کوئی قسم ہے۔ خواہ مخواہ اسے حیاتِ روحانی کہتے چلے جانا ایک مغالطہ اور فریب ہے، اسی طرح موت کا محل بھی جسم ہی ہے۔ مالک بن ریب اپنے مرثیے میں کہتا ہے۔ ؎

ولمّا تراءت عند مرو منیتی

وحلّ بها جسمی وحانت وفاتیا

ترجمہ۔ اور جب مرو کے پاس میری موت سامنے آئی اور اس کا محل میرا جسم بنا اور میری وفات کی گھڑی آ پہنچی۔

۱؎ پیشِ نظر رہے کہ جس طرح جملہ بنی آدم پر فعل اماتت محض ایک آنی اور صرف چند لحات کے لیے وارد ہوتا ہے۔ بعد ازاں برزخی معاملات شروع ہو جاتے ہیں۔ حضرت عزیرؑ پر ایسا نہ ہوا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں سو سال تک موت کی حالت میں رکھا، آگے کے برزخی معاملات ان پہ وارد نہ فرمائے کیونکہ آگے جا کر انہیں اسی دنیا میں زندہ کیا جانا تھا۔ پس جب موت سابقہ سے انتقالِ دارین کا تحقق نہ تھا، تو برزخی معاملات کو روک لیا گیا۔ یہاں مائة عام کی قید اسی لیے ہے کہ جب دوسرے بنی آدم پر فعلِ امات کے بعد معاملاتِ برزخ جاری کر دیئے جاتے ہیں۔ یہاں معاملہ عجیب ہو رہا ہے پس اسے ایک ضابطہ بنانا اور موتِ انبیاء کے لیے بطور ایک کلیہ کے پیش کرنا کس قدر کھلی خطا ہے۔

حیاتِ برزخیہ

نہایت افسوس ہے کہ انبیاء کرامؑ کی حیاتِ عنصری جسمانی کے انکار کو حیاتِ برزخی کے مبہم اقرار میں لپیٹنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ حالانکہ حیات کی کوئی قسم برزخی نہیں۔ حیاتِ برزخیہ میں علاقہ نوعیت کا نہیں، ظرفیت کا ہے۔ اور حیاتِ برزخی سے مراد حیات فی البرزخ ہے، نہ یہ کہ حیات کی اپنی کوئی قسم برزخی ہے۔ نہ یہ مطلب ہے کہ آپ کو عالم برزخ میں حیات جسمانی حاصل نہیں۔

پس جن بزرگوں نے حیاتِ برزخی کی تصریح کی ہے، اُن کی مراد روضۂ منورہ کی حیاتِ عنصری جسمانی کا انکار ہرگز نہیں۔ اسی طرح جنہوں نے حیاتِ رُوحانی کے الفاظ استعمال کیے۔ ان کا منشاء یہی تھا کہ باعتبارِ تعلّق بالرزق وہ رُوحانی حیات ہے، نہ یہ کہ حیات کی کوئی اپنی قسم رُوحانی بھی ہے۔ اندریں صورت حیاتِ رُوحانی یا حیاتِ برزخی کے قول سے قبر شریف کی حیاتِ جسمانی کا انکار ہرگز لازم نہیں آتا۔

خلاصۃ المرام یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ ثانیہ کی ان جہات (برزخی، روحانی معنوی) میں کوئی اختلاف نہیں، انہیں خواہ مخواہ محلِ بحث بنانا اصل موضوع کو اُلجھانے کے سوا اور کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ اصل موضوعِ تحقیق صرف حیاتِ جسمانی ہے اور وہی محلِ نزاع بنی ہوئی ہے۔ پس اصل مبحث یہ ہے کہ :-

"سید الکائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے روضۂ شریفہ میں حیاتِ عُنصری جسمانی حاصل ہے یا جسدِ اطہر محض بے حس و شعور پڑا ہے۔" (معاذ اللہ)

رُوح کی حقیقت

بقیۃ السلف بحرُ العلوم حضرت علامہ سید انور شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ بالفاظِ عارف جامیؒ یہاں تین چیزیں ہیں :-

(۱) وہ جواہر جن میں مادہ اور کمیت دونوں ہوں، جیسے ہمارے ابدانِ مادیہ۔

(۲) وہ جواہر جن میں مادہ نہیں صرف کمیت ہے، جنہیں صوفیاء "اجسامِ مثالیہ" کہتے ہیں۔

(۳) وہ جواہر جو مادہ اور کمیت دونوں سے خالی ہوں، جن کو صوفیاء "ارواح" یا حکماء "جواہر مجردہ" کے نام سے پکارتے ہیں۔

جمہور اہل شرع جس کو رُوح کہتے ہیں وہ صوفیہ کے نزدیک "بدنِ مثالی" سے موسوم ہے جو بدن مادی میں حلول کرتا ہے اور بدن مادی کی طرح آنکھ، ناک، کان ہاتھ، پاؤں وغیرہ اعضاء رکھتا ہے۔ یہ روح بدنِ مادی سے کبھی جُدا ہو جاتی ہے ہے اور اس جُدائی کی حالت میں بھی ایک طرح کا مجہول الکیفیت علاقہ بدن کے ساتھ قائم رکھ سکتی ہے جس سے بدن پر ہر حالت میں موت طاری نہیں ہونے پاتی۔ گویا حضرت علی مرتضیٰؓ کے قول کے مطابق، جو بغویؒ نے اللہ یتوفی الا نفس حین موتہا کی تفسیر میں نقل کیا ہے، اس وقت رُوح خود علیحدہ رہتی ہے، مگر اس کی شعاع جسد میں پہنچ کر بقائے حیات کا سبب بنتی ہے، جیسے آفتاب لاکھوں میل سے بذریعہ شعاعوں کے زمین کو گرم رکھتا ہے۔[1]

حضرت علامہ انور شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:۔

الحیوۃ فی اللغۃ شیء مغائر للروح لا عینہ بل ثمرۃ تعلقۃ وقد زعم بعض الناس انہ نفس الحیوۃ ولیس کذٰلک[2]

ترجمہ۔ حیات اور روح لغت کی رو سے دو مختلف حقیقتیں ہیں۔ حیات بروح کا عین نہیں، بلکہ اس کے تعلق کا ایک ثمرہ ہے۔ بعض عام لوگوں کا گمان ہے، کہ رُوح ہی نفسِ حیات ہے، حالانکہ معاملہ ایسا نہیں۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ بھی لکھتے ہیں:۔

---

[1] فوائد القرآن للعلامۃ العثمانیؒ ص ۶۰۳ [2] تحیۃ الاسلام ص ۳۶

بسیارے از اشاعرہ و حنفیہ در اعادۂ روح تردد کردہ اند و تلازم روح و حیات را منع نمودہ[1]

ترجمہ: بہت سے اشاعرہ اور حنفیہ (حیات فی القبر کے لیے) اعادۂ روح کے بارے میں متردد رہے ہیں (یعنی اسے قطعی نہیں جانتے رہے) اور حیات اور روح کے تلازم کے قائل نہیں ہیں۔

یعنی قبر میں حیاتِ جسمانی کے لیے اعادۂ روح ضروری نہیں، محض تعلقِ روح سے بھی وہاں حیات کا تحقق ہو جاتا ہے۔

مفارقتِ بدن کے بعد رُوح کا شعُور

امام رازیؒ اس پر دلائل پیش کرتے ہوئے کہ "رُوح مفارقتِ بدن کے بعد بھی جزئیات کا ادراک کر سکتی ہے۔ فرماتے ہیں:-

فوجب القطع بان النفس بعد مفارقة البدن مدركة للجزئيات.[2]

ترجمہ: یہ بات قطعی طور پر تسلیم کرنی چاہیئے کہ نفس انسانی بدن سے جُدا ہونے کے باوجود ان جزئیات کا ادراک کر سکتی ہے جو اس بدن پر وارد ہوں۔

ان تفصیلات سے واضح ہو گیا کہ اصل موضوع "اعادۂ روح" بھی نہیں، بلکہ "ثبوتِ حیات بعد الوفات لسید الکائنات" ہے اور اسی موضوع پر ہم کچھ گذارشات کرنا چاہتے ہیں۔ عودِ رُوح کی بحث اگر کہیں آئی ہے تو ضمناً آئی ہے۔ حیاتِ شہداء کا بیان بھی صرف اس لیے ہے کہ ان کی حیاتِ جسمانی کا ثبوت انبیاء کرام کی حیات ثابت کرنے کے لیے ایک زینہ کے درجہ میں ہے اور ان کی حیات سے انبیاء کی حیات بدلالت التزامی ثابت ہوتی ہے۔ اب ہم اس باب کو شروع کرتے ہیں۔ واللہ ولی التوفیق وبہ ازمۃ التحقیق۔

---

[1] جذب القلوب ص۱۸۶ از مسائرہ [2] المطالب العالیہ مقالہ ۱۲ فصل ۵ مطبوعہ مصر

حیاتِ شہداء

عامہ اموات کی برزخی زندگی اور اس کا اصلی بدن یا اس کے ذراتِ منتشرہ سے تعلق بایں قدر کہ عذابِ قبر یا اس کی نعیم کا ادراک ہو سکے تفصیل کے ساتھ آپ کے سامنے آچکا ہے یہ ایک روحانی زندگی ہے. جس کا قرآن پاک کی مختلف آیات میں اشارۃً ذکر ہے بقول حضرت مفتی اعظم مفتی محمد شفیع صاحب دامت برکاتہم:۔

> مرنے اور دفن ہونے کے بعد قبر میں انسان کا دوبارہ زندہ ہو کر فرشتوں کے سوالات کا جواب دینا — پھر اس امتحان میں کامیابی اور ناکامی پر ثواب یا عذاب کا ہونا قرآن مجید کی تقریباً دس آیات میں اشارۃً اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ستر احادیثِ متواترہ میں بڑی صراحت و وضاحت کے ساتھ مذکور ہے جس میں مسلمانوں کو شک و شبہ کی گنجائش نہیں[1]

لیکن حیاتِ شہداء عامہ اموات کی طرح صرف روحانی نہیں جسمانی ہے اور وہ اپنے حق میں اسے جسمانی ہی محسوس کرتے ہیں. عامہ اموات کی برزخی زندگی قرآن کریم میں اشارۃً اور شہداء کرام کی جسمانی برزخی زندگی قرآن پاک میں عبارۃً مذکور ہے. حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوات والتسلیمات کی اس سے بھی زیادہ کامل جسمانی برزخی زندگی قرآن کریم سے دلالۃً ثابت ہو رہی ہے. حیاتِ انبیاء کی بحث ہم انشاء اللہ آگے جا کر کریں گے.

یہاں موضوعِ سخن حیاتِ شہداء ہے جو قرآن کریم میں عبارۃ النص سے مذکور ہے جس کا انکار کفر ہے. اس کا سمجھ میں نہ آنا اس کے انکار کی دلیل نہیں ہو سکتا. نہ اس کا کسی

---

[1] معارف القرآن جلد ۵ ص ۲۳۶

مثال میں آنا اس کے شعور میں آنے پر منتج ہو سکتا ہے۔

نامناسب نہ ہو گا اگر ہم حیاتِ شہداء پر قرآنی شہادت پیش کرنے سے پہلے نفسِ حیات پر کچھ گذارش کر دیں۔ اس کے ضمن میں موت پر بھی کچھ بحث ہو جائے گی۔

ابن عبد الہادیؒ (۷۴۴ ھ) لکھتے ہیں :۔

والحیاۃ جنس تحتھا انواع وکذٰلک الموت فاثبات بعض انواع الحیاۃ لایزیل اسم الموت کالحیاۃ البرزخیہ واثبات بعض انواع الموت لاینافی الحیاۃ کما فی الحدیث الصحیح عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ کان اذا استیقظ من النوم قال الحمد للہ الذی احیانا بعد اماتنا والیہ النشور۔[1]

ترجمہ: حیات ایک جنس جس کے تحت کئی انواع ہیں اسی طرح موت ایک جنس ہے جس کے تحت کئی انواع ہیں سو کسی ایک قسم کی حیات کا ورود موت کے منافی نہیں۔ جیسا کہ حیات برزخی میں ہوتا ہے اور کسی ایک نوع کی موت کا اثبات حیات کے منافی نہیں جیسا کہ صحیح حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے آپ جب نیند سے اٹھتے تو کہتے کہ سب حمد و ثنا اسی ذات کے لیے ہے جس نے ہمیں موت کے بعد زندگی دی اور اسی کی طرف اُٹھ جانا ہے۔

سو حیات کی اگر مختلف انواع مان لی جائیں تو یہ کوئی ایسی گھاٹی نہیں جس پہ پہلے کوئی نہ آیا ہو۔ ہمارے دوست ہمیں بے جا طعنہ دے رہے ہیں۔ اسی طرح موت کی بھی انواع ہیں۔

○ —— ایک حیات وہ ہے جس میں روح اور بدن کا تعلق صرف اس درجہ میں ہے کہ عذابِ قبر اور اس کی نعیم کا ادراک ہو سکے یہ ایک روحانی حیات ہے اور اس میں جسم سے قدرے تعلق بھی ہے۔

---

[1] الصارم المنکی ص۱۸۵

(۲) ـــــــ ایک وہ حیات ہے جو روح کے بدن میں رہنے سے قائم ہوتی ہے لیکن روح کا بدن سے تعلقِ تصرف نہیں ہوتا نہ اس سے بدن کا تغذیہ و تنمیہ ہے۔ نہ اس کے لیے پانی اور ہوا لازمی ہیں۔ یہ اعادہ برزخ کے ساتھ برزخی زندگی ہے۔ ضروری نہیں کہ یہ زندگی پانے والے اسے حسی طور پہ جسمانی زندگی محسوس کریں۔

(۳) ـــــــ ایک حیات وہ ہے جو روح کے بدن میں داخلے اور تصرفِ تعلق سے قائم ہوتی ہے۔ اس میں آب و ہوا کے خارجی اثرات نشو و نما اور مادی خوراک درکار ہوتی ہیں جیسی کہ ہماری اس دُنیا کی زندگی ہے۔

(۴) ـــــــ ایک زندگی روح اور بدنِ عنصری کے اتصال سے قائم ہے اس میں روح کا تعلق تصرف اتنا ہے کہ پُورا بدن نرم و نازک اور محفوظ رہے۔ انہیں اس عالم کے مناسب رزق ملتا ہے اور ان سے عالمِ غیب کے افعال و آثار کا ظہور ہوتا ہے اور وہ اپنے حق میں اسے جسمانی حیات محسوس کرتے ہیں اور مختلف اعمال بھی (جیسے نماز پڑھنا) کرتے ہیں پر دیکھنے والوں کو ان میں سے کوئی حرکت دکھائی نہیں دیتی۔ ہاں انہیں اللہ تعالیٰ اس جہان کے زائرین کا سلام سُنا دیتے ہیں۔ یہ انبیاء کرام کی حیاتِ برزخی ہے۔

(۵) ـــــــ چوتھے درجے میں جس حیات کا ذکر ہے اگر وہ کھلے بندوں ہو اور ایک دوسرے کو نظر آئے اور یہ ہو بھی وفات کے بعد تو یہ صرف عالمِ آخرت کی زندگی ہے۔ اہل جنت جنت میں اسی زندگی سے رہیں اور پھریں گے اور اہلِ جہنم بھی آخرت میں اسی جسم اور زندگی سے معذب ہوں گے۔ اہل جنت اور اہل جہنم کے لیے اپنی اپنی برات کا رزق ہوگا۔

زندگی کے یہ مختلف محال ہم نے اس لیے ذکر کر دیئے ہیں کہ متعدد انواعِ حیات کو سمجھنے میں مدد ملے اور زندگی کی مختلف حقیقتوں کا ادراک ہو سکے۔

سوال : قبر کی برزخی زندگی ایک علیحدہ نوع ہے۔ کیا یہ تعبیر کہیں سلف نے بھی اختیار کی ہے کہ وہاں مختلف انواعِ حیات کے الفاظ ملیں یا زندگی کی حقیقت ایک ہی ہے۔

جواب : ہاں۔ آپ شرح العقائد اٹھا کر دیکھیں علامہ تفتازانی ؒ (۷۹۲ھ) لکھتے ہیں:

ویجوز ان یخلق اللہ تعالیٰ فی جمیع اجزاء البدن او فی بعضہا نوعًا من الحیٰوۃ قدر مایدرک الم العذاب ولذۃ النعیم۔[1]

ترجمہ۔ اور یہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ پورے بدن میں یا اس کے کسی حصے میں زندگی کی کوئی ایسی نوع قائم کر دے اسے عذاب کی تکلیف یا آرام کی لذت کا ادراک ہوتا رہے۔

حافظ ابن قیم ؒ (۷۵۱ھ) برزخ میں روح لوٹنے کے ذیل میں لکھتے ہیں:۔

لان ذٰلک الرد نوع اٰخر غیر المعہود۔[2]

ترجمہ۔ یہ روح کا بدن کی طرف لوٹنا روح و بدن کے تعلق کی اور نوع ہے جو اس دنیا والے تعلق سے مختلف ہے۔

اور ملا علی قاری ؒ (۱۰۱۴ھ) لکھتے ہیں:۔

ان اھل الحق اتفقوا علی ان اللہ یخلق فی المیت نوع حیٰوۃ فی القبر۔[3]

ترجمہ۔ سب اہلِ حق اس پر متفق ہیں کہ اللہ تعالیٰ قبر میں میت میں ایک خاص طرح کی زندگی پیدا کر دیتا ہے۔

حافظ ابن حجر ؒ (۸۵۲ھ) اس نوعِ حیات کو ادراک سے تعبیر کرتے ہیں اور کہتے ہیں اس کی اپنی تخلیق ہے:۔

ان اللہ تعالیٰ یخلق فیہ ادراکًا بحیث یسمع ویعلم ویلذ ویألم۔[4]

ترجمہ۔ اللہ تعالیٰ اس میت میں ایسا ادراک پیدا کر دیتے ہیں کہ وہ سنتا بھی ہے سمجھ بھی لیتا ہے آرام اور تکلیف محسوس کرتا ہے۔

اور یہی بات علامہ آلوسی ؒ نے روح المعانی میں کہی ہے۔[5]

---

[1] شرح عقائد ص۷۸ [2] کتاب الروح ص۸۹ [3] شرح فقہ اکبر ص۱۲۰ [4] فتح الباری جلد ۳ ص۱۷۴
[5] روح المعانی جلد ۲۲ ص۵۷

یہی بات علامہ ابن عبد الہادیؒ (۷۴۴ھ) لکھتے ہیں:۔

نوع حیاۃ برزخیہ۔[1]

ترجمہ۔ حیات برزخی زندگی کی ایک دوسری نوع ہے۔

اس زندگی سے اسمِ موت کلیتہً اٹھنا ضروری نہیں دونوں جمع ہو سکتے ہیں

موت کی بھی اسی طرح انواع ہیں یہ محض عدمِ حیات کا نام نہیں اس کی اپنی تخلیق ہے خلق الموت والحیاۃ (پ ۲۹ : الملک) قرآن کریم کی نص صریح ہے۔ سو جب یہ ایک مستقل وجودی شئے ہے تو ظاہر ہے کہ اس کی بھی کئی انواع ہو سکتی ہیں۔ الحیوۃ جنس تحتہ انواع وکذالک الموت

حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی موت کو عام اموات کی سی موت نہیں سمجھتے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ موت کی مختلف انواع کا عقیدہ رکھتے تھے۔ قرآن کریم میں حضورؐ کے میت ہونے کو اوروں کے میت ہونے سے جدا بیان کیا گیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بحیثیت میت ہونے کے ان میتون میں شامل نہیں کیا گیا۔ فرمایا:۔

انک میت وانھم میتون (پ ۲۳ الزمر) یہ نہیں کہا انک وانھم میتون۔ اس سے پتہ چلا آپ کی موت ایسی نہیں جو جمیع وجوہ سے اوروں کی موت جیسی ہو۔ حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں:۔

> حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی موت جمیع وجوہ ومعانی میں لازم نہیں کہ ایسی موت ہو جیسے کہ عام اموات کی ہوتی ہے بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی موت حس اور شعور کے ذہاب اور تعطل کی حد تک ہے۔[2]

امام الحرمین (۴۷۸ھ) لکھتے ہیں حضرت صدیق اکبرؓ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی موت کو عام اموات سے ایک جدی موت سمجھتے تھے۔ ہمارے نزدیک شہداء کی موت بھی عام اموات سے جدی موت ہے کہ باوجود موت کے حیات ان سے منتفی نہیں ہوتی۔ حضرت شیخ عبد الحق

---

[1] الصارم المنکی صد ۱۹۸ [2] مدارج النبوت جلد ۲ صد ۵۸۶

حضورؐ کے املاک حضورؐ کی ملک ہی باقی تھے. صدیق اکبرؓ حضور کی نیابت میں ان میں تصرف کرتے تھے. صدیق اکبرؓ جانتے تھے کہ حضورؐ کا ملک حضورؐ کے املاک پہ باقی ہے جیسا کہ امام الحرمین نے کہا ہے[1]

یہ صرف متاخرین کا ہی موقف نہیں امام بیہقی (۴۵۸ھ) نے بھی سنن کبریٰ جلد ۷، ص۶۲ پر یہ باب باندھا ہے:۔

باب کان مالہ بعد موتہ قائمًا علیٰ نفقتہ و ملکہ۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ بعض دنیوی احکام میں ابھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مستمر تھی اس کا حاصل اس کے سوا کیا سمجھا جا سکتا ہے کہ آپ کی موت روح مبارک کی مفارقت، کے باوجود محض ساترِ حیات ہو مزیلِ حیات نہ ہو۔

یہ حضرت صدیق اکبرؓ، امام بیہقیؒ، امام الحرمین اور حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کا تفرد نہیں، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بھی اسی موقف پہ ہیں. علامہ سمہودیؒ (۹۱۱ھ) شیخ ابو منصور البغدادیؒ کے حوالہ سے لکھتے ہیں:۔

قال الاستاذ ابو منصور البغدادی قال المتکلمون المحققون من اصحابنا ان نبینا صلی اللہ علیہ وسلم حیّ بعد وفاتہ[2]۔

ترجمہ. ہمارے محققین علماء کلام نے لکھا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنی مناسب وفات کے بعد زندہ ہیں اپنی امت کی طاعات سے خوش ہوتے ہیں.

حضورؐ کی وفات، جو آپ کے مناسب حال تھی کیسی تھی. ضروری نہیں کہ ہم اس کی کنہ پائیں ہاں اتنا مان لیں کہ وہ عام اموات سے کچھ مختلف تھی تو یہ کوئی ایسی بات نہیں جس میں کوئی تفرد ہو. پہلے بھی کئی حضرات کہہ چکے ہیں کہ آپ کو وہ وفات آئی جو آپ کے حسبِ حال تھی.

---

[1] مدارج النبوت جلد ۱ ص ۱۷۱ [2] وفاء الوفا جلد ۴ ص ۱۳۵۴ اعلاء السنن طبع قدیم جلد ۱۰ ص ۳۳۰

ہم انشاء اللہ آگے چل کر اس پر بحث کریں گے۔

یہاں ہمارا موضوع حیات شہداء ہے۔ اس کے بعد حیات انبیاء کی بحث آئے گی۔ جس کے ضمن میں بطور مقدمہ ہم انشاء اللہ العزیز کچھ موت پر بحث کریں گے۔ واللہ ولی التوفیق و بیدہ ازمۃ التحقیق۔ یہ اثبات حیات شہداء حیات انبیاء کے لیے بمنزلہ تمہید سمجھیے۔

حیاتِ شہداء قرآن کریم کی روشنی میں

ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات بل احیآء ولکن لا تشعرون۔

(پ ۲: البقرہ۔ ع ۱۹۔ آیت ۱۵۴)

ترجمہ۔ اور نہ کہو ان کو جو مارے گئے اللہ کی راہ میں کہ وہ مُردے ہیں۔ نہیں وہ تو زندے ہیں لیکن تمہیں سمجھ نہیں۔

حضرت شیخ الہندؒ اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں:۔

یعنی جس نے اللہ کے لیے جان دی وہ اس جہان میں جیتے ہیں مگر تم کو اُن کی زندگی کی خبر اور اس کی کیفیت معلوم نہیں اور یہ سب صبر کا نتیجہ ہے۔[1]

ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتا بل احیآء عند ربھم یرزقون ٥ فرحین بما اتاھم اللہ من فضلہ و یستبشرون بالذین لم یلحقوا بھم من خلفھم الا خوف علیھم ولا ھم یحزنون ٥ یستبشرون بنعمۃ من اللہ وفضل وان اللہ لا یضیع اجر المومنین ٥

(پ ۴: آل عمران۔ ع ۱۷۔ آیت ۱۶۹)

ترجمہ۔ اور تم ہرگز نہ سمجھو ان لوگوں کو جو مارے گئے اللہ کی راہ میں مردے۔ بلکہ وہ زندہ ہیں۔ اپنے رب کے پاس کھاتے پیتے۔ خوشی کرتے ہیں اس پر

---

[1] پچھلی آیت اس پر ختم ہوئی ان اللہ مع الصابرین یہ جملہ اس سے ربط کے لیے بیان فرمایا۔

جو اللہ نے ان کو دیا اپنے فضل سے۔ اور خوشی لیتے ہیں ان کی طرف سے جو ابھی تک ان کے پاس نہیں پہنچے ان کے پیچھے اس واسطے کہ نہ ڈر ہے اُن پہ اور نہ ان کو غم۔ وہ خوش ہوتے ہیں اللہ کی نعمت اور فضل سے اور اس بات سے کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کی مزدوری ضائع نہیں کرتا۔

صحابہؓ کے سامنے بدر اور اُحد کے نقشے تھے۔ شہیدوں کی یادیں تھیں۔ اللہ رب العزت نے فرمایا اپنی زبان پہ بھی یہ لفظ نہ لاؤ کہ وہ مُردے ہیں بلکہ تمہارے گمان میں بھی یہ بات نہ ہو کہ وہ مُردے ہیں ایسا خیال رکھنے کی بھی تمہیں اجازت نہیں۔

ایک اہم سوال اور اس کا جواب

جب وہ سامنے مرے اور قتل ہوئے اور پھر صحابہؓ نے انہیں دفن بھی کیا تو اب کیسے کہا۔ ماماتوا وہ مرے نہیں یا قتل نہیں ہوئے ـــــ کیا کل نفسٍ ذائقۃ الموت سے وہ مستثنیٰ ہیں؟

جواب

اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں کہا کہ تم یہ نہ کہنا۔ ماماتوا (وہ مرگ آشنا نہیں ہوئے) یا ماقتلوا (وہ قتل نہیں ہوئے) بلکہ فرمایا تم یہ نہ کہو کہ وہ مُردے ہیں یعنی اب وہ مُردے ہیں ایسا نہ کہنا نہ سمجھنا ـــــ بے شک وہ مرگ آشنا ہوئے انہوں نے موت کا پیالہ پیا۔ ان کا کفن دفن برحق۔ لیکن اب وہ مردہ نہیں اس جہان میں زندہ ہیں اور ان کی وہ زندگی حقیقی ہے اور زندگی کا پورا لطف انہیں حاصل ہے۔

ماماتوا جملہ فعلیہ ہے تمہیں یہ کہنے کا حکم نہیں دیا تم بے شک کہو قتلوا (وہ مارے گئے) تم کیا یہ تو اللہ تعالیٰ نے بھی کہہ دیا ہے ہاں ھم اموات۔ یہ جملہ اسمیہ ہے یہ کہنے سے تمہیں

روکا گیا. اب تم یہ نہ کہو وہ مردے ہیں۔ وہ مردے نہیں زندہ ہیں.

ان آیات میں بَل اضرابیہ ہے جو پہلی بات کا ابطال کرتا ہے. یہاں بَلْ قُتِلُوا کا ابطال نہیں کر رہا. قتلوا ایک حقیقت ہے بل کا اضراب هم اموات کہنے اور سمجھنے کے متعلق ہے. سو ان کے زندہ ہونے کے عقیدہ میں ان واقعات سے ہرگز کوئی تعارض اور ٹکراؤ نہیں۔ ان پر موت کا آنا بھی برحق اور اگلے جہان میں حیاتِ جسمانی پانا بھی برحق اور ان آیات میں انہی اجسام کو زندہ کہا گیا ہے جو قتلوا کا مورد بنے تھے. اختلاف زمان سے دوسری بات کا ماننا پہلی سے ٹکراؤ اور تعارض نہیں. بل کا اضراب هم اموات پر ہے اور امر واقع اور عقیدہ صادقہ یہ ہے کہ هم احیاء (وہ زندے ہیں).

بل کے بعد جو جملہ ہو وہ پہلے جملے کا ابطال کرتا ہے قد افلح من تزکّٰی میں جس فلاح کی خبر دی گئی ہے تم اسے پا نہ سکو گے کیونکہ تم دنیا کی زندگی کو آخرت کی زندگی پر ترجیح دے رہے ہو۔ یہاں بل اضرابیہ کے ساتھ بل تؤثرون الحیٰوة الدنیا فرمایا. اس نے تمہارے فائز فلاح ہونے کا ابطال کر دیا.

مشرکین سمجھتے تھے کہ بدر اور احد کے شہید عدم میں چلے گئے. اللہ تعالیٰ نے ان کی زندگی کی خبر دی یہ قصرِ قلب ہے مشرکین انہیں موت پر ختم سمجھتے تھے. اللہ تعالیٰ نے انہیں حیات پر بند کر دیا. وہ حقیقی طور پر زندہ ہیں مُردہ کہنا تو درکنار تمہارے گمان میں بھی یہ بات نہ آئے کہ وہ مُردے ہیں۔

یہاں زندہ کن کو کہا گیا

یہاں زندہ اجسام انہی کو کہا گیا ہے جن پر مشرکین کا فعل قتل وارد ہوا تھا. یہاں اجسام ہی قتل کا مورد تھے اور انہیں اجسام کو وہاں زندہ کیا گیا. یہ سمجھنے میں اگر دقت ہو تو لا تشعرون (کہ تم شعور نہیں رکھتے) کہہ کر اس تذبذب کو رفع کر دیا گیا.

جس طرح قرآن کریم میں حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں فرمایا۔ ما قتلوہ یقینا بل رفعہ اللہ الیہ۔ انہوں نے مسیح کو پورے وثوق سے قتل نہیں کیا بلکہ جس بدن کے وہ موردِ قتل ہونے کے مدعی ہوئے ہیں اس بدن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف اُٹھا لیا ہے رفع اسی جسم کا ہوا جس پہ وہ فعل قتل وارد کرنے کے مدعی تھے۔

اسی طرح جن شہدائے بدر و احد پہ وہ عمل قتل سے ان کے اموات ہونے کے مدعی تھے۔ انہی شہداء کے بارے میں اس کا ابطال کیا گیا کہ وہ مُردے نہیں زندے ہیں اور ان کی حیات کا اثبات کیا گیا۔ اور شک تک کرنے سے منع کر دیا گیا۔

قتل کون ہوا؟ جسم —— زخمی کون ہوا؟ جسم —— تلواریں اور نیزے کن پہ چلے؟ جسموں پہ —— نہ روح زخمی ہوئی۔ نہ کسی جسدِ مثالی پہ تلوار چلی۔ سو یہ بات کہ وہ زندہ ہیں یہ انہی اجسام کی خبر ہے جو میدانِ جہاد میں تڑپے اور پھڑکے اور جنہیں صحابہؓ نے دفن کیا۔ شہیدوں کی روح زندہ ہے۔ یہ بالکل بے محل بات ہے وہ تو مری ہی نہ تھی نہ جسدِ مثالی مرا تھا۔ سو فعلِ قتل جس سے متعلق ہوا حالتِ حیات بھی اسی کی ہوئی۔ ان اجسام پہ بے شک وعدہَ موت پورا ہوا۔ لیکن اب یہ زندہ ہیں اور زندگی کے تمام لوازم انہیں اُس جہان میں میسر ہیں۔ بل احیاءٌ نے وہم اموات کا کلی طور پر ابطال کر دیا ہے۔

اگر صرف روح کی زندگی مراد ہوتی تو لا تشعرون کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ روح زندہ ہے اجسام مُردے ہیں۔ یہ بات تو ہر کسی کو سمجھ آ رہی تھی۔ اس بات میں کس کو استبعاد تھا جو لا تشعرون کہہ کر ختم کیا گیا۔ یہ شہداء کی جسمانی حیات ہے جو ہمارے حواس سے بالا تھی۔ اس نارسائی سے جو بے چینی تھی اسے لا تشعرون سے دُور کیا گیا۔

اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان کی حیات کے کچھ لوازم بھی ذکر فرمائے۔

فرمایا یرزقون انہیں رزق بھی دیا جاتا ہے۔ صرف روح کو کھانے پینے کی کیا ضرورت ہے؟ نہ جسدِ مثالی رزق کا محتاج ہے۔ کھانا پینا تو اسی جسم کی صفات میں سے ہے

جب یہ صفت ذکر کی گئی تو تاکید ہو گئی کہ شہداء کی حیات جسمانی ہے صرف روحانی نہیں اور عنصری بدن سے ہے کسی اور جسد سے نہیں۔ جسد مثالی کھانے پینے سے بے نیاز ہوتا ہے۔ اس کی کچھ بحث آگے آئے گی۔

فرحین بما اتاھم اللہ من فضلہ۔ خوشی اور غم کی لہریں بدن میں اٹھتی ہیں۔ یہ احساسات روحوں میں نہیں جاگتے۔ فرح زندوں کی صفات میں سے ہے مُردوں کے حالات میں سے نہیں۔

یستبشرون بالذین لم یلحقوا بھم۔ اس بات کی خوشی کہ ان کے بھائی بھی انہیں آملیں گے ان کے چمڑوں میں محسوس ہو رہی ہے۔ وہ یہ خوشی اپنے بشرہ میں (چہرے میں) محسوس کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کھال اور چمڑے انہی ابدان کے ہیں، ابدانِ مثالیہ کے نہیں دوزخ کی آگ کھالوں کو جھلس دے گی۔ لواحة للبشر (پ ۲۹ المدثر) بدن عنصری میں خوشی کی لہریں اٹھتی ہیں تو ان چہروں کو مستبشرہ کہا جاتا ہے۔

وجوہ یومئذ مسفرۃ ضاحکۃ مستبشرہ۔ (پ ۳۰: عبس۔ آیت ۳۹)

سو اس میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کہ یستبشرون کا فاعل ابدان ہیں۔ الذین لم یلحقوا بھم سے بھی وہ پورے انسان ہیں جو انہیں آملیں گے۔ یہاں ضمیر ھم کا مرجع کون ہیں؟ وہ ابدان جو ابھی ان سے نہیں ملے۔ ورنہ روح کے لیے تو قرب و بعد زمانی کوئی چیز نہیں۔

سوال

اللہ کی راہ میں شہید ہونے والے بدنوں کو تو یہ مرتبہ ملا کہ انہیں عالم برزخ میں گو یہاں کی آنکھیں اس حیات حسی کا مشاہدہ نہ کر سکیں حسی حیات دی گئی اور یہی ابدان عالم برزخ میں فائز الحیات ہوئے لیکن ان کی روحوں کو بھی کیا کوئی امتیازی شان ملتی ہے؟

الجواب

اس عالم میں روح جس طرح بدن میں قید ہے. بدن سے نکلنے کے بعد اس کا ادراک اور دائرہ سیر بہت بڑھ جاتا ہے. اس کا قبر کے سوال وجواب کے وقت بدن میں اعادہ بھی ہو تو کاملین کے لیے یہ اعادۂ اشراف ہے اعادۂ قید نہیں وہ روحیں عالم بالا سے ایک تعلق رکھتے ہوئے بھی ابدان کی طرف لوٹ سکتی ہیں اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ موت کے بعد روح کا ادراک بڑھ جاتا ہے. حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ لکھتے ہیں:۔

وارواح الکمل اذا فارقت اجسادها صارت کالموج المکفوف لا یهزها ارادة متجددة وداعیه سانحة ولکن النفوس اللتی هی دونها تلتصق بالهمة نوراً وهیئة مناسبة للارواح[1]

ترجمہ. کامل لوگوں کی ارواح جب اپنے اجساد سے جدا ہوتی ہیں وہ اسی موج کی طرح ہو جاتی ہیں جو رکی ہو. انہیں کوئی نیا ارادہ اور پیش آنے والا داعیہ اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتا. لیکن نچلے طبقے والے نفوس اپنی ہمت سے ان سے ملصق ہو کر نور اور ایک ہئیت مناسب پیدا کر لیتے ہیں.

یعنی وہ روح ایک موج مکفوف کی طرح ہے جس سے نچلے والے اثر قبول کرتے ہیں.

یہاں قبروں کے ابدان بھی اگر کاملین کے ہوں تو وہ ارواحِ عالیہ سے اثر قبول کرتے ہیں اور ان کا اس جگہ سے خاص ربط ہوتا ہے. جہاں وہ مدفون ہوں. حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اس بحث کے آخر میں لکھتے ہیں:۔

وهی المکنی عنه بقوله علیه السلام ما من احد یسلم علی الارد الله علی روحی فارد علیه السلام وقد شاهدت ذلك ما لا احصی فی مجاورتی المدینه سنة الف ومائة واربع واربعین[2]

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ باب الاذکار ص۷۷ [2] ایضاً ج ۲ ص۷۷

ترجمہ۔ اور اسی کی طرف کنایہ ہے حضورؐ کے اس ارشاد میں کہ جب کوئی مسلم مجھ پر سلام بھیجتا ہے تو اللہ تعالیٰ میری روح کو اُدھر لوٹا چکے ہوتے ہیں سو میں بھی اس پر سلام لوٹاتا ہوں ۱۱۴۴ھ میں جب میں مدینہ ٹھہرا ہوا تھا۔ تو میں نے بارہا اس کا مشاہدہ کیا۔

اب آپ ہی بتائیں حضرت شاہ صاحبؒ کا مسلک قبر مبارک کے جسدِ اطہر کے بارے میں کیا ہے؟ آپ جب روضہ نبویہ پر حاضر ہوتے رہے اور سلام عرض کرتے رہے تو آپ نے اپنا مشاہدہ کیا بتایا ہے؟ —— کیا روحِ انور کا تعلق قبر مبارک میں رکھے جسدِ اطہر سے ہے یا نہیں؟ آپ حضرت شاہ ولی اللہؒ کی اس شہادت کو پڑھیں اور بار بار پڑھیں۔

جسدِ اطہر کی شان عالمِ برزخ میں

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے نزدیک عالم برزخ میں جسدِ اطہر کی شان کیا ہے؟ آپ کے نزدیک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سفرِ معراج عالم برزخ کی ہی ایک سیر تھی۔ اس رات آپ کے جسدِ اطہر پر روح کے خواص جاری کر دیئے گئے اور حقائق و معانی مختلف اشکال و صور میں آپ کو مشاہدہ کرائے گئے۔ حدیث میں اس کی پوری تفاصیل ملتی ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس سیرِ برزخی میں اپنے اصل جسدِ اطہر کے ساتھ تھے اور یہ خواب نہیں بیداری کا واقعہ تھا۔ جسدِ اطہر اس برزخی سیر میں روح کے حکم میں آچکا تھا اور جس طرح روح پرواز کرتی ہے آپ آن کی آن میں پہلے آسمان پر تھے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ لکھتے ہیں:۔

کل ذٰلک بجسدہ صلی اللہ علیہ وسلم فی الیقظۃ ولکن ذلک فی موطن ھو برزخ بین المثال والشہادۃ جامع لاحکامھما فظہر علی الجسد احکام الروح[1]

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ص۲۰۶ ج۲

ترجمہ: آپ کا یہ سارا سفر اپنے جسد مبارک کے ساتھ تھا اور بیداری میں تھا لیکن یہ ایسے موطن میں تھا جو عالم شہادت اور عالم مثال کے مابین ایک برزخی درجہ ہے اور یہ دونوں کے احکام کو جامع ہے اس وقت جسد پہ روح کے احکام چل رہے تھے۔

آپ کی سیر معراج بتلاتی ہے کہ مکہ مکرمہ میں ہی آپ کا یہ روح اطہر روح کے الطف مقام پر آچکا تھا اور حضرت شاہ صاحبؒ کے ہاں آپ اپنی وفات سے پہلے بھی ایک برزخی سیر سے گزارے گئے تھے۔ پھر جب آپ مدینہ منورہ آگئے اور اس پر اتمام نعمت کی دولت پا گئے (ماکان موعوداً فی قولہ تعالیٰ ویتم نعمتہ علیک) تو اب یہ جسدِ اطہر کس شان اور لطافت پہ ہوگا اسے عالمِ برزخ کے سیاحوں کے سوا اور کون سمجھ سکتا ہے۔ ہاں ہم یہ ماننے کے لیے قطعاً تیار نہیں کہ وہ جسدِ اطہر جو مکہ مکرمہ میں پوری لطافت سے برزخی سیر کرچکا تھا وہ اب انک میت و انہم میتون کے وعدہ کو پورا کرکے اس مقام پہ آگیا تھا کہ اب تاقیامت اس روحِ مقدسہ سے بیگانہ رہے جس کے تعلق سے اس پہ سفرِ معراج میں خود روح کے احکام طاری تھے۔ وہ جسدِ اطہر جسے اللہ تعالیٰ نے آپ کی مکی زندگی میں ہی جلاء تام بخش دی تھی وہ اب تاقیامت قبر میں بے جان و بے حس پڑا ہے۔ استغفر اللہ العظیم —— کیا یہ عقیدہ انحطاط آیت وللآخرۃ خیر لک من الاولیٰ سے نصاً متصادم نہیں۔

حضرت شاہ صاحبؒ تو اپنے ۱۱۴۴ھ کے مشاہدات میں روضۂ انور کی حاضری میں یہ جلوے دیکھ آئے ہیں اب انہیں پڑھ کر بھی اگر کسی کو صحتِ عقیدہ کی دولت نہ ملے تو ہم اس کے سوا کیا کہہ سکتے ہیں۔ ؎

تہی دستانِ قسمت را چہ سود از رہبرِ کامل
کہ خضر از آبِ حیواں تشنہ مے آرد سکندر را

حق یہ ہے کہ کاملین کی روح کا ادراک وفات کے بعد اور وسیع ہوجاتا ہے۔ اس دنیا کی زندگی میں حضورؐ کی رویتِ بصری اور قوتِ سمعی صحابہؓ کی سی نہ تھی۔ آپ روح الامین کو آتا

دیکھتے تھے اور آپ کے قریب بیٹھے دوست اس کیفیت کے آثار تو دیکھتے لیکن فرشتوں کو نہ دیکھتے اور نہ سنتے آپ کی نگاہ کبھی برزخ کے پردوں کو چیر کر دور کے نقشے دیکھ لیتی اور قبروں کے پاس سے گزرتے آپ کبھی برزخی آوازیں بھی سُن لیتے. جب دنیا میں یہ حال تھا تو اس وادی کے سیاحوں کے اس بیان کو بھی مان لیجئے کہ کاملین کی روح کا ادراک وفات کے بعد اور بڑھ جاتا ہے. اور وہ اپنے اجسامِ مدفونہ سے بھی کلیتہً بے توجہ نہیں ہوتیں. روحی کمالات کا فیض اُن پر بھی اُترتا ہے. مولانا رومؒ لکھتے ہیں:-

باش تا مرغ از قفس آید برون
تا بہ بینی ہفت چرخ او را زبون[1]

ترجمہ. انتظار کر یہاں تک کہ روح اس بدن سے پرواز کرے پھر تو دیکھے کہ کس طرح سات آسمان اس کے آگے زیر ہیں.

سو اس میں شک نہیں کہ وفات کے بعد روح کا ادراک اور وسیع ہو جاتا ہے. اس کی برکتیں اگر سات آسمانوں تک جا سکتی ہیں تو کیا زمین میں رکھے بدن کو ان میں سے کوئی حصہ نہیں مل سکتا. جب اس روح کے آگے سات آسمان زیر ہیں تو روح الارواح کا اشراف و اشراق صرف اس جسدِ اطہر کے لیے ہی ممنوع ہے جو زمین میں دفن ہے؟ وہاں فرشتے بھی حاضری دیتے ہیں اور سلام پیش کرنے والے زائرین کا تانتا بھی ہر آن اور ہر لحہ بندھا ہے؟ یا اس بدن اطہر میں وہ انجذاب نہیں کہ وہ اس روح عالی سے فیضیاب ہو.

آیئے برزخی مشاہدہ کے ایک اور سیاح سے اس کی تصدیق حاصل کیجئے. شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ (۱۳۷۷ھ) لکھتے ہیں:-

یہ برزخی حیات بعض پہلوؤں سے اس دنیوی حیات سے قوی تر بھی ہے.[2]
یہ اس لیے کہ دنیوی حیات کے بہت سے حجابات اس برزخی حیات میں اٹھ جاتے ہیں.

---

[1] مثنوی دفتر ۵ صہ ۴۲۵ [2] مکتوبات شیخ الاسلام جلد صہ

آپ کی حیات نہ صرف روحانی ہے جو کہ عام شہداء کو حاصل ہے بلکہ جسمانی بھی

اور از قبیل حیات دنیوی بلکہ بہت وجوہ سے اس سے قوی تر۔[1]

ہم یہ کہہ رہے تھے کہ شہداء بعد قتل ایک ایسی زندگی پالیتے ہیں جسے وہ حسًا محسوس کرتے ہیں اور ان کی وہ زندگی جسمانی ہوتی ہے اس میں ان کی روح کا ادراک اور بڑھ جاتا ہے کاملین کی ارواح میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے برزخی ادراک کا ذکر ضمنًا آگیا ہے۔ اصل موضوع ارواح شہداء کی امتیازی شان ہے۔ اب اس کا ایک پہلو ملاحظہ کیجئے۔

(ب) پھر روح کو قوت تجسد بھی ملتی ہے۔ روح خود ایک جسم کی شکل اختیار کرتی ہے وہ کسی دوسرے جسد میں بطریق حلول نہیں اترتی یہ تناسخ ہے (جس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں) یہاں روح خود ایک جسم کی صورت میں ابھرتی ہے اور یا پرندے کے بدن میں اس تعلق سے آتی ہے جو سوار کو سواری سے ہوتا ہے اور اس میں بھی تناسخ کا کوئی شائبہ نہیں۔ شہداء کی روحیں پرندوں کی سی صورت اختیار کرتی ہیں اور سیر بھی کرتی ہیں۔ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ (۱۱۸ھ) کہتے ہیں:۔

بلغنا ان ارواح الشہداء فی صور طیر بیض تاکل من ثمار الجنۃ۔[2]

ترجمہ۔ ہم کو روایت پہنچی ہے کہ شہداء کی روحیں سفید پرندوں کی شکل اختیار کرتی ہیں اور جنت کے پھل کھاتی ہیں۔

پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا سبز پرندوں کی صورت میں آنا بھی منقول ہے۔

ان ارواح الشہداء فی طیر خضر تعلق من ثمر الجنۃ۔[3]

ترجمہ۔ بے شک شہیدوں کی روحیں سبز رنگ پرندوں میں اترتی ہیں اور جنت کے پھل کھاتی ہیں۔

سنن نسائی میں حضرت کعب بن مالکؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:۔

---

[1] مکتوبات شیخ الاسلام جلد ا ص ۱۳۰ [2] المصنف لعبد الرزاق جلد ۵ ص ۲۶۳ [3] جامع ترمذی جلد ا ص ۱۹۷

ان نسمۃ المومن طائر فی شجرۃ الجنۃ حتی یبعثہ اللہ الی جسدہ یوم القیمۃ۔[1]

ترجمہ۔ مومن کی روح باغ جنت میں ایک پرندے کی صورت میں رہتی ہے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اسے اس کے جسد میں قیامت کے دن (کاملۃً) لوٹا دے۔

روح الامین بھی دحیہ کلبی کی صورت میں متجسد ہوئے۔ پھر اگر کاملین کی روحیں بھی کسی اور صورت میں تجسد کریں تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ لکھتے ہیں:-

وان شئت قلت بتمثل الروح نفسہا صورۃ لان الارواح فی غایۃ اللطافۃ وفیہا قوت التجسد کما یشعر بہ ظہور الروح الامین علیہ السلام بصورۃ وحیہ الکلبی۔[2]

ترجمہ۔ آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ روح خود پرندے کی صورت میں متمثل ہوگئی کیونکہ ارواح میں انتہائی لطافت ہوتی ہے اور ان میں قوت تجسد بھی ہے حضرت روح الامین جبریل علیہ السلام کا دحیہ کلبی کی صورت میں متمثل ہونا اس کا پتہ دیتا ہے۔

روح کے اس کمال لطافت اور تجسدِ صورت کے باوجود اس کا تعلق کسی بدن مثالی سے ہو یا قبر کے بدن عنصری سے ہو یا دونوں سے ہو تو روح کے اس اشراف کے لیے کوئی دلیلِ منع شریعت میں وارد ہے؟ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:-

لامانع من تعلقہا ببدن برزخی مغائر لہذا البدن الکثیف۔[3]

ترجمہ۔ روح کا تعلق کسی اور برزخی بدن سے بھی ہو جو اس بدن کثیف کے علاوہ ہو شریعت میں کوئی دلیل اس سے مانع نہیں ہے۔

جب یہاں کوئی مانع نہیں اور علیین میں ہونے کے باوجود روح کا تعلق کسی برزخی

---

[1] سنن نسائی جلد ۱ ص ۲۹۲ [2] حجۃ اللہ البالغہ جلد ۲ ص ۱۷۱ [3] ایضاً

بدن سے ہو سکتا ہے اور ارواح کی یہ وسعت وہاں تک اشارۃً سمجھی جا سکتی ہے تو قبر کے بدنِ عنصری سے اس کے تعلق میں کیا امر مانع ہے جس کا مشاہدہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ۱۱۷۶ھ کو روضۂ نبوی پہ بار بار ہوتا رہا ہے اور تاریخ کے مختلف موڑوں پر اگر کہیں شہداء کے اجسام کھلے تو ان میں زندگی کے اثرات دیکھے گئے۔

سو یاد رکھیئے روح کاملین کے اس درجہ لطافت اور تجسدِ صورت کے باوجود ان کے تعلق بالبدن العنصری سے کوئی شرعی مانع موجود نہیں ہے۔ ارواح شہداء کو جو بدنِ عنصری میں آنے کی اجازت نہ دی گئی تو وہ اس عالم (عالمِ دنیا) میں اپنے ابدانِ عنصریہ میں لوٹنے کی گذارش تھی۔ تاکہ ایک دفعہ پھر وہ میدانِ جہاد میں آئیں اور اللہ کی راہ میں پھر شہید ہوں۔ ان کی تمنا عالمِ برزخ میں اپنے ابدان میں آنے کی نہ تھی۔ عالمِ برزخ میں تو ان کے وہ بدن از روئے نصِ قرآن زندہ ہیں اور وہ جہاں دار العمل نہیں دار الجزا ہے۔ دار العمل صرف یہ دنیا ہے جس کے اعمال اگلے جہان میں پھل لاتے ہیں۔

عالمِ دنیا میں روحوں کے دوبارہ نہ لوٹنے کو عالمِ برزخ میں روحوں کے اپنے بدنوں میں نہ لوٹنے کی دلیل بنانا اگر علمی خیانت نہیں تو اور کیا ہے۔

اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ شہداء خود تمنا ہی عالمِ دنیا میں لوٹنے کی کریں گے۔ حدیث میں یہاں صریح طور پہ دنیا کا لفظ موجود ہے اور ان کی جنت میں بھی جب کہ وہ وہاں ابدانِ عنصریہ سے پہنچے ہوئے ہوں گے یہی تمنا ہوگی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔

ما احد یدخل الجنۃ یحب ان یرجع الی الدنیا ولہ ما علی الارض من شیٔ الا الشہید یتمنّی ان یرجع الی الدنیا فیقتل عشر مرّات[1]

ترجمہ: کوئی شخص جو جنت میں جائے اس بات کا خواہاں نہیں ہوتا کہ اسے دنیا میں پھر بھیجا جائے دنیا کی ہر چیز کا مالک بنا کر، مگر شہید وہ تمنا کرتا ہے کہ ایک دفعہ

---

[1] صحیح بخاری جلد ۱ صفحہ ۳۹۵

پھر وہ دنیا کو جائے اور اسی طرح دس دفعہ وہ اللہ کی راہ میں مارا جائے۔

ارواح شہداء کے سبز پرندوں کی صورت میں آنے یا سفید پرندوں کی صورت میں آنے کی روایات مختلف ہیں، پھر یہ اختلاف بھی کہ ارواح خود ان صورتوں میں متجسد ہوتی ہیں یا حواصل طیور میں اس طرح اُترتی ہیں جیسے سوار سواری لے لے۔ الفاظ میں بہت اختلاف ہے۔ غالباً اسی اضطراب کے باعث امام بخاری باوجود آیت ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللّٰہ امواتا کا باب باندھنے کے آپ اس میں حدیث طیر خضر نہیں لائے۔ امام مسلمؒ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت پیش کی ہے۔ امام نووی نے اسے حل کرنے کی بہت کوشش کی ہے مگر بات وہیں کی وہیں رہتی ہے:-

قال القاضی قال بعض المتکلمین علی ھذا الاشبہ صحۃ قول من قال طیر او صورۃ طیر و اکثر ماجاءت بہ الروایۃ .....
و استبعد بعضھم ھذا ولم ینکرہ اخرون ولیس مافیہ ینکر ولا فرق بین الامرین بل روایۃ طیر او جوف طیر اصح معنیٰ[1]

ترجمہ: قاضی نے بعض متکلمین سے نقل کیا ہے کہ زیادہ صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ روح خود پرندوں کی شکل میں آتے اور زیادہ روایات میں یہی بات ملتی ہے اور بعض لوگوں نے اسے مستبعد جانا ہے اور دوسروں نے اس کا انکار نہیں کیا اور اس میں کوئی ایسی بات نہیں جس پر شریعت میں انکار وارد ہو۔ اور دونوں اقوال میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہے۔ اور پرندے کی صورت یا پرندے کے پیٹ میں جانے کی روایت زیادہ صحیح ہے

یہ روایت حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت انس بن مالکؓ اور حضرت ابوسعید خدریؓ سے بھی مروی ہے اور ان میں سے کوئی بھی اُسے آیت ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللّٰہ کی تفسیر قرار نہیں دیتا۔ بیشتر روایات میں اس آیت کا ذکر تک نہیں ملتا۔ پھر ان روایات میں

---

[1] نووی شرح صحیح مسلم جلد ۲ ص ۱۳۶

کہیں یہ بات بھی نہیں ملتی کہ آخرت میں ارواحِ شہداء کو ان پرندوں سے کیسے رہائی ملے گی۔ جب وہ اپنے اصلی اجساد کے ساتھ انسانی شکلوں میں جنت میں جائیں گے۔ حشر کے دن وہ کس وقت اپنی پرندوں کی قبا بدلیں گے۔ اس کا کسی ضعیف حدیث میں بھی اشارہ نہیں ملتا۔

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی روایت سے صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ شہیدوں کی روحیں ارواحِ مجردہ کی صورت میں نہیں وہ پرندوں کی صورت میں متجسد ہیں۔ لیکن ان ارواحِ متجسدہ کا کسی اور برزخی بدن سے یا قبروں کے عنصری بدن سے کوئی تعلق ہے یا نہیں۔ اس سے یہ روایت بالکل خاموش ہے۔ سوا سے حیات شہداء کی تفسیر قرار دینا یہ سمجھ میں نہیں آتا اور نہ اس آیت ولکن لا تشعرون کی تصریح اس کی تائید کرتی ہے۔

لا مانع من تعلقها ببدن برزخی مغائر لهذا البدن الکثیف۔[1]

ترجمہ۔ روح کا تعلق کسی برزخی بدن سے بھی ہو جو اس عنصری بدن کے علاوہ ہو اس سے شرعاً کوئی چیز مانع نہیں۔

مغائر لهذا البدن الکثیف بدن برزخی کی تشریح ہے۔ اس میں اس بدن عنصری سے تعلق کی نفی کا دعوے نہیں ہے۔ جو علماء اسے بدن عنصری سے روح کا تعلق نہ ہونے کی دلیل بنا رہے ہیں اور کہتے ہیں۔

ان میں تعلق روح بالجسم العنصری کا نام تک بھی نہیں بلکہ اس کی نفی صراحۃً مذکور ہے۔[2]

وہ عبارت کو سمجھ نہیں پائے مغائر لهذا البدن بدن برزخی کی صفت ہے اس میں بدنِ عنصری سے تعلق کی نفی نہیں جیسا کہ سمجھ لیا گیا ہے۔ فواحسرتا علی ضیعة العلم۔

ارواح کا پرندوں کی شکل پانا کیا یہ اُن کی زندگی ہے

قرآن کریم نے جس پُرعظمت پیرایہ اور پُرشکوہ الفاظ میں شہداء کا بعد قتل زندہ ہونا

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ جلد ۲ صہ ۲۱ [2] مسالک العلماء صہ ۳۷

بیان کیا ہے اور اس حیات کو اتنا لطیف اور مخفی بتایا ہے کہ تم اس کو پا نہیں سکتے۔ اس تک پہنچ نہیں سکتے (ولکن لا تشعرون) اس کی یہ شرح اتنی آسان کہ انہیں پرندوں کی شکلیں دے دی جاتی ہیں اور وہ سیر کرتے پھرتے ہیں بس یہی ان کی زندگی ہے۔ یہ بات غور طلب ہے۔

کیا حدیث میں جہنمیوں کا سیاہ پرندوں کی شکل جانا مذکور نہیں کیا وہ بھی زندہ ہیں؟ اگر ایسا ہی ہے تو بتلایئے ان دو زندگیوں میں باعتبار زندگی کیا فرق ہے؟ باعتبار راحت اور عذاب بیشک فرق ہے مگر باعتبار زندگی کیا فرق ہے۔ وہ جنت میں سیر کرتے ہیں۔ یہ جہنم میں تڑپتے پھرتے ہیں مگر باعتبار زندہ ہونے کے ان میں کیا فرق ہے؟ ہمارے پاس اس کا مثبت جواب ہونا چاہیئے۔ اگر نہیں تو ہمیں ولکن لا تشعرون کے دبیز پردے کے پیچھے رہنا چاہیئے۔

یہ سمجھ لینا کہ صحابہ کرامؓ لا تشعرون پر قانع نہ رہے اور وہ اسے شعور میں لانے کی برابر کوشش کرتے رہے اور ان کے بارے میں پوچھتے رہے یہ بات غور طلب ہے۔ پھر حضورؐ نے بھی جواب میں آیت ولکن لا تشعرون نہ پڑھی۔ جواب میں شہیدوں کا پرندوں کی شکل میں آنا بیان کر دیا اور بس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا مختلف مواقع پر قرآن کی آیات سے استدلال نہیں فرمایا۔ پھر یہاں آپ نے آیت ولکن لا تشعرون کیوں نہ پڑھ دی۔

شہداء سبز پرندوں کے رُوپ میں

ارواحِ شہداء کو سبز پرندوں میں اتار دیا جاتا ہے اور ارواحِ کفار کو سیاہ پرندوں کے قالب میں ـــــ فرق ہے تو یہ کہ:۔

(۱) سبز پرندے جنت میں ہیں اور سیاہ پرندے دوزخ میں ہیں۔

(۲) سبز پرندے سیر میں چلتے پھرتے ہیں اور سیاہ تڑپتے پھرتے ہیں۔

(۳) سبز پرندوں کی روایات اونچی کتابوں میں اور سیاہ کی نچلی کتابوں میں۔

یہ سب فرق سہی مگر جس بات کو نظریں تلاش کرتی ہیں وہ ان کی حیات ہے۔ کیا زندگی

زندگی میں فرق ہے یا زندگی ایک ہی نوع کی ہے. جنت اور جہنم کی تقسیم تو ویسے ہی مومنین اور کفار میں قائم ہے۔ اس میں شہداء کی کوئی تخصیص نہیں. پھر خوشی سے چلنا پھرنا اور تڑپنا یہ نعیم و عذاب کے کوائف ہیں. زندگی دونوں میں برابر ہے —— ہاں وہ حیات جو صحابہؓ کے شعور سے بھی بالا ہے وہ کیا ہے اور حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی حدیث میں اس کا بیان کہاں ہے؟ آپ نے تو اسے حیاتِ شہداء کی کیفیت اور لا تشعرون کی تفسیر قرار نہیں دیا اور نہ ان سے یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ امید کی جا سکتی ہے کہ آپ ارشادِ الٰہی ولکن لا تشعرون کے خلاف اسے شعور میں لانے کی مثالیں بیان فرمائیں.

کفار سیاہ پرندوں کے رُوپ میں

آیت النار یعرضون علیہا (مومن) کی تفسیر میں حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں:۔

آلِ فرعون کی روحیں سیاہ پرندوں کی شکل میں ہر روز صبح و شام دو مرتبہ جہنم کے سامنے لائی جاتی ہیں اور جہنم کو دکھا کر اُن سے کہا جاتا ہے کہ تمہارا ٹھکانہ یہ ہے[1]

حافظ ابن کثیرؒ (۷۷۴ھ) لکھتے ہیں:۔

فاما حصول ذٰلك للجسد فی البرزخ وتالمه بسببه فلم يدل عليه الا السنة فی الاحادیث المرضية.[2]

یعنی۔ قرآن و حدیث کو ملا کر مسئلہ یہ ہوا کہ عذاب و ثواب قبر روح اور جسم دونوں کو ہوتا ہے اور یہی حق ہے...... اور آلِ فرعون کی روحیں سیاہ رنگ پرندوں کے قالب میں ہیں۔ ابن کثیرؒ یہ بات پہلے ص۳۴ پر کہہ آئے ہیں.

ایک شخص نے امام اوزاعیؒ (۱۵۷ھ) سے کہا:۔

---

[1] تفسیر معارف القرآن جلد ۷، ص۶۰۳ [2] تفسیر ابن کثیر جلد ۴ ص۸۱

ہم نے سمندر میں سے کچھ پرندے نکلتے دیکھے ہیں جن کے پروں پر سفیدی تھی اور ان کی تعداد اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا. وہ جھنڈ کے جھنڈ اس سمندر (بحر قلزم) سے نکلتے ہیں اور بحر غربی کے کنارے جاتے ہیں. پھر جب تیسرے پہر کا وقت ہوتا ہے تو ویسے ہی سیاہ پرندے آکر سمندر میں گھس جاتے ہیں.

اس پر امام اوزاعیؒ (م ۱۵۷ھ) نے فرمایا:۔

ان پرندوں کے حواصل میں آل فرعون کی روحیں ہیں جو صبح و شام جہنم پر پیش کی جاتی ہیں..... یہ آل فرعون چھ لاکھ جنگی سوار تھے۔[1]

علامہ نسفیؒ (۵۰۸ھ) بحر الکلام میں لکھتے ہیں:۔

واما ارواح الکفار فی جوف طیر سود تحت الارض السابعة۔[2]

ترجمہ۔ اور کافروں کی روحیں ساتویں زمین کے نیچے سیاہ پرندوں کے پیٹ میں ہوتی ہیں.

سو اگر پرندوں کے قالب میں آنا ہی زندگی ہے تو پھر شہداء کی کیا تخصیص رہی پرندوں کے قالب تو جہنمیوں کو بھی ملتے ہیں اور سبز اور سیاہ پرندوں کی دونوں قسم کی روایات حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے ہی مروی ہیں. سو یہ صرف ارواح کے تجسد کا بیان ہے ان کی حیات کی تفصیل نہیں اور نہ یہ روایات آیت لا تشعرون کو منسوخ کرتی ہیں کہ اب ہمیں ان کی حیات کا شعور حاصل ہو گیا ہے اور بات سمجھ میں آگئی ہے۔

غذا روح کی ضرورت ہے یا بدن کی

کھانا پینا یہ بدن کی ضرورت ہے روح کی نہیں. روح کی غذا تسبیح و تقدیس اور اللہ کی یاد کے سوا کچھ نہیں. جنت میں شہداء کی روحیں اگر سبز رنگ کے پرندوں کی صورت میں متجسد

---

[1] مواہب الرحمٰن جلد ۲، پ ۲۴ ص ۱۵۹ [2] نقلاً من شرح الصدور ص ۱۰۴

ہو کر سیر کرتی ہیں۔ تو ظاہر ہے انہیں کمانے کی حاجت نہیں ہوتی۔ غذا ہمیشہ سے بدن کی طلب رہی ہے نہ کہ روح کی۔

قرآن کریم نے شہداء کو جو زندہ کہا تو اس کی دلیل میں یرزقون بھی فرمایا معلوم ہوا یہ ابدان کی زندگی ہے صرف روح کی نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے الفاظ یرزقون ان کی دلیل حیات کے طور پہ بیان فرمائے ہیں۔

علامہ ابو عبداللہ القرطبی (۶۷۱ھ) فرماتے ہیں:

بل احیاء دلیل علی حیاتھم وانھم یرزقون ولا یرزق الا حی۔[1]

ترجمہ۔ بل احیاء (وہ زندہ ہیں) ان کی حیات کی دلیل ہے اور یہ کہ انہیں رزق ملتا ہے اور رزق تو زندوں کو ہی دیا جاتا ہے نہ کہ مردوں کو۔

حیات شہداء بنص قرآن ایسی واضح ہے کہ معتزلہ جو عام عذاب قبر کو بدن سے متعلق نہیں مانتے وہ بھی مانتے ہیں:

بل احیاء لدلالۃ الکلام علیھا قولہ تعالیٰ یرزقون کسائر الاحیاء یاکلون ویشربون وھو تاکید لکونھم احیاء وصف حالھم التی ھم علیھا۔[2]

ترجمہ۔ وہ زندہ ہیں اللہ کے کلام یرزقون کی دلالت اسی پہ ہے جیسا کہ دوسرے سب زندوں کی صفت ہے وہ کھاتے بھی ہیں اور پیتے بھی ہیں اور یہ کہ ان کے زندہ ہونے کی تاکید ہے ان کا وہی حال بتایا گیا جس میں کہ وہ ہیں۔

برزخ کی یہ غذا اسی جنس کی ہوتی ہے جو وہ اس دنیا میں کھاتا پیتا تھا گو نوع اس کی دوسری ہو۔ ابن رسول صاحبزادہ ابراہیمؑ کی وفات ہوئی تو حضورؐ نے بتلایا کہ ابراہیمؓ کے لیے اگلے جہان میں دودھ پلانے والی موجود ہے۔

اس سے یہ بھی پتہ چلا کہ اگلے جہان میں یرزقون کی شان شہداء سے خاص نہیں۔

---

[1] تفسیر قرطبی جلد ۲ ص ۲۷ [2] تفسیر کشاف جلد ۱ ص ۴۲۹

عن عدی بن ثابت قال سمعت البراء قال لما مات ابراھیم قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان لہ مرضعًا فی الجنّۃ۔[1]

ترجمہ۔ حضرت براءؓ کہتے ہیں جب حضورؐ کے بیٹے ابراہیم کی وفات ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اس کے لیے جنت میں دودھ پلانے والی موجود ہے۔

دنیا میں ابراہیم کی غذا دودھ تھی تو آگے بھی دودھ ملا گو وہ دودھ اُس عالم کا تھا جو ضروری نہیں کہ اِس دودھ جیسا ہو۔

ایک سوال

اگلے جہاں کے رزق سے اگلے جہان والے غذا پائیں یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے۔ لیکن یہاں کے ابدان جیسے شہداء کرام جو حیاتِ جسمانی سے فائز الحیات ہیں وہ اُس جہان کے رزق سے کیسی سیری حاصل کر سکتے ہیں؟

الجواب

کیا آپ نے یہ مطالعہ نہیں فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہاں عالمِ دنیا میں بھی کبھی غیبی رزق سے متمتع ہوئے جو بدن میں تو قوت پیدا کرتا لیکن اسے منہ سے کھانے کی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب صومِ وصال (روزے جوڑ کر رکھے) تو بعض صحابہؓ نے بھی ایسا کرنا چاہا حضورؐ نے انہیں منع فرمایا اور بات کھول دی:۔

لست کاحدکم انی یطعمنی ربی ویسقینی۔[2]

ترجمہ میں تم میں سے کسی کی طرح نہیں ہوں۔ میرا پروردگار مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے

حضورؐ کا یہاں کا جسدِ اطہر اس عالمِ غیب کے کھانے سے سیری محسوس کرتا تھا۔ سو شہداء

---

[1] صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۹۱۴ جلد ۱ صفحہ ۱۶۴ [2] ایضاً جلد ۱ صفحہ ۲۶۳

بھی اگر جسمانی حیات سے زندہ ہوں اور اللہ رب العزت انہیں ان کے مناسب حال رزق پہنچائے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔

تیسری صدی کے علماء میں سے کسی نے یہ سوال نہیں اٹھایا کہ ان دنیوی ابدان کا اس عالم غیب کے رزق سے سیری حاصل کرنا ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ سب اہلِ حق تسلیم کرتے تھے کہ اللہ کی قدرتوں کا احاطہ کرنا انسان کے بس کی بات نہیں۔ ہمارا فرض ہے اللہ رب العزت نے اور اس کے رسولِ برحق نے جو کچھ فرمادیا اس پر بے چوں وچرا ایمان لائیں۔

آیت حیاتِ شہداء کے تقاضے

آیت حیاتِ شہداء کے آخر میں یہ بات بڑی صراحت سے کہی گئی ہے ولکن لا تشعرون۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ تم اس حیاتِ شہداء کو اپنے شعور میں نہیں لا سکتے اس کا ادراک نہیں کر سکتے۔ قرآن کی یہ بات کہ تم اس کا شعور نہیں رکھتے کیا یہ ہمیشہ کے لیے نہیں؟ یہ کرم فرما کہتے ہیں کہ یہ حصہ آیت اسی وقت تک کے لیے تھا جب تک حضورؐ نے ارواحِ شہداء کے حواصل طیور میں آنے اور جنت میں داخلہ لینے کی بات نہ فرمائی تھی۔ جب آپ نے امت کو حیاتِ شہداء کا شعور بخش دیا تو اب آیت لا تشعرون منسوخ ہوگئی۔ استغفر اللہ العظیم۔

اب ان کی زندگی جنت میں اسی طرح کی ہے جس طرح اور مومنین کی ہوگی۔ اُن کی بھی حیاتِ روحانی اور ان کی بھی حیات روحانی —— آیت حیاۃ شہداء میں جو ان کی جسمانی حیات کا بیان تھا سب کا سب ختم ہو گیا —— اس سے زیادہ اس آیت کی تحریف اور کیا ہوگی۔ اعاذنا اللہ منہ۔

ہم قادیانیوں کو بارہا کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کے مدعی (انا قتلنا المسیح عیسی ابن مریم۔ پ النساء ع ۲۲) جس جسم کو قتل کرنے کے مدعی تھے اللہ نے اسی کو اُٹھایا اسی کا رفع کیا۔ بل رفعہ اللہ الیہ میں بل اضرابیہ ہے۔ یہود کا جس چیز کے قتل کا

دعوٰے ہے۔ اللہ رب العزت کا اسی کے رفع کا دعوٰی ہے۔ سو حضرت مسیح علیہ السلام کے رفع جسمانی کا عقیدہ ضروریات میں سے ہے۔

اب وہی بات ہمیں اپنے ان کرم فرماؤں کو کہنی پڑ رہی ہے کہ لمن یقتل فی سبیل اللہ میں جو زیر قتل آئے انہی کے بارے میں بل احیاء یہ الطالیہ وارد ہے کہ وہ اموات نہیں۔ انہیں اموات نہ کہو۔ بلکہ وہ زندہ ہیں تمہیں سمجھ نہ آئے تو لا تشعرون کے تحت قبول کر لو۔ ضروری تو نہیں کہ عالم غیب کی ہر بات سمجھی جائے۔

ان کرم فرماؤں نے آیت کی جو تعبیر بنا رکھی ہے وہ بل احیاء یہ پہ نظر رکھنے والوں اور لا تشعرون پر یقین رکھنے والوں کے لیے کسی طرح لائق فہم نہیں۔ ان کے بیان کا حاصل یہ ہے کہ :۔

"جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جاتے ہیں ان کی روحیں پرندوں کی صورت میں سیر کرتی ہیں تم انہیں مردہ نہ کہو وہ زندہ ہیں تمہیں ان کی زندگی کی سمجھ نہیں آ سکتی"

جب وہ پرندوں کی شکل میں آ گئے تو سمجھ تو آ گئی۔ جنت میں چلنے پھرنے والے کیا سب شہید ہوں گے یا شہداء کے علاوہ بھی وہاں کسی کو داخلہ ملے گا۔ پھر ان کے بارے میں کیا وہی کہا جائے گا کہ ان کی زندگیوں کا بھی تم شعور نہیں رکھتے یا یہ اور شکلوں میں وہاں جائیں گے اور شہید پرندوں کی شکل میں ——— کچھ تو سمجھاتے کہ ان میں ایک لا تشعرون کے تحت ہیں اور دوسرے شعور کے تحت۔ ان میں فارق آیت کون سی ہے؟

ے کچھ تو کہیے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالب غزل سرا نہ ہوا

قرآن کی آیت پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ شہداء زندہ ہیں اور ان کے جو ابدان مقتول ہوئے انہیں مُردے نہ کہو۔ ان کی زندگی تمہارے حواس سے بالا ہے تم اس کا ادراک نہیں کر سکتے۔

ارواح کا مقر علیین میں مان کر یا تم بہ تعلق روح ابدانِ مقتولہ کی زندگی نہیں مان سکتے جو یہاں کی آنکھوں سے تو پردے میں ہے لیکن لا تشعرون کے تحت ہمارے ایمان میں ہے۔ حدیث علیین کی بے شک تصدیق کرو لیکن ابدان شہداء کو ہرگز مُردہ نہ کہو۔ ان میں ایسی زندگی ہے جو تم سے پردے میں ہے۔ اور اس جہت سے وہ زندہ ہیں۔

قرآن کریم کے ان ظاہر معنوں کو کسی خبر واحد سے جو دلالۃً بھی مضطرب ہو پھیر دینا یہ علم کی کون سی خدمت ہے اور عوام میں اس خبر واحد کو متواتر اور قطعی الدلالۃ بتانا اس سے بڑھ کر عوام سے فریب کاری کیا ہے؛ جو مفسرین آیت ولا تزر وازرۃ وزر اخریٰ کو قبر سے متعلق قرار دیں ان کے سوا کون ہے جو برزخ میں شہداء کی حیاتِ جسمانی کا انکار کر سکے۔

ہر کسی نے اپنی اپنی قبر میں جانا ہے لا تزر وازرۃ وزر اخریٰ کوئی کسی کا بوجھ نہ اُٹھائے گا۔[1]

اب ہم ایسی تعبیرات کو کس طرح تسلیم کر لیں۔ اگر کسی کو اللہ تعالیٰ کے کلام لا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات کے مقابلہ میں ان کے ابدانِ مقتولہ کو اموات ہی کہنا ہے تو جسے قرآن کے انکار کی یہ روش پسند ہو وہ تسلیم کرے روح کے کوائف سُن کر ابدانِ مقتولہ کی زندگی جو نصِ قرآن سے ثابت ہے اس کا انکار ہمیں تو گوارا نہیں۔

بل احیاء

حیاۃ الشھداء ثابتۃ فی الآیات والاحادیث وقد اختلفوا فیھا و ذھب کثیر من السلف الی انھا حیاۃ حقیقیۃ بالروح والجسد و لکن لا ندرکھا ولا نعلم حقیقتھا لانھا من احوال البرزخ التی لا یطلع علیھا۔[2]

---

[1] مسالک العلماء ص ۲۵ [2] مدارک التنزیل جلد ۲ ص ۲۹

ترجمہ: شہیدوں کی زندگی آیات اور احادیث سے ثابت ہے، اور (کرامیہ جیسے) لوگوں نے اس میں اختلاف کیا ہے اور اسلاف کی اکثریت (اہل السنۃ والجماعۃ) اس طرف گئی ہے کہ شہداء کی یہ زندگی حیات حقیقی ہے جو روح اور بدن کے ساتھ ان کو حاصل ہوتی ہے لیکن ہم اسے محسوس نہیں کر پاتے اور نہ ہم اس کی حقیقت جانتے ہیں اور اس لیے بھی کہ یہ برزخ کے احوال میں سے ہے جس پر انسان مطلع نہیں ہوتا۔

ان الشہداء بعد موتہم وقتلہم احیاء عند ربہم یرزقون فرحین وھذہ صفۃ الاحیأ فی الدنیا واذا کان ھذا فی الشہداء کان الانبیاء بذلک احق واولی۔[1]

ترجمہ: بیشک شہداء اپنی موت اور قتل ہونے کے بعد اپنے رب کے ہاں زندہ ہیں انہیں رزق دیا جاتا ہے اور وہ خوش ہیں اور یہ دنیا میں زندوں کی صفت ہے جب شہداء کا یہ حال ہے کہ وہ زندہ ہیں تو انبیائے کرام تو اس شان کے زیادہ حقدار اور اہل ہیں۔

جماعت اہلحدیث کے بزرگ قاضی شوکانی (۱۲۵۵ھ) لکھتے ہیں:۔

معنی الآیۃ عند الجمہور انہم احیاء حیاۃ محققۃ ثم اختلفوا فمنہم من یقول انما ترد الیہم ارواحہم فی قبورہم فیتنعمون وقال مجاہد یرزقون من ثمر الجنۃ وذھب من عدا الجمہور الی انہا حیاۃ مجازیۃ والصحیح الاول والمراد بالرزق المعروف فی العادات علی ما ذھب الیہ الجمہور۔[2]

ترجمہ: اور آیت حیات شہداء کے معنی جمہور کے نزدیک یہ ہیں کہ وہ حیات حقیقی کے ساتھ زندہ ہیں، پھر اس میں اختلاف ہے کہ کیا ان کی روحیں قبروں میں ان کی

---

[1] سفارینی جلد ۲ صفحہ ۲۹ [2] تفسیر فتح القدیر جلد ۱ صفحہ ۱۶۹

طرف لوٹائی جاتی ہیں اور وہ وہاں ادراک نعیم کرتے ہیں۔ امام تفسیر مجاہد (۱۱۸ھ) کہتے ہیں انہیں وہاں جنت کے پھل دیئے جاتے ہیں اور جمہور (اہل السنۃ والجماعۃ) کے سوا جو لوگ ہیں (جیسے معتزلہ اور کرامیہ) وہ کہتے ہیں کہ یہ حیات حقیقی نہیں مجازی ہے اور صحیح بات پہلی ہی ہے کہ یہ ان کی (قبر کی حیات) حقیقی حیات ہے اور رزق سے مراد وہی رزق ہے جسے عادۃً رزق کہا جاتا ہے جیسا کہ جمہور اہل اسلام کا مسلک ہے۔

مفسرین میں جب اختلاف ہوا کہ ابدانِ شہداء میں روحیں لوٹتی ہیں یا نہیں تو کسی نے نہ کہا۔ جب حضورؐ نے حیاتِ شہداء کی تفسیر پرندوں کی سیر سے کر دی ہے۔ اب تم ان بدنوں کو کیوں زیر بحث لا رہے ہو۔ ان بدنوں کے لیے حیاتِ حقیقی کیوں ثابت کر رہے ہو اور پھر اسے جمہور اہل اسلام کا مسلک کہہ رہے ہو۔ کیا جمہور اسلام ارواح شہداء کے قنادیل عرش سے لٹکنے کے خلاف تھے؟ نہیں انہیں نہ اس حدیث سے انکار تھا نہ قرآن کریم سے ——— قرآن کریم کی رو سے وہ شہداء کی حیاتِ جسمانی کے بھی قائل تھے اور روح کے اپنے مقامات رفیعہ کا بھی وہ انکار نہ کرتے تھے جس کے اثر سے ابدان قبروں میں زندگی پاتے ہیں۔

قاضی صاحب یہ بھی لکھتے ہیں:-

ورد النص فی کتاب اللہ فی حق الشہداء انہم احیاء یرزقون و ان الحیٰوۃ فیہم متعلقۃ بالجسد فکیف بالانبیاء المرسلین[1]

ترجمہ: قرآن کریم میں شہیدوں کے بارے میں نص موجود ہے کہ وہ زندہ ہیں۔ انہیں رزق دیا جاتا ہے اور ان کی حیات جسد کے ساتھ ہے۔ یہ حیات انبیاء و مرسلین کو بدرجۂ اولیٰ حاصل ہے۔

ہم نے قاضی صاحب کو اس لیے پیش کیا ہے کہ ایک قاضی ہمیں بھی پیش آئے ہیں وہ تقلیدِ سلف میں ہمارے خلاف تھے اور یہ قاضی تائید سلف میں ہمارے خلاف ہیں۔

---

[1] نیل الاوطار جلد ۴ صفحہ ۲۶۱

یہ غیر مقلد بزرگ تو اپنی بات کہہ چکے۔ اب تیرہویں صدی کے ایک مقلد بزرگ سے بھی سن لیجئے۔ ان سے تمسک کئے بغیر آپ چودھویں صدی کے ان کرم فرماؤں سے نہیں بچ سکیں گے۔ علامہ محمود آلوسیؒ (۱۲۷۰ھ) لکھتے ہیں :۔

واختلف فی ھذہ الحیاۃ وذھب کثیر من السلف الی انھا حقیقیۃ بالروح والجسد ولکنا لا ندرکھا فی ھذہ النشأۃ واستدلوا بسیاق قولہ تعالیٰ عند ربھم یرزقون۔[1]

ترجمہ۔ اور اس زندگی میں اختلاف کیا گیا ہے۔ اسلاف کی اکثریت اسی بات پر ہے کہ ان کو حقیقی حیات حاصل ہے جو روح اور جسد کے ساتھ ہوتی ہے لیکن ہم اسے اس جہان میں دیکھ نہیں پاتے اور ان سلف صالحین نے عند ربھم یرزقون سے استدلال کیا ہے۔

علامہ آلوسیؒ نے سلف کا مسلک ہم تک پہنچا دیا ہے اور اسے جمہور کا مسلک کہا ہے اس کے بعد اب کیا تردد باقی رہ گیا :۔

یرزقون لکونھم احیاء ..... والقول بان ارواحھم تتعلق بالافلاک والکواکب فتلتذ بذلک وتکتسب زیادۃ کمال قول ھابط الی الثریٰ ولا اظن القائل بہ قرع سمعہ الروایات الصحیحۃ والاخبار الصریحۃ بل لم یذق طعم الشریعۃ الغراء ولا تراٰی لہ منہج المحجۃ وخبر القنادیل لا ینور کلامہ ولا یزیل ظلامہ فظھری ان حال الشھداء وحیاتھم وراء ذلک۔[2]

شہداء کی حیات اور رزق کو روحانی رزق بتلانا اور سمجھنا کہ ان کے ارواح آسمانوں اور ستاروں پر ہوتے ہیں اور اس میں لذت محسوس کرتے ہیں

---

[1] روح المعانی جلد ۲ صہ ۲۰ [2] ایضاً جلد ۴ صہ ۱۲۲، صہ ۱۲۳

اور کمال بڑھاتے ہیں۔ یہ انہی لوگوں کا کہنا اور سمجھنا ہو سکتا ہے جن کے کانوں میں صحیح اور صریح روایات اور اخبار کی آواز نہیں پڑی، بلکہ ایسے لوگ شریعت غرا کی لذت سے آشنا نہیں ہیں اور ان کو محجۃ بیضا کی راہ نہیں دکھلائی گئی۔ اللہ کی قسم شہداء کا حال اور ان کی زندگی روحانی رزق اور زندگی سے بالا و برتر ہے — پھر آگے جاکر لکھتے ہیں :۔

ان الآیۃ دلت علی عرض الارواح علی النار غدوا و عشیا فی البرزخ ولیس فیہ دلالۃ علی اتصال تالمھا باجسادھا فی البرزخ اذ قد یکون ذلک مختصا بالبرزخ فاما حصول ذلک للجسد فی البرزخ و تالمہ فلم یدل علیہ الا السنۃ فی الاحادیث المرضیۃ الاتی ذکرھا [1]

شہداء کی امتیازی حیات یہ ہے کہ ان کی ارواح کو تجسد ہے (یہ سبز یا سفید پرندوں کی صورتیں ہیں) اور اس تجسد کو شہداء کے دنیوی اجساد سے اس قدر اتصال اور تعلق ضرور ہے کہ اس نے دنیوی اجساد کے اندر حیات پیدا کر رکھی ہے۔

یہ شہداء کی زندگی کا بیان ہے کہ ارواح شہداء کا پرندوں کی صورت میں پرواز کرنے کے باوجود اپنے دنیوی اجساد سے ایک گونہ تعلق ضرور ہے اور اسی کے سبب ان کو حیاۃ جسمانی حاصل ہے۔ تاہم یہ حیات ایسی ہے کہ ہم اس دنیا میں رہتے ہوئے اس کا ادراک نہیں کر پاتے۔ الا یہ کہ اللہ تعالیٰ خود کسی کے لیے برزخ کے یہ پردے اٹھا دیں۔ عارفین نے جب کبھی شہداء یا انبیاء کو ان کی قبروں میں زندگی کے پورے آثار سے دیکھا وہ کشف کی آنکھوں سے دیکھا ورنہ وہ دنیا اس دنیا سے پردے میں ہے۔

پردہ اٹھنے کی مثالیں

برزخ کے پردے قبروں کی عام برزخی واردات پر ہیں۔ نعیم صالحین اور عذاب مجرمین

---

[1] روح المعانی جلد ۲ صد

دونوں پردے میں ہیں. حضورؐ سے پردے اُٹھے تو آپ نے دو قبروں میں دو مجرمین کو گھرے عذاب میں پایا. حضرت موسےٰ علیہ السلام کی قبر کے پاس سے گزرے تو انہیں قبر میں نماز پڑھتے پایا.

معتزلہ کی ایک غلط تاویل اور اُس کا جواب

قرآن کریم نے شہداء کے زندہ ہونے کی جو خبر دی ہے اس سے مراد یہ ہے کہ انہیں قیامت کے دن زندہ کیا جائے گا اور اُس دن وہ ہمیشہ کی آرام کی زندگی پائیں گے۔ فرحین بما اتاھم من فضلہ میں اسی طرف اشارہ ہے۔ یوں نہیں کافر بھی اس دن زندہ کئے جائیں گے مگر وہ اس دن انتہائی نکبت اور تکلیف میں ہوں گے.

الجواب : آیت حیات شہداء کا جملہ ولکن لا تشعرون (اور لیکن تم زندگی کا شعور نہیں رکھتے) اس کی تردید کرتا ہے کیوں اس دن (قیامت کے دن) تو سب ایک دوسرے کی زندگی کا شعور رکھتے ہوں گے. ہر زندہ دوسرے کو زندہ نظر آتے گا اور اس دن کسی کی زندگی چھپی زندگی نہ ہو گی ـــــ یہاں ہمیں شہداء کی زندگی کے بارے میں کہا گیا ہے. ولکن لا تشعرون. اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شہداء کی زندگی جس کی اس آیت میں خبر دی گئی ہے قیامت سے پہلے کی ہے ان کے مارا جانے اور قیامت کے مابین ان کا برزخ ہے اور اسی برزخ میں وہ حیات جسدی سے زندہ ہیں.

حافظ ابو بکر جصاص رازی (۳۷۰ھ) لکھتے ہیں :-

فیہ اخبار باحیاء اللہ تعالیٰ الشھداء بعد موتھم ولا یجوز ان یکون المراد انھم سیحیون یوم القیٰمۃ لانہ لو کان ھذا مرادہ لما قال ولکن لا تشعرون لان قولہ ولکن تشعرون اخبار بفقد علمنا بحیاتھم بعد الموت ولو کان المراد الحیاۃ یوم القیٰمۃ لکان المومنون قد شعروا بہ وعرفوا قبل ذٰلک فثبت ان المراد الحیاۃ الحادثۃ بعد موتھم قبل

یوم القیٰمۃ واذا جاز ان یکون المومنون قد احیوا فی قبورھم قبل یوم القیٰمۃ وھم المنعمون جاز ان یحیی الکفار فی قبورھم فیعذبون وھٰذا یبطل قول من ینکر عذاب القبر[1]

ترجمہ۔ اس آیت میں شہداء کے مارے جانے کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے زندہ کئے جانے کی خبر دی گئی ہے اور یہ صحیح نہیں کہ اس سے مراد قیامت کے دن زندہ کیا جانا ہو ایسا ہوتا تو اللہ تعالیٰ یہ نہ کہتے ولکن لا تشعرون کیونکہ یہ جملہ کہ تم ان کی اس زندگی کو دیکھتے نہیں ہمارے ان کی اس زندگی کو جاننے کی نفی کرتا ہے اور اگر اس آیت سے یہی مراد ہو تو مومن تو اس دن ان کی اس زندگی کو دیکھ لیں گے۔ اور پہچان لیں گے پھر لا تشعرون کیا؟

سو بات یہی ہے کہ اس سے ان کی وہ حیات مراد ہے جو ان کو مارا جانے کے بعد قیامت سے پہلے حاصل ہوگی۔ اور جب یہ ممکن ہے کہ مومنوں کو ان کی قبروں میں زندگی ملے اور وہ وہاں نعیم قبر پائیں تو یہ کیوں نہیں ہو سکتا کہ کافروں کو بھی ان کی قبروں میں زندہ کیا جائے اور ان کو ان میں عذاب ملے۔ اس سے معتزلہ کا عقیدہ انکارِ عذابِ قبر باطل ٹھہرتا ہے وہ سمجھتے ہیں عذابِ قبر کوئی شے نہیں۔ نہ وہاں کوئی زندگی ہے اور نہ عذاب۔

برزخ کا ایک اپنا حال ہے

برزخ کا ماقبل سے جدا اور مابعد سے مختلف ایک اپنا حال ہے اس کا اثبات عقیدۂ برزخ کا اقرار اور اس کا انکار عالم برزخ کی کھلی نفی ہے۔ انسان انبیاء ہوں یا شہداء موت کا پل عبور کر کے ہی اس جہان میں داخل ہوتے ہیں اور اس جہان کی ایک اپنی زندگی ہے جسے برزخی زندگی کہا جاتا ہے یہ زندگی دنیوی ابدان سے متعلق ہو تو اسے جسمانی حیات بھی کہا جاتا ہے گو یہ ہمارے شعور اور ادراک سے بالا ہو حشر کے دن جب قبروں سے اٹھیں گے تو وہ ایک کھلی حیات ہوگی۔

---

[1] احکام القرآن جلد ا ص ۹۳

برزخ کی یہ حیات ماقبل کی وفات سے متصادم نہیں نہ یہ مابعد (عالم آخرت کی کھلی زندگی کے منافی ہے ماقبل کی وفات سے انبیاء اور شہداء کو عالم برزخ میں مردے نہیں کہا جاسکتا۔

انبیاء کرام کے لئے ان کی موت کا اقرار اور حالاً انہیں مُردہ کہنے سے انکار

یہ اس بحث کا مرکزی نقطہ ہے۔ انبیاء بے شک اپنے وقت میں موت کا ذائقہ چکھ آئے ہیں لیکن حالاً وہ اموات نہیں احیاء ہیں ——— مرے ہوئے نہیں زندہ ہیں ——— ہمارا یہ استدلال اسی منہاج پہ ہے جس منہاج پر ہم نے حیات شہداء پہ استدلال کیا تھا۔ ماضی میں دونوں (شہداء اور انبیاء) موت آشنا ہوئے۔ اب دونوں اموات نہیں احیاء ہیں۔ ان دنوں ان کے میت ہونے کا فیصلہ درست نہیں، حالاً ان کے احیاء ہونے کا عقیدہ ضروریات مذہب اہل سنت سے ہے۔

شہداء کے لئے موت وارد ہونے کا اقرار اور حالاً انہیں مُردہ کہنے پر انکار

قرآن کریم نے شہداء سے موت وارد ہونے کی نفی نہیں کی۔ ایسا ہوتا تو یُوں فرماتے۔ ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ انھم ماتوا لیکن ایسا نہ کہا۔ بلکہ فرمایا انہیں اموات (مُردے) نہ کہو انہیں مُردے نہ سمجھو۔ اب بعد وفات وہ زندہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں قتل (موت وارد ہونے) کے بعد حیات بخش رکھی ہے۔

عالم برزخ میں شہداء کی زندگی روحانی ہے یا جسمانی۔ اس کا فیصلہ من یقتل کو دیکھ کر کریں زندگی کا حکم اسی پہ ہے جس پہ فعل قتل وارد ہوا اور ظاہر ہے کہ وہ جسم ہے جس پر قتل وارد ہوا۔ قرآن کریم نے اسی کے مُردہ ہونے کا ابطال کیا اور اس کے زندہ ہونے کا اثبات کیا ہے۔

بل اضرابیہ ابطالیہ ماقبل کا ابطال کرتا ہے مابعد کا اثبات کرتا۔ یہاں بل سے شہداء کے مردے ہونے کی نفی کی ان کے زندہ ہونے کا اثبات کیا۔ سو ان کی زندگی حقیقی اور جسمانی ہے اور وہ روح اور جسم دونوں سے زندہ ہیں۔ گو ہمیں اس کا ادراک اور شعور نہ ہو۔ ولکن لا تشعرون اس پر قرآنی شہادت ہے۔

یہی جسمانی زندگی ان کا مخصوص اور امتیازی درجہ ہے۔ یہ قول حضرت ابن عباسؓ۔ مجاہدؒ حسن بصریؒ اور دیگر کئی صحابہؓ اور تابعین کا ہے کہ وہ جسمانی حیات سے زندہ ہیں ــــ لیکن اس میں پھر اختلاف ہوا کہ ان کی ارواح پرندوں کی صورت میں متجسد ہیں اور پھر ابدان پر سایہ فگن ہیں یا وہ اجساد مثالیہ میں اتری ہوئی ہیں ــــ صورتِ حال جو بھی ہو یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ اُن کا ان کے اصل دنیوی اجساد سے کوئی تعلق نہیں۔

علامہ محمود آلوسیؒ (۱۲۷۰ھ) لکھتے ہیں:۔

ولا یعجز اللہ تعالیٰ ان یحل بہ حیوٰۃ تکون سبب الحس والادراک وان کنا نراہ رمۃ مطروحۃ علی الارض لا یتصرف ولا یری فیہ شیٔ من علامات الاحیاء فقد جاء فی الحدیث ان المؤمن یفسح لہ مدی بصرہ ویقال لہ نم نومۃ العروس مع انا لانشاھد ذٰلک اذا لبرزخ برزخ اٰخر بمعزل عن اذھاننا وادراک قوانا۔[1]

ترجمہ۔ اللہ تعالیٰ اس سے عاجز نہیں ہے کہ شہداء کے دنیوی اجسام میں زندگی اُتار دے اگرچہ ہم اس کو زمین ہی میں گلا سڑا دیکھیں اور حیات کے اثرات اُن میں نہ دیکھ پائیں ــــ اور یہ ہماری کمزوری ہوگی کیونکہ اصل حقیقت کچھ اور ہے گو ہم اسے پوری طرح سمجھنے میں ناکام رہیں اس کی مثال میں حدیث پیش کی جاسکتی ہے کہ مومن کے لیے اس کی قبر نظر کی حد تک کھول دی جاتی ہے اور اس کو کہا جاتا ہے کہ اس میں دلہن

---

[1] روح المعانی جلد ۲ صفحہ ۲۰

کی نیند کی طرح سو جاؤ۔ حدیث کی اس خبر کے باوجود ہم میت کی قبر کو اس حد تک کھلا ہوا نہیں دیکھتے نہ میت کو اس میں دلہن کی مانند سویا ہوا پاتے ہیں مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ خبر امر واقعہ نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ برزخ اور عالم غیب کے احوال ہیں جن کا یہاں کی آنکھ سے دیکھنا بہت مشکل ہے۔

پھر آگے جا کر لکھتے ہیں:۔

والذی یمیل القلب الیہ ان لھا تلک الابدان شبھا تاما صوریا بھذہ الابدان وان المواد مختلفۃ و الاجزاء متفاوتۃ۔ اذ فرق بین العالمین و شتان ما بین البرزخین ویمکن حمل احادیث الطیر علی تشبیہ ھذہ الابدان الغضۃ الطریۃ بسرعۃ حرکتھا وخھلبھا حیث شاءت بالطیر المخضر[1]

ترجمہ۔ اور جس بات سے میرے دل کو تسلی اور اطمینان ہے وہ یہ ہے کہ برزخی ابدان کو ان ابدان کے ساتھ پوری پوری صورت مشابہت ہے۔ اگرچہ دونوں کے اجزاء متفاوت اور ان کے عناصر مختلف ہوں اس لیے کہ دونوں جہانوں میں فرق ہے اور ہو سکتا ہے کہ حدیث میں سرعت حرکت کے اعتبار سے تشبیہ ہو۔

مولانا محمد اسماعیل صاحب (گوجرانوالہ) کہتے ہیں شہداء کو رزق دیا جانا ان کی حیات جسمانی کی دلیل نہیں بن سکتا۔ اس لیے کہ قرآن کریم اس عطا کو غیر شہداء سے بھی متعلق کرتا ہے اور زندہ صرف شہداء کو کہا گیا ہے۔ سو شہداء کو رزق دیا جانا ان کی جسمانی زندگی کی دلیل نہیں ہے۔ نیز اس رزق کو عند ربھم کہا گیا ہے جو روحانی رزق کے لیے آتا ہے۔ سو جب رزق روحانی ہے تو ان کی زندگی بھی روحانی ہوگی۔ مولانا نے اس سلسلہ میں اس آیت سے استدلال کیا ہے۔

والذین ھاجروا فی سبیل اللہ ثم قتلوا او ماتوا لیرزقنھم اللہ رزقا حسنا۔ (پ ۱۷: الحج ع ۸ آیت ۵۸)

ترجمہ۔ اور جو لوگ گھر چھوڑ آئے پھر اللہ کی راہ میں مارے گئے یا مر گئے تو اللہ تعالیٰ

---

[1] روح المعانی جلد ۲ صفحہ ۲۱

انہیں خاص رزق حسن عطا فرمائیں گے۔

یہاں عام مرنے والوں سے بھی رزقِ حسن کا وعدہ ہے کیا وہ بھی زندہ ہیں؟ اگر رزق دیا جانا زندگی کی دلیل ہے تو چاہیئے کہ وہ بھی زندہ ہوں؟

الجواب

اس آیت میں او ماتوا (یا وہ مر گئے) کے الفاظ عام اموات کے بارے میں نہیں ہیں یہ ان لوگوں کے بارے میں ہیں جو اپنے گھروں سے اللہ کی راہ میں نکلے اور پھر اسی راہِ عمل میں مرے وہ اور اس راہ عمل میں مارے جانے والے دونوں کے لیے اس آیت میں وعدہ رزق ہے

یہ کیوں؟ اس لیے کہ وہ متوفی فی سبیل اللہ بھی شہید کا درجہ رکھتے ہیں قتیل فی سبیل اللہ اور متوفی فی سبیل اللہ دونوں کو اللہ تعالیٰ نے درجہ شہادت دیا ہے اور دونوں سے رزق حسن کا وعدہ ہے۔

فضالہ بن عبید (۵۷ ھ) نے دیکھا کہ لوگ قتیل فی سبیل اللہ کے جنازہ کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں تو انہوں نے فرمایا:۔

فامامن قتل فی سبیل اللہ ... فانه حي عند ربه یرزق .... و امامن توفی فی سبیل اللہ من مهاجر اوغیر مهاجر فقد تضمنت هٰذه الأیة الکریمة مع الاحادیث الصحیحه اجراء الرزق علیه۔[1]

اس سے پتہ چلتا ہے کہ متوفی فی سبیل اللہ بھی شہید ہے وہ عام مرنے والوں میں سے نہیں۔ عام اموات کے مقابلہ میں یہاں قتیل فی سبیل اللہ اور متوفی فی سبیل اللہ دونوں باجرِ شہادت ماجور ہیں اور حیاتِ جسمانی اور رزقِ حسن پاتے ہیں۔

مولانا اسماعیل صاحب کی قرآن پاک پہ ماشاء اللہ وسیع نظر ہے لیکن حدیث میں آپ کا مطالعہ کمزور ہے اگر ان احادیث پر آپ کی نظر ہوتی تو آپ ایسی بات نہ کہتے۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر جلد ۲ صفحہ ۱۳۲، صفحہ ۲۳۹

① ——— حضرت ابو مالک اشعریؓ روایت کرتے ہیں :۔

جو اللہ کی راہ میں نکلا پھر فوت ہو گیا یا مارا گیا۔ اس کے گھوڑے یا اونٹ نے اسے مار ڈالا یا اس پر کوئی تکلیف آگئی وہ شہید ہے۔[1]

② ——— حضرت معاذ بن جبلؓ (۱۸ ھ) روایت کرتے ہیں :۔

جس نے اخلاص اور سچائی سے خدا سے مقامِ شہادت چاہا وہ طبعی موت پائے یا مارا جائے اس کے لیے مرتبہ شہادت ہے۔[2]

③ ——— حضرت عمرؓ نے اثنائے خطبہ میں فرمایا :۔

لوگو! ایسا کہو جیسا حضورؐ فرما گئے جو اللہ کی راہ میں مارا گیا یا فوت ہوا وہ جنت میں ہے۔[3]

④ ——— سہیل بن حنیف اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں :۔

جس نے سچے دل سے شہادت کو چاہا اللہ تعالیٰ اسے شہادت کا درجہ دیں گے اگرچہ وہ اپنے بستر پر فوت ہو۔[4]

مولانا اسمٰعیل صاحب قرآن کریم کے محاورہ عند ربھم یرزقون کو بھی نہیں سمجھے۔ خواہ مخواہ کہے جا رہے ہیں کہ انہیں روحانی رزق ملتا ہے۔ حضرت مریم کے پاس جب بیت المقدس میں خلافِ موسم پھل آتے تو حضرت زکریا علیہ السلام اس پر حیران ہو گئے۔ آپ نے ان سے پوچھا تو حضرت مریم نے بتایا۔ ھو من عند اللہ (پ۳ آل عمران ع ۴) یہ کوئی روحانی رزق نہ تھا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ خاص اللہ کے ہاں سے آتا تھا۔ حضرت مریم کا جسد دنیوی تھا اور یہ رزق بھی اس کے مناسب دنیوی ——— اللہ تعالیٰ بغیر اسباب کے انہیں مہیا فرمائیں تو محض اس وجہ سے انہیں روحانی رزق نہیں کہہ دیا جاتا۔ ایسے مواقع پر خدا کی قدرت پر نظر رکھنی چاہیئے۔

شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ لکھتے ہیں :۔

خدا کی قدرت سے اسی طرح مجھے یہ چیزیں پہنچائی جاتی ہیں۔[5]

---

[1] سنن کبریٰ جلد ۹ صـ ۱۶۲ [2] ایضاً صـ ۱۷ [3] ایضاً صـ ۱۲۸ [4] ایضاً صـ ۱۷ [5] تفسیر عثمانی صـ ۷

پھر اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ کہا:۔

فابتغوا عند اللہ الرزق۔ (پ۲۰ العنکبوت آیت ۱۷)

ترجمہ۔ تم اللہ کے ہاں سے رزق ڈھونڈو۔

معلوم ہوا کہ عند اللہ یا عند ربہم کچھ روحانی رزق سے ہی خاص نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں کے دنیوی رزق پر بھی یہ محاورہ استعمال کیا ہے۔ افسوس مولانا محمد اسماعیل صاحب اسے سمجھ نہیں سکے

حیاتِ شہداء کے شواہد

(۱) — حضرت جابرؓ کہتے ہیں اُحد کے دن میرے والد نے مجھے کہا۔ شاید آج میں سب سے پہلے شہید ہو جاؤں۔ حضورؐ کے بعد کوئی مجھے تم سے پیارا نہیں میرا قرض ادا کر دینا اور اپنی بہنوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا۔

حضرت جابرؓ کہتے ہیں واقعی سب سے پہلے میرے والد مارے گئے۔ اس دن دو دو شہید ایک جگہ دفن کئے گئے تھے میں نے نہ چاہا کہ میرے والد کے ساتھ کوئی اور دفن ہو— میں نے چھ ماہ بعد اپنے والد کی قبر کو کھولا۔ تاکہ آپ کو علیحدہ دفن کر دوں۔

فکان اول قتیل فدفنت معہ اخر فی قبرہ ثم لم تطب نفسی ان اترکہ مع اخر فاستخرجتہ بعد ستۃ اشہر فاذا ھو کیوم وضعتہ ھنیۃ غیر اذنہ۔[1]

ترجمہ۔ آپ جنگ اُحد کے پہلے شہید تھے میں نے آپ کے ساتھ ایک اور شخص کو بھی آپ کی قبر میں دفن کر دیا پھر مجھے یہ بات اچھی نہ لگی کہ میں اپنے والد کو کسی اور شخص کے ساتھ رکھوں میں نے پھر چھ ماہ کے بعد آپ کو وہاں سے نکالا آپ اسی حال میں تھے جیسا کہ میں نے آپ کو دفن کیا تھا صرف ایک کان میں تھوڑا سا تغیر تھا۔

حضرت جابرؓ کے والد عبد اللہ بن عمرو انصاریؓ کے ساتھ آپ کے بہنوئی حضرت عمرو بن الجموحؓ دفنائے گئے تھے۔[2]

---

[1] صحیح بخاری جلد ۱ صفحہ ۱۸۰ [2] فتح الباری جلد ۳ صفحہ ۔ کتاب الجنائز

۲۔ تقریباً پچاس سال بعد حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دورِ حکومت میں مدینہ منورہ کے قریب نہر نکالنا کھودی گئی۔ اس کھدائی میں سید الشہداء حضرت امیر حمزہؓ کا جسد ملا۔ وہ اسی طرح تھا جس طرح دفن کیا گیا تھا اس میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی تھی۔ بیلچہ انگلی پر لگ گیا تو خون بہنے لگا۔ حافظ ابن حجرؒ (۸۵۲ھ) لکھتے ہیں :۔

وما وجد فی صدر ھذہ الامۃ من شھداء احد وغیرھم علی ھٰذہ الصورۃ ولم یتغیروا بعد الدھور الطویلۃ لحمزۃ بن عبد المطلب فانہ وجد حین حفر معاویۃ العین صحیحا لم یتغیر اصابت الفاس اصبعہ فدمیت۔[1]

ترجمہ۔ اور اس امت کے پہلے دور میں جو شہداء احد وغیرہ اسی صورت میں پائے گئے لمبے زمانے گزرنے کے بعد بھی ان میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوا۔ ان میں حضرت حمزہؓ بھی ہیں۔ حضرت معاویہؓ نے جب اپنے دور میں ایک نہر کھودی تو انہیں حضرت حمزہؓ کو اسی طرح پایا گیا آپ میں کوئی تغیر واقع نہ ہوا تھا۔ کام کرنے والے کا بیلچہ آپ کی انگلی پر لگ گیا تو اس سے خون جاری ہو گیا۔

۳۔ حضرت عمرو بن الجموحؓ اور عبداللہ بن عمرو انصاریؓ ایک دفعہ پھر بوجہ سیلاب دوسری جگہ منتقل کیے گئے :۔

فوجدا لم یتغیرا کانھما ماتا بالامس وکان احدھما قد جرح فوضع یدہ علی جرحہ فدفن وھو کذٰلک فارسلت یدہ عن جرحہ ثم ارسلت فرجعت کما کانت۔[2]

ترجمہ۔ وہ دونوں اس طرح پائے گئے گویا کل فوت ہوئے ہیں ان میں سے ایک احد کے دن زخمی ہوا تھا اور اس نے اپنا ہاتھ اپنے زخم پر رکھا ہوا تھا اور اسی حالت میں وہ دفن

---

[1] سیرت ابن ہشام جلد ۱ صفحہ ۳۴ فتح الباری جلد ۳ صفحہ ۱۴۲ [2] موطا امام مالک صفحہ ۳۱۳ طبع جدید صفحہ ۱۷۱

کر دیا گیا میں نے آپ کا ہاتھ زخم سے ہٹایا اور پھر چھوڑ دیا۔ وہ وہیں جا لگا جہاں کہ پہلے تھا۔

(۴)۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں بحران کے ایک آدمی نے ایک جگہ جہاں قبریں تھیں، زمین کھودی تو حضرت عبد اللہ بن تامرؓ کا جسد ملا۔ ہاتھ سر پر رکھا ہوا تھا۔ راوی کہتا ہے:۔

فاذا اخرت یده عنها تنبعث دما واذا ارسلت یده ردها علیها فامسکت دمها۔[1]

ترجمہ۔ جب میں آپ کا ہاتھ زخم سے ہٹاتا تو اس زخم سے خون پھوٹ پڑتا اور جب میں آپ کے ہاتھ کو چھوڑ دیتا تو وہ وہیں جا لگتا اور اس کے خون کو روک دیتا۔

(۵)۔ ولید بن عبد الملک کے زمانہ میں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ کی دیوار گر گئی جب اسے بنانے لگے تو ایک قبر سے قدم ظاہر ہوا۔ لوگ گھبرا گئے کہ یہ حضورؐ کا قدم نہ ہو حضرت عروہؓ نے وہ قدم پہچان لیا اور بتایا یہ حضرت عمرؓ کا قدم ہے۔[2]

(۶) حضرت امیر معاویہؓ کے دورِ حکومت میں جب نہر کنظامہ کھودی گئی اور درمیان میں شہداء کی قبریں کھلیں تو دیکھا کہ اُن کے جسد تر و تازہ ہیں اور بال بڑھے ہوئے ہیں۔ اتفاقاً ایک شہید کے پاؤں پر کدال لگی تو خون جاری ہوگیا۔ جب وہ جگہ کھودی گئی تو سب طرف مشک کی خوشبو پھیل گئی۔[3]

(۷)۔ حضرت حذیفہ اور حضرت عبد اللہ جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے مزارات دریائے دجلہ کے کنارے تھے۔ ۱۹۳۰ء کے قریب کی بات ہے۔ دریا زمین کاٹتا ان کے مزارات کے قریب آ پہنچا۔ حکومتِ عراق نے حکم دیا کہ ان مزارات کو حضرت سلمان فارسیؓ کے احاطہ میں منتقل کر دو اور پھر ایسا ہی گیا۔ پھر جنازے ہوئے اور آٹھ دس ہزار آدمیوں نے ان میں شرکت کی۔ ایک صاحب الطاف حسین جو ان جنازوں میں شریک ہوئے تھے۔ ان کا بیان ہے:۔

---

[1] سیرت ابن ہشام جلد ۱ صـ ۳۵ و تفسیر خازن جلد ۱ صـ ۲۲۸ [2] صحیح بخاری جلد ۱ صـ ۱۸۶
[3] وفاء الوفاء جلد ۲ صـ ۹۳۹

قبر سے نکلے ہوئے جنازوں کی موجودگی اور خلق کی آہ و بکا نے قیامت کا نمونہ برپا کر رکھا تھا۔ اکثر آدمی روتے روتے بے ہوش ہو گئے۔ نعشیں تیرہ سو سال گزرنے کے بعد بھی بالکل سالم تھیں۔ کفن ہاتھ لگانے سے بوسیدہ تھا۔ ایک صاحب کی داڑھی سفید تھی اور ایک کی سیاہ۔[1]

یہ واقعہ ماہنامہ تعلیم القرآن راولپنڈی کی اگست ۱۹۶۴ء کی اشاعت میں اسی طرح منقول ہے اور اس کا عنوان ہے:۔

ناقابلِ انکار صداقت

قصبہ سلمان پاک جو بغداد سے ۳۰ میل کے فاصلے پر ہے، زمانہ قدیم میں جس کا نام "مدائن" تھا جہاں اکثر صحابہ کرامؓ گورنری کے عہدے پر فائز رہے۔ یہاں ایک شاندار مقبرے میں حضرت سلمان فارسیؓ مشہور صحابی مدفون ہیں اور آپ کے گنبد مزار سے متصل نبی آخر الزمانؐ کے دو صحابہ حضرت حذیفہ الیمانیؓ اور حضرت جابر بن عبد اللہؓ کے مزارات ہیں۔ ان دونوں اصحاب رسولؐ کے مزارات پہلے سلمان پاک سے دو فرلانگ کے فاصلے پر ایک غیر آباد جگہ پر تھے۔

ہوا یہ کہ حضرت حذیفہؓ نے خواب میں ملک فیصل اول شاہ عراق سے فرمایا کہ ہم دونوں کو موجودہ مزاروں سے منتقل کر کے دریائے دجلہ سے تھوڑے سے فاصلہ پر دفن کر دیا جائے۔ اس لیے کہ میرے مزار میں پانی اور جابرؓ کے مزار میں نمی شروع ہو گئی ہے۔

شاہ یہ خواب مسلسل دو راتوں میں دیکھتا رہا اور شاید بے پروائی یا انہماک امور سلطنت کے باعث بھول گیا، تیسری شب حضرت موصوف نے عراق کے مفتی اعظم کو خواب میں یہی ہدایت فرما کر کہا، ہم دو راتوں سے بادشاہ کو کہہ رہے ہیں لیکن اس نے اب تک انتظام نہیں کیا۔ اب یہ تمہارا کام ہے کہ اس کو متوجہ کر کے اس کا فوری بندوبست کراؤ۔

چنانچہ اگلے روز صبح ہی صبح مفتی اعظم نوری السعید پاشا وزیر اعظم کو ساتھ لے کر بادشاہ سے

---

[1] صدق لکھنؤ ۱۱، دسمبر ۱۹۴۴ء

ملے اور اس سے اپنا خواب بیان کیا. شاہ فیصل نے کہا، میں بھی دو راتوں سے خواب میں یہی دیکھ رہا ہوں.

آخر کافی غور و مشورے کے بعد شاہ نے مفتی اعظم سے کہا کہ آپ مزارات کھولنے کا فتویٰ دے دیں تو میں اس کی تعمیل کے لیے تیار ہوں. جب مفتی اعظم نے مزارات کے کھولنے اور لاشوں کو منتقل کرنے کا فتوےٰ دے دیا تو یہ فتوےٰ اور شاہی فرمان دونوں اس اعلان کے ساتھ اخبارات میں شائع کر دیئے گئے کہ بروزِ عید قربان بعد نمازِ ظہر ان دونوں اصحابِ رسول کے مزارات کھولے جائیں گے.

اخبارات میں یہ حال شائع ہونا تھا کہ تمام دنیائے اسلام میں یہ خبر بجلی کی طرح پھیل گئی. رئٹر اور دوسری خبر رساں ایجنسیوں نے اس خبر کو تمام دنیا میں پہنچا دیا. حسنِ اتفاق دیکھیے کہ ان دنوں موسم حج ہونے کے باعث تمام دنیا سے مسلمان حج کے لیے حرمین شریفین (مکے مدینے) میں جمع ہو رہے تھے. جب انہیں یہ حال معلوم ہوا تو انہوں نے شاہِ عراق سے یہ خواہش ظاہر کی کہ مزارات حج کے چند روز بعد کھولے جائیں تا کہ وہ بھی شرکت کر سکیں، اسی طرح حجاز، مصر، شام، لبنان، فلسطین، ترکی، ایران، بلغاریہ، افریقہ، روس، ہندوستان وغیرہ وغیرہ ملکوں سے شاہِ عراق کے نام بے شمار تار پہنچے کہ ہم بھی جنازوں میں شریک ہونا چاہتے ہیں. مہربانی فرما کر مقررہ تاریخ چند روز بڑھا دی جائے.

چنانچہ دنیا کے مسلمانوں کی خواہش پر یہ دوسرا فرمان جاری کر دیا گیا کہ اب یہ رسم حج کے دس دن بعد ادا کی جائے گی اور اس کے ساتھ ہی خواب میں اہلِ مزارات کی عجلت کی تاکید کے پیش نظر احتیاطی تدابیر بھی کی گئیں کہ پانی مزارات تک پہنچنے نہ پائے.

آخر کار وہ دن بھی آ گیا جس کی آرزو میں لوگ جوق در جوق سلمان پاک میں جمع ہو گئے. دو شنبہ کے دن، بارہ بجے کے بعد لاکھوں انسانوں کی موجودگی میں مزارات کھولے گئے تو معلوم ہوا کہ حضرت حذیفہ الیمانیؓ کے مزار میں کچھ پانی آ چکا تھا اور حضرت جابرؓ کے مزار میں نمی پیدا ہو چکی تھی.

حالانکہ دریائے دجلہ وہاں سے کم از کم دو فرلانگ دور تھا۔

تمام ممالک کے سفیر، عراقی حکومت کے تمام ارکان اور شاہ فیصل کی موجودگی میں پہلے حضرت حذیفہ الیمانیؓ کی نعش مبارک کو کرین کے ذریعے زمین سے اس طرح اوپر اٹھایا گیا کہ ان کی نعش کرین پر نصب کئے ہوئے سٹریچر پر خود بخود آ گئی۔ اب کرین سے سٹریچر کو علیحدہ کر کے ہز میجسٹی شاہ فیصل، مفتی اعظم عراق، وزیر مختار جمہوریہ ترکی اور پرنس فاروق ولی عہد مصر نے کندھا دیا اور بڑے احترام سے ایک شیشہ کے تابوت میں رکھ دیا۔ پھر اسی طرح حضرت جابر بن عبد اللہؓ کی نعش مبارک کو مزار سے باہر نکالا گیا۔

نعش ہائے مبارک کا کفن، حتیٰ کہ ریش ہائے مبارک کے بال تک بالکل صحیح حالت میں تھے نعشوں کو دیکھ کر یہ اندازہ ہرگز نہیں ہوتا تھا کہ یہ تیرہ سو سال قبل کی نعشیں ہیں، بلکہ گمان یہ ہوتا تھا کہ شاید انہیں رحلت فرمائے دو تین گھنٹے سے زائد وقت نہیں گزرا۔ سب سے عجیب بات یہ تھی کہ ان دونوں کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور ان میں اتنی پُر اسرار چمک تھی کہ بہتوں نے چاہا کہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھیں لیکن ان کی نظریں اس چمک کے سامنے ٹھہرتی ہی نہ تھیں اور ٹھہر بھی کیسے سکتی تھیں؟

بڑے بڑے ڈاکٹر یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ ایک جرمن ماہر چشم جو بین الاقوامی شہرت کا مالک تھا، اس تمام کارروائی میں بڑی دلچسپی لے رہا تھا۔ اس نے یہ منظر دیکھا تو بس دیکھتا ہی رہ گیا، وہ اس سے کچھ اتنا بے اختیار ہوا کہ ابھی نعش ہائے مبارک تابوتوں میں ہی رکھی گئی تھیں کہ آگے بڑھ کر مفتی اعظم عراق کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا، آپ کے مذہب اسلام کی حقانیت اور ان صحابہؓ کی بزرگی کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے؟ لائیے مفتی اعظم! ہاتھ بڑھائیے میں مسلمان ہوتا ہوں۔ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔

اس موقع پر ایک جرمن فلمساز کمپنی نے کمال کیا، کمال کیا کیا بلکہ وہ دور دراز سے آئے ہوئے مشتاقانِ دید پر احسان کیا کہ اس نے شاہ عراق کی منظوری سے اپنے خرچ پر عین مزارات

کے اوپر دو سو فٹ بلند فولاد کے چار کھمبوں پر کوئی تیس فٹ لمبا اور بیس فٹ چوڑا ٹیلی ویژن کا سکرین لگا دیا۔ پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ کھمبوں کے چاروں طرف بھی چھت سے ملحق چار سکرین لگا دیئے۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ ہر کوئی اپنی جگہ کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر مزارات کے کھلنے کے وقت سے لے کر آخر وقت تک تمام کارروائی دیکھتا رہا۔ زیارت کے جوش میں کوئی ریل پیل نہیں ہوئی۔ اور اس طرح ہزاروں لوگ اس بھگدڑ میں پس کر مرنے سے بچ گئے۔ مردوں، عورتوں اور بچوں نے نہایت اطمینان سے پوری کارروائی دیکھی۔

دوسرے دن بغداد کے سینماؤں میں اس واقعہ کے فلم دکھائے گئے۔ اس واقعہ کے فوراً بعد بغداد میں کھلبلی مچ گئی اور بے شمار یہودی اور نصرانی خاندان بلا کسی جبر کے اپنے جہل و گمراہی پر افسردہ، اپنے گناہوں پر نادم، ترساں و لرزاں جوق در جوق مسجدوں میں قبول اسلام کے لیے آتے تھے اور مطمئن شاداں و فرحاں واپس جاتے تھے۔ اس موقع پر مشرف بہ اسلام ہونے والوں کی تعداد اتنی تھی کہ اس کا اندازہ لگانا آسان نہیں۔

یہ "چشم دید واقعہ" کسی کتاب میں لکھا ہوا اگلے زمانے کا تاریخی واقعہ نہیں ہے۔ یہ ہمارے ہی زمانے کا آنکھوں دیکھا حال ہے۔ اس کو زیادہ عرصہ بھی نہیں گزرا۔ ۱۹۳۲ء میں اس معجزہ کا ظہور ہوا ہے۔ اس کو ہر مذہب و ملت اور کئی ممالک کے اشخاص نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اس کی دُنیا کے اخباروں نے جلی عنوانات سے تشہیر کی ہے اور اس کے ہر جگہ چرچے رہے ہیں۔ یہ مزارات گمنام افراد کے بھی نہ تھے۔ یہ نبی آخر الزمان محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو مشہور و معروف صحابہؓ کے مزار تھے جن کو پہلے بھی لوگ جانتے اور مانتے تھے اور جواب بھی مرجع خلائق بنے ہوئے ہیں۔[1]

ہر شخص ٹھنڈے دل سے غور کرے کیا علم و عقل قیاس اور سائنس کے پاس اس کا کوئی جواب ہے؟ کیا کوئی صاحب عقل و ہوش جس کے دل میں ذرا سی بھی شائبہ حق و انصاف ہے اس سے انکار کر سکتا ہے کہ ان اصحابِ رسول کو یہ حیات برزخی جس نسبت سے حاصل ہوئی وہ مکین گنبدِ خضریٰ بھی اسی جسدِ اطہر سے حیات برزخی رکھتے ہیں۔

---

[1] منقول از ماہنامہ تعلیم القرآن راولپنڈی اشاعت اگست ۱۹۶۴ء

یہاں مزارات سے کون سی قبریں مراد ہیں؟ یہی وہ جو یہاں محسوس و مشاہد ہیں یا کہیں عالم غیب میں تھیں اور اللہ رب العزت نے ان اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی قبروں اور ان کے اجساد مدفونہ کو جو عزت اور کرامت بخشی کیا وہ انہی گڑھوں سے متعلق نہ تھی جو یہاں زمین میں کھودے گئے اور انہی میں یہ اجسادِ کریمہ اس شان سے سالم اور محفوظ رہے۔ ان میں آثارِ حیات اگر ہمیں محسوس نہ ہوں تو آیت قرآنی لاتشعرون کے تحت ہمیں اس پر ایمان لانے میں کون سی چیز مانع ہے؟ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

دنیا نے جن صحابہؓ کی حیات برزخی کا یہ مشاہدہ کیا وہ حضرت حذیفہؓ اور حضرت جابر بن عبداللہؓ رضی اللہ عنہما تھے۔ یہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھیوں میں اور ان کی خلافت تسلیم کرنے والوں میں سے تھے۔ ان کی یہ حیات اگر ایک طرف اسلام کا اعجاز ہے تو دوسری طرف حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کی خلافتوں کے برحق ہونے کا آسمانی نشان بھی ہے۔

جو لوگ صحابہؓ پر بستے ہیں اور انہیں ان کی خلافتوں میں صادق اور امین نہیں جانتے وہ اپنے ان ابدان کی زندگی سے ہمیشہ کے لیے محروم کر دیئے جاتے ہیں اور انہیں ان کے ان کے مثالی اجساد میں رکھا جاتا ہے اور ان کا حشر بھی ان کی انہی مثالی صورتوں میں ہوگا۔

اصول فقہ کی مشہور کتاب مسلم الثبوت کی شرح فواتح الرحموت جو قم سے شائع ہوئی ہے میں ہے:۔

انهم بمثل هذه الاقاويل خرجوا عن ربقة الاسلام ولذا ام بعض اهل رضوان الله تعالىٰ عليهم اجمعين على صورة الخنازير كما هو مشروح فى الفتوحات المكية للشيخ الاكبر وارث رسول الله صلى الله عليه وسلم بل حكم بعض اهل الله تعالىٰ رضوان الله عليهما انهم يحشرون على صورة الخنازير[1]

حاصل یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ اور ان کے ساتھیوں پر زبان درازی کرنے والے اور انہیں حق پر تسلیم نہ کرنے والے آخرت میں خنزیروں کی صورت میں اٹھائے جائیں گے۔

---

[1] فواتح الرحموت بذیل المستصفیٰ من علوم الاصول جلد ۲ صفحہ ۹۷ طبع منشورات الرضی بہ قم

حیاتِ انبیاء کی ایک جھلک

جب صور پھونکا جائے اور حشر کی گھڑی آپہنچے

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ اما بعد :۔

جب قیامت کا بگل بجے گا اور صور پھونکا جائے گا کل روئے زمین ۔ اللہ تعالیٰ کی ایک مٹھی میں ہوگی اور ساتوں آسمان کاغذ کی طرح اس کے ایک ہاتھ میں ہوں گے اور اس کے دونوں ہاتھ دائیں ہیں اور اس کی مثال نہیں دی جا سکتی۔

اس دن جب سب مردے قبروں سے اٹھیں گے انبیاء کرام کا احیاء ہو گا یا ان کا طویل بے ہوشی سے افاقہ ہو گا بصورتِ ثانی وہ پہلے سے زندہ سمجھے جائیں گے۔ جواب اس نفخہ ثانیہ سے ہوش میں آ گئے۔ اس بات کی تحقیق کے لیے ہمیں قیامت کی خبروں میں لفظ افاقہ کی تلاش ہوگی۔

یہ گھڑی جس کے واقع ہونے کا وقت اللہ ہی کو معلوم ہے کیسے قائم ہوگی۔ قرآن کریم میں اس کی اس طرح خبر دی گئی ہے :۔

ونفخ فی الصور فصعق من فی السمٰوٰت ومن فی الارض الا من شاء اللہ ثم نفخ فیہ اخریٰ فاذا ھم قیام ینظرون ○ واشرقت الارض بنور ربھا ووضع الکتاب وجیٓء بالنبیین والشھداء وقضی بینھم بالحق وھم لا یظلمون ○ (پ ۲۴ : الزمر ع ۷ آیت ۶۸)

ترجمہ۔ اور پھونکا جائے گا صور۔ پھر بے ہوش ہو جائے جو کوئی آسمانوں میں ہے اور زمین میں۔ مگر جس کو اللہ چاہے پھر پھونکا جائے دوسری بار تو وہ سب اٹھ کھڑے ہوں گے دیکھتے ہر طرف۔ اور زمین اپنے رب کے نور سے

جگمگا اُٹھے گی اور لایا جائے گا نبیوں کو اور شہیدوں کو اور فیصلہ ہوگا لوگوں میں انصاف سے۔ اور ان پر ظلم نہ ہوگا اور ہر جی کو جو اس نے کیا پورا ملے گا اور وہ خوب جاننے والا ہے جو یہ کرتے رہے۔

علماء محققین کے نزدیک کل دو دفعہ نفخ صور ہوگا۔ پہلے مرتبہ میں سب کے ہوش اُڑ جائیں گے۔ پھر زندے تو مُردے ہو جائیں گے اور جو مر چکے تھے اُن کی ارواح پر بے ہوشی کی کیفیت طاری ہو جائے گی بعد میں دوسرا نفخہ ہوگا جس سے مُردوں کی ارواح اَبدان کی طرف واپس آجائیں گی اور بے ہوشوں کو افاقہ ہوگا اس وقت محشر کے عجیب وغریب منظر کو حیرت زدہ ہو کر تکتے رہیں گے پھر خداوند قدوس کی پیشی میں تیزی سے حاضر کئے جائیں گے..... اس وقت حق تعالیٰ کی تجلّی اور نورِ بے کیف سے محشر کی زمین چمک اُٹھے گی۔ حساب کا دفتر کھُلے گا اور اعمال نامے سامنے رکھ دیئے جائیں گے۔[1]

عربی میں صعق کا لفظ غشی اور موت دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے:۔

صعق الرجل اذا غشی علیہ وصعق الرجل اذا مات۔

صور پھونکا جانے پر جو صعقہ ہوگا وہ موجود زندوں کے لیے پیغامِ موت ہوگا اور جو پہلے مر چکے ہیں اور بعد الوفات زندہ تھے ان کے لیے یہ صعقہ غشی کا ہوگا وہ یہ آواز سنتے ہی بے ہوش ہو جائیں گے۔

اب سارے اوّلین و آخرین موت کی آغوش میں ہیں جو پہلے مر چکے ہیں وہ تو زیرِ زمیں تھے ہی۔ جو اب مرے وہ بھی سب پہلوں کے ساتھ موت کے پردے میں ہیں۔ چار مقرب فرشتے یا حملۃ العرش پر شاید اس نفخہ کا اثر نہ ہو اور وہ الا من شاء اللہ کا استثناء پالیں لیکن جو طبقہ قیامت قائم ہونے سے پہلے حیاتِ بعد الوفات پا چکا اس پر اس صعقہ کا اثر بے ہوشی کا ہوگا

---

[1] تفسیر عثمانی ص ۶۰۴

——— نفخہ سنتے ہی بے ہوش ہو جائیں گے۔

پھر دوسرا صعقہ ہوگا اور سب لوگ اُٹھ کھڑے ہوں گے۔ جو موت کی آغوش میں گئے تھے۔ وہ سب زندہ ہو گئے اور جو بے ہوش ہوئے وہ ہوش میں آجائیں گے۔ قبروں میں انبیاء کا مقام کیا ہے؛ مقامِ حیات ہے ہو تو وہ بیہوشی سے افاقہ میں آئیں گے۔ اموات ہوں تو زندہ کئے جائیں گے۔ مُردوں پر تو واذا النفوس زوجت کا عمل ہوگا اور بے ہوشی والے تو پہلے ہی روح و بدن کے ساتھ ہیں۔ ہاں اس دن روح مع بدن کامل صورت میں جمع ہوں گے۔

انبیاء کرام اس دن بیہوشی سے اُٹھیں گے۔ وہ موت سے حیات میں نہیں بیہوشی سے افاقہ میں آئیں گے۔ اُن کا برزخ ختم ہو جائے گا اور آخرت شروع ہو جائے گی۔ اب ان کی زندگی پردے کی نہیں کُھلی ہو گی اور وہ ایک دوسرے کے سامنے کُھلی اور کامل حیات میں ہوں گے حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

لا تخیرونی علی موسیٰ فان الناس یصعقون فاکون اول من یفیق فاذا موسیٰ باطش بجانب العرش فلا ادری أکان فیمن صعق فافاق قبلی اوکان ممن استثنی اللہ عزوجل۔[1]

ترجمہ۔ تم مجھے موسےٰ پر فضیلت نہ دو۔ لوگ بے ہوش ہو جائیں گے اور میں پہلا ہوں گا جسے بیہوشی سے افاقہ ہوگا تو میں کیا دیکھوں گا کہ موسیٰ عرش کا پایہ پکڑے کھڑے ہیں میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ بیہوش ہونے والوں میں سے تھے اور مجھ سے پہلے ہوش میں آگئے یا وہ بیہوش ہی نہ ہوئے تھے) ان میں تھے جنہیں اللہ عزوجل نے اسی آزمائش سے مستثنیٰ رکھا۔

یہ آپ کا بیہوشی سے افاقہ دوسرے نفخہ کے بعد ہوگا۔ ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں:-

انی اول من یرفع رأسہ بعد النفخۃ الاخیرۃ۔[2]

ترجمہ۔ میں پہلا شخص ہوں گا جو نفخہ ثانیہ کے بعد سر اٹھائے گا۔

---

[1] صحیح بخاری جلد ۱ صفحہ ۴۸۴، صفحہ ۳۲۵ [2] فتح الباری جلد ۱۳ صفحہ ۱۹۶

اس سے پتہ چلتا ہے کہ نفخۂ اولیٰ اور نفخۂ ثانیہ کے مابین کچھ وقت ضرور ہوگا۔ کتنا ہوگا۔ اس میں کوئی قطعی بات نہیں کہی جا سکتی لیکن اتنی بات ہے ایک فاصلہ ضرور ہے اور اصل قیامت وہی ہے جو دوسرے نفخہ کے بعد قائم ہوگی قرآن کریم میں ہے:-

ثم نفخ فیہ اخریٰ فاذا ھم قیام ینظرون ٥ (پ ۲۴: الزمر ع ۷ آیت ۶۸)

ترجمہ۔ پھر دوسری بار نفخہ صور ہوگا تو سب اُٹھ کھڑے ہوں گے ایک دوسرے کو دیکھتے۔

یہ برزخ اور آخرت میں فرق ہے۔ برزخ میں ایک دوسرے کو دیکھنا نہیں اور آخرت میں سب ایک دوسرے کو دیکھتے ہوں گے۔

صحیح احادیث میں لفظ افاقہ کی تلاش تھی۔ انبیاء کرام کے لیے نفخۂ ثانیہ پر لفظ افاق من قبلی اور اول من یفیق کے الفاظ صحیح بخاری سے مل گئے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ انبیاء کرامؑ عالم برزخ میں اپنی قبروں میں زندہ ہیں۔ اس عالم کے اعتبار سے وہاں ان کی نیند ایک بہشتی کی سی ہوگی جو نفخۂ ثانیہ پر ختم ہو جائے گی اور اب سب ایک کھلی زندگی میں آجائیں گے۔

یہ دوسرے نفخہ پر آپ کا اٹھنا کہاں سے ہوگا؟ مدینہ منورہ کی قبر مبارک سے ——
حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں حضورؐ نے فرمایا:-

فان الناس یصعقون یوم القیٰمۃ فاکون من تنشق عنہ الارض فاذا انا بموسیٰ آخذ بقائمۃ من قوائم العرش فلا ادری کان فیمن صعق ام حوسب بصعقۃ الاولیٰ۔[1]

ترجمہ۔ سو سب انسان (جو زمین پر زندہ ہوں گے) قیامت کے دن (صور پھونکا جانے سے) مر جائیں گے۔ اس کے بعد میں پہلا ہوں گا جس سے قبر پھٹے گی (کھلے گی اور میں نکلوں گا) کیا دیکھوں گا کہ موسیٰ عرش کا پایہ پکڑے

---

[1] صحیح بخاری جلد ۱ صفحہ ۳۲۵ وفی روایۃ ام جوزی بصعقۃ الطور جلد ۱ صفحہ ۴۸۱

کھڑے ہیں. میں نہیں جانتا کہ وہ بے ہوشی میں آئے یا انہیں وہی بیہوشی کافی ہوگئی. جو انہیں پہلے (کوہِ طور پر) پیش آچکی ہے.

اس سے پتہ چلتا ہے کہ پہلا نفخہ اس وقت ہوگا جب انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی قبروں میں ہوں گے اور دنیا آباد ہوگی. پہلا نفخہ قیامت کا بگل ہوگا اور دنیا کے سب انسان مرجائیں گے پھر جب دوسرا نفخہ ہوگا تو پہلے مرے ہوئے لوگ جو اپنی قبروں میں یا ذراتِ منتشرہ میں ہوں گے سب زندہ ہوجائیں گے اور جو پہلے نفخہ سے مرے تھے اور ان کے دفن ہونے کی نوبت نہ آئی تھی وہ پھر زندہ ہوجائیں گے اور اولین و آخرین سب کا حشر ہوگا.

حافظ ابن کثیر دمشقی رح لکھتے ہیں :-

ترجمہ. نفخہ اولیٰ وہ ہے جس سے زمین و آسمان میں زندہ نفوس سب مرجائیں گے مگر جن کو اللہ چاہے. اور دوسرے نفخہ سے سب مرے ہوئے زندہ ہوجائیں گے اور قیامت کے ہولناک مناظر کا سامنا کریں گے.[1]

رہا انبیاء کرام کا معاملہ وہ پہلے نفخہ سے بے ہوش ہوجائیں گے اور دوسرے نفخہ سے ان کی بے ہوشی جاتی رہے گی اور وہ اپنی قبروں سے نکلیں گے. سب سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کھلے گی اور آپ ہوش میں آئیں گے. اچانک عرش پہ نظر پڑے گی تو موسیٰ علیہ السلام عرش کا پایہ پکڑے نظر آئیں گے. معلوم ہوتا ہے وہ پہلے نفخہ پہ قبر میں بے ہوش ہی نہ ہوئے ہوں گے.

یہ صورتِ حال کیا بتا رہی ہے ؟ اوروں کا موت سے حیلہ: میں آنا اور انبیاء علیہم کا بیہوشی سے افاقہ میں آنا اور ان کی قبروں کا کھلنا اور پھر کل بنی نوعِ انسان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہو جانا.

نفخہ اولیٰ اور ثانیہ کے مابین کتنا وقت ہوگا ؟ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضہ

---

[1] تفسیر ابن کثیر جلد صد فتح الباری جلد ۱۳ صد ۱۹۸

روایت کرتے ہیں حضورؐ نے فرمایا اور بات آپ نے حضرت عیسےٰ علیہ السلام کے نزول سے شروع کی —— آپ فرماتے ہیں:۔

یخرج الدجال فی امتی فیلبث فیهم اربعین فیبعث اللّٰہ عز وجل عیسی ابن مریم ..... فیطلبه فیهلکه ثم یلبث الناس بعده سنین سبعًا لیس بین الاثنین عداوه ثم یرسل اللّٰہ ریحًا باردة من قبل الشام فلا یبقی احد فی قلبه مثقال ذرہ من ایمان الا قبضته ..... ویبقی شرار الناس فی خفة طیر واحلام السباع .....
وهم فی ذلك دارة ارزاقهم حسن عیشهم ثم ینفخ فی الصور فلا یسمعه احد الا اصغی له[1]

اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ کو بھیجے گا آپ دجال کو قتل کریں گے پھر شام کی طرف سے ایک ٹھنڈی ہوا چلے گی اور جس کے دل میں ذرہ بھر ایمان ہو گا وہ اس کے جھونکے سے مر جائے گا صرف اہلِ شر رہ جائیں گے طیور کی طرح ان میں توہم، تغزر اور اضطراب ہو گا فسق و فجور کے دلدادہ اور فساد پہ آمادہ ہوں گے خیالات ان کے بُرے ہوں گے اور حالات بے وقار ہوں گے عقلیں ناقص ہوں گی اور علم و حلم سے خالی ہوں گے۔ قلتِ رحم۔ اہلاک۔ اتلاف غضب اور وحشت ان کی زندگی ہو گی۔ نہ نیکی کو نیکی جانیں گی نہ بُرائی کو برائی مانیں گے۔ شیطان کے اُکسانے اور ترغیب پر وہ شرک کریں گے رزق ان کا وسیع ہو گا۔ صاحبِ مال اور صاحبِ حیثیت ہوں گے ایسے وقت اور ایسے حالات میں صور پھونکا جائے گا۔

ثم یرسل اللّٰہ مطرًا کانه الطل فتنبت منه اجساد الناس ثم ینفخ فیه اخری فاذا هم قیام ینظرون قال ثم یقال یا ایها النّاس هلموا الی ربکم وقفوهم انهم مسئولون۔

---

[1] مسند امام احمد جلد ۲ حدیث ۶۵۵۵ الفتح الربانی ترتیب مسند الامام احمد بن حنبل الشیبانی جلد ۲۴ ص۸۶

پہلے نفخہ کی جس کے کان میں آواز پڑے گی وہ مرجائے گا کوئی زندہ باقی نہ رہے گا سب مرجائیں گے. پھر اللہ تعالیٰ شبنم کی طرح بارش برسائے گا جس سے اجسام اُگ آئیں گے[1] پھر دوسرا نفخہ ہو گا اور سب اُٹھ کھڑے ہوں گے اس وقت سب ننگے ہوں گے اور کہا جائے گا چلو اب اپنے رب کی طرف چلو۔ اوکما قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نفخۂ اولیٰ اور نفخۂ ثانیہ کے درمیان کچھ وقت ضرور ہو گا۔ اصل قیامت وہی ہے جو دوسرے نفخہ پہ قائم ہو گی.

قرآن کریم کہتا ہے :-

ثم نفخ فیه اخری فاذاهم قیام ینظرون ۰ (پ ۲۴: الزمر)

ترجمہ. پھر دوسری بار نفخہ صور ہو گا تو وہ سب کھڑے ہو جائیں گے ایک دوسرے کو دیکھتے.

اس صورتِ حال میں انبیاء کرام کا اپنی قبروں سے آنا بیہوشی سے افاقے کی صورت میں ہو گا موت سے حیات کی صورت میں نہ ہو گا جس سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ وہ اپنی قبروں میں پہلے سے زندہ ہیں جو نفخۂ اولیٰ سے صرف بیہوشی میں جائیں گے اور دوسرے نفخہ سے وہ ہوش میں آجائیں گے اور ان کی قبریں کھل جائیں گی. امام نوویؒ (۶۰۰ھ) فرماتے ہیں :-

وھذا من اشکل الاحادیث لان موسیٰ قدمات فکیف تدرکه الصعقة وانما تصعق الاحیاء[2]

ترجمہ. یہ مشکل ترین احادیث میں سے ہے موسیٰ علیہ السلام تو فوت ہو چکے ہوئے ہیں صور پھونکا جانا ان پر کیا اثر کرے گا (وہ تو پہلے سے فوت شدہ ہیں) صور پھونکا

---

[1] قبروں کے اندر انسانی ڈھانچوں کے ریزے سب یکجا ہونے لگیں گے. بدن پھر سے بن جائیں گے

[2] شرح صحیح مسلم جلد ۲ ص ۲۶۸

جانے سے تو جو زندہ ہیں وہ مریں گے (نہ کہ وہ جو پہلے سے برزخ میں حیات پائے ہوئے ہیں)۔

پھر آگے چل کر آپ قاضی عیاضؒ (۵۴۴ھ) سے اس کا حل پیش کرتے ہیں:۔

قال القاضی فیحتمل ان ھٰذہ الصعقۃ صعقۃ فزع بعد البعث حین تنشق السموات والارض فتنتظم حینئذ الاٰیات والاحادیث و یؤید قولہ صلی اللہ علیہ وسلم فافاق لانہ انما یقال افاق من الغشی واما الموت فیقال بعث منہ وصعقۃ الطور لم یکن موتًا و اما قولہ صلی اللہ علیہ وسلم فلا ادری افاق قبلی فیحتمل انہ صلی اللہ علیہ وسلم قالہ قبل ان یعلم انہ اول من تنشق عنہ الارض ان کان ھٰذا اللفظ علیٰ ظاہرہ وان نبینا صلی اللہ علیہ وسلم اول شخص تنشق عنہ الارض علی الاطلاق[1]۔

ترجمہ: ہو سکتا ہے صعقہ سے مراد جب آسمان اور زمین پھٹ چکے ہوں گے صعقہ فزع مراد ہو۔ اس سے تمام آیات اور احادیث میں تطبیق ہو جاتی ہے اور حضورؐ کا ارشاد بھی اس کی تائید کرتا ہے جب آپ نے کہا کہ موسےٰ افاقہ میں آئے تو یہ اسے ہی کہا جاتا ہے جو بے ہوشی سے ہوش میں آئے۔ موت سے جو اُٹھایا جائے اسے بعث کہتے ہیں طور کی بیہوشی موت نہ تھی اور حضورؐ کا یہ کہنا میں نہیں جانتا کہ وہ مجھ سے پہلے ہوش آئے ہو سکتا ہے یہ اس سے پہلے کی بات ہو جب آپ کو علم دیا گیا کہ سب سے پہلے آپ کی قبر کھُلے گی۔

یہاں یہ بات معلوم رہے کہ نفخہ اولیٰ جس سے ہر ایک زندہ (باستثناء من شاء منہ) مر جائے گا اس وقت انبیاء کرام کس حال میں ہوں گے، وہ اس وقت نہ مریں گے۔

---

[1] شرح صحیح مسلم جلد ۲ ص ۲۶۸

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ (۸۵۲ھ) لکھتے ہیں:۔

ان الذین یصعقون هم الاحیاء واما الموتیٰ فهم فی الاستثناء فی قوله تعالیٰ الا من شآء الله ...... ولا یعارض ما ورد فی هٰذا الحدیث ان موسیٰ ممن استثنی الله لان الانبیاء احیاء عند الله وان کانوا فی صورة الاموات بالنسبة الی اهل الدنیا وقد ثبت ذٰلك للشهداء ولا شك ان الانبیاء اعلیٰ رتبة من الشهداء وورد التصریح بان الشهداء ممن استثنی الله[1]

ترجمہ: جو لوگ زندہ ہیں پہلے صعقہ میں مریں گے اور جو پہلے سے مرے ہیں وہ الا من شاء اللہ کے استثناء میں داخل ہیں ...... اور یہ بات اس حدیث کے خلاف نہیں جس میں موسیٰؑ ان میں شمار ہیں جو مستثنیٰ کیے گئے کیونکہ انبیاء سب اللہ کے ہاں زندہ ہیں اگرچہ وہ اہل دنیا کی نسبت سے اموات کی صورت میں ہیں اور یہ مرتبہ شہداء کو حاصل ہے اور انبیاء تو بلاشک شہداء سے کئی درجہ اعلیٰ ہیں اور ان کے مستثنیٰ ہونے کی تصریح موجود ہے۔

انبیاء علیہم السلام الا من شآء اللہ کے استثناء میں داخل ہیں جیسے کہ پہلے سے فوت شدہ لوگ اس استثناء میں شامل تھے۔

سو نفخہ اولیٰ میں موت صرف زندوں کے لیے ہے اور جو پہلے سے مردہ ہیں وہ اس صعقہ الموت میں نہیں آئیں گے۔ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اللہ کے ہاں زندہ ہیں گو عام اہلِ دنیا کے مقابل وہ اموات کی صورت میں ہیں۔ تاہم (حقیقۃً وہ اموات میں نہیں ہیں) جب شہداء کے لیے اس صعقہ سے استثناء موجود ہے تو انبیاء تو اس سے بھی اُوپر کے درجے میں ہیں۔ انبیاء کرام صعقہ اولیٰ سے مستثنیٰ ہیں اور وہ نفخہ ثانیہ میں اٹھیں گے۔ اس وقت آں

---

[1] فتح الباری جلد ۱۳ ص ۱۹۶

پر اس صعقہ سے ایک گھبراہٹ کی صورت پیدا ہو گی. یہ صعقہ ان کے لیے صعقہ فزع ہے. جس سے سب سے پہلے آپ کو افاقہ ہو گا ——— جو مُردہ ہیں وہ اس صعقہ ثانیہ سے زندہ ہو جائیں گے انبیاء علیہم السلام جو پہلے اپنی قبور میں زندہ رہے ان کی قبریں کھلیں گی اور وہ اس صعقہ سے گھبراہٹ میں ہوں گے. پھر سب انسان زندہ ہوں گے اور انبیاء کرام بھی افاقہ میں آجائیں گے اور پھر سب خدا کی طرف چل دیں گے.

حیاتِ انبیاء کی یہ ایک کھلی جھلک آپ کے سامنے ہے اور یہ اس حدیث کے عین مطابق ہے جس میں حضورؐ نے فرمایا کہ انبیاء اپنی قبروں میں زندہ ہوتے ہیں اور وہ وہاں مصروف طاعات بھی ہیں اس حدیث کی پوری بحث انشاء اللہ آگے آئے گی.

قرآنِ کریم اور عقیدہ حیاتُ النبیؐ

قرآن کریم کا یہ کھلا عنوان آپ کے سامنے ہے کہ شہدا اپنے رب کے ہاں زندہ ہیں تم انہیں مُردہ نہ کہو. علماء کرام نے اس حیاتِ شہداء سے بدلالۃ النص حیاتِ انبیاء بھی ثابت کی ہے. ہمارے مخالفین کو بھی اس کا اقرار ہے. پھر معلوم نہیں وہ کون سا داعیہ ہے جو عقیدہ حیات انبیاء کے انکار کے لیے انہیں قرآن کے گرد لے آیا ہے. حالانکہ قرآن کریم میں اس مسئلہ کی کہیں صراحت نہیں ہے. پھر ان نادانوں کا بار بار کہنا کہ اس عقیدے کے اثبات میں کتاب اللہ پیش کرو. اگر خود اپنے اکابر سے بغاوت نہیں تو اور کیا ہے. قاضی شمس الدین صاحب لکھتے ہیں:۔

> قرآن کریم میں اس مسئلہ کی صراحت کہیں بھی نہیں. ہاں شہداء کے حق میں ارشاد ہے بل هم احیاء ولکن لاتشعرون. اس سے بطور دلالۃ النص سمجھ میں آتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام جن کا درجہ شہداء سے بھی بہت بڑا ہے وہ بعد الوفاۃ زندہ ہیں اور اس طرح علماء کرام نے زادہم اللہ شرفاً یہ مسئلہ قرآن کریم سے نکالا. دلالۃ النص اسے کہتے ہیں کہ ایک چیز مذکور ہو اور دوسری اس سے بطور اولیٰ سمجھ میں آئے. اس دور میں (پہلے دور میں) اس کے ساتھ اتنا ایمان لانا کافی تھا کہ یہ حضرات زندہ ہیں جس زندگی کا ہمیں شعور نہیں اور بس[1]

---

[1] مسالک العلماء ص۲۹ معلوم نہیں قاضی صاحب نے بل هم احیاء کے الفاظ قرآن میں کہاں دیکھے ہیں.

قاضی صاحب کی بس یہاں آکر رُکی ہے. کاش کہ ان کے نوجوان ساتھی بھی اپنی بس یہیں پر روک دیتے اور بات آگے نہ بڑھتی. مگر افسوس کہ انہوں نے مجتہد بن کر قرآن کریم سے نئے سرے سے استنباط کرنا شروع کر دیا اپنے مقلد ہونے کو بھول گئے اور دعویٰ کر دیا کہ انبیاء کرام کی بعد الوفاۃ زندگی کی نفی قرآن کریم میں صراحت سے موجود ہے (استغفر اللہ العظیم) قرآن کریم پر یہ مشق ظلم اس دور کی علمی بے راہروی کی انتہا ہے

قاضی شمس الدین صاحب نے اپنی اس مذکورہ عبارت میں پانچ باتوں کا کھلا اقرار ہے.

① حیات النبی ایمانیات میں سے ہے.

② قرآن میں اس مسئلے کی کہیں صراحت نہیں ہے.

③ جس طرح شہداء بعد الوفات زندہ ہیں انبیاء کرام بعد الوفات بطریق اولیٰ زندہ ہیں.

④ جس طرح علماء حیات النبی کے قائل ہوئے ان کے لیے زادھم شرفًا کی دعا ہے.

⑤ جن علماء نے قرآن سے مسئلہ حیات النبی نکالا اس دور میں ان کی کسی نے مخالفت نہ کی تھی.

ہمیں ان نادانوں سے شکوہ نہیں جو اس مسئلہ میں بار بار قرآنی آیات کا مطالبہ کرتے ہیں اور وہ قاضی صاحب کی اس بات کو غلط کہتے ہیں کہ قرآن کریم میں اس مسئلے کی کہیں صراحت نہیں. ہم یہاں یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ ان کا قاضی صاحب کو غلط کہنا خود غلط ہے.

ہاں یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ قرآن کریم میں حیاتِ انبیاء کے کئی اقتضاء موجود ہیں.

① واسئل من ارسلنا من قبلك من رسلنا. (پ۲۵، الزخرف آیت ۴۵)

② ولقد اٰتینا موسی الکتاب فلا تکن فی مریة من لقائه.

(پ۲۱، الم سجدہ آیت ۲۳)

قرآن کریم میں اگر بقول قاضی صاحب اس مسئلے کی کہیں صراحت نہیں تو اس صورت میں احادیث صریحہ کیا اس مسئلے کا فیصلہ نہ کر سکیں گی؟ صحابہؓ کا اس ضرورت میں علمی پیمانہ کیا تھا؟ وہ مسائل کس ترتیب سے حل کرتے تھے؟

کاش! ہمارے نادان دوست اس مسئلے کو سمجھے ہوتے.

پھر اتنی ہی بات نہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بوجہ شہادت حیاتِ شہداء کے عنوان سے بھی زندہ ہیں اور یہ تو قرآن کی عبارۃ النص ہے جس کا منکر مسلمان نہیں رہ سکتا۔

اب آیئے دیکھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیسے شہادت پائی۔ ھ میں خیبر کے دن ایک یہودیہ نے آپ کو زہر دیا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے اس وقت اس کے اثر کو روک لیا۔ روکنے میں یہ حکمت تھی کہ اللہ تعالیٰ کا حضورؐ سے وعدہ تھا کہ آپ حق بات کہتے رہیں میں آپ کو لوگوں سے بچاؤں گا۔ وہ تبلیغ رسالت کو روکنے میں کامیاب نہ ہوسکیں گے۔ اللہ کے رسول غالب آکر رہتے ہیں۔ ارادۂ خداوندی ہوا کہ اس وعدے کا خلاف نہ ہو۔ اس زہر کا اثر روک لیا گیا جب آپ جملہ فرائض ادا کر چکے اس زہر کا اثر عود کرنے لگا۔

یہ اسی طرح ہے کہ جب غارِ ثور میں سانپ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ایڑی کو ڈسا تو اس زہر کو اثر کرنے سے روک دیا گیا۔ حضورؐ آپ کو اللہ کی طرف سے ان اللہ معنا کا وعدۂ حفاظت دے چکے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اس زہر کے اثر سے محفوظ رہے اور جب تک حضورؐ کی معیت رہی سانپ کے زہر کا اثر رکا رہا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد پھر اس زہر نے اثر دکھانا شروع کیا یہاں تک کہ آپ اسی تکلیف سے حیاتِ شہداء کے ایوان میں داخل ہوگئے۔

علامہ شعبی (۱۰۳ھ) قسم کھا کر کہتے ہیں حضرت ابوبکرؓ زہر سے حضرت عمرؓ قتل سے شہید ہوئے۔[۱]

آنحضرتؐ کا مرتبۂ شہادت

فتح خیبر کے بعد آپ چند دن وہیں ٹھہرے ایک یہودی عورت زینب بنت حارث نے ایک بھنی ہوئی بکری جس میں اس نے زہر ملایا تھا آپ کی خدمت میں پیش کی۔ آپ نے چکھتے ہی اپنا ہاتھ روک لیا اور فرمایا اس بکری میں زہر ملا ہوا ہے اس وقت تو آپ اس کے اثر سے محفوظ رہے لیکن آخر میں یہ اثر پھر عود کر آیا۔ آپ مرض الوفات میں فرماتے تھے یہ اسی کا زہر ہے جو میں نے خیبر میں کھایا تھا۔[۲] سو آپ کا مرتبۂ شہادت برحق ہے۔

---

[۱] دیکھئے مستدرک جلد ۳ صفحہ ۵۹ [۲] سیرت مصطفےٰ جلد ۳ صفحہ ۱۹۳ فتح الباری جلد ۷ صفحہ ۲۸

ایک اہم سوال یہ ہے کہ اگر آج بھی کوئی شخص یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ وہ ابدان جن پہ کفار قتل وارد کرنے کے مدعی ہوئے زندہ ہیں اور ان کی یہ جسمانی زندگی ہمارے شعور سے بالا ہے اور وہ اسے پرندوں کی سی زندگی نہیں کہتا۔ صرف روح کا تجسد سبز پرندوں یا سفید پرندوں کی صورت میں مانتا ہے اور کافروں کی روح کا تجسد سیاہ پرندوں میں تسلیم کرتا ہے وہ کس درجے کا مجرم ہے؟ کیا اس متفقہ عقیدہ سے نکل گیا جس کے بارے میں اوپر کہا گیا ہے کہ حیاۃ انبیا میں نزاع نہیں وہ تو بالاتفاق ثابت ہے۔

اور اگر کوئی شخص یہ کہے کہ انبیاء اور شہداء حالاً اموات ہیں احیاء نہیں قرآن کی آیۃ اموات غیر احیاء انہی کے متعلق ہے۔ وہ موت کا پل عبور کرنے کے بعد اب زندہ نہیں تو کیا وہ اوپر کے بیان کردہ عقیدہ حیات النبی کا قائل سمجھا جا سکے گا۔

ہم ان دونوں سوالوں کا جواب نہیں دینا چاہتے کیونکہ ہمارے کرم فرما اوپر بس کر چکے ہیں۔ ہم بات کو کیوں آگے بڑھائیں۔ ان کی بس یہاں رکی ہے۔

اتنا ایمان لانا کافی تھا کہ یہ حضرات زندہ ہیں جس زندگی کا ہمیں شعور نہیں اور بس۔[1]

قاضی شمس الدین صاحب ایک دوسرے مقام پہ لکھتے ہیں:۔

عزیزان من! حیاۃ الانبیاء میں نزاع نہیں وہ تو بالاتفاق ثابت ہے

ہم اس کے جواب میں اس کے سوا کیا کہہ سکتے ہیں۔

بزرگان من! جب حیاۃ النبی میں کوئی نزاع نہیں۔ یہ مسئلہ اہل سنت میں بالاتفاق طے شدہ ہے تو جنہوں نے اسے اختلافی بنا دیا آپ نے ان کے خلاف بھی کبھی کچھ کہا ہے؟ کم از کم اتنا ہی ہمیں بتا دیں کہ اتفاق میں جو شخص اختلاف پیدا کرے اس کا حکم کیا ہے؟ آپ نے عقیدہ حیاۃ النبی کا اقرار جن واشگاف لفظوں میں کیا ہے اسے پھر دیکھیں۔

---

[1] مسالک العلماء، ص ۲۹

مسئلہ حیاتُ النبی کا تعارف

آنحضرتؐ بوجہ شہادت فی سبیل اللہ قرآن کی عبارت النص کی رو سے زندہ ہیں اور بطور
نبی اور رسول بھی آپ قرآن کی دلالۃ النص سے زندہ ہیں. قاضی شمس الدین صاحب کا یہ کہنا بجا ہے
کہ حیات الانبیاء میں نزاع نہیں. انبیاء بالاتفاق زندہ ہیں.
جب ہمارا اور ہمارے دوستوں کا اس پر اتفاق ہے کہ قرآن کریم میں یہ مسئلہ صراحت
سے کہیں مذکور نہیں اسے قرآن کریم کی دلالۃ النص سے ثابت کرنے کے بعد اگر ہم ان احادیث
صریحہ کو دیکھ پائیں جن میں انبیاء کو اسی طرح احیاء کہا گیا ہے جس طرح قرآن کریم نے شہداء
کو احیاء کہا ہے. تو کیا مسلمان کا جذبہ ان احادیث کی تضعیف ہونی چاہیئے یا ان احادیث
سے قرآن کی تائید ہونی چاہیئے. اس کا ایک ہی جواب ہے دو جواب کبھی نہ ہو سکیں گے.

حیات بعد الوفات لسیّد الکائنات

الباب الاوّل وفیہ خمسۃ فصُول

حدثنا هارون بن عبد الله اخبرنا حسين بن على عن[1] عبد الرحمٰن بن يزيد بن جابر عن ابى الاشعث الصنعانى عن اوس بن اوس قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ان من افضل ايامكم يوم الجمعة فيه خلق آدم وفيه قبض وفيه النفخة وفيه الصعقة فاكثروا علىّ من الصلوٰة فان صلوٰتكم معروضة علىّ قال قالوا يا رسول الله وكيف تعرض صلوٰتنا عليك وقد ارمت قال يقولون بليت فقال ان الله عزوجل حرم على الارض اجساد الانبياء۔

سنن ابی داؤد جلد ا صـ۱۵۰، صـ۲۱۳، سنن نسائی جلد ا صـ۱۵۴، سنن ابن ماجہ صـ۷۷، صـ۱۱۹، سنن دارمی صـ۱۹۵، مستدرک حاکم جلد ا صـ۲۷۸، جلد ۴ صـ۵۶۰، مسند امام احمد جلد ۴ صـ، سنن کبرٰے بیہقی جلد ۳ صـ۲۴۸ والطبرانی کما فی نیل الاوطار جلد ۳ صـ۲۱۰، صـ۲۱۱ واحمد کما فی التفسیر لابن کثیر جلد ۳ صـ۵۱۴ وابن خزیمۃ وابن حبان وسعید بن منصور فی سننہ وابن ابی شیبۃ فی مصنفہ کما فی شرح العلامۃ البوسنوی صـ۵ مصر، المصنف جلد صـ دلائل النبوت لابی نعیم صـ۴۹۶ مصر

---

[1] قال ابن حبان فی صحیحہ حدثنا ابن خزیمۃ حدثنا ابوکریب حدثنا حسین بن علی حدثنا عبد الرحمن بن یزید بن جابر فصرح بالسماع منہ (جلاء الافہام للحافظ ابن القیم صـ۴۶ طبع امرتسر)

ترجمہ۔ حضرت اوس بن اوسؓ کہتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تمام دنوں میں سے افضل جمعہ کا دن ہے، اسی دن آدم کی تخلیق ہوئی۔ اسی دن اُن کی روح قبض ہوئی۔ اسی دن صور پھونکا جائے گا اور اسی قیامت کی بے ہوشی ہوگی بس جمعہ کے دن مجھ پہ کثرت سے درود پڑھا کرو، کیونکہ تمہارا درود بے شک مجھ پر پیش کیا جاتا ہے۔ صحابہؓ نے عرض کی کہ یارسول اللہؐ! جب آپ قبر میں گُھل چکے ہوں گے تو اس وقت ہمارا درود آپ پہ کیسے پیش کیا جائے گا آپ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ رب العزت نے زمین پہ حرام کر دیا ہے کہ انبیاء کے جسموں کو مٹی بنائے۔

(۱) ——— صحابہ کرامؓ کا یہ سوال کہ بعد الوفات ہمارا درود آپؐ پہ کیسے پیش کیا جائے گا دراصل آنحضرتؐ کے اس ارشاد سے پیدا ہوا تھا۔

فان صلوٰتکم معروضة عليّ.

ترجمہ۔ بے شک تمہارا درود مجھ پہ پیش کیا جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت یہ ارشاد فرما رہے تھے، اس زندگی میں آپ پہ صلوٰۃ وسلام بلا ریب روح مع الجسد پہ پیش ہوتا تھا۔ اس حیات میں یہ تصور بھی نہیں کہ روح اور جسم کبھی ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں۔ اس پہ یہ سوال یہ پیدا ہوا کہ بعد الوفات یہ عرض صلوٰۃ وسلام صرف روح مجرد پہ ہوگا یا بدستور روح مع الجسد ہی پہ پیش ہوتا رہے گا۔ آنحضرت کا ارشاد فان صلوٰتکم معروضة عليّ جملہ اسمیہ میں ہے۔ صحابہؓ نے جب اس استمرار پہ متعجب ہو کر قبل الوفات اور بعد الوفات میں فرق معلوم کرنا چاہا، تو آپ نے ہر دو میں فرق کرنے کے بجائے ایک اصولی بات بتادی کہ پیغمبروں کی وفات کے بعد وہ حالت نہیں ہوتی جو عام دوسرے انسانوں کی ہوتی ہے۔ آپؐ نے جو کچھ فرمایا، وہ اسی کا جواب تھا۔

ارشاد ہوا۔

"زمین پہ حرام ہے کہ انبیاء کے جسموں کو مٹی بنائے۔"

گویا آپ نے قبل الوفات اور بعد الوفات کے عرض صلوٰۃ وسلام کو برابر رکھا۔ اب ظاہر ہے کہ قبل الوفات یہ عرض صلوٰۃ وسلام روح مع الجسد پہ پورے شعور سے ہوتا تھا۔ پس اس یقین سے چارہ نہیں کہ بعد الوفات بھی یہ عرض صلوٰۃ وسلام روح الجسد پہ پورے ادراک وشعور سے ہو رہا ہے، ورنہ بنائے سوال اور جواب میں کوئی تطابق نہیں رہتا۔

(۲) ——— آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ "زمین پہ حرام ہے کہ انبیاء کے جسموں کو مٹی بنائے" صرف ارمت (آپ مٹی میں گھل چکے ہوں گے) کے مقابلہ میں نہیں، بلکہ کیف تعرض صلوٰتنا علیک کے جواب میں ہے۔ یعنی ارشادِ نبوت صرف یہ نہیں کہ انبیائے کرام کے اجسادِ مطہرہ مٹی کے ساتھ مٹی نہیں ہوتے۔ بلکہ آپ کا منشاء یہ ہے کہ انبیائے کرام کے اجسادِ مطہرہ اس طرح محفوظ ہوتے ہیں کہ اُن پہ صلوٰۃ وسلام برابر پیش ہوتا رہتا ہے۔ اس لیے کہ اصل سوال یہ تھا:۔

کیف تعرض صلوٰتنا علیک وقد ارمت۔

ترجمہ۔ ہمارا درود آپ پر کیسے پیش کیا جائے گا جب کہ آپ مٹی میں گھل چکے ہوں گے۔

ظاہر ہے کہ یہاں جواب میں یہ مُراد ہرگز نہیں کہ اجسامِ مطہرہ صرف اس طرح محفوظ ہیں کہ اپنی اپنی قبور میں محض بے حس وشعور پڑے ہیں، بلکہ منشائے رسالت میں ایسی محفوظیت مراد ہے کہ ان پہ صلوٰۃ وسلام پیش ہو سکے۔ اگر اجسادِ محفوظہ پہ صلوٰۃ وسلام پیش نہ ہوتا ہو اور انہیں اس صلوٰۃ وسلام کا بالکل شعور نہیں ہوتا۔ تو حدیث کے دونوں جملوں میں کوئی ربط نہیں رہتا۔ سوال و جواب کا اقتضاء یہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جسدِ اطہر محض بے حس وشعور اگر ما محفوظ نہ ہو، اس میں ایسی حیات ہو کہ اس پہ صلوٰۃ وسلام پیش ہو سکے۔

(۳) ——— صحابہ کرامؓ کے سوال میں "ارمت"، اور اس کے جواب میں "اجساد الانبیاء" کے اطلاقات قطعاً اور یقیناً اس دنیا والے جسدِ عنصری سے متعلق ہیں۔ یہاں اس شبہ کی قطعاً

گنجائش نہیں کہ شاید اجسادِ مثالیہ مراد ہوں پس اس یقین سے چارہ نہیں کہ اب صلوٰۃ وسلام روضۂ منورہ کے اسی جسدِ عنصری پر پیش ہو رہا ہے جس پہ ورودِ موت ہوا تھا اور جسے صحابہؓ نے دفن کیا تھا جسدِ اطہر وہاں مع الروح ہے، تو عرضِ صلوٰۃ وسلام کا محل بنا ہوا ہے محض بے جان جسم پہ درود پیش کرنے کا تو کوئی معنی ہی نہیں. اگر اس کا کچھ امکان ہوتا کہ بے جان بدن یا اجزائے بدن پر بھی عرضِ صلوٰۃ وسلام ہو سکے تو صحابہ کرامؓ کبھی یہ سوال پیدا نہ کرتے۔

كيف تعرض صلوٰتنا عليك وارمت.

اور اگر بے جان بدن پر ہی یہ عرضِ صلوٰۃ وسلام ہے، تو پھر سارے بدن کے یک جا ہونے یا ذراتِ بدن کے منتشر ہونے میں کیا فرق ہے. پھر اتنے اہتمام سے کیوں کہا گیا کہ انبیاء کے اجساد محفوظ رہتے ہیں، مٹی نہیں ہوتے. فتفكر فان ذلك من مدارك الاذكياء.

مولانا محمد بشیر قنوجیؒ تفہیم المسائل فارسی ص۸۵ پہ اس حدیث حفظِ اجساد سے اسی طرح استدلال فرما رہے ہیں.

کثیفہ

بعض حیران کن واقعات یا تصورات جب لطفِ طبع کے لیے کہے یا سنے جاتے ہیں، تو انہیں لطیفہ کہتے ہیں۔ ایسے لطائف اچھے جاسے ذوقِ طبع کا سامان ہوتے ہیں. لیکن ایسے ہی بعض اوقات جہالت کی انتہا، نظر کے فریب یا تاویل کے فساد کو بھی علمی لطیفوں کے طور پہ ذکر کر دیتے ہیں. جو واقعہ ہم عرض کرنا چاہتے ہیں وہ بھی فسادِ تاویل کی انتہائی مثال ہے. چونکہ اُسے نقل کرنے میں بھی طبیعت پہ گرانی ہوتی ہے، اس لیے اسے لطیفہ کے بجائے کثیفہ کے عنوان سے ذکر کیا جاتا ہے.

پچھلے چند ماہ کا واقعہ ہے، ایک تقریب کے سلسلہ میں ضلع کیمبل پور جانا ہوا، وہاں چند روز پہلے کے ایک جلسہ کی روئیداد بعض لوگوں سے سُننے کا اتفاق ہوا. ایک عالم نے اس حدیث پہ بحث

کرتے ہوئے بیان فرمایا کہ قبور میں اجساد کا محفوظ رہنا نبوت صادقہ کی علامت ہے۔ سچے مدعی نبوت اور
اور جھوٹے مدعی نبوت کا اس طرح سے پتہ چل سکتا ہے کہ قبر کھول کر دیکھ لو، جھوٹے مدعی کی لاش گل سڑ
کر ریزہ ریزہ ہو چکی ہوگی اور سچے پیغمبر کا جسد بالکل محفوظ ہوگا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد
فرمانا کہ مذزمین پر حرام ہے کہ پیغمبروں کے جسموں کو کھائے، سچے اور جھوٹے نبیوں کا امتیاز کرنے کے
لیے تھا۔ (معاذ اللہ) اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ قبروں کو کھول کر سچے نبیوں کی پہچان ہوتی ہے،
اس کے سوا ان کی صداقت کا کوئی نشان نہیں۔ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ۔

اگر یہ بیانِ دلفگار صحیح ہے تو غور کیجیے کہ کس طرح منشائے نبوت کو مسخ کرنے کی کس طرح
بے باک کوشش کی گئی ہے۔ ارشادِ نبوت کو سیاق و سباق سے بے نیاز کر لے اور اسے ایسا معنی
پہنانے پر، جو آج تک کسی شارحِ حدیث کو نہیں سوجھے، حیرت در حیرت ہوتی ہے۔

الا یا قومنا انتبهوا فانا
نحاسب فی القیمة غیر شك

اگرچہ یہ ارشادِ نبوت اجسادِ انبیاء کی محفوظیت ——— ایسی محفوظیت کہ اس پر صلوٰۃ
وسلام پیش ہو سکے ——— اور ایسا صلوٰۃ وسلام پیش ہونا جیسا کہ قبل الوفات ہوتا تھا یعنی
روح و جسد کے مجموعہ پر ——— پر دلیل ناطق اور شاہدِ صادق ہے ——— تاہم تائیدِ مزید
کے لیے یہ بھی سنیئے:۔

تائیدِ مزید

سنن ابن ماجہ میں حضرت ابو الدرداء سے یہ روایت اس طرح منقول ہے کہ حضور انور صلی اللہ
علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

ان اللہ حرم علی الارض ان تاکل اجساد الانبیاء فنبی اللہ حیّ یرزق۔[1]

---

[1] ابن ماجہ ص۱۱۹

ترجمہ۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کر دیا ہے کہ انبیاء کے جسموں کو مٹی بنائے پس اللہ کا پیغمبر زندہ ہوتا ہے اور اُسے رزق بھی ملتا ہے۔

لیجئے، جو مضمون حضرت اوس بن اوسؓ کی روایت سے اس طرح ثابت ہوتا تھا:۔

فان صلوٰتکم معروضۃ علی ← بنائے سوال کیف تعرض صلوتنا علیک وقد ارمت۔

ان اللہ حرم علی الارض اجساد الانبیاء ← جواب برائے صورت عرض صلوٰۃ و سلام بعد الوفات۔

نتیجہ ← بعد الوفات حیات جسمانی

حضرت ابو الدرداءؓ کی روایت میں وہی نتیجہ خود الفاظِ نبوت بن کر سامنے آگیا۔

فنبی اللہ حیّ یرزق ← اللہ کا پیغمبر زندہ ہوتا ہے اور اُسے رزق بھی دیا جاتا ہے۔

اس جزو کے متعلق بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہ مدرج من الراوی ہے۔ محدثین میں سے کسی نے یہ تصریح نہیں کی۔ یہ ادعاء اور حکم ادراج کہاں تک صحیح ہے۔ یہ اس کی تفصیل کا موقع نہیں۔ ہمیں صرف یہ بتانا ہے کہ انبیاء کے اجسادِ مطہرہ کے محفوظ ہونے اور اُن پر صلوٰۃ و سلام کے پیش ہوتے رہنے سے، حیاتُ النبیؐ کا جو استدلال ہم نے پیش کیا ہے، وہ دوسری روایت میں بعینہٖ جزوِ حدیث کے طور پر موجود ہے اور اگر یہ راویِ حدیثؒ کی اپنی تفسیر اور ادراج ہے تو بھی اس میں ہماری ہی تائید ہے کہ حدیثِ لفظ اجساد کا اس کے پورے سیاق و سباق کے ساتھ جو مطلب ہم نے سمجھا تھا، اس حدیث کے روایت کرنے والے بھی وہی مطلب لے رہے ہیں مقامِ تعجب ہے کہ اجساد الانبیاء کے واضح سیاق کے باوجود فنبی اللہ حی یرزق کا مطلب یوں بیان کیا جائے کہ اس میں مطلق حیات کا ثبوت ہے۔ حیاتِ جسدی کا اس سے کوئی تعلق نہیں علمی دُنیا میں اس سے بڑا ظلم کیا ہوگا۔[1]

---

[1] کما یظہر من صنیع صاحب السیرۃ المحمدیۃ وراجع لہ صنہ

والبغی یصرع اھلہ　　والظلم مرتعہ الوخیم

حضرت ابوالدرداءؓ کی یہ روایت ایک اور سلسلہ اسناد سے بھی طبرانی میں موجود ہے۔[۱]

رجال اسناد روایت ابی الدرداءؓ

(۱) حافظ ابن حجر عسقلانیؒ ـــــ قلت رجالہ ثقات (تہذیب جلد ۳ صـ ۲۹۸)

(۲) الحفنی حاشیہ عزیزی شرح جامع صغیر ـــــ رجالہ ثقات (السراج المنیر جلد ۱ صـ ۲۹۰ مصر)

(۳) ملا علی قاریؒ ـــــ باسناد جید نقلہ میرک عن المنذری ولہ طرق کثیرۃ بالفاظ مختلفہ (مرقات جلد ۳ صـ ۲۴۲)

(۴) قال الدمیری رجالہ ثقات. (فیض القدیر للمناوی جلد ۲ صـ ۸۷)

(۵) رواہ ابن ماجہ برجال ثقات (زرقانی شرح مواہب جلد ۵ صـ ۲۳۶)

(۶) قال المنذری. اسنادہ جید (ترجمان السنۃ جلد ۳ صـ ۱۹۷)

(۷) علامہ سمہودیؒ ـــــ رواہ ابن ماجہ باسناد جید. (خلاصۃ الوفاء صـ ۴۸)

(۸) قاضی شوکانی یمنیؒ ـــــ اخرج ابن ماجۃ باسناد جید (نیل الاوطار جلد ۳ صـ ۲۱۰)

(۹) مولانا شمس الحق عظیم آبادیؒ ـــــ باسناد جید. (عون المعبود جلد ۱ صـ ۴۰۵)

(۱۰) تنقیح الرواۃ صـ ۲۵۵ باسناد جید (وترکنا البقایا مخافۃ التطویل)

تلک عشرۃ کاملہ.

---

[۱] جلاء الافہام لابن القیمؒ صـ ۵۰)

الفصلُ الاوّل

وفيه ستّة من المباحث

المبحث الاوّل : احوالِ رُواة حدیث اَوس بن اَوس رضی اللہ عنہ

پہلا راوی جس پر تمام ائمہ حدیث کا اشتراک ہو جاتا ہے، حسین بن علی الجعفی ہے، اس کے بعد عبدالرحمٰن بن یزید بن جابر، پھر ابوالاشعث صنعانی اور ان کے بعد حضرت اوس بن اوس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں۔ اندریں صورت صرف حسین بن علیؒ، عبدالرحمٰن اور ابوالاشعث کے مختصر تراجم پیش کیے جاتے ہیں۔

حسین بن علی ــــــ ثقہ عابد۔ (تقریب ص۱۱۳، کشف الاستار ص۲۷)

عبدالرحمٰن بن یزید

عبدالرحمٰن بن یزید دو ہیں، ایک عبدالرحمٰن بن یزید بن تمیم۔ دوسرے عبدالرحمٰن بن یزید بن جابر۔ ابن تمیم کو ضعیف کہا گیا ہے، لیکن ابن جابر ثقہ اور قوی ہے۔ اس حدیث کے سلسلۂ اسناد میں عبدالرحمٰن بن یزید بن جابر ہے، ابن تمیم نہیں بعض حضرات نے ان اسانید کو دیکھ کر جہاں صرف عبدالرحمٰن بن یزید تھا، اُسے ابن تمیم سمجھ لیا اور حدیث کی تضعیف کر دی۔ حالانکہ ابوداؤد اور نسائی

---

[1] قال ابوداؤد حدثنا هارون بن عبد الله اخبرنا حسين ابن علی (جلد ۱ ص۱۵۰) قال النسائی اخبرنا اسحق بن منصور قال حدثنا حسين ابن علی (جلد ۱ ص۱۵۴) قال احمد حدثنا حسين بن علی (ابن کثیر جلد ۳ ص۵۱۴) قال ابن ماجه. حدثنا ابوبکر بن ابی شيبة حدثنا حسين بن علی (ص۱۱۹) قال ابن خزيمه حدثنا ابوكريب حدثنا حسين بن علی حدثنا عبد الرحمٰن (جلاء الافهام لابن القيم ص۳۶)

کے متن میں ابن جابر کی تصریح موجود ہے۔

نہایت افسوس کا مقام ہے کہ بعض لوگ ان دونوں کو خواہ مخواہ غلط ملط کر رہے ہیں۔ جن لوگوں کی رسائی اصل کتبِ حدیث تک نہیں ہوتی، ان کی ناواقفیت کا ناجائز فائدہ اٹھا کر انہیں مغالطہ میں ڈال دیا جاتا ہے۔ پھر یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ نچلے راوی حسین بن علی نے یوں ہی ابن جابر کہہ دیا ہے۔ (معاذاللہ، استغفراللہ) ضد اور تعصب نے یہاں تک پہنچا دیا ہے کہ ہر صداقت مشتبہ نظر آتی ہے ؎

وقد ترکتنی لا اعی لمحدثٍ

حدیثاً وان ناجیته و نجانی

سنیئے، حافظ ابن قیم فرماتے ہیں:۔

وقولھم ان ظن انه ابن جابر وانما ھو ابن تمیم وغلط فی اسم جدہ بعید فانه لم یکن یشتبه علی حسین ھذا بھذا انقدہ و علمه بھما و سماعه منھما۔[1]

ترجمہ بعض لوگوں کا یہ گمان کہ یہ راوی ابن تمیم ہے، اسے ابن جابر کہنے میں غلطی ہوگئی ہے، صحیح نہیں۔ حسین بن علی جیسے راوی حدیث پہ ایسا شک بہت بعید ہے۔ حسین بن علی کا معیار تنقید اور دونوں عبدالرحمٰن نامی راویوں کو ذاتی طور پہ جاننا اور ان سے سننا ہرگز اشتباہ کی گنجائش نہیں دیتا۔

رایت الدارقطنی قد ذکر ذٰلك نصاً۔[2]

ترجمہ میں نے دیکھا ہے کہ دارقطنی نے اسے بطور نص ذکر کیا ہے۔

عبدالرحمٰن بن یزید بن جابر نے مکحول، زہری، عطیہ بن قیس، عمیر بن ہانی، ابوالاشعث، صنعانی اور عطاء خراسانی سے احادیث سنیں اور ان سے اُن کے بیٹے عبداللہ، حسین بن علی الجعفی

---

[1] جلاء الافہام ص۴۵ [2] ایضاً ص۴۸

اور دوسرے کئی لوگوں نے روایات لیں، آپ امیر المومنین فی الحدیث حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کے بھی شیخِ حدیث تھے۔[1]

امام یحییٰ بن معین، ابن سعد، امام نسائی اور دوسرے کئی محدثین نے عبدالرحمٰن بن یزید بن جابر کو ثقہ قرار دیا ہے۔[2]

ابن المدینی کہتے ہیں کہ یہ صحابہؓ کے بعد فقہائے شام کے دوسرے طبقہ میں سے تھے یعقوب بن سفیان کہتے ہیں کہ جابر کے بیٹے عبدالرحمٰن اور یزید دونوں ثقہ ہیں۔

ابو داؤد کہتے ہیں "هو من ثقات الناس" اُن کے بیٹے ابو بکر نے کہا ہے "ثقة مامون" ابو حاتم کہتے ہیں "صدوق لا بأس به ثقة"۔[3]

وفات ۱۵۳ھ، عمر تقریباً ۸۴ سال۔ ابن جابر کے اساتذہ میں ابو اللیث الصنعانی کا اسم گرامی ذکر ہو چکا۔ یہی استاد اس حدیث حفظِ اجسادِ انبیاء کو روایت کر رہے ہیں۔ ابن تمیم کے اساتذہ میں کہیں ابو الاشعث کا نام نہیں ملتا۔[4]

پیشِ نظر رہے کہ وہ شخص جسے عبدالرحمٰن بن یزید کے دادا کے نام پر اشتباہ ہوا اور ابن تمیم کے بجائے ابن جابر کہہ گیا تھا، درحقیقت ابُو اسامہ ہے، حسین بن علی نہیں۔ اس پر عللِ رجال کے ماہرِ فن دارقطنیؒ نے نص فرمائی ہے۔

خلاصۂ کلام یہی ہے کہ یہ عبدالرحمٰن بن یزید بن جابر ہے اور ثقہ صدوق راویِ حدیث ہے۔ مقامِ افسوس ہے کہ وہ لوگ، جو طبقاتِ رواۃ اور عللِ رواۃ پر نظر نہیں رکھتے۔ از خود جرح و تعدیل میں امام بن بیٹھتے ہیں۔

ابو الاشعث الصنعانی ——— شراحیل بن آدہ

ثقة من الثانية شهد فتح دمشق۔[5]

---

[1] جلاء الافہام ص۴۷ [2] تہذیب جلد ۶ ص۲۹۸ [3] ایضاً جلد ۶ ص۲۹۸
[4] دیکھیے تہذیب التہذیب جلد ۱۰ ص۲۱۵ [5] تقریب التہذیب ص۲۲۱

ثقہ راوی ہیں۔[۱]

امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ نے اُن سے احتجاج کیا ہے عجلی انہیں ثقہ کہتے ہیں۔ ابن حبان نے بھی آپ کو ثقات میں لکھا ہے۔[۲]

المبحث الثانی

صرف راویوں کی ہی توثیق اور اُن کا باہمی اتصال نہیں۔ ائمہ فن جس حدیث کو صحیح قرار دے دیں، ہم راویوں کی بحث میں گئے بغیر بھی اُن پر اعتماد کریں گے۔ ہر فن میں اس فن کے ائمہ کی پیروی کی جاتی ہے۔ یہاں بھی آپ دیکھیں کن کن ائمہ کبار اور محدثین کرام نے اس حدیث کی تصحیح کی ہے اور اُسے قبول کیا ہے۔ ہم صرف ۳۲ ناموں پر اکتفا کرتے ہیں۔ ورنہ اُسے قبول کرنے والے ائمہ علم کی تعداد سَو سے متجاوز ہے:۔

۱۔ امام احمد (۲۴۱ھ) ۲۔ امام ابوداؤد (۲۷۵ھ) ۳۔ امام نسائی (۳۰۳ھ) ۴۔ امام ابن خزیمہ (۳۱۱ھ) ۵۔ ابن حبان (۳۵۴ھ) ۶۔ دارقطنی (۳۸۵ھ) ۷۔ امام بیہقی (۴۵۸ھ) ۸۔ حاکم (۴۰۵ھ) ۹۔ ابونعیم الاصفہانی (۴۳۰ھ) ۱۰۔ بغوی (۵۱۶ھ) ۱۱۔ نووی (۶۷۶ھ) ۱۲۔ ابن وحیہ (ھ) ۱۳۔ علامہ منذری (۶۵۶ھ) ۱۴۔ حافظ عبدالغنی النابلسی (۱۱۴۳ھ) ۱۵۔ حافظ ابن کثیر (۷۷۴ھ) ۱۶۔ حافظ ابن تیمیہ (۷۲۸ھ) ۱۷۔ حافظ ابن القیم (۷۵۱ھ) ۱۸۔ خطیب تبریزی (۷۴۲ھ) ۱۹۔ حافظ ذہبی (۷۴۸ھ) ۲۰۔ حافظ ابن حجر عسقلانی (۸۵۲ھ) ۲۱۔ حافظ عینی (۸۵۵ھ) ۲۲۔ حافظ سخاوی (۹۰۲ھ) ۲۳۔ علامہ سبکی (۷۷۱ھ) ۲۴۔ علامہ ابن عبدالہادی (۷۴۴ھ) ۲۵۔ علامہ طیبی ۲۶۔ علامہ سمہودی (۹۱۱ھ) ۲۷۔ امام ملا علی قاری (۱۰۱۴ھ) ۲۸۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی (۱۰۵۱ھ) ۲۹۔ قاضی شوکانی (۱۲۵۰ھ) ۳۰۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (۱۱۷۶ھ) ۳۱۔ شاہ اسمٰعیل شہیدؒ (۱۲۴۶ھ) ۳۲۔ حجۃ الاسلام علامہ انور شاہ کشمیری (۱۳۵۱ھ) وغیرہم من الاکابر رحمہم اللہ تعالیٰ۔

---

[۱] کشف الاستار عن رجال معانی الآثار صفحہ ۱۱۹ [۲] دیکھئے تہذیب التہذیب جلد ۴ صفحہ ۳۱۹

ان سب حضرات کی عبارات پیش کرنے کی گنجائش نہیں، تاہم بعض عبارات پیشِ خدمت ہیں:۔

حوالجات از بعض حوالجات

① شیخ الاسلام حافظ ذہبیؒ

تلخیص المستدرک للعلامة الذہبی «علی شرط البخاری»[1]

② حضرت امام نوویؒ

روینا فی سنن ابی داؤد والنسائی وابن ماجه بالاسانید الصحیحة عن اوس بن اوسؓ قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم.... الحدیث[2]

علامہ منذری نے اسے حسن الاسناد قرار دیا ہے[3]

اس حدیث کے کئی طرق ہیں جنہیں علامہ منذری نے جمع کیا ہے جن سے حدیث بہت قوی ہو جاتی ہے۔ وللحدیث طرق جمعها المنذری فی جزء فتعدد الطرق یشد بعضها بعضاً۔[4]

علامہ نابلسی فرماتے ہیں حسن صحیح[5]

③ خاتمة الحفاظ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ

الف: ورد الامر باکثار الصلوٰة علیه الجمعة من حدیث اوس بن اوسؓ وهو عند احمد وابی داؤد وصححه ابن حبان۔[6]

ب: ورد الامر باکثار منها یوم الجمعة فی حدیث صحیح کما تقدم۔[7]

ج: عند ابی داؤد والنسائی وصححه ابن خزیمة وغیرہ عن اوس بن اوس رفعه۔[8]

---

[1] تلخیص المستدرک جلد ۱ ص۲۷۸، جلد ۴ ص۵۶۰ [2] کتاب الاذکار کتاب الصلوٰة علی رسول الله ص۹۸ ، [3] القول البدیع للسخاوی ص۱۱۹ [4] تنقیح الرواة جلد ۱ ص۲۵۵ [5] ترجمان السنة جلد ۱ ص۲۹۷ [6] فتح الباری جلد ص مصر پ۲۲ کتاب الدعوات ص۱۰۵ دہلی [7] فتح الباری پ۲۶ ص۸۷ [8] کتاب الانبیاء ص۱۹۸ ج۶

④ شیخ الاسلام علامہ عینیؒ

الف: صح عنہ صلی اللہ علیہ وسلم ان الارض لا تأکل اجساد الانبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام۔[1]

ب: وھو الیوم راى والحال انہ الیوم ، کما وضع لان الارض لا تاکل اجساد الانبیاء علیہم السلام۔[2]

⑤ حافظ ابن کثیرؒ

قد صحح ھذا الحدیث ابن خزیمۃ وابن حبان والدار قطنی و النووی فی الاذکار۔[3]

ان پانچوں حوالوں کا خلاصہ یہی ہے کہ حضرت اوس بن اوسؓ کی یہ روایت کہ انبیائے کرام کے جسموں کو اللہ تعالیٰ نے مٹی پر حرام کر دیا ہے اور یہ کہ ان پر صلوٰۃ وسلام پیش ہوتا رہتا ہے، بالکل صحیح الاسناد ہے اور یقیناً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا ارشاد ہے۔

⑥ حافظ ابن قیمؒ

ومن تأمل ھذا الاسناد لم یشک فی صحتہ لثقۃ رواتہ وشھرتھم وقبول الائمۃ حدیثھم۔[4]

ترجمہ: اور جس نے بھی اس حدیث کی سند میں غور کیا، اُسے اس حدیث کی صحت میں کوئی شک نہ رہا، کیونکہ اس کے سب راوی ثقہ اور مشہور ہیں اور ائمہ حدیث نے ان سب کی روایات قبول کی ہیں۔

قد صح عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان الارض لا تاکل اجساد الانبیاء . . . الی غیر ذلک مما یحصل من جملتہ القطع بان موت الانبیاء انما

---

[1] عینی علی البخاری جلد ۶ صد ۶۹ [2] بنایہ جلد ۱ صد ۱۰۹۲ [3] تفسیر ابن کثیر جلد ۳ صد ۵۱۴
[4] جلاء الافہام صد ۴۴

ھو راجع الی ان غیبوا عنا بحیث لا ندرکھم وان کانوا موجودین احیاء۔[1]

ترجمہ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح طور پر ثابت ہو چکا ہے کہ زمین انبیائے کرام کے جسموں کو نہیں کھاتی۔ ایسے دلائل سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ انبیائے کرام کی موت کا معنی یہ ہے کہ وہ ہم سے اس طرح غائب کر لیے گئے ہیں کہ ہم ان کا ادراک نہیں کرتے، ورنہ وہ تو موجود اور زندہ ہیں۔

⑦ علامہ ابن عبد الہادی (۷۴۴ھ)

حدیث صحیح لان رواتہ کلھم مشھورون بالصدق والامانۃ والثقۃ والعدالۃ ولذلک صححہ جماعۃ من الحفاظ کابی حاتم بن حبان والحافظ عبد الغنی المالکی وابن دحیہ وغیرھم ولم یات من تکلم فیہ وعللہ بحجۃ بینۃ۔[2]

ترجمہ۔ یہ حدیث صحیح ہے کیونکہ اس کے سب راوی صدق و امانت اور عدالت میں مشہور ہیں۔ حفاظ حدیث کی ایک جماعت نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور کسی شخص نے اس حدیث پر کوئی مدلل اعتراض نہیں کیا۔

⑧ امام الحدیث والفقہ ملا علی قاری علیہ رحمۃ ربہ الباری

قال میرک ورواہ ابن حبان فی صحیحہ والحاکم وصححہ وزاد ابن حجر بعولہ وقال صحیح علی شرط البخاری ورواہ ابن خزیمۃ فی صحیحہ قال النووی اسنادہ صحیح وقال المنذری لہ علۃ دقیقۃ[3] اشار الیھا البخاری نقلہ میرک قال ابن دحیۃ انہ صحیح بنقل العدل

---

[1] کتاب الروح ص۴۳ [2] الصارم المنکی ص۱۷۸ [3] یہ علت غالباً عبد الرحمن بن یزید کے ابن تمیم یا ابن جابر ہونے کی وجہ سے ہے۔ حق یہ ہے کہ یہ عبد الرحمن بن یزید بن جابر ہے، ابن تمیم نہیں، جو محل جرح تھا۔ پس سند بالکل بے غبار رہی۔ واجاب الحافظ عما ذکر فیہ من العلۃ وراجع لہ جلاء الافہام ص۲۵، ص۲۶

عن العدل ومن قال انه منکر او غریب بعلۃ خفیۃ فقد استروح لان الدار قطنی ردھا۔[1]

یعنی جس شخص نے اس حدیث کو "منکر" یا "غریب ومعلل" کہا ہے، اس نے نہایت بچر بات کہی، کیونکہ امام دار قطنی جیسے ماہرِ فن نے اس علت کو مردود قرار دیا ہے۔

(۹) شیخ عبدالحق محدث دہلوی

در حدیثِ صحیح آمدہ است کہ بسیار گوئید در روزِ جمعہ درود بر من زیرا کہ صلوٰۃ شما معروض مے گردد بر من۔ ازیں جا معلوم مے شود کہ حیاتِ انبیاء حیاتِ جسمی دُنیاوی است نہ بمجرد بقائے ارواح۔[2]

ترجمہ: صحیح حدیث میں آیا ہے کہ جمعہ کے دن مجھ پر کثرت سے درود پڑھا کرو کیونکہ تمہارا درود مجھ پر پیش کیا جاتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء کی حیات اس دُنیا والے جسم سے ہے نہ کہ فقط ارواح کے زندہ رہنے سے۔

(۱۰) حافظ عبدالغنی النابلسی

قال الحافظ عبد الغنی النابلسی انہ حسن صحیح۔[3]

(۱۱) خاتم المحدثین حضرت العلامہ محمد انور شاہ کشمیری

ومما کفر بہ الفقہاء الحجاج[4] ...... لان فی ھذا الکلام تکذیبا لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نعوذ باللہ من اعتقاد ذلک فانہ صح عنہ صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال ان اللہ عزوجل حرم علی الارض ان تأکل اجساد الانبیاء رواہ ابوداؤد۔[5]

---

[1] مرقات جلد ۲ ص ۲۱۱ مصر [2] مدارج النبوت جلد ۲ ص ۹۲ [3] ترجمان السنۃ جلد ۳ ص ۲۹۷ [4] وراجع لہ الکامل للمبرد جلد ۱ ص ۱۹۰ بحاشیہ الدکتور زکی مبارک جلد ۱ ص ۱۵۳، ص ۱۵۴ بحاشیہ ابراھیم [5] خزائن الاسرار ص ۱۹

ترجمہ۔ فقہائے کرام نے جن وجوہ کی بناء پر حجاج کی تکفیر کی تھی، ایک اُن میں سے اس ارشادِ پیغمبر کی تکذیب بھی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے زمین پہ حرام کر دیا ہے کہ انبیاء کرام کے جسموں کو کھائے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح طور پہ ثابت ہو چکی ہے اور اسے ابو داؤد نے روایت کیا ہے۔

ایک سوال اور اُس کا جواب

ابن عربی (۵۴۳ھ) کہتے ہیں یہ حدیث ثابت نہیں۔ اُن کے ذہن میں غالباً یہ بات ہوگی کہ اس حدیث کا مرکزی راوی عبدالرحمٰن بن یزید بن تمیم ہے جو منکر الحدیث ہے۔ امام بخاری اُسے عبدالرحمٰن بن یزید بن جابر نہیں مانتے؟

جواب: آپ یہ بھی تو دیکھیں کہ اس روایت میں عبدالرحمٰن بن یزید کس سے روایت کر رہا ہے؟ ابو الاشعث الصنعانی سے —— اب آپ دیکھیں کہ ابو الاشعث عبدالرحمٰن بن یزید بن جابر کے اساتذہ میں مذکور ہے یا عبدالرحمٰن بن یزید بن تمیم کے اساتذہ میں —— ہم پہلے کہہ آئے ہیں کہ ابن تمیم کے اساتذہ میں کہیں ابو الاشعث کا نام نہیں ملتا۔

دارقطنی نے امام بخاری پر کئی تعقبات کئے ہیں اور ان کی بعض آراء کی سختی سے تردید کی ہے۔ امام بخاری کا جو معیار صحیح بخاری میں ہے وہ ان کی دوسری کتابوں میں نہیں۔ یہ بات کہ یہ راوی ابن تمیم ہے ابن جابر نہیں، صحیح بخاری میں نہیں۔ ابن عربی نے غالباً اسے اُن کی تاریخِ کبیر سے لیا ہوگا۔ حسین بن علی جیسے ناقد سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی، کہ اُن پہ اُن کا استاد ہی مشتبہ رہے کہ وہ ابن جابر ہے یا ابن تمیم —— امام دارقطنی نے امام بخاری کی اس رائے کی تردید کی ہے۔

شارحِ صحیح بخاری حافظ ابن حجر نے فتح الباری کتاب الانبیاء میں امام بخاری کی غلط فہمی کا پورا تعاقب کیا ہے۔ خطیب بغدادی (۴۶۳ھ) بھی اس بحث میں دارقطنی کے ساتھ ہیں —— حافظ سخاوی (۹۰۲ھ) لکھتے ہیں:-

لکن قد رد هذه العلة الدارقطنی وقال ان سماع حسین عن ابن جابر ثابت والی هذا جنح الخطیب.[1]

ترجمہ. لیکن اس علت کو دارقطنی نے تسلیم نہیں کیا وہ کہتے ہیں حسین کا سماع ابن جابر سے ثابت ہے اور خطیب بغدادی بھی اسی طرف جھکے ہوتے ہیں۔

المبحث الثالث

ان بزرگوں کی عبارات، جنہوں نے اس حدیث کا مطلب روضۂ منورہ کی حیات یقین کیا ہے

نہ من تنہا دریں مے خانہ مستم   جنید و شبلی و عطار ہم مست

۱. شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ. ۲. حافظ ابن القیمؒ. ۳. علامہ طیبیؒ. ۴. علامہ سید جمال الدین ۵. علامہ سندھیؒ. ۶. امام ملا علی قاریؒ. ۷. شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ. ۸. قاضی شوکانیؒ ۹. شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسنؒ. ۱۰. حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ وغیرہم من الاکابرؒ.

پیش نظر ہے کہ ان حوالجات سے ان ائمہ و اکابر کے اپنے اپنے مذہب بیان کرنا مقصود نہیں، بلکہ ارشادِ نبوت کا صحیح مفہوم متعین کرنے کے لیے یہ اہلِ فن کی وہ بے لاگ شہادتیں ہیں جن کے مقابلے میں کسی احتمالِ ثانی کی گنجائش نہیں.

(۱) آنحضرتؐ کے ارشاد پر کہ "تمہارا درود مجھ پر پیش کیا جاتا ہے"، صحابہ کرامؓ کا یہ سوال کہ "بعد الوفات یہ کیسے پیش ہوگا"، اور اس پر آپ کا یہ جواب کہ وفات کے بعد پیغمبروں کے جسموں کے ساتھ عام دوسرے انسانوں جیسا معاملہ نہیں ہوتا. یعنی وہ اس طرح محفوظ رہتے ہیں کہ اُن پہ صلوٰۃ وسلام پیش ہوتا رہتا ہے۔ ان تمام امور کا تذکرہ کرتے اور سوال و جواب کے باہمی ربط کو حل کرتے ہوئے علامہ طیبیؒ اس حدیث کا نتیجہ یوں بیان کرتے ہیں :-

---

[1] القول البدیع صـ۱۱۹

ویؤیدہ ما یرد فی الحدیث الثالث قولہ فنبی اللہ حی یرزق۔[1]

ترجمہ۔ حدیث حفظِ اجسادِ انبیاء کے اس مطلب کی تائید میں دوسری حدیث میں صریح الفاظ بھی مل جاتے ہیں کہ اللہ کا پیغمبر زندہ ہوتا ہے اور اسے رزق بھی ملتا ہے۔

(۲) عمدۃ المحققین حضرت علامہ سندھیؒ حاشیہ نسائی میں اس حدیث حفظِ اجسادِ انبیاء پر رقمطراز ہیں:۔

والجواب بقولہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ حرم علی الارض اجساد الانبیاء کنایۃ عن کون الانبیاء احیاء فی قبورہم۔[2]

ترجمہ۔ آنحضرتؐ کا یہ ارشاد فرمانا کہ اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کر دیا ہے کہ پیغمبروں کے جسموں کو کھائے، یہ اس کا کنایہ ہے کہ انبیائے کرام اپنی اپنی قبروں میں زندہ ہوتے ہیں۔

(۳) شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ:۔

قال اکثروا علی من الصلوٰۃ یوم الجمعۃ فان صلوٰتکم معروضۃ علی فقالوا کیف تعرض صلوٰتنا علیک وقد ارمت ای بلیت قال ان اللہ حرم علی الارض ان تأکل اجساد الانبیاء فاخبر انہ یسمع الصلوٰۃ من القریب ویبلغ ذٰلک من البعید۔[3]

ترجمہ۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ جمعہ کے دن مجھ پر کثرت سے درود پڑھا کرو، کیونکہ تمہارا درود مجھ پر پیش ہوگا۔ آپ نے فرمایا کہ پیغمبروں کے جسموں کو مٹی بنانا زمین پر حرام ہے اور اس حدیث میں حضورؐ نے یہی بات بتلائی ہے کہ آپ قبر کے قریب پڑھے جانے والے درود کو خود سنتے ہیں اور دور کا پڑھا ہوا درود (بتوسطِ ملائکہ) پہنچایا جاتا ہے۔

---

[1] طیبی شرح مشکوٰۃ ص ۸۲ [2] حاشیہ نسائی جلد ۱ ص ۱۵۵ دہلی [3] رسائل ابن تیمیہ الکلام فی مناسک الحج ص ۲۹۱ ج ۱۲

تنبیہ

یہاں فاخبر انہ یسمع الصلوٰۃ من القریب میں دو احتمال ہیں :-

اوّل یہ کہ یہ پہلی حدیث حفظِ اجسادِ انبیاء کا مفہوم اور نتیجہ ہے، یعنی جسدِ اطہر اس طرح محفوظ ہے کہ اس پر صلوٰۃ وسلام پیش ہوتا رہتا ہے اور آپ قبر مبارک میں اس طرح زندہ ہیں کہ قریب کے درود کو خود سُنتے ہیں۔ مطلب یہ کہ وہاں آپ کو حیاتِ جسدی حاصل ہے۔

ثانیاً ہو سکتا ہے کہ شیخ الاسلام کی مراد ان الفاظ سے وہ دوسری حدیث ہو جو حضرت ابوہریرہؓ سے بالفاظِ اختلاف اصبہانیؒ، ابن حبانؒ اور بیہقیؒ نے روایت کی ہے۔ اس میں من صلی علی عند قبری ... الحدیث کے الفاظ میں قریب و بعید درود پڑھنے کے احکام صراحت سے منقول ہیں۔ اس صورت میں امام ابن تیمیہؒ کا دونوں حدیثوں کو فَاَخْبَرَ سے جوڑنا اس بات کا اشارہ ہے کہ حفظِ اجسادِ انبیاء والی روایت اور روضۂ اطہر کے قریب سے درود شریف خود سُننے کی روایت مآل کار ایک ہیں اور مضمون دونوں کا روضۂ منورہ کی حیاتِ جسمانی ہے۔

(۴) شیخ الاسلام حافظ ابن قیمؒ :-

ومعلوم بالضرورۃ ان جسدہ صلی اللہ علیہ وسلم فی الارض طری مطرٍّ وقد سألہ الصحابۃ کیف تعرض صلوٰتنا علیک وقد ارمت فقال ان اللہ حرم علی الارض ان تأکل اجساد الانبیاء ولو لم یکن جسدہ فی ضریحہ لما اجاب بہذا الجواب وقد صح عنہ ان اللہ تعالیٰ وکل بقبرہ الملٰئکۃ یبلغون عن امتہ السلام وصح عنہ انہ خرج بین ابی بکر وعمر وقال ھکذا نبعث ھٰذا مع القطع بان روحہ الکریمۃ فی الرفیق الاعلیٰ فی اعلیٰ علیین مع ارواح

الانبیاء.... فالروح هناك ولها اتصال بالبدن فی القبر واشراف علیه وتعلق بحیث یصلی فی قبره ویرد سلام من سلم علیه وھی فی الرفیق الاعلیٰ۔[1]

ترجمہ۔ یہ یقینی طور پر معلوم ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جسدِ اطہر بالکل تر و تازہ روضۂ منورہ میں تشریف فرما ہے۔ آپ سے صحابہؓ نے پوچھا تھا کہ وفات کے بعد آپ پر صلوٰۃ وسلام کیسے پیش ہوتا رہے گا، اس پر آپ نے فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے حرام کر دیا ہے کہ پیغمبروں کے جسموں کو کھائے۔ اگر آپ کا جسدِ اطہر قبر شریف میں[2] نہ ہوتا تو ہرگز یہ جواب ارشاد نہ فرماتے، اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی صحیح طور پہ ثابت ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے روضۂ منورہ[3] کے ساتھ فرشتے مقرر کر رکھے ہیں

---

[1] کتاب الروح ص۴۴ حیدر آباد [2] یہ غالباً اس نظریے کی تردید ہے جو علامہ قونویؒ کا ہے کہ انبیاء کرام کے اجسادِ مطہرہ، دفن کے کچھ دنوں بعد اپنی قبروں میں باقی نہیں رہنے دیئے جاتے، وہاں سے انہیں اعلیٰ علیین یا حظیرۂ قدسیہ میں پہنچا دیا جاتا ہے۔ گویا انبیاء کرام کی حیاتِ جسمانی انہیں قبور میں نہیں ہوتی۔ بلکہ اعلیٰ علیین میں وہ اسی جسدِ عنصری سے زندہ ہوتے ہیں شیخ عبدالحق محدث دہلوی اس اختلاف کا حاصل یوں بیان کرتے ہیں "پس محصل اختلاف در دوام و استمرار است در قبول بحیاتیکہ پیش از وفات بود" (جذب القلوب ص۱۸۷) امام بیہقی نے ایک احتمال کے درجے میں اس طرف اشارہ کیا ہے وقد یحتمل ان یکون المراد به رفع اجسادهم مع ارواحهم (حیاتِ انبیاء امام بیہقی ص۴ مصر) حافظ ابن قیم اس نظریے کی احادیث کی روشنی میں تردید فرما رہے ہیں اور ثابت کر رہے ہیں کہ انبیاء کرام کو ان کی قبور ہی میں حیاتِ جسدی حاصل ہوتی ہے، ہاں یہ روح کی وسعت اور کمال ہے کہ اس کا استقرار علیین میں بھی ہو اور اتصال جسدِ اطہر کے ساتھ بھی ہو۔ یہاں تک کہ وہ قبور شریفہ میں نمازیں بھی پڑھتے ہوں۔ [3] اس حدیث سے واضح ہوا کہ عرض صلوٰۃ وسلام روضے ہی پہ ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ جسدِ عنصری وہیں ہے، اگر اس پر فیضانِ حیات نہ ہو تو فرشتے مقرر کرنے کا کیا فائدہ؟

جو آپ کو آپ کی امت کا سلام پہنچاتے رہتے ہیں اور یہ بھی آپ سے صحیح طور پہ ثابت ہے کہ آپ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کے مابین تشریف لائے اور فرمایا کہ ہم اسی طرح اُٹھائے جائیں گے۔ ان سارے حقائق کے ساتھ بات قطعی ہے کہ آپ کی روح مبارک اعلیٰ علیین میں رفیقِ اعلیٰ میں ہے۔ جہاں کہ دوسرے انبیاء کرام کی ارواحِ مقدسہ ہیں۔ پس رُوح تو وہاں ہے اور وہیں سے اسے روضۂ منورہ میں رکھے جسدِ اطہر کے ساتھ اتصال ہو رہا ہے۔ روح و بدن کا ایسا قوی تعلق قائم ہو چکا ہے کہ آپ اپنی قبر شریف میں نمازیں بھی پڑھتے ہیں اور ہر سلام کرنے والے کے سلام کا جواب بھی دیتے ہیں۔

وبهذا التعلق رای موسیٰ قائماً یصلی فی قبره۔[1]

ترجمہ۔ روح و بدن کے اسی تعلق کی بناء پر آپ نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنی قبر میں کھڑے ہو کر نماز پڑھتے دیکھا تھا۔

حافظ ابن قیمؒ کے کلام کا خلاصہ یہی ہے کہ انتقال بہ برزخ کے بعد روح کو اس قدر وسعت حاصل ہو جاتی ہے کہ رفیقِ اعلیٰ میں استقرار کے باوجود قبورِ شریفہ کے اجسامِ مطہرہ اس کے اتصال سے زندہ ہوتے ہیں اور اپنی اپنی قبروں میں نمازیں بھی پڑھتے ہیں۔ وہاں روح اور حیات میں تلازم نہیں۔ تقومِ حیات کے لیے فقط اتنی تاثیر اور اتنا اتصال ہی کافی ہے۔ واللہ اعلم

⑤ شیخ الاسلام حضرت علامہ عینیؒ:۔

صح عنه صلی الله علیه وسلم ان الارض لا تاکل اجساد الانبیاء ... فتحصل من جملة هذا القطع بانهم غیبوا عنا بحیث لا ندرکهم و ان کانوا موجودین احیاء و ذلك کالحال فی الملئکة علیهم الصلوٰة و السلام فانهم موجودون احیاء لا یراهم احد من نوعنا الا من خصه

---

[1] زاد المعاد ص ۴۹

اللہ تعالیٰ بکرامته واذا تقرر انهم احیاء۔۔۔ الخ[1]

ترجمہ: آنحضرتؐ نے جو یہ ارشاد فرمایا کہ زمین انبیائے کرام کے جسموں کو نہیں کھاتی، ایسے ارشادات سے یہ نتیجہ قطعی طور پر حاصل ہوتا ہے کہ انبیائے کرام زندہ ہیں۔ صرف وہ ہم سے غائب کر لیے گئے ہیں کہ ہم اُن کا ادراک نہیں کر سکتے جیسا کہ فرشتوں کا معاملہ ہے کہ وہ زندہ بھی ہیں اور موجود بھی، لیکن ہم اُن کو پا نہیں سکتے۔ ہاں جن پر اللہ تعالیٰ کرامت فرما دے، وہ انہیں دیکھ بھی سکتے ہیں یہ بات طے شدہ ہے کہ انبیائے کرام زندہ ہیں۔

یہ مٹی انبیاء کے جسموں کو نہیں کھاتی۔ اس سے صرف یہی نہ سمجھیں کہ اُن کے ابدان محفوظ ہیں۔ سوال صرف حفاظت کا نہیں، اس احساس کا تھا کہ دُرود و سلام کس وجُودِ اقدس پر پیش ہوا کرے گا۔ سو بدن اطہر صرف اس طرح محفوظ نہیں کہ صرف مٹی نہ ہو۔ اس میں تازگی اور نرمی آج بھی اسی طرح ہے جو وفات کے وقت تھی۔ وقت گزرنے سے بدنِ طیب میں کسی قسم کا اکڑاؤ پیدا نہیں ہوا صاحب ہدایہ لکھتے ہیں کہ وہ آج بھی اسی طرح ہے جیسے قبر مبارک میں رکھا گیا تھا۔

اس پر علامہ عینیؒ لکھتے ہیں:-

وهو الیوم (ای والحال انه الیوم) کما وضع لان الارض لا تاکل اجساد الانبیاء علیهم السلام۔[2]

ترجمہ: اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آج بھی اسی طرح ہیں جیسے اس وقت تھے جب آپ کو قبر مبارک میں اتارا گیا تھا کیونکہ یہ مٹی پیغمبروں کے اجساد کو ریزہ ریزہ نہیں کرتی۔

(۶) حضرت امام ملا علی قاری علیہ رحمۃ ربہ الباری:-

قال ای رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم ان اللہ حرم علی الارض ای منعها وفیه مبالغة لطیفة اجساد الانبیاء ای من ان تأکلها

---

[1] عینی علی البخاری جلد ۲ صہ ۶۹ [2] بنایہ شرح ہدایہ جلد ۱ صہ ۱۰۹۶

فان الانبیاء فی قبورهم احیاء . . . . فتحصل الجواب ان الانبیاء احیاء فی قبورهم فیمکن لهم سماع صلوٰۃ من صلی علیهم. تامل[1]

ترجمہ. آنحضرتؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کر دیا ہے کہ وہ پیغمبروں کے جسموں کو کھائے، یہ اسی لیے تھا کہ انبیائے کرام اپنی اپنی قبروں میں زندہ ہوتے ہیں (صحابہؓ کے اس سوال کے کہ بعد الوفات یہ صلوٰۃ وسلام کیسے پیش ہوگا) جواب میں یہ ارشاد فرمایا، اس کا ماحصل ہی یہ ہے کہ انبیاء اپنی قبور شریفہ میں اس طرح زندہ ہوتے ہیں کہ جو ان پر صلوٰۃ وسلام پڑھے، اُسے وہ خود سُن سکتے ہیں۔

آگے جا کر لکھتے ہیں:۔

ان الصحابۃ رضی اللہ عنہم سألوا بیان کیفیۃ العرض بعد اعتقاد جواز ان العرض کائن لا محالۃ لقول الصادق فان صلوٰتکم معروضۃ علیّ لکن حصل لهم الاشتباہ ان العرض هل هو علی الروح المجرد او علی المتصل بالجسد وجوا ان جسد النبی کجسد کل احد فکفی الجواب ما قالہ علی وجہ الصواب۔[2]

ترجمہ صحابہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے (بعد وفات) آپ پر درود و سلام پیش ہونے کی کیفیت پوچھی، یہ ان کا اعتقاد پہلے سے تھا کہ درود وسلام تو ہر حال میں پیش ہوتا ہے. آپ فرما چکے تھے تمہارا درود مجھ پر پیش ہوتا ہے انہیں اشتباہ اس میں تھا کہ یہ پیش ہونا درود کا صرف روح مجرد پر ہے یا اس روح پر جو متصل بالجسد ہو اور وہ (صحابہ کرامؓ) یہ سمجھے تھے کہ پیغمبر کا جسد ہر ایک کے جسد کی طرح ہے سو آپ نے جو جواب دیا وہ درستگی (عقیدہ کی اصلاح) میں کافی ہے۔

---

[1] مرقات جلد ۲ ص ۲۰۹ [2] مرقات جلد ۲ ص ۲۳۸

لاشك ان حفظ اجسادهم من ان ترم خرق للعادة المستمرة فكما ان الله تعالیٰ یحفظها منه فکذلك یمکن من العرض علیهم و من الاستماع منهم صلوٰت الامة۔[1]

ترجمہ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انبیاء کے اجساد کا بکھرنے سے محفوظ رہنا عام عادت زمانہ کے خلاف ہے پس جیسے اللہ تعالیٰ ان اجساد کی ریزہ ریزہ ہونے سے حفاظت فرما رہا ہے اس طرح یہ بھی ناممکن نہیں کہ ان (اجسادِ کریمہ) پر درود پیش بھی ہو اور وہ امت کا درود بھی امت سے سن پائیں۔

علامہ عینیؒ کی طرح ملا علی قاریؒ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس جواب سے یہ قطعی عقیدہ اختیار کرتے ہیں کہ حیاتِ انبیاء میں اب کسی قسم کا کوئی شک نہیں ہو سکتا۔ حافظ ابن حجرؒ بھی یہی کہتے ہیں :۔

قال ابن حجر وما افاده من ثبوت حیاة الانبیاء حیاة بها یتعبدون و یصلون فی قبورهم مع استغنائهم عن الطعام والشراب کالملٰئکة امر لامریة فیه۔[2]

ترجمہ۔ حافظ ابن حجر کہتے ہیں انبیاء کی (بعد وفات) ایسی حیات جس سے وہ تعبدی امور بجالاتے ہوں اور اپنی قبور شریفہ میں نمازیں بھی پڑھیں اور فرشتوں کی طرح اس جہان کے سے کھانے پینے سے مستغنی رہیں۔ (حاجت مند نہ ہوں) یہ ایسا امر ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کیا جا سکتا

امر لامریة فیه (یہ ایسی بات ہے جس میں کسی قسم کا کوئی شک نہیں کیا جا سکتا) کے الفاظ پر غور کریں اور دیکھیں کہ دسویں صدی کے اس مجدد کی نظر میں اس مسئلے کی اساس کتنی مضبوط ہے

(۷) حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ :۔

اس حدیث حفظِ اجساد انبیاء کا مفہوم یوں بیان فرماتے ہیں :۔

---

[1] مرقات جلد ۲ صہ ۲۳۸ [2] ایضاً

۱. ازیں جا معلوم مے شود کہ حیاتِ انبیاء حیات جسمی و دنیاوی است نہ مجرد بقائے ارواح[1]

۲. کنایہ است از حیات ..... و حیاتِ انبیاء متفق علیہ است. ہیچ کس را در وے خلافے نیست حیاتِ جسمانی دُنیاوی حقیقی ..... و دریں حدیث کہ فرمود، ان اللہ حرم علی الارض اجساد الانبیاء اشارت است باں[2]

۳. کنایۃ عن حیاتہم کما یأتی من حدیث ابی الدرداءؓ والمذھب ان الانبیاء احیاء حیٰوۃ حقیقیۃ[3]

۴. بدانکہ در حیات انبیاء علیہم السلام، و ثبوت ایں صفت مرایشاں را و ترتبِ آثار و احکامِ آں ہیچ کس را از علماء خلافے نیست[4]

۵. انبیاء علیہم السلام کو موت نہیں، وہ زندہ اور باقی ہیں، اُن کے واسطے وہی ایک موت ہے، جو ایک دفعہ آچکی۔ اس کے بعد اُن کی روحیں بدن میں لوٹا دی جاتی ہیں اور جو حیات اُن کو دُنیا میں تھی، وُہی عطا فرماتے ہیں[5]

(۸) مقتدائے فرقہ اہلِ حدیث فاضلِ جلیل قاضی شوکانی" لکھتے ہیں:۔

والاحادیث فیہا مشروعیۃ الاکثار من الصلوٰۃ علی النبیؐ یوم الجمعۃ وانہا تعرض علیہ وانہ حی فے قبرہ ..... قال ان اللہ حرم علی الارض ان تأکل اجساد الانبیاء وقد ذھب جماعۃ من المحققین الی ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حی بعد وفاتہ[6]

ترجمہ۔ احادیث سے اِن امور کی شرعی حیثیت ثابت ہے۔ ۱. جمعہ کے دن آپ پر درُود کثرت سے پڑھا جائے۔ ۲. دُرود شریف آپؐ پر پیش ہوتا ہے۔

---

[1] مدارج النبوت جلد ۲ ص ۴۰ طبع قدیم [2] اشعۃ اللمعات جلد ۱ ص ۶۱۳ [3] لمعات التنقیح ص ۳۳۱
[4] جذب القلوب ص ۱۸۲ لکھنو [5] تکمیل الایمان مترجم ص ۵۸ [6] نیل الاوطار جلد ۳ ص ۲۱۱، ص ۲۱۱

۳. آپ اپنی قبر مبارک میں زندہ ہیں۔ چنانچہ حضورؐ نے فرمایا کہ رب العزت نے زمین پر حرام کر دیا ہے کہ انبیائے کرام کے جسموں کو مٹی بنائے اور محققین کی ایک پوری جماعت اس تحقیق پر پہنچی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی وفاتِ شریفہ کے بعد پھر زندہ ہیں۔

(۹) پیشوائے اہلِ حدیث محقق عظیم آبادیؒ بھی فرماتے ہیں:۔

اجساد الانبیاء (ای من ان تأکلها) فان الانبیاء فی قبورهم احیاء۔[1]

فان الانبیاء فی قبورهم احیاء۔[2]

ترجمہ۔ اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کر دیا ہے کہ انبیاء کے جسموں کو کھائے۔ اس ارشادِ نبوت کی بناء یہ ہے کہ انبیائے کرام اپنی اپنی قبروں میں زندہ ہوتے ہیں۔ اسی طرح بذل میں ہے۔

کیا یہاں بھی کسی مخالف کا منہ بند کرنے کے لیے انبیاء کی حیاتِ قبریہ کا بیان ہو رہا ہے۔ یا محدث سہارنپوری ارشادِ نبوت کا منشا واضح کرنے کے لیے حدیث کی شرح فرما رہے ہیں اور اُن سے پہلے بھی اس حدیث کی شرح میں یہی کچھ کہا جاتا رہا ہے۔ فتفکروا یا اولی الابصار۔

حنفیہ، شافعیہ، حنابلہ اور فرقۂ اہلِ حدیث نے اس ارشادِ نبوت کا مطلب کیا سمجھا، اور کس وضاحت سے اس کا مدلول روضۂ اطہر کی حیاتِ عنصری قرار دیا۔ یہ سب آپ کے سامنے ہے اب آیئے حنفیہ کرام کے طبقہ دیوبند سے بھی استفادہ کیجیے:۔

(۱۰) صدر المحققین رئیس المحدثین شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسنؒ حاشیہ ابی داؤد میں تصحیح فرماتے ہیں:۔

ان الصحابة سألوا بیان کیفیة العرض بعد اعتقادهم بانه کائن لا محالة لقول الصادق دفعًا للاشتباه ان العرض هل هو علی الروح

---

[1] عون المعبود جلد ۱ صفحہ ۴۰۵ [2] بذل المجہود جلد ۲ صفحہ ۱۹

المجرد او علی المتصل بالجسد حسبوا ان جسد النبیؐ کجسد کل احد فکفی فی الجواب ما قالہ علی وجہ الصواب۔[1]

ترجمہ. صحابہ کرامؓ کا یہ اعتقاد تو یقینی تھا کہ درُود آپ پر پیش کیا جاتا رہے گا کیونکہ آپؐ یہ ارشاد فرما چکے تھے. پس اُن کا سوال صرف پیش ہونے کی کیفیت سے متعلق تھا کہ وفاتِ شریفہ کے بعد یہ درُود صرف روحِ مجرد پر یا روحِ متصل بہ جسد پر اُس کا عروض ہوگا. حضور اکرمؐ کا جواب کہ انبیائے کرام کے اجسادِ مطہرہ مٹی نہیں ہوتے. اس سوالِ کیفیت کا کافی جواب تھا.

خلاصہ یہ کہ جسدِ اطہر اس طرح محفوظ ہے کہ اس پر صلوٰۃ و سلام برابر پیش ہوتا رہتا ہے اور رُوح مبارک کا اس جسد سے اتصال ہے. یہ کہنا کہ قبر مبارک میں جسد اطہر بالکل بے جان اور بے شعور پڑا ہے یہ عقیدہ اہل بدعت کے سوا اور کسی کا نہیں ہو سکتا وہ معتزلہ ہوں یا کرامیہ. اہل السنۃ والجماعۃ میں سے کوئی حیاتِ انبیاء کا منکر نہیں رہا.

حضرت شیخ الہندؒ نے یہاں اپنی بات نہیں کہی صحابہ کرامؓ کا عقیدہ پیش کیا ہے وہ حضرات قدسی صفات عرض صلوٰۃ و سلام میں کیا عقیدہ رکھتے تھے یہ آپ دیکھ چکے ہیں. ان کا یہ اعتقاد محض ایک ظنی درجے کا تھا یا وہ اس عقیدے کو یقینی درجے میں اپنائے ہوئے تھے اس کے لیے آپ ان الفاظ کو بار بار پڑھیں.

جو لوگ قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے اس بیان کو کہ انبیاء کے سماع عند القبر میں کسی کو اختلاف نہیں[2] طنز و استہزاء سے پڑھتے ہوں ان کے لیے حضرت شیخ الہندؒ کی شرح حدیث کو ٹھکرانا بائیں ہاتھ کا کھیل ہے. واصحاب الشمال ما اصحاب الشمال۔

والی اللہ المشتکی وھو المستعان وعلیہ التکلان.

---

[1] حاشیہ ابی داؤد ص ۱۵۷

المبحث الرابع

حدیث ابی الدرداءؓ و احوال رواتہ

حدثنا عمرو بن سعدؒ[1] المصری ثنا عبداللہ بن وہبؒ[2] عن عمرو بن الحارثؒ[3] عن سعید بن ابیؒ[4] ھلال عن زید بن ایمن عن عبادۃ بن نسیؒ عن ابی الدرداءؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکثروا الصلوٰۃ علی

---

[1] عمرو بن سعد المصری ابو محمد المصری ثقۃ من الحادیۃ عشرۃ. ثقہ راوی حدیث ہیں. (تقریب ص۲۹۲)
[2] عبداللہ بن وہب بن مسلم مولاھم ابو محمد المصری الفقیہ ثقۃ حافظ عابد من التاسعۃ (تقریب ص۱۹۵) [3] ثقۃ فقیہ حافظ من السابعۃ (تقریب ص۲۹۸) [4] اللیثی مولاھم ابو العلاء المصری قیل مدنی الاصل قال ابن یونس بل نشاء بھا صدوق. (تقریب ص۱۹۵) صدوق راوی حدیث ہیں. ابن حزم سے پہلے کسی نے ان پہ جرح نہیں کی اور ابن حزم کی جرح کا منشاء ان کا اپنا اعتقاد تھا. وہ عذاب قبر کے قائل نہ تھے اور اجسادِ قبریہ کی کسی قسم کی حیات کا انہیں اقرار نہ تھا۔ ابوداؤد کی روایت جس میں قبر میں عودِ روح کا بیان ہے. اس کی سند میں ایک راوی منہال بن عمرو تھے، ان پر بھی ابن حزم نے جرح کر دی تھی تنقیح الرواۃ ص۳۱۴ میں ہے. ولما رای ابن حزم حدیث المنہال رادا علی معتقدۃ فی انکار عذاب الاجساد فی قبورھا طعن فیہ وطعنہ مردود والحدیث صحیح. (جلد ا ص۳۱۴) [5] زید بن ایمن روی عن عبادۃ بن نسی و عنہ سعید بن ابی ھلال ذکرہ ابن حبان فی الثقات روی لہ ابن ماجہ حدیثا واحدا فی فضل الصلوٰۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم قلت رجالہ ثقات.

(تہذیب جلد ۳ ص۳۹۸)

یوم الجمعۃ فانہ مشہود تشہدہ الملئکۃ وان احدا لن یصلی علی الا
عرضت علی صلوتہ حتی یفرغ منہا قال قلت وبعد الموت قال و بعد الموت
ان اللہ حرم علی الارض ان تأکل اجساد الانبیاء فنبی اللہ حی یرزق۔[1]

ترجمہ۔ عبادہ بن نسئ حضرت ابوالدرداءؓ سے روایت کرتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا کہ جمعہ کے دن مجھ پر کثرت سے درود پڑھا کرو کیونکہ اس دن فرشتے حاضر ہوتے ہیں اور کوئی مجھ پر درود نہیں پڑھتا مگر یہ کہ اس کے فارغ ہوتے ہی وہ مجھ پر پیش کر دیا جاتا ہے۔ ابُوالدرداءؓ کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا کہ کیا وفات کے بعد بھی آپؐ پر درود پیش ہوتا رہے گا، آپؐ نے فرمایا کہ وفات کے بعد بھی اسی طرح پیش ہوتا رہے گا اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کر دیا ہے کہ انبیاء کے جسموں کو کھائے پس اللہ کا پیغمبر زندہ ہوتا ہے اور اُسے رزق بھی دیا جاتا ہے۔

عبادہ بن نسئ

مشہور تابعی ہیں۔ وفات ۱۱۸ھ میں ہوئی۔ حضرت اوسؓ، عبادہ بن صامتؓ، ابوالدرداءؓ اور دوسرے کئی صحابہؓ سے احادیث سُنیں۔ زید بن ایمنؒ اور سعید بن ابی ہلالؒ وغیرہما نے ان سے روایات لیں۔ امام احمدؒ، یحییٰ بن معینؒ، امام نسائیؒ اور ابن سعدؒ انہیں ثقہ قرار دیتے ہیں۔ امام بخاریؒ نے بھی اُن کی تعریف کی ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ لکھتے ہیں:۔

ثلثۃ نفر ینزل بھم الغیث وینصر بھم علی الاعداء عبادہ بن نسئ
رجاء بن حیاۃ وعدی بن عدی۔[2]

ترجمہ: تین ایسی عظیم شخصیتیں ہیں کہ ان کے وسیلے سے بارشیں برستی ہیں اور ان کی برکتوں سے دشمنوں پر فتح حاصل ہوتی رہی ہے۔ ان میں سے پہلے عبادہ بن نسئ ہیں (توسل بالذوات)

---

[1] ابن ماجہ صفحہ ۱۱۹ [2] تہذیب جلد ۵ صفحہ ۱۱۴

"تہذیب الکمال" میں بھی حضرت ابوالدرداءؓ سے اُن کی حفظِ اجسادِ انبیاء والی روایت منقول ہے۔ اس کے آخر میں بھی فنبی اللہ حی یرزق کے الفاظ موجود ہیں۔[1]

عبادہ بن نسیؒ سے اگلے راوی حضرت ابوالدرداءؓ ہیں۔ ان کا ترجمہ نقل کرنے اور اُن کی تعدیل بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس لیے کہ وہ ایک نہایت جلیل القدر صحابیِ رسُول ہیں۔ عبادہ بن نسیؒ سے نچلے سب راوی ثقہ ہیں اور ان کے تراجم حاشیہ میں پیش ہو چکے ہیں اور اس پُوری سند پر ماہرینِ حدیث کی ایک پُوری جماعت "اسنادہ جید" کا حکم لگا چکی ہے۔ کما تقدم قبیل المبحث الاول قال الحافظ المنذری — اسنادہ جید۔[2]

عراقی شرح ترمذی میں لکھتے ہیں کہ زید بن ایمن اور عبادہ بن نسیؒ کے مابین انقطاع ہے۔ جواباً عرض ہے کہ اصل انقطاع اس حدیث کی طبرانی کی سند میں ہے جو سعید بن ابی ہلال عن ابی الدرداءؓ کے طور پر منقول ہے، وہاں رجال بھی محلِ کلام ہیں۔ چنانچہ حافظ ابن قیمؒ نے جلاء الافہام میں تصریح کی ہے۔

زید بن ایمن اور عبادہ کے مابین دعوئے انقطاع ثابت نہیں۔ اس پہ دلیل مطلوب ہے محض نقلِ دعوے ہی کافی نہیں۔ پھر بتایا جائے کہ یہ کون سی قسم کا انقطاع ہے، مُضر ہے یا غیر مُضر۔ پھر بصورتِ مضرت کن کن محدثین نے اس روایت کو رد کیا ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ لکھتے ہیں، زید بن ایمنؒ کا عبادہ بن نسیؒ سے روایت کرنا ثابت ہے اسی طرح سعید بن ابی ہلال عبادہ سے روایت کرتے ہیں۔[3] رہا یہ سوال کہ عبادہ بن نسیؒ کی روایت حضرت ابوالدرداءؓ سے ثابت ہے یا نہیں؟ سو اس کا جواب بھی اثبات میں ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے تصریح کی ہے کہ عبادہ کی روایت حضرت ابوالدرداءؓ سے ثابت ہے۔

محدثین نے اس حدیث کو قبول کیا ہے اور اس کی سند کو جید کہا ہے۔ سند جید تبھی ہوتی ہے کہ ضعفِ رواۃ اور انقطاع سے پاک ہو۔ سو اس عام قبولیت کے مقابل ان شاذ اقوال میں وہ قوت نہیں پائی جاتی کہ روایت کو رد کیا جا سکے۔

---

[1] حاشیہ تہذیب لابی الحسن جلد ۲ ص ۲۹۸ [2] ترجمان السنۃ جلد ۲ ص ۲۹۷ [3] دیکھئے تہذیب جلد ۳ ص ۳۹۸

اگر یہ روایت مُرسل ہے تو پیشِ نظر رہے کہ ہم اس سے بالاستقلال استدلال نہیں کر رہے بلکہ اسے حضرت اوس بن اوسؓ کی مذکورہ سابقہ روایت کی تفسیر میں پیش کیا جا رہا ہے اور یہاں اس کا قبول کسی کے ہاں محلِ اعتراض نہیں۔ جن محدثین کو احتجاج بالمرسل میں کلام ہے۔ وہ بھی تفسیر المتصل بالمرسل میں مرسل کا اعتبار کرتے ہیں۔ ترمذیؒ کی متصل روایت (بالفاظ تدریب) خیر نسائها فاطمه کی تفسیر مسندِ حارث بن ابی اسامہ کی روایت میں یم خیر نسائها عالمها و فاطمه خیر نسائها عالمها کے ساتھ اسی اصول پر کی گئی ہے۔ حالانکہ ثانی الذکر صحیح سند کے باوجود مرسل ہے اور سند میں انقطاع ہے۔ مگر چونکہ تفسیر و توضیح میں پیش کی جا رہی ہے۔ اس لیے محدثین شافعیہ بھی جو احتجاج بالمُرسل کے قائل نہیں، اسے قبول کر رہے ہیں۔ تعجب ہے کہ تفسیر المتصل بالمرسل کے باب میں بھی اس ابن ماجہ کی جید الاسناد حدیث کا اعتبار نہ کیا جائے۔

وکل من تامّل فیه علم وتیقّن ان العلم بالای سال من الدقیق الذی لایدرکه الا الموفق او الطالب المتحقق۔

المبحث الخامس

تدقیق الکلام فی عرض الصلوٰۃ والسلام

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا — ان صلوتکم معروضۃ علی (تمہارا درود مجھ پر پیش کیا جاتا ہے) یہ آپ نے کب فرمایا؟

یہ آپ کی حیات طیبہ کی بات ہے — اس وقت آپ پر درود و سلام کس طرح پیش ہوتا تھا؟ جواب ظاہر ہے کہ جو قریب آکر آپ پر سلام کہے، آپ خود سنتے تھے اور جو دور سے پڑھا جائے یا دوسرے بلاد و ممالک میں ہو وہ آپ کو فرشتے پہنچاتے ہیں۔ یہ بات اتنی ظاہر ہے کہ اس کے کسی پہلو میں کوئی علمی تشنگی نہیں۔

فرشتے آپ پر امت کا درود و سلام کیسے پہنچاتے ہوں گے۔ یہ اللہ تعالیٰ جانیں، وہ فرشتے جانیں یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم جن پر وہ درود و سلام پیش ہوتا تھا اور آپ نے اس کی اپنی امت کو بایں الفاظ (ان صلوتکم معروضۃ علی) اطلاع دی۔ تاہم یہ صحیح ہے کہ یہ ایک برزخی کیفیت تھی۔ جسے دوسرے لوگ نہ دیکھ پاتے تھے اور نہ سنتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اس دنیوی حیات میں ان برزخی کیفیات سے بالکل مانوس تھے۔ معراج کی رات آپ اس دنیوی جسد سے ہی اس برزخی سیرگاہ میں لے جائے گئے تھے۔ یہاں حضورؐ کے دنیوی جسد اور برزخی نظاروں کا اجتماع تھا۔ قرآن پاک کی رو سے اسرار کے جلووں میں لنریہ من ایاتنا (تاکہ ہم اپنے بندے کو نشان دکھائیں) کی شان ہی جلوہ گر تھی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی ہر طرف ہزاروں کی تعداد میں پھیلے تھے اور پھر ہر ایک امتی آپ پر سینکڑوں بار درود بھیجتا تھا اور یہ سارا درود و سلام حضورؐ پر ہر ایک ایسے لطیف پیرایہ میں پیش

ہوتا تھا کہ ہم اسی وادی کے ناآشنا اس باب میں کچھ نہیں کہہ سکتے۔

درود و سلام آپ پر کسی مرئی شکل میں پیش ہوتا تھا یا آپ صرف اس پر اطلاع پاتے تھے آپ نے اس کی تفصیل نہیں بتائی۔ تاہم یہ صحیح ہے کہ آپ نے اپنی اس دنیوی حیات میں اعمال امت کے بہت سے برزخی جلوے دیکھے ہیں۔

ایک دفعہ اللہ رب العزت نے حضورؐ کے سینہ مبارکہ پر اپنی قدرت کا ہاتھ رکھا تو آنحضرتؐ مدینہ منورہ میں بیٹھے ملاء اعلیٰ (اوپر کے جہان) کی باتیں سُننے لگے۔ فرشتے کفارات کی باتیں کر رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ سے پُوچھا:۔

فیما یختصم الملاء الاعلیٰ۔ کس بات میں اُوپر والے جھگڑا کر رہے ہیں۔[1]

پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی بتایا:۔

عرضت علیّ اجور امتی . . . . وعرضت علیّ ذنوب امتی فلم ارذ نبا اعظم من سورۃ من القراٰن او اٰیۃ اوتیہا رجل ثم نسیہا۔[2]

ترجمہ مجھ پر میری امت کے اچھے اعمال پیش کئے گئے . . . . اور مجھ پر میری امت کے گناہ بھی پیش کئے گئے۔ سب سے بڑا گناہ میں نے یہ دیکھا کہ کوئی شخص قرآن کریم کی کوئی سورۃ یا آیت یاد کر کے بھلادے۔

اجُور و ذنوب کن اُمور کی صدائے بازگشت ہے۔ یہ کس چیز پر مرتب ہوئے؟ اعمال پر — سو اگر اجُور و ذنوب حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر پیش ہو سکتے ہیں تو امت کے اعمال آپ پر کیوں پیش نہیں ہو سکتے؟ اس کا ثبوت بھی حدیث میں مل جاتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

حیاتی خیر لکم و مماتی خیر لکم تعرض علیّ اعمالکم فما کان من حسن حمدت اللہ علیہ و ما کان من سیّئ استغفرت اللہ لکم۔[3]

---

[1] جامع ترمذی جلد ۲ ص [2] ایضاً جلد ۲ ص۱۱۵ عن انس بن مالک مرفوعاً [3] رواہ البزار باسناد جید فتح الملہم جلد ۱ ص۴۱۳

ترجمہ میری زندگی بھی تمہارے لیے خیر اور میری وفات بھی تمہارے لیے خیر۔ اس ممات میں تمہارے اعمال مجھ پر پیش کیے جائیں گے جو اچھے ہوں گے۔ اس پر میں اللہ کی حمد کہوں گا اور جو برے ہوں گے ان پر میں تمہارے لیے اللہ سے استغفار مانگوں گا۔

آپ اپنی امت کے نیک اعمال سے خوش ہوتے ہیں اور یہ اس کے بغیر نہیں ہو سکتا کہ آپ پر امت کے اعمال پیش کیے جاتے ہوں۔ قاضی شوکانی (۱۲۵۰ھ) لکھتے ہیں:۔

انه یسر بطاعات امته وان الانبياء لا يبلون۔[1]

ترجمہ۔ آپ اپنی امت کی نیکیوں سے خوش ہوتے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ انبیاء کے اجساد پرانے نہیں ہوتے۔

درود و سلام کا آپ پر پیش ہونا احادیث میں اس کثرت سے وارد ہے کہ اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کیفیت اس کی اللہ کو ہی معلوم ہے لیکن بعض روایات میں اس کے اوقات بھی دیئے گئے ہیں۔ حضرت امام شافعی روایت کرتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا:۔

اذا كان يوم الجمعة وليلة الجمعة فاكثروا الصلوٰة علي۔[2]

ترجمہ۔ جب جمعہ کا دن ہو یا جمعہ کی رات تو مجھ پر کثرت سے درود پڑھا کرو۔

یہ تو کثرت سے درود پڑھنے کی ترغیب ہے۔ اب پیش کیے جانے کا موقعہ بھی معلوم کریں۔ سعید بن منصور اپنی سنن میں یہ روایت لائے ہیں:۔

اكثروا الصلوٰة علي في كل يوم جمعة فان صلوٰة امتي تعرض علي في كل يوم جمعة۔[3]

ترجمہ۔ مجھ پر جمعہ کے روز درود کثرت سے پڑھو کیونکہ میری امت کا درود مجھ پر ہر جمعہ کے دن پیش ہوتا ہے۔

---

[1] نیل الاوطار جلد ۳ صفحہ ۳۰۵ [2] مسند امام شافعی صفحہ۔ منتقی الاخبار جلد ۲ صفحہ ۳۰۴ [3] منتقی الاخبار ابن تیمیہ جلد ۳ صفحہ ۳۰۴

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں آپ پر کس پیرائے میں صلوٰۃ وسلام پیش ہوتا تھا. صحابہؓ نے اس کی آپ سے کبھی کیفیت نہ پوچھی. البتہ انہیں یہ اشکال پیش آیا کہ آپ کی وفات کے بعد یہ عرض صلوٰۃ وسلام جسدِ اطہر پر کیسے ہوگا جب کہ آپ مٹی میں گھل چکے ہوں گے. آپ نے جواب میں فرمایا کہ انبیاء کے اجساد کبھی مٹی کے ساتھ مٹی نہیں ہوتے، محفوظ رہتے ہیں.

اس جواب سے یہ بات واضح ہوگئی کہ وفات کے بعد آپ پر عرضِ صلوٰۃ وسلام نئے سرے سے شروع نہ ہوگا بلکہ اسی عرض کا تسلسل ہے جو آپ کو اس دنیا میں حاصل تھا. جب یہاں یہ عرض روح وجسد کے مجموعے پر تھا تو وہاں بھی یہ عرض صلوٰۃ وسلام اس جسدِ اطہر پر ہوتا ہے جس کے محفوظ رکھنے کی اللہ تعالیٰ نے ضمانت دی ہے. اللہ تعالیٰ آپ کی روحِ اقدس کو اس طرف متوجہ کر دیتا ہے عرض صلوٰۃ وسلام پہلے ہے اور رد اللہ علی روحی (روحِ اقدس کا اس طرف متوجہ ہونا) اس کے بعد ہے. حدیث کی ترتیب یہی ہے.

حیٰوۃ الانبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام متفق علیہا لاخلاف لاحد فیہ فقال الحافظ معناہ ردّ اللہ علیّ نطقی.[1]

ترجمہ. انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی حیات اہل اسلام میں متفق علیہ ہے کسی شخص کا اس میں اختلاف نہیں ہے. حافظ ابن حجر کہتے ہیں روح لوٹانے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ مجھ پر میرے نطق کو لوٹا دیتا ہے جس سے میں اس کو جواب دیتا ہوں.

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان ردّ اللہ علی روحی کا مطلب یہ نہیں کہ حضور کو اس وقت زندہ کیا جاتا ہے. آپ کی حیات تو اپنی جگہ متفق علیہ ہے. یہاں مراد ردّ اللہ علیّ نطقی ہے —— چوتھی توجیہ ہے جو حافظ ابن حجر نے کی ہے یہ ہے:.

المراد بالروح النطق فتجوز فیہ من جہۃ خطابنا بما نفہمہ.[2]

ترجمہ. یہاں روح سے مراد نطق ہے یہ ہمارے خطاب کی جہت سے کہ ہم اسے

---

[1] انوار المحمود جلد ۱ صفحہ ۶۱۱ [2] فتح الباری جلد ۶ صفحہ ۳۵۲

سمجھ پائیں درست ہے (ایسے معنی ہو سکتے ہیں)۔

طبرانی میں ہے. آپ فرماتے ہیں:۔

لیس من عبد یصلی علی الابلغنی صلاتہ ـــــ قلنا وبعد وفاتک قال وبعد وفاتی. ان اللہ حرم علی الارض ان تاکل اجساد الانبیاء۔[1]

ترجمہ۔ کوئی ایسا بندہ نہیں کہ وہ مجھ پر درود نہ بھیجے مگر یہ کہ اس کا درود مجھے پہنچتا ہے (ہم نے پوچھا) اور وفات کے بعد بھی؟ آپ نے فرمایا اور میری وفات کے بعد بھی۔ بیشک اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کر دیا ہے کہ وہ انبیاء کے جسموں کو کھائے۔

آپ کو صلوٰۃ و سلام پہنچتا ہے۔ یہ دونوں صورتوں کو شامل ہے۔ قریب سے ہو تو براہِ راست اور دور سے ہو تو بتوسطِ ملائکہ ـــــ یہ بات یقینی ہے کہ آپ کو صلوٰۃ و سلام پہنچتا ہے۔

اس حدیث میں پہلے روح کا لوٹنا ذکر نہیں کیا گیا معلوم ہوا حیات آپ کو پہلے سے حاصل ہے۔ جب کوئی شخص آپ پر سلام عرض کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ آپ کی روحِ اقدس کو جو ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کی ذات و تجلیات میں حالتِ استغراق میں ہے کچھ ادھر بھی توجہ فرما دیتے ہیں اور آپ کو اس کا درود و سلام پہنچا دیا جاتا ہے اور ہمیں معلوم نہیں اسی روح اقدس کی جہاتِ توجہ کتنی کروڑوں ہیں جو ہر امتی کا صلوٰۃ و سلام لے لیتی ہیں۔ بلکہ سلام کرنے والوں کو آپ جواب بھی دیتے ہیں۔ احادیث میں اس سلسلے میں ردّ اللہ علی روحی کے الفاظ ہیں ردّ اللہ الی روحی کے الفاظ نہیں۔ پہلے جملہ کا ترجمہ ہے مجھ پر روح لوٹائی جاتی ہے۔ دوسرے جملہ کا ترجمہ ہے، روح میری طرف لوٹائی جاتی ہے۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ ایک خط کے جواب میں لکھتے ہیں:۔

اگر لفظ الیٰ روحی فرمایا گیا ہوتا تو آپ کا شبہ وارد ہو سکتا ہے الیٰ اور علیٰ کے فرق سے آپ نے ذہول فرمایا۔ علیٰ استعلاء کے لیے ہے اور الیٰ نہایت طرف کے لیے ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صلوٰۃ و سلام سے پہلے روح کا

---

[1] نیل الاوطار جلد ۳ صفحہ ۳۰۵

(اس جہت میں) استعلاء نہ تھا، نہ یہ کہ وہ جسم اطہر سے بالکل خارج تھی اور اب اس کو جسم اطہر کی طرف لوٹایا گیا ہے۔[1]

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی لکھتے ہیں:۔

اکثر شارحین نے ردِ روح کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ قبر مبارک میں آپکی روح پاک کی تمام تر توجہ دوسرے عالم کی طرف اور اللہ تعالیٰ کی جمالی اور جلالی تجلیات کے کے مشاہدہ میں مصروف رہتی ہے ..... پھر جب کوئی امتی سلام کرتا ہے اور وہ فرشتہ کے ذریعہ یا براہِ راست آپ تک پہنچتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے اذن سے آپ کی روح (ایک جہت سے) اس طرف بھی متوجہ ہوتی ہے اور آپ سلام کا جواب دیتے ہیں بس اس روحانی توجہ والتفات کو روح سے تعبیر فرمایا گیا۔[2]

سلام پیش کرنے والوں کی طرف روحِ اقدس کی ہزاروں جہات متوجہ، مجیب اور متبدل (کبھی کسی طرف اور کبھی طرف) ہیں۔ مگر اس سے روحِ اقدس کا ذات وتجلیاتِ الٰہی میں استغراق متاثر نہیں ہوتا۔ اس میں فرق نہیں ہوتا۔ آپ ہمہ وقت جمال وجلال کے مشاہدہ میں مستغرق ہیں۔

آٹھویں صدی کے مشہور محدث، حافظ ابن الملقن (۸۰۴ھ) فرماتے ہیں:۔

المراد برد الروح النطق لانہ صلی اللہ علیہ وسلم حی فی قبرہ وروحہ لاتفارقہ لما صح ان الانبیاء احیاء فی قبورھم۔[3]

ترجمہ۔ ردِ روح (روح کے بدن کی طرف لوٹنے) سے مراد نطق ہے (کہ آپ جواب دے سکیں) کیونکہ حضور تو اپنی قبر میں زندہ ہیں اور آپ کی روح اقدس تو کبھی بھی آپ سے جدا نہیں ہوتی یہ بات صحیح سند سے ثابت ہو چکی ہے کہ انبیاء اپنی قبروں میں زندہ ہوتے ہیں۔

حافظ ابن حجر عسقلانی (۸۵۲ھ) نے رد روح سے پیدا ہونے والے اشکال کے متعدد جواب دیئے ہیں۔

---

[1] مکتوبات شیخ الاسلام جلد ۱ ص ۲۲۸ [2] معارف الحدیث جلد ۵ ص ۳۷۶ [3] نقلہ الشوکانی فی شرح حصن حصین ص ۲۸

الخامس انه يستغرق فی امور الملاء الاعلیٰ فاذا سلّم الیه رجع الیه فهمه لیجیب من سلّم علیه۔[1]

ترجمہ۔ پانچویں بات یہ ہے کہ آپ ملاءِ اعلیٰ کے جلوؤں میں مستغرق رہتے ہیں پس جب کوئی شخص آپ پر سلام بھیجتا ہے تو آپ کا فہم آپ کی طرف واپس لوٹتا ہے تاکہ آپ اس کے سلام کا جواب دیں۔

پھر اس پر ایک اور اشکال وارد کرتے ہیں اور پھر اس جواب پر یہ بحث ختم کر دیتے ہیں۔

ان امور الآخرة لا تدرک بالعقل واحوال البرزخ اشبه باحوال الآخرة والله اعلم۔[2]

ترجمہ۔ آخرت کے حالات عقل سے جانے نہیں جاسکتے اور عالم برزخ کے حالات آخرت کے حالات سے بہت ملتے جلتے ہیں۔

حافظ ابن حجر کے شاگرد محدث سخاوی (۹۰۲ھ) علامہ تقی الدین السبکی سے ردِ روح کا معنی نقل کرتے ہیں۔

یحتمل ان یکون ردا معنویا وان تکون روحه الشریفة مشتغلة بشهود الحضرة الالٰهیة والملاء الاعلیٰ عن هٰذا العالم فاذا سلّم علیه اقبلت روحه الشریفة علیٰ هٰذا العالم لیدرک سلام من یسلّم علیه ویرد علیه۔[3]

ترجمہ۔ یہاں ردِ روح سے مراد روح کا حسّاً لوٹنا نہیں معنوی طور پر لوٹنا ہے وہ اس طرح کہ آپ کی روح شریفہ اس عالم سے ہٹ کر دربارِ الٰہی اور ملاءِ اعلیٰ کے شہود میں مشتغل رہے۔ پھر جب کوئی شخص آپ پر سلام کہے تو آپ کی روح شریفہ اس عالم پر ظہور کرے تاکہ سلام کرنے والے کے سلام کا ادراک کرے اور اسے جواب بھی دے۔

---

[1] فتح الباری جلد ۶ صفحہ ۳۵۲ [2] ایضاً [3] القول البدیع صفحہ ۱۲۷

علامہ جلال الدین سیوطی (۹۱۱ھ) جملہ رد اللہ علی روحی کو جملہ حالیہ قرار دیتے ہیں اور فرماتے ہیں عربی قاعدہ ہے کہ جملہ حالیہ جب ماضی کے طور میں ہو تو اس میں قد مقدر نکالنا پڑتا ہے۔ جیسے قرآن کریم میں ہے:۔

او جاؤکم حصرت صدورھم ان یقاتلوکم او یقاتلوا قومھم۔

(پ۵، النساء ع ۱۲ آیت ۹۰)

ترجمہ۔ یا وہ آئے تمہارے پاس درحالیکہ تنگ آچکے ہیں ان کے دل تمہاری لڑائی سے یا یہ کہ اپنی قوم سے لڑیں۔

حصرت فعل ماضی ہے جیسے رد فعل ماضی ہے۔ اس صورت میں حدیث معنی اس طرح واضح ہوگی۔

مامن احد یسلم علی الا وقد رد اللہ علی روحی قبل ذلک وارد علیہ[1]۔

ترجمہ۔ کوئی ایسا شخص نہیں کہ وہ مجھ پر سلام بھیجے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اس سے پہلے مجھ پر میری طرف لوٹا دیں اور یہ کہ میں اس کا جواب دوں۔

اب آیئے گیارہویں صدی کے مصر کے نامور عالم علامہ احمد بن محمد الخفاجی (۱۰۶۹ھ) کا جواب بھی ملاحظہ کیجئے:۔

لان الکون لا یخلو من مسلم یسلم علیہ فی کل لحظۃ[2]۔

ترجمہ۔ کیونکہ جہان کسی ایسے وقت سے خالی نہیں کہ مسلمان وہاں ہر لحظہ عرض سلام نہ کر رہے ہوں۔

اب بارہویں صدی میں چلئے۔ حضرت امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ بھی مرکز سلام اسی روضہ قدسیہ کو ہی سمجھتے ہیں جس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دفن ہیں اور جہاں زائرین لاکھوں کی تعداد میں حاضری دیتے ہیں۔ آپ لکھتے ہیں:۔

---

[1] انباہ الاذکیاء صفحہ ۱ [2] شرح شفاء جلد ۳ صفحہ ۴۹۹

وارواح الکمل اذا فارقت اجسادها صارت کالموج المکفوف لا یهن ها لراده متجدده وداعیه سانحة ولکن النفوس التی هی دونها تلتصق بالهمة فتجلب منها نورا او هیئة مناسبة للارواح وهی المکنی عنه بقوله علیه السلام مامن احد یسلم علی الا رد الله علی روحی حتی ارد علیه السلام وقد شاهدت ذلک مالا احصی فی مجاورتی المدینة سنة الف ومائة واربع واربعون۔[1]

ترجمہ: اور کاملین کی ارواح جب اپنے اجساد سے جدا ہوتی ہیں تو وہ ایک رُکی ہوئی موج کی صورت میں ہو جاتی ہیں۔ اب انہیں کوئی نیا ارادہ اور پیش آنے والا داعیہ حرکت نہیں دے سکتا۔ ہاں وہ نفوس جو درجہ میں ان سے کم ہوتے ہیں وہ (اپنی روح کی) ہمت سے ان سے جا چمٹتے ہیں اور ان سے نور اور ہیئت جو اپنی ارواح کے مناسب ہو جلب کرتے ہیں (اپنی طرف کھینچتے ہیں) حضورؐ کے اس ارشاد میں کہ جب کوئی شخص مجھ پر سلام بھیجتا ہے تو اللہ تعالیٰ میری روح کو مجھ پر لوٹا دیتا ہے (متوجہ کر دیتا ہے) حتیٰ کہ میں اس پر سلام لوٹا دیتا ہوں اسی طرف اشارہ ہے اور میں نے ۱۱۴۴ھ میں جب میں مدینہ کی مجاورت میں تھا۔ میں نے اس سلام وجواب کا اتنی دفعہ مشاہدہ کیا کہ میں شمار نہیں کر سکتا۔

اس سے پتہ چلا کہ روح اقدس عالم بالا میں ہو کر جسد اطہر پر اس طرح تجلی ریز ہے کہ آپ زائرین کا سلام سنتے ہیں اور جواب بھی دیتے ہیں اور جو لوگ آرام گاہِ نبوت اور مزار پُرانوار پر مجاورت اختیار کئے بیٹھے ہیں وہ دن رات ان جلوؤں سے متمتع اور فیضیاب ہوتے ہیں۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (۱۲۹۷ھ) تفرد اختیار نہیں کرتے۔ آپ لکھتے ہیں:۔

جب کوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام بھیجتا ہے تو خداوند کریم آپ کی روح

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ جلد ۲ صفحہ ۱۷ مصر، صفحہ ۱۴۹ مترجم

پُرفتوح کو اس حالت استغراق فی ذات اللہ و تجلیات اللہ سے بوجہ محبوبیت و محبیت تامہ جو آپ کو حاصل رہتی ہے اپنے ہوش (ادھر دھیان کرنا) عطا فرما دیتا ہے۔[1]

اب چودہویں صدی میں بھی یہی معنی حدیث سُنیں اور یقین کریں الا رد اللہ علی روحی کے الفاظ ہرگز یہ نہیں کہتے کہ سلام سے پہلے بدنِ اطہر روح سے بالکل بے تعلق تھا حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوریؒ (۱۳۴۶ھ) لکھتے ہیں:۔

قال القاضی لعل معناہ الی روحہ المقدسۃ فی شان ما فی حضرۃ الالٰہیۃ فاذا بلغہ سلام احد من الامۃ رد اللہ تعالیٰ روحہ المطہرۃ من تلک الحالۃ الی رد من سلم علیہ۔[2]

ترجمہ۔ قاضی عیاض کہتے ہیں یہ معنی ہو سکتا ہے کہ آپ کی روحِ اقدس اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہو اور جب کبھی آپ کو امت میں سے کسی کا سلام پہنچے تو اللہ تعالیٰ آپ کی روحِ اطہر کو اس حالت سے اس کی طرف لوٹا دیتے ہیں جس نے آپ پر سلام عرض کیا۔

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے فتح الملہم کی پہلی جلد میں اس پہ پوری بحث کی ہے۔[3] یہ چودہ سو سال کا علمی سرمایہ ہے جو ہم نے آپ کے سامنے لاکر رکھ دیا ہے۔ چودہ سو سال کے اعیانِ امت میں ایک ایسا عالم نہیں ملتا جس نے الا رد اللہ علی روحی سے یہ استدلال کیا ہوا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قبر میں زندہ نہیں ہیں اور روح اسی وقت لوٹتی ہے جب کوئی آکر آپ پر سلام کرے۔

اب ہم اس بحث کو شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا دامت برکاتہم کے بیان پر ختم کرتے ہیں آپ فرماتے ہیں حضور پر عرض صلوٰۃ و سلام جسد اطہر اور روحِ اقدس دونوں پہ ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہ اس کا تعلق صرف روح سے ہو اور جسدِ اطہر کسی شعور اور ادراک کے بغیر قبر مبارک میں بے جان پڑا

---

[1] آبِ حیات ص۱۷۵ [2] بذل المجہود جلد ۲ ص۲۰۲ [3] دیکھئے فتح الملہم جلد ۱ ص۲۲

ہو۔ آپ حدیث ان صلوتکم معروضۃ پر لکھتے ہیں :-

اور حدیث پاک میں اس طرف اشارہ ہے کہ درود روح مبارک اور بدن مبارک (دونوں) پر پیش ہوتا ہے[۱]

اس بات سے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر اس دُنیا میں بھی صلوٰۃ وسلام پیش ہوتا تھا اور آپ کو یہاں کئی برزخی مناظر دکھا دیئے جاتے تھے اور یہ کہ آپ کبھی عذاب قبر کی آوازیں بھی سُن لیتے اور کبھی بغیر کھائے پیئے روزوں میں وصال فرماتے اور دل آپ کا کبھی نہ سوتا تھا۔ ہمیشہ بیدار رہتا تھا۔ یہ بات کُھل کر سامنے آتی ہے کہ :

آپ کی دیکھنے کی قوت اوروں جیسی نہ تھی۔ آپ کی سننے کی روحانی قوت اور لوگوں کی طرح نہ تھی۔ آپ کا مادی غذا کا احتیاج اور لوگوں کی طرح کا نہ تھا۔ آپ کا قلب مُبارک نرالی شان کا حامل تھا اور آپ کا بدن اطہر عام ابدان سے مختلف تھا۔

حسبوا انّ جسد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کجسد کل احد فکفیٰ فی الجواب ماقالہ علیٰ وجہ الصواب۔[۲]

ترجمہ :- انہوں نے گمان کیا تھا کہ نبی پاک کا جسد اطہر بھی دوسرے لوگوں کے جسد کی طرح ہوگا۔ سو حضورؐ نے جو جواب دیا۔ وہ صحیح صورت بتلانے کے لیے کافی تھا۔

ہم یہ بات صرف اپنی عقیدت سے بیان نہیں کر رہے۔ صحابہؓ کرامؓ بھی عقیدہ رکھتے تھے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پیش ہوتا ہے۔ اسود بن یزید کہتے ہیں سیدنا حضرت عبداللہ بن مسعودؓ (۳۲ ھ) فرمایا کرتے تھے :-

اذا صلیتم علیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاحسنوا الصلوٰۃ علیہ فانکم لاتدرون لعل ذٰلک یعرض علیہ۔[۳]

ترجمہ :- جب تم حضور صلی اللہ علیہ وسلم پہ درود پڑھو تو بڑے اچھے پیرایہ میں پڑھو

---

[۱] فضائل درود شریف ص۲۱ [۲] مرقات جلد ۳ ص ۲۳۸ حاشیہ ابی داؤد شیخ الہندؒ جلد ا ص ۱۵۷ [۳] سنن ابن ماجہ ص ۶۵

تم نہیں جانتے ہو سکتا ہے وہ (قبولیت کے ساتھ) آپ پر پیش کیا جا رہا ہو۔ شاگردوں نے کہا پھر آپ ہمیں سکھائیں ہم کیسے اپنے درود کو اچھا بنائیں، تو آپؐ نے فرمایا یوں کہو۔

اللّٰھم اجعل صلٰوتك و رحمتك و برکاتك علیٰ سیّد المرسلین و امام المتقین و خاتم النبیین محمد عبدك و رسولك امام الخیر و قائد الخیر و رسول الرحمة. اللّٰھم ابعثه مقامًا محمودًا یغبط به الاوّلون و الاٰخرون اللّٰھم صل علیٰ محمد و علیٰ اٰل محمد کما صلیت علیٰ ابراھیم و علیٰ اٰل ابراھیم انك حمید مجید. اللّٰھم بارك علیٰ محمد و علیٰ اٰل محمد کما بارکت علیٰ ابراھیم و علیٰ اٰل ابراھیم انك حمید مجید۔

نوٹ:-

قارئین سے درخواست ہے کہ آپ بھی ایک دفعہ پوری توجہ کے ساتھ اس پیرایہ میں حضورؐ پر درود بھیجیں ـــــ گر قبول افتد زہے عزّ و شرف. جمعہ کے دن یہ عمل کریں تو انشاء اللہ زیادہ فائدہ مند رہے گا.

درود پہنچانے والے کارکنانِ الٰہی

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہی بیان کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

ان اللّٰہ ملٰئکة سیاحین فی الارض یبلغونی من امتی السلام[1]

ترجمہ۔ بے شک اللہ تعالیٰ کے فرشتے سیاحتِ ارض پر مقرر ہیں وہ میری امت کا سلام مجھے پہنچاتے رہتے ہیں۔

درود پڑھنے والے تو بے شک زمین پر ہیں، اب درود جسے پہنچانا ہے وہ اگر آسمانوں پہ

---

[1] سنن نسائی جلد ا ص۱۴۳ سنن دارمی ص۳۷۲

ہو یا اعلیٰ علیین میں تو وہ فرشتے جو اس کام پہ کارکنانِ الٰہی لگے ہوئے ہیں۔ سیاحین فی الارض (زمین پر پھرنے والے) کیسے تصور ہوں گے۔ اگر وہ درود شریف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قبرِ انور پر پہنچاتے ہوں تو بات صاف سمجھ میں آتی ہے کہ یہیں سے لیتے ہیں اور یہیں پہنچاتے ہیں اور اسی سبب سے وہ سیاحین فی الارض ٹھہرتے ہیں اور وہ زمین و آسمان میں چکر لگانے والے نہ ہوئے۔ لیکن اگر درود روضۂ انور پہ پیش نہیں ہوتا تو سیاحین فی الارض میں خطرناک تاویل کرنی پڑے گی۔ حضورؐ جب اس دُنیوی زندگی میں تھے تو اس وقت حضورؐ کو جو فرشتے درود پہنچاتے تھے وہ بھی تو یہی سیاحین فی الارض تھے ——— آپ کی وفات سے اس نظام میں تو کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ سب سیاحین فی الارض حضورؐ کے امتیوں کا سلام اپنے طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر عرض کرتے ہوں گے یا وہاں ان کا سردار کوئی اور فرشتہ ہو گا جو ساری دُنیا میں دُور رہنے والے امتیوں کے سلام اُن سے لے گا اور ان امتیوں کی طرف سے حضورؐ کو پہنچائے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پہ صلوٰۃ و سلام پیش ہونے کی روایات اس قدر ہیں کہ ان پہ تواترِ معنوی کا دعوے کیا جا سکتا ہے۔ کوئی مسلمان نہیں جو حضورؐ پہ خلوصِ دل سے صلوٰۃ و سلام کہے اور وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر پیش نہ ہوتا ہو۔ آپؐ نے فرمایا :۔

عن ابی الدرداء رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم اکثروا الصلوٰۃ علی یوم الجمعۃ فانہ مشہود تشہدہ الملٰئکۃ وان احدًا لن یصلی علی الا عرضت علی صلوتہ حتی یفرغ منہا[1]

ترجمہ: جمعہ کے دن مجھ پر درود کثرت سے پڑھا کرو۔ یہ یوم مشہود (حاضری کا دن) ہے اس دن فرشتے حاضری دیتے ہیں۔ کوئی شخص مجھ پہ درود نہیں پڑھتا مگر یہ کہ وہ مجھ پر پیش ہوتا ہے یہاں تک کہ وہ اس سے فارغ ہو جائے۔

یعنی جمعہ کے دن تو وہ پڑھتے پڑھتے ہی پیش ہو رہا ہے۔ کیونکہ جمعہ کے دن فرشتے آپ

---

[1] رواہ ابن ماجہ کما فی منتقی الاخبار جلد ۳ صـ ۲۰۴

پر حاضری دیتے ہیں کہ امت کا صلوٰۃ وسلام آپ کو پہنچا دیں۔ دوسرے دنوں میں پڑھا جانے والا بھی جمعہ کے دن ہی پیش ہوتا ہے۔

سیّاحین فی الارض کا دائرہ کار

درود وسلام پہنچانے والے فرشتوں کا دائرہ کار دور سے درود پڑھنے والوں اور حضورؐ کے روضۂ پاک کے مابین ہے جو خود آکر سلام عرض کریں اس میں فرشتے واسطہ نہیں بنتے۔ ملا علی قاری (۱۰۱۴ھ) لکھتے ہیں:۔

درود وسلام پہنچانے کے لیے فرشتوں کا تقرر اس شخص کے ساتھ مخصوص ہے جو روضۂ اطہر سے دُور ہو[1]

شیخ عبدالحق دہلویؒ (۱۰۵۲ھ) سیدنا حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے نقل کرتے ہیں:۔

نیز از ابن عمرؓ آمدہ ومن صلّ عليّ عند قبری زدت علیه ومن صلّ عليّ فی مکان اٰخر بلغونیه۔[2]

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے بھی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ جو میری قبر کے پاس آکر مجھ پر درود پڑھے گا میں اس پر اور سلام کہوں گا اور جو کسی اور جگہ سے مجھ پر درود پڑھے گا وہ (سمجھو) مجھے فرشتوں نے پہنچایا ہے (اس میں میری طرف سے جواب لازم نہیں)۔

قاضی شوکانیؒ (۱۲۵۵ھ) اس قسم کی احادیث پر جن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ وسلام پیش ہونے کا بیان ہے بحث کرتے ہوئے اپنا حاصلِ مطالعہ ان الفاظ میں لکھتے ہیں:۔

والاحادیث فیها مشروعیة الاکثار من الصلوٰة علی النبیّ صلی اللہ علیه وسلم یوم الجمعة وانها تعرض علیه صلی اللہ علیه وسلم وانه حي فی قبره

---

[1] مرقات جلد ۲ صفحہ ۔ [2] جذب القلوب الیٰ دیار المحبوب صفحہ ۱۸۲

وورد النص فی کتاب اللہ فی حق الشهداء انهم احیاء یرزقون وان الحیاة فیهم متعلقة بالجسد فکیف بالانبیاء والمرسلین۔[1]

ترجمہ۔ اور احادیث میں جمعہ کے دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کثرت سے درود پڑھنے کی مشروعیت ہے اور اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ نبی اکرمؐ پر پیش کیا جاتا ہے اور یہ بات بھی صحیح ہے کہ آپ اپنی قبر مبارک میں زندہ ہیں اور قرآن کریم میں شہداء کے حق میں یہ نص موجود ہے کہ وہ زندہ ہیں اور انہیں (اگلے جہان کے حسب حال) رزق بھی ملتا ہے اور ان کی حیات صرف روح کی نہیں جسد کے ساتھ ہے جب شہداء کا یہ حال ہے تو انبیاء و مرسلین کی حیات (فی القبر) کتنی قوی ہوگی۔

ایک سوال

درود پڑھنے والوں کا درود اگر اس زندگی میں بھی حضورؐ پہ پیش ہوتا تھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب مقام حدیبیہ میں تھے اور کسی نے خبر دی کہ حضرت عثمانؓ مکہ میں شہید کر دیئے گئے ہیں اور آپ نے اُن کے خون کے بدلہ میں پندرہ سو صحابہؓ سے بیعت لی اور حضرت عثمانؓ کی طرف سے بھی اپنے بائیں ہاتھ سے بیعت لی تو آپ کو اُن کا درود پیش ہونے سے کیوں پتہ نہ چلا کہ آپ مکہ میں زندہ ہیں، شہید نہیں کیے گئے۔ آپ کو پتہ چل جانا چاہیے تھا کہ قتلِ عثمانؓ کی اطلاع غلط ہے؟

جواب :-

(۱) جب آپ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف سے بھی بیعت لی تو کیا یہ اس بات کا اشارہ نہیں کہ آپ کا گمان یہی تھا کہ یہ خبر غلط ہے۔

(۲) اگر حضرت عثمانؓ شہید بھی ہو گئے ہوتے اور یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ شہداء زندہ ہیں اور یہ بات بھی اپنی جگہ ثابت ہے اونچے درجے کے مقربین برزخ اور جنت میں بھی اعمال طاعت

---

[1] نیل الاوطار جلد ۳ صفحہ ۳۰۵

میں لگے رہتے ہیں. گویا ان پر فرض اور واجب نہ ہو تو اگر حضرت عثمانؓ کی طرف سے درود برابر آرہا تھا. تو کیا یہ اس کا محل نہیں ہو سکتا تھا کہ آپ عالم برزخ میں حضورؐ پہ درود وسلام بھیج رہے ہوں اس احتمال کے ہوتے ہوئے حدیبیہ میں اس خبر شہادت سے آپ پہ درود پیش ہونے کی روایات رد نہیں کی جا سکتیں۔

③ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ پر پوری امت کا درود اجمالاً پیش کیا جاتا ہو تفصیلاً نہیں یا یہ کہ صرف جمعہ کو پیش ہوتا ہو. ہر روز نہیں.

④ آپ پہ اعمالِ امت پیش ہونے کی روایات تو ملتی ہیں. آپ پہ حالاتِ امت پیش ہوتے ہوں. یہ بات کسی روایت میں نہیں ملتی. امت کے مجموعی حالات کی آپ کو اطلاع ملتی ہو. اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ فرداً فرداً ہر ایک کی آپ کو اطلاع دی جائے. ان امور میں غور کرنے سے آپ کے شبہات کا انشاء اللہ العزیز ازالہ ہو جائے گا.

یہ فصل درود وسلام کے پیش ہونے کے بارے میں تھی، یہ حدیث ان صلوٰتکم معروضۃ علیّ کا مختلف پہلوؤں سے بیان تھا. رہا حضورؐ کے روضۂ پاک پہ حاضر ہو کر خود براہ راست درود وسلام پڑھنا تو یہ پیش ہونے کا موضوع نہیں، اس پر ایک مستقل باب آگے آرہا ہے۔

المبحث السادس — التحقیق المفید فی الذب عن الشیخ الشہیدؒ

بعض مبتدعین حضرت مولانا شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ کے ذمہ یہ لگاتے ہیں کہ وہ انبیائے کرام کے (وفاتِ شریفہ کے بعد) مٹی کے ساتھ مٹی ہو جانے کے قائل تھے. ان کے نزدیک یہ حدیث کہ اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرام کے اجسادِ مطہرہ مٹی پہ حرام فرما دیئے، ثابت نہیں، اور اگر ثابت تھی، تو پھر ان کی تحقیق میں ضعیف ہو گی. اس الزام کے لیے حضرت شہیدؒ کی جو عبارت جو پیش کی جاتی ہے، وہ یہ ہے:

یعنی میں بھی ایک دن مر کر مٹی میں ملنے والا ہوں، تو کب سجدے کے لائق ہوں.

یہاں لفظ "ملنا" محل اعتراض ہے اور اسی پہ الزام کی ساری عمارت تعمیر کی جاتی ہے حالانکہ مٹی کے ساتھ ملنا اور بات ہے اور مٹی ہونا اور بات ہے۔

اُردو زبان میں لفظ "ملنا" کے یہ معنی ملتے ہیں:۔

پیوستہ ہونا، ملحق ہونا، چسپاں ہونا، ایک ذات ہونا۔ نور اللغات جلد ۴ ص ۶۳۲

معترضین خواہ مخواہ اس لفظ کو چوتھا معنی پہناتے ہیں۔ تاکہ ہم کفر کی مشین کو حرکت دے سکیں حق یہ ہے کہ حضرت شیخ شہیدؒ کی عبارت میں یہ پہلے معنی مراد ہیں۔ اس تشریح میں حضورؐ کی طرف سے یہ کہا جارہا ہے کہ مجھے بھی ایک دن پردۂ قبر میں جانا ہے۔ مٹی میں ملنے والا ہوں۔ اس سے مراد یہی ہے کہ ایک دن مجھے قبر کی مٹی سے ملحق ہونا ہے، نہ یہ کہ مجھے مٹی ہو جانا ہے۔ (معاذاللہ)

اردو زبان کا جامع ترین لغت، "جامع اللغات" جلد ۲ ص ۵۹۵ میں خاک میں ملنا کے معنی دفن ہونا اور مٹی میں پڑنا بھی لکھے ہیں۔ جلد ۴ ص ۴۶ میں لکھا ہے:۔ مٹی سے مٹی مل جانا، دفن ہونا۔

منیر اللغات ص ۹ میں ہے:۔ خاک میں ملنا۔ دفن ہونا۔

اسی طرح سعید اللغات مرتبہ منیر لکھنوی میں ہے:۔ مٹی میں مل جانا۔ دفن ہو جانا۔

ان تصریحات کی موجودگی میں ظاہر ہے کہ مٹی میں ملنے والا ہوں کا معنی یہی ہے کہ ایک دن مجھے قبر میں دفن ہونا ہے۔ اب اسے ضد و عناد سے ان معنوں پر محمول کرنا، جو مصنف کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ گزرے ہوں، کس قدر فریب اور ظلم ہے۔ والی اللہ المشتکیٰ!

پیش نظر رہے کہ جب کوئی چیز دوسری چیز کے ساتھ کسی ایک جہت سے چسپاں ہو تو اس ملنے کو اس طرح تعبیر کرتے ہیں کہ "یہ چیز اس چیز سے ملی ہوئی ہے" لیکن اگر اول الذکر کو اس ثانی الذکر چیز نے چاروں طرف سے احاطہ کر رکھا ہو اور اس کی ہر جہت اس سے ملحق ہو رہی ہو تو پھر پہلی چیز کے متعلق یہ نہیں کہا جائے گا کہ "یہ چیز اس سے ملی ہوئی ہے" بلکہ زیادہ بلیغ انداز یہی ہو گا کہ "سے" کے بجائے "میں" کا لفظ اختیار کیا جائے۔ حضور اکرمؐ کے جسد اطہر پہ روضۂ منورہ ہر جہت سے چسپاں ہو رہا ہے۔ اس لیے حضورؐ کی طرف سے یہ مضمون ان لفظوں میں ادا کیا گیا:۔ مٹی میں ملنے والا ہوں۔ تو کب سجدے کے لائق ہوں۔

ویسے نور اللغات جلد ۴ صفحہ ۴۳۸ پر لکھا ہے کہ "میں" کبھی "سے" کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ جیسے کہتے ہیں درخت میں باندھ دو یعنی درخت سے باندھ دو۔

مبتدعین محض بغض و عناد اور اپنی کور باطنی کی وجہ سے اس عبارت کے معنی بگاڑتے ہیں اور اس مضمون کو حدیث حفظ اجساد انبیاء سے خواہ مخواہ ٹکراتے ہیں۔ حالانکہ حضرت شیخ شہیدؒ اور ان کے حلقۂ اعتقاد میں اس عبارت کا مفہوم ہمیشہ یہی سمجھا گیا کہ حضور اکرمؐ ایک دن ضرور پردۂ قبر میں تشریف لے جائیں گے اور اس کے لیے آپ کو اس دروازے سے بھی گزرنا ہوگا۔ جس کے بغیر کوئی اس عالم سے اس عالم میں منتقل نہیں ہو سکتا اور اسی دروازے کو موت کہتے ہیں۔ جس کی لذت آشنائی انبیاء کے لیے بھی ضرور ہے۔ کل نفس ذائقۃ الموت

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ لکھتے ہیں:۔

مٹی میں ملنے کے دو معنی ہیں، ایک یہ کہ مٹی ہو کر زمین کے ساتھ خلط ہو جائے جیسا سب اشیاء زمین پر پڑ کر خاک ہو کر زمین ہی بن جاتی ہیں، دوسرے مٹی سے متصل ہونا، یہاں (یعنی مولانا اسماعیل شہیدؒ کے کلام میں) مراد دوسرے معنی ہیں اور جسدِ انبیاء علیہم السلام کے خاک نہ ہونے کے مولانا اسماعیل شہیدؒ بھی قائل ہیں۔[1]

محدثینِ حنفیہ اور شافعیہ نے بھی اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے (جس کی تشریح کے ضمن میں مولانا اسماعیل شہیدؒ نے عبارت زیرِ بحث لکھی تھی) آنحضرتؐ کی طرف سے ایک ایسے ہی مضمون کو ادا کیا ہے:۔

اسجدوا للحی الذی لا یموت ولمن ملکہ لا یزول فانک انما تسجد لی الاٰن مھابۃ واجلالاً فاذا صرت رھین رمس امتنعت عنہ[2]

ترجمہ: سجدے تم اس ذات کو کرو جو زندہ ہے اور اس پر فنا کبھی نہ آئے گی اور جس کی بادشاہی لازوال ہے۔ بے شک تو اس وقت تو میری ہیبت اور میری

---

[1] فتاویٰ رشیدیہ صفحہ ۹ [2] مرقات جلد ۱ صفحہ ۴۶۹

تعظیم کے لیے سجدہ کرنے کرتیار ہو رہا ہے لیکن جب میں مٹی کے قبضے میں چلا جاؤں گا تو اس وقت تو سجدے سے رُک جائے گا۔

علامہ طیبیؒ شافعیہ میں اور ملا علی قاریؒ حنفیہ میں بہت بلند پایہ ائمہ فقہ و حدیث ہیں، انہوں نے ارشادِ نبوت کے اس مضمون کو آں حضرتؐ کی طرف سے اسی طرح ادا فرمایا ہے جس طرح کہ مولانا اسماعیل شہیدؒ نے اس مضمونِ حدیث کو بیان کیا ہے۔ ہاں ان بزرگوں کے الفاظ فاذا صرت رهين ومس۔ جب میں قبر کی مٹی میں گرفتار ہو جاؤں۔ مولانا شہید کے مقابلے میں ذرا زیادہ سخت ہیں۔

بعض مبتدعین مٹی کی پوری بحث ہی کو ہدفِ طعن بنا لیتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا جسدِ اطہر ہی خاکی نہ تھا۔ نہ مٹی سے بنا اور نہ مٹی میں سے بنے کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ یاد رہے کہ مولوی احمد رضا خاں صاحب حضور انورؐ کی حدیث نقل فرما رہے ہیں۔ کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

انا وابوبکر و عمر خلقنا من تربة واحدة فيها ندفن۔ فتاویٰ افریقیہ ص۸۵

ترجمہ۔ میں اور ابوبکرؓ و عمرؓ ایک ہی مٹی سے بنے ہیں اور اسی میں دفن ہوں گے۔

معلوم ہوا کہ جسدِ اطہر خاکی ہی تھا اور ذاتِ اقدس کو مٹی سے گریز نہ تھا۔ ہاں آپ اپنی صفات میں منبعِ نور و عرفان اور مرکزِ ہدایت و ایمان تھے اور اس سے کس بدبخت کو انکار ہو سکتا ہے۔

مولانا شہیدؒ کا حفظِ جسدِ اطہر کا عقیدہ

مولانا شہیدؒ کا عقیدہ تھا کہ آپؐ کا جسدِ اطہر روضہ میں مختفی اور محفوظ ہے ریزہ ریزہ نہیں۔ آپ مثنوی سلکِ نور میں لکھتے ہیں ؎

ان آنکھوں سے ہر چند وہ جسم پاک | بظاہر ہوا مختفی زیرِ خاک
ولے نور ان کا ہے قائم مقام | کہ ہر پاک دل میں ہے انکا مقام

جو زیرِ پردہ ہے وہ آپ کا جسم ہے جو ہر جگہ پھیلا ہے وہ آپ کا نور ہے۔

الفصلُ الثّانی

وفیہ ستّۃ من المباحث

حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

ما من احد یسلم علیّ الا رد اللہ علیّ روحی حتّٰی ارد علیہ السلام۔[1]

ترجمہ: کوئی شخص ایسا نہیں کہ مجھ پر سلام بھیجے مگر یہ کہ اللہ میری روح مجھ پر لوٹا دے گا یہاں تک کہ میں اس کا جواب دوں۔ (وعلیک السلام کہوں)

المبحث الاوّل فی معنی الحدیث

اس حدیث پر یہ چند سوال اُبھرتے ہیں ان پر غور فرمالیجئے:۔

① سلام کرنے والا سلام کہنے کے لیے کہاں آئے؟ مدینہ منورہ کے روضۂ اطہر پہ یا اپنے تصور میں اعلیٰ علیین پہنچے۔ پھر یہ کہ کیا دور سے بھی آپ کو سلام کیا جاسکتا ہے جس طرح درود بعید سے بھی بھیجا جاسکتا ہے؟

② سلام کرنے والا روحِ اقدس پر سلام عرض کر رہا ہے یا جسدِ اطہر پہ؟ اللہ مجھ پہ روح لوٹاتا ہے۔ یہاں مجھ سے مراد جسدِ اطہر نہیں تو اور کیا چیز ہے جس پہ روح اقدس لوٹتی ہے؟

③ اگر جسد پر روح لوٹتی ہے تو کیا وہ بے جان محض ہے جس پہ درود و سلام پیش ہوتا ہے یا وہ جسدِ اطہر زندہ ہے اور اس پہ روح لوٹنے کا مطلب روحِ اقدس کا اس زائر کی طرف متوجہ ہونا ہے؟

---

[1] سنن ابی داؤد جلد ا صفحہ ۲۷۹ مسند امام احمد جلد ۲ صفحہ ۵۲۷

④ جب ہر وقت روضہ منورہ پہ زائرین کا ایک تانتا بندھا ہے تو روح اقدس کا اشراف یا اس کی توجہ بدنِ اطہر پہ دائماً ہے یا انقطاعاً۔ اس دوسری صورت میں اس کی صورت عمل کیا ہوگی؟

الجوابات

سلام گو ہم یہاں سے بھی گذارش کرتے ہیں اور ہر نماز میں السلام علیك ایہا النبی و رحمۃ اللہ کہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے فرشتے بھی روئے زمین پر گھومتے ہیں۔ جہاں کسی نے آپ پر سلام کہا انہوں نے حاضری پہ وہ سلام حضورؐ کے گذارش کر دیا۔ مگر حدیث زیر بحث پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سلام جسدِ اطہر پہ ہی عرض کیا جائے گا۔ روح کے آنے جانے یا توجہ کرنے کا محل روضۂ پاک ہی ہے۔ اور روح اقدس اس جسد اطہر پہ ہی متوجہ ہوتی ہے جو روضۂ پاک میں مدفون ہے۔ سو زائرین سلام کے لیے یہی حاضری دیں۔ روح کا قرینہ بتلا رہا ہے کہ جہاں بدن اطہر ہے وہیں سلام پیش ہوتا ہے۔

حافظ ابن قدامہ حنبلی (۶۲۰ ھ) نے اس روایت میں عند قبری کے الفاظ بھی نقل کیے ہیں اب ظاہر ہے کہ قبر سے مراد وہی جگہ ہوگی جسے لوگ قبر جانتے ہوں نہ کہ اعلیٰ علیین کی کوئی اور جگہ۔

ما من احد یسلم علیّ عند قبری ۔۔۔۔ الحدیث[1]

حضورؐ کی قبر یہی ہے جس پہ زائرین حاضری دیتے ہیں۔ روح اقدس اعلیٰ علیین میں ہو تو بھی قبر مبارک یہی ہے اور اسی دُنیوی جسدِ اقدس میں برزخی حیات ہے جو دیکھنے والوں کو تو نظر نہ آئے لیکن آپ اس میں نمازیں بھی پڑھتے ہوں اور سلام زائرین کا جواب بھی دیتے ہوں۔ بلکہ دُور سے پڑھنے والوں کا سلام بھی فرشتے آپ کو یہیں پہنچاتے ہیں[2] اور روح اقدس کی کچھ جہات ان کی طرف متوجہ ہوتی ہوں۔ آفتاب کی کروڑوں کرنیں زمین پہ جلوہ ریز ہوں اسے تو آسانی سے تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ کیونکہ مشاہدہ ہے اور اس لیے کہ یہ عام ہے لیکن روح اقدس کی کروڑوں روحانی کرنوں کا تسلیم

---

[1] المغنی جلد ۳ صفحہ ۵۵۸ روایۃ عن احمد اسے ہم تائیداً نقل کر رہے ہیں۔ [2] قال ابن عبد الهادی هو صلی اللہ علیہ وسلم یسمع السلام من القرب وتبلغه الملٰئكة الصلوٰة والسلام من البعد۔ (الصارم المنكی ص ۲۸۲)

کر لینا ہمارے دوستوں کے لیے سوہان روح بنا ہوا ہے کیونکہ یہ جلوے برزخی ہیں اور ان کی آنکھوں سے اوجھل ہیں۔ اور معتزلہ ان چیزوں کو ماننے کے لیے تیار نہیں جو ان کے حواس میں نہ آئیں۔

حدیث میں سلام کا ذکر پہلے ہے اور ردِ روح کا بعد میں —— اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ سلام دائرین جسدِ اطہر پر ہی پیش ہوتا ہے۔ علامہ زین الدین ابوبکر المراغی (۸۱۶ھ) لکھتے ہیں:۔

اعلم ان کتب السنة متضمنة للاحادیث الدالة علیٰ ان روح النبی صلی اللہ علیہ وسلم ترد علیہ وانہ یسمع و یرد علیہ السلام[1]

ترجمہ۔ جان لو اہل سنت کی کتابوں میں کتنی احادیث ہیں جو اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روحِ اطہر آپ کی طرف لوٹائی جاتی ہے اور آپ سلام سُنتے بھی ہیں اور جواب بھی دیتے ہیں۔

علامہ عزیزی جامع صغیر میں لکھتے ہیں:۔

الارد اللہ علی روحی ای رد علی نطق لانہ حی دائما و روحہ لاتفارقہ[2]

ترجمہ۔ بگمیہ کہ اللہ تعالیٰ مجھ پر میری روح لوٹا دیتا ہے یعنی میرا نطق اور تکلم مجھے دیا جاتا ہے (یہ تشریح اس لیے ضروری ہے) کہ آپ زندہ ہیں اور آپ کی روح مقدسہ آپ سے جدا نہیں ہوتی۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی بھی اس حدیث سے حیاتِ انبیاء پر استدلال کرتے ہیں:۔

بدانکہ حیاتِ انبیاء صلوات اللہ وسلامہ علیہم اجمعین متفق علیہ است میانِ علماء ملت و ہیچ کس را خلاف نیست دراں ۔۔۔۔ ایں حدیث صحیح است ما من مسلم یسلم علی الارد اللہ علی روحی[3]

ترجمہ۔ جان لو کہ حیاتِ انبیاء اللہ کے نبیوں کی حیات اللہ کے صلوٰت اور تسلیمات ان پر ہوں تمام علمائے امت کے ہاں متفق علیہ ہے کسی عالم کا اس سے اختلاف نہیں۔ یہ حدیث صحیح ہے کہ کوئی مسلمان ایسا نہیں کہ جب مجھ پر سلام بھیجے تو اللہ تعالیٰ مجھ پر میری روح متوجہ نہ کرے۔

---

[1] تحقیق النصرۃ ص ۱۱۱ المطبوع بمصر [2] السراج المنیر جلد ۳ ص ۲۶۹ [3] مدارج النبوت جلد ۲ ص ۴۴۸

ہمارے یہ کرم فرما کبھی کہتے ہیں کہ شیخ عبدالحق کا اسے متفق علیہ کہنا درست نہیں شیخ تصحیح میں متساہل تھے۔ ہم عرض کرتے ہیں امام ابن تیمیہؒ تو متساہل نہ تھے۔ ان سے کون متشدد زیادہ ہوگا۔ آپ بھی یہی بات کہتے ہیں جو حضرت شیخ نے کہی ہے:۔

واتفق الائمة علی انه یسلم علیه عند زیارته وعلی صاحبیه لما فی السنن

عن ابی هریرة عن النبی صلی الله علیه وسلم انه قال مامن مسلم یسلم علی

الا رد الله علی روحی۔[1]

ترجمہ: اور اس پر تمام ائمہ کا اتفاق ہو چکا ہے کہ حضور کی (قبر کی) زیارت کے وقت آپ پر اور حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ پر سلام عرض کیا جائے۔ سنن میں حضرت ابوہریرہؓ سے یہ حدیث مروی ہے وہ اسے حضورؐ سے نقل کرتے ہیں کہ کوئی مسلمان ایسا نہیں کہ جب وہ مجھ پر صلوٰۃ و سلام بھیجے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھ پر میری روح لوٹا دیتے ہیں۔

امام طبرانی اور بیہقی نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے۔

المبحث الثانی ـــــ اس حدیث کی سندِ تحقیق

صحاح ستہ میں یہ حدیث ابوداؤد کی روایت سے ہے۔ اس کے راوی یہ ہیں:۔

۱۔ ابوداؤد صاحب سنن۔ ۲۔ ابوحاتم محمد بن عوف۔ ۳۔ عبدالرحمٰن بن یزید المقری۔ ۴۔ حیوۃ بن شریح۔ ۵۔ ابوصخر حمید بن زیاد۔ ۶۔ یزید بن عبداللہ بن قسیط۔ ۷۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ صحابیِ رسول۔

ابوحاتم محمد بن عوف کو امام نسائی نے ثقہ کہا ہے۔[2] عبدالرحمٰن بن یزید المقری کو بھی امام نسائی نے ثقہ کہا ہے۔[3] حیوۃ بن شریح کو امام یحییٰ بن معین ثقہ کہتے ہیں۔[4] علماء مصر کے استاد تھے۔[5] ابوصخر حمید بن زیاد کو دارقطنی جیسے متشدد نے بھی ثقہ کہا ہے۔[6] یزید بن عبداللہ بن قسیط کو امام نسائی

---

[1] فتاویٰ امام ابن تیمیہ جلد ۴ ص ۳۶۱ [2] تہذیب التہذیب جلد ۹ ص ۳۸۴ [3] ایضاً جلد ۶ ص ۸۴ [4] ایضاً جلد ۳ ص ۷۱ [5] تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص ۱۸۶ [6] تہذیب جلد ۳ ص ۳۴۲

ثقہ اور محمد بن معین لیس بہ بأس[1] کہتے ہیں۔ ان روات میں کوئی کذاب نہیں۔ جو واعظین ان رواۃ حدیث کو کذاب کہتے ہیں وہ خود بڑے کذاب ہیں۔

تصحیح محدثین

① حافظ ابن کثیر (۷۷۴ھ) امام نووی (۶۷۶ھ) سے اس کی تصحیح نقل کرتے ہیں۔[2]

امام نووی کتاب الاذکار میں لکھتے ہیں۔ بالاسناد الصحیح ص۱۰۱ اور ریاض الصالحین ص۴۹۲ میں بھی اس کی تصحیح کرتے ہیں۔

یہ ساتویں آٹھویں صدی کی شہادت ہے۔ علامہ سبکی (۷۷۱ھ) لکھتے ہیں۔ امام احمد (۲۴۱ھ) اور ابوداؤد (۲۷۵ھ) نے اس روایت پر اعتماد کیا ہے۔ یہ تیسری صدی کی شہادت ہے۔

② حافظ ابن حجر عسقلانی (۸۵۲ھ) لکھتے ہیں رواتہ ثقات (اس کے سب راوی ثقہ ہیں)۔[3]

③ علی شیخ احمد العزیزی (۱۰۵۰ھ) شارح جامع الصغیر لکھتے ہیں۔ اسنادہ حسن۔[4]

④ علامہ سمہودی (۹۱۱ھ) لکھتے ہیں۔ روی ابوداؤد بسند صحیح۔[5]

⑤ علامہ زرقانی (۱۱۲۲ھ) لکھتے ہیں۔ باسناد صحیح۔[6]

⑥ شیخ عبدالحق محدث دہلوی (۱۰۵۲ھ) لکھتے ہیں:۔ ایں حدیث صحیح است۔[7]

⑦ نواب صدیق حسن خاں (۱۳۰۷ھ) لکھتے ہیں:۔

قال النووی فی الاذکار اسنادہ صحیح وقال ابن حجر رواتہ ثقات۔[8]

⑧ امام العصر علامہ انور شاہ کشمیری (۱۳۵۲ھ) لکھتے ہیں۔ رواتہ ثقات۔[9]

⑨ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی (۱۳۶۹ھ) لکھتے ہیں:۔

---

[1] تہذیب جلد ۱۱ ص۳۴۲ قال ابن عبد البر ثقہ من الثقات [2] تفسیر ابن کثیر جلد ۳ ص۵۱۴ [3] فتح الباری جلد ص [4] السراج المنیر جلد ۳ ص۲۶۹ [5] وفاء الوفاء ص۴۰۳ جلد دوم [6] زرقانی شرح مواہب جلد ۸ ص۳۰۵ [7] مدارج النبوۃ جلد ۲ ص۴۴۷ [8] دلیل الطالب ص۸۴۳ [9] عقیدۃ الاسلام ص۵۲

عن ابی ھریرۃ رضہ ما من احد یسلم علی الارد اللہ علی روحی حتی ارد علیہ السلام ورواتہ ثقات ..... انہ یستغرق فی امور الملاء الاعلیٰ فاذا سلمہ الیہ جع الیہ فہمہ لیجیب من سلم علیہ۔[1]

(۱۰) محدث العصر علامہ ظفر احمد عثمانی دامت برکاتہم لکھتے ہیں:۔

رواہ ابو داؤد بسند صحیح واعتمد علیہ جماعۃ قال السبکی وھو اعتقاد صحیح۔[2]

ایک اعتراض ۔ وہ یہ کہ حضرت ابو ہریرہؓ اور یزید بن عبد اللہؓ کے درمیان انقطاع ہے امام مالک نے یزید بن عبد اللہ بن قسیط پر جرح کی ہے اور یہ کہ یزید بن عبد اللہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا؟

الجواب وہو صدق والصواب

یہ صحیح نہیں کہ امام مالک یزید بن عبد اللہ بن قسیط کو لائق اعتماد نہ سمجھتے تھے۔ ابو حاتم کی رائے صحیح نہیں، امام ابن عبد البر مالکی ہیں انہوں نے ابو حاتم کا رد کیا ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں:۔

ویزید قد احتج بہ مالک فی مواضع من المؤطا وھو ثقۃ من الثقات۔[3]

حافظ ابن حجر یہ بھی لکھتے ہیں۔ روی عن ابن عمر وابی ھریرۃ۔

اب کیسے مان لیا جائے کہ یزید بن عبد اللہ نے حضرت ابو ہریرہؓ کو نہیں پایا۔ یزید بن عبد اللہ کی عمر حضرت ابو ہریرہؓ (۵۸ ھ) کی وفات کے وقت ۲۶ سال کے قریب تھی۔ تحمل روایت میں سب سے زیادہ سختی کوفیوں کے ہاں تھی وہ بھی بیس سال کی عمر پر کسی کو سماع سے نہیں روکتے تھے ہم یہ کیسے تسلیم کرلیں کہ یزید بن عبد اللہ اس عمر تک حضرت ابو ہریرہؓ جیسی شخصیت سے بیگانہ رہے ہوں۔

حدیث مذکور آپ کی روضہ مبارکہ کی حیات پر نص ہے۔ رد اللہ علی روحی سے جو ابہام پیدا ہوتا تھا وہ امت کے دائمی صلوٰۃ وسلام اور وہاں ہر وقت کی حاضری خاص وعام کے باعث

---

[1] فتح الملہم جلد ا صفحہ ۲۲ [2] اعلاء السنن طبع قدیم جلد ۱ صفحہ ۲۲۴ [3] تہذیب التہذیب جلد ۱۱ صفحہ ۳۴۳

کسی درجہ میں در خورِ اعتنا نہیں۔ افسوس صد افسوس کہ ہمارے بعض کرم فرما اب آکر ان روایات سے کھلا تصادم کہہ رہے ہیں جن میں جمعہ کے دن آپ پر صلوٰۃ وسلام کے پیش ہونے کا بیان ہے۔ سو مناسب ہوگا کہ اس اضطراب کو بھی رفع کرلیا جائے۔ معلوم رہے کہ یہ اضطراب سند کا نہیں مضمون کے ظاہر کا ہے اور اس میں تطبیق ممکن ہے۔

المبحث الثالث ــ کشف الحجاب عن وجہ الاضطراب

حضرت ابوالدرداءؓ کی روایت ابن ماجہ کے حوالے سے آپ کے سامنے آچکی ہے۔ اس میں درود پڑھتے ہی اس کے پیش ہونے کا بیان ہے۔

ان احدًا لن یصلی علی الا عرضت علی صلوٰتہ حتی یفرغ منہا۔

ترجمہ: کوئی مجھ پر درود نہیں پڑھتا، مگر یہ اس کے فارغ ہوتے ہی مجھ پر پیش کر دیا جاتا ہے۔

اس میں جو پہلے یوم جمعہ کی فضیلت اور صلوٰۃ وسلام پیش ہونے کا بیان ہے۔ اس میں فضیلت کے اوقات میں درود جیسے اعمالِ صالحہ کی ترغیب ہے۔ صلوٰۃ وسلام پیش ہونے کے لیے جمعہ کی تخصیص نہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اوقات فاضلہ میں اعمالِ صالحہ کا درجہ اور زیادہ بلند ہو جاتا ہے[1] حضرت اوس بن اوسؓ کی روایت کا مفاد بھی یہی ہے۔ حصن حصین کے الفاظ "لیس یصلی علی احد یوم الجمعۃ الا عرضت علی" میں بھی جمعہ کے دن پیش ہونے کی تخصیص نہیں۔ جمعہ کے دن درود پڑھنے پر اس کے پیش ہونے کی یہ بشارت ہے اور جو یوم جمعہ کی فضیلت میں فرمایا:

فانہ مشہود تشہدہ الملئکۃ۔

ترجمہ: اس دن فرشتے حاضر رہتے ہیں۔

---

[1] ان العمل الصالح زید فضلًا بواسطۃ فضل الوقت وعلی ہذا لاحاجۃ الی تقیید العرض بیوم الجمعۃ قالہ السندھی۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ جمعہ کے ماسوا باقی دنوں میں فرشتے بالکل حاضر نہیں ہوتے، بلکہ یہاں مراد کثرتِ شہود ہے، نہ یہ مطلب ہے کہ روضۂ منورہ پر صلوٰۃ وسلام عرض کرنے والے ہی فرشتے اس دن حاضر ہوتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے تو اللہ تعالیٰ نے سیاح فرشتوں کی ایک مستقل جماعت مقرر کر رکھی ہے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی یہ روایت آپ پڑھ آئے ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا:۔

ان للہ ملٰئکۃ سیاحین فی الارض یبلغونی من امتی السلام[1]

ترجمہ۔ بے شک اللہ تعالیٰ کے فرشتے سیاحتِ ارض پہ مقرر ہیں جو میری امت کا سلام مجھے پہنچاتے رہتے ہیں۔[2]

یہاں اس سیاحت کے لیے یومِ جمعہ کی کوئی تخصیص نہیں۔ اگر اوقاتِ فضیلت میں اعمالِ فضیلت کی ترغیب دلائی جائے۔ تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ اعمال یا ان کی شان ان اوقات ہی میں منحصر ہو کر رہ گئی ہے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ ان اوقاتِ فضیلت میں عرضِ صلوٰۃ وسلام بھی بعض خصوصیات کا حامل ہو۔

پیشِ نظر رہے کہ ان روایات میں عرضِ صلوٰۃ وسلام کے لیے اگر جمعہ کی تخصیص نہیں تو ہر روز کی بھی تصریح نہیں۔ یہاں عرضِ صلوٰۃ وسلام کا محض اجمالی بیان ہے۔ جن روایات سے درود پڑھتے ہی اس کا پیش ہونا متبادر ہوتا ہے، اسے بھی ہم ہر روز پیش ہونے کے لیے تصریح نہیں

---

[1] نسائی جلد ۱ صفحہ ۱۴۳، دارمی صفحہ ۳۴۷ [2] علامہ عزیزی لکھتے ہیں یہ حدیث صحیح ہے۔ (السراج المنیر جلد ۱ صفحہ ۵۱۴) اس کی سند میں زاذان راوئ حدیث ہے۔ امام ابن معین انہیں ثقہ قرار دیتے ہیں۔ ابن سعد ثقہ اور کثیر الحدیث قرار دیتے ہیں۔ خطیب اور عجلی نے بھی ثقہ کہا ہے۔ ابن عدی اور حاکم نے بھی اس کی توثیق کی ہے۔ (تہذیب جلد ۳ صفحہ ۳۰۳) حافظ ابن القیم لکھتے ہیں:۔

وزاذان من الثقات روی عن اکابر الصحابۃ کعمر وغیرہ وروی لہ مسلم فی صحیحہ قال یحیٰی بن معین ثقۃ وقال حمید بن ھلال وقد سئل عنہ ھو ثقۃ لا تسال عن مثل ھؤلاء۔ (کتاب الروح صفحہ ۵۹)

کہہ سکتے۔ ہو سکتا ہے وہ جمعہ کے دن ہی پیش ہونے کا بیان ہو۔ اس لیے کہ وہ روایات بھی تو فضیلت جمعہ کے ضمن ہی میں وارد ہوئی ہیں۔

بعض روایات میں عرض صلوٰۃ وسلام کے لیے یوم جمعہ کی تصریح بھی موجود ہے۔ لیکن ان کی سندیں ضرور محل کلام ہیں۔ سنن سعید بن منصور میں یہ مرسل روایت منقول ہے:۔

ان صلوٰۃ امتی تعرض علیّ فی کل یوم جمعۃ۔[1]

ترجمہ:۔ بے شک میری امت کا درود مجھ پر ہر جمعہ کے دن پیش ہوتا ہے۔

ان روایات کی روشنی میں اگر پہلی سب روایات کے اجمال کو اٹھالیں۔ تو غایت ما فی الباب یہ ہوگا کہ ہر جمعہ امت کے صلوٰۃ وسلام فرشتوں کے توسط سے روضۂ اطہر پر پیش ہوتے ہیں۔

اب اس کے مقابلہ میں ان روایات کو لیجئے۔ جن میں یوم الجمعہ کی نہ تخصیص ہے نہ ذکر، بلکہ عمومی طور پر صلوٰۃ وسلام پیش ہوتے رہنے کا بیان ہے۔ ابوداؤد میں ہے:۔

ما من احد یسلم علیّ الا رد اللہ علیّ روحی فارد علیہ السلام۔[2]

---

[1] منتقی الاخبار جلد ۲ ص۱۱۱ مصر [2] رواتہ ثقات (فتح الباری پ۱۳ ص۲۹۱) رواتہ ثقات (فتح الملہم جلد ۱ ص۲۳۰) اسنادہ ھکذا حدثنا محمد بن عوف اخبرنا المقری اخبرنا حیوۃ عن ابی صخر حمید بن زیاد عن یزید بن عبد اللہ بن قسیط من اواخر کتاب المناسک وتقدیر الکلام ما من احد یسلم علیّ الا ارح علیہ السلام لانی حی اقدر علیہ (کذا فی الشرح جلد ۲ ص۲۱) قال المحدث السخاوی یؤخذ من ھذہ الاحادیث انہ صلی اللہ علیہ وسلم حی علی الدوام وذلک انہ محال عادۃ ان یخلوا الوجود کلہا من واحد یسلم علیہ فی لیل ونہار ونحن نؤمن ونصدق بانہ صلی اللہ علیہ وسلم حی یرزق فی قبرہ وان جسدہ الشریف لا تاکلہ الارض والاجماع علی ھذا۔ اھ (القول البدیع ص۱۳۵) رد اللہ علیہ روحہ لاجل سلام من یسلم علیہ واستمرت فی جسدہ صلی اللہ علیہ وسلم لا انہا تعاد ثم تنزع ثم تعاد (القول البدیع ص۱۳۷) قال المحدث انور شاہ کشمیری الظاہر منہ انہ لم یوجد ھناک نقل من موطن الی موضع وانما ھو نقل من حالۃ الی حالۃ وتنبہ بہا ولعل المراد بحدیث الانبیاء احیاء فی قبورہم یصلون انہم ابقوا علی ھذہ

ترجمہ۔ جب بھی کوئی مجھ پر سلام بھیجتا ہے تو اللہ تعالیٰ میری روح کو میری طرف متوجہ فرما دیتے ہیں۔ پس میں اس کا جواب دیتا ہوں۔

اس میں صلوٰۃ و سلام پڑھتے ہی اس کے پیش ہوتے رہنے کا بیان ہے۔ نہ جمعہ کی کوئی تخصیص نہ اس کا کوئی پہلے ذکر ہے۔ غنیۃ الطالبین کی روایت سے کل یوم کے الفاظ بھی ملتے ہیں یہ مفہوم یقیناً ان روایات سے متعارض ہے۔ جن میں عرض صلوٰۃ و سلام کے لیے یوم جمعہ کی تخصیص تصریحاً یا تفسیراً تسلیم کر لی گئی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا ان دو متعارض مضامین میں کوئی صورتِ مطابقت ہے ایک طرف کی روایات میں ہر جمعہ کے دن عرضِ صلوٰۃ و سلام متبادر ہوتا ہے اور توسطِ ملائکہ کا تذکرہ ملتا ہے اور دوسری طرف کی روایات ہر ہفتہ بلکہ ہر آن عرض صلوٰۃ و سلام کا پتہ دے رہی ہیں اب سوال یہ ہے کہ ان روایات کو متصادم قرار دے کر کیا اضطراب فی الروایۃ کا دعوےٰ کر دیا جائے گا یا اس تعارض کو اٹھانے کی کوشش کی جائے؟ کیا کسی محدث یا شارحِ حدیث نے محض اس بنا پر اس روایت کو مضطرب قرار دیا ہے؟ ہرگز نہیں۔ من ادعیٰ فعلیہ ان یأتی بالنقل۔

لیجئے ہمیں مزید بحث کی ضرورت نہیں۔ خود ارشادِ نبوت ہی اس اضطراب کو رفع کر دیتا ہے۔ حضور نے فرمایا۔

من صلی علی عند قبری سمعتہ و من صلی علی نائیاً بلغتہ۔[1]

الحالۃ ولم تسلب عنہ (تحیۃ الاسلام ص۳۶) اس صورت میں معنی حدیث شریف یہ ہوں گے کہ جب کوئی سلام بھیجتا ہے تو خداوند کریم آپ کی روح پر فتوح کو اس حالتِ استغراق فی ذات اللہ و تجلیات اللہ سے.... ہوش فرما دیتا ہے۔ جو نسا امتی آپ پر سلام عرض کرے گا۔ اس کی طرف کا شعبہ لوٹے گا۔ ارتداد جملہ شعب لازم نہیں اور ظاہر ہے۔ اس شعبہ کا ارتداد باعث اطلاع سلام معلوم تو ہوگا، پر موجب زوالِ استغراقِ مطلق نہ ہوگا۔ (مکتوبات شیخ الاسلام مولانا مدنی علیہ الرحمۃ جلد ا ص۲۴۵) والمعنی ان اللہ سبحانہ یرد روحہ الشریف عن استغراقہ المنیف لیرد علی مسلمہ (شرح الشفا للملا علی القاری جلد ۲ ص۱۴۲ مصر) والتفصیل فی نسیم الریاض للخفاجی جلد ۳ ص۴۹۹)

[1] رواہ ابو الشیخ بسند جید کما فی الفتح جلد ا ص۳۲۳

ترجمہ۔ جو میرے روضہ پر آکر مجھ پر درود پڑھے، اسے میں خود سُنتا ہوں اور جو دُور سے پڑھے، وہ مجھے پہنچایا جاتا ہے۔

بات صاف ہو گئی کہ درود پڑھنے اور پہنچنے کی دو صُورتیں ہیں۔ مذکورہ بالا دونوں قسم کی روایات کو ان پر منطبق کر لو۔ روضۂ منورہ کے پاس حاضر ہو کر درود پڑھنا ہر وقت پہنچتا ہے اور دُور سے پڑھنا جمعہ کے دن فرشتوں کے توسط سے پہنچایا جاتا ہے۔ جب اس تقسیم پر غور کیا تو امام احمد کی ایک روایت ما من احدٍ یسلم علیّ کے مضمون کی اور وضاحت ہو گئی۔ حضورؐ نے فرمایا:۔

ما من احد یسلم علیّ عند قبری الا رد اللہ علیّ روحی۔

لیجئے رفعِ تعارض اور تطبیق بین القولین کے لیے "عرضِ سلام بوقتِ تسلیم" کا جو مطلب ہم نے بتایا تھا کہ یہ قرب روضہ کے لیے ہے۔ وہی مضمون "علی قبری" کی عبارت میں خود الفاظِ نبوت ہو کر سامنے آ گیا ہے۔ ؎

وکم من عائب قولاً صحیحاً
وآفته من الفهم السقیم

سیدنا ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں:۔

درود وسلام پہنچانے کے فرشتوں کا تقرر اس شخص کے ساتھ مخصوص ہے جو روضۂ اطہر سے دور ہو۔[1]

نیز از ابن عمرؓ آمدہ من صلی علیّ عند قبری زدت علیه ومن صلی علیّ فی مکان اٰخر بلغونیه۔[2]

باقی رہا حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی روایت میں فانکم لا تدرون لعلّ ذالک یعرض علیه[3] کے الفاظ، سو اس لفظ لعلّ میں درود پہنچنے کی کسی تیسری صُورت کا ذکر نہیں۔ بلکہ اس کی قبولیت

---

[1] مرقات جلد ۲ صفحہ [2] جذب القلوب صفحہ ۱۸۲ [3] ابن ماجہ صفحہ ۶۵

اور عدم قبولیت کے احتمالات کا بیان[1] ہے۔ یعنی درود شریف اچھی طرح پوری توجہ ہی سے پڑھا جائے۔ تبھی حضورؐ کی خدمت میں پہنچتا ہے۔

مبتدعین کا یہ کہنا کہ براہِ راست سننے اور بتوسط ملائکہ پہنچنے کا فرق قُرب و بُعد کے لیے نہیں بلکہ محبت اور عدم محبت کے لیے ہے۔ جو محبت سے درود پڑھے، وہ خود سنتے ہیں اور دوسرا فرشتوں کی وساطت سے پہنچایا جاتا ہے۔ یہ سب وسوسے اور توہمات ہیں۔ تحقیق میں ان کا کوئی مقام نہیں۔ درود شریف تو پڑھا ہی محبت سے جاتا ہے۔ خواہ روضے کے پاس حاضر ہو، خواہ دور سے پڑھ رہا ہو۔ وہ کون سا بدبخت ہو گا، جو محبت کے بغیر درود پڑھتا ہو۔ کامل ترین محبت کے بغیر تو ایمان ہی مکمل نہیں ہوتا۔ یاد رکھیئے حضورؐ پہ وہی درود پیش ہوتا ہے جو پوری توجہ اور محبت سے پڑھا جائے، روضہ پہ حاضری ہو تو خود سماعت فرماتے ہیں، دُور سے پڑھا جائے تو فرشتوں کے توسط سے پہنچتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ عرضِ صلوٰۃ وسلام کی روایات میں کوئی تعارض نہیں۔ اگر پہلی روایات کی بعض مُرسل اور کمزور روایات کی روشنی میں یوم جمعہ کے ساتھ تخصیص نہ کریں تو پھر تو تعارض کا سوال بالکل پیدا نہیں ہوتا قرب و بعد کا صلوٰۃ وسلام ہر روز بلکہ ہر ساعت پہنچتا ہے اور اگر ان روایات کے اجمال کی بعض کمزور اور مُرسل قسم کی روایات کے ساتھ تفصیل کر دی جائے اور تبلیغ صلوٰۃ وسلام کو یوم جمعہ سے خاص سمجھا جائے، تو پھر اس کی تطبیق دوسری روایات سے یوں ہو گی کہ قریب کے صلوٰۃ وسلام کے لیے تو کسی وقت کی تخصیص نہیں اور دُور کا مجموعی طور پہ جمعہ کے دن پیش ہوتا ہے

نوٹ: طبرانی کی ایک روایت میں لیس من عبد یصلی علیّ الا بلغنی صلوتہ کے الفاظ ہیں حافظ ابن قیم کی جلاء الافہام میں یہ حدیث نقل کی گئی ہے۔ لیکن تصحیفِ کاتب سے بلغنی صلوتہ کے بجائے بلغنی صوتہ لکھا گیا ہے۔ ناظرین طبرانی کے حوالے سے جلاء الافہام کے حوالے میں تصحیح فرمالیں۔ طبرانی کی روایت میں سعید بن ابی ہلال اور حضرت ابو الدرداءؓ کے مابین انقطاع ہے۔

---

[1] ان الترجی فی قبولیۃ الصلوٰۃ فان عرضہ لایکون الا بشرط القبول لعدم اختلاطہ بالریاء

المبحث الرابع

فی تصحیح المتقدمین

مبحث ثانی میں ہم اس حدیث کی تصحیح سند سے فارغ ہو چکے ہیں۔ ہم نے وہاں ابتدار امام نووی کی تصحیح سے کی۔ اس پر ہم سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ ہم اس کی صحت متقدمین سے کریں۔ اصولاً یہ مطالبہ صحیح نہیں۔ قرون وسطیٰ کے ائمہ فن پر اعتماد نہ کرنا سلف سے ایک کھلا خروج ہے۔

حضرت امام احمد بن حنبلؒ (۲۴۱ھ) امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ کے جلیل القدر استاد اور خود امام مجتہد ہیں۔ آپ سے پوچھا گیا اگر کوئی حضورؐ کے روضہ پر سلام عرض کرے تو کیا آپ سنتے ہیں؟ اس وقت آپ کے پاس یہی روایت مستحضر تھی کہ جب کوئی شخص مجھ پر سلام پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ میری روح کو مجھ پر متوجہ کر دیتے ہیں۔ حافظ ابن تیمیہؒ (۷۲۸ھ) لکھتے ہیں:۔

والامام احمد اعلم الناس فی زمانه لما سئل عن ذلك لم یکن عنده بما یعتمد علیه فی ذلك من الحدیث الا حدیث ما من رجل یسلم علی الا ردّ الله علی روحی حتی ارد السلام[1]

ترجمہ۔ امام احمد نے اپنے زمانے کے سب سے بڑے عالم تھے جب آپ سے یہ بات پوچھی گئی تو آپ کے پاس اس وقت سوائے اس حدیث کے اور کوئی روایت نہ تھی جس پر کہ اعتماد کیا جا سکے۔ وہ یہ کہ جب کوئی شخص مجھ پر سلام پڑھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ میری روح کو ادھر لوٹا دیتا ہے یہاں تک کہ میں اس کا جواب دوں۔

حضرت امام احمد نے خود بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے۔[2]

---

[1] فتاوے ابن تیمیہ جلد ۲۷ صفحہ ۲۳۶ [2] دیکھئے مسند امام احمد جلد ۲ صفحہ ۵۲۷

پھر امام ابوداؤد (۲۷۵ھ) خود بھی تو متقدمین میں سے ہیں اور امام احمد کے شاگرد ہیں۔ آپ اپنی سنن میں جس حدیث پر سکوت فرمائیں وہ آپ کے نزدیک صالح للاحتجاج ہوتی ہے۔ اگر وہ آپ کے ہاں کسی جہت سے مجروح ہوتی تو آپ اس پر جرح کر دیتے۔ آپ نے حضرت ابو ہریرہؓ کی اس حدیث پر سکوت فرمایا ہے اور یہ آپ کے نزدیک صالح للاحتجاج ہے۔

مالم یذکر فیہ شیأ فھو صالح [۱]

امام ابوداؤد نے لکھا ہے :۔

میں نے اس کتاب میں کوئی ایسی حدیث نہیں لی جس کے ترک پر سب کا اتفاق ہو [۲]

محدث کبیر مولانا ظفر احمد عثمانی لکھتے ہیں :۔

ابوداؤد نے اسے سند صحیح کے ساتھ روایت کیا ہے اور اس پر ایک جماعت کی جماعت نے اعتماد کا اظہار کیا ہے۔ امام سبکی کہتے ہیں یہ اعتماد بالکل صحیح ہے [۳]

مولانا عبدالجبار غزنوی

ابوداؤد اور بیہقی ، روایت کرتے ہیں ما من احد یسلم علی الا رد اللہ علی روحی فارد علیہ السلام [۴]

سماحۃ الشیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز

سنن ابی داؤد میں ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص مجھ پر سلام بھیجتا ہے تو اللہ تعالیٰ میری روح مجھ پر لوٹا دیتا ہے یہاں تک کہ میں اس کے سلام کا جواب دیتا ہوں [۵]

---

[۱] تدریب الراوی ص۵۵ [۲] مرقات جلد ۱ ص۲۲ [۳] اعلاء السنن جلد ۱۰ ص۳۳۴

[۴] اثبات الالہام والبیعۃ ص۱۴۲ [۵] الحج والعمرۃ والزیارۃ ص۱۵۱

المبحث الخامس

فی معنیٰ رد الروح

فصل اول میں ہم اس بحث سے فارغ ہو چکے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جس طرح دنیا میں صلوٰۃ وسلام " روح انور اور جسد اطہر " کے مجموعے پر آپ کی ذات مبارک پر پڑھا جاتا تھا وفات سید کائنات کے بعد بھی درود وسلام اسی جسد اطہر پر پیش ہوتا ہے جو بہ تعلق روح فائز الحیات ہے گو وہ حیات کلی طور پر اس دنیا کی سی نہ ہو ـــــ اس پر شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ نے جو علمی شرح فرمائی ہے وہ بھی آپ کے سامنے آچکی اور یہ بات بھی کھل کر سامنے آگئی کہ یہ سارا معاملہ اس صورت میں ہے کہ درود پڑھنے والا خود روضہ انور پر حاضر ہو ـــــ وہاں آپ ہر ایک کا درود وسلام خود سنتے ہیں۔

رئیس المحدثین حضرت مولانا سید انور شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں :-

رواہ ابو داؤد فی رد روحہ حین یسلم علیہ لیس معناہ انہ یرد روحہ ای انہ یحیی فی قبرہ بل توجیہ من ذٰلک الی ھٰذا الجانب فھو حی فی کلتا الحالتین۔[1]

ترجمہ۔ ابو داؤد کی روایت میں سلام کے وقت آپ کی روح لوٹنے کا جو ذکر ہے اس کا یہ معنی نہیں کہ آپ کی روح اس طرح لوٹائی جاتی ہے کہ آپ کو آپ کی قبر میں زندہ کیا جائے بلکہ اس سے مراد آپ کو اس طرف متوجہ کرنا ہے زندہ تو آپ دونوں حالتوں میں ہیں (اب درود شریف پیش ہونے کے وقت بھی اور اس سے پہلے بھی)۔

---

[1] فیض الباری جلد ۲ صـ ۶۵

حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری لکھتے ہیں۔

فاذا بلغه سلام احد من الامة رد الله روحه المطهرة من تلك الحالة الى رد من سلم عليه۔[1]

ترجمہ: جب آپ کو امت میں سے کسی کا سلام پہنچتا ہے تو اللہ تعالیٰ آپ کی روح اطہر کو اس حالت سے ادھر لوٹاتا ہے کہ آپ سلام کہنے والے پر جواب لوٹا سکیں۔

فهی دائما تعرض علیه بواسطة الملئکة الاعند روضته فیسمعها بحضرته۔[2]

ترجمہ: درود شریف آپ پر فرشتوں کے واسطہ سے پیش ہوتا رہتا ہے دائما مگر آپ کے روضہ انور کے پاس۔ وہاں آپ اسے خود سنتے ہیں۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا السید حسین احمد مدنی کا یہ حوالہ یاد رکھنے کے لائق ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زائر کے سلام کا جواب دینا یقینی اور متفق علیہ ہے اور غیر زائر کو جواب دینا علماء کے نزدیک مختلف فیہ ہے۔ بعض روایات کی بنا پر علماء نے جمع کی یہ صورت بیان فرمائی ہے کہ سلام غائب کی صرف بذریعہ ملائکہ تبلیغ ہوتی ہے اور سلام حاضر کی تبلیغ بھی ہوتی ہے اور سماع بھی ۔۔۔ لہٰذا قریب سے صلوٰۃ وسلام کو ترجیح اور فضیلت حاصل ہوتی ہے کیونکہ زائر کی آواز کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گوش مبارک تک پہنچنا بڑے شرف اور مجد کی بات ہے۔[3]

حضرت مولانا عبدالجبار غزنوی رحمہ لکھتے ہیں:۔

"بے شک حقیقۃً" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس جہان میں حاضر اور زندہ

---

[1] بذل المجہود جلد ۳ صفحہ ۲۰ [2] ایضاً جلد ۱ صفحہ ۱۶۰ [3] مکتوبات شیخ الاسلام جلد ۱ صفحہ ۲۴۳

نہیں مگر حکماً ہیں (کیونکہ یہاں سے وہاں ہمارا سلام سنتے ہیں) ابوداؤد اور بیہقی روایت کرتے ہیں:۔

مامن احد یسلم علی الا رد اللہ علی روحی فارد علیہ السلام

"جب کوئی شخص مجھ کو سلام کہتا ہے اس وقت اللہ جل شانہ میری روح مجھ پر لوٹاتا ہے اور میں اس کو جواب سلام دیتا ہوں"

پس جب کہ ہمارا سلام آپ کو پہنچ جاتا ہے اور آپ ہم کو جواب دیتے ہیں تو یہ خطاب غیر محل نہ ٹھہرا۔ دوسری روایت میں ہے:۔

ان للہ ملٰئکۃ سیاحین فی الارض یبلغون من امتی السلام رواہ النسائی وابن حبان فی صحیحہ والحاکم وصححہ[1]

الفصل الخامس میں وہ حدیث بھی آرہی ہے جس میں قبر مبارک کے قریب درود پڑھنے اور دور پڑھنے کا فرق بتلایا گیا ہے. قریب سے پڑھا جانے والا درود پاک آپ خود سنتے ہیں اور دُور سے پڑھا جانے والا آپ کی خدمت میں فرشتے پہنچاتے ہیں. اس کی دو سندوں میں سے ایک کمزور اور دوسری عمدہ ہے اس کی پُوری بحث آگے آئے گی ـــــ یہاں صرف یہ بتلانا مقصود ہے کہ اس حدیث کا مضمون حضرت ابوہریرہؓ کی اس حدیث سے بھی پوری وضاحت سے ثابت ہے اور عجیب اتفاق یہ کہ وہ حدیث بھی حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے اور یہ بھی۔

اس حدیث میں ہے قریب سے پڑھا گیا درود شریف آپ خود سنتے ہیں. اِس حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جواب بھی دیتے ہیں ـــــ اس میں ہر ایک کا صلوٰۃ وسلام سُنے جانے کی صراحت نہیں. اِس میں ہر ایک کے صلوٰۃ وسلام پر حضور کی روح مقدسہ کا متوجہ ہونا مذکور ہے ـــــ اُس حدیث میں دور سے پڑھنے والے کے درود وسلام کا بواسطہ ملائکہ پہنچنا مذکور ہے اور اِس حدیث میں دُور سے صلوٰۃ وسلام پڑھنے والے کا سرے سے کوئی

---

[1] اثبات الالہام والبیعۃ صہ ۲۳۶

ذکر نہیں ـــــ ہاں اس حدیث کا یہ مضمون ایک اور حدیث میں اس صراحت سے موجود ہے جیسا کہ وہ حضرت ابوہریرہؓ کی اس حدیث میں مذکور ہے، مولانا عبدالجبار غزنویؒ نے بھی اسے نقل کیا ہے اور صحیح ابن حبان کا حوالہ بھی دیا ہے۔

المبحث السادس ـــ فی سیاحۃ الملٰئکۃ

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

ان للہ ملٰئکۃ سیاحین فی الارض یبلغونی من امتی السلام۔[1]

ترجمہ بے شک خدا تعالیٰ کے فرشتے زمین میں سیاحت پہ مقرر ہیں وہ میری امت کا سلام مجھے پہنچاتے ہیں۔

یہ فرشتے پورے صفحہ زمین پر سیاحت کرتے ہیں اور جہاں کسی امتی نے حضورؐ پر درود پڑھا وہ زمین پر سیاحت کرتے روضۂ انور پر حاضری دیتے ہیں اور مسلمانوں کا پڑھا درود آنحضرتؐ کے حضور پیش کرتے ہیں۔

یہ سارا کام زمین پر ہوتا ہے۔ درود پڑھنے والے اور جس ذاتِ اقدس پہ درود پڑھا جا رہا ہے سب اسی زمین پر ہیں۔ تبھی تو وہ فرشتے زمین کے سیاح ہیں۔ اگر آپ کی حقیقی قبر زمین پہ مدینہ منورہ میں نہ ہوتی اعلیٰ علیین میں ہوتی تو وہ فرشتے سیاحین فی الارض نہ ہوتے بلکہ سیاحین بین الارض والسماء ہوتے۔

یہ حدیث دُور سے صلوٰۃ و سلام پڑھنے والوں کے بارے میں ہے ان کا سلام فرشتے پہنچاتے ہیں قریب سے سلام پڑھنے والوں کے بارے میں حضرت ابوہریرہؓ کی یہ حدیث ہے کہ جب کوئی مسلمان مجھ پہ (میری قبر کے پاس) درود پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ میری روح کو اس پہ متوجہ کر دیتا ہے جس سے میں اس کے سلام کا جواب دیتا ہوں۔

---

[1] سنن نسائی جلد ۱ صفحہ ۱۴۳

ان دونوں حدیثوں کو جمع کریں تو یہ بات نکھر کر سامنے آتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قریب سے پڑھے گئے درود و سلام کو خود سنتے ہیں اور دور سے پڑھا آپ کو فرشتوں کے توسط سے پہنچایا جاتا ہے. ہمارے پاس اگر ابوالشیخ کی حضرت ابوہریرہؓ والی حدیث نہ بھی ہوتی اور نہ ہی حضرت ابن عمرؓ والی حدیث جسے حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے اپنے کتاب جذب القلوب میں نقل فرمایا ہے تو بھی ہمارا یہ مسئلہ ان دو احادیث سے عبارۃ النص سے ثابت ہے. اور یہ دونوں حدیثیں صحیح ہیں.

حضرت مدنیؒ نے اسے یقینی اور متفق علیہ مسئلہ قرار دیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں اہل حق میں سے کسی کا اختلاف نہیں. شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کے صاحبزادے شیخ عبداللہ نے اپنے عقائد پر جو رسالہ لکھا ہے (جسے مولانا محمد اسمٰعیل غزنوی نے اردو میں ترجمہ کیا ہے) اس کے ص۵۲ پر علمائے نجد کا عقیدہ اس باب میں اس طرح لکھا ہے :-

اور حضورؐ کی زندگی قبر میں برزخی زندگی ہے جو شہداء کی زندگی سے بہت اعلیٰ ہے. قرآن شریف کی آیات اس پر نصوص ہیں. کیونکہ حضورؐ شہداء سے بلاشک و ریب افضل ہیں ہمارا عقیدہ ہے کہ جب کوئی مسلمان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام کہے تو آپ اس کا سلام سنتے ہیں.

پھر آگے ص۱۲۰ پر آل شیخ علامہ نجد شیخ محمد بن عبداللطیف کا عقیدہ بھی بایں طور مرقوم ہے۔

اور آپ کی قبر پر جو آپ کو سلام کہتا ہے آپ سنتے ہیں.

مسئلہ مذکورہ میں اگر کسی قسم کے اختلاف کی گنجائش ہوتی تو علمائے نجد کبھی اس طرح کھل کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سماع عند القبر کے قائل نہ ہوتے سو بات اسی طرح ہے جیسا کہ حضرت گنگوہیؒ اور حضرت مدنیؒ نے تصریح فرمائی ہے کہ انبیاء کرام کے سماع عند القبر میں کسی عالم کا کوئی اختلاف نہیں. اہل حق کے ہاں یہ ایک یقینی اور متفق علیہ مسئلہ ہے.

الفصلُ الثّالث

وفیه ستّة من المباحث

حدثنا هداب بن خالد وشیبان بن فروخ قال اخبرنا حماد بن سلمة عن ثابت البنانی وسلیمان التیمی عن انس بن مالك ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال اتیت وفی روایة هداب مررت علی موسیٰ لیلة اسری بی عند الکثیب الاحمر وهو قائم یصلی فی قبره.[۱]

ترجمہ۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا، معراج کی رات میں سُرخ ٹیلے کے قریب موسےٰ علیہ السلام کے پاس سے گزرا، کیا دیکھتا ہوں کہ وہ اپنی قبر میں کھڑے ہو کر نماز پڑھ رہے ہیں۔

اس حدیث میں حضرت موسےٰ علیہ السلام کا اپنی قبر شریف میں زندہ ہونا اور نمازیں پڑھنا بصراحت مذکور ہے۔ قرآن عزیز فرماتا ہے۔

ولقد اٰتینا موسیٰ الکتٰب فلا تکن فی مریة من لقائه۔

(پ ۲۱ ، سجدہ، آیت ۲۳)

ترجمہ۔ اور ہم نے موسےٰ کو کتاب دی پس ان کی ملاقات میں کسی قسم کا شک نہ کریں۔

یعنی آپ جو شبِ معراج میں موسےٰ علیہ السلام کو ملے تھے، وہ امرِ واقع اور سچی حقیقت تھی، یہ کوئی خواب یا کسی مثالی وجود اور روح کی ملاقات نہ تھی اور نہ ہی کوئی دھوکہ یا نظر بندی

---

[۱] مسلم جلد ۲ صفحہ ۲۶۸، نسائی جلد ا صفحہ ۱۸۵

تھی آپ یقیناً اسی شخصیت کو ملے تھے جسے ہم نے تورات دی تھی. ظاہر ہے کہ یہ تورات دینا کسی مثالی وجود کو نہ تھا اور نہ ہی وہاں روح متمثل ہو رہی تھی. بلکہ تورات لینے والے خود موسیٰ علیہ السلام تھے. جن کا جسم عنصری تھا. انہی کو آنحضرتؐ نے شب معراج میں دیکھا تھا. قرآن کہتا ہے کہ آپ اس موسیٰ کی ملاقات میں ہرگز شک نہ کریں ـــــ اور اگر آئندہ یہ ملاقات کی خبر ہے تو بھی اس میں شک نہ کریں، ملاقات ہو کر رہے گی ـــــ اس کی مفصل بحث ہم پہلے کر آئے ہیں۔[1]

المبحث الاول

یہ سوال پیدا کیا جاتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قبر منور میں زندہ موجود تھے، تو پھر بیت المقدس میں ان کا حاضر ہونا اور باقی انبیاء کے ساتھ حضورؐ کی اقتداء میں نماز پڑھنا، اور پھر آسمانوں پر حضورؐ کو ملنا اور پھر آپ کی واپسی پر نمازوں کی تخفیف کے لیے آپ سے مذاکرہ کرنا، آخر ان تمام ملاقاتوں کا محل کیا ہو گا. یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ قبر میں بھی زندہ موجود ہوں. بیت المقدس میں بھی حاضر ہوں اور ملاء اعلیٰ میں بھی تشریف فرما ہوں. یہاں بھی ہوں اور وہاں بھی ـــــ کیا وہ ہر جگہ موجود ہیں ؟

افسوس ہے کہ یہاں وہ امور زیر بحث لائے جا رہے ہیں، جن کی مدارس عربیۃ کے متوسط طالب علموں سے بھی توقع نہیں ہو سکتی تھی. وہ بھی جانتے ہیں کہ تعارض کے لیے وحدتِ زمان شرط ہے جو یہاں مفقود ہے. حافظ ابن حجر عسقلانیؒ لکھتے ہیں :-

وصلوتهم فی اوقات مختلفة و فی اماکن مختلفة لا یرده العقل وقد ثبت به النقل فدل ذلك علی حیاتهم۔[2]

ترجمہ. اور انبیائے کرام کا مختلف اوقات میں مختلف مقامات پر نمازیں پڑھنا یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ عقل سلیم اس سے متصادم نہیں. اور نقلِ صحیح اسے ثابت کر

---

[1] دیکھیے ص ـــ از کتاب ہذا [2] فتح الباری کتاب الانبیاء جلد ۶ ص ـــ مصر

رہی ہے۔ پس یہ ان کے زندہ ہونے پر کافی شہادت ہے۔

یعنی قبر میں نماز پڑھنا، پھر بیت المقدس میں نماز پڑھنا، اور پھر ملاءِ اعلیٰ میں ملنا، ان سب کے اوقات مختلف ہیں پس تعارض لازم نہیں آتا۔ فتفکروا یا اولی الابصار۔

محدث کبیر امام بیہقیؒ (۴۵۸ھ) فرماتے ہیں:۔

فی قصۃ المعراج انہ لقیھم فی جماعۃ الانبیاء فی السمٰوات وکلمھم وکلموہ وکل ذلک صحیح لا یخالف بعضہ بعضا فقد یری موسیٰ علیہ السلام قائما یصلی فی قبرہ ثم یسری بموسیٰ وغیرہ الی بیت المقدس کما اسری بنبینا صلی اللہ علیہ وسلم فیراھم فیہ ثم یعرج بھم الی السمٰوات کما عرج بنبینا صلی اللہ علیہ وسلم فیراھم فیہ کما اخبرہ وصلاتھم فی اوقات بمواضع مختلفات جائز فی العقل کما ورد بہ خبر الصادق وفی کل ذلک دلالۃ علی حیاتھم۔[1]

ترجمہ۔ واقعہ معراج میں ہے کہ حضور اکرمؐ انبیائے کرام کی ایک پوری جماعت کو آسمانوں میں ملے تھے۔ ان سے کلام فرمایا اور انہوں نے آپ سے باتیں کیں یہ سب مضامین صحیح ہیں اور ایک دوسرے سے متعارض نہیں۔ ایک وقت ہے کہ آپ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کی قبر میں کھڑے ہو کر نماز پڑھتے دیکھ رہے ہیں، پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی بیت المقدس تک سفر اسراء کرایا گیا۔ جیسا کہ حضور اکرمؐ کو سفر اسراء پیش آیا پس آپ نے وہاں بھی حضرت موسےٰ علیہ السلام کو دیکھا۔ پھر سب پیغمبروں کو بھی آسمانوں تک (اپنے اپنے مقام میں) معراج کرایا جیسا کہ حضور اکرمؐ کو معراج ہوا۔ پس آپ نے وہاں بھی انبیائے کرام کو دیکھا پس انبیائے کرام کا مختلف اوقات میں مختلف جگہوں پر نماز پڑھنا اس پر عقلاً

---

[1] حیات الانبیاء للامام البیہقی ص۴ مصر

کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا اور نقلاً اس پر قولِ صادق موجود ہے۔ ان تمام واقعات سے انبیائے کرام کی حیات پر دلالت ہو رہی ہے۔

المبحث الثانی

بعض اوقات کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ حیات حضرت موسےٰ علیہ السلام کی خصوصیت تھی اور اسے واقعۃ حال لاعموم لہا کہہ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ جواباً عرض ہے کہ محدثین نے اسے حضرت موسےٰ علیہ السلام کے ساتھ خاص نہیں کیا۔ بلکہ اس کے برعکس اسے حیاتِ انبیاء کے کلیہ کے ماتحت ذکر کرتے ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی (۸۵۲ھ) اور علامہ شبیر احمد عثمانی (۱۳۶۹ھ) نے یہی موقف اختیار کیا ہے:۔

فان قیل ھٰذا خاص بموسٰی قلنا قد وجدنا له شاھدًا من حدیث ابی ھریرۃ اخرجه مسلم ایضًا من طریق عبد اللّٰه بن الفضل عن ابی سلمة عن ابی ھریرۃ رفعه لقد رایتنی فی الحجر وقریش تسألنی عن مسرای۔۔۔۔ الحدیث[۲]

ترجمہ: پس اگر یہ کہا جائے کہ یہ حیات موسٰی علیہ السلام کی خصوصیت ہے تو ہم کہیں گے کہ ہمیں صحیح مسلم کی روایت سے حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث اس کے شاہد کے طور پر مل گئی ہے۔ جس میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا، میں مقام حجر میں تھا اور قریش مجھ سے میرے سفرِ اسراء کے متعلق سوال کر رہے تھے۔ پھر اسی حدیث میں ہے کہ میں نے اپنے آپ کو انبیاء کی پوری جماعت میں دیکھا موسےٰ علیہ السلام، عیسٰی علیہ السلام، ابراہیم علیہ السلام سب حضرات وہاں جمع تھے۔

محدثین کرام میں سے یہ کسی کا موقف نہیں کہ یہ حیات، صرف حضرت موسےٰؑ کے ساتھ

---

[۱] راجع له ص۲۲۴ مع الفتح [۲] فتح الباری جلد ۱۳ ص۲۷۵ کتاب الانبیاء، فتح الملہم جلد ۱ ص۳۳۳

خاص تھی۔ یہ ہمارے نادان دوستوں کی سینہ زوری ہے۔ من ادعیٰ فعلیہ البیان۔

آنحضرتؐ نے ایک دفعہ بالکل عالم بیداری میں بحالت سفر حضرت موسےٰ علیہ السلام اور حضرت یونس علیہ السلام کو وادیٔ ازرق اور ثنیۃ ہرشیٰ میں لبیک پڑھتے ہوئے خاص ہیئت و لباس میں دیکھا[1] آپ نے ایک دفعہ یہ بھی فرمایا کہ میں نے وادیٔ عسفان میں حضرت نوحؑ علیہ السلام، حضرت ہود علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیکھا، وہ سرخ اونٹوں پر سوار تھے جن کی مہاریں کھجور کی چھال کی تھیں[2]۔ حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ میں نے حضرت ہود علیہ السلام، اور حضرت صالح[3] علیہ السلام کو بھی دیکھا ہے۔ یہ واقعات لیلۃ المعراج کے نہیں، بلکہ دوسرے مواقع سے متعلق ہیں۔ پس ایسے انکشافات نہ تو لیلۃ الاسراء سے خاص ہیں اور نہ ہی یہ حیات صرف موسیٰ علیہ السلام کی خصوصیت ہے۔ واللہ اعلم بالصواب وعلمہ اتم واحکم فی کل باب۔

المبحث الثالث

بعض اوقات یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ قبر کی حیاتِ عنصری اگر تسلیم بھی کر لی جائے تو تمام انبیاء کا اس رات بیت المقدس میں اجسادِ عنصریہ سے حاضر ہونا اور پھر ملاء اعلیٰ میں اجسامِ عنصریہ سے پہنچنا ہرگز قرینِ قیاس نہیں۔ جواباً عرض ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اسی جسدِ عنصری کے ساتھ دوسرے آسمان سے بیت المقدس میں آنا اگر قرینِ قیاس ہے دوسرے انبیاء کرام کا اپنی اپنی قبور سے وہاں پہنچنا کیوں قرینِ قیاس نہیں۔ پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اسی جسدِ عنصری سے ملاء اعلیٰ میں پہنچنا اگر محال نہیں، تو باقی انبیائے کرام کے اجسادِ مطہرہ کے ساتھ وہاں پہنچنے میں کون سا استبعاد ہے؟ اگر مدار عقل پہ ہے تو وجہ استبعاد بتائی جائے اور اگر نقل پہ ہے تو پھر اسے استبعادِ عقلی کے

---

[1] مسلم جلد ۱ صفحہ ۹۴، بخاری کتاب المناسک جلد ۱ صفحہ ۲۱

[2] رواہ ابو یعلی والطبرانی قال الحافظ ابن کثیر فیہ غرابۃ۔ (البدایۃ والنہایۃ جلد ۱ صفحہ ۱۱۹)

[3] اخرجہ احمد قال ابن کثیر ھٰذا اسناد حسن (البدایۃ جلد ۱ صفحہ ۱۳۸)

طور پر پیش نہ کیا جائے. آخر نقل تو یہاں بھی موجود ہیں.

اگر کہا جائے کہ اس رات انبیائے کرام کا اصل اجسادِ عنصریہ کے ساتھ حاضر ہونا اسے لازم ہے کہ اُن کی قبریں کھلیں اور ایسا ہونا اذا القبور بعثرت کے خلاف ہے (یعنی قیامت کو قبریں اکھاڑ دی جائیں گی). اس سے پہلے ایسا کبھی وقوع میں نہیں آسکتا. جواباً عرض ہے کہ پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا معراج کی رات بیت المقدس میں آنا کتاب و سنت کی ان نصوص کے کیوں خلاف نہیں، جن میں ان کا آنا قیامت کے قریب مذکور ہے. اگر یہ کہو کہ کتاب و سنت میں ان کی جس آمد کی خبر دی گئی ہے، وہ آمد اصلاحِ احوال اس زمین پہ زندگی گزارنے کے لیے ہو گی اور یہ آمد قطعاً اس رات واقع نہیں ہوئی. ہم کہیں گے کہ اذا القبور بعثرت وغیرہ آیات میں قبروں کی جس اکھاڑ کی خبر دی گئی ہے، وہ وہ ہے، جو حساب و کتاب اور حشر کے لیے ہو گی اور ظاہر ہے کہ لیلۃ المعراج میں انبیائے کرام کا اپنی اپنی قبور سے نکل کر بیت المقدس پہنچنا ان مقاصد کے لیے نہ تھا. علاوہ ازیں اس کا کیا ثبوت ہے کہ اس رات وہ قبورِ منورہ نہیں کھلی تھیں، رات کا وقت تھا. کون وہاں دیکھ رہا تھا. جو بیان کرے کہ وہ ہرگز نہ کھلی تھیں، نیز یہاں کوئی حصر نہیں، خوب سمجھ لیا جائے.

اگر کہا جائے کہ انبیائے کرام اپنی اپنی قبور سے اصل اجسامِ عنصریہ کے ساتھ تشریف لے گئے تھے تو کیا اتنا عرصہ وہ اپنی اپنی قبور سے علیحدہ رہے تھے. جواباً عرض ہے کہ اگر رات کے نہایت مختصر لمحوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سدرۃ المنتہیٰ سے ہو کر واپس آسکتے ہیں اور اس کا پتہ کسی کو نہیں چلتا، بستر بھی گرم رہتا ہے، تو باقی انبیائے کرام کے اپنی اپنی قبور سے ایک نہایت مختصر لمحے کے لیے چلے جانے میں اور اس طرح چلے جانے میں کسی کو اس کا پتہ نہ چلے. اس میں کون سا استحالہ لازم آتا ہے اور کون سا شرعی اصول پامال ہوتا ہے. انبیائے کرام اس رات اگر اپنے اجسامِ عنصریہ کے ساتھ حاضر تھے تو یہ ضروری نہیں کہ اس حاضری کے تحقق کے لیے جو اسباب کارفرما ہوں وہ بھی سب مادّی ہوں، جہاتِ مختلفہ یہاں ناممکن نہیں. ان

نفوسِ قدسیہ کی مذکورہ حاضری کے لیے جو اسباب عمل میں آئے وہ روحانی تھے۔ پس روحانی طریق سے قبروں کا کھلنا اور پھر بند ہونا یہ کوئی ایسی بات نہیں، جو امرِ محال ہو اور ایسے موقعوں پر لمبا اوقات زمان و مکان کی وسعتیں لپیٹ دی جاتی ہیں اور وہاں تزاحمِ تضاد کا وسوسہ بھی باقی نہیں رہتا۔

بایں ہمہ اگر یہ سب انکشافات حقیقت نہ ہوں، وادیٔ ازرق، ثنیۂ ہرشیٰ اور وادیٔ عسفان کی یہ ملاقاتیں یا لیلۃ المعراج میں انبیائے کرام کا بیت المقدس میں اجتماع اور ملاءِ اعلیٰ کے مذاکرات، یہ سب امور ابدانِ مثالیہ سے متعلق ہوں اور یہ سب مشاہدات عالمِ مثال کے قرار دیئے جائیں، تو بھی اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ حضرت موسےٰ علیہ السلام کا اپنی قبر شریف میں نماز پڑھنا یہ بھی ایک عالمِ مثال ہی کا واقعہ تھا۔ امورِ مذکورہ بالا کو اگر ان تاویلات پر بھی محمول کر دیا جائے، جو ان کے تذکروں میں بطور احتمال ذکر کی گئی ہیں۔ تو بھی یہ مقصودِ کلام قطعاً متاثر نہیں ہوتا کہ انبیائے کرام کو اپنی اپنی قبور میں جو حیات حاصل ہے، وہ عنصری اور جسمانی ہے۔ نیز یہ کہ وہ تلذذاً معروف عبادت ہیں۔

ہاں اگر کہا جائے کہ مذکورہ انکشافات میں اور معراج کی ملاقاتوں میں نہ ابدان مثالیہ تھے اور نہ اجسامِ عنصریہ۔ بلکہ ان انبیائے کرام کی ارواحِ قدسیہ ہی متمثل[1] ہو رہی تھیں۔ تو پھر یہ وہم ہو سکتا ہے کہ پھر ان کے اجسامِ عنصریہ قبورِ شریفہ میں زندہ نہ ہوں گے۔ اس صورت میں ہم عرض کریں گے کہ اگر ارواحِ مقدسہ رفیقِ اعلیٰ یا حظیرۃ قدسیہ کو اپنا مستقر بنا کر وہاں سے اجسامِ قبریہ پر اپنی تاثیر[2] دکھا سکتی ہیں اور انہیں فائز الحیات کر سکتی ہیں کہ وہ اجسامِ عنصریہ بھی اپنی اپنی قبور میں زندہ ہوں تو جہاں وہ ارواحِ متمثل بصورتِ جسمیہ ہو رہی ہوں۔ وہاں سے اجسامِ قبریہ پر کیوں پرتو نہیں ڈال سکتیں اور وہاں اتصالِ روح کے نتیجے میں حیات کا تحقق کیوں نہیں ہو سکتا۔

---

[1] قال الشیخ الاکبر فی الفصوص الروح یتشکل باشکال مختلفۃ۔ (العرف الشذی ص۱)

[2] کما ذھب الیہ ابن القیم دراجع لہ کتاب الروح ص۴۳ وزاد المعاد جلد ۲ ص۴۹

نوٹ:

اس مبحث میں ہمارا مقصود ان انکشافات کی تحقیق، اس کے ضمن میں مختلف احتمالات کی تطبیق یا کسی ایک توجیہہ کا اثبات یا ابطال نہیں، بلکہ حضرت موسےٰ علیہ السلام کے اپنی قبر شریف میں زندہ ہونے کے بیان میں جو جو مغالطات عوام کے سامنے آتے ہیں۔ ان کے الزامی جوابات اور استبعاد میں دلائل امکانات ہیں۔ نہ ہر صورت ممکنہ کے وقوع کا دعوےٰ ہے اور نہ اس کی ضرورت کہنا یہ ہے کہ اصل مدعا کسی بھی صورتِ واقعہ سے متاثر نہیں ہوتا۔

المبحث الرابع

یہ بھی سننے میں آیا[1] ہے کہ حضرت موسےٰ علیہ السلام کے اپنی قبر شریف میں نماز پڑھنے کی روایت اگرچہ صحیح مسلم میں موجود ہے لیکن قرآن پاک کے خلاف ہونے کی وجہ سے لائق اعتماد نہیں قرآن پاک میں ہے:۔

واعبد ربک حتّٰی یاتیک الیقین۔ (پ۱۴ : الحجر، آیت ۹۹)

ترجمہ۔ اور بندگی کیے جا اپنے رب کی، یہاں تک کہ تجھے وفات آجائے۔

پس جب عبادت موت تک کرنے لیے ہی ہے تو قبر میں عبادت کرنے اور نمازیں پڑھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ ہرگز دار العمل نہیں۔ پس یہ حدیث، جس میں حضرت موسےٰ علیہ السلام کا اپنی قبر منورہ میں نماز پڑھنا مذکور ہے، قرآن کے خلاف ہے۔ (معاذاللہ، ثم معاذاللہ)

جواباً عرض ہے کہ دار العمل کے بعد "وجوب عمل" کا انقطاع ہے "نفسِ عمل کا نہیں۔ قرآن عزیز نے جس عبادت کا حکم دیا ہے۔ اس کی منتہائے مدت، موت ہے۔ اس کے بعد عبادت کا نہ حکم ہے اور نہ کسی پر یہ اُس عالم میں واجب ہے۔ انبیائے کرام جو عالم برزخ میں اپنی اپنی

---

[1] یہ روئداد ملتان کے ایک درس کی ہے، جو ہمارے محترم دوست ڈاکٹر فیروزالدین صاحب (اندرون بوہڑ گیٹ) نے ہمیں سنائی تھی۔

قبور میں) نمازیں پڑھتے ہیں، وہ تلذذاً پڑھتے ہیں، وجوباً نہیں۔

قال القرطبی حببت الیھم العبادۃ فھم یتعبدون بما یجدونہ من دواعی انفسھم لا بما یلزمون بہ۔[1]

خاتم المحدثین حضرت مولانا السید انور شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں۔

ان کثیرا من الاعمال قد ثبت فی القبور کالاذان والاقامۃ عند الدارمی وقراءۃ القرآن عند الترمذی۔[2]

ترجمہ۔ بہت سے اعمال قبور شریفہ میں بھی ثابت ہوتے ہیں۔ سنن دارمی کی روایت سے قبر میں اذان واقامت اور ترمذی شریف کی روایت سے قبر میں تلاوتِ قرآن کا ثبوت ملتا ہے۔

پس جس طرح صلوا خمسکم (تم اپنی پانچ نمازیں پڑھ لیا کرو) میں تہجد کی نفی نہیں، اسی طرح ورودِ موت کے بعد قبر کی زندگی میں نمازیں پڑھنا، تلاوت کرنا واعبد ربک حتی یاتیک الیقین کے خلاف نہیں۔ مقربینِ ایزدی کو عبادت میں اس قدر لذت ملتی ہے کہ وجوب ہو نہ ہو، وہ عبادت کو اپنی طبیعت بنا چکے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن عزیز جنت میں بھی دعاء وذکر کی خبر دیتا ہے:۔

دعواھم فیھا سبحانک اللھم وتحیتھم فیھا سلام، وآخر دعواھم ان الحمد للہ رب العلمین۔ (پ۱۱ : یونس)

ترجمہ۔ ان کی دعا اس جگہ یہ ہے کہ اے اللہ! تیری ذات پاک ہے اور ان کا تحفہ ایک دوسرے کو سلام کا ہوگا اور خاتمہ ان کی دعا کا اس پر ہے کہ سب تعریفیں سب جہانوں کے پروردگار کے لیے ہی ہیں۔

پس جب دعا جو مخ العبادۃ ہے یعنی ساری عبادت کا مغز ہے، وہ مرنے کے بعد

---

[1] راجع فتح الباری جلد ۶ ص ۳۲۳ [2] فیض الباری ج ۱ ص ۱۸۳ مصر

ثابت ہے، تو پھر یہ کہنا کہ قرآن عزیز اس دارالعمل کے بعد کسی قسم کی عبادت یا ذکر و حمد کی خبر نہیں دیتا.
قرآن پاک پر اور خود اسلام کے نظریۂ مابعد الموت پر کس قدر ظلم ہے ۔

فریب کشمکشِ عقل دیدنی دارد   کہ میرِ قافلہ و ذوقِ راہزنی دارد

قال اللہ تعالیٰ :-

وقالوا الحمد للہ الذی صدقنا وعدہ واورثنا الارض
..... وقیل الحمد للہ رب العلمین۔ (پ ۲۴، زمر)

ترجمہ۔ اور جنتی کہیں گے الحمد للہ، جس نے اپنا وعدہ سچا کیا اور وارث کیا ہمیں اس زمین کا۔ ... اور ہر طرف سے الحمد للہ رب العلمین کی آوازیں آئیں گی.

ولہ الحمد فی الاٰخرۃ وھو الحکیم الخبیر۔ (پ ۲۲، سبا)

ترجمہ۔ اور آخرت میں بھی اسی کی ہی حمد ہوگی اور وہی ہے حکیم و خبیر۔

وقالوا الحمد للہ الذی ھدانا لھذا۔ (پ ۸، اعراف)

ترجمہ۔ اور جنتی کہیں گے الحمد للہ، سب تعریفیں اسی ذات کے لیے ہیں جس نے ہمیں یہاں تک پہنچا دیا۔

حضرت جابرؓ کہتے ہیں، حضورؐ نے ارشاد فرمایا :-

یلھمون التسبیح والتحمید۔[1]

ترجمہ۔ اللہ تعالیٰ کی تسبیح اور حمد ان کے دلوں میں ڈال دی جائے گی۔

پھر حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :-

یسبحون اللہ بکرۃً وعشیًا۔ متفق علیہ۔

ترجمہ۔ وہ صبح و شام اللہ تعالیٰ کی تسبیح کہیں گے۔

فسبح بحمد ربك واستغفرہ میں تسبیح و تحمید اور استغفار کا حکم تھا، اس عالم میں

---

[1] مسلم شریف

وجوباً اس پر عمل ہوتا رہا۔ بعد ازاں تلذذاً تسبیح وتحمید اور دعا و استغفار کا سلسلہ جاری ہے تسبیح وتحمید کا بیان ہو چکا۔ اب استغفار بھی لیجیئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

حیاتی خیر لکم ومماتی خیر لکم تعرض علیّ اعمالکم فما کان من حسن حمدت اللہ علیہ وما کان من سیئ استغفرت اللہ لکم۔ رواہ البزار باسناد جید۔[1]

وکذا عند البزار بسند جید عن ابن مسعودؓ۔[2]

بزار برجال صحیح از عبد اللہ بن مسعودؓ می آرد۔[3]

ترجمہ۔ میری یہ زندگی بھی تمہارے لیے خیر ہے اور بعد الوفات بھی میری حالت تمہارے لیے خیر ہے۔ تمہارے اعمال مجھ پر پیش ہوتے رہیں گے۔ پس جو اچھے ہوں گے، تو یہ میرے لیے سامانِ تحمید ہو گا اور جو اعمال اچھے نہ ہوں گے، اس پر میں دعائے استغفار کرتا رہوں گا۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں۔

مجموع روایات سے علاوہ فضیلتِ حیات واکرام ملائکہ کے برزخ میں آپ کے (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ مشاغل ثابت ہیں۔ ۱۔ اعمالِ امت کا ملاحظہ فرمانا۔ ۲۔ نماز پڑھنا۔ ۳۔ غذا مناسب اس عالم کے نوش فرمانا۔ ۴۔ سلام کا سننا، نزدیک سے خود اور دور سے بذریعہ ملائکہ۔ ۵۔ سلام کا جواب دینا یہ تو دائماً ثابت ہیں، اور احیاناً بعض خواصِ امت سے یقظہ میں آپ کا کلام اور ہدایت فرمانا بھی آثار واخبار میں مذکور ہے اور حالتِ رؤیا اور کشف میں تو ایسے واقعاتِ حد و احصار سے متجاوز ہیں اور ان مشاغل کے ایک وقت میں اجتماع سے تزاحم کا وسوسہ نہ کیا جائے، کیونکہ برزخ میں روح کو پھر خصوصاً روح مبارک کو بہت

---

[1] فتح الملہم جلد ا صـ۴۱۳ [2] عقیدۃ الاسلام صـ۱۱ مولانا انور شاہؒ [3] جذب القلوب صـ۱۸۴

وسعت ہوتی ہے. مگر اس وسعت سے امورِ غیر ثابتہ بالدلیل الصحیح یعنی منفیہ یا مسکوت عنہا کو ثابت یا ثابتہ احیاناً کو ثابت بالدوام ماننا جائز نہ ہوگا، خوب سمجھ لیا جائے۔[1]

خلاصۂ مبحث یہی ہے کہ یہ حدیث صلوٰۃِ موسےٰ فی القبر بالکل صحیح ہے اور ہرگز قرآن پاک کے خلاف نہیں۔ اسی طرح لیلۃ الاسراء میں انبیائے کرام کا نمازیں پڑھنا اور پھر آنحضرتؐ کا ان کی امامت کرانا یہ بھی احادیثِ صحیحہ سے روزِ روشن کی طرح ثابت ہے۔

واللہ اعلم بالصواب والیہ المرجع والمآب.

المبحث الخامس

یہ اعتراض بھی سننے میں آیا ہے کہ حضرت موسےٰ علیہ السلام کے قبر میں نماز پڑھنے کی حدیث حضرت انسؓ نے آنحضرتؐ سے براہِ راست نہیں سُنی. اس لیے کہ بعض سندوں میں عن انسؓ عن بعض اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال . . . . الحدیث کے الفاظ ملتے ہیں بس جب تک اس صحابی کے نام کا پتہ نہ ملے، جس سے حضرت انسؓ نے یہ حدیث سُنی تھی، اس وقت تک اسے حجت نہیں سمجھا جا سکتا۔

جواباً عرض ہے کہ صحیح مسلم کی روایت میں حضرت انسؓ براہِ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس حدیث کو نقل کر رہے ہیں۔ پس جو سند اس عالی سند سے ٹکرائے گی، ناقابلِ اعتماد ہوگی۔

ثانیاً امام نسائی جنہوں نے دونوں طریقِ اسناد پیش کئے ہیں، خود اسی روایت کو ترجیح دے رہے ہیں، جس میں حضرت انسؓ براہِ راست حضور اکرمؐ سے اس حدیث کو روایت کرتے ہیں۔

قال ابو عبد الرحمٰن النسائی ھذا اولی بالصواب عندنا۔[2]

ثالثاً اگر ان دونوں حقیقتوں کو نظر انداز کر دیں، تو غایت ما فی الباب لازم آتا ہے کہ یہ حدیث

---

[1] نشر الطیب صا۳۰ [2] سنن نسائی جلد ا صد ۱۸۵

مرسلاتِ صحابہؓ میں شمار ہو اور ظاہر ہے کہ مرسلاتِ صحابہؓ بالاتفاق موصولات کے حکم میں ہیں۔ اور ان لوگوں کے نزدیک بھی معتبر ہیں، جو مرسل کے قبول کرنے میں کلام کرتے ہیں۔ الفیہ عراقی میں ہے:۔

اما الذی ارسلہ الصحابی فحکمہ الوصل علی الصواب

الفیہ سیوطی میں ہے:۔

و مرسل الصاحب وصل فی الاصح

تحریر میں ہے:۔

فلا یضر اذ لا یرسل الا عن صحابی[1]

شیخ الاسلام فرماتے ہیں:۔

اما مراسیل الصحابۃ فحکمہا حکم الموصول علی المشہور الذی ذہب الیہ الجمہور۔[2]

خلاصہ سب دلائل کا یہی ہے کہ:۔

صحابہ کرامؓ کی مرسلات (یعنی وہ روایات جو روایت کرنے والے صحابیؓ نے خود حضورؐ سے نہ سنی ہوں، بلکہ کسی اور صحابیؓ سے سنا ہو کہ حضورؐ نے ایسا ایسا فرمایا تھا اور اب وہ اس دوسرے صحابی کی نشاندہی ضروری نہ سمجھتے ہوئے ان احادیث کو براہِ راست حضورؐ سے ہی روایت کر رہے ہوں، تو) اُن کا حکم یہی ہے کہ انہیں متصل روایات قرار دیا جائے اور یہی جمہور محدثین کا فیصلہ ہے۔

المبحث السادس

وادیٔ ازرق، اور لیلۃ الاسراء کے مشاہدات اگر حقیقت نہ ہوں مثالی ہی ہوں، تو بھی مقصودِ کلام متاثر نہیں ہوتا۔

مذکورہ سابقہ انکشافات برزخیہ میں یہ اختلاف درپیش ہے کہ اجسامِ مرئیہ واقعی

---

[1] التحریر لابن الہمام ص ۳۲۷ مصر [2] مقدمہ فتح الملہم ص ۳۴

حضرات انبیاء علیہم السلام ہی تھے یا یہ فقط ان کے مثالی اجسام تھے؟ اس میں کئی موقف اختیار کیے جاتے ہیں۔

حضورؐ نے جب فرما دیا کہ میں نے انہیں دیکھا ہے، تو واقعی آپ نے انہیں دیکھا ہے، اس کا ادراک و شعور اگر ہمیں نہ بھی ہو سکے، تو بھی یقین کامل ہے کہ آپ نے جنہیں دیکھنے کا دعویٰ فرمایا، آپ نے واقعی انہیں دیکھا تھا اور وہ واقعۃً وہی حضرات تھے، جن کا آپ نے ذکر فرمایا۔ اس عالم برزخ میں انبیائے کرام جسمانی طور پر زندہ ہیں اور جس کے لیے بھی کبھی یہ پردے اٹھائے گئے، اس نے ان نفوسِ قدسیہ کو اس دنیا کی جسمانیات قبر یا کعبہ وغیرہما سے متعلق ہی پایا۔

یہ موقف کہ ان انکشافات میں اشخاصِ مرئیہ صرف مثالی وجود تھے یا ان کی ارواح (تعلق بالبدن المدفون کے باوجود) یہاں متمثل ہو رہی تھیں، یقیناً صرف عن الظاہر ہے اور یہ طے شدہ تحقیق ہے کہ ہر شئے اپنی اصل پر قائم ہے، جب تک کہ اس کا حقیقت پر محمول ہونا شرعًا یا عقلاً متعسر نہ ہو۔ صرف عن الظاہر کے لیے اصل شرعی مطلوب ہے اور وہ بھی کم از کم اسی پایہ کی ہونی چاہیے جس پائے کا آپ کا یہ دعوئے شریفہ ہے کہ میں نے ان ان انبیاء کو فلاں فلاں موقع پر دیکھا تھا۔ اگر اس درجہ کی اصل اس مقام پر موجود نہیں تو ظاہر ہے کہ اصل دعوئے کو اپنے اصل ہی پر رہنے دیا جائے۔

اس موقف کے قائلین پر ایک الزام

جو اہلِ علم حضرات ان انکشافات کے حقیقت پر محمول ہونے کا مسلک رکھتے ہیں۔ ان کی تردید میں یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ سلف صالحین میں سے یہ کسی کا مسلک نہ تھا۔ ان اجسام مدفونہ سے متعلق سماع و عدمِ سماع یا شعور و عدم شعور کے مباحث تو تھے لیکن ان کے متحرک ہونے یا ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کا دعوئے سلف میں سے کسی نے نہیں کیا۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ اس الزام میں قلبِ موضوع، حقائق کو برعکس بیانی

کرنے، موجود کو غیر موجود کہنے سے کام لیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انبیائے کرام کے اجسامِ مدفونہ سے متعلق سماع یا عدمِ سماع اور شعور یا عدمِ شعور کے مباحث تو حضراتِ اہلِ سنت میں کہیں نہیں ملتے۔ اور اس کے برعکس ان اجسامِ مدفونہ کے متحرک ہونے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ آنے جانے کا قول سلفِ صالحین میں موجود ہے۔

شیخ الاسلام حافظ ابن حجر عسقلانیؒ فتح الباری باب المعراج میں لکھتے ہیں:-

واستشکل رؤیۃ الانبیاء فی السموات مع ان اجسادھم مستقرۃ فی قبورھم بالارض واجیب بان ارواحھم تشکلت بصور اجسادھم او احضرت اجسادھم لملاقات النبی صلی اللہ علیہ وسلم تلک اللیلۃ تشریفاً وتکریماً ویؤیدہ حدیث عبدالرحمٰن بن ھاشم عن انسؓ ففیہ وبعث لہ آدم ومن دونہ من الانبیاء۔[1]

ترجمہ۔ یہ اشکال پیش کیا گیا ہے کہ انبیائے کرام کے اجسادِ کریمہ تو اپنی قبروں میں استقرار پذیر ہیں۔ پھر حضورؐ کا انہیں معراج کی رات آسمانوں پہ دیکھنا یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ان کی ارواحِ قدسیہ اس رات متجسد کر دی گئی تھیں۔ یا ان کے اجسادِ کریمہ ہی (اُن کی قبور سے) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف و تکریم کے لیے لا حاضر کر دیئے گئے تھے اور اس دوسری صورت کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جو حضرت انسؓ سے منقول ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ کا اندازِ بیان بتلا رہا ہے کہ وہ اُس دوسری صورت کو ہی ترجیح دے رہے ہیں۔ خاتمۃ الحفاظ کے علاوہ اور بھی کئی محدثین سے یہ مؤقف منقول ہے۔ حیرت در حیرت ہے کہ جو مباحث موجود ہیں، اُن کے وجود ہی سے انکار ہو اور جن کا حضراتِ اہلِ سنت میں نام و نشان بھی نہیں ملتا، ان کے امرِ واقع ہونے کا دعوے کر دیا جائے۔

---

[1] فتح الباری جلد ۷، صفحہ ۱۶۲ مصر

ؔ خرد کا نام جنوں رکھ دیا، جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حُسنِ کرشمہ ساز کرے

- بعض دوسرے حضرات کا مؤقف یہ ہے:۔

حضورؐ نے جن انبیائے کرام کے متعلق فرمایا کہ میں نے انہیں دیکھا ہے، حضورؐ نے انہیں واقعی نہ دیکھا تھا، بلکہ یا:۔

(۱) ان انبیاء کی ارواحِ قدسیہ صورتِ جسم میں متمثل ہو رہی تھیں یا
(۲) ان انبیائے کرام کے ان اجسام کا مشاہدہ ہو رہا تھا، جو عالمِ مثال میں قائم تھے اور یا
(۳) انہیں اس عالم سے انتقال فرمانے کے بعد کوئی اور جسم ملا ہوا ہے اور انبیائے کرام کی یہ حاضریاں انہی جسم کے ساتھ تھیں۔

ہمیں ان احتمالات کے مابین محاکمہ کرنا نہیں۔ امر واقع خواہ کوئی صورت ہو، اس عقیدے کے لیے قطعاً کوئی گنجائش نہیں کہ انبیائے کرام کے اجسادِ عنصریہ اپنی قبورِ شریفہ میں بالکل بے حس و بے شعور ہیں۔

اگر یہ نفوسِ قدسیہ اپنی وفات شریفہ کے بعد بھی کہیں کہیں اپنے اصل جسدِ عنصری سے چلتے پھرتے دکھائی دیں اور یہ رفت و آمد خرق الاسباب بغیر انشقاقِ قبور کے ہو اور اس اعتبار سے روحانی ہو کہ زمان و مکان کی وسعتیں، جیسا کہ معراج کی رات واقع ہوا، سمٹ گئی ہوں، یعنی اپنی قبور سے جدائی بھی کسی خاص محسوس درجے میں نہ ہو تو سوال یہ ہے کہ:۔

رب العزت کے لیے ایسے حالات پیدا کرنا اور پھر روحانی اور جسمانی اعتبارات کو مختلف جہات سے اس عالمِ برزخ میں جمع کر دینا کیا امر ناممکن ہے؟ یا ان جزئیات میں سے کوئی جزیہ کتاب و سنت کی کسی تصریح سے متصادم ہوتا ہے؟ یا یہاں کوئی پہلو ایسا بھی اختیار کیا گیا جس کی نظیر پہلے کے کسی واقعہ میں نہ ہو؟

جواب یقیناً نفی میں ہو گا۔

پیش نظر رہے کہ ان تفصیلات کو ہم مدعی ہو کر اپنے دلائل میں پیش نہیں کر رہے. بلکہ بات یہ چلی کہ آنحضرتؐ کا یہ فرمانا کہ میں نے فلاں فلاں پیغمبر کو فلاں فلاں جگہ دیکھا تھا، آیا حقیقت پر محمول ہیں یا اسے حقیقت پر محمول کرنا شرعاً اور عقلاً محال ہے. بصورت دیگر ہم مجبور ہوں گے کہ آپ کے اس ارشاد کو اس کے ظاہر سے پھیر کر تمثیل و مجاز وغیرہ پر محمول کریں. ہم نے یہ تفصیل اس لیے کی ہے کہ آنحضرتؐ کے ان ارشادات کو ان امکانات، احتمالات اور نظائر کے ہوتے ہوئے ان کے ظاہر پر محمول کرنا شرعاً اور عقلاً ہرگز ناممکن نہیں اور واضح ہے کہ امکان ثابت کرنے کے لیے یا امتناع توڑنے کے لیے صرف صورتِ ممکنہ کافی ہوتی ہے صورتِ واقعہ کا مطالبہ نہیں کیا جاتا.

اگر ان برزخی مشاہدات میں اجسامِ مرئیہ اصل اجسام عنصریہ نہ ہوں. بلکہ عالم مثال کے مثالی اجسام ہوں، تو بھی اس سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ اصل اجسام عنصریہ اپنی اپنی قبور میں بالکل بے حس و بے شعور ہوں اور انبیائے کرام اپنے روضات میں فائز الحیات نہ ہوں، اس لیے کہ ان دونوں معاملات میں کوئی تصادم نہیں، ہر معاملہ اپنے اپنے مقام پر اپنے اپنے حالات کے مطابق ہو رہا ہے.

ہاں اگر یہ تشکل عالم مثال کا نہ ہو، بلکہ اصل ارواحِ قدسیہ ہی متمثل بصورتِ جسمیہ ہو رہی ہوں جیسا کہ علامہ قرطبی وغیرہ کی رائے ہے، تو ہمیں وہ موقف اختیار کرنا پڑتا ہے کہ عالم برزخ میں ان ارواحِ طیبہ کو عظیم وسعت حاصل ہوتی ہے. ہرگز بعید نہیں کہ یہ ارواحِ قدسیہ اجسام عنصریہ سے بھی بالکل بے تعلق نہ ہوں اور ان کا پرتو یہاں بھی صورتِ جسمیہ میں متمثل ہو رہا ہو. یا وہ ارواحِ اصلیہ ان مقامات پر متمثل بصورتِ جسمیہ ہو رہی ہوں اور ان کا اجسام قبریہ پر بھی پرتو پڑ رہا ہو. جس سے وہ صفتِ حیات سے متصف ہوں. اگر روحِ پاک رفیقِ اعلیٰ یا حظیرۂ قدسیہ کو اپنا مستقر بنا کر قبورِ شریفہ میں رکھے، اجسام پر پرتو حیات ڈال سکتی ہے. جیسا کہ حافظ ابن قیم کی رائے ہے، تو ارواحِ متمثلہ یہاں قریب کے مقامات سے اجسام قبریہ پر تاثیر کیوں نہیں کر سکتیں؟

حق یہ ہے کہ احوالِ برزخ پر اس عالم کی نظر و فکر کے پہرے نہیں بٹھائے جا سکتے. جن حضرات کا یہ موقف ہے کہ ان انکشافات میں ارواحِ قدسیہ ہی متمثل بصورتِ جسمیہ ہو رہی تھیں، آخر وہ

بھی تو رفیقِ اعلیٰ یا حظیرۂ قدسیہ ہی کو روح کا محلِ استقرار قرار دیتے ہیں. جو جواب ان کا ان احوال میں ارواحِ قدسیہ کے علیین سے جُدا ہونے کا ہوگا، وہی جواب ان کا سمجھ لیجئے. جو ارواحِ قدسیہ کو قبر کے اجسامِ عنصریہ سے متعلق مان کر پھر ان مشاہدات میں تمثّلِ ارواح کا دعوےٰ کر رہے ہیں.

ہم یہ نہیں کہہ رہے کہ صُورتِ واقعہ کیا تھی اور کیا نہیں اور نہ اس وقت یہ ہمارا موضوع ہے مقصد صرف یہ ہے کہ مذکورہ احتمالات میں سے کوئی بھی جانب اختیار کر لی جائے. یہ حقیقت قطعاً متاثر نہیں ہوتی کہ انبیائے کرام کے اجسامِ عنصریہ اپنی اپنی قبور میں ہرگز بے حس و بے شعور نہیں، بلکہ وہ فائز الحیات ہیں.

حضرت موسےٰ علیہ السلام کا اپنے روضہ شریفہ میں کھڑے ہو کر نماز پڑھنا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ان کی خبر دینا ان اختلافات سے قطعاً متاثر نہیں ہوتا. حدیث صلوٰۃِ موسےٰ پر حاشیہ سنن نسائی میں "زہر الربیٰ" سے منقول ہے:

قال الشیخ بدر الدین ھٰذا اصریح فی اثبات الحیوٰۃ لموسٰے علیہ السلام فی قبرہ فانہ وصفہ بالصلوٰۃ وانہ قائم ومثل ذلک لا یوصف بہ الروح وانما یوصف بہ الجسد وفی تخصیصہ بالقبر دلیل علیٰ ھٰذا فانہ لو کان من اوصاف الروح لم یحتج لتخصیصہ بالقبر وقال الشیخ تقی الدین سبکی فی ھٰذا الحدیث "الصلوٰۃ تستدعی جسداً حیّاً" ولا یلزم من کونہا حیوٰۃ حقیقیۃ ان تکون الابدان معہا کما کانت فی الدنیا من الاحتیاج الی الطعام والشراب وغیر ذلک من صفات الاجسام التی نشاھدھا بل یکون لہا حکم اٰخر.[1]

ترجمہ: شیخ بدر الدین فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حضرت موسیٰ کے اپنی قبر میں زندہ ہونے پر صریح دلیل ہے. کیونکہ حضور اکرمؐ نے آپ کو نماز سے موصوف بتلایا ہے اور ظاہر ہے کہ اس سے صریح رُوح موصوف نہیں ہوتی. نماز جیسے عمل سے متصف ہونا تو جسم کا

---

[1] حاشیہ نسائی جلد ۱ صفحہ ۱۸۵ باب صلوٰۃ نبی اللہ موسیٰ و ذکر الاختلاف علی سلیمان التیمی

کام ہے، صرف روح کا نہیں۔ نیز اس عمل کے قبر سے متعلق ہونے میں بھی "حیات فی القبر" پر دلیل ہے (یعنی یہ عمل جسدِ عنصری کا ہے، کیونکہ قبر میں تو جسدِ عنصری ہی ہوتا ہے۔ اگر کوئی اور جسدِ مثالی پیشِ نظر ہوتا، تو پھر اس عملِ صلوٰۃ کے مخصوص بالقبر ہونے کی حاجت نہ تھی) پس اگر یہ عملِ صلوٰۃ (یا تجسد لعمل الصلوٰۃ) روح کی صفت ہوتی، تو اس کی تخصیص قبر سے بالکل نہ ہوتی۔ شیخ تقی الدین السبکیؒ بھی اس حدیث کا یہی مطلب بیان کرتے ہیں کہ "نماز زندہ جسم کو چاہتی ہے۔" پیشِ نظر رہے کہ حیاتِ حقیقی کے ثبوت سے یہ چیز لازم نہیں آتی کہ وہاں بھی ابدان اسی طرح کھانے پینے کے محتاج ہوں جس طرح کہ دنیا میں تھے۔ جیسا کہ ہم صفاتِ اجسام کو ہر روز دیکھتے ہیں، بلکہ اس جہان کے احکام اس سے مختلف ہیں (یعنی حیاتِ جسمانی کے ساتھ وہاں رزقِ مادی نہیں، بلکہ معنی ہے۔ حیاتِ دنیاوی صرف تعلق بالبدن الدنیوی کی بنا پر ہے۔ تعلق بالرزق کی بنا پر وہ حیاتِ روحانی ہے اور تعلق بالظرف کے پیشِ نظر برزخی ہے)"

عالمِ برزخ کی حقیقتیں اس جہان والوں سے مخفی رہتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ جب کسی پر انہیں منکشف فرمانا چاہتے ہیں تو پہلے اس میں برزخی مشاہدات کی صلاحیت پیدا فرما دیتے ہیں۔ پھر جب ان مخفی حقائق سے پردہ اٹھایا جاتا ہے تو وہ نفوسِ قدسیہ دیکھ لیتے ہیں کہ کس کس کی حیاتِ برزخی مضمحل ہے اور کس کی روح و جسم فائز الحیات ہیں۔ اس عالم میں رہتے ہوئے اس عالم کی جھلکیں دیکھ پانا نقلِ صحیحہ کے پیشِ نظر ہرگز محال نہیں۔ کشف القبور سے تو بارہا غیر انبیاء بھی متصف ہوتے رہے ہیں اور رہوتے ہیں۔ آنحضرتؐ نے بارہا مختلف قبروں کو دیکھا اور ان کے احوال مختلف لوگوں کے سامنے بیان فرمائے یہ اطلاع وحی کے بجائے کشف پر مبنی ہوتی تھی۔ ؎

چہ گویم شرح اس حالت کہ در گفتن نمی آید

ایسے انکشافات صرف لیلۃ المعراج ہی سے خاص نہ تھے۔ آپ نے بارہا اس عالم میں ہوتے ہوئے اس عالم برزخ میں انبیائے گذشتہ کو دیکھا۔ ان کا زندوں جیسے کاموں میں اشتغال ——

جیسے وادی سے گزرتے یا گھاٹی سے اترتے لبیک لبیک کہنا، نمازیں پڑھنا اور تحیۃ وسلام کہنا، یہ سب امور معراج کے علاوہ اور بہت سے انکشافات کا پتہ دے رہے ہیں۔ اور اس دنیا سے ایک تعلق اور رابطہ ثابت کر رہے ہیں۔ اس کے پورے خدوخال کیا ہیں، اس پر ایک پردہ ہے جو نہ ہٹتا ہے، نہ پھٹتا ہے، اور یہی برزخیت ہے۔ ہاں کبھی کبھار جو دیکھا یا سُنا جاتا ہے یہ محض اس عالم کی کچھ جھلکیاں ہیں یا بعض نفوسِ قدسیہ کے مشاہدات اور انکشافات!

انبیائے کرام کے ایسے مشاہدات میں بعض ایسے الفاظ بھی ملتے ہیں جن سے تمثّلِ ارواح یا ابدانِ مثالیہ کی بہت گنجائش ملتی ہے جیسے کانّی انظر وغیرہ، لیکن ان الفاظ کو ان انکشافات سے اٹھا کر ان حقائق پر منطبق کرنا جہاں حقیقت مراد لینے سے نہ عقلِ سلیم سے تصادم ہوتا ہے اور کسی نقل صحیح کی مخالفت لازم آتی ہے، کس قدر زیادتی ہے۔

واللہ اعلم بالصواب وعلمہٗ اتم واحکم فی کل باب۔

صورِ اسرافیل بھی ان کو جگا سکتی نہیں
روح سے تھا زندگی میں بھی تہی جن کا جسد
مر کے جی اٹھنا فقط آزاد مردوں کا ہے کام
گرچہ ہر ذی رُوح کی منزل ہے آغوشِ لحد

الفصلُ الرّابع

وفیہ ستّۃ من المباحث

عن انس بن مالکؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الانبیاء احیاء فی قبورھم یصلّون۔[1]

ترجمہ۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ انبیائے کرام اپنی قبروں میں زندہ ہوتے ہیں اور نمازیں بھی پڑھتے ہیں۔

حیاتِ انبیاء کی قبورِ شریفہ سے صریح نسبت کے بعد اس وسوسے کے قطعاً کوئی گنجائش نہیں رہتی کہ انبیائے کرام صرف رفیقِ اعلیٰ اور علیّین میں فائز الحیات ہیں اور ان کی حیاتِ شریفہ کو اجسامِ قبریہ سے کوئی تعلق نہیں۔ وقد مرّ تفصیلہ من حاشیۃ سنن النسائی۔

آنحضرت کا یہ ارشاد محدثین کرام نے مختلف طرق سے نقل فرمایا ہے۔ ان میں نچلے راوی متعدد ہیں اور مختلف ہیں لیکن ان سب کا اشتراک اوپر کے اتنے سلسلۂ اسناد پر جا قائم ہوتا ہے۔

المستلم بن سعید عن الحجاج الاسود عن ثابت البنانی عن انس بن مالکؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

پس تمام محققین کا نقطۂ نظر انہی راویوں کی توثیق ہے، یعنی یہ رُواتِ حدیث قابلِ اعتماد ہیں تو حدیث ثابت ہے۔ ان کے بعد کے نچلے راویوں میں اگر کوئی اختلاف ہو بھی، تو مقصودِ توثیق قطعاً متاثر نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ طرق مختلف اور متعدد ہیں۔

---

[1] مسند ابی یعلی (جامع صغیر صفحہ ۱۰۳ مصر) حیات الانبیاء للامام البیہقی صفحہ ۳ مصر۔ ابن بزار (جمع الفوائد جلد ۲ صفحہ ۲۶ میرٹھ) ابن عدی (شفاء السقام صفحہ ۱۳۴) مسند ابی یعلی جلد ۳ صفحہ ۳۷۹ مجمع الزوائد جلد ۸ صفحہ ۲۱۱

حافظ ابو یعلیٰؒ کا سلسلۂ اسناد یہ ہے:۔

حدثنا ابو الجہمؒ الازرق بن علی حدثنا یحیی بن ابی بکیرؒ حدثنا المستلمؒ بن سعید عن الحجاجؒ عن ثابتؒ عن انسؓ قال قال رسول اللہ ﷺ ...... الحدیث

یہ سلسلۂ اسناد امام بیہقی کو اس طریق سے پہنچا ہے:۔

اخبرنا الثقۃ من اھل العلم قال انبأنا ابو عمروؒ بن حمدان قال انبأنا ابو یعلیٰ الموصلی حدثنا ابو الجہمؒ الازرق۔

حافظ ابو یعلی کے سلسلۂ اسناد میں سب راوی معروف، قابلِ اعتماد اور متصل ہیں۔ اب حافظ بیہقی کی سند ابو یعلی تک جن دو راویوں سے پہنچتی ہے اگر وہ نہ بھی ہوتے اور امام بیہقیؒ تک یہ حدیث نہ بھی پہنچی ہوتی، تو بھی یہ حدیث صحیح اور صالح الاحتجاج تھی اور حافظ ابو یعلی کا اسے سند صحیح سے لے آنا اس کی حجیت کے لیے کافی تھا۔ کس قدر افسوس ہے کہ امام بیہقی کے اس کہنے پر کہ "اخبرنا الثقۃ من اھل العلم" اس حدیث کے پورے اسناد پر مجہول ہونے کا حکم لگا دیا جاتا ہے۔ حالانکہ اس سند میں امام بیہقی کے شیخ روایت بھی حکماً مجہول نہیں۔ کیونکہ مجہول وہ ہوتا ہے، جسے کسی امامِ حدیث نے ثقہ نہ کہا ہو اور یہاں خود امام بیہقیؒ اسے اسی سند میں ثقہ قرار دے رہے ہیں۔ راوی کا تعین اور اس کے حالات کی تفصیل اسی لیے مطلوب ہوتی ہے کہ اس کی ثقاہت کا پتہ چلے اور اس مقام پر نہ صرف اس کی توثیق ہے۔ بلکہ امام حدیث حافظ بیہقی اس کے اہل العلم ہونے کا بھی اعلان کر رہے ہیں۔

خیر، اسے بھی جانے دیجئے۔ حافظ ابو یعلیؒ کے سلسلۂ اسناد کو لیجئے، نچلے رواۃ میں اگر کوئی اختلاف بھی ہو، تو بھی اوپر کے رواۃ کی توثیق بالکل متاثر نہیں ہوتی اور یہاں اوپر کے سب ثقہ ہیں

ملحوظ رہے کہ توثیقِ رجال میں حافظ بیہقی کا مسلک دارقطنی اور ابن حبان والا نہیں کہ فقط راویوں کی روایت اس کے لیے کافی ہو۔ بلکہ امام بیہقی اس باب میں جمہور محدثین کے ساتھ ہیں۔ پس ان کی توثیق کچھ کم وزن نہیں رکھتی۔ بالخصوص جب کہ اس روایت سے انہیں کسی خاص فقہی موقف کی کوئی تائید مقصود نہ ہو۔

المبحث الاول فی معنی الحدیث

اس حدیث میں انبیاء کے لیے وہی عنوان قائم کیا گیا ہے جو شہداء کے لیے قرآن کریم میں ملتا ہے۔ ہمارے نادان دوست بے فائدہ اس حدیث کی تضعیف میں لگے ہوئے ہیں اور جو سند ابن عدی یا ابن بزار کی ہے، اس پہ جرح کرکے اس حدیث سے جان چھڑانا چاہتے ہیں۔ حالانکہ یہ وہ عنوان ہے جو خود قرآن مجید میں موجود ہے۔ پس جو تاویل اور توجیہ تم قرآن پاک میں کرتے ہو، کیا وہی تاویل اس حدیث میں نہ ہوسکے گی۔ کیوں خواہ مخواہ اس صحیح حدیث کو ضعیف قرار دینے میں اپنی قوتیں ضائع کر رہے ہو۔ اور تمام علماء حق سے فکر لے رہے ہو۔

رہا یہ فرق کہ قرآن کریم میں فی قبورھم نہیں اور حدیث میں فی قبورھم کے الفاظ ہیں تو اس کی فکر وہ کرے جسے قبر کا معنی بدلنا نہ آتا ہو اور جسے پتہ ہو مجاز کا دروازہ کھلا ہے تو کون اس میں گھسنے کی راہ نہیں جانتا۔ پھر ان الفاظ کے انکار کے درپے ہونا اس میں معلوم نہیں انہیں کون سی ذہنی راحت ملتی ہے۔

باقی یہ فرق کہ قرآن کریم میں یرزقون کی تصریح ہے اور حدیث میں یصلون کے الفاظ ہیں تو اس جہت سے بھی تضعیفِ حدیث کی کوشش کوئی خاص فائدہ مند دکھائی نہیں دیتی یصلون کی نسبت یرزقون کا پیرایہ دنیوی زندگی کے اور زیادہ قریب ہے۔ معلوم نہیں یہ لوگ اس حدیث کی تضعیف کے کیوں درپے ہیں۔

اس حدیث میں حیاتِ انبیاء کو یصلون سے جوڑا گیا ہے۔ نماز ذکر اور چند جسمانی حرکات چاہتی ہے۔ سو نماز جسد چاہتی ہے۔ معلوم ہوا یہاں انبیاء کی کسی روحانی حیات کا ذکر نہیں۔ ان کی جسمانی زندگی کا ذکر ہے جس کا قوی قرینہ ان کا نمازیں پڑھنا ہے۔ معلوم ہوا وہ بایں معنی حیات ہیں کہ ان کے اعمالِ طاعت جاری ہیں اور یہ افتاد اُن سے سلب نہیں کی گئی۔

الانبیاء احیاءٌ (نبی زندہ ہیں) میں الانبیاء (پہلے جزو) کے معنی سمجھ لیجیے کہ یہاں روح

اور جسد دونوں مراد ہیں اور یہی نفس انسانی ہے۔ حضرت علامہ انور شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:۔

یرید بقوله الانبیاء احیاءٌ مجموع الاشخاص لا الارواح فقط[1]

ترجمہ۔ الانبیاء کے لفظ سے جسد اور روح کا مجموع اشخاص مراد ہے صرف روحیں نہیں۔

اور دوسرے جزء احیاء کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

اراد بالحیوٰۃ فعل الاعمال واکثر من فی القبور فی العطلة بخلاف المقربین۔[2]

ترجمہ۔ حیات سے آپ کی مراد اعمال کا جاری رہنا ہے (جو بدون جسد تقوم نہیں پاتے) اور اکثر اہل قبور بے کار پڑے ہیں لیکن مقربین کی یہ حالت نہیں (ان کے اعمال قائم ہیں)۔

ان کے اعمال ہمیں نظر نہ آئیں تو بھی ان کے اعمال سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ وہ زندگی پردے میں ہے اور ہم اس جہان میں ہیں۔ یہاں رہتے ہوئے ہم اس جہان کے حالات کو دیکھ نہیں پاتے، نہ اس جہاں کی آوازیں سن سکتے ہیں۔ ہاں ہم ہم تسلیم کرتے ہیں کہ انبیاء اور صدیق اپنی اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور باعتبارِ عالم ان کی زندگی برزخی ہے پردے میں ہے۔ اور جس طرح ہم یؤمنون بالغیب کے تحت ہم اور بہت سی حقیقتوں کو بن دیکھے تسلیم کرتے ہیں۔ ان احوال قبر پر بھی ہم یومنون بالغیب کے سائے میں ایمان لاتے ہیں۔ حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:۔

ان کثیراً من الاعمال قد ثبت فی القبور کالاذان والاقامة عند الدارمی وقرأة القرآن عند الترمذی۔[3]

ترجمہ۔ قبروں میں (احادیث کی رُو سے) بہت سے اعمال ثابت ہیں اذان اور اقامت کا ذکر سنن دارمی میں ملتا ہے اور قبر میں کسی کے قرآن پڑھنے کا ثبوت ترمذی شریف میں موجود ہے۔

صرف نماز ہی نہیں جو ایک جگہ ادا ہوتی ہیں۔ انبیاء عالم برزخ میں حج تک کرتے ہیں اور

---

[1] تحیۃ الاسلام صفحہ ۳۶ [2] فیض الباری جلد ۱ صفحہ ۱۸۳

دیکھنے والا انہیں کہیں چلتے پھرتے نہیں دیکھتا۔ وہ یہی محسوس کرتا ہے کہ وہ اپنی قبروں میں استراحت فرما رہے ہیں۔

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ لکھتے ہیں:۔

ان الانبیاء افضل من الشہداء والشہداء احیاء عند ربھم فکذلک الانبیاء فلا یبعد ان یصلوا و یحجوا و یتقربوا الی اللہ بما استطاعوا ما دامت الدنیا وھی دار تکلیف باقیۃ۔[1]

ترجمہ۔ انبیاء کرام شہداء سے افضل ہیں اور شہداء اپنے رب کے ہاں زندہ ہیں۔ سو انبیاء کرام بھی اس طرح زندہ ہیں۔ یہ کوئی امر بعید نہیں کہ وہ نماز بھی پڑھتے ہوں اور حج بھی کریں اور جہاں تک ہو سکے اللہ رب العزت کے قرب میں اور بڑھتے رہیں۔ جب تک یہ دنیا جو عمل کی دنیا ہے باقی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے موسیٰ علیہ السلام کو قبر میں نماز پڑھتے دیکھا اور وادی میں تلبیہ پکارتے بھی دیکھا۔ یہ عالم غیب میں نماز اور حج کی واردات ہیں جو یقیناً اپنی جگہ صحیح ہیں۔ گو ہم انہیں دیکھ نہ پائیں۔

اما موسیٰ کانی انظر الیہ اذا انحدر فی الوادی یلبی۔[2]

ترجمہ۔ اور موسیٰ علیہ السلام اس طرح ہیں کہ میں انہیں وادی میں اترتے دیکھ رہا ہوں وہ تلبیہ پڑھ رہے ہیں (لبیک پکار رہے ہیں)۔

عالم برزخ میں قبر کی زندگی میں اعمال طاعات کا جاری رہنا اور انبیاء و مقربین سے وہاں اذکار و ادعیہ کا صدور یہ ہرگز کوئی غیر شرعی بات نہیں ہے۔

علامہ سمہودیؒ (۹۱۱ھ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

ھو فی البرزخ ودعائہ لربہ فی ھذہ الحالۃ غیر ممتنع۔[3]

---

[1] فتح الباری جلد ۱۳ ص۲۴۵ [2] صحیح بخاری جلد ۱ ص۲۱۰ [3] وفاء الوفاء جلد ۲ ص۴۲۲ مصر

ترجمہ۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت عالم برزخ میں ہیں اور آپ کا
اس حالت میں اپنے پروردگار سے دعا کرنا کوئی ناممکن بات نہیں ہے۔

ایک اور جہت سے معنی پر غور

اس حدیث میں یہ بات غور طلب ہے کہ اس کا منشاء انبیاء کی صرف حیاتِ طبعی کا بیان نہیں، جس قسم کی حیات انبیائے کرام کے لیے ثابت کی جارہی ہے، وہ اس حیاتِ طبعی پر ایک امر زائد ہے اس کے لیے اس حقیقت کو پیش نظر رکھیئے :۔

عام طور پر روح اور جسم کے تعلق یا روح کے بدن میں ہونے کو زندگی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ حیات کا صرف طبعی مفہوم ہے۔ اس حیاتِ طبعی کی پھر دو حالتیں ہیں ۔ایک یہ کہ یہ حیات ان تمام کاموں سے جو مقصدِ حیات ہیں، خالی اور بے کار ہو اور دوسرے یہ کہ یہ حیات بے کار نہ ہو اور ان جیسے کاموں سے جو مقصدِ حیات ہیں، اس کا تعطل نہ ہو۔

اوّل الذکر حیات طبعی تو ہے، لیکن حقیقۃً یہ بھی موت ہے یا ایک ایسی زندگی ہے کہ اس میں اور موت میں کوئی فرق نہیں۔ قرآن عزیز ان لوگوں کو، جن کی حیاتِ طبعی تو تھی، لیکن ان کا دامنِ حیات مقصدِ حیات سے بالکل خالی تھا۔ قلوب ان کے مُردہ تھے اور دل کے کانوں سے وہ بہرے تھے، صریح الفاظ میں مُردے قرار دیتا ہے :۔

انّکَ لا تسمع الموتیٰ ولا تسمع الصّمّ الدّعاءَ۔ (پ۲۰ نمل، پ۲۱ : روم)

ترجمہ۔ بے شک آپ ان مُردوں کو نہیں سُنا سکتے اور نہ ان بہروں تک اپنی پکار پہنچا سکتے ہیں۔

پھر یہی نہیں کہ انہیں ،، مُردے ،، فرمایا، بلکہ ان کے لیے مُردوں کے لوازمات بھی ذکر کر دیئے :۔

وما انت بمسمع من فی القبور۔ (پ ۲۲، فاطر آیت ۲۲)

ترجمہ۔ اور آپ ان کو سنا نہیں سکتے، جو قبروں میں پڑے ہوئے ہیں۔

یہ لوگ طبعی طور پر تو زندہ اور موجود تھے، لیکن حکمی طور پر مُردہ —— بظاہر حیات تھی لیکن حقیقۃً موت۔ ظاہراً سنتے تھے مگر حقیقۃً نہیں۔

کریں گے مر کے بقائے دوام کیا حاصل جو زندہ رہ کے مقامِ حیات پا نہ سکے

قرآن عزیز احکامِ طبعی کو اپنا موضوع قرار نہیں دیتا، بلکہ حقائق کا ادراک کرتا ہے۔ اس کی نظر میں اندھا پن ظاہری آنکھوں سے محرومی نہیں، باطن کی سیاہی اور دل کی آنکھوں پر پردے کا نام ہے۔ قال اللہ تعالیٰ:۔

لا تعمی الابصار ولکن تعمی القلوب التی فی الصدور۔ (پ ۱۷: حج آیت ۴۶)

ترجمہ۔ یہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں، بلکہ حقیقت میں اندھے دل ہوتے ہیں جو سینوں میں پڑے ہوئے ہیں۔

اور اسی وجہ سے فرمایا:۔

من کان فی ھذہ اعمیٰ فھو فی الاٰخرۃ اعمیٰ۔ (پ ۱۵: بنی اسرائیل آیت ۷۲)

ترجمہ۔ جو کوئی اس جہان میں اندھا رہا، سو وہ دوسرے جہان میں بھی اندھا ہی ہوگا۔

ان حقائق سے واضح ہے کہ روح و جسم کا تعلق یا روح کا بدن میں ہونا ایک حیاتِ طبعی ہے۔ جب تک اس کا اشتغال ان کاموں میں نہ ہو، جو مقصدِ حیات اور رازِ تخلیقِ کائنات ہیں اسے حقیقی حیات نہیں کہا جا سکتا۔ اربابِ خبرت اس طبعی زندگی کی اوّل الذکر کیفیت کو موت ہی قرار دیتے ہیں اور صرف ثانی الذکر زندگی ہی کو حیات کہتے ہیں۔

یہاں تین کیفیتیں اور ان کے احکام پیشِ نظر رہنے چاہییں۔

(۱) —— روح اور جسم کا کوئی تعلق نہ ہو۔ اسے عامۃ الناس اور اربابِ خبرت دونوں موت قرار دیتے ہیں۔ یہ حیات کسی معنیٰ میں نہیں۔

(۲) روح اور جسم کا تعلق تو ہو، لیکن دامنِ حیات مقصدِ حیات سے خالی ہو، اسے عوام حیات اور اربابِ خبرت موت سے تعبیر کرتے ہیں.

(۳) روح اور جسم کا تعلق بھی ہو اور زندگی بھی مقصدِ حیات سے خالی نہ ہو، اسبابِ خبرت اسے ہی حیات قرار دیتے ہیں اور حقیقت میں زندگی یہی ہے.

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ارشاد فرمایا کہ الانبیاء احیاء فی قبورھم یصلون (انبیائے کرام اپنی اپنی قبروں میں زندہ ہوتے ہیں) تو آپ کا منشا صرف حیاتِ طبعی کا بیان نہیں، بلکہ اس حیات کی کیفیت کا اظہار تھا. اگر حیاتِ انبیاء کا یہی مفہوم ہو کہ انہیں قبورِ شریفہ یا ریاضِ متورہ میں ایسی زندگی حاصل ہے. جس میں محض روح و بدن کا تعلق قائم ہے، تو یہ کوئی خاص مقام نہیں. اس لیے کہ قرآن عزیز تعطل عن الافعال کی حیاتِ طبعی کو بے کار ہونے کی وجہ سے موت کے برابر قرار دیتا ہے. پس حدیث شریف کا منشاء اسی قسم کی حیاتِ طبعی نہیں، بلکہ ایسی حقیقی حیات ہے، جس میں محض روح و بدن ہی کا تعلق نہیں، بلکہ اعمال سے بھی ہرگز تعطل نہیں اور یہی حقیقت میں قرآن کا مفہوم حیات ہے.

الغرض یہ مذکورہ بالا تین صورتوں میں سے دوسری قسم کی حیات نہیں، بلکہ تیسری قسم کی حقیقی حیات ہے اور اسے ہی اسبابِ دانش حقیقتِ حیات قرار دیتے ہیں.

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اگر یہی ارشاد فرماتے کہ "الانبیاء احیاء فی قبورھم"، تو یوں متبادر ہو سکتا تھا کہ روضۂ شریفہ میں انبیاء صرف روح و بدن کے تعلق کے ساتھ زندہ ہیں اور انبیاء کی حیاتِ جسمانی فقط اسی تعلق کا نام ہے. لیکن حضور نے لفظ یصلون ارشاد فرما کر احیاء کی کیفیتِ حیات پر بھی متنبہ کر دیا یعنی انبیاء جسدِ عنصری سے اس طرح فائز الحیات ہیں کہ زندوں جیسے کاموں سے ہرگز تعطل نہیں ہوا اور وہ بدستور اعمال طیبات میں مشغول ہیں. نہ دنیا میں ان کے اشغال طیبہ میں تعطل ہوا، نہ قبورِ شریفہ میں.

خلاصۂ کلام یہ کہ انبیائے کرام کی اس حیاتِ قبریہ کے دو جزو ہیں :-

(۱) وہاں کی حیات محض روحانی نہیں کہ صرف ارواح زندہ ہوں، بلکہ یہ زندگی جسم و روح کے مجموعہ کی ہے۔

(۲) یہ حیات صرف حیاتِ طبعی کی حدود تک نہیں، بلکہ ان اشخاص کریمہ کا زندوں جیسے کاموں میں اشتغال بھی موجود ہے۔

رئیس المحدثین حضرت علامہ انور شاہ صاحبؒ نے ان دونوں جزوں کو خوب بیان فرمایا ہے جزء اول کے متعلق لکھتے ہیں:۔

یرید بقولہ "الانبیاء احیاء" مجموع الاشخاص لا الارواح فقط۔[1]

ترجمہ: آنحضرت کی مراد اس حدیث سے کہ "انبیائے کرام زندہ ہوتے ہیں" یہی ہے کہ مجموعہ اشخاص فائز الحیات ہیں نہ کہ فقط ان کی ارواح زندہ ہیں۔

اور دوسرے جزء کے متعلق لکھتے ہیں:۔

اراد بالحیٰوۃ فعل الاعمال واکثر من فی القبور فی العطلۃ بخلاف المقربین ومعانی الحیات فی النھایۃ وان المیت لا فعل لہ فی خلق افعال العباد والاحادیث ارادت افعال الحیٰوۃ واعمالھا لا بقاء الروح وھو قولہ فنبی اللہ حی یرزق واحیاء فی قبورھم یصلون نشرد فی ذکر الحیٰوۃ افعالھا لا اصلھا او اراد مع الاجساد فان اجسادھم حرمت علی الارض۔[2]

خلاصہ: آنحضرت کی مراد انبیاء کے زندہ ہونے سے اعمال کی زندگی ہے اور اکثر لوگوں کی قبریں ایسے اعمال سے تعطل میں ہیں۔ ان احادیث کا منشاء اعمال حیات کا بیان ہے نہ کہ فقط روح کی زندگی۔ حضور کا یہ ارشاد فنبی اللہ حی یرزق (اللہ کا نبی زندہ ہوتا ہے اور اسے رزق بھی ملتا ہے) اور یہ ارشاد کہ انبیائے کرام اپنی قبروں میں زندہ ہوتے ہیں اور نمازیں بھی پڑھتے ہیں، یہ سب اصل حیات کے بیان میں

---

[1] تحیۃ الاسلام فی حیات عیسیٰ علیہ السلام مصنفہ مولانا سید انور شاہؒ ص۳۶ [2] ایضاً

نہیں، بلکہ (اس سے بھی زائد) اعمال حیات کے ثابت ہونے کے لیے ارشاد فرمائے گئے تھے یا یوں کہیے کہ اس زندگی سے مراد حیاتِ جسدی کا بیان ہے۔ کیونکہ انبیاء کے اجسادِ کریمہ مٹی پر حرام کر دیئے گئے ہیں اور وہ اعمال انہی اجسادِ کریمہ کے ساتھ وجود میں آ رہے ہیں۔

شاہ صاحبؒ نے اس دوسرے جزو کو "دروسِ بخاری" میں بھی تفصیلاً ارشاد فرمایا ہے۔ چونکہ وہاں پہلے جزو کی اس طرح تفصیل نہیں۔ اس لیے عبارت سے ابتدائی سطح میں مغالطہ لگ سکتا ہے۔ انصاف یہ ہے کہ پہلا جزو محققین سلف کے نزدیک اتنا بدیہی تھا کہ اس کے لیے کسی تفصیل کی ضرورت محسوس نہ فرماتے تھے۔ ان لوگوں کے علم و فہم پر حیرت ہوتی ہے۔ جو اس جزو اول کے عدمِ ذکر کو ذکرِ عدم بنا کر دوسرے جزو کا مفہوم و مطلب بھی اپنی تدلیس کی نذر کر دیتے ہیں۔ اعاذنا اللہ منہا ومن تحریف المبطلین۔

① مولانا السید انور شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:۔

المراد بحدیث الانبیاء احیاء فی قبورهم یصلون انهم ابقوا علی هذه الحالة ولم تسلب عنهم۔[1]

ترجمہ۔ اس حدیث حیاتِ انبیاء کا مطلب یہی ہے کہ انبیائے کرام (بدن میں روح لوٹ آنے کی) اسی حالت میں باقی رکھے گئے ہیں اور پھر روح ان سے جدا نہیں کی گئی۔

② قاضی شوکانیؒ شرح حصنِ حصین میں فرماتے ہیں:۔

انه صلی اللہ علیه وسلم حی فی قبره وروحه لا تفارقه لما صح ان الانبیاء احیاء فی قبورهم۔[2]

ترجمہ۔ حضور اکرمؐ اپنی قبر شریف میں زندہ ہیں اور آپ کی روحِ اقدس آپ کے جسدِ اطہر

---

[1] تحیۃ الاسلام ص۳۶ [2] تحفۃ الذاکرین للشوکانی ص۲۸ مصر

سے کبھی جُدا نہیں ہوتی۔ کیونکہ یہ حدیث صحیح سند سے ثابت ہو چکی ہے کہ انبیاء اپنی اپنی قبروں میں زندہ ہوتے ہیں۔

البیان المسدد من حضرت المجدد

(۳) حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ نے اس حدیث کو اس سیاق و سباق میں نقل فرمایا ہے:۔

برزخِ صغرٰے چوں از یک وجہ از مواطنِ دُنیوی است، گنجائشِ ترقی دارد و احوال ایں وطن نظر باشخاص متفاوتہ تفاوت فاحش دارد۔ الانبیاء یصلون فی القبور شنیدہ باشند و حضرتِ پیغمبر ما علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰۃ والسلام شبِ معراج چوں بر قبر حضرت کلیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام گذشتند دیدند کہ در قبر نماز می گزارد۔[لے]

اس کلام ہدایت نظام میں جہاں اس طرف اشارہ ہے کہ حیاتِ برزخی کسی ایک جہت سے حیاتِ دُنیوی بھی ہے، وہاں اس امر کی تصریح بھی موجود ہے کہ برزخِ صغرٰے میں بھی ترقی مقامات کی گنجائش ہے۔

سوال یہ ہے کہ اس ترقی سے مراد کیا ہے؟ جواباً عرض ہے کہ اس سے مراد "قربِ الٰہی" میں آگے بڑھتے چلے جانا ہے۔

اس ارتقاء کا تحقق کیسے ہوتا ہے اور اس ترقی کی کیا صُورت ہوتی ہے۔ اسے سمجھنے کے لیے حضرت مجدد الف ثانیؒ کے یہ اصُول و ضوابط پیشِ نظر رہیں:۔

حضرت کے نزدیک "عالمِ خلق"، "عالمِ امر" سے افضل ہے اور وہ "قربِ عالمِ خلق" کو "قربِ اصلی" اور "قربِ عالمِ امر" کو "قربِ ظلی" قرار دیتے ہیں۔

پس ان کے کلام میں ترقی کی صُورت اور ارتقاء کا انداز یہی ہے کہ یا "قربِ ظلی" سے ہی

لے مکتوبات جلد ۲ صفحہ ۲۹ نمبر ۱۶ مطبوعہ لکھنؤ

"قربِ اصلی" میں انتقال ہو اور یا "قربِ اصلی" ہی میں قوت و زیادت ہوتی چلی آئے۔

اسلام میں ایمان کے بعد نماز کا درجہ ہے اور اس کے کمالات ایمان کی طرح ذاتی کمالات ہیں۔ اس عبادت کو اسلام میں جو درجہ حاصل ہے، اس کے پیش نظر اس میں کوئی شک کی گنجائش نہیں کہ وہ قرب جو نماز میں تحقق پذیر ہو گا۔ اس قرب سے بہرحال اعلیٰ و افضل ہے جو کسی اور حالت میں حاصل ہو گا۔ پس نماز کے ساتھ "قربِ الٰہی" میں بڑھتے چلے جانا "قربِ اصلی" پر فائز المرام ہونا ہے۔ اسی لیے فرمایا:۔

الانبیاء احیاء فی قبورھم یصلون۔

ترجمہ۔ انبیاء اپنی قبروں میں زندہ ہوتے ہیں اور نمازیں بھی پڑھتے ہیں۔

پس جب یہ نمازیں جو انبیائے کرام اپنے اپنے روضات میں تلذذاً عمل میں لا رہے ہیں قربِ الٰہی میں سامانِ ارتقاء ہیں۔ جیسا کہ حضرت مجدد صاحبؒ نے تصریح فرمائی ہے اور یہ بھی حقیقت مسلمہ ہے کہ قرب کے باب میں عالمِ خلق عالمِ امر سے افضل ہے، تو اس بنیاد یقین سے چارہ نہیں کہ انبیائے کرام کا اپنی اپنی قبروں میں نمازیں پڑھنا جب قُربِ الٰہی میں ترقی پانے کی گنجائش رکھتا ہے، تو ان کا یہ عمل ضرور عالمِ خلق ہی سے متعلق ہے۔ اس لیے کہ حضرت مجدد قربِ عالمِ خلق ہی کو قربِ اصلی قرار دیتے ہیں اور ظاہر ہے کہ ان کے عملِ صلوٰۃ کا عالمِ خلق سے متعلق ہونا اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے اجسادِ کریمہ کے ساتھ فائز الحیات ہوں اور یہ ادائے نماز انہی اجسامِ عنصریہ سے عمل میں آ رہا ہو۔ اگر یہ عملِ صلوٰۃ صرف روح ہی کا عمل ہو تو پھر یہ عالمِ امر سے متعلق ہو گا اور واضح ہے کہ حضرت مجددؒ کے کلام میں اسے قربِ اصلی کہنے کی کوئی گنجائش نہیں۔

پس خلاصۂ کلام یہی ہے کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے نزدیک اس حیاتِ انبیاء کا مفہوم و مطلب یہی ہے کہ انبیائے کرام اپنی اپنی قبروں میں اجسادِ عنصریہ سے فائز الحیات ہیں۔

④ علامہ سندھیؒ فرماتے ہیں:۔ الصلوٰۃ تستدعی جسداً حیاً۔ (حاشیہ سنن نسائی)

ترجمہ۔ نماز پڑھنا ایک زندہ جسم سے ہی ہو سکتا ہے۔

(۵) حضرت علامہ شعرانی" فرماتے ہیں۔

قد صحت الاحادیث انہ صلی اللہ علیہ وسلم حی فی قبرہ یصلی باذان واقامۃ[۱]

ترجمہ: صحیح حدیثوں سے ثابت ہو چکا ہے کہ حضور انور اپنی قبر مبارک میں زندہ ہیں اور اذان و اقامت سے نماز پڑھتے ہیں۔

(۶) حافظ ابن حجر عسقلانی رح فرماتے ہیں آپ استمرار حیات سے زندہ ہیں۔

ان حیاتہ صلی اللہ علیہ وسلم فی القبر لا یعقبہا موت بل یستمر حیا و الانبیاء احیاء فی قبورھم[۲]

ترجمہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قبر شریف میں اس طرح زندہ ہیں کہ اس زندگی پر موت کبھی نہ آئے گی۔ آپ ہمیشہ کے لیے زندہ رہیں گے اور انبیائے کرام اپنی قبروں میں زندہ ہی رہتے ہیں۔

نماز کسی ایک وقت کی نہیں ہر روز پانچ وقت ہوتی ہے سئل فی القبر (قبر کا سوال و جواب) ایک ہی دفعہ ہوتا ہے لیکن نماز روزانہ کا ایک عمل ہے۔ نماز نہ بدون جسد عمل میں آسکتی ہے نہ بدوں جگہ۔ دنیا والوں کے لیے اس کی جگہ مسجد ہے اور برزخ کے لیے قبر۔ وہ وہیں پڑے کی زندگی میں محو نیاز ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کی ارواحِ قدسیہ کہیں ملاء اعلیٰ میں ہوں یا اور کہیں، نماز کے لیے انہیں ایک بدن اور جگہ کی ضرورت ہوتی ہے حدیث الانبیاء احیاء میں کونسی حیات مراد ہے؟ یہاں ان کے نماز پڑھنے کا بیان ہے تو لازمی طور پر احیاء سے مراد روح اور جسد کی زندگی ہے اور اس کے لیے جگہ انبیاء کرام کی اپنی اپنی قبور شریفہ ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت موسیٰ کو اپنی قبر میں نماز پڑھتے دیکھا۔ علامہ بدر الدین لکھتے ہیں۔

ھذا صریح فی اثبات الحیٰوۃ لموسیٰ علیہ السلام فی قبرہ فانہ وصفہ بالصلوٰۃ وانہ قائم ومثل ھذا لا یوصف بہ الروح وانما یوصف بہ الجسد وفی تخصیصہ بالقبر دلیل علیٰ ھذا فانہ لو کان من اوصاف الروح لم یحتج لتخصیصہ بالقبر[۳]

---

[۱] منح المنۃ صہ ۹۲ [۲] فتح الباری جلد ۷، صہ ۲۲ [۳] زہر الربیٰ علیٰ سنن النسائی

ابو یعلیٰ کے سب راوی ثقہ ہیں اور سب میں اتصال موجود ہے، محدث کبیر حافظ ہیثمیؒ فرماتے ہیں۔

رجال ابی یعلی ثقات [1]

سو اب ہم ان ہی راویوں کی تعدیل بیان کریں گے جو اوپر کے ہیں اور جن پر حدیث کا دار و مدار ہے۔

المبحث الثانی ـــــ فی احوال الرواۃ لابی یعلیٰ

① ـــــ ابوالجہم الازرق

بن علی الحنفی ابوالجہم صدوق یغرب من الحادیۃ عشرۃ۔ [2] ابن حبان نے ثقہ کہا ہے

صدوق اور سچے راوی حدیث ہیں۔

② ـــــ یحییٰ بن ابی بکیر

واسمہ نسر الکرمانی کوفی الاصل نزل بغداد :

ثقۃ من التاسعۃ مات سنہ ۲۹۸ ھ۔ [3]

ثقہ راوی حدیث ہیں۔ رجال صحیح میں سے ہیں۔ [4]

③ ـــــ مستلم بن سعید

امام احمد اور ابن حبان انہیں ثقہ قرار دیتے ہیں (فتح) صدوق۔ [5]

یعنی ثقہ اور سچے راوی حدیث ہیں۔

④ ـــــ حجاج بن الاسود الاسود

یہ ابن ابی زیاد بصری ہے۔ اس نے ثابت بنانی، جابر بن یزید، ابی نضرہ اور کئی دوسرے بزرگوں سے احادیث روایت کی ہیں اور اس سے جریر بن حازم، حماد بن سلمہ، روح بن عبادہ اور کئی اور لوگوں نے روایات لیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ فرماتے ہیں امام احمد اور یحییٰ بن معین نے اسے ثقہ کہا ہے

---

[1] مجمع الزوائد [2] تقریب ص۳۹ [3] تقریب ص۳۸۵ [4] فتح الباری پ۱۳ ص۱۴۸ [5] تقریب ص۲۸۹

آپ کی یہ توثیق لسان المیزان میں موجود ہے اور یہ سب رواۃ اعلیٰ درجے کے قابلِ اعتماد اور ثقہ رواۃ حدیث ہیں اور حدیث بالکل حدیث ہے۔

کسی راوی پر جرح ہو تو علماء کا کام وجہ جرح کو تلاش کرنا اور اس کا سبب معلوم کرنا ہوتا ہے۔ جو جرح مبین السبب نہ ہو اور اس کے مقابل ائمہ فن کی تعدیل موجود ہو تو محدثین اس جرح کو وزن نہیں دیتے۔ ایسی ہی ایک جرح اس کے پانچویں راوی حجاج بن اسود پر ہے۔ ذہبی نے میزان الاعتدال میں اس پر نکرہ ہونے کی جرح کی ہے اور اس کی روایت کو خبر منکر کہا ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے لسان المیزان (جو خاص اسی کتاب میزان الاعتدال پر لکھی گئی ہے) میں اس جرح کو رد کر دیا ہے۔ اب آپ خود غور فرمائیں کہ ذہبی کی جرح کو میزان سے نقل کرنا اور لسان المیزان کے جواب کا ذکر تک نہ کرنا کون سی شانِ دیانت اور حق طلبی ہے؟ ہاں عوام کی آنکھوں میں خاک جھونکنے کے لیے (کہ دیکھو یہ جرح موجود ہے فلاں نے یہ کہہ دیا ہے) یہ ایک بہانہ ضرور ہے۔ آیئے اب اس پر کچھ غور بھی کریں۔

حجاج بن الاسود

ذہبی (۷۴۸ھ) کہتے ہیں "ما روی عنه فیما اعلم سوی مستلم بن سعید"، کہ مستلم بن سعید کے سوا اس سے کسی نے روایت نہیں لی۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ لکھتے ہیں جریر بن حازم، حماد بن سلمہ، روح بن عبادہ اور کچھ اور لوگوں نے بھی روایت لی ہے۔ سو اسے کسی درجے میں مجہول نہیں کہا جا سکتا۔

رہی توثیق تو یاد رہے کہ امام یحییٰ بن معین اور امام احمد دونوں اسے ثقہ راوی حدیث کہتے ہیں اور ابو حاتم نے اسے صالح الحدیث کہا ہے۔

حجاج بن الاسود بصری الاصل ہے۔ یہ ابن زیاد بصری ہے۔ اس نے ثابت بنانی، جابر بن یزید، ابی نضرہ اور دوسرے کئی بزرگوں سے احادیث سُنی ہیں اور اس سے جریر بن حازم، حماد بن سلمہ، روح بن عبادہ، عیسیٰ بن یونس، مستلم بن سعید اور دیگر کئی حضرات نے روایات لی ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ لکھتے ہیں:-

قال احمد ثقة ورجل صالح وقال ابن معين ثقة وقال ابو حاتم صالح الحديث وذكره ابن حبان فی الثقات۔[1]

ترجمہ۔ امام احمد نے فرمایا، حجاج ثقہ راوی ہے اور مردِ صالح ہے۔ امام یحییٰ بن معین لکھتے ہیں وہ ثقہ راوی ہے۔ ابوحاتم کہتے ہیں وہ صالح الحدیث ہے اور ابن حبان نے اُسے ثقہ راویوں میں شمار کیا ہے۔

کشف الستارۃ عن وجہ النکارۃ

حافظ ذہبیؒ کا خیال ہے کہ حجاج نکارت کا مرتکب ہے۔ یعنی ثابت بُنانی سے روایت کرتے ہیں وہ ثابت کے دوسرے شاگردوں کی مخالفت کر رہا ہے۔ پس "منکر الروایۃ" ہے۔ ذہبی لکھتا ہے:۔

فاتی بخبر منکر عنه عن انسؓ فی ان الانبیاء احیاء فی قبورھم یصلون رواہ البیہقی۔[2]

ترجمہ۔ حجاج اسود، ثابت سے حضرت انسؓ کی روایت لایا ہے، جو "منکر" ہے کہ انبیاء اپنی قبروں میں زندہ ہوتے ہیں اور نمازیں بھی پڑھتے ہیں۔
یعنی حجاج ثابت کے دوسرے شاگردوں کی مخالفت کر رہا ہے۔

ہم نے بہت تلاش کی کہ ثابت بُنانی کے دوسرے شاگردوں سے اس روایت کی کہیں مخالفت مل جائے، یعنی انہوں نے اسے اس طرح روایت کیا ہو حیاتِ انبیاء کا مضمون اس سے ٹکرا رہا ہو اور کسی طرح اس پر ثقہ کی زیادتی بھی نہ بن سکے۔ لیکن افسوس کہ حافظ ذہبی کے اس گمان کی ہمیں کہیں سے تصدیق میسر نہیں آسکی۔ ومن ادعی فعلیه البیان۔

غایت تامل سے ذہن اس طرف منتقل ہوا کہ ممکن ہے حافظ ذہبی کے پیشِ نظر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قبر میں نماز پڑھنے کی وہ روایت ہو جسے کہ ہم صحیح مسلم کے حوالہ سے نقل کر چکے ہیں۔

---

[1] لسان المیزان جلد ۲ صفحہ ۱۷۵ فتح الباری جلد ۱۳ صفحہ ۲۴۲ [2] میزان الاعتدال جلد ۱ صفحہ ۴۶۰

اس لیے کہ اس روایت کا سلسلۂ اسناد بھی عن ثابت البنانی عن انسؓ ان رسول اللہ صلی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ـــــ پر منتہی ہوتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ صلوٰۃ موسیٰ فی القبر والی روایت کا سلسلۂ اسناد یہ ہے:۔

حماد بن سلمہ عن ثابت عن انسؓ عن النبیؐ۔

اور صلوٰۃ جمیع الانبیاء فی القبور والی روایت کا سلسلۂ اسناد یہ ہے:۔

حجاج بن الاسود عن ثابت عن انسؓ عن النبی۔

حافظ ذہبیؒ کے اعتراض سے ایسا متبادر ہوتا ہے کہ وہ ان دونوں روایتوں کو اصلاً ایک سمجھ رہے ہیں اور اس لیے کہ حماد بن سلمہ حضرت ثابت سے حضرت موسےٰ علیہ السلام کا قبر میں نماز پڑھنا روایت کر رہے ہیں اور حجاج اسود اس کی بجائے تمام انبیائے کرام کا اپنی قبروں میں نماز پڑھنا نقل کر رہے ہیں۔ انہوں نے اسے ثابت کے دوسرے شاگردوں کی مخالفت سمجھ کر حجاج اسود کو نکارت کا مرتکب قرار دے دیا اور حدیث کو منکر کہہ دیا۔

حالانکہ یہ دونوں حدیثیں علیحدہ علیحدہ تھیں بس نکارت کا سوال پیدا نہیں ہوتا، نہ یہ ایک روایت ہے اور نہ حجاج اپنے شیخ روایت کے دوسرے شاگردوں سے ٹکرا رہا ہے۔ یہ دو حدیثیں ہیں، اور مستقل طور پر علیحدہ علیحدہ ہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ خاتمۃ الحفاظ حافظ ابن حجر عسقلانی نے "لسان المیزان" میں حافظ ذہبی کی مذکورہ جرح بالکل قبول نہیں کی اور اسے نقل کر کے اس کا رد فرمایا ہے۔ حضرت امام احمد اور امام یحییٰ بن معین جیسے ائمہ جرح و تعدیل جس کے ثقہ ہونے پر نص فرما رہے ہوں۔ اس کی روایت کیسے نشانۂ ضعف بن سکتی ہے۔ فتفکروا یا اولی الابصار

الغرض حجاج اسود نہایت ثقہ اور صالح الحدیث ہے اور ائمہ کبار نے اس کے ثقہ ہونے پر نص فرمائی ہے۔ حافظ ذہبی کا منشائے اعتراض یہ تھا کہ دونوں روایتیں ایک ہوں، حالانکہ ایسا ہرگز نہیں۔ دونوں حدیثیں جدا جدا ہیں اور اپنے اپنے مقام پر دونوں صحیح ہیں۔ رجال دونوں کے ثقہ ہیں اور سب میں اتصال موجود ہے۔

علامہ ذہبیؒ کے وہم کا ازالہ

علامہ ذہبیؒ کے ذہن میں حجاج بن اسود کوئی غیر معروف راوی ہے جس سے مستلم بن سعید کے ۔ اکوئی اور روایت کرنیوالا نہیں۔ ان کے خیال میں یہ وہ حجاج بن اسود نہیں جس سے جریر بن حازم حماد بن سلمہ ۔ روح بن عبادہ وغیرہ بھی روایت کرتے ہیں۔ علامہ ذہبی نے اسی وہم کی وجہ سے میزان الاعتدال میں حجاج بن اسود کی اس صحیح روایت کو خبر منکر کہا ہے جسے پیر العیت اٹھائے پھرتے ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے لسان المیزان میں حافظ ذہبیؒ کی پوری تردید کر دی ہے اور حضرت امام احمد یحیٰی بن معین اور ابن حبان سے حجاج بن اسود کی توثیق نقل کی ہے اب نہ حجاج مجہول راوی رہا نہ اسکی روایت کسی قاعدہ حدیث سے منکر ٹھہری۔

عراق کے اکابر علماء حدیث میں شیخ علی السویدی البغدادی (۱۲۳۷ھ) علامہ محمود آلوسی (۱۲۷۰ھ) کے اساتذہ میں سے ہیں انہوں نے العقد الثمین فی بیان مسائل الدین لکھی ہے۔ اس میں ہے :-

اخرج ابویعلیٰ والبیہقی وصححہ عن انسؓ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال الانبیاء احیاء فی قبورہم یصلون۔

علامہ آلوسیؒ کے بیٹے علامہ نعمان آلوسی (۱۳۱۷ھ) نے عدم سماع موتیٰ پر ایک کتاب الآیات البینات فی عدم سماع الاموات علی مذہب الحنفیۃ السادات لکھی ہے اس میں آپ حیاۃ انبیاء کے بارے میں لکھتے ہیں ــــــ "فامر ثابت بالاحادیث الصحیحۃ"

آپ نے اس میں پہلے حدیث الانبیاء احیاء فی قبورہم یصلون پیش کی ہے اور اسے صحیح کہا ہے علامہ محمد ناصر الدین البانی نے الاحادیث الصحیحہ میں اس حدیث کی تصحیح کی ہے۔ علامہ البانیؒ نے الآیات البینات کی احادیث کی تخریج کی ہے۔ اس میں آپ لکھتے ہیں:-

حققتہ فی الاحادیث الصحیحۃ (۶۲۱ھ) وبینت فیہ صحۃ الحدیث ووہم من طعن فی احد رواتہ فراجعہ فانہ بحث مفید عزیز قلما تراہ فی کتاب۔ ص۴۰

ترجمہ: میں نے احادیث صحیحہ میں اس کی تحقیق کی ہے اور صحت مذکور کو واضح کیا ہے اور جس نے اس کے کسی راوی میں کوئی جرح کی وہ وہم کا شکار ہے اس کی مراجعت فرمائیں بہت مفید

حدیثِ صلوٰۃ موسےٰ فی القبر کو محدثین نے اس حدیث " الانبیاء احیاء فی قبورھم یصلون" کا شاہد اور مؤید قرار دیا ہے پس دونوں کو ایک حدیث کیسے سمجھا جا سکتا ہے. شیخ الاسلام حضرت عثمانی " نقل فرماتے ہیں :۔

وشاھد ھذا الحدیث ما ثبت فی صحیح مسلم من روایۃ حماد بن سلمۃ[1]

ترجمہ. صحیح مسلم میں حماد بن سلمہ سے جو روایت منقول ہے. وہ اس حدیث (الانبیاء احیاء فی قبورھم یصلون) کی شاہد ہے.

ھذا ما ظھر لی واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم.

المبحث الثالث

حضرت ثابت بُنانیؒ سے یہ حدیث حیاتِ انبیاء صرف حجاجِ اسود روایت کر رہے ہیں راوی ثقہ ہونے کے باعث یہ حدیث بالکل صحیح ہے اور اس کی سند بالکل بے غبار ہے. تاہم تائید مزید ملاحظہ کیجیے :۔

حضرت ثابت بنانیؒ یہ روایت کرتے تھے :۔

اللّٰھم ان کنت اعطیت احدًا من خلقک ان یصلی لک فی قبرہ فاعطنی ذالک.[1]

ترجمہ. اے اللہ! اگر تُو نے (انبیاء کے سوا) کسی کو اپنی مخلوق میں سے یہ مرتبہ دیا ہے کہ وہ اپنی قبر میں تیرے لیے نماز پڑھے تو وہ مرتبہ مجھے عطا فرما.

دُوسری سند میں یوسف بن عطیہ متابعت کرتے ہوئے کہتے ہیں :۔

سمعت ثابتًا یقول لحمید الطویل ھل بلغک یا ابا عبید ان احدًا یصلی فی قبرہ الا الانبیاء قال " لا " ، قال ثابت " اللّٰھم ان اذنت لاحد ان یصلی فی قبرہ

---

[1] حلیۃ الاولیاء لابی نعیم جلد ۲ صد ۳۱۹ مصر

فاذن الثابت ان یصلی فی قبرہ۔[1]

ان روایات سے پتہ چلتا ہے کہ انبیائے کرام کے اپنی اپنی قبور شریفہ میں نماز پڑھنے کا مضمون حضرت ثابت بنانیؒ کے نزدیک یقینی طور پہ ثابت تھا تبھی تو وہ اپنے لیے بھی اس کی دعائیں کر رہے تھے۔ پھر ان کا ابو عبیدہؒ سے یہ کہنا کہ کیا تمہیں کوئی روایت پہنچی ہے کہ انبیائے کرام کے سوا کچھ اور لوگ بھی اپنی قبروں میں نمازیں پڑھیں گے اور انبیائے کرام سے متعلق اس دعوے پر ابو عبیدہ کا نکیر نہ کرنا اس حقیقتِ حال کا پتہ دیتا ہے کہ حضرت عبیدہؒ کو بھی یہ مضمونِ حدیث پہنچ چکا تھا کہ انبیائے کرام اپنی اپنی قبور شریفہ میں نمازیں پڑھتے ہیں۔ ورنہ غیر انبیاء کے اس مقام پر آنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اب حجاج اسودؒ حضرت ثابتؒ سے یہ مضمون نقل کرتے میں متفرد نہ رہے اور اس کے ایک اور طریق کا پتہ چل گیا۔ اگرچہ اس میں ابو عبیدہؒ عن ثابتؒ عن انسؓ کی تصریح نہیں، تاہم اس کا مجموعی مفاد اس روایت کی تائید ضرور کر رہا ہے اور حضرت ثابتؒ کے نزدیک تو اس مضمون کے ثابت ہونے میں کوئی شبہ ہی نہ رہا۔

حضرت جبیرؒ کہتے ہیں کہ میں نے ثابت بنانیؒ کو خود قبر میں اتارا تھا۔ حمید طویل بھی اس وقت میرے ساتھ تھے۔ جب ہم نے ان پر اینٹیں برابر کر دیں تو ایک اینٹ گر پڑی، ثابتؒ کو دیکھا کہ قبر میں نماز پڑھ رہے ہیں۔[2] اللہ تعالیٰ کسی سے کبھی برزخ کا پردہ اٹھا دیں تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔

فلما سوینا علیہ اللبن سقطت لبنۃ فاذا رایتہ یصلی فی قبرہ فقلت للذی معی الا تری قال اسکت فلما سوینا علیہ وفرغنا اتینا ابنتہ فقلنا لھا ما کان عمل ابیک ثابتؒ ..... قال فی دعائہ اللھم ان کنت اعطیت احدا من خلقک الصلوۃ فی القبر فاعطنیھا۔[3]

وقال ابن سعد فی الطبقات وابن ابی شیبۃ فی المصنف والامام احمد فی الزھد اخبرنا عفان بن مسلم قال حدثنا حماد بن سلمۃ عن ثابت البنانی ھکذا واللہ اعلم بالصواب۔

---

[1] حلیۃ الاولیاء، جلد ۲ صفحہ ۳۱۹ مصر [2] والتفصیل فی تنویر الحلک فی رؤیۃ النبی والملک صفحہ ۱۰ مصر [3] حلیۃ الاولیاء، جلد ۲ صفحہ ۳۱۹

المبحث الرابع

کن کن اکابر محدثین اور علماء اعلام نے اس حدیث کے صحیح ہونے پر نص فرمائی ہے یا اسے قبول کیا ہے یا اسے استدلالاً ذکر کیا ہے۔

(۱) ابن بزار (۲۹۸ھ)
(۲) حافظ ابو یعلی الموصلی (۳۰۷ھ)
(۳) ابن عدی (۳۶۵ھ)
(۴) حافظ ابو نعیم (۴۳۰ھ)
(۵) حافظ بیہقی (۴۵۸ھ)
(۶) حافظ ابن عساکر الدمشقی (۵۷۱ھ)
(۷) حافظ توربشتی (۶۶۲ھ)
(۸) حافظ ابن تیمیہ (۷۲۸ھ)
(۹) حافظ ابن قیم (۷۵۱ھ)
(۱۰) حافظ تاج الدین سبکی (۷۷۴ھ)
(۱۱) حافظ ابن کثیر (۷۷۴ھ)
(۱۲) حافظ ھیثمی (۸۰۷ھ)
(۱۳) حافظ ابن حجر عسقلانی (۸۵۲ھ)
(۱۴) حافظ بدر الدین العینی (۸۵۵ھ)
(۱۵) علامہ سخاوی (۹۰۲ھ)
(۱۶) حافظ سیوطی (۹۱۱ھ)
(۱۷) علامہ سمہودی (۹۱۱ھ)
(۱۸) علامہ شعرانی (۹۷۳ھ)
(۱۹) حافظ منذری (۱۰۰۳ھ)
(۲۰) ملا علی قاری (۱۰۱۴ھ)
(۲۱) امام ربانی مجدد الف ثانی (۱۰۳۴ھ)
(۲۲) علامہ علی بن شیخ احمد عزیزی (۱۰۵۰ھ)
(۲۳) شیخ عبد الحق محدث دہلوی (۱۰۵۲ھ)
(۲۴) علامہ احمد بن محمد الخفاجی المصری (۱۰۶۹ھ)
(۲۵) علامہ زرقانی (۱۱۲۲ھ)
(۲۶) امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (۱۱۷۶ھ)
(۲۷) قاضی ثناء اللہ پانی پتی (۱۲۲۵ھ)
(۲۸) شاہ عبد العزیز محدث دہلوی (۱۲۳۹ھ)
(۲۹) علامہ شامی (۱۲۵۲ھ)
(۳۰) قاضی شوکانی (۱۲۵۵ھ)
(۳۱) علامہ محمود آلوسی صاحب روح المعانی (۱۲۷۰ھ)
(۳۲) نواب قطب الدین شارح مشکوٰۃ (۱۲۷۹ھ)
(۳۳) نواب صدیق حسن خاں (۱۳۰۷ھ)
(۳۴) مولانا نذیر حسین دہلوی (۱۳۲۰ھ)

(۴۵) مولانا شمس الحق عظیم آبادی (ھ) (۴۶) مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری (۱۳۴۶ھ)
(۴۷) حضرت انور شاہ کشمیری (۱۳۵۲ھ) (۴۸) حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی (۱۳۶۲ھ)
(۴۹) شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی (۱۳۶۹ھ) (۵۰) محدث العصر مولانا ظفر احمد عثمانی (ھ)

حدیث پر تواتر کا دعویٰ

حیاۃ النبیؐ فی قبرہ وسائر الانبیاء معلومۃ عندنا علماً قطعیاً لما قام عندنا من الادلۃ فی ذٰلک وتواترت بہ الاخبار[1]

ان من جملۃ ما تواتر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم حیاۃ الانبیاء فی قبورھم[3]

حوالجات از بعض عبارات

(۱) حافظ بیہقی (۴۵۸ھ)

حافظ ابن بزار اور حافظ ابو یعلی الموصلی ابن عدی اسے اپنی اپنی سند ملا سے لائے ہیں ان میں حافظ ابو یعلی کی سند نہایت پختہ اور ثقہ راویوں پر مشتمل ہے۔ چوتھی صدی میں یہ روایت اسی طرح چلی، پانچویں صدی میں امام بیہقی (۴۵۸ھ) نے اسے خود بھی امام ابو یعلی کی سند سے بھی روایت کیا ہے اور اس کی تصحیح بھی کی ہے :۔

اخبرنا الثقۃ من اہل العلم قال انبأنا ابو عمرو بن حمدان قال انبأنا ابو یعلی الموصلی حدثنا ابو الجہم الازرق ..... الحدیث

امام بیہقی کا محض روایت کر دینا اور درجہ رکھتا ہے اور آپ کا اسے صحیح قرار دینا اور عقائد کی بحث میں اسے استدلالاً لانا اور مخالفین کے سامنے اسے بطور حجت کے پیش کرنا یہ اور درجہ رکھتا ہے۔ یہ دوسری بات نہایت اعلیٰ درجہ کی تصحیح ہے اور نہایت پختہ روایات کو میسر

---

[1] فتاویٰ حافظ جلال الدین السیوطی جلد ۲ صفحہ ۱۴۷ طبع مصر ونحوہ فی مرقاۃ الصعود [3] نظم المتناثر من الحدیث المتواتر ص ۳

آسکتی ہے. حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے اسے اسی وضاحت سے نقل کیا ہے:۔

واخرجه البزار ولكن وقع عنده الحجاج الصواف وهو وهم والصواب الحجاج الاسود كما وقع التصريح فى رواية البيهقى وصححه البيهقى [1]

ترجمہ. اسے محدث بزار نے بھی روایت کیا ہے. لیکن اس کے ہاں یہ حجاج صواف کے نام سے مذکور ہے اور یہ وہم ہے صحیح راوی حجاج اسود ہے جیسا کہ بیہقی کی روایت میں اس پورے نام کی تصریح موجود ہے اور امام بیہقی نے تو اسے صحیح بھی کہا ہے۔

② حافظ شہاب الدین فضل اللہ تورپشتی (۶۶۲ھ)

حدیثے درست است کہ ان اللہ حرم على الارض اجساد الانبياء الى ان قال هم احياء فى قبورهم يصلون واوّل ہمہ پیغمبر ما برخیزد۔ [2]

ترجمہ. یہ حدیث بھی صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کے اجساد زمین پر حرام کر دیئے ہیں (وہ انہیں ریزہ ریزہ نہیں کر سکتی) اور یہ بھی آپ نے فرمایا ہے کہ انبیاء اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور وہ وہاں نمازیں بھی پڑھتے ہیں، اور سب سے پہلے قبر سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی اُٹھیں گے۔

③ شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ (۷۲۸ھ)

علامہ بدرالدین بعلی الحنبلی نے فتاوی ابن تیمیہ کا نہایت نفیس اختصار کیا ہے. اس میں ہے:۔

والانبياء احياء فى قبورهم وقد يصلون. [3]

---

[1] فتح الباری جلد ۱۳ صفحہ ۲۴۶ [2] کتاب الانبیاء [3] کتاب المعتمد فی المعتقد باب ۲ فصل ۴ [3] مختصر الفتاوی المصریہ صفحہ ۱۸

وقد کے الفاظ کمپوزر کا سہو ہیں یا بطور سہو کہے گئے ہیں۔ یہ حدیث کے الفاظ نہیں ہیں مراد یہ ہے انبیاء کرام اپنی قبور میں ہمیشہ نماز میں ہی نہیں رہتے۔ کئی دوسری طاعات میں بھی کبھی اشتغال رکھتے ہیں۔ اس کی تشریح کچھ بھی ہو حدیث اپنی اصل میں ان کے ہاں مسلم ہے اور صحیح ہے۔

(۴) علامہ تاج الدین السبکیؒ (۷۷۴ھ)

عن انسؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الانبیاء احیاء فی قبورھم یصلّون فاذا ثبت ان نبینا صلی اللہ علیہ وسلم حیّ فالحیّ لابد من ان یکون اما عالمًا او جاھلًا ویجوز ان یکون النبیؐ جاھلًا۔[۱]

ترجمہ: حضرت انسؓ کہتے ہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ انبیاء اپنی قبروں میں زندہ ہوتے ہیں اور وہ نمازیں بھی پڑھتے ہیں۔ پس جب یہ ثابت ہو گیا کہ ہمارے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں تو جو بھی زندہ ہو وہ یا باشعور ہو گا یا بے شعور اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ نبی (اپنی قبر میں) بے شعور ہو یہ نہیں ہو سکتا۔

اور آگے جا کر لکھتے ہیں:۔

لان عندنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حیّ یحس ویعلم وتعرض علیہ اعمال الامۃ ویبلغ الصلوٰۃ والسلام علی ما بیّنا۔[۲]

ترجمہ: یہ اس لیے کہ ہم (اہل سنت) کے عقیدہ میں نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں بدن مبارک میں حس موجود ہے۔ علم کی شان آپ میں باقی ہے اور آپ پر امت کے اعمال بھی پیش کئے جاتے ہیں اور آپ کو (امت کا) صلوٰۃ وسلام بھی جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں پہنچایا جاتا ہے۔

---

[۱] طبقات شافعیہ جلد ۲ صفحہ ۲۸۱ مصر [۲] ایضاً صفحہ ۲۸۲

اور اس سے پہلے آپ یہ لکھ آئے ہیں:۔

ومن عقائدنا ان الانبیاء علیهم السلام احیاء فی قبورهم فاین الموت.[1]

ترجمہ. اور ہم (اہلسنت) کے عقائد میں سے ہے کہ انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں (اس وقت اُن پر) موت کہاں؟

⑤ علامہ نورالدین ہیثمیؒ (۸۰۷ھ)

رجال ابی یعلی ثقات.[2]

ترجمہ. ابو یعلی کی اس روایت کے تمام راوی ثقہ (لائق اعتماد اور پختہ) ہیں۔

⑥ خاتمۃ الحفاظ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ (۸۵۲ھ)

اخرجه من طریق یحیی بن ابی بکیر وهو من رجال الصحیح عن المستلم بن سعید وقد وثقه احمد وابن حبان عن الحجاج الاسود وهو ابن ابی زیاد البصری وقد وثقه احمدؒ وابن معینؒ عن ثابتؓ عن انسؓ واخرجه واخرجه ایضا ابو یعلیؒ فی مسنده من هذا الوجه واخرجه البزار لکن وقع عنده عن الحجاج الصواف وهو وهم والصواب الحجاج الاسود کما وقع التصریح فی روایة البیهقی وصححه البیهقی.[3]

ترجمہ. یہ حدیث یحییٰ بن ابی بکیر کے طریق سے مروی ہے اور وہ صحیحین کے راویوں میں سے ہے. اس نے مستلم بن سعید سے روایت کی ہے جسے کہ امام احمدؒ اور ابن حبانؒ نے ثقہ قرار دیا ہے اس نے یہ روایت حضرت ثابتؓ سے لی ہے اور انہوں نے اسے حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے۔ ابو یعلی نے بھی اپنی مسند میں

---

[1] طبقات شافعیہ جلد ۲ صہ ۲۲۶ [2] مجمع الزوائد جلد ۸ صہ ۲۱۱ [3] فتح الباری جلد ۱۳ صہ ۲۴۶ کتاب الانبیاء

اسے اسی طریق سے روایت کیا ہے۔ بزار کی تخریج میں وہم سے حجاج صواف آگیا ہے۔ صحیح حجاج اسودؒ ہی ہے۔ جیسا کہ امام بیہقیؒ نے تصریح کی ہے اور امام بیہقیؒ نے اسے صحیح بھی کہا ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ امام بیہقیؒ کے اس فیصلے سے کہ یہ حدیث صحیح ہے پوری طرح متفق ہیں۔ مولانا انور شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں۔

وفی البیہقی عن انسؓ وصححہ ووافقہ الحافظ فی المجلد السادس ان الانبیاء احیاء فی قبورھم یصلون۔[1]

الانبیاء احیاء فی قبورھم۔[2]

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے امام بیہقی کی تصحیح کو جو اہمیت دی ہے حضرت شاہ صاحبؒ بھی امام بیہقی کی اس تصحیح کو خاصا وزن دے رہے ہیں۔ فتفکر

⑦ حافظ بدر الدین العینیؒ (۸۵۵ھ)

الانبیاء — فانھم لا یموتون فی قبورھم بل ھم احیاء واما سائر الخلق فانھم یموتون فی القبور ثم یحیون یوم القیٰمۃ۔[3]

⑧ حافظ شمس الدین السخاویؒ (۹۰۲ھ)

نحن نؤمن ونصدق بانہ صلی اللہ علیہ وسلم حیّ یرزق فی قبرہ وان جسدہ الشریف لا تاکلہ الارض۔[4]

---

[1] فیض الباری جلد ۲ صفحہ ۶۴ مصر [2] فتح الباری جلد صفحہ ۲۲ [3] عینی جلد ۷ صفحہ ۲۰۰
[4] القول البدیع صفحہ ۱۲۵ طبع ہند

ترجمہ۔ ہم ایمان لاتے ہیں اور تصدیق کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قبر میں زندہ ہیں آپ کو (وہاں کے مناسب) رزق بھی دیا جاتا ہے اور آپ کے جسدِ اطہر پر زمین کا کوئی اثر وارد نہیں ہوتا۔

⑨ حافظ جلال الدین السیوطیؒ (۹۱۱ھ)

حیاۃ النبی فی قبرہ و سائر الانبیاء معلومۃ عندنا علماً قطعیاً لما قام عندنا من الادلۃ فی ذٰلک وتواترت بہ الاخبار۔[1]

ترجمہ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی قبر میں حیات اور (اسی طرح) تمام انبیاء کرام کی (اپنی قبروں میں) زندگی ہمارے نزدیک علماً قطعی درجے میں ہے ہمارے ہاں اس پر دلائل قائم ہو چکے ہیں اور احادیث اس باب میں تواتر (قدرِ مشترک) تک پہنچ چکی ہیں۔

ان من جملۃ ما تواتر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم حیاۃ الانبیاء فی قبورھم۔[2]

ترجمہ۔ جو روایات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تواتر کے ساتھ منقول ہیں۔ ان میں یہ حدیث بھی ہے کہ انبیاء اپنی قبروں میں زندہ ہوتے ہیں۔

⑩ علامہ سمہودیؒ (۹۱۱ھ)

لا شک فی حیاتہ صلی اللہ علیہ وسلم بعد وفاتہ وکذا سائر الانبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام احیاء فی قبورھم حیاۃ اکمل من حیاۃ الشھداء التی اخبر اللہ بھا فی کتابہ العزیز۔[3]

ترجمہ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات بعد الوفات میں کسی شک کو راہ نہیں

---

[1] فتاویٰ حافظ سیوطی جلد ۲ ص ۱۴۷ [2] النظم المتناثر من الحدیث المتواتر [3] وفاء الوفا جلد ۲ ص ۴۰۵

دی جا سکتی۔ اسی طرح تمام انبیاء کرام اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور اُن کی یہ حیات شہداء کرام کی حیات جس کی اللہ تعالیٰ نے قرآن میں خبر دی ہے سے بھی زیادہ کامل ہے۔

(۱۱) علامہ عبدالوہاب الشعرانیؒ (۹۷۳ھ)

قد صحت الاحادیث انہ صلی اللہ علیہ وسلم حی فی قبرہ یصلی باذان و اقامۃ[۱]

ترجمہ۔ یہ حدیثیں پوری صحت کو پہنچ چکی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قبر مبارک میں زندہ ہیں اور آپ وہاں اذان و اقامت کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں۔

(۱۲) علامہ عبدالرؤف المناویؒ (۱۰۰۳ھ)

الانبیاء احیاء فی قبورھم۔ ھذا حدیث صحیح[۲]

ترجمہ۔ یہ حدیث کہ انبیاء اپنی قبروں میں زندہ ہیں صحیح درجے کی حدیث ہے۔

(۱۳) مجدد مائۃ دہم مُلا علی قاری علیہ رحمۃ ربہ الباریؒ (۱۰۱۴ھ)

صح خبر الانبیاء احیاء فی قبورھم یصلون[۳]

ترجمہ۔ یہ حدیث کہ انبیاء اپنی قبروں میں زندہ ہیں صحیح سند سے ثابت ہو چکی ہے۔

ان الانبیاء احیاء فی قبورھم فیمکن لھم سماع صلوٰۃ من صلی علیھم[۴]

ترجمہ۔ انبیاء اپنی قبروں میں زندہ ہیں۔ سو یہ بات عالم امکان میں ہے کہ آپ اس

---

[۱] منح المنۃ صہ ۹۲ مصر [۲] فیض القدیر جلد ۳ صہ ۱۸۴ [۳] مرقات جلد ۱ صہ ۲۱۲ قدیم جلد ۳ صہ ۲۴۱ طبع جدید
[۴] مرقات جلد ۲ صہ ۲۳۵ طبع جدید

شخص کا صلوۃ وسلام سنیں جو آپ پر درود وسلام پڑھے

ای یوصلون من امتی السلام اذا سلوا علی قلیلا او کثیرا و ھذا مخصوص بمن بعد عن حضرۃ مرقدہ المنور و مضجعہ المطھر وفیہ اشارۃ الی حیاتہ الدائمۃ و فرحہ ببلوغ سلام امتہ الکاملۃ وایماء الی قبول السلام حیث قبلتہ الملئکۃ[1]

ترجمہ۔ فرشتے میری امت کا سلام قلیل ہو یا کثیر مجھے پہنچاتے ہیں اور یہ اس کے لیے ہے جو دور ہو آپ کی قبر منور سے اور آپ کی آرامگاہ پاک ہے اس میں آپ کی حیات دائمی اور خوشی کی طرف اشارہ ہے جو آپ کو آپ کی امت کے سلام ملنے سے حاصل ہوتی ہے اور اس میں اس سلام کے قبول ہونے کا بھی اشارہ ہے کہ فرشتوں نے اس سلام کو آگے پہنچانے کے لیے قبول کر لیا ہوا ہے۔

وہ سلام کسی وجہ سے لائق رد ہوتا تو فرشتے اسے کبھی اٹھا کر نہ لے جاتے۔ فرشتوں کا اسے لے لینا ہی اس بات کا نشان ہے کہ اب سلام قبول ہو چکا۔

وما افادہ من ثبوت حیاۃ الانبیاء حیاۃ بھا یتعبدون و یصلون فی قبورھم مع استغنائھم عن الطعام والشراب کالملئکۃ امر لا مریۃ فیہ[2]

ترجمہ۔ یہ بات کہ انبیاء کرام کے لیے وہاں ایسی حیات ثابت ہے کہ اس سے وہ اپنی قبروں میں مشغول عبادت اور معروف نماز ہیں اور فرشتوں کی طرح یہاں کے عادی کھانے پینے سے مستغنی ہیں یہ ایسی پختہ بات ہے کہ اس میں شک نہیں۔

وقد ورد بہ الاحادیث والانباء وانھم احیاء فی قبورھم فانھم افضل من الشھداء واحیاء عند ربھم[3]

ترجمہ۔ اور اس موضوع پر بہت سی احادیث واخبار وارد ہیں اور بے شک

---

[1] مرقات جلد ۲ ص ۲۴ [2] ایضاً جلد ۳ ص ۲۲۹ [3] ایضاً جلد ۱ ص ۱۴۳

وہ اپنی قبروں میں زندہ ہیں۔ کیونکہ وہ (بالیقین) شہداء سے جو اپنے رب کے ہاں زندہ ہیں ہر حال میں افضل ہیں۔

انہ علیہ السلام فی قبرہ حی وقال تعالیٰ لا ترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی۔[1]

ترجمہ۔ بے شک حضور علیہ السلام اپنی قبر میں زندہ ہیں اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ تم اپنی آوازیں حضورؐ کی آواز سے اونچی نہ کرو۔

وفیہ دلیل علی ان الانبیاء احیاء حقیقۃ۔[2]

ترجمہ۔ اور اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ انبیاء کرام حقیقی طور پہ زندہ ہیں۔

المعتقد المعتمد انہ صلی اللہ علیہ وسلم حیّ فی قبرہ کسائر الانبیاء فی قبورھم وھم احیاء عند ربھم وان لارواحھم تعلقاً بالعالم العلوی والسفلی۔[3]

ترجمہ۔ وہ عقیدہ جس پر اعتماد کیا جاسکتا ہے یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح دوسرے انبیاء اپنی قبروں میں زندہ ہیں آپ بھی زندہ ہیں اور وہ (انبیاء کرام) اپنے رب کے ہاں زندہ ہیں۔ اور بایں طور کہ ان کی ارواح کا تعلق عالم علوی اور اس جہانِ ارضی دونوں سے ہے۔

(۱۴) مجدد مائۃ یازدہم حضرت امام ربانی سیدنا الشیخ سرہندیؒ (۱۰۳۴ھ)

برزخِ صغرےٰ چوں از یک وجہ از مواطنِ دنیوی است گنجائش ترقی دارد و احوال ایں وطن نظر باشخاصِ متفاوتہ تفاوت فاحش دارد۔ "الانبیاء یصلون فی القبور" شنیدہ باشند۔[4]

---

[1] مرقات جلد ۲ صفحہ ۲۲۳ [2] ایضاً جلد ۱۱ صفحہ ۱۴۲ [3] شرح الشفاء جلد ۲ صفحہ ۱۴۲ [4] مکتوبات دفتر ۲ نمبر ۱ صفحہ ۲۹

ترجمہ۔ یہ پہلا برزخ چونکہ ایک پہلو سے موطن دنیوی بھی ہے اس میں ترقی اعمال کی گنجائش ہے اور برزخ کے اس موطن دنیوی کے حالات مختلف درجوں کے افراد کے لحاظ سے مختلف ہیں۔ آپ نے یہ حدیث تو سنی ہوگی کہ انبیائے کرام اپنی قبروں میں نمازیں پڑھتے ہیں۔

(۱۵) علامہ علی بن شیخ احمد عزیزیؒ (۱۰۵۰ھ) شارح جامع صغیر

لانه حیّ دائماً وروحه لا تفارقه لان الانبیاء احیاء فی قبورهم۔[۱]

ترجمہ۔ یہ اس لیے کہ (آپ) دائمی حیات سے زندہ ہیں اور آپ کی روح مقدسہ کبھی آپ سے جدا نہیں ہوتی۔ کیونکہ سب انبیاء اپنی قبروں میں زندہ ہیں۔

(۱۶) حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ (۱۰۵۲ھ)

ابو یعلیٰؒ بنقل ثقات از روایت انس بن مالکؓ آوردہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الانبیاء احیاء فی قبورهم یصلون۔[۲]

ترجمہ۔ ابو یعلیٰ نے ثقہ راویوں کی روایت سے حضرت انس بن مالکؓ سے نقل کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ انبیائے کرام اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور وہ وہاں نمازیں بھی پڑھتے ہیں۔

(۱۷) علامہ احمد بن محمد الخفاجیؒ (۱۰۶۹ھ) شارح شفاء

وقد ثبت بالاحادیث الصحیحة ان النبی صلی اللہ علیه وسلم وسائر الانبیاء احیاء حیاة حقیقیة کالشهداء۔[۳]

---

[۱] السراج المنیر جلد ۳ ص ۲۷۸ [۲] مدارج النبوۃ جلد ۲ ص ۴۱۰ طبع مطبع ۱۲۷۱ھ جذب القلوب ص ۱۸۰ [۳] نسیم الریاض ص ۴۹۹ ج ۳

ترجمہ. اور یہ بات احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہو چکی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام انبیائے کرام حیاتِ حقیقی سے جیسا کہ وہ شہداء کے لیے حاصل ہے، زندہ ہیں۔

(۱۸) علامہ محمد بن عبدالوہاب الزرقانیؒ (۱۱۲۲ھ) شارح مواہب اللدنیہ

وحیاة النبیؐ فی قبرہ ھو وسائر الانبیاء معلومة عندنا علماً قطعیاً لما قام عندنا من الادلة فی ذالک وتواتر الاخبار به۔[1]

ترجمہ. حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قبر مبارک میں اور تمام انبیاء کرام کی حیات (ان کی قبروں میں) ہمارے ہاں علم قطعی سے ثابت ہو چکی ہے. کیونکہ ہمارے ہاں اس پہ دلائل قائم ہو چکے اور یہ احادیث تواتر کے درجے کو پہنچی ہیں۔

(۱۹) علامہ یوسف الشافعی الاردبیلیؒ (ھ)

ویخاطب بعد الموت بقول السلام علیک ایھا النبی ورحمة اللہ وبرکاته لان الانبیاء احیاء فی قبورھم یصلون ویحجون کما ورد۔[2]

ترجمہ. اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات میں سے ہے کہ آپ کو موت کے بعد بھی السلام علیک ایھا النبی سے خطاب کیا جا سکے. کیونکہ انبیاء کرام اپنی قبروں میں زندہ ہیں وہ وہاں نمازیں بھی پڑھتے ہیں اور حج بھی کرتے ہیں جیسا کہ روایات میں وارد ہو چکا۔

(۲۰) مجدد ملت دوازدہم حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (۱۱۷۶ھ)

---

[1] شرح المواہب جلد ۵ صفحہ ۳۳۲ [2] کتاب الانوار فی فقہ الامام الشافعی جلد ۲ صفحہ ۱ طبع ۱۳۶۲ھ مصر

آپ کی کتاب فیوض الحرمین میں ان مقامات کا مطالعہ فرمائیں۔ جب آپ مدینہ منورہ میں روضۂ انور پر حاضری دیتے تھے۔

لما دخلت المدینة المنورة وزرت الروضة المقدسة ..... رأیت روحه صلی الله علیه وسلم ظاهرة بارزة لا فی عالم الارواح فقط ..... ثم توجهت الی القبر الشامخ المقدسة مرة بعد اخری ..... وانه الذی اشار الیه بقوله ان الانبیاء لا یموتون وانهم یصلون ویحجون فی قبورهم وانهم احیاء الی غیر ذلك ولما سلمت علیه قط الا وقد انبسط الحی وانشرح۔[1]

اس کی تائید میں ایک دوسری حدیث بھی لیجیے:

وهی المکنی عنه بقوله صلی الله علیه وسلم ما من احد یسلم علی الا رد الله علی روحی حتی ارد علیه السلام وقد شاهدت ذلك مالا احصی فی مجاورتی المدینة سنة الف ومائة واربع واربعون۔[2]

ترجمہ۔ اور یہ اشارہ ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کی طرف کہ جب کوئی شخص مجھ پر سلام بھیجتا ہے تو اللہ تعالیٰ مجھ پر میری روح لوٹا دیتا ہے (اسے مجھ پر متوجہ کر دیتا ہے) یہاں تک کہ میں اس پر سلام لوٹاؤں اور میں نے ۱۱۴۴ھ میں جب میں مدینہ منورہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ٹھہرا ہوا تھا تو میں نے اس حقیقت کو وہاں (روضۂ انور پر) اتنی بار مشاہدہ کیا کہ میں شمار نہیں کر سکتا۔

(۲۱) محدثِ کبیر قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ (۱۲۲۵ھ) صاحب التفسیر المظہری

انه صلی الله علیه وسلم قال من صلی علیّ عند قبری سمعته ومن صلی علیّ غائبا بلغته۔[3]

---

[1] فیوض الحرمین ص۲۸ مطبوعہ دیوبند [2] حجۃ اللہ البالغہ جلد ۲ ص مترجم ص ۲۴۹ [3] تفسیر مظہری جلد ۱ ص ۲۲۴

(۲۲) حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ (۱۲۳۹ھ) صاحب تفسیر فتح العزیز

ارواح کے لیے موت کے بعد فنا نہیں بلکہ صرف بدن سے اس کا تعلق منقطع ہو جاتا ہے لیکن علماء کے حق میں روح کی حیات سے مراد صرف یہ ہے کہ روح باقی رہتی ہے اور شہداء کو اس بقا کے علاوہ دو امر زائد دیئے جاتے ہیں۔ دنیا میں روح کا بدن کے ساتھ جو تعلق ہے اس کا حاصل بھی یہی دو امر ہیں۔ اوّل یہ کہ شہداء کے اجر میں ترقی ہوتی ہے اور دوسرا امر یہ ہے کہ بتوسط بدن شہداء کو روزی دی جاتی ہے..... انبیاء علیہم السلام کو اس سے بھی زیادہ درجہ حاصل ہے کہ امت کے احوال ان کے حضور میں پیش کیے جاتے ہیں..... چنانچہ عوام کی دنیوی حیات کے اثر سے کہیں زیادہ ہے۔[1]

(۲۳) علامہ ابن عابدین الشامیؒ (۱۲۵۲ھ) شارح الدر المختار

ان الانبیاء احیاء فی قبورھم کما ورد فی الحدیث۔[2]

ان الانبیاء علیھم الصلوٰۃ والسلام احیاء فی قبورھم۔[3]

ترجمہ۔ حدیث میں وارد ہے کہ انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں۔

(۲۴) قاضی شوکانیؒ (۱۲۵۵ھ) صاحب تفسیر فتح القدیر و شارح منتقی الاخبار

انہ صلی اللہ علیہ وسلم حیّ فی قبرہ و روحہ لا تفارقہ لما صح ان الانبیاء احیاء فی قبورھم۔[4]

ترجمہ۔ بیشک حضورؐ اپنی قبر میں زندہ ہیں اور آپکی روح اقدس آپ سے جدا نہیں ہوتی کیونکہ یہ بات صحیح طریق سے ثابت ہو چکی ہے کہ انبیاء کرام اپنی قبور میں زندہ ہیں۔

---

[1] فتاویٰ عزیزی جلد ۱ ص۱۲۰ [2] رسائل ابن عابدین جلد ۲ ص۲۰۳ مصر

[3] رد المحتار الشامی جلد ۳ ص۳۴۴ باب المغنم [4] تحفۃ الذاکرین شرح الحصن الحصین ص۲۸

ورد النص فی کتاب اللہ فی حق الشہداء انہم احیاء یرزقون و ان الحیوٰۃ فیہم متعلقۃ بالجسد فکیف بالانبیاء والمرسلین و قد ثبت فی الحدیث ان الانبیاء احیاء فی قبورہم[1]

رواہ المنذری وصححہ البیہقی۔

ترجمہ: قرآن کریم میں شہداء کے حق میں نص وارد ہے کہ وہ زندہ ہیں اور اپنے رب کے ہاں رزق بھی دیئے جاتے ہیں اور یہ کہ حیات ان کی ان کے جسد سے تعلق رکھتی ہے یہ شہداء کی حیات ہے تو انبیاء و مرسلین کی حیات کس درجہ قوی ہو گی اور یہ بات تو حدیث میں ثابت ہو چکی ہے کہ انبیائے کرام اپنی اپنی قبروں میں زندہ ہوتے ہیں۔

انہ صلی اللہ علیہ وسلم حیّ فی قبرہ بعد موتہ کما فی حدیث الانبیاء احیاء فی قبورہم وقد صححہ البیہقی والف فی ذٰلک جزءًا۔[2]

ترجمہ: بے شک حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قبر میں بعد الوفات زندہ ہیں جیسا کہ حدیث میں وارد ہوا اور بیہقی نے اس کی تصحیح کی ہے۔

انہ صلی اللہ علیہ وسلم حیّ فی قبرہ بعد موتہ کما فی حدیث الانبیاء احیاء فی قبورہم.... ویؤیدہ ذٰلک ماثبت ان الشہداء احیاء یرزقون فی قبورہم والنبی صلی اللہ علیہ وسلم وآلہ وسلم منہم واذا ثبت انہ حیّ فی قبرہ کان المجیٔ الیہ بعد الموت کالمجیٔ الیہ قبلہ۔[3]

ترجمہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قبر میں اپنی وفات کے بعد بھی زندہ ہیں جیسا کہ حدیث الانبیاء احیاء فی قبورہم سے ثابت ہے اور اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ شہداء زندہ ہیں اور انہیں ان کی قبروں میں رزق بھی دیا جاتا ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی تو شہید ہیں

---

[1] نیل الاوطار شرح منتقی الاخبار جلد ۳ صفحہ ۳۰۵ [2] ایضاً جلد ۵ صفحہ ۱۸۰ [3] ایضاً جلد ۵ صفحہ ۱۸۰

میں سے ہیں۔

اور جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے قبر میں حیات ثابت ہو چکی تو آپ کی قبر مبارک پر آنا اسی طرح ہے جس طرح وفات سے پہلے آپ کے پاس حاضری دینا تھا۔[۱]

(۲۵) علامہ محمود آلوسیؒ (۱۲۷۰ھ)

والمراد بتلك الحيوة نوع من الحيوة غير معقول لنا هي فوق حياة الشهداء بكثير وحيوة نبينا صلى الله عليه وسلم اكمل واتم من حياة سائرهم عليهم السلام الى ان قال تلك الحيوة في القبر وان كانت يترتب عليها بعض ما يترتب على الحيوة في الدنيا المعروفة لنا من الصلوة والاذان والاقامة ورد السلام المسموع ونحو ذلك الا انها لا يترتب عليها كل ما يمكن ان يترتب على تلك الحيوة المعروفة۔[۲]

والحيوة في القبر[۳] تستلزم الخروج وانا اقول بها في حق الانبياء عليهم السلام۔[۳]

حاصل یہ کہ آنحضرتؐ کی حیات شہداء سے بہت اعلیٰ اور اتم ہے اس حیات فی القبر پر اگرچہ بعض دنیوی امور مرتب ہیں جیسے نماز اذان اقامت اور سلام کرنے والوں کا جواب دینا لیکن اس دنیا کی حیات معروفہ کی ہر ممکن چیز اس حیات پر مرتب نہیں ہے۔

(۲۶) نواب قطب الدین خانؒ (۱۲۷۹ھ) شارح مشکوٰۃ و صاحب مظاہر حق

زندہ ہیں انبیاء علیہم السلام قبروں میں۔ یہ مسئلہ متفق علیہ ہے کسی کو اس میں اختلاف نہیں کہ حیات ان کو وہاں حقیقی جسمانی دنیا کی سی ہے۔[۴]

(نوٹ) دنیا کی سی ہے سے مراد یہ ہے کہ دنیوی نہیں کیونکہ مشبہ اور مشبہ بہ میں تغایر ضروری ہے باعتبار عالم وہ حیاۃ برزخی ہے اور انبیاء اسے اسی طرح جسمانی محسوس کرتے ہیں جیسے وہ اس دنیا میں ایک جسمانی زندگی رکھتے تھے اور وہی جسد فانی حیات ہے جو ریزہ ریزہ ہونے سے محفوظ کیا گیا۔ گو یہاں والوں کو محسوس نہ ہو۔

---

[۱] نیل الاوطار جلد ۵ صفحہ ۱۰۵ [۲] روح المعانی ۲۲/۳۶ [۳] ایضاً [۴] مظاہر حق جلد ۱ صفحہ ۲۴۰

(۲۷) نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ (۱۳۰۷ھ)

نواب صاحب اس حدیث کے بارے میں لکھتے ہیں اس کی سند جید ہے۔

من صلی علی عند قبری سمعته ومن صلی علی نائیا بلغته رواه ابوالشیخ۔[۱]

قریب سے درود وسلام خود سنتے ہیں اور دور سے فرشتے پہنچاتے ہیں جیساکہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا معمول تھا۔[۲]

(۲۸) میاں نذیر حسین صاحب دہلویؒ (۱۳۲۰ھ)

اور حضرت انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اپنی اپنی قبروں میں زندہ ہیں خصوصاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کہ فرماتے ہیں کہ جو کوئی عند القبر درود بھیجتا ہے میں سنتا ہوں اور دور سے پہنچایا جاتا ہوں۔[۳]

(۲۹) مولانا شمس الحق عظیم آبادیؒ (ھ) صاحب عون المعبود شرح سنن ابی داؤد

اجساد الانبیاء ای من ماکلها فی قبورهم احیاء۔[۴]

ترجمہ۔ انبیاء کرام کے اجساد مٹی پر حرام ہے کہ ان کو کھائے وہ اپنی قبروں میں زندہ ہیں۔

(۳۰) مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوریؒ (۱۳۴۷ھ)

المراد بالسلام عند القبر وقت حضوره للزیارة ...... ان روح المقدسة فی شان ما فی الحضرة الالهیة فاذا ابلغه سلام احد من الامة رد اللہ تعالی روحه المطهرة من تلک الحالة الی رد من سلم علیه۔[۵]

آنحضرتؐ حیات ہیں لہذا پست آواز سے سلام عرض کرنا چاہیئے مسجد نبوی کی حد میں کتنی ہی پست آواز سے سلام عرض کیا جائے اس کو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود سنتے ہیں۔[۶]

---

[۱] دلیل الطالب ص۸۴۲ [۲] رحلۃ ص۸ [۳] فتاوی نذیریہ جلد۲ ص۵۳ [۴] عون المعبود جلد۱ ص۴۰۵ [۵] بذل جلد۳ ص۲۰۸ [۶] تذکرۃ الخلیل ص۳۶

(۳۱) امام العصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ (۱۳۵۲ھ)

فی البیھقی عن انسؓ وصححه ووافقه الحافظ فی المجلد السادس ان الانبیاءُ احیاء فی قبورھم یصلون۔[1]

ترجمہ: بیہقی میں حضرت انسؓ سے روایت ہے اور بیہقی نے اس کی تصحیح کی ہے اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری کی چھٹی جلد میں بیہقی سے اس حدیث کی صحت پر موافقت کی ہے حدیث یہ ہے کہ انبیاء کرام اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور وہ وہاں نمازیں بھی پڑھتے ہیں۔

(۳۲) حکیم الامۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ (۱۳۶۲ھ)

حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہوتے ہیں اور نمازیں پڑھتے ہیں۔[2]

(۳۳) شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ (۱۳۶۹ھ)

اما بعد وفاته فروحه المقدسة صلی اللہ علیه وسلم قد استقرت فی الرفیق الاعلیٰ مع ارواح الانبیاء علیھم الصلوٰۃ والسلام ولا یتوھم من ھٰذا انکار حیاته فی قبره الشریف فان لروحه صلی اللہ علیه وسلم اشراقًا علی البدن المبارك المطیب واشراقًا وتعلقًا به وبدنه فی ضریحه غیر مفقود واذا اسلم علیه المسلم رد اللہ علیه روحه حتی یرد علیه السلام کما ورد فی الحدیث ولم یفارق الملاء الاعلیٰ ومن کثف ادراکه وغلظت طباعه عن ھٰذا الادراك فلینظر الی الشمس فی علو محلھا وتعلقھا وتاثیرھا فی الارض وحیاة النبات والحیوان بھا۔[3]

---

[1] فیض الباری جلد ۲ صفحہ ۶۴ [2] نشر الطیب صفحہ ۱۸۳ طبع دیوبند [3] فتح الملہم جلد ۳ صفحہ ۴۳۰

المبحث الخامس — الکلام علیٰ عالم المثال

قبر عالمِ برزخ کی ایک قرارگاہ ہے اگلی قرار گاہ عالمِ آخرت ہے جس کے دو بڑے حصے ہیں
۱۔جنت ۔۲۔جہنم — مقام اعراف بھی عالمِ آخرت کا ہی ایک حصہ ہے ۔

یہ دنیا جس میں اب ہم ہیں ہماری یہ قرار گاہ بھی کچھ وقت کے لیے ہے۔ دائمی قرار گاہ عالمِ آخرت ہے۔

۱۔عالم ارواح ۔۲۔ عالم دنیا ۔۳۔ عالم برزخ اور ۔۴۔ عالم آخرت ۔یہ چاروں عالم بالترتیب چلے ہیں ۔پہلے تینوں اپنے اپنے وقت کے لیے بنی نوعِ انسان کی قرار گاہیں اور چوتھا جہاں مستقل طور پر ہماری قرار گاہ ہے ۔یہ چاروں جہاں حقائق کے جہاں ہیں۔یوں سمجھیے چاروں جہاں عالمِ شہادت کے مختلف پیرائے ہیں علماء نے ان کے متوازی ایک اور جہان کا پتہ دیا ہے۔یہ جہاں عالمِ مثال ہے جو عالمِ شہادت کے ساتھ ساتھ چلتا ہے یہ حقائق کی دنیا نہیں یہاں حقائق کی ان کے اپنے مناسب حال تصویریں اترتی ہیں۔عالمِ مثال گویا ایک آئینہ ہے جس میں حقائق منعکس ہوتے ہیں ۔

خود آنحضرتؐ کے سامنے جنت ایک دفعہ مثالی شکل میں لائی گئی رأیت الجنۃ والنار ممثلتین[۱]

حضرت شیخ محی الدین ابن العربیؒ فتوحاتِ مکیہ میں لکھتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام سے پہلے کئی اور آدم گذرے ہیں اور اس پر انہوں نے عالمِ مثال کے کچھ مشاہدات ذکر کئے ہیں ۔

حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں کہ یہ سب آدم عالمِ مثال کے ہیں ۔عالمِ شہادت میں صرف وہی ایک آدم گذرے ہیں جنہوں نے صفتِ جامعیت پر خلقت پائی ۔ان کے آنے سے پہلے ان کے لطائف یا صفات میں سے کوئی صفت یا لطیفہ اللہ رب العزت کی ایجاد سے عالم مثال میں وجود پاتا رہا اور صورت آدم میں اس کا ظہور ہوتا رہا[۲]

حضرت امام ربانی شیخ سرہندی کے اس ارشاد سے بعض حضرات یہ مطلب نکال رہے

---

[۱] صحیح البخاری جلد ۱ ص۱۰۳ جلد ۲ ص۱۰۵۱ [۲] مکتوبات دفتر دوم ص۵۸ ص۱۱۳

ہیں کہ جس طرح اوادم مختلفہ عالم مثال میں موجود رہے۔ اسی طرح انبیائے کرام وفات کے بعد عالم مثال میں چلے جاتے ہیں اور ان کی ارواح قدسیہ عالم مثال ہی میں مختلف اطوار میں ظہور فرماتی ہیں۔ یہ انبیاء کرام کا اپنے قبور میں نمازیں پڑھنا سب مثالی وجود ہی سے عمل میں آتا ہے نہ کہ جسد عنصری سے نعیم قبر اور عذاب قبر اسی عالم مثال میں ہوتے ہیں۔

جواباً عرض ہے کہ پہلے حضرت مجدد کے کلام میں عالم مثال کا معنی سمجھ لیجئے۔ آپ کے ہاں عالم مثال ایک آئینہ کے درجہ میں ہے جس میں حقائق اور معانی منعکس ہوتے ہیں۔ اس کی اپنی کوئی صورت و ہیئت نہیں۔ جتنی صورتیں اور شکلیں اس میں نظر آتی ہیں، وہ دوسرے عوامل سے اس آئینہ مثال میں عکس دے رہی ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ پھر یہ عالم مثال کوئی رہنے کا محل نہیں، اسے عالم ارواح اور عالم اجساد کے درمیان فقط ایک برزخ کا درجہ حاصل ہے، جو فی حد ذاتہ کسی صورت و شکل کو متضمن نہیں۔

عالم مثال کی اس تفصیل سے یہ واضح ہو گیا کہ روح آدم خلقت آدم سے پیشتر بھی ہرگز عالم مثال میں اقامت گزیں نہ تھی قرون متطاولہ سابقہ میں فقط اس کے لطائف منعکس ہو کر آدم کا نام پاتے رہے۔ روح بہرحال عالم ارواح میں تھی نہ کہ عالم مثال میں۔ اس لیے کہ عالم مثال رہنے کی جگہ نہیں۔ فقط دیکھا جانے کا ایک آئینہ ہے جس میں حقائق و معانی اُترتے ہیں۔

پس یہ کہنا کہ جس طرح اوادم مختلفہ عالم مثال میں موجود رہے ہیں، اسی طرح انبیائے کرام بعد وفات اس عالم مثال میں چلے جاتے ہیں، کس طرح بنائے فاسد علی الفاسد ہے۔

اعاذنا اللہ منہا۔

ارشاد حضرت مجدد الف ثانی رح

نوشتہ بودند کہ روح پیش از تعلق بہ بدن در عالم مثال بودہ است و بعد از مفارقت از بدن باز بعالم مثال خواہد رفت، پس عذاب قبر در عالم مثال خواہد بود

بدانند کہ ایں قسم خیالات از صدق قلیل النصیب است ...... بعالم مثال کار ندارد نہ پیش از تعلق و نہ بعد از تعلق بیش ازیں نیست کہ در بعضے اوقات بتوفیق اللہ سبحانہٗ بعضے از احوالِ خود را در مرآۃ عالم مطالعہ می نماید ...... عالم مثال از برائے دیدن است نہ برائے بُودن، جائے بودن عالم ارواح است یا عالم اجساد، عالم مثال پیش از مرآۃِ ایں دو عالم نیست .... عذابِ قبر ازیں قبیل نیست کہ حقیقت عقوبت است نہ صُورتِ وشبہ عقوبت۔[1]

ترجمہ: آپ نے لکھا تھا کہ روح بدن کے ساتھ وابستہ ہونے سے پہلے عالم مثال میں رہتی ہے اور بدن سے جُدا ہونے کے بعد پھر عالم مثال میں چلی جاتی ہے۔ پس عذابِ قبر اس عالم مثال میں ہوتا ہے۔ جواباً آپ کو جاننا چاہیئے کہ اس قسم کے خیالات انہی لوگوں کے ہیں، جنہیں صداقت بہت کم نصیب ہوئی ہے اور وہ اس باب میں قلیل النصیب ہیں۔ روح کا عالم مثال سے کوئی سروکار نہیں، نہ بدن کے ساتھ وابستہ ہونے سے پہلے اور نہ اس کے بعد۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا ہے کہ اللہ رب العزت کی قدرت سے روح کے بعض احوال اس عالم کے آئینے میں منعکس ہوتے ہوں۔ لیکن عالم مثال روح کے رہنے کی جگہ نہیں (وہ تو محض دیکھنے کا ایک پردہ ہے، جس پر صُورتیں ظاہر ہوتی ہیں) رہنے کی جگہ یا عالمِ ارواح ہے یا عالمِ اجساد۔ عالمِ مثال ان دونوں جہانوں کے آئینہ ہونے کے سوا اور کچھ نہیں۔ عذابِ قبر اس مثالی صورت پر وارد نہیں ہوتا۔ کیونکہ عذابِ قبر خود ایک حقیقت ہے کسی عذاب اور سزا کی محض کوئی تصویر نہیں۔

اس مکتوب پر حضرت امام ربانیؒ نے جو تصریحات فرمائیں، ان کا خلاصہ حسب ذیل ہے:۔

---

[1] مکتوبات دفتر سوم، م ۳۱ ص ۵۸

① معاملاتِ قبر اپنا حقیقی وجود رکھتے ہیں، فقط صورت وانعکاس نہیں۔

② وجود عالمِ مثال فقط شبہ وصورت ہے، کسی شئے کی حقیقت نہیں۔

③ روح کا تعلق عالمِ مثال میں کبھی رہنے کا نہیں ہوا نہ بدن سے متعلق ہونے سے پہلے نہ بعد ازاں۔

④ مفارقتِ بدن کے بعد روح اور اطوارِ روح کو عالمِ مثال میں ٹھہرانا روح کی نفی کرنے کے مترادف ہے۔

اب غور فرمایئے کہ انبیائے کرام کی ارواحِ قدسیہ ان کے برزخی احوال اور ان کے معاملاتِ قبر کو عالمِ مثال کے امور بتلانا اور پھر اسے فیصلہ کن ٹھہرانا کس قدر شانِ علم و دیانت ہے۔

المبحث السادس —— فی معنی القبر

قبر اپنی وسعت اور کشادگی کے اعتبار سے فقط اس زمینی نشان کا نام نہیں، بلکہ یہ ایک عالمِ برزخ کی منزل ہے جس کا ایک پہلو یہ زمینی نشان ہے اور اس کی دوسری حدود و اطراف کو اللہ رب العزت ہی جانتے ہیں۔

آپ کسی میت کے لیے کوئی گڑھا کتنا ہی فراخ کیوں نہ بنادیں۔ اللہ تعالیٰ اس سے اس کے خلاف معاملہ کرنا چاہیں، تو اُسے تنگی کی آخری انتہا تک پہنچا دیتے ہیں۔ اگرچہ وہ اتنا ہی فراخ دکھائی دے۔ اسی طرح کسی بندۂ خدا کے لیے کوئی قبر کتنی ہی تنگ کیوں نہ بنادی جائے، وہ رحیم مطلق جب چاہے اسے حدِ نظر سے بھی زیادہ فراخ کر دیتا ہے۔ اگرچہ بظاہر اس زمینی نظام میں کوئی خاص تبدیلی ظہور پذیر نہ ہو۔ اس سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ یہ ظاہری قبر عالمِ برزخ کا صرف ایک پہلو ہے، جس کی اگلی وُسعت و فسحت کو اللہ رب العزت ہی جانتے ہیں یا وہ بندگانِ خدا اس پر اطلاع پاتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ اس کا انکشاف کرامت فرما دیتے ہیں۔ اس کی بحث ہم تفصیل سے پیچھے کر آئے ہیں۔

ایک غلطی کا ازالہ

بعض لوگ صوفیائے کرام کے ان ارشادات سے کہ "قبر حقیقت میں اس ظاہری زمین نشان کا نام نہیں، بلکہ وہ ایک عالمِ برزخ کی منزل ہے" —— اس غلط فہمی کا شکار ہوجاتے ہیں کہ عالم برزخ اس ظاہری قبر سے ایک بالکل جدا مکان کا نام ہے، حالانکہ ایسا نہیں۔ امر واقع یہ ہے کہ عالم برزخ کو اس ظاہری قبر سے کچھ نہ کچھ تعلق ضرور ہوتا ہے۔ البتہ قبر اپنی وسعت و فسحت کے اعتبار سے اس زمینی نشان تک محدود نہیں، بلکہ یہ ایک برزخی منزل[1] ہے جس کا ایک پہلو یہ ظاہری قبر اور اس کی باقی حدود اس پردے میں ہیں، جسے کہ برزخ کہا جاتا ہے۔ یعنی یہ ظاہری قبر حقیقت قبر سے کلیۃً جدا نہیں، صرف بعض اعتبارات سے اس سے مختلف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ برزخی مشاہدات میں بھی اس ظاہری نشان پر قبر کا اطلاق بکثرت وارد ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ عالمِ برزخ کا ایک پہلو یقینًا یہ ظاہری قبر ہے۔ اسے حقیقت قبر سے کنایہ قرار دینا، تو خیر سمجھ میں آتا تھا، لیکن مجاز ہی مجاز[2] کہے چلے جانا یہ بالکل خلافِ واقع ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

پیچھے اس پر پوری بحث ہو چکی ہے اور آپ یہ حدیث پڑھ آئے ہیں کہ:۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک قبرستان سے گزرے۔ آپؐ نے دو شخصوں کو عذاب ہوتے دیکھا۔ ایک ان میں سے پیشاب کے چھینٹوں سے نہ بچتا تھا اور دوسرا چغلی کھانے کا عادی تھا۔[3]

یہ تو ظاہر ہے کہ ان دونوں کو عالمِ برزخ میں عذاب ہو رہا تھا۔ اب اس کا ان ظاہری قبروں سے انکشاف اس حقیقت کا پتہ دے رہا ہے کہ حقیقتِ قبر اس ظاہری زمینی نشان سے کلیۃً علیحدہ نہیں

---

[1] ان القبر اول منازل الآخرۃ (مستدرک جلد ۱ ص ۳۷۱) و احوال البرزخ اشبہ باحوال الآخرۃ (فتح الباری ص ۲۷۹ ج ۱۱)

[2] عن ابن فورک انہ صلی اللہ علیہ حی فی قبرہ رسولًا الی الابد حقیقۃً لا مجازًا قال ابن عقیل من الحنابلۃ ھو صلی اللہ علیہ وسلم حی فی قبرہ یصلی (الروضۃ البہیۃ فیما بین الاشاعرۃ والماتریدیۃ ص ۴۲ مطبوعہ حیدرآباد دکن)

[3] راجع لہ البخاری جلد ۱ ص ۱۸۴

بلکہ یہ علیحدگی صرف وسعت وفسحت وغیرہ کے اعتبار سے ہے۔

اسی طرح آنحضرتؐ کا اس عورت کے متعلق جو مسجد میں جھاڑو دیا کرتی تھی، فرمانا کہ مجھے اس کی قبر کا پتہ بتاؤ یقیناً اس ظاہری زمینی نشان سے ہی متعلق تھا۔ آپ نے ارشاد فرمایا:۔

دلونی علی قبرها[1]

ترجمہ۔ مجھے اس کی قبر کا پتہ بتاؤ۔

اور پھر آپ کا یہ اعلان بھی اسی ظاہری زمینی نشان ہی سے متعلق تھا:۔

ان هٰذه القبور مملوۃ ظلمةً علیٰ اهلها وان الله ینوّرها لهم بصلاتی۔[2]

ترجمہ۔ بے شک یہ قبور اپنے مدفونین کے لیے تاریکی سے اٹی پڑی ہیں اور اللہ تعالیٰ میرے جنازہ پڑھنے سے انہیں نورانی بنا دیتے ہیں۔

یہ ارشاد بھی بتا رہا ہے کہ ظلمت و نور کا محل یقیناً وہی ظاہری قبور ہیں جو هٰذه کا مشارالیہ ہیں۔ ہاں اس کے باقی برزخی پہلو اور وسعت وفسحت کو اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں وہ اس ظاہری نشانات کی ظاہری حدود میں منحصر نہیں۔

آنحضرتؐ نے موسیٰ علیہ السلام کو ان کی حس برزخی زندگی میں نماز پڑھتے دیکھا تھا، اس کا انکشاف اس ظاہری قبر سے ہی ہوا تھا، جو سرخ ٹیلے کے پاس آپ نے دیکھی تھی۔

ان حقائق کی روشنی میں یہ کہنا کہ عالم برزخ کو اس ظاہری قبر سے کوئی تعلق نہیں، یقیناً غلط ہے۔ مقام افسوس ہے اور محلِ حیرت در حیرت ہے۔

آنحضرتؐ نے اس حدیث حیاتِ انبیاء میں صرف یہ نہ فرمایا "الانبیاء احیاء" (انبیاء زندہ ہوتے ہیں) بلکہ اس کے ساتھ "فی قبورھم" (اپنی اپنی قبروں میں) کی وضاحت فرما دی، تاکہ کوئی یہ گمان نہ کر سکے کہ انبیائے کرام کی برزخی حیات صرف روحانی ہوتی ہے "فی قبورھم"

---

[1] صحیح بخاری جلد ا صفحہ ۱۵ [2] صحیح مسلم جلد ا صفحہ ۳۱۰

کے الفاظ سے اس پر متنبہ کر دیا کہ یہاں محل حیات وہی ہے، جسے قبروں میں رکھا جاتا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ انبیائے کرام کے اجسامِ عنصریہ ہی بعد الوفات قبور میں اتارے جاتے ہیں۔ پس اُن کی حیات کا بیان ان قبور کے ذکر کے ساتھ اس حقیقت کو بے نقاب کر رہا ہے کہ انبیائے کرام کی برزخی حیات صرف روحانی نہیں، بلکہ عنصری اور جسمانی بھی ہے۔

پھر یہی نہیں کہ آنحضرت نے حیاتِ انبیاء کی وضاحت فی قبورھم کے الفاظ سے کی، بلکہ آپ نے یصلون (کہ وہ نمازیں بھی پڑھ رہے ہیں) کی تصریح فرما کر حیاتِ جسمانی کو اور روشن کر دیا۔ اس لیے نماز کسی وجودِ جسدی کو چاہتی ہے اور ظاہر ہے کہ وہ تو قبر میں ہے:۔

الصلوٰۃ تستدعی جسدًا حیًا۔ (حاشیہ نسائی)

افصح العرب والعجم، صاحبِ جوامع الکلم نے کس جامع اور بلیغ انداز میں ارشاد فرمایا ہے۔

الانبیاء احیاء فی قبورھم یصلون۔

ترجمہ۔ انبیائے کرام اپنی اپنی قبروں میں زندہ ہوتے ہیں اور نمازیں پڑھتے ہیں۔

(۱) احیاء میں حیات کا بیان جملہ اسمیہ سے کر کے استمرار کی وضاحت کی۔

(۲) فی قبورھم میں حیات کے عنصری جسمانی ہونے کی وضاحت ہوئی۔

(۳) یصلون میں حیاتِ حقیقی کا، جس میں اعمالِ طیبہ سے تعطل نہ ہو، بیان ہوا۔

پس بجوائے حدیث شریف آنحضرت اپنے روضہ شریفہ میں (تاثیرِ روح یا دخولِ روح سے) اپنے جسدِ عنصری کے ساتھ فائز الحیات ہیں اور بدستور اشغالِ طیبہ میں استغراق ہے۔ یہ عمل تلذذًا ہے نہ کہ وجوبًا۔ علامہ علی بن شیخ احمد عزیزی لکھتے ہیں:۔

تلذذًا لان التکلیف انقطع بالموت۔[1]

ترجمہ۔ یہ عبادت تلذذًا ہے کیونکہ مکلف ہونا ورودِ موت سے ختم ہو چکا ہے۔

تاہم قبر سے مراد یہی قبر ہے جس کی برزخی وسعت کو اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں۔

---

[1] عزیزی شرح جامع صغیر صـ۱۲۴

مقدمہ میں ہم معنی قبر پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین سے متعدد مثالیں پیش کر چکے ہیں۔ یہاں ایک اور حوالہ نوٹ کر لیجئے۔ اس سے واضح ہوگا کہ اللہ رب العزت کے ہاں بھی یہ دنیا کا گڑھا مفہوم قبر سے بالکل بے تعلق نہیں مومنین پر اللہ رب العزت کی رحمتیں انہی گڑھوں پر اترتی ہیں اور بسا اوقات نور کے شعلے بھی انہی سے اٹھتے ہیں۔

حضرت ابو ایوب انصاریؓ کی قبر سے نور کا مینار اٹھا

حضرت ابو ایوب انصاریؓ (۵۱ھ) اس لشکر میں شامل تھے جو قسطنطنیہ پر حملہ آور ہوا۔ یہ حضرت معاویہؓ کا دورِ خلافت تھا۔ آپ بیمار ہوئے اور وہیں وفات پائی۔ آپ رات کے وقت قلعہ کے دامن میں دفن کئے گئے۔ امام محمد بن احمد السرخسی (۴۸۳ھ) بیان کرتے ہیں۔

فدفنوه ليلاً فصعد نور من قبره الى السماء ورأى ذلك من كان بالقرب من ذلك الموضع من المشركين فجاء رسولهم من الغد فقال من كان هٰذا الميت فيكم فقالوا صاحب لنبينا فاسلموا ابصار اؤا[1]

ترجمہ۔ انہیں ساتھیوں نے رات کے وقت قبر میں اتارا آپ کی قبر سے نور کا ایک شعلہ آسمان کی طرف بلند ہوا اور اس منظر کو دوسری طرف کفار نے بھی جو سرحد کے قریب تھے دیکھ لیا صبح ہوئی تو ان کا ایک قاصد آیا اور اس نے پوچھا کہ یہ مرنیوالا کون تھا (جسے رات تم نے دفن کیا) انہوں نے کہا کہ یہ ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی تھے۔ جنہوں نے اسے دیکھا وہ سب ایمان لے آئے۔

انہوں نے سوچا کہ جب نبی کے صحابی کی یہ شان ہے کہ ان کی قبر سے روشنی اٹھتی ہے اس نبی کی اپنی شان کیا ہوگی کس طرح آپ کے لیے آسمان رحمتیں برساتا ہوگا اور زمین بھی اپنی برکتیں اگلتی ہوگی۔ اور یہ حقیقت ہے کہ آپ کی قبر مبارک حضرت ابو ایوب انصاریؓ کی قبر سے کئی گنا زیادہ منبع نور ہوگی۔

---

[1] شرح سیر کبیر جلد ۱ صفحہ ۱۵۷

الفصل الخامس

وفیہ ستّۃ من المباحث

قال ابوالشیخ فی کتاب الصلوٰۃ حدثنا عبد الرحمٰن بن احمد الاعرج حدثنا الحسین بن الصباح حدثنا ابو معاویہ حدثنا الاعمش عن ابی صالح عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

من صلی علیّ عند قبری سمعتہ و من صلی علیّ من بعید اعلمتہ —— و فی روایۃ من صلی علیّ نائیًا ابلغتہ۔[1]

ترجمہ۔ جو پڑھے درود میری قبر کے پاس اسے میں خود سنوں گا اور جس نے دُور سے پڑھا وہ مجھے پہنچا دیا جائے گا۔

المبحث الاوّل —— فی معنی الحدیث

اس حدیث میں من صلّی عام ہے۔ جس نے بھی حضورؐ پر درود بھیجا، وہ انسان ہو یا فرشتہ یا جن، ہر ایک کا درود آپ کو پہنچتا ہے۔ ہاں جو قبر مبارک کے پاس وُردو پڑھے، اسے حضور اکرمؐ خود سُنیں گے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قوتِ سامعہ کیا اتنی تیز تھی کہ منوں مٹی کا فاصلہ اسے روک نہیں سکتا؟

---

[1] رواہ ابوالشیخ الاصبہانی وابن حبان بسند جید مرقات جلد۱ صڈ۲۴۷ طبع قدیم جلد۲ مڈ۱

جواب — ہاں. جب حضورؐ خود دُنیا میں تشریف فرما تھے تو کیا آپ نے منوں مٹی کے فاصلے سے اُن مردوں کی آوازیں نہ سُنیں جن کو عذاب ہو رہا تھا اور کیا یہ احادیث صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں موجود نہیں ہیں؟

سوال، کیا کسی اور حدیث سے بھی ثابت ہے کہ حضورؐ قریب سے کیے گئے سلام کو سنتے ہیں؟

جواب: ہاں، حضورؐ نے فرمایا، ما من احد یسلم علی الا رد اللہ علی روحی حتی ارد علیہ السلام[1]

جو مجھ پر سلام پڑھے اللہ تعالیٰ میری روح کو میری طرف متوجہ کرتا ہے اور میں اس کا جواب دیتا ہوں رد اللہ علی روحی کی بحث پہلے آچکی ہے. اس حدیث میں حضورؐ کا قریب سے صلوٰۃ و سلام سننا خود ثابت ہے.

ثانیاً، حضورؐ نے حضرت عیسیٰ کے بارے میں بھی فرمایا:-

لئن قام علی قبری فقال یا محمد لاجیبنہ.[2]

ترجمہ اگر وہ میری قبر پر آئیں اور مجھے بلائیں، میں ان کا جواب دوں گا.

اس سے پتہ چلتا ہے کہ قبر مبارک پر آپ خود سنتے ہیں. اور سلام کا جواب بھی دیتے ہیں.

ثالثاً، حضورؐ نے فرمایا:-

لیس من عبد یصلی علی الا بلغنی صلوٰتہ رواہ الطبرانی.[3]

ترجمہ جو بندہ خدا مجھ پر درود پڑھتا ہے وہ مجھے پہنچتا ہے.

یہاں پہنچایا جاتا نہیں کہا، پہنچتا کہا ہے. معلوم ہوتا ہے یہ اس شخص کے متعلق ہے جو قریب سے پڑھے، دور پڑھنے والے کا پہنچایا جاتا ہے نہ یہ کہ خود پہنچتا ہے. بعض حوالوں میں یہ روایت تصحیف کاتب سے

---

[1] سنن ابی داؤد جلد ۱ صفحہ ۲۷۹ مسند امام احمد جلد ۲ صفحہ ۵۲۷ [2] رواہ ابو یعلی ورجالہ رجال الصحیح. مجمع الزوائد جلد ۸ صفحہ ۲۱۱، الجامع الصغیر جلد ۲ صفحہ ۱۴۰ رواہ ابو یعلی کما فی الحاوی للفتاوی جلد ۲ صفحہ ۲۹، روح المعانی پ ۲۲ صفحہ ۳۵ مسند امام احمد جلد ۲ صفحہ ۲۹ مستدرک حاکم جلد ۲ صفحہ ۵۹۵ [3] نیل الاوطار جلد ۳ صفحہ ۲۱ مسند ابی یعلی جلد صفحہ

بلغنی صوتہ کے لفظوں میں منقول ہے. اس سے بھی اس بات کی تائید ملتی ہے کہ یہ قبر مبارک کے قریب درود پڑھنے والے سے متعلق ہے۔

حدیث کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ جو درود دور سے پڑھا جائے وہ مجھے پہنچایا جاتا ہے۔ یہ مضمون ان روایات سے بھی ثابت ہوتا ہے۔

(۱) ان للہ ملٰئکۃ سیاحین فی الارض یبلغونی من امتی السلام۔[۱]

ترجمہ. بیشک اللہ کے فرشتے زمین میں سیاحت کرتے ہیں جہاں کوئی میرا امتی مجھ پر سلام پڑھے وہ مجھے پہنچا دیتے ہیں۔

(۲) یبلغونی صلوٰۃ من صلّی علیّ من امتی۔[۲]

ترجمہ. وہ مجھے پہنچاتے ہیں جو کوئی میرا امتی مجھ پر درود پڑھے۔

(۳) ان صلوٰتکم معروضۃ علی.

ترجمہ. بے شک تمہارا درود مجھ پر پیش ہوتا ہے۔

فرشتوں کے پہنچانے کے ذیل میں درود اور سلام دونوں کا ذکر ملتا ہے. بعض روایات میں صرف صلوٰۃ کا بیان ہے، بعض میں صرف سلام کا ـــــ اور فیصلہ کُن بات یہ ہے کہ فرشتے درود بھی پہنچاتے ہیں اور سلام بھی ـــــ دونوں میں افراد ہو تو بھی احناف کے ہاں جائز ہے اور صلوٰۃ و سلام جمع پڑھے جائیں تو بھی جائز ہے اور دونوں آپ تک پہنچتے ہیں. صلوٰۃ و سلام حضور کو دور سے خطاب کر کے بھی عرض کیا جا سکتا ہے بایں اعتقاد کہ فرشتے اسے اسی طرح روضۂ پاک پر عرض کر دیں گے جیسے کہ میں پیش کر رہا ہوں اور قریب سے بھی عرض کیا جا سکتا ہے. بایں اعتقاد کہ آپ خود سنتے ہیں۔

سماع عند القبر کے موضوع پر عام لوگوں کے بارے میں تو اختلاف ہے کہ سُنتے ہیں یا نہیں.

---

[۱] رواہ النسائی جلد ۱ ص ۱۸۹، مسند امام احمد جلد ۱ ص ۴۴۱، سنن دارمی ص ۳۶۲، المصنف لابن ابی شیبہ جلد ص البدایہ والنہایہ جلد ۱ ص ۱۵۴، الجامع الصغیر جلد ۱ ص ۹۳، مشکوٰۃ ص ۸۶، تحریرات حدیث مولانا حسین علی ص ۴۱۱

[۲] رواہ الدار قطنی والقول البدیع ص ۱۱۱

لیکن حضورؐ کا سماع عند القبر مجمع علیہ ہے۔ اس میں کسی کو اختلاف نہیں۔ قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ (۱۳۲۳ھ) لکھتے ہیں:

انبیاء علیہم السلام کے سماع میں کسی کو اختلاف نہیں[1]

مجدد صدی دہم سیدنا ملا علی قاریؒ فرشتوں کے درود پہنچانے کے بارے میں لکھتے ہیں:

ھذا مخصوص بمن بعد عن حضرۃ مرقدہ المنور ومضجعہ المطہر وفیہ اشارۃ الی حیاتہ الدائمۃ وفرحہ ببلوغ سلام امتہ الکاملۃ وایماء الی قبول السلام حیث قبلتہ الملٰئکۃ وحملتہ الیہ علیہ السلام[2]

ترجمہ: فرشتوں کا یہ درود پہنچانا اس شخص سے مخصوص ہے جو حضورؐ کے مرقد منور اور آپکی استراحت گاہ مطہر سے دور ہو اور اس میں آپکی حیات دائمہ کا اشارہ بھی ہے اور آپکی اس خوشی کا بھی جو آپ کو اپنی امت کاملہ کا سلام پہنچنے سے ہوتی ہے اور اس میں سلام کرنیوالے کے سلام کے قبول ہونے کا اشارہ بھی ہے، بایں طور کہ فرشتوں نے اسے قبول کر لیا ہے اور اسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے آئے ہیں۔

ترجمہ۔ اس سے بھی پتہ چلا کہ روضہ پہ پڑھے گئے درود و سلام کو حضورؐ خود سنتے ہیں۔ حضرت ملا علی قاریؒ ایک دوسرے مقام پہ لکھتے ہیں:

من صلی علی عند قبری سمعتہ ای سمعا حقیقیا بلا واسطۃ۔[3]

ترجمہ۔ حدیث "جو مجھ پر میری قبر پر آکر درود پڑھتا ہے اسے میں سنتا ہوں" کا مطلب سماع حقیقی ہے جو بلا واسطہ ہوتا ہے۔

یہ دونوں مضمون کہ روضہ پہ پڑھے گئے صلوٰۃ وسلام کو حضورؐ خود سنتے ہیں اور دور سے پڑھا گیا آپ کو فرشتوں کے واسطہ سے پہنچایا جاتا ہے۔ ہم متعدد دوسری روایتوں سے جزءاً جزءاً پیش کر آئے ہیں۔ ابوالشیخ کی اس روایت میں صرف یہ خصوصیت ہے کہ اس میں دونوں مضمون یکجا جمع ہیں۔ سو جن حضرات نے اس حدیث کو صرف اس لیے ہدف طعن بنا رکھا ہے کہ اسے ابوعبدالرحمن محمد بن

---

[1] فتاویٰ رشیدیہ جلد ا صفحہ ۱ [2] مرقات جلد ۲ صفحہ ۳۴۲ [3] ایضاً صفحہ ۳۴۲

مروان السدی نے روایت کیا ہے اور وہ ضعیف ہے۔ وہ یہ نہیں سوچتے کہ اس روایت کے دونوں مضامین اپنی اپنی جگہ علیحدہ علیحدہ بھی ثابت ہیں اور ان روایات سے ثابت ہیں جنہیں اکابر محدثین نے تسلیم کیا ہے۔

نوٹ

سماع عند القبر کی یہ حدیث حضرت ابوہریرہؓ کے علاوہ حضرت ابن عمرؓ سے بھی مروی ہے۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں۔

نیز ابن عمرؓ آمدہ من صلی علی عند قبری ردت علیہ ومن صلی علی فی مکان اٰخر بلغونیہ [1]

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے حضورؐ نے فرمایا جو شخص مجھ پر میری قبر پر آکر درود پڑھتا ہے میں اس کا جواب اس پر رد کر دیتا ہوں اور جو کوئی کسی دوسری جگہ پڑھتا ہے وہ فرشتے مجھے پہنچا دیتے ہیں۔

حضرت مولانا تھانویؒ اسے حضرت انسؓ سے مروی بھی بتاتے ہیں۔

جو روایت حضرت انسؓ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو شخص میری قبر کے پاس درود پڑھتا ہے اس کو میں خود سن لیتا ہوں اور جو شخص دور سے درود بھیجتا ہے وہ مجھ کو پہنچا یا جاتا ہے یعنی بذریعہ فرشتوں کے۔[2]

سو یہ روایت حضرت ابوہریرہ، حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت انس رضی اللہ عنہم تین صحابہ سے مروی ہے۔

ہمارے مخالفین اس حدیث کو روایت کرنے کے بعد اسے مطلقہ عامہ ٹھہراتے ہیں۔ یہ بھی نہ ماننے کی ایک ادا ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ درود پڑھنے کے ساتھ آپ کا اسے متصلاً سننا ضروری نہیں۔ یہ تحقق سمع آئندہ کسی وقت ہو جائے تو بھی مطلقہ عامہ کا تقاضا پورا ہو جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے اللہ تعالیٰ آئندہ کسی وقت سنا دے۔ یہ ساتھ ہی سننا کہاں سے لازم آگیا؟

---

[1] جذب القلوب صفحہ ۱۸۲ [2] نشر الطیب صفحہ ۲۱۱

حدیث میں کوئی لفظ ایسا نہیں جو اس تاویل کو راہ دے اور حال یہ ہے کہ دن رات کے اوقات میں کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرتا کہ ہزاروں زائرین روضہ اطہر پر صلوٰۃ وسلام عرض نہ کر رہے ہوں. اگر قبر مبارک کی حاضری اور وہاں درود وسلام دائماً نہ پڑھا جا رہا ہوتا تو بات اور تھی.

سو اس موجودہ صورت میں یہ قضیہ مطلقہ عامہ نہ ہوگا دائمہ مطلقہ ٹھہرے گا. جب درود وسلام ہر وقت پڑھا جا رہا ہے تو آپ کا اسے سُننا بھی دائمی ہے. یہ قضیہ دائمہ مطلقہ ہے مطلقہ عامہ نہیں. دائمہ مطلقہ وہ ہوتا ہے جس میں ثبوت محمول کا جز یہاں سمعتہ ہے. موضوع کے لیے جو من صلی علی عندقبری ہے دائماً ہو.

ہم نے ضروریہ مطلقہ نہیں کہا. جیسے کل انسان حیوان بالضرورۃ دائمہ مطلقہ کہا ہے جیسے کل نبی صادق بالدوام. سو جس طرح صدق نبوت سے شرعاً ممتنع السلب ہے. کوئی مومن روضہ اطہر پر درود پڑھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نہ سُنیں، یہ شرعاً ممتنع ہے.

قاضی صاحب اس حدیث میں کوئی قید لگا کر تو اسے مطلقہ عامہ بنا سکتے ہیں. حدیث کے اپنے الفاظ میں یہ قضیہ مطلقہ عامہ نہیں ہے:

فالقضیة دائمة اذ من المحال العادی ان یخلو الوجود کله عن واحد یسلم علیه فی لیل او نهار فنحن نؤمن ونصدق بانه صلی الله علیه وسلم یسمع مادام المصلون یصلون علیه علی قبره الشریف ولا تذهب ساعة من الساعات ولا وقت من الاوقات الا ویصلی علیه فی مسجده الشریف صلی الله علیه وسلم بالدوام او بالضرورة.

المبحث الثانی — فی بیان الشاہد من الحدیث

حضرت ابو ہریرہؓ کی اس روایت کے ضمن میں ہم حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی یہ روایت پیش کر آئے ہیں۔ امام نسائیؒ اسے دو سندوں سے روایت کرتے ہیں اور وہ دونوں حضرت سفیان الثوریؒ پر مل جاتی ہیں:-

اخبرنا عبد الوہاب بن عبد الحکم الوراق قال اخبرنا معاذ بن معاذ عن سفیان بن سعیدؒ و اخبرنا محمود بن غیلان قال حدثنا وکیع و عبد الرزاق (کلاھما) عن سفیان۔

سند حضرت سفیان بن سعید الثوری :-

عن عبد اللہ بن السائب عن زاذان عن عبد اللہ بن مسعودؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان للہ ملائکۃ سیاحین فی الارض یبلغونی من امتی السلام[1]

ترجمہ بے شک اللہ تعالیٰ کے فرشتے مقرر ہیں جو زمین پر ہر وقت مصروف سیاحت ہیں وہ امت کا سلام مجھے پہنچاتے رہتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ پہنچانا دور والوں سے ہی متعلق ہے قریب والے تو خود سامنے سلام عرض کر دیتے ہیں۔

فرشتے کیسے پہنچاتے ہیں؟ قبر مبارک پر پہنچ کر — قبر کہاں ہے؟ زمین پر — حدیث میں ان فرشتوں کو سیاحین فی الارض کہا ہے۔ سو جس طرح درود و سلام بھیجنے والے زمین پر ہیں، قبر اطہر بھی مدینہ منورہ میں زمین پر ہے۔ فرشتے درود بھیجنے والوں اور روضۂ اطہر کے مابین مصروف سیاحت رہتے ہیں۔ وہ درود بھیجتے ہیں اور یہ پہنچاتے ہیں اور اس لیے پہنچاتے ہیں کہ آپ کی آن

---

[1] سنن نسائی جلد ۱ صفحہ ۱۸۹

میں درود لے کر وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ اس سے یہ بات از خود واضح ہے کہ قریب سے آپ خود سن رہے ہیں، تبھی تو فرشتوں سے آپ خود سنتے ہیں، جو روضہ اطہر پہ حاضر ہو کر دور والوں کا سلام عرض کرتے ہیں اور یہ مضمون اس حدیث میں عبارۃ النص سے مذکور ہے کہ دور والوں کا سلام حضورؐ کو پہنچایا جاتا ہے۔

سو جو بات حدیث ابو ہریرہؓ میں بیان کی گئی ہے وہ بعینہ اس حدیث میں بھی موجود ہے فرق ہے تو صرف یہ کہ حدیث عبد اللہ بن مسعودؓ میں اس حدیث کا پہلا جزء دلالۃ النص اور دوسرا عبارۃ النص سے ثابت ہے اور حدیث ابو ہریرہ میں دونوں باتیں عبارۃ النص میں مذکور ہیں۔ دور سے درود کا اس طرح پہنچا بتلاتا ہے کہ قریب سے آپ خود سنتے ہیں ورنہ تبلیغ صلوٰۃ و سلام کے لیے سیاحین فی الارض کے بیان کی کیا ضرورت تھی؟

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی سند کا حال

عبد الوہاب بن الحکم ثقہ ہیں معاذ بن معاذ ثقہ ہیں، سفیان ثوری ثقہ ہیں، عبد اللہ بن السائب ثقہ ہیں اور ان سب کی توثیق تقریب التہذیب میں صلـ۱۵۱، صـ۲۰۱، صـ۲۴۹، صـ۲۵۰ پر علی الترتیب موجود ہے۔ ابو عبد اللہ زاذان کندی کو ابن حبان نے ثقات میں شمار کیا ہے مگر کثیر الخطاء کہا ہے جمہور علماء نے اُن کی یہ جرح قبول نہیں کی اور جرح جب تک مفسرنہ ہو اس کا اعتبار کیا؟ ابن سعد عجلی اور خطیب تینوں اسے ثقہ کہتے ہیں، بعض نے اُن کی کنیت ابو عمرو بھی لکھی ہے۔ امام فن یحیٰی بن معین کہتے ہیں ثقۃ لایسئل عن مثلہ۔ یہ ایسے ثقہ ہیں کہ ایسے حضرات کے متعلق مزید تحقیق کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

دوسری سند کے راوی

محمود بن غیلان ہے اوپر کے راوی جرح و تعدیل کے امام وکیع بن الجراح ۱۹۷ھ ہیں۔ یہ اور عبد الرزاق (۲۱۱ھ) صاحب المصنف امام اعظم ابو حنیفہؒ کے شاگرد ہیں۔ حضرت سفیان ثوریؒ

سے روایت کرتے ہیں. علامہ ہیثمی فرماتے ہیں:۔

رواہ البزار ورجالہ رجال الصحیح[1]

یہ حدیث اور کن کن کتابوں میں ہے

مسند امام احمد جلد ا ص۱۴۱، المصنف لابن ابی شیبہ جلد ص، سنن دارمی ص۳۷۲، سنن دارقطنی (القول البدیع ص۱۱۵) البیہقی ص، مستدرک حاکم جلد ۲ ص۴۲۱، البدایہ والنہایہ جلد ا ص۱۵۴، حلیہ ابی نعیم ص الجامع الصغیر جلد ا ص۹۳، مشکوٰۃ ص۸۶، وفاء الوفاء جلد ۲ ص۴۰۴ دیگر کئی کتابوں میں بھی موجود ہے۔

کن کن محدثین نے اسے صحیح کہا ہے

① علامہ ذہبی صاحب میزان الاعتدال (۷۴۸ھ) تلخیص المستدرک میں لکھتے ہیں یہ صحیح[2]

② علامہ سمہودی (۹۱۱ھ) لکھتے ہیں امام نسائی اور اسماعیل قاضی نے اسے صحیح سند سے روایت کیا ہے[3]

③ علامہ عزیزی (ھ) شرح جامع صغیر میں لکھتے ہیں حدیث صحیح[4]

④ علامہ ہیثمی (۸۰۷ھ) لکھتے ہیں ورجالہ رجال الصحیح[5]

⑤ علامہ سخاوی (۹۰۲ھ) رواہ احمد والنسائی والدارمی وابن نعیم والبیہقی والخلق وابن حبان والحاکم قال صحیح الاسناد[6]

⑥ علامہ ابن عبدالہادی (۷۴۴ھ) مختلف طرق سے صحیح اسانید کے ساتھ یہ روایت نقل کی ہے[7]

محدثین میں یہ حدیث اس درجہ مشہور اور مقبول ہے کہ اس کے تواتر معنوی کا دعویٰ کیا گیا ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ لکھتے ہیں:۔

---

[1] مجمع الزوائد جلد ۲ ص۲۸ [2] مستدرک جلد ۲ ص۴۲۱ [3] وفاء الوفاء جلد ۲ ص۴۰۴ [4] السراج المنیر جلد ا ص۵۱۸
[5] مجمع الزوائد جلد ۹ ص۲۴ [6] القول البدیع ص۱۱۵ [7] الصارم المنکی ص۱۲۸

ہر آئینہ خدائے را فرشتگان اند سیر کنندگاں در زمین مے رسانند مرا از امت من

سلام را و بتواتر رسید این معنی[1]

ترجمہ بے شک خدا تعالیٰ کے فرشتے ہیں زمین میں سیر کرتے پھرتے. مجھے میری امت

کا سلام پہنچاتے ہیں اور یہ بات تواتر کے درجے میں پہنچ چکی ہے.

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی دامت برکاتہم جن کا مضمون اس مسئلہ پہ ماہنامہ تعلیم القرآن راولپنڈی

میں چھپا ہے اور اس سے محدث جلیل حضرت مولانا عبدالرحمن صاحب سابق صدر مدرس مظاہر العلوم

سہارنپور (بہبودی تحصیل ضلع کیمبل پور) نے پورے اتفاق کا اظہار کیا ہے اور فریقین کو اس پہ جمع ہونے

کی دعوت دی ہے. وہ اس حدیث کے بارے میں لکھتے ہیں :-

فرشتوں کے ذریعے آپ کو صرف وہی درود و سلام پہنچتا ہے جو کوئی دور سے

بھیجے لیکن اللہ تعالیٰ جن کو قبر مبارک کے پاس پہنچا دے اور وہ وہاں حاضر ہو کر

صلوٰۃ و سلام عرض کریں تو آپ اس کو بنفسِ نفیس سنتے ہیں.[2]

کاش! کہ ہمارے کرم فرما اسی نقطۂ اتحاد پہ جمع ہو جائیں اور روضہ انور کا یہ سماع تسلیم کر لیں.

المبحث الثالث — الجوہر النقی فی تحقیق اسانید ابی الشیخ والبیہقی

حضرت ابوہریرہؓ کی یہ حدیث کہ جو مجھ پر میری قبر کے پاس درود پڑھے میں سنتا ہوں جو دور سے پڑھے

وہ مجھے پہنچایا جاتا ہے گو حضرت ابن عمرؓ سے بھی مروی ہے اور حضرت انس بن مالکؓ سے بھی اسے

مروی بتلایا جاتا ہے لیکن اس وقت ہم صرف حضرت ابوہریرہؓ کی روایت پہ بحث کریں گے. اس حدیث

کو حافظ ابوالشیخ الاصبہانی جو بقول ذہبی امام ثقہ اور احد الاعلام ہیں.[3] کتاب الثواب کے کتاب الصلوٰۃ میں

روایت کرتے ہیں اور امام بیہقی اسے شعب الایمان اور حیاۃ الانبیاء میں روایت کرتے ہیں. اصبہانی

اور بیہقی کی سندیں اپنی اپنی ہیں. اصبہانی کی سند جید ہے اور یہ حدیث صحیح ہے. اور بیہقی کی سند کا ایک

---

[1] فتاویٰ عزیزی جلد ۲ صفحہ ۶۹ [2] معارف الحدیث جلد ۵ صفحہ ۳ [3] تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ صفحہ ۱۴۷

راوی ابوعبدالرحمٰن محمد بن مروان السدی ضعیف ہے۔ ایک سند کا ضعف جب دوسری صحیح سند سے اُٹھ جاتا ہے تو کیا یہ دیانت کے خلاف نہیں کہ جید سند کو بالائے طاق رکھ کر عوام میں صرف ضعیف سند کو متعارف کرایا جائے اور دیدہ دانستہ قولِ رسول کی تضحیک کی جائے۔ یہاتنی بڑی جسارت ہے کہ اب پوری قوم اس عذاب کی زد میں ہے۔ اعاذنا اللہ منہ۔ اور انہیں حق قبول کرنے کی توفیق نہیں۔

مشکوٰۃ شریف میں یہ حدیث صرف بیہقی کے حوالے سے نقل کی گئی ہے۔ عوام میں مشکوٰۃ بڑی عام اور متداول کتاب ہے۔ ہمارے کرم فرما اسے مشکوٰۃ کے حوالے سے ہر جگہ لیے پھرتے ہیں۔ اور اُن کے بائیں ہاتھ میں ابوعبدالرحمٰن محمد بن مروان پر جرح ہوتی ہے اور جب لوگوں کو بتایا جائے کہ ابوالشیخ نے اس حدیث کی دوسری سند بھی پیش کی ہے جو صحیح ہے تو پھر یہ دوسرا پینترہ بدلتے ہیں کہ یہ حدیث قرآن کے خلاف ہے۔ قرآن تو کہتا ہے مُردے نہیں سُنتے اور یہ حدیث کہتی ہے حضورؐ سُنتے ہیں، ہم قرآن کو مانیں یا اس حدیث کو؟

اوّلاً تو یہ بات بھی صحیح نہیں کہ قرآن کہتا ہے مُردے نہیں سُنتے۔ قرآن کریم میں تو یہ ہے، انک لا تسمع الموتٰی "آپ مُردوں کو نہیں سُنا سکتے"۔ اللہ تعالیٰ جسے چاہے سُنا دیتا ہے۔ قرآن کریم میں اسماع کی نفی ہے سماع کی نہیں۔ پھر یہ تو عام دعوے ہے اسے شہیدوں اور پیغمبروں پر منطبق کرنا اور ان کی حیات کے خصوصی دلائل کو دبا جانا کیا یہ قادیانیوں کا طریقہ نہیں جو اموات غیر احیاء سے اور قد خلت من قبلہ الرسل سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات ثابت کرتے ہیں۔ دعویٰ خاص اور دلیل عام کا ایسا کریہہ منظر شاید ہی کسی نے دیکھا ہو۔

اس وقت ہمیں اس استدلال سے بحث نہیں، نہ ہم یہاں سماعِ موتٰی کی بحث لانا چاہتے ہیں ہمیں صرف یہ بتلانا ہے کہ ہمارے مہربانوں نے جب نیت ہی کرلی ہو کہ اس حدیث کو نہیں ماننا تو جب ان کا پہلا وار (کہ یہ حدیث ضعیف ہے) خالی جاتا ہے تو پھر کس جرأت سے قادیانی طرزِ استدلال پر آجاتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح بھی ہو تو ہم اسے قبول نہیں کریں گے۔ کیونکہ قرآن کے خلاف ہے۔ اگر ان سے پوچھا جائے کہ ائمہ اعلام میں سے کسی نے کہا ہے کہ یہ حدیث قرآن کے

تابع نہیں یہ اسکے خلاف تو اس پر ایک حوالہ بھی پیش نہ کر سکیں گے۔ ولو کان بعضھم لبعض ظھیرا۔

مغالطے کا ایک اور انداز

بیہقی کی سند کا راوی ابو عبدالرحمٰن محمد بن مروان ہے اور ابوالشیخ کی روایت کا ایک راوی عبدالرحمٰن بن احمد الاعرج (۰۰ ۳ھ) ہے جو ضعیف نہیں۔ عبدالرحمٰن کا نام چونکہ دونوں میں آتا ہے اس لیے ہمارے مخالفین اس کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں اور ابو عبدالرحمٰن کی جرح عبدالرحمٰن بن احمدؒ پر بھی لگا دیتے ہیں اور کہتے ہیں ابوالشیخ کی سند میں بھی وہ ضعیف راوی موجود ہے ان ھذا الا بھتان عظیم۔

المبحث رابع

تحقیق رواۃ سند ابی الشیخ

① ابوالشیخ الاصبہانی ② ابو صالح عبدالرحمٰن بن احمد الاعرج

③ الامام الحافظ حسن الصباح ④ ابو معاویہ محمد بن خازم

⑤ سلیمان بن مہران الاعمش ⑥ ابو صالح ذکوان (السمان الزیات)

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

① ——— ابوالشیخ الاصبہانی

علامہ ذہبی ان کو حافظ۔ امام اور مسند زمان کہتے ہیں۔ ان کے تعدیل و تدین کو تسلیم کرتے

لہ عبدالرحمٰن بن الاعرج سے قاضی ابو احمد محمد بن احمد بن ابراہیم بھی روایت کرتے ہیں (دیکھئے تاریخ اصبہان جلد ۲ ص۱۱۱) اور ابوالشیخ اصبہانی بھی (دیکھئے جلاء الافہام للحافظ ابن القیم ص۱۹) امام دارقطنی لکھتے ہیں جس شخص سے دو راوی روایت کریں وہ مجہول نہیں رہ سکتا (دیکھئے سنن دارقطنی جلد ۲ ص۳۶۱) تو جب اس پر مشتمل سند کو علماء محدثین نے جید تسلیم کیا ہے۔ من روی عنہ ثقتان فقد ارتفعت جہالتہ وثبتت عدالتہ۔ تو کیا اب بھی عبدالرحمٰن کی تعدیل نہ ہوگی۔ اس اصول کے لیے دیکھئے: (فتح المغیث ص۱۳۷)

ہیں۔ ابن مردویہ ان کو ثقہ اور مامون کہتے ہیں اور حافظ ابو نعیم ان کو احد الاعلام اور ثقہ کہتے ہیں[1]

ابو محمد عبد اللہ بن محمد بن جعفر ابو الشیخ ــــ فہو الحافظ الکبیر . . . ثقہ[2]

(۲) ــــ ابو صالح عبد الرحمن بن احمد الاعرج

والد کا نام ابو یحییٰ ۔ ابو نعیم اصفہانی (۴۳۰ھ) نے تاریخ اصفہان جلد ۲ صـ ۱۱۳ میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ اس سے قاضی ابو احمد محمد بن احمد اور ابو الشیخ جیسے ثقات نے روایتیں لی ہیں اور اس نے سلمہ بن شبیب اور الامام الحافظ حسن الصباح جیسے حضرات سے روایات لی ہیں حافظ ابن حجر عسقلانی سلمہ بن شبیب کے بارے میں لکھتے ہیں :۔

احد الثقات حدث عنہ الائمۃ والقدماء[3]

سلمہ بن شبیب سے روایت کرنے والوں میں یہ ابو صالح عبد الرحمن بن احمد بھی ہیں۔

البتہ عبد الرحمن بن احمد الاعرج کا بھائی محمد بن احمد ضعیف ہے :۔

قال ابو الشیخ لم یکن بالقوی ــــ فی الحدیث[4]

(۳) ــــ الحسن بن الصباح

صحیح بخاری کے معروف راوی ہیں۔ ذہبی انہیں امام اور حافظ جیسے پرعظمت الفاظ سے ذکر کرتے ہیں۔ جن لوگوں نے اسے حسن بن صباح جو اسماعیلی فرقے کا بانی تھا مشہور کر رکھا ہے وہ خدا کا خوف کریں[5]

(۴) ــــ ابو معاویہ محمد بن خازم

کوفہ کے مشہور محدث تھے۔ حافظ ذہبی انہیں حافظ اور ثبت کہتے ہیں۔ صحاح ستہ کے راوی ہیں۔ اعمش سے روایت کرنے میں ثقہ ہیں کبھی اور سے روایت کریں تو ہو سکتا ہے اس میں کچھ اضطراب ہو[6]

---

[1] دیکھئے تذکرہ للذہبی جلد ۳ صـ ۱۴۷ [2] لسان المیزان جلد ۶ صـ ۲۹۵ [3]

[4] لسان المیزان جلد ۵ صـ ۴۳ [5] تذکرہ جلد ۲ صـ ۵۵ [6] دیکھو تذکرہ جلد ۱ صـ ۲۷۱

یحییٰ بن معین کہتے ہیں اعمش سے روایت کرنے میں اثبت ہیں۔[1]

⑤ —— سلیمان بن مہران الاعمش

صحاح ستہ کے مرکزی راوی ہیں عظیم المرتبت اور جلیل القدر محدث ہیں۔ ان پہ شیعیت کا الزام ہے۔ مگر ان دنوں شیعیت رفض کے معنوں میں نہ تھی۔ تحریف قرآن، عقیدہ امامت اور انکارِ خلافتِ راشدہ روافض کا مذہب ہے اثنا عشریہ کا نہ کہ مطلق شیعوں کا۔

⑥ —— ابوصالح ذکوان

صحاح ستہ کے مرکزی راوی ہیں۔ امام احمد فرماتے ہیں:۔

ثقه ثقه من اجل الناس واوثقهم۔[2]

ترجمہ: ثقہ ثقہ ہے بڑے اور سچے لوگوں میں سے ہے اور سب سے زیادہ لائق وثوق لوگوں میں سے ہے

اور اس زمانے میں تو راویوں کی پڑتال اور غیر مبین السبب جرح سامنے لانے کی بجائے یہ دیکھنا چاہیئے کہ یہ حدیث متلقی بالقبول ہے یا نہیں۔ یہی راہ سلامتی کے زیادہ قریب ہے۔ اب دیکھیئے کن کن ائمہ فن نے اس حدیث پر اعتماد کیا ہے۔

جن علمائے اعلام نے اس حدیث کو صحیح تسلیم کیا ہے

کن کن ائمہ کبار اور علمائے فن نے اس حدیث کی تصحیح کی ہے اور کن کن اعیانِ امت نے اس کے مضمون کو صحیح تسلیم کیا ہے؟ کچھ نام ملاحظہ فرمائیں:۔

① —— شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ (۷۲۸ھ)

② —— حافظ ابن قیمؒ (۷۵۱ھ)

③ —— خاتمۃ الحفاظ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ (۸۵۲ھ)

④ —— سخاویؒ (۹۰۲ھ)

---

[1] حاشیہ تہذیب التہذیب جلد ۹ صفحہ ۱۳۸ [2] تذکرہ جلد ۱ صفحہ ۸۳

⑤ —— علامہ ابن حجر مکی (۹۷۳ھ)

⑥ —— علامہ عبدالرؤف المناوی (۱۰۰۴ھ)

⑦ —— ملا علی قاری (۱۰۱۴ھ)

⑧ —— قاضی ثناء اللہ پانی پتی (۱۲۲۵ھ)

⑨ —— علامہ سید احمد طحطاوی (۱۲۳۰ھ)

⑩ —— نواب صدیق حسن خاں (۱۳۰۷ھ)

⑪ —— حضرت مولانا عبدالحی لکھنوی (۱۳۰۴ھ)

⑫ —— علامہ شبیر احمد عثمانی (۱۳۶۹ھ)

حوالجات از بعض عبارات

① حافظ ابن تیمیہ کی شہادت

صلوا علی حیثما کنتم فان صلوتکم تبلغنی قال فاخبر صلی اللہ علیہ وسلم انہ یسمع الصلوٰۃ من قریب و یبلغ ذلک من بعید[1]

ترجمہ: حضورؐ نے فرمایا، مجھ پر درود پڑھا کرو جہاں بھی تم ہو، کیونکہ تمہارا درود مجھے پہنچتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا ہے کہ آپ قریب سے پڑھے گئے درود کو خود سنتے ہیں اور دور سے پڑھا آپ کو پہنچایا جاتا ہے۔

یہ دو حدیثیں ہیں۔ پہلی ابو داؤد کی ہے اور اس کی سند صحیح ہے۔ اور دوسری وہی امام بیہقی والی —— امام ابن تیمیہ اس دوسری حدیث کی سند سے بے خبر نہیں ہیں۔ اس کی کمزوری آپ کو معلوم ہے مگر آپ اسے اس کے شواہد کے باعث قبول کر رہے ہیں۔

---

[1] رسائل ابن تیمیہ صفحہ ۳۹۱ رسالہ ملا

وقد روی ابن ابی شیبۃ والدار قطنی عنه من صلی علی عند قبری سمعته

ومن صلی علی نائیا ابلغته وفی اسناده لین لکن له شواهد ثابتة فان

ابلاغ الصلوۃ والسلام علیه من البعد قد رواه اهل السنن من غیر وجه[1]

ترجمہ۔ اور ابن ابی شیبہ اور دارقطنی نے حضور سے روایت کی آپ نے فرمایا جو مجھ پر میری قبر پہ

آکر درود پڑھے وہ میں خود سنتا ہوں اور جو مجھ پر دور سے پڑھا جائے وہ مجھے پہنچایا

جاتا ہے اس کی سند میں کچھ کمزوری ہے لیکن اس حدیث کے بہت سے شواہد ہیں

آپکو دور سے صلوۃ وسلام کا پہنچایا جانا ائمہ حدیث نے کئی طریقوں سے روایت کیا ہے

② حافظ ابن القیم کی شہادت

یہ جو کہا ہے کہ اس کی سند میں کچھ کمزوری ہے۔ یہ ابوالشیخ کی سند کے بارے میں نہیں، ابن ابی شیبہ

اور دارقطنی کی سند کے بارے میں ہے، اور ممکن ہے یہ وہی کمزوری ہو جو بیہقی کی سند میں تھی۔ مگر چونکہ بقول

ابن تیمیہؒ اس کے شواہد موجود ہیں۔ اس لیے یہ روایت بھی قبول کی جائے گی اور یہ محدثین کا اصول ہے

کہ روایت اپنے شواہد سے قوی ہو جاتی ہے[2]۔

ان شواہد میں وہ حدیث بھی ہے جسے اہل سنن (نسائی وغیرہ) نے روایت کیا ہے کہ حضور صلی

اللہ علیہ وسلم کو دور سے پڑھا گیا صلوۃ وسلام (فرشتوں کے توسط سے) پہنچایا جاتا ہے۔ امام سیوطیؒ

بھی اس کے شواہد کا ذکر کرتے ہیں:۔

قلت هذا الحدیث اخرجه الطبرانی و ابونعیم فی الحلیه وله شواهد یرتقی بها

الی درجه الحسن۔[3]

یہ سب تائید اسی روایت کی ہے جو امام بیہقی نے لکھی ہے۔ یہ ائمہ فن بتاتے ہیں کہ اس کا ضعف

ان شواہد سے کلیۃً اٹھ جاتا ہے۔۔

---

[1] فتاوی ابن تیمیہ جلد ۲۷ صفحہ ۱۱۶ [2] تعدد الطرق یفید القوۃ اعلاء السنن جلد ۱ صفحہ ۳۳ طبع قدیم [3] اللآلی المصنوعہ جلد ۱ صفحہ ۲۸۵

حافظ ابن قیم (۷۵۱ھ) نے جلاء الافہام میں ابوالشیخ کی پوری سند دے کر حضرت ابوہریرہؓ سے یہ حدیث نقل کی ہے من صلی علی عند قبری سمعته ومن صلی علی من بعید أعلمته[1]

سند یہ ہے:۔

قال ابو الشیخ فی کتاب الصلوٰۃ حدثنا عبد الرحمن بن احمد الاعرج حدثنا حسین بن الصباح حدثنا ابو معاویۃ حدثنا الاعمش عن ابی صالح عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

اور کتاب الروح میں لکھا ہے:۔

وقد صح عنه ان اللہ تعالیٰ وکل بقبرہ الملئکة یبلغون عن امته السلام۔

ترجمہ۔ اور حضورؐ سے سند صحیح سے ثابت ہو چکا کہ اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کی قبر پہ فرشتے مقرر کر رکھے ہیں جو حضورؐ کو آپ کی امت کا صلوٰۃ وسلام پہنچاتے ہیں۔

فرشتے یہاں (روضہ اقدس پر) حاضر ہو کر صلوٰۃ وسلام تبھی پہنچاتے ہیں کہ حضورؐ یہاں خود سنتے ہیں ورنہ فرشتوں کے یہاں آنے کا کیا مطلب — اور جو درود وسلام دور پڑھا جائے یہاں پہنچایا جاتا ہے۔

یہ حافظ ابن قیم کی طرف سے اس حدیث کی اور اس کے معنی کی پوری تصدیق کی ہے — پھر لکھتے ہیں:۔

فالروح ھناك ولها اتصال بالبدن فی القبر واشراق علیه وتعلق به بحیث یصلی فی قبرہ ویرد سلام من سلم علیه۔[2]

ترجمہ۔ سو روح اقدس اپنے مقر میں ہے اور اس کا قبر میں پڑے بدن سے ایک اتصال اشراف اور ایک تعلق ہے بایں طور کہ آپ اپنی قبر میں نماز پڑھتے ہیں اور سلام عرض کرنے والے کو جواب بھی لوٹاتے ہیں۔

اس حدیث کے بارے میں کوئی شک نہیں ہے کہ حضورؐ اپنے روضہ اقدس پر عرض کئے گئے صلوٰۃ وسلام کو خود سنتے ہیں اور اس سماع عند القبر کا اہل حق میں سے کسی نے انکار نہیں کیا اس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔

---

[1] جلاء الافہام ص ۱۵ [2] کتاب الروح ص ۵۴ طبع حیدرآباد

④ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ کی شہادت

اخرج ابو الشیخ فی کتاب الثواب بسند جید بلفظ من صلّی علیّ عند قبری سمعته ومن صلی علی نائیاً بلغته۔[1]

ترجمہ۔ ابو الشیخ نے کتاب ثواب اعمال میں بڑی عمدہ سند سے یہ الفاظ روایت کئے ہیں کہ جو میری قبر کے پاس آکر مجھ پر دُرود پڑھے وہ میں خود سنوں گا اور دُور سے پڑھا مجھے پہنچایا جاتا ہے۔

حافظ ابن حجر یہاں اس حدیث پر بحث کر رہے ہے جو صلوا علیّ فان صلوٰتکم تبلغنی ہے اس کے بعد آپ اس کے شواہد ذکر کرتے ہیں ① پہلا ابو داؤد کی روایت سے ② دوسرا ابو الشیخ کی روایۃ سے ③ تیسرا ابو داؤد اور نسائی کی روایت فان صلوٰتکم معروضۃ علیّ سے۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ حافظ اسی روایت کو لائق قبول بنا رہے ہیں جو امام بیہقی سے منقول تھی اور اس پر شواہد پیش کر رہے ہیں جنہوں نے اس کی سند کی کمزوری اٹھا دی ہے ابو الشیخ کی روایت پیش کرتے ہوئے وہ ضمناً یہ بات بھی کہہ گئے کہ اس کی سند عمدہ ہے۔ ہم نے اس کی سند حافظ ابن قیم کی کتاب جلاء الافہام سے نقل کی ہے۔ حافظ کی پوری عبارت یہ ہے:۔

ومن شواھد الحدیث ما اخرجه ابو داؤد من حدیث ابی ھریرۃ رفعه وقال فیه صلوا علیّ فان صلوٰتکم تبلغنی حیث کنتم سنده صحیح واخرجه ابو الشیخ فی کتاب الثواب بسند جید بلفظ من صلّی علیّ عند قبری سمعته ومن صلی نائیاً بلغته وعند ابی داؤد والنسائی وصححه ابن خزیمة وغیرہ عن اوس الی ان قال فان صلوٰتکم معروضه علیّ فقالوا کیف تعرض وقد ارمت۔[1]

---

[1] فتح الباری جلد ـــ صـــ

④ حافظ شمس الدین سخاویؒ کی شہادت

من صلی علی عند قبری سمعته ومن صلی علیّ من بعید اعلمته رواه ابوالشیخ وسنده جید.[1]

ترجمہ: حضورؐ نے فرمایا ہے جو میری قبر پر آکر مجھ پر درود پڑھے میں خود سنتا ہوں اور دُور سے پڑھا مجھے پہنچایا جاتا ہے اسے ابوالشیخ نے روایت کیا ہے اور اس کی سند جید ہے عُمدہ ہے۔

⑤ علامہ ابن حجر مکیؒ کی شہادت

اذا صلی وسلم عند قبرہ سمعه سماعا حقیقیا ویرد علیه من غیر واسطة وان صلی وسلم من بعید لا یسمعه الا بواسطة. یدل علیه احادیث کثیرة.[2]

ترجمہ: جب کسی نے درود وسلام آپ کی قبر کے پاس پڑھا تو آپ اسے حقیقی طور پر سنتے ہیں اور سلام کا جواب براہ راست دیتے ہیں اور اگر درود وسلام دور سے پڑھا تو آپ اسے نہیں سنتے مگر فرشتوں کے واسطہ سے۔ اس پر بہت سی احادیث دلالت کرتی ہیں۔

اور الجوہر المنظم میں لکھتے ہیں:۔

انه صلی الله علیه وسلم یبلغه الصلوٰة والسلام اذا صدر من بعید ویسمعها اذا کان عند قبرہ الشریف بلا واسطة.[3]

ترجمہ: بے شک حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو درود وسلام پہنچایا جاتا ہے جب وہ دور سے آئے اور آپ اسے خود بلا واسطہ سنتے ہیں جب پڑھنے والا آپ کی قبر شریف کے پاس ہو۔

---

[1] القول البدیع ص۱۱۶ [2] شرح ہمزیہ ص۔۔ [3] الجوہر المنظم ص۲۳

وفی روایۃ اخری للطبرانی لیس من عبد یصلی علی الابلغنی صوتہ قلنا یا رسول اللہ وبعد وفاتک قال وبعد وفاتی ان اللہ حرم علی الارض ان تاکل اجساد الانبیاء ای فسمعھم الحسی کیفیتہ کحواسھم الظاھریۃ۔[1]

ترجمہ۔ اور طبرانی کی ایک دوسری روایت میں ہے کوئی مسلمان مجھ پر درود نہیں پڑھتا مگر یہ کہ اس کی آواز مجھے پہنچتی ہے ہم نے کہا اور آپ کی وفات کے بعد کیا ہو گا حضورؐ نے فرمایا وفات کے بعد بھی ایسا ہی ہو گا۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے انبیاء کے اجساد زمین پر حرام کر دیئے ہیں کہ انہیں ریزہ ریزہ کرے۔ انبیاء کا سننا ایسا ہے کہ اس کی کیفیت حسی ہے جیسا کہ ان کے دوسرے حواس (قائم ہوتے ہیں)۔

اجسادِ انبیاء کہاں محفوظ رہتے ہیں؟ اپنی قبر میں ـــــ حضورؐ نے جب خبر دی کہ درود پڑھنے والے کی آواز مجھے پہنچتی ہے۔ تو صحابہؓ کا ذہن فوراً آپ کی قبر مبارک کی طرف متوجہ ہوا کہ وہاں آپ کیسے سنیں گے۔ آپ نے اپنے جسدِ اطہر کے محفوظ رہنے کی خبر دی ـــــ ابن حجرؒ اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ انبیاء کے دوسرے ظاہری حواس کی طرح ان کی قوت سامعہ حسی طور پر محفوظ ہے۔

حضورؐ جب دنیا میں تھے تو بھی عام حالت یہ تھی کہ قریب والے کی بات سنیں اور دور کی بات سے اطلاع پائیں۔ وفات کے بعد جب قوت سامعہ اسی ظاہری انداز پہ ہے تو ظاہر ہے کہ قبر مبارک میں بھی آپ قریب سے سنیں گے اور دور والے کا درود و سلام آپ کو پہنچایا جائے گا ـــــ سو حدیث الابلغنی صوتہ حافظ ابن حجر مکی کے ہاں عند قبری سے خاص ہو گی اور اس سے اس کی ان احادیث صحیحہ سے بھی تطبیق ہو جائے گی جن میں دور کے سلام کا بتوسطِ ملائکہ پہنچنا صریح لفظوں میں پایا جاتا ہے۔ ابن حجر نے اسے اسی شخص کے متعلق قرار دیا ہے جو قبر مبارک کے پاس آکر درود پڑھے ـــــ یہ تفصیل ہم نے اس لیے کی ہے کہ بعض دوسرے علماء نے جب طبرانی کی اس حدیث کو نقل کیا ہے۔ تو الفاظ بلغنی صلوتہ (اس کا درود مجھے پہنچتا ہے) روایت کئے ہیں معلوم ہوتا ہے بلغنی صوتہ

---

[1] ـــــ

یہ تصحیف ہوئی ہے۔ سو اگر سے اسی شکل میں لیا جائے تو اسے عند قبری کے ساتھ خاص کرنا ہوگا۔ اس صورت میں یہ روایت بھی امام بیہقی کے شواہد میں ذکر کی جا سکتی ہے

⑥ حافظ ابن کثیرؒ (۷۷۴ھ)

باوجودیکہ آپ اس کی بیہقی والی سند پہ جرح کرتے ہیں اس کے راوی محمد بن مروان السدی الصغیر کو متروک قرار دیتے ہیں مگر حدیث کو مقبول قرار دیتے ہیں یہ تلقی بالقبول ہے[1]

⑦ علامہ شہاب الدین الخفاجیؒ (۸۹۹ھ)

وبما تقرر فی هذه الاحادیث علم انه صلی الله علیه وسلم تبلغه الصلوٰة والسلام اذا صدر من بعید ویسمعها اذا کان عنده قبره الشریف بلا واسطة[2]

لانه صلی الله علیه وسلم حی فی قبره یسمع دعاء زائره[3]

ترجمہ۔ اور ان احادیث میں جو بات قرار پائی اس سے معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو درود و سلام پہنچایا جاتا ہے جب وہ دور سے آئے اور آپ اسے خود بلا واسطہ سنتے ہیں جب آپ کی قبر شریف کے پاس پڑھا جائے ــــــ یہ اس لیے کہ آپ اپنی قبر مبارک میں زندہ ہیں اور زیارت کے لیے آنے والے کی آواز سنتے ہیں۔

⑧ حضرت علامہ عبد الرؤف المناویؒ (۱۰۰۳ھ)

من صلی علی عند قبری سمعته ومن صلی علی نائیا ای بعیدا (ابلغته) ای اخبرت به من احد من الملئکة وذلك لان لروحه تعلقا بمقر بدنه الشریف وحرام علی الارض ان تاکل اجساد الانبیاء[4]

---

[1] تفسیر ابن کثیر جلد ۳ صفحہ ۵۱۵ [2] نسیم الریاض جلد ۳ صفحہ ۳۹۸ [3] ایضاً صفحہ ۵۰۳ [4] فیض القدیر جلد ۶ صفحہ ۱۷۰

ترجمہ۔ جو مجھ پر میری قبر کے پاس درود پڑھے میں اسے سنتا ہوں اور جس نے دور سے پڑھا وہ مجھے پہنچایا جاتا ہے فرشتوں میں سے کوئی مجھے اس کی اس کی اطلاع دے دیتا ہے اور یہ اس لیے کہ آپ کی روح اقدس کا آپ کے مقر بدن (قبر مبارک) سے ایک تعلق ہے اور زمین پر حرام ہے کہ وہ اجساد انبیاء کو کھائے۔

(۹) ملا علی القاری علیہ رحمۃ ربہ الباری (۱۰۱۴ھ)

(۱) ورواہ ابو الشیخ وابن حبان فی کتاب ثواب الاعمال بسند جید۔[۱]

ترجمہ۔ اس حدیث کو ابو الشیخ اور ابن حبان نے ثواب الاعمال میں سند جید سے روایت کیا ہے۔

(۲) من صلی علی عند قبری سمعتہ ای سماعاً حقیقیاً بلا واسطۃ۔[۲]

ترجمہ۔ جو مجھ پر میری قبر کے پاس آ کر درود پڑھتا ہے میں اسے حقیقی طور سنتا ہوں بلا واسطہ۔

(۳) انہ قد ثبت من صلی علیہ نائیاً بلغہ ومن صلی علیہ عند قبرہ سمعہ۔[۳]

ترجمہ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ جو شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر دور سے درود پڑھے وہ آپ کو پہنچایا جاتا ہے اور جس نے آپ کی قبر مبارک کے پاس درود پڑھا اسے آپ خود سنتے ہیں۔

(۴) ان الزائر اذا صلی وسلم علیہ عند قبرہ سمعہ سماعاً حقیقیاً ورد علیہ من غیر واسطۃ ... لما جاء عنہ بسند جید من صلی علی عند قبری سمعتہ ومن صلی علی من بعید اعلمتہ۔[۴] ترجمہ۔ زائر جب آپ کی قبر کے پاس آ کر آپ پر درود و سلام پڑھے تو آپ اسے حقیقۃً سنتے ہیں اور سلام کا جواب دیتے ہیں بلا واسطہ ... کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سند جید کے ساتھ یہ بات پہنچی ہے کہ جو شخص میری قبر پر آ کر مجھ پر درود پڑھتا ہے وہ میں خود سنتا ہوں اور جس نے دور سے پڑھا وہ مجھے پہنچایا جاتا ہے۔

---

[۵] مرقات جلد ۲ صفحہ ۱۰ [۱] شرح الشفاء جلد ۳ صفحہ ۵ [۲] مرقات جلد ۳ صفحہ ۵۲۵ [۳] الدرۃ المضیئۃ فی زیارۃ المصطفویہ منقول از تعلیم القرآن راولپنڈی۔[۴]

(۱۰) علامہ سید احمد طحطاویؒ (د ۱۲۳۳ھ)

فانہ یسمعہا ای اذا کانت بالقرب منہ صلی اللہ علیہ وسلم وتبلغ الیہ ای یبلغہا الملک الیہ اذا کان المصلی بعیدًا۔[۱]

(۱۱) قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ (۱۲۲۵ھ) صاحب تفسیر المظہری

انہ صلی اللہ علیہ وسلم قال من صلی علیّ عند قبری سمعتہ ومن صلی علیّ غائبًا بلغتہ۔[۲]

(۱۲) شیخ عبد اللہ بن محمد بن عبد الوہاب نجدیؒ (د ھ)

انہ یسمع من یسلم علیہ۔[۳]

ترجمہ۔ آپ اس درود کو جو آپ پہ (قبر کے پاس) پڑھا جائے خود سنتے ہیں۔

مولانا اسمٰعیل غزنوی نے آپ کے اس رسالہ کا اردو میں ترجمہ کیا ہے اسے ان کے الفاظ میں پڑھیے:۔

ہمارا عقیدہ ہے کہ جب کوئی مسلمان آنحضرتؐ پر سلام کہے تو آپ اس کا سلام سنتے ہیں۔ ص ۶۵[۴]

آل شیخ کے معتمد عالم علامہ نجدی شیخ محمد بن عبد اللطیف رقمطراز ہیں:۔

ہمارا عقیدہ ہے، کہ آپ کا رتبہ تمام مخلوق سے بہتر ہے اور آپ اپنی قبر میں زندہ ہیں لیکن برزخی زندگی کے ساتھ اور شہداء کی زندگی سے کہیں بہتر آپکی زندگی ہے اور آپکی قبر پر جو آپ کو سلام کہتا ہے آپ سنتے ہیں۔[۵]

(۱۳) حضرت مولانا عبد الحی لکھنویؒ (۱۳۰۴ھ)

جو خود روضہ پہ حاضر ہوں اور صلوٰۃ وسلام بالکل سامنے عرض کر رہے ہوں وہ صلوٰۃ وسلام

۱۔ طحطاوی مراقی علی الفلاح ص ۴۰۵ مصر ۲۔ مظہری جلد ۱ ص ۲۲۴ ۳۔ اتحاف النبلاء ص ۴۰۵ ۴۔ ترجمہ رسالہ از مولانا اسمٰعیل غزنوی ۱۹۲۷ء امرتسر

آپ خود سنتے ہیں۔[۱]

روضۂ اطہر پر حاضر ہو کر صلوٰۃ وسلام پڑھا جائے تو نبی کریمؐ خود سُن کر جواب دیتے ہیں یہ مسئلہ سنتِ رسول اور اجماعِ امت سے ثابت ہے۔[۲]

⑭ نواب صدیق حسن خاںؒ (۱۳۰۷ھ)

اسنادہ جید ——— اس حدیث کی سند جید ہے۔[۳]

⑮ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ (۱۳۶۹ھ)

اخرجه ابو الشيخ في كتاب الثواب بسند جيد من صلى علي عند قبري سمعته ومن صلى علي نائيا بلغته۔[۴]

⑯ حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری (۱۳۴۶ھ)

مسجد نبوی کی حد میں کتنی ہی پست آواز سے سلام عرض کیا جائے اس کو حضرتؐ خود سنتے ہیں۔[۵]

ان تصریحات کی روشنی میں یہ بات واضح ہے کہ حضورؐ کے اپنی قبر مبارک پر سلام سننے کو تلقی بالقبول کا درجہ حاصل ہے اور محدثین کا اس پر اتفاق ہے کہ تلقی بالقبول سے حدیث بلاشبہ لائق اعتماد ہو جاتی ہے اس حدیث پر ابو الشیخ کی سند جید نہ بھی موجود ہوتی تو بھی بیہقی کی روایت تلقی بالقبول کے باعث لائق اعتماد ہے محدث سہارنپوری نے بذل المجہود جلد ۲ ص ۱۱۷ اور ص ۳۷ پر اور المہند علی المفند میں اپنے عقیدہ کو بڑی وضاحت کے ساتھ لکھا ہے۔ ہمارے کرم فرماؤں نے المہند کے خلاف القول المسند فی رد المہند لکھ کر قوم کے سامنے بڑی بے کار بات پیش کی ہے۔

---

[۱] دیکھیے السعی المشکور ص ۲۵۵ [۲] الیضاًت ص ۲۵۲ [۳] الدلیل الطالب ص ۸۴۴ [۴] فتح الملہم جلد ۱ ص ۳۳۰ [۵] تذکرۃ الخلیل ص ۳۶

⑰ حکیم الامۃ مجدد الامۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی رحؒ (۱۳۶۲ھ)

خود حضورؐ کا ارشاد مروی ہے کہ جو شخص میری قبر کے پاس درود پڑھتا ہے اس کو میں خود سنتا ہوں اور جو شخص دور سے درود بھیجتا ہے وہ مجھ پہنچایا جاتا ہے یعنی بذریعہ فرشتوں — جیسا کہ مشکوٰۃ میں نسائی اور دارمی سے بروایت عبداللہ بن مسعودؓ آپ کا ارشاد مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کچھ ملائکہ زمین میں سیاحت کرنیوالے مقرر ہیں کہ میری امت کی طرف سے مجھ کو سلام پہنچاتے ہیں۔[۱]

⑱ مولانا عبد الغفور غزنوی امرتسری رحؒ (ھ) مترجم مشکوٰۃ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مع جسم صحیح وسالم ہیں اور قبر شریف میں زندہ ہیں اور جو کوئی قبر کے پاس درود یا سلام بھیجے تو آپ خود سن لیتے ہیں اور اگر دور سے درود بھیجے تو فرشتے آپ تک پہنچا دیتے ہیں۔ اہلحدیث کا یہی اعتقاد ہے۔[۲]

⑲ مولانا محمد عطاء اللہ حنیف صاحب التعلیقات السلفیہ

انما احیاء فی قبورھم یصلون وقد قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من صلی علیّ عند قبری سمعتہ ومن صلی علیّ نائیا بلغتہ[۳]

ترجمہ۔ انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور وہ وہاں نمازیں بھی پڑھتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جو شخص میری قبر پر آکر مجھ پر درود پڑھے میں خود سنتا ہوں اور جو دور سے پڑھے وہ مجھے پہنچایا جاتا ہے

واضح ہوا کہ عند القبر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صلوٰۃ وسلام کا سماع فرماتے ہیں اور بلوغ صلوٰۃ وسلام صحیح ہے اور اس بلوغ اور (سلام) کی کیفیت اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔[۴]

---

[۱] نشر الطیب ص۱۸۴ [۲] حاشیہ مشکوٰۃ باب الجمعہ ص۱۲۱ [۳] التعلیقات جلد ا ص۱۳۷ [۴] تسکین القلوب ص۱۰۵

المبحث الخامس

علامہ ابن عبدالہادی کا اُسے قبول کرنا

علامہ ابن عبدالہادی کی نظر ابو الشیخ کی سند پر نہیں گئی۔ ان کے پیش نظر امام بیہقی والی سند ہی تھی آپ نے محمد بن مروان سدی صغیر پر بڑی سخت جرح کی ہے۔ لیکن یہ بات تسلیم کئے بغیر انہیں بھی چارہ نہیں رہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم قریب سے عرض کئے گئے صلوٰۃ وسلام کو خود سُنتے ہیں اور دور سے آپ کو پہنچایا جاتا ہے۔ یُوں سمجھیے کہ اگر ابوالشیخ والی سند نہ بھی ہوتی تو بیہقی کی روایت ان کے ہاں دوسرے شواہد کی روشنی میں تلقی بالقبول کا درجہ پا چکی تھی۔ کیا محدثین اور کیا فقہاء، کیا احناف اور کیا شوافع کیا موالک اور کیا حنابلہ، پُوری امت میں کوئی مقتدر عالم ایسا نہیں ملے گا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عند القبر سماع بلا واسطہ کا قائل نہ ہو۔ فرشتے کا توسط صرف دور کے سماع کے لیے ہے اور اس میں کسی کا اختلاف نہیں۔ علامہ طحطاوی لکھتے ہیں :۔

يبلغها الملك اذا كان المصلي بعيداً۔[1]

ترجمہ: فرشتہ اس صورت میں درود وسلام پہنچاتا ہے جب کہ درود بھیجنے والا قبر مبارک سے دور ہو۔

علامہ ابن عبدالہادی لکھتے ہیں اور تسلیم کرتے ہیں :۔

وهو صلى الله عليه وسلم يسمع السلام من القابر وتبلغه الملئكة الصلوٰة والسلام من البعد۔[2]

ترجمہ۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قبر مبارک سے سلام خود سنتے ہیں اور فرشتے وہ صلوٰۃ وسلام پہنچاتے ہیں جو دور سے پڑھا جائے

اس سے معلوم ہوا کہ علامہ ابن عبدالہادی سماع عند القبر کے ہرگز منکر نہیں۔ آپ کرامت کی

---

[1] طحطاوی علی مراقی الفلاح ص۴۰۵ [2] الصارم المنکی ص۲۰۴

چودہ صدیوں میں ایک عالم ربانی ایسا نہیں ملے گا جو اہلسنت کہلاتے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سماع عند القبر بلا واسطہ کا منکر ہو۔

علامہ ابن عبد الہادی ایک دوسرے مقام پہ لکھتے ہیں:۔

فلما ذالك الحديث وان كان معناه صحيحاً فاسناده لا يحتج به وانما يثبت معناه بلحاديث اخر فانه لا يعرف الا من حديث محمد بن مروان السدى صغير عن الاعمش كما ظنه البيهقى وما ظنه فى هذا هو متفق عليه۔[1]

ترجمہ۔ اور یہ حدیث اگرچہ اس کا معنی بالکل صحیح ہے لیکن اس کی سند ایسی نہیں جس سے احتجاج کیا جا سکے یہ معنی کہ حضورؐ اپنی قبر کے پاس سے سنتے ہیں۔ دوسری احادیث سے ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ حدیث محمد بن مروان سدی صغیر عن الاعمش کے سوا اور کسی طریق سے معروف نہیں ہوتی جیسا کہ بیہقی کا خیال ہے اور اس کا جو خیال ہے وہ متفق علیہ ہے۔

امام بیہقی کی نظر میں اعمش سے صرف ابو عبد الرحمٰن محمد بن مروان یہ روایت لے رہا ہے، انہیں معلوم نہیں کہ اعمش سے یہ حدیث، ابو معاویہ نے بھی سنی تھی۔ اب اگر امام بیہقی کو اپنے اساتذہ سے اس ابو معاویہ کی روایت کا علم نہ ہوا ہو تو سچ کہیئے اس میں ابو معاویہ جو صحاح ستہ کے مرکزی راوی ہیں اور وہ کوفہ جیسے مرکز علم کے نہایت ممتاز محدث تھے ان کا کیا قصور ہے؟ کیا علم رکھنے والا شخص اس شخص پر حجت نہیں جسے علم نہ ہو؟

بیہقی کے طریق میں واقعی محمد بن مروان منفرد ہے۔ اس کا کوئی متابع نہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ الحسن بن الصباح کے طریق میں بھی اس حدیث کو اعمش سے روایت کرنے والا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ ہاں بیہقی کا یہ گمان کہ محمد بن مروان منفرد ہے اس کے اپنے طریق اور علم کے مطابق درست ہے۔

---

[1] الصارم المنکی ص ۲۳۱

اب کوئی شخص بیہقی کے طریق میں ابو معاویہ کو داخل کرے تو کیا یہ واقعی موضوع روایت نہ ہوگی؟ بیہقی کی سند میں علاء بن عمرو الحنفی محمد بن مروان ہے اور وہ اعمش سے اس حدیث کا راوی ہے. یہ سند محمد بن مروان کی وجہ سے واقعی ضعیف ہے. گو یہ ضعف دوسرے شواہد سے دُور ہو جاتا ہے لیکن اگر کوئی شخص یوں بیان کرے. علاء بن عمرو الحنفی عن ابی معاویہ عن الاعمش تو اسی سند کو موضوع کہنے سے چارہ نہیں رہے گا لیکن اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ امام بیہقی کی محمد بن مروان بن الاعمش والی سند موضوع ہے وہ موضوع نہیں ضعیف ہے. اگر یہ روایت موضوع ہوتی تو امام بیہقی اسے روایت کرنے کے بعد یہ نہ فرماتے :-

ابو عبدالرحمٰن هذا هو محمد بن مروان السدی فیما اری وفیه نظر وقد مضیٰ ما یؤکده.[۱]

ترجمہ. یہ ابو عبدالرحمٰن جیسا کہ میں سمجھا ہوں محمد بن مروان سدی صغیر ہے اور اس کے لائق حجت ہونے میں کلام ہے اور وہ روایات پہلے بیان ہو چکیں جو اس روایت کی تائید کرتی ہیں۔

معلوم ہوا امام بیہقی کو پوری طرح معلوم ہے کہ محمد بن مروان پر کس طرح کی جرح ہے. بایں ہمہ وہ اسے کلیتہً ترک نہیں کرتے. دوسرے شواہد سے اسے مؤکد کرتے ہیں اور یہی محدثین کا طریقہ ہے کہ وہ ایک سند کی کمزوری کو دوسرے قرائن سے منجبر کر لیتے ہیں. پھر جب اس حدیث کے ظاہر معنی سے خود ابن عبدالہادی کو بھی انکار نہیں. تو اب کسی عالم کو اس انکار کی کیسے جرأت ہو سکتی ہے.

سو یاد رکھیے امام بیہقیؒ کی روایت فنی نقطہ نظر سے متروک نہیں مؤکد ہے. عبادتِ حق کی خدمت میں گذارش ہے کہ وہ بیہقی کے الفاظ وقد مضیٰ ما یؤکده کو کبھی نہ بھولیں اور بیہقی کی اس روایت کو ہرگز نہ چھوڑیں.

امام بیہقی نے یہ حدیث اپنی کسی حدیث کی کتاب میں نہیں رسالہ "حیات الانبیاء" میں لکھی ہے

---

[۱] حیات الانبیاء للبیہقی ص۱۲

اور اس وقت ان کا مقصد اس رسالہ سے کرامیہ کا رد تھا۔ آپ کا اس رسالے میں اس حدیث کو لانا بتلاتا ہے کہ آپ کے ہاں اس حدیث میں مخالفین کے سامنے حجت بننے کی صلاحیت موجود تھی۔ آپ نے اسنادًا خود اس پہ جرح کی اور معنیً خود اسے قبول کیا ہے۔ اور کون ہے جو اس کا انکار کرے[1]

اہل سنت کے مختلف مسالک میں جو اختلاف ہے وہ فروع کا ہے اصول کا نہیں۔ کرامیہ اور معتزلہ شیعہ اور خوارج سے ہمارا اختلاف اصولی درجے کا ہے۔ فروعی اختلاف خطاء اور صواب کے درمیان دائر ہوتا ہے۔ مگر اصولی اختلاف میں ہمیشہ حق اور باطل کے فاصلے ہوتے ہیں۔

امام بیہقیؒ سے اگر ہم نے فروع میں کبھی اختلاف کیا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اصولی مسائل میں بھی ہم ان سے اختلاف کرنے لگیں۔ اصول اسلام میں سب صحابہؓ، سب ائمہ اور سب علماء ایک ہیں اور ہمارے یہ سب اسلاف اکابر اہل السنۃ والجماعۃ ہیں۔

ابو الشیخ کی سند تو امام بیہقی کی سند کے علاوہ ہے اور اس کے سب راوی سچے اور قابل اعتماد ہیں۔ محدثین نے اسے بالاتفاق جید مانا ہے۔ مگر افسوس کہ اس پہ ہمارے کرم فرما یہ بحث لے اُڑے جید ہی تو کہا ہے صحیح نہیں کہا۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے۔

جیّد اور صحیح میں فرق

امام ابن الصلاح (۶۴۳ھ) اصول حدیث کے مسلّم امام ہیں۔ مقدمہ ابن الصلاح اس فن میں آپ کا شاہکار ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ صحیح اور جید ایک ہی درجے میں ہیں۔ علامہ بلقینی اسے نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:-

---

[1] محدث ابن عبد البر (۴۶۳ھ) ایسے موقع پہ حدیث پہ صحت کا حکم لگاتے ہیں۔ قاضی شوکانی ان سے ایک بحث نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

ثم حکم ابن عبد البر مع ذلک بصحتہ لتلقی العلماء لہ بالقبول فردہ من حیث الاسناد وقبلہ من حیث المعنی۔ (نیل الاوطار جلد ا ص)

من ذٰلك يعلم ان الجودة يعبر بها عن الصحة۔[1]

ترجمہ: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کے صحیح ہونے کو جید ہونے سے بھی تعبیر کر دیا جاتا ہے۔

امام ترمذیؒ جس طرح مختلف احادیث پر حسن صحیح کا حکم لگاتے ہیں آپ نے اپنی سنن کے ابواب الطب میں ایک جگہ یہ تعبیر بھی اختیار کی ہے:۔

هٰذا حديث جيد غريب۔[2]

دعوئے غرابت اور اس کی وضاحت

حافظ ابن قیمؒ نے ابوالشیخ کی روایت کو غریب کہا ہے۔ اس سے بھی یہ ہمارے کرم فرما اس حدیث کو اس نظر سے دیکھتے ہیں جس سے ہمارے دور کا استعمار پرست غریبوں کو دیکھتا ہے۔ پھر غرابت کبھی سند میں ہوتی ہے کبھی متن میں۔ ہمارے یہ مہربان اس کی بھی کچھ وضاحت نہیں کرتے۔

اس حدیث کی اکثر روایات میں اُبلغته یابلّغته کے الفاظ ہیں۔ متن مشکوٰۃ اور اس کے حاشیہ میں بیہقی کی روایت میں نسخہ کے اختلاف کا نشان موجود ہے۔ لیکن ابوالشیخ کی روایت میں اعلمته (مجھے اس کا علم دیا جاتا ہے) کے الفاظ ہیں۔ ابلغته میں ملائکہ واسطہ بنتے ہیں اور اعلمته میں یہ ضروری نہیں۔

ہم عرض کرتے ہیں جب دوسری روایات میں ابلغته کے الفاظ موجود ہیں تو یہاں اعلمته کے الفاظ کو بھی اسی معنی میں لیا جائے گا اور یہ غرابت کوئی مضر نہیں۔ حدیث صحیح اور غریب میں تبائن نہیں۔ مشکوٰۃ تو ہر طالب علم کے پاس موجود ہوتی ہے۔ اس کا مقدمہ جو حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کا لکھا ہے ہی اُٹھا کر دیکھ لیں:۔

ان الغرابة لاتنافي الصحة۔ حدیث کا غریب ہونا اس کے صحیح ہونے کے منافی نہیں۔

---

[1] تدریب الراوی صہ [2] جامع ترمذی جلد ۱ صہ ۵۹

کیا صحیح بخاری میں آپ نے یہ الفاظ نہیں دیکھے :-

فرفع النبی صلی اللہ علیہ وسلم یدیہ وقال اللہ اکبر خربت خیبر... قال ابوعبد اللہ دع فرفع یدیہ فانی اخشی ان لا تکون محفوظا وان کان فیہ فرفع یدیہ فانہ غریب جدا۔[1]

حاصل کلام یہ ہے کہ محمد بن مروان سدی صغیر جو امام بیہقی کی سند کا راوی ہے۔ اس پر مشتمل سند کو کمزور تو کہا جا سکتا ہے موضوع نہیں اور ابوالشیخ کی سند تو بالاتفاق جید ہے۔ ماہنامہ تعلیم القرآن راولپنڈی ۱۹۶۷ء کی اکتوبر کی اشاعت میں ہے :-

اس حدیث کی جو سند سدی صغیر پر مشتمل ہے۔ اس کو بوجہ راوی مذکور کے کمزور کہا جائے گا اور جس سند میں یہ راوی نہیں وہ کمزور نہیں ہے...... ملا علی قاری الحنفی شرح مشکوٰۃ میں فرماتے ہیں۔ قال میرک نقلا عن الشیخ ورواہ ابو الشیخ ...... باسناد جید۔[2]

اہل سنت کا موقف تو ہم آپ کے سامنے پیش کر چکے ہیں۔ آپ کو کوئی جلیل القدر عالم اس کا مخالف نظر نہ آئے گا۔ ہاں کسی خطیب اور واعظ کی آواز اس کے خلاف سنائی دے تو ہمارے عوام کی بھی تو کچھ ذمہ داری ہے کہ وہ آواز اور خطابت کے دام میں نہ آئیں۔ محدث جلیل ملا علی قاری علیہ رحمۃ ربہ الباری فرماتے ہیں راہِ سنت کی مخالفت درست نہیں۔

وفیہ اشعار بان من خالف السنۃ وان کان فی الظاھر متیناً خطیباً مکرماً عند الناس فھو فی الحقیقۃ نجس اخس من الکلب۔[3]

ترجمہ۔ اور اس میں اس طرف رہنمائی ہے کہ جو شخص طریق اہل سنت کی مخالفت کرے گو ظاہراً وہ بڑا بنا ٹھنا اور کتنا بڑا خطیب کیوں نہ ہو اور اپنے لوگوں میں اس کا مقام بھی ہو، حقیقت میں وہ نجس ہے اور وہ کتے سے بھی زیادہ خسیس ہے۔

---

[1] صحیح بخاری جلد ۱ صفحہ ۵۱۴ [2] ماہنامہ تعلیم القرآن صفحہ ۴۸ [3] مرقات شرح مشکوٰۃ جلد ۲ صفحہ ۴

(ماخوذ از حیات الانبیاء صفحہ ۱۴۲)

یہ ابوالشیخ کی سند جید نہ بھی ہوتی تو اصولاً بیہقی کی کمزور سند بھی لائق اعتماد تھی، اس لیے کہ او پنچے درجے کے علماء (فقہاء کرام) جس بات کو بالاتفاق قبول کرلیں وہ دوسروں کے لیے حجت ہو جاتی ہے اور فقہاء کی قبولیت سے اس کا ضعف اُٹھ جاتا ہے۔

(۱) حافظ ابو بکر الجصاص الرازی (۳۷۰ھ) ایسی ہی ایک روایت پر لکھتے ہیں:-

ان الفقهاء قد تلقت هٰذا الحديث بالقبول وعملوا به فثبت حجته

بقبولهم له كقوله عليه السلام لا وصية لوارث۔[۱]

(۲) حافظ ابن عبد البر المالکی (۴۶۳ھ) بھی اس اصول پر ایک ضعیف حدیث کو معتمد ٹھہراتے ہیں۔ قاضی شوکانی (ھ) ایک بحث میں لکھتے ہیں:-

ثم حكم ابن عبد البر مع ذٰلك بصحته لتلقى العلماء له بالقبول۔[۲]

ترجمہ۔ اس ضعف کے باوجود علامہ ابن عبد البر نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ کیونکہ علما کی ایک جماعت اسے قبول کر چکی ہے۔

(۳) علامہ ابن عبد الہادی (۷۴۴ھ) حدیث من صلى عليّ عند قبری کو ضعیف کہتے ہیں (گو ہم ان سے اس بات پر متفق نہیں) لیکن وہ اس کے معنی سے بوجہ تلقی بالقبول پوری طرح متفق ہیں۔[۳] حدیث کی سند کا متکلم فیہ ہونا اور بات ہے اور خود حدیث کا غلط ہونا اور بات ہے۔ اگر ان دونوں میں تلازم ہوتا تو محدثین کے ہاں تلقی بالقبول سے کبھی کوئی حدیث اعتماد کا درجہ نہ پاتی ــــ تاہم یہاں ہمیں اس اصول کو سامنے لانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ کیونکہ یہ حدیث ایک دوسرے طریق میں (ابوالشیخ کے طریق سے) جید سند کے ساتھ موجود ہے۔ اور اس کے جید السند ہونے کا علمائے کبار کی ایک جماعت نے اقرار کیا ہے۔

---

[۱] احکام القرآن جلد ۲ صفحہ ۲۲۵ [۲] نیل الاوطار جلد ۱ صفحہ ۲۴ [۳] دیکھئے الصارم المنکی صفحہ ۱۰۳

المبحث السادس

ارشاد العوام لعرض الصلوۃ والسّلام

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں صلوٰۃ وسلام علی خیر الانام عرض کرنے کے لیے حاضری ہو اور مومن یہ سعادت پالے کہ اس کی آواز حضورؐ کی سماعت اکے شرف سے مشرف ہو جائے تو وہ اسے حضورؐ کی خدمت میں حاضری سمجھے۔ یہ تصور لے کر نہ آئے کہ وہ ایک میت کے لیے دُعا کرنے آیا ہے یہ صحیح ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پہ وفات آئی۔ آپ پر انک میت و انھم میتون کا وعدہ پُورا ہوا۔ لیکن اب آپ میت نہیں ہیں، بعد الوفات زندہ ہیں، اب اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں نے حضورؐ کی قبر کی زیارت کی اور یہ سمجھے کہ حضورؐ اس قبر میں میت ہیں تو امام مالکؒ کے نزدیک ایسا کہنا مکروہ تحریمی ہے۔ کیونکہ صورت حال یہ نہیں۔ حضورؐ اپنی قبر مبارک میں زندہ ہیں اور صلوٰۃ وسلام عرض کرنے والے کا صلوٰۃ وسلام خود سُنتے ہیں۔

ائمہ اربعہ میں فروع و احکام کے اختلافات تو ہیں۔ اصول و عقائد میں چاروں امام اہل السنۃ والجماعت میں سے ہیں اور ان میں کوئی اختلاف نہیں اور ان مجتہدین کا عقیدہ ہم مقلدین پر حجت ہے علامہ سمہودی حضرت امام مالکؒ کا فتوے نقل کرتے ہیں:۔

نقل عن الامام مالك انه كان يكره ان يقول رجل زرت قبر النبي صلى الله عليه وسلم قال ابن رشد من اتباعه ان الكراهة لغلبة الزيارة في الموتىٰ وهو صلى الله عليه وسلم احياه الله تعالىٰ بعد موته حياة تامة[1]

ترجمہ: حضرت امام مالک (۱۷۹ھ) سے منقول ہے آپ اسے مکروہ جانتے تھے کہ کوئی شخص کہے میں نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کی زیارت کی ہے

---

[1] وفاء الوفا جلد ۲ ص۴۱۳ مصر

ابن رشد مالکی کہتے ہیں یہ کراہت اس لیے ہے کہ زیارت کا لفظ عام طور پر موتٰی کے لیے استعمال ہوتا ہے اور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو تو اللہ تعالیٰ نے وفات کے بعد ایک کامل زندگی سے نواز رکھا ہے (ان کے لیے زیارت کا لفظ کیوں؟)

فقہاء احناف احتیاطاً اس مقام پر زیارۃ النبیؐ یا زیارۃ الرسول کا عنوان اختیار فرماتے ہیں یہ حاضری قبر پر حاضری نہیں، آپ کی خدمت میں حاضری ہے اور نہیں تو نورالایضاح جو عام دینی مدارس میں داخل نصاب ہے، اسی میں دیکھ لیجئے:۔

ینبغی لمن قصد زیارۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان یکثر من الصلوٰۃ علیہ فانہ یسمعہا[1]

ترجمہ: جو شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت چاہے اسے چاہیئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر کثرت سے درود پڑھے کیونکہ حضورؐ اسے سنتے ہیں۔

پھر جب آپ میت نہیں تو آپ کے روضۂ اطہر پر حاضری آپ کی خدمت میں حاضری ہے۔ حضورؐ کی خدمت میں بایں تصور جانا کہ حضورؐ میرے لیے اللہ رب العزّت سے مغفرت کی دُعا کریں بالکل جائز ہے۔ حضورؐ کی اس دُنیا کی زندگی میں آپ کی خدمت میں حاضری کا ایک موضوع یہ بھی تھا:۔

ولو انہم اذ ظلموا انفسہم جاءوک فاستغفروا اللہ واستغفر لہم الرّسول لوجدوا اللہ توابا رحیما (پ۵ النساء ع ۹ آیت ۶۴)

ترجمہ: اور جب یہ اپنی جانوں پر ظلم کریں تو آپ کے پاس آئیں اور اللہ سے استغفار کریں اور اللہ کے رسول بھی ان کے لیے استغفار چاہیں تو وہ اللہ تعالیٰ کو بہت توبہ قبول کرنیوالا بہت مہربان پائیں گے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں:۔

جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لیے آیا وہ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمسائیگی میں ہے۔ یہ اسی صورت میں متصور ہے کہ وہ حضورؐ کو روضۂ انور میں حیات سمجھے۔[2]

---

[1] نورالایضاح صـ۱۸۸ الطحطاوی صـ۴۰۵ [2] جذب القلوب صـ۱۸۱ فارسی

محدث کبیر حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ لکھتے ہیں :۔

فثبت ان حکم الآیۃ باق بعد وفاتہ صلی اللہ علیہ وسلم[1]

ترجمہ: ثابت ہوا کہ اس آیت کا حکم حضورؐ کی وفات کے بعد بھی باقی ہے۔

حضورؐ کی قبر مبارک پر حاضری کی تمنا کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔ بحر العلوم عبد العلی یہ دعا بدیں الفاظ لکھتے ہیں :۔

وارزقنی من زیارۃ رسولک صلی اللہ علیہ وسلم[2]

ترجمہ: اور مجھے اپنے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب فرما۔

سو جب یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری ہے تو وہاں صلوٰۃ وسلام عرض کرنے کے ساتھ حسب آیت کریمہ واستغفر لھم الرسول استغفار کی گذارش بھی بلا تردد جائز ہوگی اور شفاعت کے لیے عرض کسی طرح بے جا نہ ہوگی۔

قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ لکھتے ہیں :۔

فقہاء نے بعد سلام کے وقت زیارت قبر مبارک کے شفاعت پیغمبر کا عرض کرنا لکھا ہے۔ پس یہ جواز کے لیے کافی ہے۔[3]

محقق علی الاطلاق حافظ ابن ہمام (۸۶۱ھ) نے قبر اطہر پر حاضری کے لیے آداب بتائے ہیں۔ کہ یہ قبر پہ حاضری نہ رہے اس میں حضورؐ کی خدمت میں حاضری کی جھلک آجائے۔ اس صورت میں قبر کی زیارت کے الفاظ موجب کراہت نہ رہیں گے۔ کیونکہ حکم کی علت جاتی رہی۔ آپ لکھتے ہیں کہ تیرا چہرہ قبر کی طرف رہے اور تو کہے السلام علیک ایھا النبی ورحمۃ اللہ وبرکاتہ —— اور یہ اس تصور کے ساتھ کہ حضورؐ قبر شریف میں اپنی دائیں کروٹ پر لیٹے ہوئے ہیں —— اور آپ پر کثرت سے درود شریف پڑھے اور یہاں تک کہ توبہ کرے اور آنسو نکل آئیں :۔

ویجتھد فی خروج الدمع فانہ من امارات القبول وینبغی ان یتصدق بشیٔ

---

[1] اعلاء السنن جلد ۱ صفحہ ۳۳۰ قدیم [2] رسائل الارکان صفحہ ۳۸۰ [3] فتاویٰ رشیدیہ جلد ۱ صفحہ ۱

علی جیران النبی صلی اللہ علیہ وسلم ثم ینصرف متباکیا متحسرا علی الفراق الحضرۃ النبویۃ والقرب منہا ثم یسأل النبی صلی اللہ علیہ وسلم الشفاعۃ یقول یارسول اللہ اسألک الشفاعۃ یارسول اللہ اسألک الشفاعۃ واتوسل بک الی اللہ ان اموت مسلماً علی ملتک وسنتک ویذکر کل ماکان من قبیل استعطاف۔[1]

ترجمہ۔ اور وہ آنسو لانے میں جہد کرے یہ آنسو دعا کی قبولیت کے آثار ہیں اور یہ بھی چاہیے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمسایوں پر کچھ صدقہ کرے ـــــ پھر وہ روتا ہوا وہاں سے رخصت ہو۔ دربار نبوت کی جدائی اس پہ گراں اور اس کا قرب اس کا تقاضا ہو پھر وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یوں شفاعت کی درخواست کرے۔ اے اللہ کے رسول: میں آپ سے شفاعت کا طلب گار ہوں اور میں آپ کا وسیلہ اللہ تعالیٰ کے حضور لاتا ہوں کہ میں آپ کے دین پر اور آپ کی سنت پر مسلمان رہتے مروں اور ہر وہ بات یاد کرے جس سے نرمی اور نیازمندی میں اضافہ ہوتا ہو۔

امام ابن ہمام نے اس سے پہلے سیدنا عبداللہ بن عمرؓ (۲، م) کی یہ حدیث نقل کی ہے۔

روی ابو حنیفہؒ فی مسندہ عن ابن عمرؓ قال من السنۃ ان تأتی قبر النبی صلی اللہ علیہ وسلم من قبل القبلۃ وتجعل ظہرک الی القبلۃ وتستقبل القبر بوجہک ثم تقول السلام علیک ایہا النبی ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔[2]

ترجمہ۔ امام ابو حنیفہؒ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں سنت یہی چلی آ رہی ہے کہ تم حضورؐ کی قبر مبارک پر قبلہ کی طرف سے آؤ۔ تمہاری پشت قبلہ کی طرف رہے اور قبر مبارک سامنے ہو اور پھر وہاں سلام عرض کرو۔

سو امام ابن ہمامؒ کا مذکور فتوےٰ بلا اصل نہیں ہے۔ اسے ایک جلیل القدر صحابیؓ کی سند حاصل ہے۔

---

[1] فتح القدیر جلد ۲ صـ ۳۳۷ [2] ایضاً صـ ۳۳۶

قبر مبارک پر حاضری کے بعد اور اس طلب شفاعت کے وقت یہ نہ سمجھئے کہ یہ غائبانہ پکار ہے اسے غائبانہ پکار کہا جائے تو یہ شرک ہوگا. یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری ہے. یہ اس لیے ہے کہ روضۂ انور پہ عرض کی گئی بات حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود سنتے ہیں ماہنامہ تعلیم القرآن راولپنڈی کی ستمبر ۱۹۵۹ء کی اشاعت میں ہے :۔

عند القبر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا سماع بلاشبہ ثابت ہے خصوصاً سید الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مقام بہت بلند ہے اور آپ کے سماع میں تو کچھ شبہ ہی نہیں.

اللّٰھم صل وسلم علیہ الصلوٰۃ والسلام دائمین.

ھذا واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ اتم.

(مولانا) عبد الرشید مفتی دار العلوم تعلیم القرآن راولپنڈی
۲۷ صفر ۱۳۷۹ھ

الجواب الصحیح
لاشیٔ (مولانا) غلام اللہ خاں

مہر دار الافتاء

حضورؐ کی خدمت میں سلام عرض کرنے کے کلمات

امتی جس ادا سے اور جن الفاظ عقیدت سے سلام عرض کرے جائز ہے. بشرطیکہ اس میں کوئی بات پیرایۂ شریعت کے خلاف نہ ہو. لیکن جو کلمات علمائے محققین نے لکھ دیئے ان سے سلام کہے تو بہتر ہے. حافظ ابن ہمام الاسکندری نے یہ چھ سلام لکھے ہیں :۔

① السلام علیك یا رسول اللہ ② السلام علیك یا خیر خلق اللہ.

③ السلام علیك یا خیرۃ اللہ من جمیع خلقہ ④ السلام علیك یا حبیب اللہ.

⑤ السلام علیك یا سید ولد آدم. ⑥ السلام علیك ایھا النبی ورحمۃ اللہ وبرکاتہ.

پھر امتی اپنے عقیدہ توحید و رسالت کا اقرار اور حضورؐ کے احسانات کا بایں طور اعتراف کرے اور پھر اللہ تعالیٰ سے آپ کے حق میں دعا کرے:۔

یارسول اللہ انی اشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ ——— وانک عبدہ ورسولہ ——— واشھد انک یارسول اللہ قد بلغت الرسالۃ وادیت الامانۃ ونصحت الامۃ وکشفت الغمۃ فجزاک اللہ عنا خیرا جازاک اللہ عنا افضل ماجازیٰ نبیاً عن امتہ۔

اللّٰھم اعط سیدنا عبدک ورسولک محمدًا الوسیلۃ والفضیلۃ والدرجۃ العالیۃ الرفیعۃ وابعثہ المقام المحمود الذی وعدتہ وانزلہ المنزل المقرب عندک انک سبحانک ذوالفضل العظیم۔

اس کے بعد اپنے لیے رقت کے پیرایہ میں اور چھلکتے آنسوؤں سے شفاعت کی درخواست کرے اور اپنے اندر ایسی کیفیت پیدا کرے کہ حضورؐ یہ امتی اب آپ کے بغیر کس منہ سے اللہ کے حضور حاضر ہو، آپ اس دن میری شفاعت فرمائیں جس دن شفاعت کبریٰ کے مقام پہ آپ کے سوا کوئی نہ آسکے گا۔

امتی پھر ان دوستوں کی طرف سے بھی سلام عرض کرے جنہوں نے قبر اطہر میں سلام عرض کرنے کے لیے کہا تھا اور خالی جگہ میں اس کا نام مع ولدیت کے ذکر کرے۔

السلام علیک یارسول اللہ من ——— بن ———

گنبدِ خضریٰ کے سب مکینوں پر سلام ہو؟

حافظ ابن ہمام (۸۶۱ ھ) لکھتے ہیں کہ اب شیخین کریمین سیدنا ابوبکرؓ اور سیدنا حضرت عمرؓ پر بھی سلام عرض کرے۔ یہ حضرات گو انبیاء میں سے نہیں کہ ان کا قبر پہ سننا قطعی ہو، لیکن بایں سبب

کہ حضورؐ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کا خمیر ایک مٹی سے ہوا۔ کمارواہ الخطیب۔ اس لیے یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ یہ حضرات بھی گنبد خضرے پر عرض گئے سلام کو سنتے ہیں۔ اور مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہاں حاضری پر ان بزرگوں پر بھی سلام عرض کریں۔ ابن ہمام لکھتے ہیں:۔

یہاں تک کہ ان دونوں حضرات کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور واسطہ بنانا بھی درست ہے اور ان کا سلام بھی عرض کرسکتا ہے۔[1]

فتاویٰ عالمگیری میں ہے:۔

ویبلغه سلام من اوصاه فیقول السلام علیك یارسول الله من فلان ابن فلان یستشفع بك الی ربك فاشفع له ولجمیع المسلمین[2]

ترجمہ۔ اور زائر حضورؐ کو اس کا سلام پہنچائے جس نے اس زائر کو اس کے لیے کہا ہو اور اسے اس طرح عرض کرے حضورؐ فلاں بیٹا فلاں کا سلام عرض کرتا ہے اور آپ سے شفاعت کے لیے عرض کرتا ہے۔

انبیاء تو بالاتفاق سنتے ہیں لیکن اوروں کے بعد الوفات اپنی قبروں پر سننے کی بات اس طرح قطعی نہیں ہے۔ اس اختلاف میں ہم ان حضرات کے ساتھ ہیں جو کاملین اور شہداء و صالحین کو نبوت کے سائے میں جگہ دیتے ہیں اور جو دوست اس سے متفق نہیں، انہیں یہ کہنے کا حق نہیں کہ ان کے عدم سماع کا قول اسلام میں قطعی یا یقینی درجہ رکھتا ہے۔ اگر یہ بات اس طرح ہوتی تو یہ مسئلہ کبھی اختلافی نہ ہوتا۔ حالانکہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ لکھتے ہیں:۔

قبر کے پاس جاکر کہے کہ اے فلاں تم میرے واسطے دعا کرو کہ حق تعالیٰ میرا کام کردے اس میں اختلاف علماء کا ہے مجوز سماع موتیٰ اس کے مقر ہیں اور مانعین سماع منع کرتے ہیں سو اس کا فیصلہ اب کرنا محال ہے مگر انبیاء علیہم السلام کے سماع میں کسی کو اختلاف نہیں اسی وجہ سے ان کو مستثنیٰ کیا ہے اور دلیل جواز یہ ہے کہ فقہاء نے بعد سلام کے وقت زیارت قبر کے شفاعت مغفرت کا لکھا ہے پس یہ جواز کے لیے کافی ہے۔[3]

---

[1] اقسام حج جلد ا صـ ۲۸۲ [2] فتاویٰ عالمگیری جلد ا صـ ۲۸۲ [3] فتاوےٰ رشیدیہ جلد ا صـ ۱۰۰

ہمارے دور کے گرامی حضرات نے اپنے اس موقف کو قطعیت دینے کے لیے اس پر قرآن کریم کی اس آیت کا معارضہ ڈالا ہے. وہ کہتے ہیں کہ یہ مرحومین نہیں سنتے اور قبر پر صلوٰۃ وسلام سنے جانے کی روایات قطعی طور پر قرآن کے خلاف ہیں، نامناسب نہ ہوگا کہ چلتے ہوئے ہم اس معارضے کو بھی اُٹھاتے جائیں.

ان تدعوھم لا یسمعوا دعاءکم ولو سمعوا ما استجابوا لکم ویوم القیٰمة یکفرون بشرککم ولا ینبئك مثل خبیر ○ (پ ۲۲، فاطر ع ۲ آیت ۱۴)

ترجمہ. اگر تم ان کو پکارو، نہیں سنیں گے تمہاری پکار اور اگر سن بھی لیں تو نہ پہنچیں تمہارے کام پر اور قیامت کے دن وہ منکر ہوں گے تمہارے شریک ٹھہرانے سے اور کوئی نہ بتلائے تجھے جیسے ذات خبیر تجھے بتلا رہی ہے.

ومن اضل ممّن یدعوا من دون اللہ من لا یستجیب لہ الیٰ یوم القیٰمة وھم عن دعاءھم غافلون ○ (پ ۲۶، الاحقاف آیت ۴)

ترجمہ. اور اس سے زیادہ گمراہ کون ہے جو پکارے اللہ کے سوا کسی ایسے کو جو نہ پہنچ سکے اس کی پکار کو قیامت کے دن تک اور انہیں ان کے پکارنے کی بھی خبر نہیں.

(۱) ـــــ ان دونوں آیتوں میں کہیں پاس سے سننے کی نفی نہیں ـــــ دونوں جگہ پکار سننے کی نفی ہے، پکار کسے کہتے ہیں دور سے بلانے کو ـــــ دور سے تو پیغمبروں پر بھی صلوٰۃ وسلام عرض کریں تو اسے فرشتے پہنچاتے ہیں وہ خود نہیں سنتے ـــــ سو ان آیتوں سے حضور کی قبر مبارک پر عرض کئے گئے صلوٰۃ وسلام کو نہ سنے جانے کے معرض میں لانا اور ان کے اسے سننے کی نفی کرنا کس قدر درست ہو سکتا ہے. یہ بات کسی پڑھے لکھے سے مخفی نہیں رہ سکتی. اہل علم کے ہاں اس کا کچھ وزن نہیں. جاہلوں میں بیٹھ کر کسی خطیب کا ان آیتوں کو جھوم جھوم کر پڑھنا اور اُسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سماع عند القبر کی نفی پر دلیل لانا امر دیگر ہے. ولیست باوّل قارورۃ کسرت فی الاسلام فلیبك علی الاسلام من کان باکیا.

(۲) ——— پھر ان تدعوھم سے براہِ راست انبیاء و شہداء مراد لینا اور یہ کہ وہ کہیں بھی سنتے نہیں کیا یہی ان آیات کا موضوع ہے یا مفسرین حضرات نے ان میں جمادات کو بھی داخل کیا ہے جن میں روح کبھی آئی ہی نہیں اگر ایسا ہے تو ان کا مصداق صرف انبیاء، و اولیاء اور شہداء کو ٹھہرانا سلف صالحین کا کیا یہی طریق تھا۔ اس پر بھی کچھ غور فرمالیں۔

کیا تفسیر مدارک جلد ۴ صہ ۱۴۱ پر ان میں بتوں کا ذکر نہیں؟ کیا تفسیر ابن کثیر جلد ۳ صہ ۱۵۵ میں یہ نہیں لکھا۔ لانھا جمادات لا ارواح لھا۔ کیا روح المعانی میں ان آیات کے تحت اصنام کا تذکرہ نہیں؟ قاضی شوکانی کو لیجئے لکونھا جمادات۔ تفسیر فتح القدیر جلد ۴ صہ ۳۴۲ کیا آپ کے سامنے نہیں۔

مفسر حقانی نے لکھا ہے:-

اگر تم اُن کو پکارو، وہ تمہارا پکارنا نہیں سُنتے۔ کس لیے کہ جمادات بے حس و حرکت ہیں۔

گرامی ان آیات میں یہ معنی اس لیے بیان نہیں کرتے کہ اس سے لا یسمعوا دعاءکم کی بتوں پر دلالت انہیں اس مغالطہ دہی میں کامیاب نہ ہونے دے گی کہ حضورؐ اپنے روضہ پہ عرض کیے گئے صلوٰۃ و سلام کو نہیں سُنتے۔

(۳) ——— پھر غافلون کا یہ معنی کرنا کہ "انہیں پتہ ہی نہیں ان کی پکار کا"، کیا صحیح ترجمہ ہے۔ یا مراد یہ ہے کہ انہیں دھیان نہیں، خبر نہیں۔ قرآن کریم کی اس آیت میں غفلت کے معنی کیا ہیں؟

لقد کنت فی غفلۃ من ھذا فکشفنا عنک غطاءک فبصرک الیوم حدید

(پ ۲۶ ، ق ع ۲)

ترجمہ۔ تو بے خبر رہا اس دن سے سو ہم نے اُٹھا دیا تیرا پردہ۔ سو آج تیری نگاہ بہت تیز ہے۔

لہ تفسیر حقانی جلد ۶ صہ ۱۲۸

تیری آنکھوں کے سامنے شہوات و خواہشات کا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ پیغمبر جو سمجھاتے تھے تجھے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ آج ہم نے تیری آنکھ سے وہ پردے ہٹا دیئے[1]

سو یہاں غفلت کا معنی یہ نہیں کہ پتہ ہی نہ ہو۔ یہاں نفی دھیان اور توجہ کی ہے۔ دھیان کی نفی اور شعور کی نفی اس سے ہوتی ہے جو فی الواقع زندہ ہو مگر ادھر دھیان نہ ہو۔

اللہ کے سوا تم جن کو پکارتے رہے ہو وہ مورد موت ہیں یا اصلاً بے جان ہیں، جن میں حیات کبھی آئی ہی نہیں اور انہیں خبر تک نہیں کہ کب اٹھائے جائیں گے وما یشعرون ایان یبعثون۔

وھم عن دعائھم غافلون سے کیا یہ نہیں سمجھا جا سکتا کہ انہیں کوئی اس طرح دھیان نہیں اسے نہ سننے کی دلیل بنانا اور اسے اس پر قطعی الدلالۃ ٹھہرانا معلوم نہیں کون سی شانِ علم ہے۔ کفار سنتے تو تھے دھیان نہیں دیتے تھے۔ اسی پر انہیں کہا گیا۔ لقد کنت فی غفلۃٍ من ھٰذا۔

افسوس کرامی حضرات وھم عن دعائھم غافلون کا ترجمہ کرتے۔ اس آیت لقد کنت فی غفلۃ من ھٰذا کو یکسر بھول جاتے ہیں۔

یاد رکھیئے آیات کے عمومات سے دعویٰ ابطال احادیث یہ طریقہ کبھی بھی اہلِ حق کا نہیں رہا۔ سب سے پہلے معتزلہ آئے جنہوں نے یہ ہتھیار اٹھایا اور آج ان کی شاخ کرامیہ اسی راہ سے حدیث کا مذاق اڑا رہی ہے۔

ہم بصمیم قلب یقین رکھتے ہیں کہ حضورؐ روضہ پر عرض کیے گئے صلوٰۃ وسلام کو خود سنتے ہیں اور دور سے پڑھا آپ کو پہنچایا جاتا ہے اور کرامی حضرات آپ کے نفی سماع پر جو آیات پیش کرتے ہیں ان آیات میں انبیاء کرام کے عند القبر سماع کی ہرگز نفی نہیں ہے۔ ہاں یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ وہ وہی کچھ سنتے ہیں جو اللہ چاہے اور وہی کچھ کر سکتے ہیں جو اللہ چاہے اور آپ پر عرض صلوٰۃ وسلام کرنے والے اسی عقیدے سے آپ پر صلوٰۃ وسلام عرض کرتے ہیں۔ ہماری آواز آپ کی سماعت

---

[1] تفسیر عثمانی ص ۶۷۳

سے مشرف ہو اس سے بڑھ کر ہم کس سعادت کی تلاش میں ہیں؟

مولانا حسین علی مرحوم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سماع عند القبر کے ہرگز منکر نہ تھے۔ آپ کے خلیفہ اعظم حضرت مولانا نصیر الدین غور غشتوی اپنے ایک خط میں جو ماہنامہ تعلیم القرآن راولپنڈی ستمبر ۱۹۶۰ء میں چھپا ہے لکھتے ہیں :

میں اور مولانا غلام اللہ خاں عقیدہ میں متفق ہیں۔ میں بھی نبی علیہ السلام کی وفات کے بعد برزخی حیات کا قائل ہوں اور وہ بھی برزخی حیات کے قائل ہیں۔ میں یہ کہتا ہوں کہ روضہ پاک کے قریب میں جب درود جہراً پڑھا جائے تو نبیؐ سنتے ہیں اور جواب دیتے ہیں اور جناب مولانا غلام اللہ خاں صاحب نے بھی اپنے ماہنامہ تعلیم القرآن میں یہ لکھا ہے میرا بھی یہ اعتقاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی چیز ذات اور صفات میں شریک نہیں اور اُن کا بھی یہی عقیدہ ہے کہ ہر شخص کی ندا کو ہر وقت سننا اور ہر جگہ سے ...... الخ[1]

مولانا عبد الرحمٰن جامی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ پہ حاضری دیتے تو درود و سلام کے علاوہ بھی کئی باتیں رقت میں کہہ گزرتے اور جواب بھی سُنتے۔ بوقتِ واپسی عرض کرتے :

خواجہ بسفرے روم چہ فرمائی

" آقا میں اب چلتا ہوں، کیا اجازت ہے " جواب ملتا۔

بسلامت روے و باز آئی

" سلامتی سے جائیں اور پھر یہاں آئیں "

ایک سال صرف یہ جواب ملا " بسلامت روی " پھر آنے کی بات نہ آئی اور واقعات نے بتایا کہ یہ آخری حاضری تھی۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ صرف درود و سلام ہی نہیں سنتے نعت بھی سُن لیتے ہیں اور عرضداشت بھی۔ اور یہ سب سننا اور سُنوانا اللہ رب العزت کے دستِ قدرت میں ہے۔

مولانا عبدالرحمن جامیؒ کی بات اگر آپ کو پسند نہیں تو صحابیِ رسول حضرت بلال بن الحارثؓ (۶۰ھ) کا واقعہ تو آپ سے مخفی نہ ہوگا۔ آپ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک پر حاضری دیتے ہوئے آپ سے بارش ہونے کے لیے دعا کرنے کو کہا۔ انہوں نے بھی روضۂ اطہر پر حضور اکرم کو یا رسول اللہ کہہ کر خطاب کیا۔

یا رسول اللہ استسق لامتک فانہم ھلکوا۔[1]

ترجمہ۔ یا رسول اللہ! آپ اپنی امت کے لیے بارش کی دعا فرمائیں وہ ہلاک ہو رہے ہیں۔

پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس صحابی کو خواب میں ملے اور بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں بارش کی دعا قبول کر لی ہے۔ یہ واقعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت کا ہے۔ ابن خلدون کہتے ہیں ۱۸ھ کا ہے۔ آپ نے حضرت بلال بن الحارثؓ کو یہ بھی فرمایا۔

ائت عمر فاقرأہ السلام واخبرہ انہم مسقون۔[2]

ترجمہ۔ آپ عمر کے پاس جائیں اور اسے میرا سلام کہیں اور بتائیں کہ لوگ بارش سے سیراب ہوں گے۔

معلوم ہوا صحابہؓ روضۂ انور پر صرف صلوٰۃ و سلام ہی نہیں کہتے تھے۔ کوئی اور عرضداشت (بارش طلبی ہو یا شفاعت طلبی) پیش کرنا ممنوع نہیں جانتے تھے اور خطاب کے پیرایہ میں آپ پر سلام پڑھتے تھے۔

تحقیق حدیث حضرت بلال بن الحارثؓ

یہ حدیث جو حضرت مولانا حسین علی مرحوم نے پیش کی ہے۔ حضرت امام بیہقیؒ (۴۵۸ھ) نے دلائل النبوت میں نقل کی ہے اور اسے ابن ابی شیبہ (۲۳۵ھ) نے بھی روایت کیا ہے۔

ابن ابی شیبہ نے یہ روایت ابو معاویہ محمد بن خازم سے لی ہے اور یہ مرچی سند ہے جو

---

[1] تحریرات حدیث حضرت مولانا حسین علی مرحوم صفحہ ۲۵۵ [2] وفاء الوفاء للسمہودی جلد ۲ ص ۴۴۱

حدیث من صلی علی عند قبری سمعته کی بطریق ابی الشیخ ہم پیش کر آئے ہیں۔

ابو معاویہ محمد بن الخازم (۱۹۸ھ) اعمش (۱۴۸ھ) ابو صالح ذکوان السمان

اُس حدیث کو ابو صالح حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کرتا ہے اور اس حدیث کو حضرت مالک الدار سے نقل کرتا ہے۔ حضرت مالک الدار کو علامہ ذہبی صحابہ میں شمار کرتے ہیں اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آپ نے حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ اور حضرت بلال بن الحارثؓ کا دور پایا ہے۔ سو یہ سند متصل ہے اور اس کی جملہ راوی ثقہ اور قابلِ اعتماد ہیں۔

ابن جریر الطبری (۳۱۰ھ) نے تاریخ الملوک والامم جلد ۴ صفحہ ۹۸ میں اسے نقل کیا ہے۔ پھر امام بیہقی (۴۵۸ھ) نے اسے سند صحیح سے روایت کیا ہے۔ پھر علامہ ابن اثیر جزری (۶۳۰ھ) نے اپنی تاریخ میں الکامل جلد ۲ صفحہ ۵۵۶ میں اس کی تصدیق کی ہے۔ آیئے اب آپ کو آٹھویں صدی میں لے چلیں علامہ سبکی نے شفاء السقام صفحہ ۱۳۰ میں اس کی شہادت دی ہے۔ پھر حافظ ابن کثیر (۷۷۴ھ) نے امام بیہقی کی روایت البدایہ میں پوری سند سے نقل کی ہے اور لکھا ہے۔ ھذا اسناد صحیح[1]

ابن ابی شیبہ کی سند کی حافظ ابن حجر عسقلانی (۸۵۲ھ) پوری تصدیق کرتے ہیں۔

رواہ ابن ابی شیبۃ باسناد صحیح من روایۃ ابی صالح السمان[2]

پھر علامہ سمہودی (۹۱۱ھ) نے وفاء الوفاء میں اس واقعہ کی تصدیق کی ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے جلد ۲ صفحہ ۴۱۰

روضہ انور پر سلام بہ پیرایہ خطاب

سیدنا عبداللہ بن عمرؓ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ پہ حاضری دیتے تو یوں سلام عرض کرتے۔

السلام علیک یارسول اللہ[3]

اور شیخین کریمینؓ پہ بھی یوں سلام پڑھتے۔

السلام علیک یا ابا بکر السلام علیک یا ابتاہ

---

[1] البدایہ والنہایہ جلد ۷ صفحہ ۹۲ [2] فتح الباری جلد ۲ صفحہ ۱۴۹۵ [3] المصنف لعبد الرزاق جلد ۳ صفحہ ۵۷۶ المصنف لابن ابی شیبہ صفحہ ۱۳۸

الباب الثانی وفیہ خمسۃ فصول

الفصل الاوّل

مسلکِ خلفائے راشدینؓ

شانِ ورودِ خطبۂ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

حضور پیغمبر خاتم کی احادیث شریفہ روضۂ منورہ کی حیاتِ جسمانی کے بیان میں یکے بعد دیگرے آپ کے سامنے آچکیں، اب اس باب میں افضل البشر بعد الانبیاء سیدنا حضرت صدیق اکبرؓ کا فیصلہ بھی ملاحظہ ہو۔ وفات النبیؐ کا سب سے پہلا اعلان بھی حضرت صدیق اکبرؓ ہی کی زبان فیض ترجمان سے صادر ہوا تھا۔ اب اس کے بعد کی حیات النبیؐ کا فیصلہ بھی اسی خطبۂ صدیقی میں ملاحظہ کیجیے۔ ان سے بڑھ کر اور کون فطرتِ نبوت کا نبض شناس ہو سکتا ہے۔ پہلے شانِ ورود دیکھیے:-

نزولِ وحی کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کچھ ایسی کیفیات وارد ہوتی تھیں کہ اس دُنیا کے احساسات کچھ وقت کے لیے منقطع ہو جاتے تھے اور قلبِ منوّر پوری طرح عالم بالا کی طرف متوجہ ہو جاتا تھا۔ ان انکشافات میں بظاہر غشی وغیرہ کا گمان ہونے لگتا اور اتمامِ وحی کے بعد آپ پھر اس کیفیت ملکی سے کیفیتِ بشری کی طرف منتقل ہو جاتے۔ جب روح الامین آپ کے قلبِ مبارک پر نزول فرماتے تو ایسی کیفیات اکثر وارد ہوتی تھیں۔

آنحضرتؐ پر جب اذاقتِ موت کا وعدۂ الٰہیہ پورا ہوا تو بعض صحابہؓ نے اس ورودِ وفات کو

مذکورہ سابقہ غشی خیال کیا اور گمان کیا کہ ابھی کارِ نبوت کے کچھ اہم امور باقی ہیں، آپ انہیں سرانجام دینے کے بعد ہی اس دُنیا سے انتقال فرمائیں گے۔ بنابریں انہوں نے نہایت سختی سے کہا کہ کوئی آپ پہ وفاتِ شریفہ کے وارد ہونے کی بات نہ کرے۔[1]

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ:-

(۱) —— کیا وہ لوگ انتہائے غم میں جذبات سے مغلوب ہو کر ایسے خیالات قائم کر رہے تھے؟ یا

(۲) —— ان کا اعتقاد ہی یہ تھا کہ حضور پہ وُرودِ موت کبھی نہ ہوگا؟ اور یا

(۳) —— انہیں وُرودِ موت کی پہچان نہ تھی، کیفیت وُرودِ موت اور آثارِ موت کا کوئی تجربہ نہ رکھتے تھے؟ یا

(۴) —— اس انکارِ موت کا منشاء و مبنیٰ کچھ اور تھا؟

جب ہم حضرت فاروق اعظمؓ جیسے ذکی الطبع، سلیم الحس اور بیدار مغز انسان کو بھی اسی صف میں کھڑا دیکھتے ہیں، تو پھر ہمیں اور زیادہ غور و فکر سے سوچنا پڑتا ہے کہ آخر اس انکارِ موت کا سبب کیا تھا؟

جہاں تک پہلے احتمال کا تعلق ہے کہ شاید وہ لوگ انتہائے غم میں جذبات سے مغلوب ہو کر ایسے خیالات قائم کر رہے تھے۔ یہ ہرگز صحیح نہیں۔ اگر غلبۂ محبت ہی اس کا باعث تھا تو حضرت سیدہ فاطمۃ الزہراؓ اور ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سب سے پہلے ان جذبات کی رو میں بہ جاتیں۔ پھر حضرت فاروق اعظمؓ جیسے مدبر اور نکتہ شناس سے بالکل مغلوب الحال ہو جانے کی توقع بھی کیسے ہو سکتی ہے۔ نیز ان کا استدلالی پہلو کہ ابھی کارِ نبوت کے کچھ اہم امور باقی ہیں، خود اس بات کا پتہ دے رہا ہے کہ اُن کے حواس میں اختلال ہرگز نہ تھا۔ ورنہ یہاں وہ کوئی اجتہاد کرتے نظر نہ آتے۔ خود

---

[1] ما مات رسول الله صلى الله عليه وسلم ولا يموت حتى يقتل المنافقين (ابن ابي شيبة كما في القسطلاني) فليقطعن ايدى رجال وارجلهم (بخاری جلد ۱ صفحہ ۵۱۷)

فرماتے ہیں:۔

واللہ ان کنت اظن انہ صلی اللہ علیہ وسلم سیبقی فی امتہ حتی یشہد علیہ باٰخر اعمالہا وانہ ھو الذی حملنی علی ان قلت ما قلت ۔

رواہ البیہقی وراجع لہ تفسیر "وکذٰلک جعلناکم امۃ وسطا"

اگر دوسرے احتمال کو جگہ دیجئے کہ شاید ان کے اعتقاد میں حضورؐ پر ورودِ موت کبھی ہونا ہی نہ تھا، یعنی وہ حیات بلا وفات کے قائل تھے تو یہ بھی صحیح نہیں، اس لیے کہ اس انکارِ وفات کی جو وجہ حضرت فاروق اعظمؓ سے منقول ہے وہ خود اس کی تردید کرتی ہے

ثانیاً حضرت فاروق اعظمؓ خود حافظِ قرآن تھے۔ انک میت وانہم میتون افان مات او قتل وغیرھما من الآیات ان سے مخفی نہ تھیں۔ پورے قرآن کی تلاوت ان کے شب و روز کا وظیفہ تھا۔ ان کا علم و فہم بھی کچھ مشتبہ نہ تھا۔ ان کا اعتقاد یہ تھا کہ آپ پر یقیناً لذتِ موت کا وعدۂ الٰہیہ پورا ہوگا۔ حضرت امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ارشاد فرماتے ہیں:۔

باید دانست کہ قصہ دلالت می کند برآں کہ فاروقؓ می دانست کہ موت برآں حضرت شدنی است۔ پس مخالفِ آیت انک میت وانہم میتون اعتقاد نہ کردہ بود۔ لیکن گمان می کرد کہ آنچہ واقع شدہ است موت نیست۔ بلکہ تعطیل حواس ظاہر است۔[1]

ترجمہ معلوم ہونا چاہیئے کہ حضرت فاروق اعظمؓ یہ جانتے تھے کہ ورودِ موت آنحضرت پر ہونا ہی ہے۔ پس ان کا اعتقاد آیت انک میت الخ کے خلاف ہرگز نہ تھا لیکن وہ خیال کر رہے تھے کہ یہ صورت پیش افتادہ موت نہیں، بلکہ صرف آثارِ حیات روک لیے گئے ہیں، یعنی جو کچھ واقع ہوا تھا اسے وہ موت قرار نہیں دیتے تھے۔

اگر تیسرا احتمال سامنے رکھیئے کہ انہیں ورودِ موت کی پہچان نہ تھی، تو یہ بھی قرینِ قیاس

---

[1] قرۃ العینین ص۴۲ مطبوعہ دہلی

نہیں ——— ماحولِ عرب سے کچھ کم آشنا نہ تھے۔ ہزاروں انسانوں کو انہوں نے مرتے دیکھا تھا، موت کی کیفیات بھی کچھ اُن سے مخفی نہ تھیں اور ایسے مواقع کی نزاکت کا بھی انہیں کوئی کم تجربہ نہ تھا۔

پھر آخر ان کا وقوعِ موت سے انکار کیوں تھا؟ اس کا سبب اور منشار کیا ہے ———؟

حقیقت الامر

بات دراصل یہ تھی کہ جس طرح نزولِ وحی کی بعض کیفیات میں اس دُنیا کے احساسات سے تعطل ہو جاتا تھا، مگر حیات کی نفی نہ ہوتی تھی۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ورودِ وفات کچھ ایسے طریق سے ہوا کہ حیات کلیۃً منتفی نہ ہوئی تھی، صرف آثارِ حیات سلب ہو گئے تھے (اور یہ بھی اس لیے تھا کہ عالمِ برزخ میں انتقال ہو سکے اور پردۂ قبر میں تشریف لے جا سکیں) حضرت فاروق اعظمؓ کی نگاہیں اس حیاتِ قلب تک پہنچ رہی تھیں، جو زیرِ پردہ مستور تھی (آخر محدثیت کا مقام کچھ کم منبع عرفان نہ تھا) اور اس کے ہوتے ہوئے وہ وقوعِ موت کا ادراک نہ کر سکے تھے۔ اس وجودِ حیات کو اس ورودِ وفات سے تطبیق دینا ان کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے متعلق ان کا اعتقاد یہی تھا کہ آپ پر بھی اسی طرح موت آئے گی، جس طرح کہ عام دوسرے انسانوں پر وارد ہوتی ہے اور چونکہ صورتِ پیش افتادہ اور حالتِ واقعہ ایسی نہ تھی، اس لیے وہ آپؐ پر ورودِ وفات کا یقین نہ کر سکے اور خیال کیا کہ یہ مرحلہ ابھی باقی ہے۔ بیشتر ازیں وہ آیتِ شریفہ انک میت و انھم میتون کے پیشِ نظر آپؐ پر قرائنِ موت کا تتبع نہ کر سکے تھے۔

پھر جب حضرت صدیق اکبرؓ نے اس صورتِ پیش اُفتادہ اور کیفیت واقعہ ہی کو وفات النبیؐ کہا اور آیاتِ قرآنیہ، جن میں آپؐ پر ورودِ وفات کی پیشگوئیوں یا امکان کا بیان تھا۔ ان کا منشار اسی قسم کی حالت کو قرار دیا تو اب حضرت عمر فاروقؓ سمجھے کہ آیاتِ مذکورہ اپنے عمومی مفہوم میں نہ تھیں اور انہیں شرحِ صدر ہو گیا کہ ان آیات شریفہ کا منشار، وفات النبیؐ کے متعلق کیا ہے فرماتے ہیں کہ

ان آیات کا مفہوم مجھ پر یُوں منکشف ہوا :۔

"گو یا کہ میں نے پہلے وہ آیات پڑھی ہی نہ تھیں"

مقام غور ہے کہ اگر یہ آیات شریفہ اپنے اسی عام مفہوم میں ہوتیں، جیسا کہ ابتدائی سطح میں متبادر ہوتا ہے، تو صحابہ کرامؓ بالخصوص حضرت فاروق اعظمؓ ان آیات کے متعلق اتنا اہم اعلان نہ فرماتے۔ حضورؐ کے متعلق وعدہ موت اگر انہی معنوں میں ہوتا جن میں کہ موت عام ماحول عرب میں متعارف تھی، تو حضرت فاروق اعظمؓ حافظ قرآن اور نہایت ذکی الطبع ہوتے ہوئے یہ ہر گز ارشاد نہ فرماتے :۔

کانی لم اقرأھا الا یومئذٍ۔

ترجمہ۔ گو یا کہ وہ آیات میں نے اس دن کے سوا کبھی پڑھی ہی نہ تھیں۔

بات صاحب ہے کہ آنحضرتؐ پر وفات شریفہ کا وُرود کچھ ایسے طریق سے ہوا، جو عام دوسرے انسانوں سے مختلف تھا۔ آپ کے جسدِ میّت سے قرائنِ موت کچھ ایسے جلی نہ تھے کہ کسی کو شک کی گنجائش نہ مل سکے۔ آپ پر کچھ ایسی کیفیات تھیں کہ موت کا یقین نہ ہوتا تھا۔ اسی کیفیت نے جو زیر پردہ مستور تھی، اشتباہ پیدا کر رکھا تھا، جن کے خیال میں اس کیفیت کی قرائنِ موت سے تطبیق محال تھی، وہ ان قرائن کو غشی سمجھتے رہے۔ کیونکہ ان کے حاشیۂ فکر میں موت کے صرف وہی معنی تھے، جو عام طور پر معروف ہیں اور جس ہستیِ مقدس کو رازدارِ نبوت ہونے کا شرف حاصل تھا۔ اس نے اس کیفیت باطنہ کو جو زیر پردہ مستور تھی، وُرودِ وفات سے متصادم نہ جانا تھا۔ اس وجودِ حیات اور وقوعِ وفات میں کوئی تعارض خیال نہ کیا۔ اعلان فرمایا :۔

فان محمداً قد مات[1]

ترجمہ۔ حضورؐ موت کا ذائقہ چکھ چکے ہیں۔

جب حضرت صدیق اکبرؓ نے اس صورتِ پیش افتادہ ہی کو وفاتِ پیغمبر قرار دے دیا، تو پھر حضرت فاروق اعظمؓ نے آپ پر قرائنِ موت کا تتبع شروع کیا اور بالآخر وُرودِ وفات کے قائل ہو

---

[1] بخاری شریف جلد ۱ صفحہ ۶۴۰

گئے۔ باقی سب صحابہؓ نے بھی اسے تسلیم کر لیا حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ فرماتے ہیں:۔

معنی قول او کانی لم اسمعھا این ست کہ استماع این آیت مائل گردانید او را بہ تتبع قرائن و پیش ازیں میلان باآں نداشت[1]

ترجمہ۔ آپ کے اس ارشاد ،،گویا کہ یہ آیت میں نے پہلے سنی ہی نہ تھیں،، کا مطلب یہی ہے کہ اس آیت کے استماع نے انہیں تتبع قرائن کی طرف متوجہ کر دیا کہ یہ صورت پیش افتادہ ہی اس آیت شریفہ کا مورد ہے) اور پیش تر ازیں آپ کا (اس آیت کے) اس معنی کی طرف دھیان نہ تھا۔

حجۃ الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے حضرت عمرؓ کے انکار وفات کو عام جذبات محبت پر محمول نہیں کیا بلکہ اس میں ایک نہایت دقیق گہرائی معلوم کی ہے صورت پیش افتادہ میاں حضرات کریمین کا یہ اختلاف کہ یہ موت ہے یا غشی اور پھر حضرت عمرؓ کا تتبع قرآن سے اسے آیت انك میت وانھم میتون سے متعلق کرنا بتلاتا ہے کہ یہ موت کوئی عام اموات کی طرح نہ تھی، کچھ مختلف تھی۔ ورنہ اول وہلہ میں یہ اختلاف کسی طرح نہ ہوتا۔

حضرت عمرؓ سمجھتے تھے کہ آپ پر موت اسی طرح آئے گی جس طرح عام دوسرے انسان پہ آتی ہے اس لیے ہنوز وہ نہیں آئی جو کچھ پیش آیا ہے وہ کچھ اور ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ سمجھتے تھے کہ وفات پہ بھی آپ کی خوشبو کا اسی طرح پھیلے رہنا جس طرح کہ آپ کی دنیا کے عین حیات تھی آپ کی ایک جداقسم کی موت کا پتہ دیتا ہے اور بالآخر اسی پہ آپ کے اِس عالم سے اُس عالم میں منتقل ہونے کا اقرار کرنا ہوگا ـــــ جو حضرت عمرؓ نے بالآخر کر لیا اور اسی پر سب صحابہؓ کا اجماع ہو گیا۔

سو جس طرح ورود وفات پر تمام صحابہؓ کا اجماع ہو گیا۔ اسی طرح یہ بھی ایک اجماعی حقیقت قرار پائی کہ آپ کی وفات سے وہ معاملہ ہرگز نہ کیا گیا جو عام لیے دوسرے موقعوں پہ کیا جاتا ہے۔ صحابہ کرامؓ نے اس موت کی نوعیت عام انسانوں سے کچھ مختلف سمجھی۔

---

[1] قرۃ العینین صفحہ ۲۷

تنوعِ موت پر پہلی شہادت

کہ صحابہ کرام نے اجماعًا آپ کی وفات سے دوسری اموات والا معاملہ نہ کیا

اختصاصات لوفات سیّد الکائنات

① ــــــ آپ کو آخری غسل پہلے پہنے ہوئے کپڑوں ہی میں دیا گیا۔ کُرتہ تک جسدِ اطہر سے نہ اُتارا گیا۔

② ــــــ نمازِ جنازہ بھی عام اموات مسلمین کی طرح نہیں پڑھی گئی، بلکہ اسے کسی دوسرے طریق سے ادا گیا، بلکہ بعض روایات سے تو معلوم ہوتا ہے کہ معروف نمازِ جنازہ کی بجائے صرف صلوٰۃ وسلام عرض کیا گیا اور آپ کے احسانات کے اعتراف کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے آپ کے لیے دُعا کی گئی۔

③ ــــــ اور اس سے بڑھ کر یہ کہ مُردوں کے دفن کرنے کے بارے میں تاخیر نہ کرنے کا جو عام تاکیدی حکم شریعت میں ہے، اس کے خلاف قریباً پونے دو دن گزر جانے کے بعد آپ کو دفن کیا گیا اور اس غیر معمولی تاخیر میں کوئی حرج نہ سمجھا گیا اور کوئی اندیشہ محسوس نہیں گیا اور کسی ایک صحابیؓ نے بھی اس معاملہ میں جلدی کرنے کا تقاضا نہ کیا۔

④ ــــــ پھر آپ کی ایک خاص ہدایت کے مطابق آپ کی پہلی زندگی کے عزیز مسکن، یعنی حضرت عائشہ صدیقہؓ کے حجرہ ہی کو آپ کا مدفن اور آپ کی دائمی آرام گاہ بنا دیا گیا اور آپ اسی میں دفن کیے گئے۔

⑤ ــــــ اسی طرح آپ کی ایک ہدایت کے مطابق آپ کی املاک میں ترکہ اور وراثت کا عام قانون جاری نہیں کیا گیا۔ بلکہ آپ کی حیاتِ طیبہ میں ان کا جو مصرف اور نظام تھا وہی بدستور قائم رکھا گیا اور وہ خلافت کی تولیت میں رہیں۔

(۶) ——— اسی طرح آپ کی ازواجِ مطہراتؓ کا یہ حق سمجھا گیا کہ وہ اپنے مسکونہ حجروں کو تازیست اپنے استعمال میں رکھیں اور رسول اللہؐ کے املاک سے اپنا نفقہ تاحیات حاصل کرتی رہیں، جیسا کہ حضورؐ کے سامنے ان کو یہ دونوں حق حاصل تھے۔ حالانکہ کسی مسلمان کے مرنے کے بعد اس کی بیوہ کے یہ حقوق صرف عدت کی مختصر مدت تک رہتے ہیں۔

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی دامت برکاتہم ان واقعات کی روشنی ارشاد فرماتے ہیں۔

"ان سب استثنائی اور اختصاصی احکام و معاملات سے یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی نوعیت دوسرے تمام لوگوں کی موت سے بہت کچھ مختلف ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ اتنی بات سے ہمارے حلقے کے کسی صاحبِ علم کو اختلاف ہوگا۔"

تنوعِ موت پر دوسری شہادت

سوال: کیا موت کے علاوہ اور کوئی کیفیت بھی ہے جو اس کی طرح تمام زندہ انسانوں پر وارد ہوتی ہے؟ اس کے متعلق پتہ کیجئے کہ کیا شریعتِ مطہرہ نے اس کے معنوں میں بھی تنوع پیدا کیا ہے اور انبیاء کو غیر انبیاء سے اس باب میں بھی ممتاز فرمایا ہے؟

جواب: ہاں نیند بھی موت کی طرح تمام زندہ انسانوں کی فطرت ہے اور تمام زندہ انسانوں پہ وارد ہوتی ہے۔ چنانچہ کہا گیا ہے:۔

النوم اخو الموت[1]

ترجمہ: نیند موت کی بہن ہے۔

---

[1] جاء فی الحدیث النوم اخو الموت (فیض الباری جلد ا ص۱۸۳ مصر) یراجع حدیث النوم اخو الموت ولا یموت اهل الجنة من الجامع الصغیر (تحیة الاسلام للشیخ الانور ص۲۳) وکذلك فی کتاب الروح ص۵۳ والتعلیقات علی النبراس ص۳۲۳

اگر انبیاء اور غیر انبیاء میں "تنوع نیند" ثابت ہے تو ہر دو طبقوں میں "تنوع موت" کیسے ثابت نہ ہوگا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

ان عینی تنامان ولا ینام قلبی۔[1]

ترجمہ: میری صرف آنکھیں سوتی ہیں، دل نہیں سوتا، وہ بیدار رہتا ہے۔

ایک مرسل روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا:۔

انا معاشر الانبیاء تنام اعیننا ولا تنام قلوبنا۔[2]

ترجمہ: ہم لوگ جو انبیاء ہیں، ہماری صرف آنکھیں سوتی ہیں، دل نہیں سویا کرتے۔

وکذالک الانبیاء تنام عیناھم ولا تنام قلوبھم۔[3]

ترجمہ: انبیاء کرام کی صرف آنکھیں سویا کرتی ہیں دل نہیں سوتے۔

خاتم المحدثین مولانا السید انور شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:۔

عدم نقض الوضوء بالنوم من خصائص الانبیاء۔[4]

ترجمہ: سونے سے وضوء نہ ٹوٹنا یہ انبیاء کرام کی خصوصیت ہے۔

انبیاء کرام کی یہ شان ہے کہ اس نیند کی حالت میں بھی اُن کے ادراکات جاری رہتے ہیں۔ ان کے ادراکات کی نوعیت بھی ہمارے ادراک کی نوعیت سے مختلف ہے۔ نیند کی طرح ادراک میں بھی تنوع ہے۔ انبیاء کرام کی نیند کے ادراکات بھی ایک قسم کی وحی سمجھے جاتے ہیں — رؤیا الانبیاء وحی (ترمذی) اس کی تصدیق ہے۔ انبیاء کی نیند اور دوسروں کی نیند میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ ان کے منامی ادراکات بھی وحی کا مقام رکھتے ہیں۔ حضرت عمران بن حصینؓ کہتے ہیں:۔

کنا لا نوقظ نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من منامہ اذا نام حتی یستیقظ۔[5]

ترجمہ: ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نیند سے کبھی نہ جگاتے تھے جب تک کہ خود نہ بیدار ہو جاتے۔

---

[1] رواہ الشیخان [2] اخرجہ ابن السعد کما فی الخصائص [3] بخاری [4] العرف الشذی ص۸ [5] صحیح مسلم جلد ا ص۲۳۸

حضرت موسےٰ علیہ السلام جب حضرت خضر علیہ السلام کی تلاش میں نکلے تو حضرت یوشع بن نونؑ ان کے ساتھ تھے۔ جب عین منزلِ مقصود پہ پہنچے تو حضرت موسےٰ علیہ السلام کی آنکھ لگ گئی، حضرت یوشعؑ نے فرمایا :-

لا اوقظہ۔[۱] میں آپ کو بیدار نہیں کروں گا۔

انبیاء کو خوابِ استراحت سے اس لیے نہیں اُٹھایا جاتا کہ معلوم نہیں اُن پہ کیا اسرار منکشف ہو رہے ہوں کیوں انکے لیے سبب حرج بنا جائے۔ شیخ الاسلام مولانا بدر عالم میرٹھی ثم المدنی لکھتے ہیں :-

پھر جب ان کی نیند صرف آنکھوں تک محدود ہوتی ہے تو اس سے ان کی موت کا بھی کچھ اندازہ کر لینا چاہیئے۔ کیونکہ النوم اخوالموت مشہور ہے، وہ بھی نیند کی طرح ان پہ طاری ضرور ہوتی ہے، مگر عام بشر کی موت کی طرح نہیں۔ یہاں بھی ان کو بڑا امتیاز حاصل ہوتا ہے، حتیٰ کہ ان کی وفات کے بعد بھی اُن پر زندہ کا اطلاق آیا ہے۔[۲]

سیرت کی کتابوں میں اک باب ہے رحلت کا
کم فہم سمجھتے ہیں، ہے موت یہ ہم جیسی

ان حقائق کی روشنی میں غور فرمایئے کہ تنوعِ موت کا انکار اور پھر اسے شرعی مدارک چھوڑ کر احداث فی اللغۃ کے الزام سے رد کرنا کون سی شانِ تحقیق ہے۔ تنوعِ موت کا پتہ چلانے کے لیے تنوعِ حیات کر لیجئے۔ موت اگر حیات کی ضد ہے تو تنوعِ حیات سے تنوعِ موت کیسے لازم نہ آئے گا۔ علامہ راغبؒ فرماتے ہیں :-

الحیاۃ تستعمل علیٰ اوجہ[۳]۔ لفظ حیات، کلامِ عرب میں کئی معنوں میں آتا ہے۔

واللہ اعلم بالصواب وعلمہ اتم واحکم فی کل باب۔

---

[۱] بخاری جلد ۲ صفحہ ۶۸۹ [۲] ترجمان السنۃ جلد ۲ صفحہ ۲۵۸ [۳] المفردات صفحہ ۱۳۸

اعتقاد الصدیق لحیات الرفیق

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جب وفاتِ شریفہ وارد ہوئی تو حضرت ابوبکرؓ مقام سنح میں تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے کہا:۔

مامات رسول اللہ صلی علیہ وسلم۔

ترجمہ۔ آنحضرتؐ پر جو حالت وارد ہے، وہ ہرگز موت نہیں۔

بعد میں حضرت عمرؓ خود فرماتے تھے:۔

واللہ ماکان یقع فی نفسی الا ذاك۔

ترجمہ۔ خدا کی قسم! میرے ضمیر کا بھی یہی فیصلہ تھا۔

حضرت ابوبکرؓ تشریف لائے تو آپ نے حضور انورؐ کے چہرۂ مبارک سے چادر اٹھائی، آپ کی پیشانی پر بوسہ دیا اور بے اختیار رو پڑے اور حضورؐ کو مخاطب کر کے کہا:۔

بابی انت وامی طبت حیًا ومیتًا والذی نفسی بیدہ لا یذیقك اللہ الموتتین ابدًا۔[1]

ترجمہ۔ میرے ماں باپ آپ پر قربان۔ آپ حیات وموت دونوں کیفیتوں میں کیسے پاکیزہ ہیں۔ اس ذات کی قسم! جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو دو موتوں کا ذائقہ کبھی نہ چکھائے گا۔

اما الموتۃ التی کتب اللہ علیك فقد متھا۔[2]

ترجمہ۔ جو موت اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے لکھی تھی وہ آپ پر وارد ہو چکی۔

ابن ابی شیبہؒ کی روایت سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے آتے ہوئے حضرت عمرؓ کی یہ بات سن لی تھی کہ آنحضرتؐ پر جو صورتِ حال پیش ہے، وہ موت نہیں ہے۔

---

[1] بخاری جلد ۱ ص ۵۱۷ [2] بخاری کتاب الجنائز جلد ۱ ص ۱۶۶

فکشف عن وجهہ ثم اکب علیه فقبلہ و بکیٰ ثم قال بابی انت و امی واللہ لا یجمع اللہ علیک موتتین اما الموتۃ التی کتبت علیہا فقد متہا[1]

ترجمہ: پس آپ نے حضورؐ کے چہرہ سے کپڑا اٹھایا، آپ پر جھک پڑے، بوسہ دیا، اور رو پڑے۔ پھر فرمایا میرے ماں باپ آپ پر قربان، خدا کی قسم اللہ تعالیٰ آپ پر دو موتیں کبھی نہ جمع کرے گا۔ جو موت کہ آپ کے لیے لکھی گئی تھی اس کا ذائقہ آپ چکھ چکے۔

یہاں تین امور پیش نظر رہیں:

اولاً: کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے کسی خاص قسم کی موت لکھی تھی کہ اس کا اس خصوصیت سے تذکرہ کیا جا رہا ہے؟

ثانیاً: میرے ماں باپ آپ پہ قربان، عربوں کے محاورات میں یہ جملہ کیا اموات محضہ کے لیے آتا ہے یا اس دعا و تصدیق کے لیے من وجہ حیات لازم ہے؟

ثالثاً: یہاں جمع موتتین میں دو موتوں سے کیا مراد ہے؟ ہم یہاں صرف تیسری بحث کی تفصیل کرتے ہیں۔

مفہوم موتتین کی تعیین

لا یجمع اللہ علیک موتتین (اللہ تعالیٰ آپ پر دو موتیں کبھی جمع نہ کریں گے) اس کی شرح میں مختلف باتیں کہی جاتی ہیں۔ پس فکر و نظر سے ان کا جائزہ لینا چاہیئے۔

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ارشاد صدیقیؓ حضرت عمرؓ کی تردید کے لیے تھا۔ کیونکہ اگر اس صورت پیش کو موت نہ کہا جائے، تو لازم آتا ہے کہ آپ پر موت کبھی آئے گی اور اس طرح گویا کہ آپ پر دو موتیں وارد ہوئیں۔ اس کی نفی کرتے ہوئے حضرت ابو بکرؓ نے آنحضرت

---

[1] صحیح بخاری کتاب المغازی جلد ۲ ص ۶۴۰

پر وُرودِ وفات ثابت فرمایا۔

جواباً عرض ہے کہ حضرت صدیق اکبرؓ کے اس ارشاد لا یجمع اللہ علیك موتتین کا یہ مفہوم ہرگز نہیں، حضرت عمرؓ کے پہلے خیال کے مطابق اگر اس صورت پیش اُفتادہ کو موت نہ کہا جائے اور اس لزوم کو بھی مان لیا جائے کہ اس صورت میں آنحضرتؐ پر پھر کبھی ورودِ وفات ہوگا تو اس سے یہ کیسے لازم آیا کہ حضرت عمرؓ کے خیال کے مطابق حضورؐ پر دو موتیں جمع ہو رہی ہیں، جس کی تردید کی ضرورت حضرت صدیق اکبرؓ کو پیش آئی تھی؟ اس لیے کہ جب پہلی صورت ان کے خیال میں موت ہی نہیں، تو پھر آئندہ کے وُرودِ موت سے دو مَوتوں کا اجتماع کیسے لازم آیا؟ اور اگر پہلے ورودِ موت ہو چکا ہے، تو اس پر یہ لزوم کیسے لایا جا سکتا ہے کہ اس صورت میں آپ پر موت پھر کبھی آئے گی۔

لا یجمع علیك موتتین. تو اسی ذہن پر کچھ اثر ڈال سکتا ہے، جو پہلے ورود موت کا قائل ہو اور صورتِ پیش افتادہ کو موت یقین کر رہا ہو، اور ظاہر ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ اس پہلی ہی وفات کے قائل نہ تھے۔ بس ان کے خیال کے مطابق پھر کبھی موت واقع ہونے سے دو موتوں کا اجتماع ہرگز لازم نہیں آتا کہ حضرت صدیق اکبرؓ اس کی تردید فرما رہے ہوں، جب حضرت عمرؓ پہلی موت ہی کے قائل نہیں، تو ان کی تردید کے لیے یہ جملہ مذکورہ کیسے کارفرما ہو سکتا ہے۔ اس جملۂ بلیغہ

---

[1] بخاری کے حاشیہ پر علامہ کرمانیؒ کا یہ قول بے شک لکھا ہے۔ قالہ ابو بکر ردًّا لما قالہ عمر (جلد ۱ صفحہ ۱۶۶) لیکن جلد ۲ صفحہ ۶۴۰ کے حاشیہ میں کچھ اور اقوال بھی لکھے ہیں اور اس قول اول کو واضح کہنے کے باوجود اسے قیل کے ساتھ ہی لکھا ہے۔ ہمیں بہت تعجب تھا کہ علامہ کرمانیؒ جیسے فاضل یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ بغور کرنے سے پتہ چلا کہ حضرت عمرؓ کے خیال کی تردید میں چونکہ اگلا خطبہ تھا اور یہ جملہ تمہید میں آ گیا تھا اس لیے علامہ کرمانیؒ نے اگلے خطبہ کے پیشِ نظر اس کو بھی تردید ہی میں ذکر کر دیا ہے۔ چنانچہ علامہ کرمانیؒ ایک اور مقام پر فرماتے ہیں۔ فیہ تمہید لرد مقالۃ عمر۔ (حاشیہ بخاری صفحہ ۵۱۷) محدث سہارنپوریؒ کا اصل فیصلہ اسی جگہ ہے۔

مطلب یقیناً وہی ہے، جو شیخ الاسلام علامہ عینیؒ بیان فرمارہے ہیں:۔

اراد بالموتتین الموت فی الدنیا والموت فی القبر وھما موتتان المعروفتان المشھورتان فلذلک ذکرھما بالتعریف وھما موتتان الواقعتان لکل احد غیر الانبیاء علیھم السلام فانھم لا یموتون فی قبورھم بل ھم احیاء واما سائر الخلق فانھم یموتون فی القبور ثم یحیون یوم القیٰمۃ ومذھب اھل السنۃ والجماعۃ ان فی القبر حیٰوۃ وموتا فلابد من ذوق الموتتین لکل احد غیر الانبیاء۔[1]

ترجمہ۔ دو موتوں سے مراد ایک اس دنیا کی موت اور دوسری قبر کی موت ہے، اور یہ دونوں موتیں تعلیماتِ اسلام میں معروف ہیں اور اسی لیے انہیں معرفہ ذکر کیا گیا ہے۔ یہ دونوں موتیں انبیاء کے سوا باقی ہر ایک انسان کو پیش آتی ہیں۔ انبیاء کو اپنی قبور میں پھر دوسری موت نہیں آتی۔ بلکہ وہ وہاں زندہ رہتے ہیں ان کے علاوہ باقی عام لوگوں پہ (سوال و جواب کے بعد) پھر قبر میں ورودِ موت ہوتا ہے۔ اس کے بعد انہیں زندگی قیامت کو ملتی ہے۔ اہل السنۃ والجماعۃ کا مذہب یہی ہے کہ ماسوائے انبیاء کے باقی سب کے لیے قبر میں موت و حیات دونوں ہیں پس ہر کسی نے دو موتوں کا ذائقہ چکھنا ہے۔

خاتمۃ الحفاظ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ منکرین حیات کا جواب دیتے ہوئے، ایک جواب کے بعد ارشاد فرماتے ہیں:۔

واحسن من ھذا الجواب ان یقال ان حیاتہ فی القبر لا یعقبھا موت بل یستمر حیا والانبیاء احیاء فی قبورھم ولعل ھذا ھو الحکمۃ فی تعریف الموتتین حیث قال لا یذیقک اللہ الموتتین ای المعروفتین المشھورتین الواقعتین

---

[1] عینی شرح بخاری جلد ۷ صفحہ ۶ مصر

لکل احد غیر الانبیاء۔[1]

ترجمہ۔ احسن ترین جواب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی قبر شریف میں پھر ایسی حیاتِ دائمہ حاصل ہو چکی ہے کہ اب اس کے بعد پھر کبھی ورودِ موت نہ ہوگا اور انبیائے کرام اپنی اپنی قبروں میں زندہ ہوتے ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ارشادِ نبوت میں موتتین کو الف، لام سے لایا گیا ہے۔ پس یہ دونوں موتیں (ایک اسی دنیا میں، دوسری قبر میں) انبیاء کے سوا باقی ہر انسان پر وارد ہوتی ہیں۔

شیخ الاسلام علامہ نور الحق محدث دہلویؒ شارح بخاری لکھتے ہیں:۔

لا یذیقک اللہ الموتتین ابداً یعنی بعد از موت بحیاتِ ابدی زندہ خواہی بود از آں کہ وے رضی اللہ عنہ، دانستہ بود کہ انبیاء در عالمِ برزخ زندہ اند بخلاف سائر مسلماناں کہ در وقتِ سوال منکر و نکیر زندہ می کنند۔ آں ہا را باز می میرانند، چنانکہ در تفسیر احیتنا اثنتین وامتنا اثنتین گفتہ اند۔[2]

پھر ایک اور مقام پر رقمطراز ہیں:۔

قول مختار و مقررِ جمہور ہمیں است کہ انبیاء بعد اذاقتِ موت زندہ اند بحیاتِ دنیوی۔[3]

ترجمہ۔ ارشادِ نبوت کہ اللہ تعالیٰ آپ کو دو موتوں کا ذائقہ کبھی نہ چکھائے گا۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ وفاتِ شریفہ وارد ہو چکنے کے بعد پھر آپ ہمیشہ کی زندگی پائیں گے۔ حضرت ابوبکرؓ کا عقیدہ تھا کہ انبیائے کرام عالمِ برزخ میں زندہ ہوتے ہیں باقی عام مسلمان منکر و نکیر کے سوالات کے لیے اپنی اپنی قبروں میں زندہ کیے جاتے ہیں اور پھر ان پر قبر میں دوبارہ ورودِ موت ہوتا ہے۔

پھر ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:۔

موت دوم آنست کہ سائر الناس را در قبر بعد از سوال منکر و نکیر خواہد بود و ایں

---

[1] فتح الباری جلد ۷ ص ۲۲ مصری ۱۴ ص ۳۶۴ دہلی [2] تیسیر القاری شرح صحیح بخاری جلد ۳ ص ۲۲۵ [3] ایضاً ص ۲۶۲

جواب موافقِ جمہورِ علماء است کہ قائل اند بحیاتِ سائر انبیاء در عالمِ برزخ و بایں معنی ناطق است آثار و احادیث چنانکہ بر متتبعاں پوشیدہ نیست و ایں قول نزد ما احسن اقوال است [1]

ترجمہ۔ دوسری موت وہ ہے جو عامۃ الناس کو قبر میں منکر و نکیر کے سوالات کے بعد پھر دوبارہ آئے گی. یہ جواب جمہور علماء کے فیصلے کے مطابق ہے، وہ عالمِ برزخ میں تمام انبیاء کی حیات کے قائل ہیں. اس معنی کی تائید میں آثار و احادیث وارد ہیں، چنانچہ تتبع کرنے والے اہلِ حق پر یہ مخفی نہیں اور ارشادِ صدیقی کا یہ معنی ان تمام اقوال سے بہتر ہے، جو اس کی تشریح میں کہے گئے ہیں.

شیخ عبد الحق محدث دہلوی بھی اس حدیث کی شرح اسی طرح ہے :-

مراد آنست کہ نمی میرد بموتِ دیگر در قبر ہمچو دیگراں کہ زندہ گردانیدہ می شود برائے سوال باز میرانیدہ می شود و ظاہر آنست کہ موت دیگر نیست بر وے و بعد از جریانِ سنتِ الہٰی براذاقت موت و زندہ گردانیدن بعد ازاں حیات باقی و مستمر خواہد بود و ممات برآں طاری نخواہد شد. پس ایں سخن اشارہ است بحیاتِ آں حضرت [2]

ترجمہ. حضرت ابوبکر صدیقؓ کی مراد اس کلمہ سے یہ تھی کہ دوسرے لوگوں کی طرح آپؐ قبرِ منور میں دوسری موت کا ذائقہ بالکل نہ چکھیں گے. دوسرے عام لوگوں کو قبر میں سوال و جواب کے لیے زندہ کیا جاتا ہے اور پھر ان پر دوبارہ ورودِ موت ہوتا ہے. آنحضرتؐ پر یہ دوسری موت کبھی نہ آئے گی. ایک دفعہ لذتِ وفات چکھنے اور پھر زندہ ہونے کے بعد آپؐ حیاتِ دائمہ سے زندہ ہیں. آپؐ پر پھر کبھی طریانِ موت نہ ہو گا. اس ارشادِ عالی میں حضرت ابوبکرؓ کا اشارہ مسئلہ حیات النبی کی طرف ہی تھا.

---

[1] تیسیر القاری پ ۱۸ جلد ۴، کتاب المغازی ص ۲۱۷ [2] مدارج النبوت جلد ۲ صفحہ ۸۹

خلاصۂ کلام یہ کہ صحیح بخاری کے شارحین علامہ عینیؒ، حافظ ابن حجر عسقلانیؒ، شیخ الاسلام نور الحقؒ اور دوسرے اکابر محدثینؒ نے موتِ ثانیہ سے قبر کی موت ہی مراد لی ہے۔ دوسرے احتمالات عقلاً اور نقلاً صورتِ حال پر قطعاً چسپاں نہیں ہوتے۔ لا یجمع اللّٰہ علیك موتتین کا صحیح مفہوم یہی ہے کہ موتِ ثانیہ، جس سے مراد قبر کی موت ہے، انبیاء پر ہرگز طاری نہ ہو گی۔ وہ موت کی لذت شناسی کے بعد پھر ہمیشہ کے لیے زندہ کر دیئے جاتے ہیں۔

حضرت صدیق اکبرؓ کی بصیرت اور فراست پر قربان! وفاتُ النبیؐ کا اعلان بعد میں فرمایا پہلے حیات بعد الوفات پر اشارہ فرما دیا، تاکہ وقوعِ موت کی صراحت سے کہیں حیاتِ ثانیہ کی نفی لازم نہ کر لی جائے۔ مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوریؒ بھی صحیح بخاری کے حاشیہ پر اہلسنت کی طرف سے منکرینِ حیاتِ قبریہ کا اسی طرح جواب دیتے ہیں:۔

والاحسن ان یقال ان حیاته صلی اللّٰہ علیه وسلم لا یعقبها موت بل یستمر حیا والانبیاء احیاء فی قبورهم۔

ترجمہ: بہترین جواب یہی ہے کہ ایک دفعہ موت چکھنے کے بعد حضور انورؐ کی حیات ایسی ہے کہ پھر ان پر کبھی موت نہ آئے گی اور پھر دائمی طور پر انبیاء کی طرح اپنے روضہ میں فائز الحیات رہیں گے۔

غور فرمائیے! حضرت ابوبکرؓ کی بصیرت اور فطرت نبوت کی مزاج شناسی کہاں تک پرواز کر رہی ہے۔ کتنی دور کی بات آپ نے ایک جملے میں بیان فرما دی اور کس شان سے آپ کے بے حیات بعد الوفات کا اثبات فرمایا۔ جامعیت، شان اور بلاغتِ بیان نے جس طرح یہاں سمندر کو کوزے میں بھر دیا ہے اس کی نظیر کلامِ عرب میں شاید ہی کہیں ملے۔

وقوعِ وفات کا پہلا اعلان بھی حضرت صدیق اکبرؓ ہی نے کیا تھا۔ احساسِ نزاکت پر قربان جائیے کہ وفات کا اس وقت تک اعلان نہیں فرمایا، جب تک کہ اس کے ساتھ ہی بعد الوفات کی حیات کا اثبات نہیں فرما دیا۔

تنبیہ

پیش نظر رہے کہ "لا یذیقک اللہ الموتتین ابدًا" کی شرح میں شیخ الاسلام حضرت علامہ عینیؒ اور دوسرے اجلّہ محدثین نے حیات فی القبر کے جس مسئلے کو بیان فرمایا ہے، اسے صرف اپنی رائے یا اپنا نظریہ یا صرف اپنی ہی ترجیح قرار نہیں دیا، بلکہ اُسے پُورے اہلسنّت کا مذہب قرار دیا ہے جس کا انکار خروج عن اہل السنّۃ ہے:۔

ومذهب اهل السنة والجماعة ان فى القبر حيوة وموتا فلا بد من ذوق الموتتين لكل احد غير الانبياء[1]

ترجمہ: پُورے اہل سنّت کا مذہب یہی ہے کہ قبر میں زندگی اور موت دونوں ہیں پس ہر ایک کو دو موتوں کا ذائقہ چکھنے سے چارہ نہیں۔ ہاں انبیائے کرام پر یہ دوسری موت کبھی نہ آئے گی۔

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے بھی اسی انداز بیان کو اختیار فرمایا ہے کہ "حیوٰۃ فی القبر" کے منکرین اہل سنّت میں سے نہیں اور انہیں جواب دینا اہل سنّت کے ذمہ ہی ہوتا ہے۔

قد تمسك به من انكر الحيوة فى القبر واجيب عن اهل السنة ... ان حيوته صلى الله عليه وسلم فى القبر لا يعقبها موت بل يستمر حيا[2]

ترجمہ: حیوٰۃ فی القبر کے منکرین کبھی کبھی اس خطبۂ صدیقیؓ ہی کو اپنا استدلال بنا کر پیش کر دیتے ہیں، اُن کے لیے اہل سنّت کی طرف سے یہی جواب ہے کہ حضورؐ اپنے روضہ میں دائمی طور پر زندہ ہیں انہیں وہاں پھر موت کبھی نہیں آئے گی۔

---

[1] عینی جلد ۷ صفحہ ۱۶ مصر [2] فتح الباری جلد ۷ صفحہ ۲۲

اعتقادِ الفاروق الاعظمؓ لحیاتِ النبی الخاتمؐ

حضرت صدیق اکبرؓ کا عقیدہ تو آپ کے سامنے واضح ہو چکا. اب حضرت فاروق اعظمؓ کا اعتقاد بھی ملاحظہ کیجئے. پہلے اس اصولی مسئلے کو پیشِ نظر رکھیئے :-

یاایھا الذین آمنوا لاترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی ولا تجھروا له بالقول کجھر بعضکم لبعض ان تحبط اعمالکم وانتم لاتشعرون ٥

(پ ۲۶ : حجرات)

ترجمہ. اے ایمان والو! بلند نہ کرو اپنی آوازیں نبیؐ کی آواز سے اور آپ کے سامنے بھی اس قدر آواز بلند نہ کیا کرو. جیسے کہ ایک دوسرے کے سامنے کرتے ہو. ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال اکارت ہو جائیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو.

یعنی حضورؐ کی مجلس میں یا آپ کے سامنے اس طرح آواز نہ نکالو. جیسے کہ آپس میں ایک دوسرے سے جھک کر یا تڑخ کر بات کرتے ہو. آپؐ کے سامنے دبی آواز سے بات کرنا چاہیئے. مبادا بے ادبی ہو جائے اور تمام اعمال ضائع ہو جائیں.

انّ الذین یغضون اصواتھم عند رسول الله اولٰئک الذین امتحن الله قلوبھم للتقوٰی. (پ ۲۶ : حجرات)

ترجمہ. جو لوگ آنحضرتؐ کے پاس دبی آواز سے بولتے ہیں، وہی لوگ ہیں، جن کے دلوں کا اللہ تعالیٰ نے ادب کے لیے امتحان کر لیا ہے.

اکابرِ اہلسنت اور جمہور مفسرین کا اجماع ہے کہ ورودِ وفات کے بعد بھی حکم قرآنی روضۂ اطہر کے پاس کامل ادب و احترام ملحوظ رکھنے کا متقاضی ہے. مسجد نبویؐ کی حدود میں شرعی ضروریات کے علاوہ آواز ہمیشہ پست رہے.

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں :-

قبر شریف کے پاس حاضر ہو، وہاں بھی ان آداب کو ملحوظ رکھے۔[1]

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب محدث سہارنپوریؒ فرماتے ہیں:۔

آنحضرتؐ حیات ہیں، لہٰذا پست آواز سے سلام عرض کرنا چاہیے۔ مسجد نبویؐ کی حدود میں کتنی ہی پست آواز سے سلام عرض کیا جائے، اس کو حضرت خود سنتے ہیں۔[2]

قطب الاقطاب حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ ارشاد فرماتے ہیں:۔

بہت پکار کر نہ بولے، بلکہ آہستہ خضوع اور ادب سے بہ نرمی عرض کرے اور جس کا سلام کہتا ہو، عرض کرے۔ یارسول اللہ من فلان بن فلان یستشفع بك الی ربك۔[3]

حضرت فاروق اعظمؓ کا اعتقاد

عن السائب بن یزید قال کنت قائماً فی المسجد فحصبنی رجل فنظرت الیہ فاذا عمر بن الخطابؓ فقال اذھب فاتنی بھذین فجئتہ بھما فقال من انتما او من این انتما قال من اھل الطائف قال لو کنتما من اھل البلد لأوجعتکما ترفعان اصواتکما فی مسجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔[4]

ترجمہ: سائب بن یزیدؓ کہتے ہیں، میں مسجد میں کھڑا تھا کہ کسی شخص نے میرے کنکری ماری کیا دیکھتا ہوں کہ وہ حضرت عمرؓ ہیں۔ آپ نے فرمایا "جاؤ اور ان دونوں شخصوں کو میرے پاس لے آؤ"۔ میں انہیں آپ کے پاس لے آیا۔ آپؓ نے ان سے پوچھا "تم کن لوگوں میں سے ہو یا تم کہاں کے ہو؟"۔ انہوں نے کہا "ہم اہل طائف میں سے ہیں"۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا "اگر تم اہل مدینہ میں سے ہوتے تو میں تمہیں سزا دیتا، اس لیے کہ تم مسجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں (جس کے سامنے آپ کا روضہ منورہ ہے) اپنی آوازیں بلند کر رہے ہو"۔

---

[1] فوائد القرآن ص۶۶۹ [2] تذکرۃ الخلیل ص۱۰۶ [3] زبدۃ المناسک ص۹ ادارہ اشرفیہ لاہور [4] صحیح بخاری ج۱ ص۶۷

آواز بلند کرنے پر مسجد رسول اللہ کی نسبت سے نکیر کرنا اسی لیے تھا کہ وہاں آپ کا روضۂ اطہر ہے۔ جس طرح آپ کی اس دنیوی زندگی میں آپ کے پاس آواز بلند کرنا جرم تھا، اسی طرح آپ کے روضۂ منورہ کے پاس آواز بلند کرنا بھی جائز نہیں۔ اس لیے کہ آپ وہاں تشریف فرما ہیں اور جسدِ عنصری سے زندہ ہیں۔ حدودِ مسجد کی آواز کو بلا کسی واسطہ کے خود سنتے ہیں۔

یہ گمان نہ کیا جائے کہ اس نکیر کا منشاء یہ "اصل" ہے کہ مسجد میں آوازیں بلند کرنا جائز نہیں پھر جس شان اور مقام کی یہ مسجد ہوگی، اسی درجے کا یہ حکم ہوگا کہ اس میں آواز بلند نہ کی جائے اور اس کی خلاف ورزی اسی درجہ کا جرم قرار پائے گی۔ اس لیے کہ سلف و خلف میں سے کسی نے اس اصل کو منشائے نکیر نہیں فرمایا۔

ثانیاً: علمائے ثقات اور ائمہ سلف ہمیشہ اس روایت کو ان ابواب میں ذکر کرتے آئے ہیں جو حضورؐ کی مجلس میں حاضری سے متعلق ہیں۔ کما نقل عن مالک الامام وغیرہ من الائمۃ الاعلام۔

ثالثاً: اس صورت میں مسجد کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت محض تشریف مسجد کے لیے ہوگی، حکم نکیر براہِ راست اس اضافت سے متعلق نہ ہوگا۔ حالانکہ حضرت فاروق اعظمؓ نکیر ہی ان الفاظ سے فرمارہے ہیں۔ بس اس میں تاویل مذکور یقیناً، صرف عن الظاہر ہوگی اور ظاہر ہے کہ جب کلام اپنے اصل پہ محمول ہو سکے تو وہاں، صرف عن الظاہر، درست نہیں ہوتا۔

رابعاً: حضرت فاروق اعظمؓ نے اس نکیر پہ دلیل پیش نہیں فرمائی، بلکہ اس اضافت ہی کو دلیل کے انداز میں پیش فرمایا ہے۔ اگر محض احترام مسجد ہی مقصود ہوتا تو اس پہ دلیل بھی بیان فرمادی ہوتی۔ اس لیے کہ یہ مسئلہ اس سطح پہ بھی نظری ہی تھا۔ ہاں احترام دربار رسالتؐ نصِ قرآن اور واضح تعامل کے پیش نظر ضرور یہ درجہ اختیار کر چکا تھا کہ اسے معرضِ دلیل میں لائے بغیر ہی منشائے نکیر کے طور پہ بیان کیا جا سکے۔

خامساً: محض احترام مسجد کو نظر انداز کرنا قابلِ اخراج عن المسجد تو ہو سکتا ہے (فعلہ عبداللہ بن مسعودؓ کما رواہ الدارمی فی سننہ) لیکن اسے قابلِ سزا قرار دینے کا قول سلف میں سے

کسی نے نہیں کیا، ہاں آداب رسالت کو نظر انداز کرنا اسلامی تاریخ کے ہر دور میں ضرور قابل سزا رہا ہے اور یہاں ایجاع کا ذکر ہے، اخراج کا نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب وعلمہ اتم واحکم فی کل باب۔

اگر حضرت عمر فاروقؓ کے اعتقاد میں حضورؐ اپنی قبر مبارک میں زندہ نہ ہوتے اور قریب کی آوازوں کو خود نہ سُن رہے ہوتے تو حضرت فاروق اعظمؓ حضور اکرمؐ کے پاس دبی آواز سے بات کرنے کے قرآنی حکم کو اس انداز میں کبھی نہ بیان فرماتے۔ حدودِ مسجد تک بلند آواز نکالنے کو قابلِ سزا قرار دینا اس حقیقت کا پتہ دیتا ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ آنحضرتؐ کو اپنے روضۂ اطہر میں فائز الحیات، زندہ اور مدرک الاصوات سمجھتے تھے۔ پیشِ نظر رہے کہ یہ حدیث صحیح بخاری میں ہے اور اس کی صحت اور تقریب ہر لحاظ سے قابلِ اعتماد ہے۔

مزید تائید

قدروی عن ابی بکر الصدیقؓ قال لا ینبغی رفع الصوت علیٰ نبی حیا و لا میتا و روی عن عائشةؓ انها کانت تسمع صوت الوتد یوتد والمسمار یضرب فی بعض الدور المطنبة بمسجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فترسل الیھم لا تؤذوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قالوا وما وعمل علی بن ابی طالبؓ مصراعی داره الا بالمناصع[1] توقیا لذلك هكذا رواه الحسینی فی اخبار المدینة و هذا مما یدل علی انهم کانوا یرون انه حیّ۔[2]

ترجمہ۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آواز بلند کرنا جائز نہیں، نہ وفات سے پہلے نہ وفات کے بعد۔ اور حضرت عائشہ صدیقہؓ جب کبھی اُن گھروں میں جو مسجد نبوی سے متصل تھے، کسی میخ لگنے یا کیل لگانے کی آواز سنتی تھیں تو یہ حکم بھیجتی تھیں کہ (خبردار!) حضورؐ کو (اس آواز سے) اذیت نہ دو اور حضرت علیؓ

---

[1] المناصع التی یتخلی فیها للبول او قضاء الحاجة والواحد مصنع۔ نظر [2] شفاء السقام ص۱۴۳ مصر

نے اسی سے بچنے کے لیے اپنے گھر کے کواڑ باہر جا کر بنوائے تھے (تاکہ ان کے بننے کا شور حضورؐ کو اذیت نہ دے) ان تمام روایات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ آنحضرتؐ کو اپنے روضہ انور میں زندہ یقین کرتے تھے۔

حضرت عمر فاروقؓ جب کسی مہم سے فارغ ہو کر واپس مدینہ آتے، تو سب سے پہلے جو کام آپ کرتے، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں سلام عرض کرنا ہوتا تھا اور اسی کی سب دوسروں کو تلقین فرماتے تھے۔

اوّل کارے کہ عمرؓ ابتداء کرد سلام پیغمبر بود، صلی اللہ علیہ وسلم۔[1]

حضرت عثمانؓ کا اعتقاد

امیر المومنین سیدنا حضرت عثمانؓ کا جب باغیوں نے محاصرہ کر لیا تو بعض صحابہؓ نے عرض کی کہ بہتر یہ ہے کہ آپ شام چلے جائیں، وہاں کی افواج مضبوط ہیں۔ اس پہ حضرت عثمانؓ نے ارشاد فرمایا:-

روا ندارم کہ از دار الہجرت خود مفارقت کنم و مجاورت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم بگذارم۔[2]

ترجمہ۔ میں اسے جائز نہیں سمجھتا کہ اپنے دار الہجرت کو چھوڑ جاؤں اور (یہ بھی مناسب نہیں سمجھتا کہ) حضورؐ کی ہمسائیگی چھوڑ دوں۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ حضور اکرمؐ کو اپنے روضہ اطہر میں زندہ یقین کرتے تھے۔ اگر وہاں جسدِ اطہر محض بے حس و بے شعور پڑا ہوتا اور روح اس سے بالکل جدا ہوتی، تو پھر اس قرب کا آخر کیا فائدہ تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسا قرب کسی لذت کا سامان نہیں ہو سکتا۔ چہ جائے کہ اس پہ جان قربان کر دی جائے۔ حضرت عثمانؓ شام نہ گئے اور مجاورتِ رسولؐ میں وہ لذت اُٹھائی کہ اس پہ جان قربان کر دی۔

---

[1] جذب القلوب صفحہ ۲۰۰ [2] ایضاً صفحہ ۱۸۸

حافظ ابن کثیرؒ (۷۷۴ھ) ۴۳ھ کے واقعات میں لکھتے ہیں:۔

ان معاویۃ لما ودعہ عثمان حین عزم علی الخروج الی الشام عرض علیہ ان یرحل معہ الی الشام فانھم قوم کثیرۃ طاعتھم للامراء فقال لا اختار بجوار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سواہ۔[1]

ترجمہ حضرت معاویہؓ نے جب شام واپسی کا ارادہ فرمایا اور حضرت عثمانؓ نے انہیں الوداع کہی تو انہوں نے آپ کے سامنے تجویز رکھی کہ آپ بھی ان کے ساتھ شام چلے آئیں وہاں کے لوگ اپنے امراء کے بہت تابع فرمان چلتے ہیں۔ آپ نے فرمایا میں حضورؐ کے جوار (ہمسائیگی) پر اور کسی چیز کو ترجیح نہیں دیتا۔

یہاں آپ نے اس مجوزہ دوری کو قبرِ رسول سے دوری نہیں کہا۔ خود ذاتِ رسالت سے دوری قرار دیا ہے کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قرب کو کسی قیمت پر چھوڑنے کے لیے تیار نہیں۔

یہ صرف پیغمبروں کی شان ہے کہ وہ جہاں ہجرت کر جائیں پھر اس جگہ کو نہیں چھوڑتے حضورؐ نے فتح مکہ کے باوجود اپنے دارالہجرت کو نہیں چھوڑا حضرت عثمانؓ آپ کے خلیفہ راشد تھے۔ آپ اپنے آقا کے نقش قدم پر چلے اور اپنی جان کو خطرے میں سمجھنے کے باوجود آپ نے اپنے دارالہجرت کو نہ چھوڑا۔ دوسری وجہ آپ نے یہ بتائی کہ میں حضورؐ سے جدا نہیں ہونا چاہتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر آپ شام چلے جاتے تو پھر جوارِ رسول میں نہ رہتے اس سے پتہ چلا کہ جوارِ رسول یہیں ہے ہر جگہ نہیں اور عاشقانِ رسولؐ وہیں ڈیرے ڈالتے ہیں جہاں جمال جہاں آرا ہر وقت ان کے سامنے رہے۔

حدیث میں آتا ہے جس حالت میں کوئی فوت ہو وہ اسی پیرایہ میں اٹھایا جاتا ہے حضرت عثمانؓ نے جوارِ رسول سامنے رکھتے ہوئے جان جان آفرین کے سپرد کی اب اگلے جہاں میں (عالم برزخ میں) آپ بدستور جوارِ رسول میں ہیں۔ گو جنت البقیع میں آپ کی قبر گنبد خضرا سے کچھ فاصلہ پر ہی کیوں نہ ہو۔ حکماً آپ بھی اپنے پیشروؤں حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کے ساتھ جوارِ رسول میں ہیں۔

---

[1] البدایہ والنہایہ جلد ۷ صفحہ ۱۴۹ تاریخ ابن خلدون جلد ۲ صفحہ ۱۰۴۰

حضرت علی المرتضیٰؓ کا اعتقاد

حضرت علیؓ فرماتے ہیں :-

من زار قبر رسول اللہ کان فی جوار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔[1]

ترجمہ: جو حضورؐ کے روضۂ اطہر کے پاس حاضر ہو، وہ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمسائیگی میں ہوتا ہے۔

اگر حضور انورؐ کی روحِ اقدس آپ کے جسدِ اطہر سے مفارق اور بالکل بے تعلق ہوتی تو سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ اس خصوصیت کے ساتھ قربِ روضۂ مطہرہ کو ہمسائیگی رسولؐ ہرگز قرار نہ دیتے۔ آپؓ کے اس ارشاد سے پتہ چلتا ہے کہ آپ بھی حضرت عثمانؓ کی طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے روضۂ اطہر میں زندہ یقین کرتے تھے۔

حضرت تھانویؒ نے فرمایا :-

مدینہ منورہ جانے والا یہ نہ کہے کہ میں نے حضورِ انورؐ کی قبر کی زیارت کی، بلکہ یوں کہے کہے کہ میں نے حضورؐ کی زیارت کی، کیونکہ حضورؐ زندہ ہیں۔[2]

علماء کرام نے حضرت علیؓ کے اس عمل کی علت اسی حقیقت کو قرار دیا ہے :-

اذ ھو حی فی قبرہ یصلی فیہ۔[3]

حضرت علیؓ کے اس عمل کی بناء یہی تھی کہ حضور اکرمؐ اپنے روضۂ اطہر میں زندہ ہیں۔

وما عمل علی ابن ابی طالبؓ مصراعی دارہ الا بالمناصع توقیاً لذلک۔[4]

ترجمہ: حضرت علی مرتضیٰؓ نے اپنے گھر کے دروازے مدینہ میں ایک باہر کی جگہ میں بنوائے تاکہ کواڑ بننے کا کہیں شور پیدا نہ ہو اور حضورؐ کو اذیت نہ ہو۔

عہ محل بالمدینۃ کان متبرز النساء نیلاً قبل تحذ الکنف وھی ناحیۃ بئر ابی ایوب۔ زرقانی جلد ۸ ص۳۴۳ مصر

[1] جذب القلوب ص۱۸۰ [2] وعظ المبلغ ص۱۱ جمادی الاولی ۱۳۴۰ھ [3] زرقانی جلد ۸ ص۳۴۳ [4] شفاء السقام ص۱۴۳ مصر

علاوہ ازیں حافظ عبداللہؒ مصباح الظلام میں حضرت علی المرتضیٰؓ سے روایت کرتے ہیں ایک اعرابی حضورِ اقدسؐ کے روضۂ اطہر پر حاضر ہوا اور عرض کی :-

یارسول اللہ! آپ نے جو پروردگار سے سُنا، ہم نے آپ سے سُن لیا اور جو کچھ آپ نے خدا سے یاد کیا، ہم نے آپ سے یاد کر لیا، آپ پر جو آیات نازل ہوئیں، ان میں یہ آیتِ شریفہ بھی ہے :-

ولو انھم اذ ظلموا انفسھم جآءوک فاستغفروا اللّٰہ واستغفر لھم الرسول لوجدوا اللّٰہ توابًا رحیمًا ۝ (پ ۵ : النساء)

ترجمہ۔ اور ان لوگوں نے جب اپنے آپ پر ظلم کیا، تو اگر آتے آپ کے پاس اور اللہ تعالیٰ سے مغفرت چاہتے اور یہ رسول بھی ان کے لیے دُعائے معافی کرتے، تو یہ لوگ اللہ تعالیٰ کو توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا پاتے۔

روضۂ منورہ سے آواز آئی :-

اللہ تعالیٰ نے تجھے بخش دیا۔[1]

حضرت علیؓ کی یہی روایت علامہ ابوحیان اندلسیؒ البحر المحیط جلد ۵ ص ۲۸۳ مصر میں، علامہ سمہودیؒ وفاء الوفا میں (خلاصۃ الوفا ص ۵۷ مصر) اور علامہ قرطبیؒ اپنی تفسیر جلد ۵ ص ۲۶۵ میں نقل فرماتے ہیں۔ حضرت علیؓ کا یہ مشاہدہ اور پھر اس پر کسی قسم کی نکیر نہ کرنا اور نہ اس کی کوئی توجیہہ کرنا، ان کے اس عقیدے کی تائید کرتا ہے کہ :-

جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اطہر کی زیارت کے لیے آیا، وہ اس وقت حضور اکرمؐ کی ہمسائیگی میں ہے۔[2]

یاد رہے کہ اعرابی کا مذکورہ بالا واقعہ ہم نے صرف تائیداً نقل کیا ہے۔ پس اسناد کا متصل نہ ہونا اور روایت میں کلام ہونا مُضر نہ سمجھا جائے، اس لیے کہ استدلال مقصود نہیں، صرف

---

[1] جذب القلوب فارسی ص ۱۹۲ [2] ایضاً ص ۱۸۰

استشہاد پیشِ نظر ہے۔

تنبیہ

اعرابی کی یہ روایت اپنی جگہ تسلیم ہو یا نہ، لیکن یہ بالکل صحیح ہے کہ آیتِ مذکورہ میں جاءوک (اگر وہ گنہگار آپ کے پاس حاضر ہوتے) کا مطلب آنحضرتؐ کی یہاں کی دنیوی زندگی تک بالکل محدود نہیں سمجھا گیا، بلکہ آنحضرتؐ کو وفاتِ شریفہ کے بعد بھی حیاتِ حقیقی اور سماعِ حقیقی حاصل ہے اور اُن کے حضور میں پھر دعائے استغفار کے لیے عرض کیا جا سکتا ہے۔ محدثین اور مفسرین کا اس آیتِ شریفہ کے تحت ایسے واقعات نقل کرنا اس حقیقت کا پتہ دیتا ہے کہ جاءوک کا مطلب ہرگز اس دُنیا کی زندگی تک محدود نہیں، بلکہ اب بھی آپ کے روضہ اقدس پہ حاضر ہو کر دعائے مغفرت کے لیے عرض کیا جا سکتا ہے:۔

دراجع له شرح المسلك المتقسط لملا علی القاری ص۲۸۱ مصر

وشرح الشفاء للعلامة الخفاجی المصری جلد۳ ص۳۹۸

والزرقانی جلد۸ ص۲۹۹، ص۳۰۶ مصر

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ ارشاد فرماتے ہیں:۔

فقہاءؒ نے بعد سلام کے وقت زیارت قبر مبارک کے شفاعتِ مغفرت کا عرض کرنا لکھا ہے۔ بس یہ جواز کے واسطے کافی ہے۔[1]

---

[1] فتح القدیر جلد۲ ص۳۳۷ مصر میں ہے ثم یسئل النبی صلی اللہ علیہ وسلم الشفاعة فیقول یا رسول اللہ اسئلك الشفاعة یا رسول اللہ اسئلك الشفاعة واتوسل بك الی اللہ فی ان اموت مسلماً علی ملتك وسنتك ویذکر کل ما کان من قبیل الاستعطاف والرفق ۔۔۔۔۔۔ انتہٰی قلت وکذلك فی الطحطاوی علی مراقی الفلاح فراجع له تجده کافیاً فی کل باب شافیاً من کل ارتیاب واللہ اعلم بالصواب والیه المرجع والمآب۔ [2] فتاویٰ رشیدیہ جلد۱ ص۱

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے بھی اس آیت شریفہ میں "جاءوک" (اگر گنہگار آپ کے پاس حاضر ہوں) کو عام رکھا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

ولو انھم اذ ظلموا انفسھم جاءوک فاستغفروا اللہ واستغفر لھم الرسول لوجدوا اللہ توابا رحیما۔ کیونکہ اس میں کسی کی تخصیص ہو تو کیونکر ہو۔ آپ کا وجود باجود تربیت تمام امت کے لیے یکساں رحمت ہے کہ پچھلے امتیوں کا آپ کی خدمت میں آنا اور استغفار کرنا اور کرانا، جب ہی متصور ہے کہ آپ قبر میں زندہ ہوں[1]

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں:۔

مواہب میں بسند امام ابوالمنصور صباغ اور ابن النجار اور ابن عساکر اور ابن الجوزی نے محمد بن حرب ہلالی سے روایت کیا ہے کہ میں قبر مبارک کی زیارت کر کے سامنے بیٹھا تھا کہ ایک اعرابی آیا اور زیارت کر کے عرض کیا کہ یا خیر الرسل: اللہ تعالیٰ نے آپ پر ایک سچی کتاب نازل فرمائی جس میں ارشاد فرمایا۔ ولو انھم اذ ظلموا انفسھم جاءوک فاستغفروا اللہ واستغفر لھم الرسول لوجدوا اللہ توابا رحیما۔ میں آپ کے پاس اپنے گناہوں سے استغفار کرتا ہوا اور اپنے رب کے حضور میں آپ کے وسیلے سے شفاعت چاہتا ہوا آیا ہوں۔ اور پھر دو شعر پڑھے ...... ان محمد بن حرب کی وفات ۲۲۸ھ میں ہوئی ہے اھ۔ غرض زمانہ خیر القرون کا تھا اور کسی سے اس وقت نکیر منقول نہیں، پس حجت ہو گیا[2]

فثبت ان حکم الاٰیۃ باق بعد وفاتہ صلی اللہ علیہ وسلم[3]

ترجمہ: ثابت ہو چکا ہے کہ اس آیت کا حکم حضورؐ کی وفاتِ شریفہ کے بعد بھی باقی ہے۔

یہ تحقیق اپنے مقام پر ثابت ہو چکی ہے کہ اس آیت کا حکم حضورؐ کی وفاتِ شریفہ کے بعد بھی باقی ہے۔

---

[1] آب حیات ص۴۰ [2] نشر الطیب ص۲۱۹ [3] اعلاء السنن جلد ۱۰ ص ۳۲۹، ص ۳۳۰

اعرابی کی حکایتِ مذکورہ حافظ ابن کثیرؒ اپنی تفسیر (جلد ۲ ص۳۲ا مصر) میں شیخ المنصور صباغ کی روایت سے نقل فرماتے ہیں اور یہی واقعہ تفسیر مدارک (جلد ا ص۳۹۹ مصر) میں بھی موجود ہے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ فرماتے ہیں:-

جمیع ارباب مذاہب اربعہ کہ تصنیفِ مناسکِ حج کردہ اند، ایں حکایت را آوردہ واستحسان نمودہ وبسیارے از ائمہ اعلام باسانیدے کہ دارند روایتِ آں کردہ۔[1]

ترجمہ: چاروں مذہبوں کے علماء نے، جنہوں نے مناسک حج پر تصنیفات کی ہیں، اس حکایت کو بیان کیا ہے۔ اس کی تحسین کی ہے اور بڑے بڑے ائمہ نے اسے اپنی اپنی سندوں سے روایت کیا ہے۔

ممکن ہے محمد بن حرب کی یہی روایت دراصل حضرت علی المرتضیٰؓ سے منقول ہو، اختصار کے باعث محمد بن حرب سے اُوپر کی سند حذف ہو گئی ہو اور "اعتماد علیٰ محمد بن حرب" کے سبب اس کا ذکر ضروری نہ سمجھا گیا ہو۔ ہم نے اس روایت کو صرف تائید مفہوم اور آیتِ شریفہ کے بیانِ عموم کے لیے بیان کیا ہے۔ مستقل استدلال مقصودِ نظر نہیں۔

---

[1] جذب القلوب ص۱۹۵

تتمۃ الفصل

بیان عقیدہ از عائشہ صدیقہؓ

علامہ سبکیؒ نقل فرماتے ہیں :۔

روی عن عائشۃؓ انہا کانت تسمع صوت الوتد یوتد والمسمار یضرب فی بعض الدور المطنبۃ بمسجد رسول اللہؐ فترسل الیہم لا تؤذوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔[1]

وکذلک فی شرح العلامۃ الزرقانی جلد ۸ ص۳۰۴ مصر۔

ترجمہ۔ حضرت عائشہؓ جب کبھی ان گھروں سے جو مسجد نبوی سے متصل تھے کسی میخ یا کیل لگائے جانے کی آواز سنتی تھیں تو یہ حکم بھیجتی تھیں کہ (خبردار!) حضورؐ کو (اس آواز سے) اذیت نہ دو۔

عن عائشۃؓ قال کنت ادخل بیتی الذی فیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وانی واضع ثوبی واقول انما ھو زوجی وابی فلما دفن عمر معہم فواللہ ما دخلت الا وانا مشدودۃ علیّ ثیابی حیاء من عمرؓ رواہ احمد۔[1]

رجال اسناد احمد رجال صحیح۔ (تنقیح الرواۃ جلد ۱ ص۳۴۳ مطبع انصاری)

ترجمہ۔ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں اپنے حجرے میں، جس میں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے، چادر کھلے داخل ہو جایا کرتی تھی۔ مجھے یہی خیال ہوتا تھا کہ میرے خاوند اور میرے والد ہی تو یہاں ہیں۔ جب حضرت عمرؓ وہاں دفن ہوئے، تو خدا کی قسم،

---

[1] شفاء السقام ص۱۷۳

میں وہاں پردے ہی سے جاتی تھی اور یہ حضرت عمرؓ سے حیا کے باعث تھا۔

دیکھئے: حضرت عائشہؓ یُوں نہیں کہہ رہی ہیں کہ میں اس حجرے میں داخل ہوتی تھی، جس میں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بدنِ میّت مدفون تھا۔ بلکہ یُوں فرما رہی ہیں:۔

"جس میں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے"

نبوّت و رسالت کے لیے ادراک و شعور لازم ہے۔ اگر ذاتِ مدفون محض بے حس و بے شعور ہو، تو پھر اسے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی نہیں کہا جا سکتا۔ اور اگر کہنا ہی ہو، تو حکمی طور پر کہنے سے چارہ نہیں، حقیقی اعتبار سے بے حس و بے شعور ذاتِ مدفون کو ہرگز رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کہنے کی گنجائش نہیں۔ فقط روحِ اقدس کے لیے تو فقط "رسول اللہ" کے اطلاق کے لیے تاویل ہو سکتی ہے۔ روحِ اقدس اور جسمِ اطہر کے مجموعہ پر بھی یہ اطلاق بلاریب صحیح ہے۔ لیکن فقط بدن، جس میں ادراک و شعور دونوں منتفی ہوں۔ اس پر حقیقی اعتبار سے اطلاقِ رسول قطعاً نہ ہو سکے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت ام المومنینؓ حضورِ انورؐ کو آپ کے روضۂ اقدس میں زندہ یقین کرتی تھیں۔ حضرت عائشہؓ کا سماعِ موتیٰ سے انکار مشہور رہے۔ مگر یہاں نہ صرف اس کا استثنا ہے۔ بلکہ رویتِ بصری بھی ثابت کی جا رہی ہے۔ ہاں پردے کی چادر کا چونکہ مقصودِ وجود ہی ستر و حیاء اور پردے کا اہتمام ہوتا ہے۔ اس لیے اس کی کثافت باقی رہنے دی جاتی تھی۔ تاکہ جس طرح قبورِ شریفہ کی پاک مٹی سے یہ انکشافات جاری ہیں، پردے کی چادر سے ایسا نہ ہو اور اس کا مقصودِ وجود باطل ہو کر نہ رہ جائے۔

بات دراصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب تک کسی چیز کو قائم رکھتے ہیں، اس کا مقصودِ وجود ضائع نہیں فرماتے۔ ہاں ضمنی حالات میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ قبر کا مقصودِ وجود ذاتِ مدفون کو عامۃ الناس سے پردے میں کرنا ہوتا ہے، عامۃ الناس کو ذاتِ مدفون سے پردے میں لانا نہیں ہوتا۔ اگر ایسا ہو تو ضمناً ہوتا ہے۔ پس اگر ذاتِ مدفون کو پردۂ قبر میں سے باہر کا انکشاف ہو رہا ہو اور باہر

والے اسے عادۃً نہ دیکھ سکیں تو اس سے مقصود وجود باطل نہیں ہوتا اور پردہ چادر کا چونکہ مقصود وجود ہی اوڑھنے والے کو پردے میں لانا ہے۔ اس لیے انکشاف کی حدود اگر اس کے پار نہ ہو سکیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

حاشیہ مشکوٰۃ میں اس حدیثِ عائشہؓ پر یُوں لکھا ہے :۔

اوضح دلیل علی حیات المیت وعلی انه ینبغی احترام القبور عند زیارۃ مهما امکن لاسیما الصالحون بان یکون فی غایة الحیاء والتأدب بظاهرہ باطنه۔[1]

ترجمہ۔ یہ حدیث حیاتِ میت پر بہت واضح دلیل ہے اور اس پر کہ قبورِ شریفہ کا احترام جہاں تک ممکن ہو سکے کیا جائے، خاص طور پر صالحین کی قبور کے سامنے بہت ادب وحیاء ملحوظ رہے۔

حضرت صدیقہ کے اس تعامل سے نہ صرف آنحضرتؐ کی حیاتِ طیبہ اور آپ کے حواس کے روشن ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ بلکہ حضرت صدیق اکبرؓ اور حضرت فاروق اعظمؓ کی حیاتِ اقدس اور اُن کے حواس کے روشن ہونے کا بھی ثبوت ملتا ہے۔

ولید بن عبدالملک کے زمانۂ خلافت میں جب کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ والیٔ مدینہ تھے تو ایک دفعہ آنحضرتؐ کے روضۂ اقدس کی دیوار خستگی کی وجہ سے کچھ کھُل گئی، تو ایک قدم نظر آیا، لوگ بہت گھبرائے۔ یہاں تک کہ :۔

جاء سالم بن عبدالله بن عمر بن الخطابؓ وعرف الناس انها قدم جده عمر بن الخطابؓ۔[2]

ترجمہ۔ حضرت عمرؓ کے پوتے سالمؒ آئے اور انہوں نے پہچان کی کہ یہ اُن کے دادا سیدنا حضرت عمرؓ کا قدم مبارک ہے۔

---

[1] مشکوٰۃ صفحہ ۱۵۴ [2] مختصر تذکرہ قرطبی صفحہ ۴۰

قبر کے انکشاف کی ایک اور مثال

گنبد خضریٰ کے مکین مٹی کی دبیز تہ سے گذر کر زائر کو دیکھ پائیں یا زائر کی روحانی نظر اس دبیز تہ کو چیر کر مدفون افراد قدسیہ تک جا پہنچے۔ قبر کا یہ انکشاف اونچی روحانی اڑان اڑنے والوں کو نصیب ہو ہی جاتا ہے۔ یہ کرامت بطور خرقِ عادت ہوتی ہے کیونکہ عادت یہی ہے کہ مٹی حائل ہونے سے اِدھر کی نگاہ اُدھر نہ جا سکے اور دنیا کی آنکھ احوالِ برزخ کو نہ دیکھ سکے۔

ہاں برزخ والے دنیا والوں کو دیکھ لیں اس کے مواقع اس سے کہیں زیادہ ہیں کہ کوئی دنیا کی آنکھ برزخی حالات کا کچھ مشاہدہ کرے۔ دسویں صدی کے مجدد محدثِ شہیر ملا علی قاریؒ (م ۱۰۱۴ھ) شرح اللباب میں لکھتے ہیں:۔

ثم من اٰداب الزیارۃ ماقالوا من انہ یأتی الزائر من قبل رجل المتوفی لا من قبل راسہ لانہ اتعب لبصر المیت بخلاف الاول لانہ یکون مقابل بصرہ۔[1]

ترجمہ: قبروں کے آداب زیارت میں سے ہے کہ زائر میت کے پاؤں کی طرف سے آئے سر کی طرف سے نہ آئے کیونکہ اس طرح کرنا میت کی آنکھ کے لیے زیادہ تکلیف دہ ہوگا بخلاف پہلی صورت کے۔ کیونکہ اس صورت میں زائر اس کی آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے۔

میت زائر کو دیکھے یہ صرف اس صورت میں ہوگا کہ مٹی کے دبیز پردے میت کی آنکھوں کے آگے حائل نہ ہو اور وہ برابر زائر کو دیکھ سکے ــــ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس کی آنکھ زائر کے کپڑوں کی تہ کو بھی پار کرے گی یا نہ؟

جواب یہ ہے کہ نظر کا مٹی کے دبیز پردے کے پار ہونا خرقِ عادت اور خلافِ قیاس ہے اللہ تعالیٰ کسی کو یہ منظر دکھادیں تو یہ اس کی کرامت ہے نہ دکھادیں تو یہ مٹی کی عادت ہے

---

[1] رد المحتار جلد ۲ صفحہ ۲۴۲ طبع جدید

کہ جب یہ حائل ہو تو کچھ نظر نہیں آتا۔

اصلِ فقہ میں یہ بات طے ہے کہ جو بات خلاف قیاس اور خرق عادت کے طور پر ہو وہ اپنے مورد پر منحصر رہتی ہے۔ ہم اس پر قیاس کرکے آگے یہ بات نہیں کہہ سکتے کہ پھر وہ نگاہ زائر کے کپڑوں کے اندر بھی پہنچتی ہوگی اور زائر میت کو بالکل ننگا دکھائی دیتا ہوگا۔ اگر اس کا ذرا بھی احتمال ہوتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کبھی بقیع کے باسیوں کے لیے وہاں دعائے مغفرت کرنے نہ جاتے۔

یہ بات مانی جا سکتی ہے کہ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ اور گنبدِ خضریٰ کے مکینوں کے مابین مٹی کی دبیز تہ حائل نہ رہے۔ لیکن اس پر قیاس کرکے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ پھر ان مکینوں کی نگاہ اس چادر سے بھی گزر جانی چاہیئے جس سے حضرت ام المؤمنینؓ نے روضہ اطہر پر حاضری کے وقت پردہ کیا ہوتا تھا۔

حضرت ام المؤمنینؓ کا روضہ انور میں حضرت عمرؓ سے پردہ کرنا بتلاتا ہے کہ وہ نہ صرف حضورؐ کی حیات فی القبر کی قائل تھیں بلکہ وہ حضرات شیخین کریمینؓ کی بھی حیات فی القبر کا عقیدہ رکھتی تھیں حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں:۔

فیہ اوضح دلیل علی حیاۃ المیت وعلی انہ ینبغی احترام المیت عند زیارتہ مھما امکن لاسیما الصالحون بان یکون فی غایۃ الحیاء والتادب بظاھرہ وباطنہ۔[1]

ترجمہ۔ اس میں حیاتِ میت کی کھلی دلیل ہے اور یہ کہ زیارتِ قبر کے وقت میت کا خود احترام کیا جائے جتنا بھی ہو سکے خاص کر نیک لوگوں کا — ظاہر اور باطن ہر دو پہلوؤں سے پورے ادب اور حیاء سے وہاں آئے۔

بتلایئے یہ احترامِ میت کس قبر کے کنارے کیا جا رہا ہے اور اسے میت سمجھ کر کیا جا رہا ہے یا زندہ — اور کیا حضرت شیخ نے اسے حیات میت کی روشن دلیل نہیں کہا؟

---

[1] تنقیح اللمعات جلد ۴ صفحہ ۳۸۴

سیدنا حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا تعامل

حدثنا ابو معاویۃ عن عبید اللہ عن نافع عن ابن عمرؓ انہ کان اراد ان یخرج دخل المسجد فصلی ثم اتی قبر النبیؐ فقال السلام علیک یارسول اللہ، السلام علیک یا ابابکر، السلام علیک یا ابتاہ ثم یاخذ وجھہ وکان اذا قدم من سفر یفعل ذلک قبل ان یدخل منزلہ۔[1]

اخرجہ عبد الرزاق ایضاً بسند صحیح۔ (وفاء الوفاء للسمہودی جلد ۲ صفحہ ۴۱۲)

ترجمہ۔ حضرت ابن عمرؓ جب کبھی سفر پہ روانہ ہوتے تو مسجد نبویؐ میں آتے، نماز پڑھتے اور پھر روضۂ انور پہ حاضر ہوتے اور السلام علیک یارسول اللہؐ، یا ابابکرؓ، اور السلام علیک اے ابا جانؓ! پڑھتے اور پھر اپنے منہ کو مقام لیتے اور جب سفر سے واپس ہوتے، تو اپنے گھر جانے سے پہلے پھر اسی طرح صلوٰۃ وسلام عرض کرتے۔

عبدالرحمٰن باسناد صحیح می آرد کہ ابن عمرؓ چوں از سفر قدوم مے آرد۔ اوّل بقبر شریف می رسید ومی گفت۔ السلام علیک یا رسول اللہؐ![2]

وراجع لہ المؤطا للامام محمد ص۳۹۶

روایات سابقہ میں صرف سلام عرض کرنے ہی کا صیغہ ملتا ہے:

السلام علیک یارسول اللہ ——— وغیر ذلک۔

البتہ شرح شرعۃ الاسلام میں جو کہ احناف کے ہاں بہت بڑا علمی اور تحقیقی فقہی سرمایہ ہے۔ یوں بھی مرقوم ہے:

یقول الصلوٰۃ والسلام علیک یارسول اللہ۔

---

[1] المصنف لابن ابی شیبہ جلد ۱ ص۱۳۸ ہند [2] جذب القلوب ص۲۰۰

عن نافع کان ابن عمرؓ یسلم علی القبر رأیته فی الیوم مأۃ مرۃ واکثر یجئ الی القبر فیقول السلام علیکؐ[1]

ترجمہ: حضرت نافعؒ کہتے ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ کو میں نے دیکھا، وہ روضۂ اطہر پہ سلام عرض کرتے تھے۔ میں نے ایک ایک دن میں انہیں سو سو دفعہ، بلکہ اس سے بھی زائد بار بار قبر شریف پہ آتے اور السلام علیک یارسول اللہؐ پڑھتے دیکھا۔

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ نے بھی یہی صیغے سلام کے لکھے ہیں:۔

السلام علیکَ یارسول اللّٰہ۔ السلام علیک یاخیر خلق اللّٰہ۔ السلام علیکَ یاحبیب اللّٰہ[2]

سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی نزول فرمانے کے بعد روضۂ اطہر پہ حاضری دیں گے۔ حضرت ابوہریرۃؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا:۔

ولیاتین قبری حتی یسلم علی ولا ردن علیہ رواہ الحاکم وصححہ[3]

ترجمہ: حضرت عیسیٰؑ ضرور میری قبر پہ بھی آئیں گے اور سلام کہیں گے اور میں بھی اس کا جواب دوں گا۔

مسند ابی یعلیٰ جلد ۶ ص۱۰۱ میں یہ حدیث بدیں الفاظ مروی ہے:۔

والذی نفس ابی القاسم بیدہ لینزلن عیسیٰ ابن مریم اماماً مقسطاً و حکماً عدلاً... ثم لئن قام علی قبری فقال یامحمد لاجیبنہ۔

یہاں کون سی قبر مراد ہے جس پہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آئیں گے یہی مدینہ منورہ والی یا کسی اعلیٰ علیین والی۔ یہ آپ سوچیں یا محمدؐ کے الفاظ روایت بالمعنیٰ ہوں گے کیونکہ حضورؐ اسے روایت کر رہے ہیں۔

---

[1] منتہی المقال ص۳۰، للمفتی صدر الدین [2] زبدۃ المناسک ص۹۰ لاہور [3] درمنثور جلد ۲ ص۲۴۵

روضۂ اطہر کے پاس ان صیغوں سے صلوٰۃ وسلام عرض کرنا اسی لیے ہے کہ حضورؐ حدودِ مسجد کے قرب میں خود سماعت کرتے ہیں پس اس طرزِ ادا سے کسی غلط عقیدے کا ایہام نہیں ہوتا۔ اگر حضور روضۂ مطہرہ پر بھی خود نہیں سُنتے۔ تو پھر ان صیغوں سے صلوٰۃ وسلام عرض کرنا غلط عقائد کا ایہام پیدا کرنا ہے اور ظاہر ہے کہ اس باب میں ہمارے ائمہ کرام الفاظ موہمہ سے احتراز کرنے کا حکم دیتے ہیں صلوٰۃ وسلام کی مختلف کیفیات صرف اسی صورت میں لائق قبول ہیں کہ کسی طرح کے غلط عقیدے کا ایہام پیدا نہ ہوتا ہو۔

علامہ شامیؒ لکھتے ہیں :-

قد اختار جماعة من العلماء كيفيات في الصلوٰة. ومقتضى كلام ائمتنا المنع من ذٰلكَ الا فيما ورد عنه صلى الله عليه وسلم على من اختاره الفقيه۔[1]

ترجمہ علماء کے ایک طبقے نے صلوٰۃ وسلام پڑھنے کے باب میں مختلف کیفیات جائز قرار دی ہے۔ ہمارے ائمہ احناف کے کلام کا حاصل ہے، کہ ماسوائے ماثورہ صیغوں کے باقی تمام الفاظ موہمہ سے پرہیز کیا جائے۔ جیسا کہ فقیہ نے فیصلہ فرمایا ہے۔

پس اگر حضورؐ اپنے روضۂ اقدس کے قریب عرض کیے گئے صلوٰۃ وسلام کو خود نہ سُنتے ہوتے۔ تو پھر ان صیغوں سے صلوٰۃ وسلام عرض کرنا غلط عقائد کا ایہام پیدا کرنے کی وجہ سے ہرگز جائز نہ ہوتا اور اور اگر جائز ہوتا تو پھر قریب و بعید ہر جگہ سے جائز ہوتا اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا یہ عمل ہر جگہ پہ توارث تعامل کے طور پر موجود ہوتا۔

یہ گمان نہ کیا جائے کہ پھر عامۃ المسلمین کی قبروں کے پاس صیغہ خطاب سے سلام کہنے کی کیا توجیہہ ہوگی۔ اس لیے کہ وہاں خطاب جمع اور جنس مومنین کو ہے، کسی معین کو نہیں۔ اور یہاں ایک ذات معین کو اس صیغہ خطاب سے مخاطب کیا جا رہا ہے اور ظاہر ہے کہ غیر معین مخاطبین سے خطاب مجاز کے جتنے پہلو اپنی لپیٹ میں لیے ہوتا ہے معین فردِ واحد کہ خطاب کرنے میں اس کی اتنی گنجائش نہیں ہوتی۔ فافهم وتفكر۔

---

[1] ردالمحتار جلد ۵ ص ۳۴۹

حضرت ابو ایوب انصاریؓ

عن داؤد بن صالح قال اقبل مروان یوما فوجد رجلاً واضعاً وجهه علی القبر فاخذ برقبته وقال اتدری ماتصنع قال نعم فاقبل علیه فاذا هو ابو ایوب الانصاریؓ فقال جئت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولم آت الحجر سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول لا تبکوا علی الدین اذا ولیه اهله ولکن ابکوا علیه اذا ولیه غیر اهله [1]

اخرجه الحاکم وقال صحیح الاسناد جلد ۴ ص۵۱۵ واقر علیه الذهبیؒ فقال صحیح [1]

ترجمہ۔ ایک دن مروان آیا اور اس نے ایک شخص کو روضۂ انور پر منہ رکھے ہوئے دیکھا اس نے اسے گردن سے پکڑ کر ہٹایا اور کہا " جانتا ہے کہ تو کیا کر رہا ہے؟ اس نے کہا، ہاں ــــ وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔ کیا دیکھتا ہے کہ وہ حضرت ابو ایوب انصاریؓ ہیں۔ آپ نے فرمایا " میں رسول اللہ کے پاس آیا ہوں پتھروں کے پاس نہیں آیا، میں نے حضورؐ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اس وقت دین

---

[1] رواہ احمد ایضاً بسند حسن قال حدثنا عبد الملک بن عمرو حدثنا کثیر بن زید عن داؤد بن ابی صالح قال ...... الخ قال الهیثمی رواہ احمد والطبرانی فی الکبیر والاوسط وفیه کثیر بن زید وثقه جماعة وضعفه النسائی (کما فی کتاب الضعفاء والمتروکین للامام النسائی) وغیرہ ورواہ یحیی بن الحسین بن جعفر الحسینی فی اخبار المدینة حدثنی عمر بن خالد حدثنا ابو نباتة عن کثیر بن زید عن المطلب بن عبد اللہ قال السبکی وابو نباتة ومن فوقه ثقات وعمر بن خالد لم اعرفه قلت لاضیر فان احمد رواہ عن عبد الملک بن عمرو وهو ثقة عن کثیر بن زید وقد حکم السبکیؒ بتوثیقه (کذا فی وفاء الوفاء جلد ۴ ص۱۳۴۲)

پر نذر ماننا جب اس کے والی اُس کے اہل ہوں۔ بلکہ اس وقت رونا جب کی دین کی ولایت غیر اہل ہاتھوں میں آجائے۔

پیش نظر رہے کہ یہ مقام فقط انہی حضرات کا ہے، جنہیں انکشاف ہو رہا ہو اور وہ قبر سے نہیں، صاحب قبر سے مصروفِ نیاز ہوں۔ پس ان لوگوں کے لیے جو اس مقام انکشاف کے بغیر روضاتِ عالیہ یا قبورِ شریفہ سے لپٹتے ہوں یا انہیں بوسہ دیتے ہوں۔ اس حدیث میں کوئی دلیل اور حجت نہیں۔ ان کے لیے ایسے امور کا ارتکاب جیسا کہ فقہائے کرامؒ نے فرمایا ہے، وہ قطعاً ناجائز ہے۔

حضرت ابو ایوب انصاریؓ کی حضورؐ کی خدمت میں یہ حاضری بتاتی ہے کہ ان کاملین کے لیے کس طرح برزخی پردے اُٹھے ہوئے تھے۔ حضرت ابو ایوب انصاریؓ جب خود قسطنطنیہ میں دفن ہوئے تو دنیا نے دیکھا کہ آپ کے برزخی مقام کا شعلۂ نور کس پُر شکوہ پیرائے میں پورے فوجی کیمپ کو منور کر گیا۔ علامہ سرخسیؒ (۴۸۳ھ) لکھتے ہیں:۔

ودفنوہ لیلاً فصعد من قبرہ نور الی السماء ورای ذلک من کان بالقرب من ذلک الموضع۔

ترجمہ: مسلمانوں نے آپ کو رات کو دفن کیا معاً آپ کی قبر سے ایک شعلہ نور اُٹھا اور وہ اوپر بلند ہوا جو لوگ بھی اس مقام کے قریب تھے سب نے یہ منظر دیکھا۔

حضرت ابو ایوب انصاریؓ کی حیاتِ برزخی اس وقت ہی ہر وارد و صادر پہ کھل گئی تھی۔

خلاصۃ البیان

یہ کہ آنحضرتؐ کے ارشاداتِ عالیہ، خلفائے راشدینؓ کے عقائدِ قدسیہ، ام المومنینؓ کے عملی فیصلے اور صحابہ کرامؓ کے نظریات یکے بعد دیگرے آپ کے سامنے آچکے ہیں۔ ان سب میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ حضور انورؐ اپنے روضۂ اطہر میں فائز الحیات ہیں اور قریب عرض کئے گئے صلوٰۃ و سلام کو خود سنتے ہیں۔ احادیثِ خمسہ اور خلفائے اربعہ کے فیصلوں کے بعد اب مسالکِ اربعہ ملاحظہ کیجئے:۔

مذاہب اربعہ قرآن کے خلاف نہیں چلے

مذاہب اربعہ میں آپس میں کتنے بڑے چھوٹے اختلافات ہیں مگر حضورؐ کی حیات بعد الوفات پر چاروں متفق ہیں. کیوں کہ اہل السنۃ والجماعۃ عقیدہ میں سب ایک ہیں، مسئلہ حیات النبی میں کچھ بھی اختلاف کی گنجائش ہوتی تو یہ موقع تھا جس میں کوئی ایک فریق اس مسئلہ میں دوسرا پلیٹ فارم ترتیب دے سکتا تھا. لیکن مسئلہ حیات النبی کی نوعیت کچھ ایسی یقینی ہے کہ یہ چاروں طبقے اپنے دوسرے بیسیوں اختلافات کے باوجود اس میں سرمو بھی ایک دوسرے سے مختلف نہیں دارالعلوم دیوبند کا یہ ۱۳۰۵ھ کا مفصل فتوےٰ یہاں ہدیۂ قارئین ہے. غور فرمائیں کہ پنجاب کے مماتی گروہ میں اگر کچھ بھی مسلکی صداقت علمی قوت اور استدلالی شوکت ہوتی تو یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ ہندوستان کے دس ہزار مدارس دینی میں کوئی ایک معروف شیخ الحدیث بھی ان کا ہمنوا نہ ہو اور یہ بدعتی ٹولہ صرف پنجاب میں ضد اور انتشار کے سہارے ایک اختلافی مسلک بنائے بیٹھا ہو.

الفصلُ الثّانی

مذاہبِ اربعہ در حیاتِ نبویّہ

مالکیہ

سیّدنا حضرت امام مالکؒ مدنی ہونے کے اعتبار سے اس باب میں خاص طور پر ممتاز ہیں آپ روضۂ اطہر کے پاس ہی مسجدِ نبویؐ میں درسِ حدیث دیتے تھے۔

امیر المومنین ابو جعفر نے امام مالک سے کسی مسئلے میں مسجدِ نبوی میں گفتگو کی تو امام مالکؒ نے فرمایا، اے امیر المومنین، تم کو کیا ہوا؟ اس مسجد میں آواز مت بلند کرو، کہ حضورِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا احترامِ وفات کے بعد وہی ہے، جو حالتِ حیات میں تھا، سو ابو جعفر دب گیا۔

(وکذٰلک فی وفاء الوفاء جلد ۲ صـ۴۲۳ طبع مصر)

نقل عن الامام مالکؒ انہ کان یکرہ ان یقول رجل زرت قبر النبیؐ قال ابن رشد من اتباعہ ان الکراھۃ لغلبۃ الزیارۃ فی الموتیٰ وھو صلی اللہ علیہ وسلم احیاہ اللہ تعالیٰ بعد موتہ حیاۃ تامۃ واستمرت تلک الحیٰوۃ وھی مستمرۃ فی المستقبل ولیس ھٰذا خاصۃ بہ صلی اللہ علیہ وسلم بل یشارکہ الانبیاء فھو حی بالحیاۃ الکاملۃ مع الاستغناء عن الغذاء الحسی الدنیوی۔[2] (وکذا فی وفاء الوفاء جلد ۲ صـ۴۱۳، صـ۴۱۴ مصر)

---

[1] نشر الطیب از حضرت تھانوی صـ۲۰۱ مطبوعہ دیوبند [2] نور الایمان بزیارۃ حبیب الرحمٰن صـ۱۴ مولانا عبدالحلیم فرنگی محل

علمائے مالکیہ میں سے امام قرطبیؒ (جلد ۵ ص۲۶۵) امام ابو حیان اندلسی (بحر المحیط جلد ۱ ص۸۳)،
علامہ ابن الحاج، علامہ ابن رشد اندلسی اور ابن ابی جمرہ وغیرہم من الکبائر نے ان مسائل کا خوب تذکرہ
کیا ہے۔

شوافع

شوافع میں سے امام بیہقیؒ اور امام سیوطیؒ نے حیاتِ انبیاء کے عنوان پر مستقل تصانیف
سپردِ قلم کی ہیں۔ علامہ طیبیؒ اور حافظ ابن حجر عسقلانیؒ کے متعدد حوالے مباحث حدیثیہ کے ضمن میں آپ
کے سامنے آچکے ہیں۔ امام غزالیؒ اور علامہ سبکیؒ نے بھی انہی حقائق کی تصدیق فرمائی ہے۔
لطف یہ ہے کہ یہ اکابر، خواہ مالکی ہوں، خواہ شافعی کسی مقام پر بھی اس تحقیق کو اپنے فقہی
مسلک کے تحت ذکر نہیں کرتے، بلکہ جہاں کہیں اس عقیدے کا ذکر آتا ہے، وہاں اسے مسلک اہلسنت
ہی کے طور پر ذکر کرتے ہیں۔ معلوم ہوا یہ کسی ایک فقہی مسلک کا نہیں سب اہلسنت کا اجماعی عقیدہ ہے۔
جمیع اکابر شافعیہ یہی مسلک رکھتے ہیں کہ آنحضرتؐ کو اپنے روضۂ اطہر میں جو حیات حاصل
ہے وہ حیات جسمانی ہے اور وہی جسد اطہر فائز الحیات ہے جو اس دنیا میں تھا۔
علامہ قونویؒ (شافعی المسلک) کا تفرد اس میں تو ہے کہ وہ انبیائے کرام کے استقرار قبر میں
استمرار کے قائل نہیں، بلکہ یہ سمجھتے ہیں کہ انبیائے کرام دفن کے کچھ دن بعد اپنی قبور شریفہ سے اُٹھا
لیے جاتے ہیں اور ملاء اعلیٰ میں استقرار پذیر ہوتے ہیں۔ لیکن اس حقیقت سے انہیں بھی انکار نہیں کہ
انبیاء کرام کی روحیں ان کے اجسادِ کریمہ سے ہرگز جدا نہیں ہوتیں اور جہاں بھی انبیائے کرام کے یہ
دنیا والے جسم ہوں، وہیں انہیں حیات جسمانی حاصل ہوتی ہے۔ حیاتِ جسمانی پہ بہرصورت اجماع
قائم ہے اور علمائے شافعیہ کا "حیات فی القبر" پہ جو اجماع ہے، وہ بھی ایک تفرد سے قطعاً
متاثر نہیں ہوتا۔ علامہ سبکی الشافعیؒ طبقاتِ شافعیہ میں لکھتے ہیں:۔

عندنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حی یحس ویعلم وتعرض علیہ اعمال

الامۃ ویبلغ الصلوٰۃ والسلام[۱]

ترجمہ ہم شافعیہ کے نزدیک حضورؐ زندہ ہیں اور آپ میں احساس وشعور موجود ہے آپ پر اعمال امت بھی پیش ہوتے ہیں اور صلوٰۃ وسلام بھی آپ کو پہنچایا جاتا ہے۔

علامہ یوسف اردبیلی الشافعی کتاب الانوار لاعمال الابرار میں لکھتے ہیں:۔

ویخاطب بعد الموت بقول السلام علیک ایہا النبی ورحمۃ اللہ وبرکاتہ لان الانبیاء احیاء فی قبورھم یصلون ویحجون کما ورد۔[۲]

حنابلہ

حنابلہ میں سے حافظ ابن تیمیہؒ کی یہ تحقیق ہے کہ حضورؐ اپنے روضۂ اطہر کے قریب عرض کئے گئے صلوٰۃ وسلام کو خود بلا واسطہ سنتے ہیں۔ ان کی اپنی تحریر با حوالہ بقید صفحہ ومطبع آپ کے سامنے آچکی ہے۔ حافظ ابن قیم کی تصریحات بھی یکےبعد دیگرے آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں۔

قال ابن عقیل من الحنابلۃ ھو صلی اللہ علیہ وسلم حی فی قبرہ یصلی۔[۳]

ترجمہ۔ حنابلہ کے مشہور بزرگ ابن عقیل فرماتے ہیں کہ حضور انورؐ اپنی قبر شریف میں زندہ ہیں اور نمازیں بھی پڑھتے ہیں۔

حنفیہ کرامؒ

(۱) علامہ شرنبلالیؒ نور الایضاح میں فرماتے ہیں (یہ کتاب دار العلوم دیوبند کے نصاب تعلیم میں داخل ہے)

ولما ھو مقرر عند المحققین انہ صلی اللہ علیہ وسلم حی یرزق متمتع بجمیع

---

[۱] طبقات شافعیہ جلد ۲۲ ص ۲۸۲ [۲] کتاب الانوار جلد ۲ ص ۱۴۱ مصر [۳] الروضۃ البہیۃ ص ۱۴

عہ مسالک اربعہ میں سے اس مسلک کو باوجودیکہ یہ رتبۃً، تحقیقاً اور قبولاً باقی سب مسالک پر فائق و مقدم ہے، آخر میں اس لیے بیان کیا گیا ہے کہ اس کی کچھ تفصیل مطلوب تھی اور پہلے تین مسالک چونکہ ہمارے بلاد میں کم پائے جاتے ہیں۔ اس لیے ان کے متعلق اجمال سے کام لیا گیا ہے۔

الملاذ والعبادات غیرانه احجب عن ابصار القاصرین عن شریف المقامات۔[۱]

ترجمہ۔ محققین کے نزدیک یہ طے شدہ ہے کہ حضور انورؐ زندہ ہیں اور آپ کو رزق بھی ملتا ہے اور عبادات سے آپ لذت بھی اٹھاتے ہیں، ہاں اتنی بات ہے کہ وہ ان نگاہوں سے پردے میں ہیں جو ان مقامات تک پہنچنے سے قاصر رہتی ہیں۔

(۲) مراقی الفلاح میں ہے:۔

ینبغی لمن قصد زیارۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان یکثر الصلوٰۃ علیہ فانہ یسمعھا وتبلغ الیہ۔[۲]

ترجمہ۔ جو شخص حضور اکرمؐ کی زیارت کرنے کے لیے آئے اسے چاہیئے کہ کثرت سے درود عرض کرے۔ کیونکہ آپ اُسے خود سُن رہے ہوتے ہیں اور (دور سے) آپ کو پہنچایا بھی جاتا ہے۔

(۳) طحطاوی میں ہے:۔

(فانہ یسمعھا) ای اذا کانت بالقرب منہ صلی اللہ علیہ وسلم (وتبلغ الیہ) ای یبلغھا الملک اذا کان المصلی بعیداً۔[۳]

ترجمہ۔ آپ صلوٰۃ وسلام کو اس وقت خود سنتے ہیں جب قریب سے عرض کیا جا رہا ہو اور فرشتے اس وقت پہنچاتے ہیں جب یہ دُور سے پڑھا جا رہا ہو۔

تنبیہ

علامہ شرنبلالیؒ کا مذکورہ سابقہ فیصلہ اور پھر اسے مختار محققین قرار دینا اگر کچھ بھی محل نظر ہوتا تو اس کے شارح اور پھر شارح کے شارح ہر ایک مرحلے پر اس کی تصدیق و توثیق نہ کرتے چلے جاتے آخر کسی مقام پر اُسے نشانۂ ضعف کیا جاتا۔ جب ہر مرحلے پر اس کی تصدیق ہی تصدیق ہے۔ تو اس یقین سے چارہ نہیں کہ فقہ حنفی کا متفقہ نظریہ یہی ہے کہ حضور انورؐ اپنے روضہ اطہر میں جسمانی طور پر

فائز الحیات ہیں اور قریب سے عرض کئے گئے صلوٰۃ وسلام کو خود بلا واسطہ سنتے ہیں۔ واللہ اعلم

(۴) محقق علی الاطلاق امام ابن الہمامؒ (المتوفی ۸۶۱ھ) فرماتے ہیں :-

تستقبل القبر بوجهك، ثم تقول السلام عليك ايها النبي ورحمة الله وبركاته . . . . وذلك انه عليه السلام فى القبر الشريف المكرم على شقه الايمن مستقبل القبلة فليكثر دعاءه بذلك فى الروضة الشريفة عقيب الصلوٰة وعند القبر ويجتهد فى خروج الدمع فانه من امارات القبول وينبغى ان يتصدق بشئ على جيران النبىؐ ثم ينصرف متباكيا متحسرا على الفراق الحضرة النبوية والقرب منها . . . . ثم يسئل النبى الشفاعة فيقول يارسول الله اسألك الشفاعة يارسول الله . . . . . الخ[1]

ترجمہ. تم حضور اقدسؐ کی قبر شریف کے سامنے ہو کر السلام عليك ايها النبى ورحمة الله عرض کرو . . . . اور یہ اس لیے کہ حضور علیہ السلام اپنی قبر شریف میں دائیں کروٹ قبلہ کی طرف رُخ کیے ہوتے ہیں، روضۂ شریفہ میں درود شریف کے بعد اور قبر کے پاس بکثرت سے دُعا کرے اور آنسو آجانے کی حد تک زاری کرے کیونکہ یہ قبولیت کی علامات میں سے ہے اور چاہیئے کہ روضۂ اطہر کے مجاورین پہ کچھ صدقہ بھی کرے پھر روتا ہوا آپ کے قربِ اقدس سے جدا ہونے کا غم ساتھ لیتے ہوئے واپس ہو . . . . پھر حضور انورؐ سے شفاعت کرنے کی التجا بھی کرے اور کہے کہ یارسول اللہ میں شفاعت کے لیے سوال عرض کرتا ہوں.

(۵) علامہ ابن عابدین شامیؒ :-

امام شافعی کے نزدیک مالِ غنیمت میں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حصہ آپ کی وفاتِ شریفہ کے بعد خلیفہ کو پہنچتا ہے۔ کیونکہ آنحضرتؐ کو یہ حقِ قیادت اور قیام بامور العامۃ کی بناء

---

[1] فتح القدیر جلد ۲ ص ۳۳۷ ادا خراج مصر

پر پہنچیا تھا اور اب آپ کے بعد یہ انتظامیہ قیادت بصورت خلافت موجود ہے۔ احناف کے نزدیک آپ کا یہ حق امامت پر مبنی نہیں، بلکہ رسالت پر مبنی تھا۔ آپ کی وفات شریفہ کے بعد کسی نئے رسول کی آمد شرعاً نہیں۔ پس حنفیہ کے نزدیک سہم رسول وفات پیغمبر سے ساقط ہو جاتا ہے۔ اس سے آگے یہ بحث چلتی ہے کہ کیا رسول کی رسالت اس کی وفات پر ختم ہو جاتی ہے یا نہیں؟ بعض کہتے ہیں صرف حکماً باقی ہوتی ہے، حقیقۃً نہیں۔ لیکن حق یہ ہے کہ وہ حقیقۃً باقی ہے۔ یعنی حضورؐ اب بھی حقیقی طور پہ رسول ہیں۔ رسالت کو صرف حکماً باقی کہنا صحیح نہیں۔ علامہ شامی فرماتے ہیں:-

افاد فی الدر المنتقیٰ انہ خلاف الاجماع قلت وما نسب الی الامام الاشعری امام اھل السنۃ والجماعۃ من انکار ثبوتہا بعد الموت فھو افتراء و بھتان والمصرح فی کتبہ وکتب اصحابہ خلاف مانسبہ الیہ بعض اعدائہ لان الانبیاء علیھم الصلوٰۃ والسلام احیاء فی قبورھم وقد اقام النکیر علی افتراء ذٰلک ابو القاسم القشیری۔[1]

ترجمہ: درِ منتقیٰ میں ہے کہ حضورؐ کی رسالت آپؐ کی وفات شریفہ کے بعد اب بھی حقیقۃً باقی ہے اور اسے صرف حکماً باقی کہنا خلاف اجماع ہے اور امام اہلسنت امام اشعریؒ کی طرف جو اس کا انکار منسوب ہے، وہ افتراء اور بہتان ہے۔ اشاعرہ کی کتابوں میں اس کے خلاف تصریح موجود ہے۔ آپ کی وفات شریفہ کے بعد رسالت کا حقیقۃً باقی نہ رہنا اہل سنت کے بعض دشمنوں نے ان کی طرف منسوب کر دیا ہے کیونکہ انبیاء علیہم السلام تو اپنی قبور شریفہ میں زندہ موجود ہوتے ہیں۔

ان المنع ھنا لانتفاء الشرط وھو اما عدم وجود الوارث بصفۃ الوارثیۃ کما اقتضاہ الحدیث واما عدم موت الوارث بناءً علی ان الانبیاء احیاء فی قبورھم کما ورد فی الحدیث۔[2]

---

[1] شامی باب المغنم وقسمتہ بعد قسمۃ الخمس ص۲۶۶ [2] رسائل ابن عابدین جلد ۲ ص۲۳ معہ الرحیق المختوم شرح قلائد المنظوم

(۶) علامہ عینیؒ :۔

انهم لا يموتون فى قبورهم بل هم احياء۔[1]

ترجمہ: یقیناً انبیائے کرام اپنی قبور شریفہ میں مردہ نہیں ہوتے، بلکہ وہ وہاں زندہ ہیں۔

(۷) امام ملا علی قاریؒ :۔

ان الانبياء احياء فى قبورهم فيمكن لهم سماع صلوة من صلى عليهم۔[2]

ترجمہ: بے شک انبیائے کرامؑ اپنی اپنی قبروں میں زندہ ہوتے ہیں، یہاں تک کہ وہ سُن سکتے ہیں، اس شخص کو جو ان پہ درود پڑھے۔

المعتقد المعتمد انه صلى الله عليه وسلم حى فى قبره كسائر الانبياء فى قبورهم وهم احياء عند ربهم وان لارواحهم تعلقا بالعالم العلوى والسفلى كما كانوا فى الحال الدنيوى۔[3]

ترجمہ: عقیدہ جس پہ پورا اعتماد ہے، وہ یہی ہے کہ حضورؐ اپنی قبر شریف میں زندہ ہیں اور اسی طرح تمام انبیاء اپنی اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور ان کی ارواح قدسیہ کو عالم علوی اور عالم سفلی کے ساتھ ایک تعلق بھی ہوتا ہے اور ایسا ہی تعلق انہیں اس دنیا میں بھی حاصل تھا۔

اکابر فرقہ اہل حدیث

اہلسنت کی کشتی کے پانچویں سوار حضرات فرقہ اہل حدیث ہیں۔ اُن کے اکابر کی تصریحات بھی دیکھئے :۔

(۱) قاضی شوکانی یمنیؒ :۔

روحه صلى الله عليه وسلم لا تفارقه لما صح ان الانبياء احياء فى قبورهم۔[4]

---

[1] عینی شرح بخاری جلد ۷ صفحہ ۱۵۱ [2] مرقات جلد ۲ صفحہ ۲۱۹ [3] شرح الشفاء لملا علی القاری جلد ۲ صفحہ ۱۴۲ مصر [4] تحفۃ الذاکرین صفحہ ۲۸

ترجمہ. حضور انور کی روح مبارک اپنے جسد اطہر سے جدا نہیں ہوتی. کیونکہ صحیح حدیث سے ثابت ہو چکا ہے کہ انبیائے کرام اپنی قبور شریفہ میں زندہ رہتے ہیں.

انہ حی فی قبرہ . . . . وقد ذھب جماعۃ من المحققین الیٰ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حی بعد وفاتہ۔[۲]

ترجمہ. حضور اکرم اپنی قبر میں زندہ ہیں اور محققین کی ایک جماعت کا یہی فیصلہ ہے کہ حضور اپنی وفات شریفہ کے بعد زندہ ہیں.

(۲) شیخ کبیر عبد اللہ بن محمد بن عبدالوہاب نجدی :-

والذی نعتقد ان رتبۃ نبینا صلی اللہ علیہ وسلم اعلیٰ مراتب المخلوقین علی الاطلاق وانہ حی فی قبرہ حیوٰۃ مستقرۃ ابلغ من حیاۃ الشھداء المنصوص علیھا فی التنزیل اذا ھو فضل منھم بلا ریب وانہ یسمع من یسلم علیہ۔[۳]

ترجمہ. ہمارا یہی اعتقاد ہے کہ حضور اکرم کا مرتبہ تمام مخلوقات سے علی الاطلاق اعلیٰ ہے اور یہ کہ آپ اپنی قبر شریف میں دائمی طور پہ زندہ ہیں اور آپ کی یہ حیات شہداء کی حیات سے، جو قرآن پاک میں منصوص ہے، بہت بالا ہے، کیونکہ آپ ان سے بلاریب افضل ہیں اور آپ اپنے روضہ اطہر میں سلام عرض کرنے والوں کے سلام کو خود سنتے ہیں.

(۳) نواب صدیق حسن خان :-

حدیث "من صلی علی عند قبری سمعتہ" (جو میری قبر کے پاس آکر درود پڑھتا ہے، اُسے

ع آپ نے اپنے عقائد پہ ایک مستقل رسالہ لکھا ہے جس کا بیشتر حصہ نواب صدیق حسن خاں صاحب نے اپنی کتاب اتحاف النبلاء مقصد دوم میں حرف المیم کے ماتحت نقل فرمایا ہے. شیخ عبد اللہ نے اس میں ان تمام الزامات کی تردید ہے جو اس طبقہ سے منسوب کئے جاتے ہیں. آپ مقلد تھے غیر مقلد نہ تھے.

[۱] نیل الاوطار جلد ۴ صفحہ ۷۱. [۲] صفحہ ۲۱۱ [۳] اتحاف النبلاء، صفحہ ۴۱۵ مطبوعہ کانپور

میں خود سنتا ہوں) کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں:۔ اسنادہ جید [۱]

حج الکرامۃ ص۲۸۵ [عہ] میں واقعہ حرّہ نقل فرمایا ہے کہ امام التابعین حضرت سعید بن المسیبؒ فرماتے ہیں کہ "میں ان دنوں حجرہ شریفہ سے اذان اور اقامت سنتا تھا" روضۂ اطہر سے آواز آنے کی اس روایت کے متعلق نواب صاحبؒ لکھتے ہیں:۔

ابن جوزیؒ بسند متصل تا سعید بن المسیبؒ لایا ہے کہ سعیدؒ نے ایسا فرمایا۔ [۲]

(۴) حضرت مولانا میاں نذیر حسین صاحب دہلویؒ (۱۳۲۰ھ)

اور حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ اپنی اپنی قبر میں زندہ ہیں خصوصاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، کہ فرماتے ہیں کہ جو کوئی عند القبر درود بھیجتا ہے، میں سنتا ہوں اور دور سے پہنچایا جاتا ہوں [۳]

(۵) مولانا وحید الزماں حیدر آبادی (۱۳۳۸ھ) تلمیذ حضرت میاں صاحب

اور پیغمبروں کے اجسام مردہ نہیں وہ جسم سمیت اپنی قبروں میں زندہ رہتے ہیں۔ جیسے دوسری حدیث سے ثابت ہے۔۔۔۔ وہ مرنے کے بعد بھی جب حکم الٰہی ہوتا ہے تو اپنے زائر پر توجہ فرماتے ہیں اور ان کی روح سے زائر کو بہت سے فیوض پہنچتے ہیں ۔۔۔ اگر مردوں میں عموماً احساس اور سمع نہ ہوتا تو اہل قبور پر سلام کیوں مشروع ہوتا کیا لکڑی پتھر کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کرنے کا دیا۔ اس کا وہی قائل نہ ہوگا جو نادان ہے۔ [۴]

(۶) مولانا شمس الحق عظیم آبادی (ھ) شارح سنن ابی داؤد

ان الانبیاء فی قبورھم احیاء ص۲ [۵] انبیاء اپنی قبروں میں زندہ ہوتے ہیں۔ اور حدیث ما من احد یسلم علی الا رد اللہ علی روحی کے تحت لکھتے ہیں:۔

والقول الصحیح ان ھذا لمن زارہ ومن بعد عنہ تبلغہ الملٰئکۃ سلامہ۔ [۶]

عہ وسیأتی تفصیلہ وراجع لہ ص۲۰۹ من ھذا الکتاب [۱] الدلیل الطالب ص۸۴۴ [۲] حج الکرامۃ ص۲۸۵ [۳] فتاوٰے نذیریہ جلد ۲ ص۵۵ ضمیمہ [۴] تیسیر الباری کتاب الدعوات جلد ۶ ص۹۵ [۵] عون المعبود ص

⑦ التعلیقات السلفیہ علی سنن النسائی میں منقول ہے :۔

انھم احیاء فی قبورھم یصلون وقد قال النبیؐ من صلی علیّ عند قبری سمعتہ ومن صلی علیّ نائیاً بلغتہ۔ (التعلیقات السلفیہ علی سنن النسائی ص۲۴۷)

ترجمہ۔ انبیائے کرام اپنی اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور نمازیں بھی پڑھتے ہیں اور حضورؐ نے فرمایا ہے کہ جو مجھ پر میری قبر کے پاس درود پڑھے، اسے میں خود سنتا ہوں اور جو دور سے پڑھے وہ مجھے پہنچایا جاتا ہے۔

التعلیقات السلفیہ جلد ا ص۱۹۵ پر سنن نسائی مطبوعہ دہلی جلد ا ص۱۸۱ کا پورا حاشیہ (جو حیات قبریہ کے حیات جسمانی عنصری اور غیر معطل عن الاشتغال الطیبہ ہونے پر نہایت واضح بیان اور مکمل برہان ہے) منقول ہے اور مؤلف نے اپنی عادت کے مطابق یہاں کوئی اختلافی نوٹ نہیں لکھا۔

⑧ مولانا فضل الرحمٰن بہری پوری

کل پیغمبروں کے اجسام زمین کے اندر صحیح وسالم ہیں قبر شریف میں۔ اور اہلحدیث کا یہی اعتقاد ہے[۱]۔

⑨ مولانا شمس الحق ملتانی از دار الحدیث رحمانیہ ملتان

عالم برزخ میں خصوصیت نبوی سے ایک خاصہ یہ بھی ہے کہ آپ درود وسلام زائر کا سنتے ہیں اور دور سے صلوٰۃ وسلام پہنچایا جاتا ہے[۲]۔

⑩ مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ

آپ میت کی حیات فی القبر اور اعادہ روح دونوں کے قائل تھے۔ آپ لکھتے ہیں:۔

فرشتے میت کو سمجھاتے ہیں[۳] یعاد روحہ بھی ہے[۴]

یہ ان دس حضرات کا بیان ہے جو جماعت اہلحدیث میں لائق تقلید سمجھے جاتے ہیں۔ اب سعودی عرب کے حنبلی علماء جو گو مقلد ہیں مگر اہلحدیث حضرات کے ہاں ان کا بڑا احترام پایا جاتا ہے گو کسی وجہ سے ہو۔ ان کا موقف بھی اس باب میں ملاحظہ کر لیجئے :۔

---

[۱] رسالہ درود شریف از مولانا فضل الرحمٰن [۲] فتویٰ ۱۲ جمادی الثانیہ ۷۰م اھ [۳] فتاویٰ ثنائیہ جلد ا ص۱۹۲ [۴] ص۲۱۵

اب علمائے نجد کی تصریحات بھی ملاحظہ فرمائیں۔

علمائے نجد کا عقیدہ

① شیخ کبیر عبداللہ بن محمد بن عبدالوہاب نجدی کا بیان آپ اس کتاب میں صـ پر اتحاف النبلاء المتقین کے حوالے سے پڑھ آئے ہیں۔

② علامہ نجد شیخ محمد بن عبداللطیف من آل الشیخ کا عقیدہ آپ اس کتاب کے صـ پر ملاحظہ کر چکے ہیں کہ "آپ اپنی قبر میں زندہ ہیں برزخی زندگی کے ساتھ"

⑦ ہم اعتقاد رکھتے ہیں کہ رُتبہ حضور انورؐ کا تمام مخلوق کے مراتب سے اعلیٰ ہے۔ وہ اپنی قبر میں حیاتِ برزخیہ سے زندہ ہیں جو کہ حیاتِ شہداء سے اکمل و افضل ہے اور سلام کہنے والے کا سلام آپ سُنتے ہیں[1]

⑧ پاکستان میں سعودی عرب کے سابق سفیر علامہ عبدالحمید الخطیب فرماتے ہیں:۔
کیا واقعی علمائے نجد اور علمائے وہابیہ کا یہ عقیدہ ہے کہ ان کے ہاں الصلوٰۃ والسلام علیک یارسول اللہ کہنا حرام ہے؟ تو میں نے اس کا جواب دیا کہ تمام اسلافِ وہابیہ اس سلام کو جائز قرار دیتے ہیں بعض لوگ خواہ مخواہ اپنے غلط عقائد وہابیہ کے ساتھ غلط ملط کر کے وہابیہ کو بدنام کر رہے ہیں۔ جیسا کہ انڈونیشیا کی ایک جماعت اور نغ وھابی کے نام سے مشہور ہے۔ مگر ان کے عقائد سراسر وہابیہ کے خلاف ہیں۔ اس سے متاثر ہو کر میں نے یہ قصیدہ لکھا اور اس کو اجلہ علمائے نجد کے سامنے پیش کیا، سب نے تصویب فرمائی[2] اس قصیدۂ میمیہ کا پہلا شعر یہ ہے ؎

علیکَ سلام اللہ یاسیّد الوریٰ
ومن قدرہ عنداللہ عظیم

یہ پورا قصیدہ "تحیۃ للحبیب" علامہ مذکور نے روضۂ اطہر کے سامنے کھڑے ہو کر خود پڑھا۔

---

[1] الہدیۃ السنیۃ والتحفۃ الوہابیۃ النجدیہ صـ۴۷ مطبوعہ مصر [2] دیباچہ رسالہ اسمی الرسالات صـ۲، صـ۳

عقائدِ متکلمین درحیات النبیّن

علم کلام کے مشہور امام علامہ تورپشتیؒ فرماتے ہیں :۔

صلوٰت و برکات چنداں کہ فہم از و پر شود و اندیشہ درو گم گردد از سراپردہ کبریائے او نثار رواں پاک و کالبد زندہ ساکن مدینہ ......

پھر اہلسنّت کے عقائد شمار کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

و ازاں جملہ آں ست کہ بداند کہ کالبد وے را زمین نخورد و بوسیدہ نشود و چوں زمین از وے شگافتہ شود کالبد وے بحال خود باشد و حشر وے و جملہ انبیاء چنیں باشد و حدیثی درست است کہ ان حرم علی الارض ___ اجساد الانبیاء ___ ھم احیاء فی قبورھم یصلّون ___ و اوّل ہمہ پیغمبر ما برخیزد از گور ___ دانستن ایں ہمہ کہ یاد کردیم مہم است[1]

اشاعرہ اور ماتریدیہ کا فیصلہ

(۱) ان النبی صلی اللہ علیہ و سلم فی القبر حی یحس و یعلم و تعرض علیہ اعمال الامۃ و اللہ تعالیٰ خلق ملٰئکۃ سیاحین یبلغون الیہ الصلوٰۃ من امتہ[1]۔

ترجمہ: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قبر شریف میں زندہ ہیں، علم و احساس آپ میں برابر موجود ہیں۔ امت کے اعمال آپ پر پیش ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ایسے فرشتے پیدا کر رکھے ہیں جو زمین میں سیاحت کرتے رہتے ہیں اور امت کا صلوٰۃ وسلام پہنچاتے رہتے ہیں۔

(۲) عندھم محمد صلی اللہ علیہ و سلم حیّ فی قبرہٖ[2]۔

اشاعرہ کے نزدیک حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قبر مبارک میں زندہ ہیں۔

---

[1] کتاب المعتمد فی المعتقد باب دوم فصل ۳ للعلامۃ تورپشتیؒ [2] الروضۃ البہیۃ صہ۱۵

امام ابو منصور الشافعی البغدادی اکابر ائمہ اہلسنت میں سے ہیں۔ آپ کی کتاب اصول الدین عقائد میں سند کا درجہ رکھتی ہے۔ ملا علی قاری نے شرح فقہ اکبر[1] میں آپ کا مرتبہ امامت تسلیم کیا ہے آپ کا عقیدہ کیا تھا؛ مولانا ظفر احمد عثمانیؒ لکھتے ہیں:-

(۳) قال الاستاذ ابو منصور البغدادی قال المتکلمون المحققون من اصحابنا ان نبینا صلی اللہ علیہ وسلم حی بعد وفاتہ[2]

ترجمہ: امام ابو المنصور بغدادیؒ نے فرمایا ہے ہمارے اصحاب محققین متکلمین کا یہی فیصلہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی وفات شریفہ کے بعد پھر زندہ ہیں۔

خلفائے راشدینؓ مذاہب اربعہ اور متکلمین اسلام کے ان اجماعی عقائد کے خلاف جو بھی کوئی نئی راہ چلے ہر چند وہ اپنے موقف کو براہِ راست قرآن کریم سے نسبت کرے۔ لیکن اہل السنۃ والجماعۃ ایک دین مسلسل پر ایمان رکھتے ہیں جو بات امت کے اس اجماعی موقف کے خلاف ہو وہ کبھی حق نہیں ہو سکتی۔

تتمۃ الفصل ؍ عقائد علمائے دیوبند اور المہند

مسلمانوں پر جب بھی غیر اسلامی افکار نے ہجوم کیا مسلمانوں نے انہی کے ہتھیاروں سے ان کو پسپا کیا۔ ما انا علیہ واصحابی سے عہد وفا باندھنے والوں کے خلاف معتزلہ وغیرہ اُٹھے تو یہ متکلمین اسلام ہی تھے جنہوں نے انہیں ہر محاذ پر شکست دی۔

چودہویں صدی کے اوائل میں اہل بدعت پھر اہل سنت سے صف آراء ہوئے۔ اس تحریک کا آغاز بدایوں سے ہوا، پھر بریلی اس کا مرکز بنا اور مولانا احمد رضا خان ۱۳۲۴ھ میں ایک تکفیری دستاویز لے کر حجاز پہنچے۔ اب ضرورت تھی کہ ہندوستان میں اہل السنۃ والجماعۃ (علمائے دیوبند) پھر اپنے عقائد کا ایک خاکہ مرتب کریں۔ المہند انہی عقائد کی ایک تاریخی دستاویز ہے جس میں عقیدہ حیات النبیؐ پوری صراحت سے موجود ہے۔

---

[1] شرح فقہ اکبر ص ۱۴۴ کانپور [2] اعلاء السنن جلد ۱۰ ص ۳۲

الفصل الرابع

شواہد الحیات من بیان الواقعات

واقعہ حرّہ

اسلامی تاریخ کا یہ سانحہ یزید کے عہدِ حکومت میں پیش آیا۔ مظالم کربلا کے بعد ۶۳ھ میں مسلمانوں کی تاریخ اس خونی المیہ سے رنگی گئی۔ یزید نے اہلِ مدینہ پر جن میں بہت سے صحابہ کرامؓ اور اکثر تابعین کرامؒ تھے، فوج کشی کا حکم دیا۔ مسلم بن عقبہ شامی فوج کا سردار تھا۔ اس لشکر نے اپنے ڈیرے حرہ کے مقام پر ڈالے :۔

وحرة هذا ارض بظاهر المدينة لها حجارة سود كثيرة۔[1]

ترجمہ۔ حرہ مدینہ منورہ کے باہر وہ زمین ہے جہاں بہت سے سیاہ پتھر پائے جاتے ہیں۔

جب قتلِ عام اور لوٹ مار کا بازار گرم ہوا تو سب لوگ اپنے اپنے گھروں میں پناہ گزین ہو گئے۔ اس وقت مسجدِ نبویؐ میں حضرت سعید بن مسیّب کے سوا اور کوئی نہ تھا۔

حضرت سعید بن المسیبؒ بڑے جلیل القدر تابعی تھے، ان کے عظمتِ شان کے باعث انہیں افضل التابعین کہتے ہیں۔ آپ نے سینکڑوں ان ہستیوں کو دیکھا، جن کی آنکھیں آنحضرتؐ کی دولتِ دیدار سے بارہا شرف یاب ہو چکی تھیں۔

امام دارمیؒ، ابن سعدؒ، ابونعیمؒ، زبیر بن بکارؒ اور علامہ ابن الجوزیؒ روایت کرتے ہیں کہ

---

[1] مجمع البحار ص ۲۵۶

حضرت سعید بن المسیبؒ نے ارشاد فرمایا:۔

اذا حانت الصلوٰۃ اسمع اذاناً یخرج من قبل القبر الشریف۔ ۔ ۔ ۔ لا یأتی وقت الصلوٰۃ الا وسمعت الاذان من القبر ثم اقیمت الصلوٰۃ فتقدمت فصلیت وما فی المسجد احد غیری۔[1]

ترجمہ: جب نماز کا وقت ہوتا تھا، میں قبر شریف سے اذان کی آواز سنتا تھا، پھر اقامت بھی ہوتی اور میں اسی اقامت سے نماز پڑھتا، ان دنوں مسجد نبوی میں میرے سوا اور کوئی نہ ہوتا تھا۔

اسی واقعہ کو محدثِ شہیر علامہ سخاویؒ نے بھی القول البدیع میں نقل کیا ہے۔ نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ فرماتے ہیں:۔

ابن جوزی بسندِ متصل تا سعید بن المسیبؒ لایا ہے۔[2]

شیخ عبدالحق محدثِ دہلویؒ لکھتے ہیں:۔

وقضیۂ سماع سعید بن المسیبؒ ایام واقعۂ حرہ اذان از حجرہ شریفہ تا سہ روز کہ مردم مفارقتِ مسجد نبوی کردہ بودند۔[2]

ترجمہ: ایام حرہ میں سعید بن المسیبؒ کے حجرۂ شریفہ سے تین دن تک اذان سننے کا واقعہ بہت مشہور ہے۔ ان دنوں لوگ مسجد نبوی میں نہ آتے تھے۔

قبر سے آواز آنے کی ایک اور مثال

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ آنحضرتؐ کے بعض صحابہؓ نے بے خبری میں ایک قبر پر خیمہ گاڑ دیا۔ اس سے سورۂ تبارک الذی بیدہ الملک کی آواز آرہی تھی۔ حتیٰ کہ اس نے تمام سورۃ ختم کی۔ صحابہؓ نے آکر یہ واقعہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا، تو

---

[1] خلاصۃ الوفاء للسمہودی ص۳۸ [2] جذب القلوب ص۱۸۸، مدارج النبوت جلد ۱ ص۱۰۵

آپ نے فرمایا:۔

ھی المانعة المنجیة وتنجیه من عذاب القبر.

ترجمہ۔ یہ سورت عذاب سے نجات دینے والی ہے۔

اسے امام بیہقیؒ اور امام حاکمؒ نے بھی روایت کیا ہے۔ حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے بھی التکشف ص۳۴۴ پر نقل فرمایا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب وعلمہ اتم واحکم فی کل تاب۔

اسے اور مذکورۂ سابقہ واقعہ حرہ کو "واقعہ حال" کہہ کر نظر انداز نہ کیا جائے۔ اس لیے کہ اکابر علمائے ثقات اسے ایک اصول اور ضابطے کے ماتحت ذکر کرتے آئے ہیں۔ خاتم المحدثین حضرت مولانا السید انور شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:۔

ان کثیرا من الاعمال تثبت فی القبور کالاذان والاقامة عند الدارمی وقرأة القران عند الترمذی۔[1]

ترجمہ۔ بے شک بہت سے اعمال قبروں میں بھی ظہور پذیر ہوتے ہیں جیسے کہ دارمی کی روایت میں اذان اور اقامت کا وجود (واقعہ حرہ) اور ترمذی کی روایت سے قبر میں قرأت قرآن کا ثبوت ملتا ہے۔

واقعہ سلطان نورالدین شہید محمود بن زنگیؒ (۵۵۷ھ)

سلطان نورالدین شہیدؒ (شاہِ مصر) نے ایک رات سردارِ انبیاء حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تین بار خواب میں دیکھا کہ وہ سامنے کھڑے دو شخصوں کی طرف اشارہ کر کے فرما رہے ہیں کہ "جلدی پہنچو اور مجھے ان دو شخصوں کے شر سے محفوظ کرو"۔ سلطان نے اپنی فراست سے معلوم کر لیا کہ مدینہ منورہ میں کوئی بہت ناخوشگوار واقعہ پیش آ رہا ہے۔ سلطان مذکور نے اسی وقت رات کے آخری حصے میں اپنے بیس خاص آدمیوں کے ساتھ بہت سا مال ساتھ لے کر مدینہ منورہ کی طرف

---

[1] فیض الباری جلد ۱ ص۱۸۵

چل پڑا اور سولہ دنوں میں شام سے مدینہ منورہ پہنچا۔[1]

آخر کار پتہ چلا کہ دو انگریز جو بظاہر بہت پرہیز گار اور عبادت گزار بنے ہوئے تھے، روضۂ اطہر کے قریب ایک رباط میں مقیم ہو کر سُرنگ کے ذریعے قبر منور تک پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ انہیں عیسائی بادشاہ نے اس ناپاک پروگرام کے ساتھ بھیجا ہوا تھا کہ جسدِ اطہر کو وہاں سے منتقل کر لیا جائے۔ یہ لوگ حاجی بن کر حرم شریف میں داخل ہوئے تھے۔

جس رات وہ روضۂ اطہر کے قریب پہنچنے والے تھے، ابر و باراں اور رعد و برق کا ظہور ہوا زمین کانپنے لگی اور صبح سلطان نورالدین مدینہ منورہ میں حاضر ہو گیا۔ سلطان کی آنکھیں اشکبار تھیں اور ایک عجیب کیفیت طاری تھی۔ بالآخر ملعون فریب کار قتل کر دیئے گئے اور سلطانِ عادل نے حجرہ شریفہ کے گرد خندق کھدوا کر ایک سیسہ پلائی چار دیواری بنا دی تاکہ جسدِ اطہر تک پھر کسی رسائی نہ ہو سکے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:۔

ایں قصہ را جمیع مورخان مدینہ منورہ و مثل شیخ جمال الدین مطری و مجدالدین فیروزآبادی وغیر ایشاں از علمائے اعلام ذکر کردہ اند و تصحیح نمودہ۔[2]

قلت و كذلك فى خلاصة الوفاء باخبار دار المصطفیٰ ص۱۱۶ وانى الشيخ السمهودى بالاسناد والاعتماد۔

تتمۃ الفصل

محب طبری ریاض النضرہ میں اس جیسا ایک اور عجیب واقعہ نقل کرتے ہیں:

روافض حلب کی جماعت والئ مدینہ کے پاس آئی اور اسے (مغالطہ یا) بہت سی رشوت اور

---

[1] جذب القلوب ص۱۱۱ ، مدارج النبوت جلد ۲ ص۴۰۵ [2] جذب القلوب ص۱۱۹

لالچ دے کر اس پر آمادہ کر لیا کہ وہ انہیں رات کے وقت حجرۂ شریفہ تک باریابی دے (تاکہ وہ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کے اجسادِ مطہرہ کو کسی اور جگہ منتقل کر سکیں) امیر نے دربان کو کہہ دیا کہ جب وہ آئیں، تو حرم کا دروازہ کھول دے اور انہیں کسی بات سے نہ روکے۔

دربان کہتا ہے کہ جب عشاء کی نماز ہو چکی اور تمام دروازے بند ہو گئے۔ چالیس رافضی کھودنے، گرانے کے آلات اور شمع لے کر "بابُ السلام" پر آ گئے اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے امیر کے حکم کے مطابق دروازہ کھول دیا اور خود ایک گوشے میں بیٹھ کر رونے لگا۔

خدا کی قدرت کہ ابھی وہ منبر شریف کے برابر بھی نہ پہنچے تھے اور اس ستون کے قریب ہی تھے جو حضرت عثمانؓ کے اینہ ذکردہ حصہ مسجد کے ساتھ ہے کہ تمام کے تمام اپنے سب آلات و سامان کے ساتھ نیچے دھنس گئے۔ والیٔ مدینہ، جو بد مذہب اور منافق تھا، انجامِ کار کا منتظر تھا۔ اس نے مجھے بلایا اور ان لوگوں کا حال پوچھا۔ میں نے جو کچھ دیکھا تھا، پورے کا پورا سنا دیا۔

امیر نے کہا، کیا تو دیوانہ ہو گیا ہے۔ کیا کہہ رہا ہے؟

میں نے کہا۔ امیر خود جا کر دیکھ لیں۔ ان کے دھنسنے کے آثار[1] اور ان کے کپڑوں کے نشان ابھی باقی ہیں۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں:۔

---

[1] دھنسنے کے کچھ آثار اس لیے باقی رہ گئے تھے کہ وہ ملعونین کیفرِ کردار کو پہنچنے کے بعد وہاں سے اکھاڑ کر پھر کسی دوسری جگہ پھینکے جا سکیں۔ اس پاک سرزمین میں انہیں ہمیشہ کا استقرار کیسے مل سکتا تھا اگرچہ "روضة من ریاض الجنة" کی حدود آگے منبر شریف سے شروع ہوتی تھیں اور حجرہ شریفہ تک پہنچتی تھیں اور یہ جگہ جہاں یہ واقعہ پیش آیا تھا، اس قطعہ قدسیہ سے ذرا پیچھے تھی۔ تاہم اس کا بھی احترام قائم رکھا گیا۔ ان ملعونین کے جو حصے دھنسنے سے باقی رہ گئے۔ پھر ان پر حکمِ قتل جاری کیا گیا تھا۔ زیادہ تفصیل کے لیے تحفہ اثنا عشریہ فارسی ص۲۰۱ مطبوعہ لکھنؤ دیکھیے ——— وراجع له کتاب الاستنصار للفاضل السهنانی القاضی۔

طبری نسبت ایں حکایت بہ ثقات مے کند کہ بہ صدق و دیانت مشہور اند و بعضی مورخان مدینہ نیز ذکر کردہ اند۔[1]

ارشاداتِ نبوت، خلفائے راشدینؓ کے نظریاتِ قدسیہ، امہات المؤمنینؓ اور صحابہ کرامؓ کے بیانات عالیہ، مذاہب اربعہ کی تصریحات، متکلمین کرامؒ کے فیصلے اور شواہد واقعات کے بعد دیگرے آپ نے ملاحظہ فرما لیے۔ تاریخ اسلامی کے ان مختلف ادوار میں حیاتِ انبیاء کا مسئلہ اس کثرت سے بیان ہوتا رہا کہ ان تمام نقول کا استقصاء اور دلائل کا احصاء قریب قریب ناممکن ہے۔ ہاں یہ حقیقت لطف سے خالی نہیں کہ جہاں تاریخ کے ہر دور میں یہ مسئلہ اتنے شد و مد سے سامنے آتا رہا، وہاں ایک مثال بھی نہیں ملتی کہ سوادِ اہلسنت کے کسی فقہی یا کلامی مسلک نے اس مرکزی نقطہ حیات سے سرِ مو بھی تجاوز کیا ہو۔ تاریخ کے ہر دور میں بعض ائمہ و اکابر اسے بیان کر دینا اور دوسرے اعیانِ امت میں سے کسی کا اس پر نکیر نہ کرنا، اس حقیقت کی واضح شہادت ہے کہ انبیائے کرام کی حیاتِ برزخیہ کے جسمانی اور اسی دنیا والے جسم سے قائم ہونے پر اہلِ حق اہلسنت کا تاریخِ ملت کے ہر دور میں اجماع رہا ہے۔

شہاداتِ اجماع

(۱) محدثِ کبیر علامہ سخاویؒ تلمیذ خاتمۃ الحفاظ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ :-

نحن نؤمن ونصدق بانہ صلی اللہ علیہ وسلم حی یرزق فی قبرہ ان جسدہ الشریف لاتأکلہ الارض والاجماع علی ھذہ۔

ترجمہ۔ ہمارا ایمان ہے اور ہم اس کی تصدیق کرتے ہیں کہ حضور اکرمؐ اپنی قبر شریف میں زندہ ہیں، آپؐ کو وہاں رزق بھی ملتا ہے اور آپؐ کے جسدِ اطہر کو مٹی نہیں کھاتی، اور اس عقیدے پہ اہلِ حق کا اجماع ہے۔

---

[1] جذب القلوب ص۱۱۳ [2] القول البدیع ص۱۲۵

(۲) شیخ الاسلام محدث شہیر حضرت علامہ عینیؒ:۔

ومذهب اهل السنة والجماعة ان فی القبر حیاة وموتًا فلابدّ من ذوق الموتتین لکل احد غیر الانبیاء۔[1]

ترجمہ۔ پورے اہلسنت والجماعت کا یہی مذہب ہے کہ قبر میں حیات اور پھر موت یہ دونوں سلسلے ہوتے ہیں، پس ہر ایک کو دو موتوں کا ذائقہ چکھنے سے چارہ نہیں ماسوائے انبیاء کے (کہ وہ اپنی قبروں میں زندہ رہتے ہیں، ان پہ دوبارہ موت نہیں آتی)۔

(۳) علامہ محقق محمد عابد السندیؒ استاد حضرت شاہ عبدالغنی مجددیؒ:۔

اما هم (ای الانبیاء) فحیاتهم لا شكّ فيها ولا خلاف لاحد من العلمآء فی ذٰلك۔۔۔ فهو صلی الله علیه وسلم حی علی الدوام۔[2]

ترجمہ۔ انبیائے کرام کی حیات میں کوئی شک نہیں اور نہ علماء میں سے کسی کا اس سے اختلاف ہے۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم اب دائمی طور پہ زندہ ہیں۔

(۴) حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ:۔

حیات متفق علیہ است، ہیچ کس را درو ے خلافے نیست۔[3]

ترجمہ۔ حضور انورؐ کی حیات ایک متفق علیہ اجماعی مسئلہ ہے، کسی کا (اہل حق میں سے) کسی کا اختلاف نہیں۔

(۵) نواب قطب الدین صاحب دہلویؒ:۔

"زندہ ہیں انبیاء علیہم السلام قبروں میں" یہ مسئلہ متفق ہے۔ کسی کو اس میں خلاف نہیں کہ حیات ان کو وہاں حقیقی جسمانی دنیا کی سی ہے۔[4]

---

[1] عینی علی البخاری جلد ۷، ص۱۰۶ [2] رسالہ مدنیہ ص۱۴ [3] اشعۃ اللمعات جلد ۱ ص۶۱۳ [4] مظاہر حق جلد ۱ ص۴۴۵ عــه جن اعیانِ امت نے آنحضرتؐ کی اس حیات فی البرزخ کو دنیوی کہا ہے ان کی مراد صرف یہی ہے کہ آپ کا وہی بدن فائز الحیات ہے جو اس دنیا میں تھا نہ یہ کہ اس عالم دنیا کی حیات کے جمیع لوازم وہاں ثابت ہیں۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اس دنیوی حیات کا مفہوم ان لفظوں میں بیان فرماتے ہیں "انبیاء کرام کو انہیں حیاتِ دنیاوی کے تعلق کے اعتبار سے زندہ سمجھتا ہوں" لطائف قاسمیہ ص۳

(۶) قطب الاقطاب حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ :-

قبر کے پاس ..... انبیاء کے سماع میں کوئی اختلاف نہیں۔[1]

جب جمیع اہل سنت کا یہ متفقہ اور مجمع علیہ عقیدہ ہے تو پھر روضۂ اطہر کی

حیاتِ جسمانی کا انکار

آخر کن کا مذہب ہے؟

(۱) شیخ الاسلام حضرت علامہ عینیؒ فرماتے ہیں :-

من انکر الحیٰوۃ فی القبر وھم المعتزلۃ ومن نحا نحوھم واجاب اھل السنۃ عن ذلک۔[2]

ترجمہ: جن لوگوں نے آنحضرتؐ کی قبر کی زندگی کا انکار کیا ہے اور وہ معتزلہ اور ان کے ہم عقیدہ ہیں۔ اہلسنت نے اُن کے دلائل کے جوابات دیئے ہیں۔

(۲) حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے بھی اسی انداز کو بیان فرمایا ہے کہ منکرین حیات اہل سنت میں سے نہیں ہیں :-

قد تمسک بہ من انکر الحیٰوۃ فی القبر واجیب عن اھل السنۃ ..... ان حیٰوتہ صلی اللہ علیہ وسلم فی القبر لایعقبھا موت بل یستمر حیا۔[3]

ترجمہ: منکرین حیات فی القبر اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں اور اہلسنت کی طرف سے ان کا جواب دیا جاتا ہے کہ حضورؐ کی قبر کی زندگی ایسی ہے کہ دوبارہ اس پر موت نہیں اور آپ اب دائمی طور پر زندہ ہیں۔

حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوریؒ نے بھی اس عبارت کو حاشیہ بخاری جلد ۱ ص ۵۱۷ پر نقل اور تسلیم کیا ہے۔

---

[1] فتاویٰ رشیدیہ ص ۱۰۰ [2] عینی علی البخاری جلد ۷ ص ۲۰۱ [3] فتح الباری جلد ۷ ص ۲۲ مصر

الفصلُ السابع

وفیہ اربعۃ من المباحث

مبحثِ اوّل

حیات فی القبر

جمیع اہل السنۃ والجماعت اس بات پر متفق ہیں کہ مرنے کے بعد قبر میں (یا جہاں بدن میت پڑا ہو یا جہاں جہاں اجزائے بدن پھیلے ہوئے ہوں، سب میں) پھر روح سے تعلق قائم ہوتا ہے۔ یہ تعلق یا تو "دخولِ روح در جسد" سے قائم ہوتا ہے یا اس کا تحقق "اتصال روح بجسد" سے ہوتا ہے۔ جو صورت بھی ہو قبر میں زندگی ضرور ملتی ہے۔

سوال وجواب کی منزل گزرنے کے بعد پھر یہ تعلق کمزور ہو جاتا ہے اور اتنا کمزور کہ اُسے "موت فی القبر" سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس منزل میں حیات صرف اس درجہ میں باقی ہوتی ہے، کہ ثواب وعذاب کا ادراک ہوتا رہے، اور ہو سکتا ہے کہ حیات کا یہ درجہ روح کے بغیر ہو۔ اس لیے کہ روح اور حیات میں تلازم محض ایک امرِ عادی ہے کہ عام عادتِ الٰہی اسی طرح جاری ہے عقلی یا شرعی نہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ بہت سے اشاعرہ اور حنفیہ روح وحیات کے اس تلازم کے قائل نہیں۔

خیر، یہ تو سوال وجواب کی منزل کے بعد کی بات ہے کہ اس درجے کی حیات روح کے ساتھ قائم ہوتی ہے یا روح کے بغیر لیکن اس پر سب اہل تحقیق متفق ہیں کہ اس منزل سے پہلے کی "حیات فی القبر" روح کے ساتھ ہی قائم ہوتی ہے خواہ "اعادۂ روح بجسد" کے ساتھ خواہ "اتصالِ روح بجسد" کے ساتھ، بہرحال اس حیات کے تعلق بالروح سے چارہ نہیں۔ یہ امر مجمع علیہ اور یقینی ہے کہ دفن

کے بعد قبر کی پہلی منزل میں ایک دفعہ پھر تعلق بالروح سے زندہ کیا جاتا ہے اور اس منزل کے گزرنے کے بعد عامۃ الناس میں روح کا استقرار نہیں رہتا۔ اس زندگی پر پھر ایک دفعہ موت آتی ہے۔ ہاں یہ اماتت حقیقی نہیں ہوتی اور اس درجہ میں احساس باقی رہتا ہے کہ ثواب و عذاب کا ادراک ہوتا ہے۔

طریقِ حیات فی القبر

دفن ہونے کے بعد قبر کی پہلی منزل میں یہ حیات کیسے حاصل ہوتی ہے۔ اس باب میں سوادِ اعظم کے دو طبقے ہیں۔ ایک اعادۂ روح کا قائل ہے اور دوسرا اتصالِ روح کا مسلک رکھتا ہے۔ ان میں ترجیح کسے حاصل ہے، براہِ راست ہمارا موضوع نہیں۔ ہاں، یہ امر یقینی اور متفق علیہ ہے کہ بدن مدفون ایک دفعہ پھر تعلق بالروح سے ذائق الحیات ہوتا ہے اور اس کے بعد قبر کی دوسری منزل میں ایک دفعہ پھر حکمی موت وارد ہوتی ہے۔ اور یہ امر بھی اجماعی اور یقینی ہے کہ انبیاء علیہم السلام پر یہ دوسری موت قطعاً نہیں آتی۔ ان کے لیے ایک ہی دفعہ موت کی لذت شناسی ہے اور صحابہ کرامؓ کا سب سے پہلا اجماع اسی مسئلے پر قائم ہوا تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی "حیات فی القبر" کے متعلق بھی یہی دو نظریے بیان کیے جاتے ہیں۔ بعض حضرات اعادۂ روح کے قائل ہیں اور بعض اتصالِ روح یا تاثیر روح کا مسلک رکھتے ہیں۔

یہ دونوں مسلک اسی ایک پہلے اختلاف کا نتیجہ ہیں کہ قبر کی حیاتِ ثانیہ اعادۂ روح سے حاصل ہوتی ہے۔ پھر اول الذکر مسلک زیادہ صحیح ہے اور اگر اس حیات کا تحقق اتصالِ روح سے ہے تو پھر ثانی الذکر نظریہ زیادہ صحیح ہو گا۔

آئیے! چلتے ہوئے یہ بھی دیکھتے جائیں کہ حیات فی القبر اعادۂ روح سے قائم ہوتی ہے، یا اتصالِ روح۔

حضرت براء بن عازبؓ فرماتے ہیں کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا :-

فتعاد روحه فی جسده فیاتیه ملکان فیجلسانه فیقولان له من ربك ......

الحدیث رواه احمد۔[1]

ترجمہ: پس اس مرنے والے مومن کی روح پھر اس بدن میں لوٹائی جاتی ہے اور دو فرشتے اس کے سامنے آتے ہیں پس اُسے بٹھلاتے ہیں اور پھر سوال و جواب کا سلسلہ ہوتا ہے۔

والحدیث صحیح۔ (تنقیح الرواۃ جلد ۱ صفحہ ۳۱۷)

حافظ ابن قیمؒ فرماتے ہیں:۔

رواه الامام احمد وابوداؤد و روی النسائی وابن ماجة اوله و رواه ابوعوانة الاسفرائنی فی صحیحه وذهب الی القول بموجب هذا الحدیث جمیع اهل السنة والحدیث من سائر الطوائف۔[2]

النص الصحیح الصریح وهو قوله صلی الله علیه وسلم " فتعاد روحه فی جسده "[3]

فالحدیث صحیح لاشك فیه۔[4]

رواه احمد محتج بهم فی الصحیح والحدیث حسنة المنذری ورواه ایضاً ابوداؤد والحاکم وابن ابی شیبة وابن منده وابونعیم وابوعوانة الاسفرائنی فی صحیحه من طرق صحیحة والبیهقی وقال هذا حدیث صحیح الاسناد۔[5]

ابن منده کی پوری روایت حافظ ابن قیمؒ نے کتاب الروح صفحہ ۵۶ تا صفحہ ۵۸ نقل کی ہے۔ اس میں ایسے الفاظ بھی ملتے ہیں کہ رب العزت ملائکہ سے فرماتے ہیں:۔

ردوا روح عبدی الی الارض فانی وعدتهم انی ادعهم فیها۔[6]

ترجمہ: میرے بندے کی روح پھر زمین کی طرف لوٹادو کہ میرا وعدہ ہے کہ میں انہیں پھر زمین میں لوٹاؤں گا۔

---

[1] مشکوۃ صفحہ ۱۴۲ سطر ۱۹ [2] کتاب الروح صفحہ ۵۱ [3] ایضاً صفحہ ۵۲ [4] ایضاً صفحہ ۵۶ [5] تنقیح الرواۃ فی تخریج احادیث المشکوۃ جلد ۱ صفحہ ۳۱۲/۱۲۰

اس کا حاصل یہی ہے کہ مرنے والوں کی روحیں علیین یا سجین سے تعلق قائم کر کے وہاں سے ہو کر پھر زمین کی طرف لوٹائی جاتی ہیں۔ اعادہ روح کی اس حدیث کے متعلق حافظ ابن قیم علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں :-

ھٰذا حدیث ثابت مشھور مستفیض صححہ جماعۃ من الحفاظ و لا نعلم احدًا من ائمۃ الحدیث طعن فیہ بل رووہ فی کتبھم و تلقوہ بالقبول وجعلوہ اصلاً عن اصول الدین۔[1]

ترجمہ۔ یہ حدیث ثابت ہے، مشہور اور مستفیض ہے، حفاظِ حدیث کی ایک پوری جماعت نے اس کی تصحیح کی ہے اور ائمہ حدیث میں سے کسی نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا، بلکہ اسے اپنی کتابوں میں جگہ دی ہے، اسے قبول کیا ہے اور اس کو اصولِ دین میں سے ایک اصل قرار دیا ہے۔

المبحث الثانی

ردّ الاشتباہات فی تحقیق الرّوات

حافظ ابن تیمیہؒ کا ارشاد :-

قال الحافظ ابونعیم الاصفھانی واما حدیث البراءؓ رواہ المنھال بن عمرو عن زاذان عن البراء فحدیث مشھور رواہ عن المنھال الجم الغفیر و رواہ عن البراء عدی بن ثابت و محمد بن عقبہ وغیرھما و رواہ عن زاذان عطاء بن السائب قال و ھو حدیث اجمع رواۃ الاثر علی شھرتہ واستفاضتہ وقال الحافظ ابو عبداللہ بن مندۃ ھذا الحدیث اسنادہ متصل

---

[1] کتاب الروح ص۵۹

مشهور رواه جماعة عن البراءؓ. (شرح حدیث النزول ص۴۲ للحافظ ابن تیمیہؒ)

حافظ ابن قیمؒ کا ایک اور حوالہ:۔

وهو حديث صحيح صححه جماعة من الحفاظؒ

اجتماع جیوش الاسلامیه علیٰ غزو المعطلة الجهمیه لابن القیم ص۳)

امام احمد کی پہلی روایت کے متعلق بعض حضرات کہتے ہیں کہ:۔

اس میں ایک راوی منہال بن عمرو ہے اور وہ "فتعاد روحه فی جسده" کے قطعہ روایت میں منفرد ہے۔ ابن حزم نے اس کے متعلق کہا ہے "لیس بالقوی"

جواباً عرض ہے کہ منہال بن عمرو کو امام جرح وتعدیل امام یحییٰ بن معینؒ نے ثقہ کہا ہے۔ امام عجلیؒ بھی اس کے ثقہ ہونے پر نص فرماتے ہیں۔ ابن حزمؒ چونکہ عذاب قبر کے قائل نہ تھے اور یہ حدیث ان کے اعتقاد کی تردید کرتی تھی۔ اس لیے انہوں نے اس حدیث کی تضعیف کر دی اور منہال بن عمرو کو ضعیف کہہ دیا۔ تنقیح الرواۃ میں ہے:۔

وفی اسناد الحدیث منهال بن عمرو وثقه ابن معینؒ والعجلیؒ وقد تکلم ابن حزمؒ فی المنهال ولا یلتفت لکلام بن حزم بعد احتجاج الشیخین به ولما رأی ابن حزم حدیث المنهال رادّ علیٰ معتقده فی انکار عذاب الاجساد فی قبورها طعن فیه وطعنه مردود والحدیث صحیح[1]

ترجمہ۔ اس حدیث کی سند میں منہال بن عمرو ہے۔ اسے امام یحییٰ بن معینؒ اور عجلیؒ ثقہ قرار دیتے ہیں۔ ابن حزمؒ نے اس پر کلام کیا ہے، لیکن اس کی کوئی پرواہ نہیں کی جائے کیونکہ حدیث کے دو بڑے امام اسے حجت مان رہے ہیں۔ ابن حزمؒ چونکہ عذاب قبر کے جسمانی ہونے کے قائل نہ تھے اور یہ حدیث ان کے عقیدہ کی تردید کر رہی تھی اس لیے انہوں نے اس پر جرح کر دی، حالانکہ حدیث صحیح ہے اور اس پر طعن مردود ہے

---

[1] تنقیح الرواۃ جلد ۱ ص۴۲

حافظ ابن قیمؒ لکھتے ہیں :۔

فالمنہال احد الثقات العدول قال ابن معین المنہال ثقۃ وقال العجلی کوفی ثقۃ واعظم ماقیل فیہ انہ سمع من بیتہ صوت غناء و ھذا لایوجب القدح فی روایتہ واطراح حدیثہ وتضعیف ابن حزم لہ لاشیء فانہ لم یذکر موجبا لتضعیفہ غیر تفردہ بقولہ فتعاد روحہ فی جسدہ وقد بینا انہ لم یتفرد بہا بل رواہا غیرہ قد روی ماھو ابلغ منہا[1]

ترجمہ: منہال عادل اور ثقہ لوگوں میں سے ہیں۔ ابن معین اور عجلی انہیں ثقہ کہتے ہیں زیادہ سے زیادہ جو اُن پر اعتراض ہے، وہ یہی ہے کہ ایک دفعہ ان کے گھر سے گانے کی آواز سنی گئی تھی (یہ بھی قیل سے ہی مذکور ہے معلوم نہیں صحیح ہے یا غلط نیز اس کا مرتکب کون تھا اور کون نہیں) اور یہ اس کی روایت میں موجب قدح نہیں اور ابن حزم کا اسے ضعیف کہنا بالکل لاشئ ہے۔ اس نے صرف اس کا تفرد ہی بیان کیا ہے اور ثابت کر آئے ہیں کہ وہ متفرد نہیں۔

دوسرا اعتراض

حضرت براء بن عازبؓ سے اس حدیث کو زاذان نقل کر رہا ہے اور اس کا سماع حضرت براءؓ سے ثابت نہیں۔ علاوہ ازیں وہ بھی اس روایت میں متفرد ہے۔ نیز اس میں بھی ابن حزمؒ کو کلام ہے۔

جواباً گذارش ہے کہ حافظ ابوعوانہ اسفرائنیؒ نے زاذان کندی کا حضرت براءؓ سے صیغہ سماع نقل کیا ہے۔ پس اعتراض کی بھی کوئی حقیقت باقی نہیں رہتی۔

حافظ ابن قیمؒ لکھتے ہیں :۔

---

[1] کتاب الروح صـ۵۹

هذه العلة باطلة فان ابا عوانة الاسفرائنی رواه فی صحیحه باسناده قال عن ابن عمرو زاذان الکندی قال سمعت البراء۔[1]

ترجمہ. یہ علت باطل ہے کیونکہ امام ابوعوانہ اسفرائنی نے اسے اپنی صحیح میں اپنی سند سے روایت کیا ہے اور اس میں سماع کی تصریح ہے۔

تفرد زاذان کے متعلق فرماتے ہیں:۔

فالحدیث لاشک فیه صحیح وقد رواه عن البراء بن عازبؓ جماعة غیر زاذان منهم عدی بن ثابت و محمد بن عقبه و مجاهد۔[2]

ترجمہ. پس حدیث صحیح ہے اس میں کسی قسم کا کوئی شک نہیں. براءؓ سے اسے زاذان کے علاوہ اور لوگوں نے بھی روایت کیا ہے. انہیں میں عدی بن ثابت محمد بن عقبہ اور مجاہد بھی ہیں۔

اور توثیق زاذان کے متعلق ملاحظہ ہو:۔

امام یحییٰ بن معینؒ انہیں ثقہ قرار دیتے ہیں. ابن سعدؒ ثقہ اور کثیر الحدیث کہتے ہیں. خطیبؒ اور عجلیؒ نے بھی ثقہ کہا ہے. ابن عدیؒ اور حاکمؒ نے بھی توثیق کی ہے (تہذیب التہذیب جلد ۳ ص ۳۰۳)

علامہ عزیزیؒ اس کی روایت کے متعلق لکھتے ہیں. حدیث صحیح. (السراج المنیر جلد ۱ ص ۵۱۴ مصر)

حافظ ابن قیمؒ فرماتے ہیں:۔

وزاذان من الثقات روی عن اکابر الصحابه کعمرو غیره وروی له مسلم فی صحیحه قال یحیی بن معین ثقة قال حمید بن هلال وقد سئل عنه هو ثقة لا تسأل عن مثل هٰؤلاء۔[3]

ترجمہ. زاذان ثقہ راویوں میں سے ہے. اس نے حضرت عمرؓ جیسے اکابر صحابہؓ سے روایات لیں ہیں. امام مسلمؒ نے صحیح مسلم میں اس کی روایت لی ہے یحییٰ بن معینؒ

---

[1] کتاب الروح ص ۵۹ [2] ایضاً ص ۵۶ [3] ایضاً ص ۵۹

اسے ثقہ کہتے ہیں۔ حمید بن ہلال سے زاذان کے متعلق پوچھا گیا، تو انہوں نے فرمایا، ایسے ذمہ دار لوگوں کے متعلق پوچھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

المبحث الثالث

اعادۂ روح کے متعلق متکلمین کا موقف

تفصیلاتِ مذکورہ کے پیشِ نظر محدثین کا موقف تو بالکل بے غبار ہے کہ وہ طریق حیات فی القبر کے باب میں "اعادۂ روح" کے قائل ہیں، لیکن متکلمین کے متعلق عام طور پر یہی رائے ہے کہ وہ اعادۂ روح کے قائل نہیں، بلکہ اتصال روح سے بدن مدفون میں حیات تسلیم کرتے ہیں۔ حضرت مولانا عبدالحکیم سیالکوٹیؒ لکھتے ہیں:۔

لیس المراد بالحیّ ھھنا ما یعاد فیہ الروح ویصدر عنہ الافعال الاختیاریۃ بل ما لم یدرك الالم واللذۃ فاذا خلق اللہ فیہ ادراکاً۔۔۔۔ یکون حیا لا جماداً۔[1]

ترجمہ: اس جگہ سے "حی" سے مراد یہ نہیں کہ اس میں روح لوٹائی گئی ہو، اور اس سے افعالِ اختیاریہ صادر ہوتے ہیں۔ بلکہ حیات سے مُراد یہ ہے کہ وہ الم و لذت کا ادراک کر سکے۔ اس اندازِ حیات سے بھی وہ جماد ہونے سے نکل جاتے ہیں اور زندہ ہوتے ہیں۔

تحقیق المقام

اس مقام پہ تین مسلک بیان کیے جاتے ہیں:۔

---

[1] عبدالحکیم علی الخیالی ص۱۱۸

① ——— میت کو قبر میں زندگی ملتی ہے. پس عذابِ قبر برحق ہے. یہ مسلک اہلسنت والجماعت کا ہے.

② ——— میت قبر میں جمادِ محض ہے پس عذابِ قبر کچھ نہیں. یہ جمہور معتزلہ و روافض کا مسلک ہے.

③ ——— میت ہے تو قبر میں جماد اور بے جان، مگر اس پہ عذاب پھر بھی ہوتا ہے. یہ مسلک معتزلہ کی شاخ صالحیہ اور فرقہ کرامیہ کا ہے.

خیالی کی عبارت "جوز بعضھم تعذیب غیر الحی" میں اس تیسرے مسلک کا بیان ہے اس پر حضرت مولانا سیالکوٹیؒ انہیں الزام دیتے ہیں جسے ہم اپنے لفظوں میں بیان کرتے ہیں.

کہ جب تم میت کے لیے قبر میں عذاب مانتے ہو تو پھر تمہارا اسے جماد کہنا کیسے درست ہو سکتا ہے. جماد تو اسے ہی کہتے ہیں، جس میں کہ کوئی احساس نہ ہو. پس اسے عذاب ہونے کا تصور بھی نہیں ہو سکتا. اور اگر اس میں اتنا احساس ہے کہ اَلم و لذّت کا ادراک کر سکے، تو پھر اس کے لیے زندگی ثابت ہو گئی، جمادِ محض نہ رہا.

اس مقام پر مولانا سیالکوٹیؒ حیاتِ میت کی تشریح میں وہ عبارت لکھتے ہیں جو کہ پہلے لکھی گئی ہے. ظاہر ہے کہ یہاں مولانا مرحوم صالحیہ اور کرامیہ کو الزام دے رہے ہیں کہ جس "صورتِ عذابِ قبر" کو تم تجویز کر رہے ہو، اسے بھی حیاتِ قبر لازم آ رہی ہے. ہاں اس صورتِ حیات میں اعادہ روح لازم نہیں. چنانچہ "نبراس علی شرح العقائد" میں ایسے جواب پر لکھا ہے.

ھذا جواب اشکال اوردہ المعتزلہ مستدلین بقولہ تعالیٰ لا یذوقون فیھا الموت الا الموتۃ الاولیٰ [1]

ترجمہ. یہ تو ایک اشکال کا جواب تھا، معتزلہ نے اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے پیش کیا تھا، وہ نہیں چکھیں گے وہاں کوئی اور موت، انکے لیے تو وہی موت ہے جو آ چکی

---

[1] نبراس صفحہ ۳۴۲

یہ صورتِ جواب کیوں اختیار کی گئی؟

اس لیے کہ اعادۂ روح کا مضمون متکلمین کے نزدیک حدیث براء بن عازبؓ کی رُو سے خبر واحد سے ثابت ہو رہا تھا اور معتزلہ خبر واحد کی حجیت کے قائل نہ تھے۔ پس انہیں اعادۂ روح کی روایت سے قائل نہ کیا جا سکتا تھا۔ ہاں عذاب قبر کی روایات چونکہ حدِ تواتر تک پہنچ رہی تھیں، اور ان کی رُو سے میتِ مدفون کے لیے لذت و اَلم کا ادراک ثابت ہو رہا تھا۔ اس لیے یہاں اسے ہی حیاتِ میت ثابت کرنے کے لیے ایک زینہ بنایا گیا۔ معتزلہ اور کرامیہ یقیناً اس کے جواب باصواب سے عاجز تھے۔

اب سوال یہ ہے کہ متکلمین نے میت میں پھر روح نہ لوٹنے کو، کیا تحقیقِ واقعی کے طور پہ بیان کیا ہے یا یہ صرف ایک الزامی شکلِ جواب تھی اور متکلمین کا اصل مسلک وہی ہے جو محدثین کا تھا؟ شرح نبراس میں اس حقیقت سے اس طرح نقاب کشائی کی گئی ہے:۔

وعندی فی هذا الجواب بحث و هوان الاحادیث الصحیحة ناطقة بان الروح تعاد فی الجسد عن السوال فالجواب بانکار الاعادة غیر مرجه وقد اجاب المشائخ عن هذه الاٰیة بوجوه۔[1]

ترجمہ: میرے نزدیک یہ جواب محلِ نظر ہے۔ اس لیے کہ احادیث صحیحہ پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ روح پھر جسم میں لوٹائی جاتی ہے۔ پس اعادۂ روح کا انکار کر کے معتزلہ کو جواب دینا ٹھیک نہیں۔ معتزلہ نے ان کی پیش کردہ آیت کے اور کئی جواب دیے ہیں۔

سائر الاحادیث الصحیحة المتواترة تدل علی عود الروح ان البدن اذا المسئلة (مبتدا) للبدن بلا روح قول (خبر) قاله طائفة من الناس وانکره الجمهور

---

[1] نبراس ص ۳۲۲

وكذلك السوال للروح بلا بدن قاله ابن ميرة وابن حزم ولو كان كذلك

لم يكن للقبر بالروح اختصاص[1]

هذا قول منكر عند عامة اهل السنة والجماعة[2]

واذا قبضت (الروح) عرج بها الى الله فى ادنى زمان ثم تعاد الى البدن

فتسأل وهى فى البدن[3]

حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ نے بھی تحفۂ اثنا عشریہ میں "حیات فی القبر" کا حکمی ہونا روافض کے آیتِ مذکورہ سے استدلال کرنے کے جواب ہی میں تحریر فرمایا ہے۔ حق یہی ہے کہ محدثین کا مسلک اس باب میں بالکل بے غبار ہے اور متکلمین بھی تحقیقاً انہی کے ساتھ ہیں۔ اس کے علاوہ جو کچھ بھی صورتِ جواب ہے، وہ معتزلہ کے پیدا کردہ اشکالات کے پیش نظر ہے۔ جب جملہ اموات کے لیے اعادۂ روح ثابت ہے تو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو کس دلیل کی بناء پر مستثنیٰ کیا جاتا ہے؟ علامہ سبکیؒ فرماتے ہیں:۔

وعود الروح الى البدن.... فى سائر الموتى فضلاً عن الشهداء فضلاً

عن الانبياء وانما النظر فى استمرارها فى البدن[4]

ترجمہ: روح کا بدن میں پھر دوبارہ لوٹنا، یہ تو تمام اموات کے لیے ثابت ہے شہداء اور انبیاء پر تو بدرجۂ اولیٰ اس کا تحقق ہوگا۔ بحث صرف اس میں ہے کہ روح پھر بدن میں دائماً رہے گی یا پھر یہ تعلق ٹوٹے گا۔

---

[1] شرح حدیث النزول للحافظ ابن تیمیہ ص۸۱ [2] ایضاً ص۸۵ [3] ایضاً ص۸۷ [4] شفاء السقام ص۱۵۹

ع اس عقیدہ کی تائید میں کہ قبر کے سوال وجواب روح اور بدن کے مجموعہ سے متعلق ہیں، علامہ صدر الدین الحنفیؒ کی یہ تصریح بھی ملاحظہ کیجئے:۔

وكذلك عذاب القبر يكون للنفس والبدن جميعاً باتفاق اهل السنة والجماعة تنعم النفس وتعذب مفردة عن البدن ومتصلة به۔ (شرح عقیدۃ الطحاوی ص۲۳۰)

احادیث شریفہ میں "حیات فی القبر" کے لیے اعادۂ روح تو نہایت صحیح اور متواتر المعنیٰ روایات سے ثابت ہے۔ لیکن قبر کی پہلی منزل گزرنے کے بعد بدن یا اجزائے بدن میں ادراک الم و لذت کا کچھ اثر چھوڑتے ہوئے یہ روح پھر نکل جاتی ہے یا وہیں استقرار پذیر رہتی ہے؟ یہ معاملہ غور طلب ہے۔

حافظ ابن قیمؒ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ سے نقل کرتے ہیں:-

قال شیخ الاسلام الاحادیث الصحیحۃ المتواترۃ تدل علیٰ عود الروح الی البدن وقت السوال۔[1]

ترجمہ۔ احادیث الصحیحہ متواترہ بتارہی ہیں کہ سوال قبر کے وقت روح پھر بدن میں لوٹائی جاتی ہے۔

قطع می کنم بعودِ حیات مر میت را چنانکہ در احادیث ورود یافتہ۔[2]

اس منزل کے بعد پھر روح رخصت ہو جاتی ہے۔ یہ ایسی حقیقت ہے جس سے کسی شخص کو اختلاف نہیں اور جملہ فرق اہلِ اسلام کا اس پر اجماع ہے کہ عامۃ الاموات کے لیے اعادۂ روح کے ساتھ قبر کی زندگی ہمیشہ نہیں۔ عودِ روح تو احادیثِ صحیحہ صریحہ سے ثابت ہے۔ لیکن پھر اس کی مفارقت؟ یہ امر اجماع اور تواتر طبقاتی سے منقول ہے۔ ہاں انبیائے کرام کے لیے یہ مفارقت قطعاً ثابت نہیں اور جس طرح عامۃ الاموات کے لیے اس مفارقت کا پتہ اجماع سے چلتا ہے، اسی طرح انبیاء کے لیے اس عدمِ مفارقت پر بھی اجماع اور تواتر طبقاتی قائم ہے۔ فافہم وتدبّر۔

---

[1] کتاب الروح ص ۶۲ [2] جذب القلوب ص ۱۸۵

المبحث الرابع

اعادۂ روح اور اتصالِ رُوح میں موازنہ

حیات فی القبر کے لیے اعادۂ روح تو احادیث صحیحہ صریحہ سے ثابت ہے۔ اسی اصل کے مطابق انبیاء علیہم السلام کے اجسادِ مطہرہ میں ارواحِ قدسیہ دوبارہ لوٹائی جاتی ہیں۔ صورتِ زیرِ بحث صرف یہ رہ جاتی ہے کہ جس طرح جملہ اموات کے لیے پھر روح کی مفارقت ہوتی ہے، کیا انبیاء علیہم السلام کی ارواحِ قدسیہ بھی پھر معرضِ مفارقت میں آجاتی ہیں؟ اہل سنّت کے ہاں یہ مفارقت کہیں ثابت نہیں ہوتی۔

اتصالِ روح کا مؤقف اثباتِ حیات کے باب میں اگرچہ نہایت کافی و وافی ہے اور اس صورتِ کیفیت میں بھی انبیاء علیہم السلام کی اپنی اپنی قبروں میں حیاتِ عنصری جسمانی کی قطعاً نفی نہیں ہوتی۔ تاہم دیکھنا یہ ہے کہ اس صورتِ کیفیت کی اصل کیا ہے؟

بات دراصل یہ ہے کہ اتصالِ روح کا مؤقف کسی نصِ صریح پر مبنی نہیں۔ بلکہ علمائے کبار نے مختلف نصوص میں تطبیق دینے کے لیے اسے اجتہادی طور پر اختیار کیا۔ بعض مقامات پر ارواحِ قدسیہ کے اعلیٰ علیین میں ہونے کی خبر دی گئی تھی اور دوسری طرف انبیاء کرام کے اپنی اپنی قبورِ شریفہ میں زندہ ہونے اور عند القبر خود سُننے کا صحیح روایات سے ثبوت ملتا تھا۔ اب بعض علماء کا ذہن بجائے اس کے کہ ابدانِ مطہرہ کو ارواحِ قدسیہ کا مستقر قرار دے کر اعلیٰ علیین سے ایک قوی تعلق پیدا کریں۔ ادھر منتقل ہوا کہ ارواحِ قدسیہ کو وہاں مان کر ابدانِ مدفونہ سے ایک قوی علاقۂ حیات تسلیم کر لیا۔

خلاصہ یہ کہ اعادہ روح کا مؤقف من حیث الاصل احادیث صحیحہ صریحہ پر مبنی تھا اور اتصالِ روح کا مؤقف علمائے کبار نے محض تطبیق بین الروایات کی خاطر اجتہادی طور پہ اختیار

کیا تھا۔ بیہقی وقت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی لکھتے ہیں :-

انه صلی الله علیه و سلم قال من صلی علی عند قبری سمعته و من صلی علی نائیا بلغته فکیف التطبیق؟ قلنا وجه التطبیق ان مقر ارواح المومنین فی علیین او فی السماء السابعة و نحو ذلك کما مر و مقر ارواح الکفار فی سجین و مع ذلك لکل روح منها اتصال بجسده فی قبره لا یدرك کنهه الا الله تعالی و بذلك الاتصال یصح ان یعرض علی الانسان المجموع المرکب من الجسد والروح مقعده من الجنة او النار و یحس اللذة و الالم و یسمع سلام الزائر[1]

ترجمہ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص میری قبر کے پاس آکر مجھ پہ درود پڑھے، اسے میں خود سنتا ہوں اور دور کا پڑھا مجھے پہنچایا جاتا ہے (اور یہ بھی سابقاً گزرا کہ ارواح طیبہ علیین میں ہوتی ہیں) پس دونوں مضمونوں میں تطبیق کیسے ہوگی؟ ہم کہتے ہیں ارواحِ مومنین کا مقر تو علیین یا ساتویں آسمان ہی میں ہے۔ اسی طرح ارواحِ کفار مقامِ سجین میں ہی رہتی ہیں، لیکن ان حقائق کے باوجود ہر روح کا تعلق قبر میں پڑے جسد (یا اجزائے جسد) سے بھی ضرور ہوتا ہے۔ اس تعلق کی پوری حقیقت کو اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں، ہاں روح کے جسد کے ساتھ اس طرح متصل ہونے سے ایسی صورت پیدا ہو جاتی ہے کہ معاملات قبر روح و جسد کے مجموعے سے ہوتے ہیں اور الم و لذت کا ادراک اسی طرح واقع ہوتا ہے۔

پس جب اعادہ روح کا موقف من حیث الاصل منصوص اور اتصالِ روح کا موقف من

---

[1] مظہری جلد ۱۰ ص ۲۲۴، ص ۲۲۵ ہند

حیث الاستدلال اجتہادی ہے۔ تو اگرچہ بہر صورت کیفیت قبر شریف کی حیاتِ عنصری جسمانی نہایت واضح طور پر ثابت ہے۔ تاہم اتصالِ روح کا موقف اختیار کرنے سے نصوص پر اجتہاد کی ترجیح لازم آتی ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ جمہور محدثین اور اکابر علمائے دیوبند اسی صورتِ کیفیت حیات کے قائل ہیں۔ جس کی اصل احادیثِ صحیحہ صریحہ پر مبنی ہے۔

روح وبدن کے تعلق کے کھلے آثار

عالم برزخ میں روح وبدن کا تعلق برزخی ہے۔ ضروری نہیں کہ اسے عام لوگ بھی دیکھ پائیں لیکن اللہ رب العزت کبھی ان برزخی امور سے پردہ اٹھا بھی لیتے ہیں ایسے اٹھے پردے بھی دنیا نے بار ہا دیکھے ہیں، ہم پہلے بہت سے ایسے واقعات پیش کر آئے ہیں۔ حضرت حذیفہ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہما کی قبریں چودہویں صدی میں کھلیں تو لوگوں نے ان کے ابدانِ مبارکہ کو بالکل محفوظ پایا۔

ایک صاحب سید الطاف حسین بیان کرتے ہیں:۔

> قبر سے نکلے ہوئے جنازوں کی موجودگی اور خلق کی آہ وبکا نے قیامت کا نمونہ برپا کر دیا تھا۔ اکثر آدمی روتے روتے بیہوش ہو گئے۔ نعشیں تیرہ سو سال گزرنے کے بعد بھی بالکل سالم تھیں۔ کفن ہاتھ لگانے سے بوسیدہ تھا۔ ایک صاحب کی داڑھی سفید تھی اور ایک کی سیاہ[1]

یہاں ہم صرف یہ بات کہنا چاہتے ہیں کہ بعد الوفات تحفظ اجساد کا وعدہ انبیائے کرام سے ہے۔ لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرام کے علاوہ بعض دوسرے اجسادِ کریمہ کو بھی تحفظ سے مشرف فرمایا ہے اور یہ ان کے اہلِ حق میں سے ہونے کا ایک کھلا دنیوی نشان ہے۔

واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم۔

---

[1] صدق لکھنؤ ۱۱، دسمبر ۱۹۴۲ء

انبیاء کرام کے علاوہ بعض دوسرے مقربین کے اجساد کا بھی محفوظ ہونا

حیاتِ قبریہ اور اُس کے اِدراکات

① —— جب حضرت امیر معاویہؓ نے اپنے عہدِ حکومت میں مدینہ منورہ میں ایک نئی نہر کھُدوانے کا حکم دیا تو اس کی گزرگاہ میں اتفاق سے قبرستانِ اُحد آتا تھا۔ آپ نے حکم دیا کہ ان مدفونین کو یہاں سے اُٹھا کر دوسری جگہ دفن کر دیا جائے۔ جب قبریں کھولی گئیں تو شہدائے احد اپنی اصل حالت پہ بالکل تر و تازہ تھے۔ کھودتے ہوئے اتفاق سے ایک کدال حضرت حمزہؓ کے پاؤں کے قریب جا لگی، اسی وقت خون جاری ہو گیا۔ یہ واقعہ جنگِ اُحد سے تقریباً ۵۰ سال بعد کا ہے۔

② —— بیہقی نے روایت کیا ہے کہ فاطمہ بنت خزاعیہ نے حضرت حمزہؓ کی قبر پہ سلام کیا:۔

السلام علیكَ یاعم رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم۔

وہاں سے جواب آیا:۔

علینا وعلیکم السلام ورحمة اللّٰه۔

③ —— حضرت عمرو بن جموح انصاریؓ بھی شہدائے اُحد میں سے تھے۔ جب سیلاب نے اُن کی قبروں کو کھول ڈالا، تو یُوں معلوم ہوتا تھا، گویا کہ کل دفن کئے گئے ہیں۔ جنگِ اُحد اور اس واقعہ سیلاب کے مابین ۴۶ سال کا فرق تھا:۔

فوجد الم یتغیرا کانهما ماتا بالامس وکان احدهما قد جرح فوضع یده علیٰ جرحه فدفن وهو کذٰلك فامیطت یده عن جرحه ثم ارسلت فرجعت کما کانت۔[1]

---

[1] مؤطا امام مالک ص۱۷۶

ترجمہ: پس ان دونوں کو اس طرح پایا گیا کہ وہ ابھی کل ہی فوت ہوئے ہیں۔ دونوں میں سے ایک کو ایسا زخم لگا تھا کہ انہوں نے اپنا ہاتھ اس پہ رکھا تھا اور اسی طرح انہیں دفن کر دیا گیا تھا۔ پس جب ان کا ہاتھ اس زخم سے ہٹایا گیا اور پھر چھوڑ دیا گیا تو وہ وہیں آ گیا جہاں کہ تھا۔

(۴) ——— حضرت حذیفہؓ اور حضرت عبداللہ بن جابرؓ کے مزارات دریائے دجلہ کے کنارے تھے۔ پندرہ بیس برس کا عرصہ گزرتا ہے کہ دریا زمین کاٹتا ہوا ان مزارات تک پہنچنے لگا۔ حکومت عراق نے حکم دیا کہ ان مزاراتِ شریفہ کو یہاں سے حضرت سلمان فارسیؓ کے احاطہ میں منتقل کر دو۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ آٹھ دس ہزار آدمیوں کے قریب ان جنازوں میں شامل ہوئے۔ قاضی شوکانیؒ لکھتے ہیں۔

ورد النص فی کتاب اللہ فی حق الشہداء انہم احیاء یرزقون وان الحیاۃ فیہم متعلقۃ بالجسد[1]

ترجمہ: شہدائے کرام کے حق میں، نصِ قرآنی وارد ہے کہ وہ زندہ ہیں اور انہیں رزق بھی ملتا ہے اور یہ کہ ان کی حیات جسمانی ہے (خواہ ہمارے ادراک سے بالا ہی کیوں نہ ہو)۔

شہدائے کرام کی قبور کھلنے پہ اگر ہمیں ان کے حرکت و عمل پہ اطلاع نہیں ہوتی، اور ہم انہیں عبادت کرتا ہوا محسوس نہیں کر سکتے، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری آنکھوں میں وہ قوت نہیں کہ ہمیں ان کے مصروف بالعبادت ہونے کا ادراک ہو سکے۔ یہ نہیں کہ وہ ذواتِ مدفونہ ہی معطل عن الافعال ہیں۔ پردۂ برزخ اس ادراکِ لطیف میں حائل ہوتا ہے۔ ہاں! اللہ تعالیٰ جب کسی کے لیے اس عالم سے پردہ اُٹھا دیں، تو وہ اس عالم میں ہوتے ہوئے بھی اس عالم کے بہت سے حالات مشاہدہ کر لیتے ہیں۔

---

[1] نیل الاوطار جلد ۳ صفحہ ۲۱۱

مسلک ارجمند از اکابرِ دیوبند

المعروف

اجماع العلماء الاعلام

علیٰ

حیات الانبیاء الکرام

پیشتر اس کے کہ حیات النبیؐ کے باب میں ہم اکابر دیوبند کی تصریحات پیش کریں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اس بات کی وضاحت کردی جائے کہ مسلکِ دیوبند سے کیا مراد ہے:

معلوم رہے کہ دارالعلوم دیوبند کسی "مستقل مکتبِ فکر" کا بانی نہیں اور نہ اکابر دیوبند کے مسلک کی تاریخ دارالعلوم دیوبند کی تاریخ سے شروع ہوتی ہے۔ اکابر دیوبند نے کوئی نیا مسلک ترتیب نہیں دیا۔ بلکہ دارالعلوم کے تمام اکابر انہی عقائد و افکار کے پابند رہے جو قرونِ ثلٰثہ مشہود لہا بالخیر سے ما انا علیہ و اصحابی کی مقدس وراثت کے طور پہ چلے آ رہے تھے دیوبندیت کسی مستقل مکتبِ فکر یا مسلکِ عمل کا نام نہ تھا، بلکہ سلفِ صالحین، اہلِ تحقیق کی کامل اتباع اور اس کی تعلیم و اشاعت اکابر دارالعلوم دیوبند کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ یہ تمام حضرات عقائد میں اہلسنت والجماعت اور فروعات میں امام اعظم ابو حنیفہؒ کے مسلکِ عمل پہ تھے اور دارالعلوم دیوبند پورے ایشیا میں مسلکِ فکر کا سب سے بڑا مرکز سمجھا جاتا تھا اور اس سے کسی کا اختلاف نہ تھا۔

اچانک اوپر سے تار ہلا اور جناب مولوی احمد رضا خاں صاحب اوائل ۱۳۲۴ھ میں ان بزرگوں کے خلاف ایک تکفیری دستاویز تیار کر کے حجاز پہنچ گئے۔ تاکہ علمائے حرمین سے اس پہ

دستخط لینے میں کامیاب ہو سکیں۔ ان کے پاس پہنچنے کا فائدہ یہ تھا کہ وہ اُردو نہ جانتے تھے اور وہاں علماء دیوبند کی اردو تحریرات بدلے مفہوم سے پیش کی جا سکتی تھیں۔

کئی منزلیں گزرنے کے بعد معاملہ یہاں تک پہنچا کہ علمائے حرمین نے "موضوعاتِ زیرِ بحث" اکابر دیوبند سے خود براہِ راست ۲۶ استفسارات کئے اور ان کے عقائد و افکار کو اصولِ اہلسنت پر جانچنے کی کوشش کی۔

اس کے جواب میں اس وقت کے اکابرِ دارالعلوم نے اپنا مسلک پیش کیا اور ۲۶ مفصل جوابات کے ضمن میں اپنے عقائد و افکار یکجا قلمبند کر دیئے۔ اور اس پر اپنی مہریں ثبت کر دیں۔ فخر المحدثین حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ نے انہیں لکھا اور حضرت شیخ الہندؒ، مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ، حکیم الامت حضرت تھانویؒ، حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوریؒ اور حضرت مفتی کفایت اللہ دہلویؒ جیسے سب بزرگوں نے اس پر تصدیقات تحریر فرما دیں اور فقط اعتماد نہیں، بلکہ تحقیقاً سب جواب دیکھ کر اس پر دستخط کر دیئے۔

چنانچہ مفتی اقلیم ہند حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں:۔

رأیت الاجوبۃ کلہا فوجدتہا حقۃ صحیحۃ۔[1]

ترجمہ۔ میں نے تمام جوابات خود دیکھے ہیں اور انہیں حق صریح پایا ہے۔

ان عقائد پر پھر مکہ معظمہ، مدینہ منورہ جامعہ ازہر، مصر و شام کے علمائے کبار (جن میں کہ احناف و شوافع، موالک و حنابلہ، مسالکِ اربعہ کے اکابر علماء سب شامل تھے) سب نے اس پر تصدیقات فرمائیں اور یہ "المہند" نامی دستاویز عقائدِ علمائے دیوبند کے نام سے موسوم ہوئی۔

اس منزل سے گزرنے کے بعد اکابر دیوبند کا مسلک ایک واضح، معیّن اور مشخص صورت میں سامنے آگیا۔ یہ کوئی نیا مسلک نہ تھا، چودہ سو سال کے اکابر علمائے حق کی صدائے بازگشت تھی۔

---

[1] اہ

دیوبندیت کے ضابطۂ تحریر میں آنے کے بعد اب یہ امکان نہ رہا کہ کوئی شخص علمائے دیوبند کی طرف کسی ایسے عقیدے کو منسوب کرے، جو اکابر کی اس اجتماعی مسلکی دستاویز کے خلاف ہو اور نہ ہی یہ امکان باقی رہا کہ کوئی منسوب بہ دارالعلوم افکار و آراء کے باہمی اختلاف میں اس مرکزی دستاویز سے کچھ تجاوز کر سکے۔ اگر کوئی شخص اپنے آپ کو اکابر دیوبند کے مسلک پر بھی کہے اور عقائد بھی اس کے اس "مرکزی مسلکی دستاویز" کے خلاف ہوں اور نہ صرف خلاف بلکہ اس کا رد و ابطال اس کے نزدیک جزوِ تبلیغِ توحید ہو، تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ کذب و دجل اور دھوکہ و فریب آخر کس بلا کا نام ہے۔ عقل و خرد سے کھیلنے کا یہ خوفناک منظر ہم نے آنکھوں دیکھا ہے۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اس مرکزی مسلکی دستاویز کے علاوہ اور دوسرے مسائل میں اختلاف خواہ وہ تعبیرات و توجیہات میں ہو یا فقہی جزئیات میں، ترجیحات کے باب میں ہو تنظیماتِ عمل میں، اصل دیوبندیت کو ہرگز مشتبہ نہیں کرتا۔ اس لیے کہ دیوبندیت اکابرِ دیوبند میں سے کسی ایک شخصیت کا نام نہیں اور نہ دیوبندیت کا معیار اکابر میں سے کسی ایک بزرگ کی تقلیدِ شخصی ہے۔ بلکہ مسلکِ دیوبند کا مرکزی نقطہ "المہند علی المفند" ہے جسے وقت کے تمام اکابرِ دیوبند اجتماعاً آئینہ دیوبندیت قرار دے چکے ہوئے ہیں۔

مسائلِ حدیث میں حضرت گنگوہیؒ اور حضرت علامہ کشمیریؒ کے اختلافاتِ توجیہات اہلِ علم سے مخفی نہیں۔ حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت تھانویؒ کے مختلف مواقفِ عمل سے کون واقف نہیں۔ اور مختلف علمائے دیوبند کے مختلف نظریات بلکہ تفردات کس دور میں نہیں رہے۔ اکابر کی علمی تحقیقات کے ناپیداکنار سمندر اور تصنیفات کے ضخیم دفاتر اس حقیقتِ حال کے پُرزور ترجمان ہیں کہ اکابرِ دیوبند افکارِ شریعت اور اسرارِ کتاب و سنت کی تعلیم و تفہیم میں ہمیشہ دقیق النظر اور عمیق الفکر اور سلف صالحین کے متبع رہے ہیں اور انہوں نے اپنی روایتی وسیع النظری کو کبھی گروہی تعصب یا دھڑے بندی کی نذر ہونے نہیں دیا۔ فجزاھم اللہ احسن الجزاء۔

افکار و آراء کے ان اختلافات میں کبھی ایک طبقے نے دوسرے کی دیوبندیت کو چیلنج نہیں کیا

نہ اسے اس پہلو سے کسی شبہے کی نگاہ سے دیکھا اور نہ کبھی سُنا گیا کہ علماء کا فلاں طبقہ مسلکِ دیوبند سے ہٹ گیا ہے۔ اس لیے کہ ایسے تمام اختلافات اور ایسے مختلف نظریات ان ابواب میں ہے جو مسلکِ دیوبند کی مرکزی مسلکی دستاویز "المہند علی المفند" سے کسی طرح متصادم نہ ہوتے تھے مسلکِ دیوبند کے خدوخال جس آئینے میں مشخص یا معین ہوئے، وہ بلاریب اکابرِ دیوبند کی اجماعی تحریر "المہند علی المفند" ہی ہے۔ مسلکِ دیوبند کی حدود باعتبارِ کمیت کبھی بھی "المہند" سے متجاوز نہیں ہوئیں۔ ہاں باعتبارِ کیفیت یعنی قوت وضعف کے مختلف بزرگوں کا مزاج مختلف رہا ہو تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔

مسئلہ حیات النبیؐ کا مدار اگر صرف "آبِ حیات" پر ہوتا تو اس سے اختلاف مسلکِ دیوبند سے خروج نہ تھا، اس لیے کہ دیوبندیت کوئی مستقل مکتبِ فکر نہیں اور نہ حضرت نانوتویؒ کسی علیحدہ مکتبِ فکر اور مسلک عمل کے بانی تھے۔ بلکہ حضرت نانوتویؒ اور حضرت گنگوہیؒ نے دارالعلوم دیوبند کی بنیاد جس اُصول پر رکھی، وہ سلف صالحین اہلسنت کی اعتقاداً اور عملاً کامل اتباع ہی تھی۔ ان اکابر سے کسی ایک مسئلہ میں اختلاف یہ صورتِ فکر تو پیش کر سکتا تھا کہ جانب مخالف اہل سنت سے خروج ہے۔ یا یہ اختلاف حدودِ اہل سنت میں بھی سمو سکتا ہے، لیکن یہ بحث ہرگز نہ چل سکتی تھی کہ یہ مسلکِ دیوبند سے خروج ہے یا نہیں۔ اس لیے کہ دیوبندیت حضرت نانوتویؒ یا حضرت گنگوہیؒ کی تقلید شخصی کا نام ہرگز نہیں۔

دیوبند سے قریبی تعلق رکھنے والوں سے یہ حقیقت مخفی نہیں کہ مسئلہ حیات النبیؐ میں مسلکِ دیوبند کا مدار صرف آبِ حیات پر نہیں، بلکہ "المہند" کی اجماعی مسلکی دستاویز پر ہے۔ پس اس سے اختلاف یقیناً مسلکِ دیوبند سے خروج اور دیوبندیت سے ہٹ جانا ہے، ورنہ ان تمام اکابر کی تکذیب لازم آتی ہے جنہوں نے "المہند" کو آئینہ دیوبندیت قرار دیا تھا اور ان تمام بزرگوں کی بھی تجہیل ہوتی ہے، جو اُسے دوسروں کے سامنے اسے دیوبندی مسلکِ فکر کے ترجمان کی صورت میں پیش کرتے رہے۔

مسئلہ زیرِ بحث میں مسلکِ دیوبند تو "المہند" سے ہی پوری طرح عیاں ہے، تاہم

اکابرِ دیوبند کی علیحدہ علیحدہ تصریحات بھی تائیداً پیشِ خدمت ہیں۔ انہیں مرحومین اور موجودین کی ترتیب سے ہدیۂ قارئین کیا جاتا ہے۔

مرحومین

① — حجۃ اللہ العالمین، مرکزِ دائرۃ التحقیق، قطب افلاک اسرار التشریع

حضرت مولانا الشیخ محمد قاسم النانوتوی الصدیقی انار اللہ برہانہٗ (۱۲۹۷ھ)

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے حسبِ ارشاد حضرت امام ربانی مولانا رشید احمد گنگوہیؒ ایک کتاب "ہدیۃ الشیعہ"ؔ تحریر فرمائی تھی۔ آپ اس میں رقمطراز ہیں :-

رسول اللہؐ بلکہ تمام انبیاء بالیقین قبر میں زندہ ہیں، تو اس صورت میں آپ کی ملک زائل ہونے ہی نہیں پائی، جو وارثوں کی ملک اس کے قائم مقام ہو، بلکہ جیسے ہم تم

ؔ ہدیۃ الشیعہ اور ہدایۃ الشیعہ دو علیحدہ علیحدہ کتابیں ہیں۔ اوّل الذکر حضرت نانوتویؒ کی تصنیف ہے اور ثانی الذکر حضرت گنگوہیؒ کی۔ مولانا نانوتویؒ کی کتاب بھی دراصل حضرت گنگوہیؒ کی ہی تحریک پر لکھی گئی تھی یہ آبِ حیات سے بہت پہلے کی تصنیف ہے۔ حضرت مولانا نانوتویؒ آبِ حیات میں لکھتے ہیں :-

ارشاد حضرت مجمعِ علم و عمل جامع کمالات عیانی و دینهانی عالم ربانی مولانا رشید احمد صاحب خلیفۂ ارشد حضرت پیر و مرشد ادام اللہ فیوضہ باعث تحریر اصل رسالہ یعنی ہدیۃ الشیعہ ہوا تھا۔

(آبِ حیات صـ۵ مطبع مجتبائی)

ہدیۃ الشیعہ میں حیات النبی کے مضمون کا ہونا ان لوگوں کے لیے تازیانہ عبرت ہے جو اسے محض حضرت نانوتویؒ کی افتادِ طبع قرار دیتے ہیں اور اسے ان کے تفرد پر محمول کرتے ہوئے حضرت گنگوہیؒ کو اس سے بالکل لاتعلق قرار دیتے ہیں، حق یہ ہے کہ ہدایۃ الشیعہ (حیات النبیؐ کے بیان پر حضرت نانوتویؒ کی پہلی تصنیف) کے محرک ہی حضرت گنگوہیؒ تھے۔ فافہم وتدبر

کہیں چلے جائیں یا چندے کسی گوشہ میں بیٹھ رہیں اور ہمارے لواحق وغیرہ ہماری اشیاء کو برتیں اور اس سے ہماری ملک زائل نہیں ہوتی اور برتنے والے یا وارث مالک نہیں بن جاتے ایسے ہی رسول اللہ بھی گوشہ قبر میں پنہاں ہو گئے اور آپ بدستور اپنے اشیاء، اموال کے مالک ہیں، کوئی اور مالک نہیں ہو گیا اور حدیث لا نورث ما ترکناہ صدقۃ جو ابوبکر صدیقؓ سے مروی ہے۔ اس حدیث کی لم بھی یہی معلوم ہوتی ہے کہ آپ اب تک بقیدِ حیات ہیں، پر شیعہ نہ سمجھیں تو کیا کیجئے۔[1]

پھر نانوتویؒ لطائفِ قاسمیہ میں لکھتے ہیں:-

انبیائے کرام کو انہیں اجسامِ دنیاوی کے تعلق کے اعتبار سے زندہ سمجھتا ہوں۔[2]

اصل مضامین کی حقیقت تو اپنے نزدیک محقق ہو گئی۔ یوں کوئی منکر نہ مانے تو وہ

---

[1] ہدیۃ الشیعہ ص ۲۲۸-۲۲۹ از حضرت نانوتویؒ [2] لطائف قاسمیہ ص ۳ عہ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت نانوتویؒ اور علماء دیوبند جو آنحضرت کی اس عالم برزخ کی حیات کو دنیاوی حیات کہتے ہیں اس سے ان کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ وہ حیاتِ برزخی اسی دنیا والے جسدِ اطہر سے متعلق ہے نہ یہ کہ وہ حیات بجمیع الوجوہ دنیاوی حیات ہے جب حضرت نانوتویؒ حیاتِ دنیاوی کے مفہوم اور اس کی حدود کو خود واضح فرما رہے ہیں کہ وہ بعینہا اس دنیا والی حیات نہیں بلکہ حیاتِ دنیوی کا اطلاق محض ابدانِ دنیوی میں زندگی ہونے کے اعتبار سے ہے تو کس قدر مغالطہ دہی ہے کہ اس حیاتِ دنیوی کے ابطال کے لیے ان آیات اور روایات کا سہارا لیا جائے جن میں اس عالمِ دنیا کی حیات اور اس کے مطلوب و محبوب نہ ہونے کا بیان ہے جو لوگ اس مغالطہ دہی کے سہارے علمائے دیوبند کے خلاف یہ پروپگنڈہ کرتے ہیں کہ وہ آنحضرت کو اسی عالمِ دنیا میں زندہ سمجھتے ہیں اور انتقال دار من الدار کے قائل نہیں، انہیں حضورؐ کا یہ ارشاد پیشِ نظر رکھ کر کہ آپ نے مغالطے ڈالنے سے منع فرمایا ہے اپنی آخرت کی فکر کرنی چاہیئے۔ واللہ ہو الموفق۔ عہ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت نانوتویؒ حیات النبی کے مضمون کو محض الہامی طور پر بیان نہیں کر رہے بلکہ اس کا حق ہونا حضرت کے نزدیک محقق ہے۔ لہٰذا کوئی منکر نہ مانے تو وہ جانے۔ افسوس کہ اس باب میں بھی مغالطہ دہی سے کام لیا جاتا ہے اور یہ ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی جاتی ہے کہ حیات النبی حضرت کا اپنا عقیدہ نہ تھا، بلکہ آپ نے اسے محض الزامی طور پر تردید شیعہ کے لیے بیان کیا تھا۔ رب العزت تقیہ کی تہمت سے محفوظ رکھے۔

جائے منکروں کا کام یہی ہے[1]

پھر لکھتے ہیں:۔

انبیاء کو ابدان دنیا کے حساب سے زندہ سمجھیں گے، پر حسب ہدایت کل نفس ذائقة الموت اور انک میت وانهم میتون، تمام انبیائے کرام خاص کر حضرت سرور انام صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت موت کا اعتقاد بھی ضروری ہے[2]

حضرت نانوتویؒ ایک دوسرے مقام پہ انبیائے کرام علیہم السلام کے لیے ورود موت کا اقرار ان لفظوں میں کرتے ہیں:۔

بالجملہ موت انبیاء اور موت عوام میں زمین و آسمان کا فرق ہے، وہاں استتار حیات زیر پردہ موت ہے اور یہاں انقطاع حیات، بوجہ عروض موت ہے اگر موت ضد حیات، اور صفت وجودی ہو یا بوجہ دیگر اگر موت، عدم اور ملکہ حیات ہو اور شاید یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ جناب باری نے حضرت سرور عالم کو جدا خطاب کرکے ارشاد فرمایا انک میت اور سوآپ کے اوروں کو بھی جدا ارشاد فرمایا، انهم میتون اور مثل جملہ لاحقہ ثم انکم یوم القیمة عند ربکم تختصمون سب کو شامل کرکے یوں ارشاد فرمایا کہ انکم میتون. بالجملہ جیسے حیات نبویؐ اور حیات مومنین امت میں فرق ہے، چنانچہ اُس کے اثبات کے لیے تقریر وافی اور تحریر شافی اوراق گذشتہ میں گذر چکی ہے. ایسے ہی موت نبویؐ اور

---

[1] آب حیات ص۵ [2] لطائف قاسمیہ ص۷ ع حضرت کی یہ تصریح ان لوگوں کے منہ پر ایک عبرتناک طمانچہ ہے جو یہ پراپیگنڈہ کر رہے ہیں کہ حضرت نانوتویؒ کا یہ عقیدہ تھا کہ حضورؐ پہ ورود موت ہی نہیں ہوا اور وہ حضورؐ کے لیے کسی قسم کی وفات کے قائل نہیں، یہ حضرت پر ایک بہتان عظیم ہے. ثانیاً اس عبارت سے منکرین حیات کا یہ پراپیگنڈہ بھی بے غبار ہو گیا کہ وفات النبی کی یہ مذکورہ آیات حضرت نانوتویؒ کو یاد نہ تھیں یا بیان حیات النبی کے وقت مستحضر نہ تھیں اور سامنے نہ تھیں۔

موتِ مومنین میں بھی فرق ہے اور مرجہ فرق بین الموتتین وہی فرق بین الحیاتین ہے اور اسی بناء پر لازم ہے کہ نوم نبوی اور نوم مومنین میں فرق ہو. اس لیے کہ النوم اخو الموت[1] چنانچہ خداوند کریم نے بھی اپنے کلام پاک میں موت اور نوم کو ایک سلک میں کھینچا ہے اور ایک ذیل میں داخل کیا ہے. فرماتے ہیں :۔

اللہ یتوفی الانفس حین موتہا والتی لم تمت فی منامہا.[2]

جب دونوں کی حقیقت توفی اور امساک ہوئی. چنانچہ ارسال کا تقدم امساک پر دال ہے. جیسے موت تقدم حیات پر دلالت کرتی ہے. تو پھر جو حال وقت امساک موت ہوگا وہی حال وقت امساکِ نوم ہوگا. جس کی موت کے وقت استتارِ حیات ہوگا، اُس کی نوم کے وقت بھی استتار ہی ہوگا. فرق ہو تو شدتِ استتار و ضعفِ استتار ہو. . . . چنانچہ آنحضرتؐ کا کلام اس بیان کی تصدیق کرتا ہے. فرماتے ہیں :۔

تنام عینای ولا ینام قلبی اوکماقال. (رواہ البخاری ومسلم بالفاظ مختلفہ)

ترجمہ: میری صرف آنکھیں سوتی ہیں دل نہیں سوتا.[3]

---

[1] عزیزی شرح جامع صغیر جلد ص [2] فیمسک التی قضی علیھا الموت ویرسل الاخری الی اجل مسمیٰ (پ ۲۴، الزمر) یعنی اللہ تعالیٰ جانوں کو قبض کرتا ہے موت کے وقت بھی اور نیند کے وقت بھی. پھر انہیں ان کے متعلق روک رکھتا ہے جن کی موت کا فیصلہ ہو چکا — اور دوسری جانوں کو پھر لوٹا دیتا ہے کچھ مدت تک کے لیے — حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے بغوی نے نقل کیا ہے کہ نیند میں روح نکل جاتی ہے مگر اس کا مخصوص تعلق بدن سے بذریعہ شعاع کے رہتا ہے جس سے حیات باطل نہیں ہونے پاتی (جیسے آفتاب لاکھوں میل سے بذریعہ شعاعوں کے زمین کو گرم رکھتا ہے) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نیند میں بھی وہی چیز نکلتی ہے جو موت کے وقت نکلتی ہے لیکن تعلق کا انقطاع ویسا نہیں ہوتا جو موت میں ہوتا ہے (فوائد القرآن للشیخ العثمانی ص ۶) ہاں انبیائے کرام سے نیند کے وقت بھی روح نہیں نکلتی اسی سے حقیقت موت پر بھی غور کرو. واللہ اعلم [3] آب حیات ص ۲۱۹ ۲۲۰ مجتبائی

حضرت نانوتوی نے "آبِ حیات" کو "تقریر ابوتِ نبوی" تک پہنچ کر پھر حضرت گنگوہی کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ وہ خود لکھتے ہیں:۔

بغرض اطمینان و تصدیق مولانا و مخدومنا رونقِ طریقت زیبِ شریعت مولانا رشید احمد گنگوہی سلمہ اللہ تعالیٰ و ادام فیوضہ کی خدمت میں عرض کی۔[1]

آبِ حیات کے پہلے ورق پر مرقوم ہے:۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہنوز قبر میں زندہ ہیں اور مثل گوشہ نشینوں اور چلہ کشوں کے عزلت گزیں ہیں، جیسے اُن کا مال قابلِ اجرائے حکم میراث نہیں ہوتا، ایسے ہی آپ کا مال بھی محلِ توریث نہیں۔[2]

پھر فرماتے ہیں:۔

ارواحِ انبیاء کو بدن سے علاقہ بدستور رہتا ہے۔ ہر اطراف و جوانب سے سمٹ آتی ہے۔[3]

پھر لکھتے ہیں:۔

سماعِ انبیاء علیہم السلام بعد وفات زیادہ تر قرینِ قیاس ہے اور اسی لیے اُن کی زیارت بعد وفات بھی ایسی ہی ہے، جیسے ایامِ حیات میں "احیاء" کی زیارت ہوا کرتی ہے۔[4]

---

[1] تسوید تقریر ابوت نبوی آبِ حیات صفحہ ۶۳، صفحہ ۸۳، صفحہ ۱۰۸، صفحہ ۱۴۷، صفحہ ۱۲۵ بلکہ اس کے آگے تک پھیلتی گئی ہے۔ عہ حضرت گنگوہی کی تصدیق ان کی اپنی کتاب ہدایۃ الشیعہ میں بھی ہے فرماتے ہیں "اس مضمون حیات کو بھی مولانا محمد قاسم صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسالہ "آبِ حیات" میں بمالا مزید علیہ ثابت کیا ہے" صفحہ ۱۹ مطبع مجتبائی۔ حضرت گنگوہی کے اس ارشاد میں مالا مزید علیہ (کہ اس پر اور کچھ کہا ہی نہیں جا سکتا) کے الفاظ خاص طور پر قابلِ غور ہیں۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی بھی "آبِ حیات" کے متعلق فرماتے ہیں "مولانا گنگوہی قدس سرہ "ہدایۃ الشیعہ" اور رسالہ "حج" وغیرہ میں بھی اس کی تصریح و تائید فرما رہے ہیں۔ (الشہاب الثاقب صفحہ ۴۵ برقی پریس دہلی)۔

[1] آبِ حیات صفحہ ۲۰۷ [2] ایضاً صفحہ ۲ [3] جمالِ قاسمی صفحہ ۱۳ [4] ایضاً صفحہ ۱۲

ان تفصیلات سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ حضرت نانوتوی حضور پر ورود وفات کے ہرگز منکر نہ تھے۔ حضرت گنگوہی کی انہیں پوری تائید حاصل تھی اور وہ اپنی رائے میں منفرد تھے۔ آیت انک میت و انہم میتون ان سے اوجھل نہ تھی۔ وہ اسے ان مباحث میں پڑھتے بھی تھے اور تشریح بھی کرتے تھے اور آپ کی یہ تشریح اسلاف امت کے خلاف نہ تھی۔ حقیقت یہی ہے، البتہ جھوٹ کا کوئی علاج نہیں۔

② — فخر المحدثین قطب الارشاد امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ

ولان النبیین صلوات اللہ علیہم اجمعین لما کانوا احیاء فلا معنی لتوریث الاحیاء منہم۔[1]

ترجمہ: چونکہ انبیائے کرام علیہم الصلوات سب کے سب زندہ ہیں، اس لیے ان کے آگے ان کی وراثت چلے، یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

پھر فرماتے ہیں:۔

آپ اپنی قبر شریف میں زندہ ہیں۔ ونبی اللہ حی یرزق۔[عـہ] اس مضمون حیات کو بھی مولوی محمد قاسم صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسالہ "آب حیات" میں بما لا مزید علیہ ثابت کیا ہے۔[2]

پھر ارشاد فرماتے ہیں:۔

(کسی) قبر کے پاس جا کر کہے کہ اے فلاں! تم میرے واسطے دعا کرو کہ حق تعالے

---

[1] الکوکب الدری جلد ۱ ص۴۲۳ [2] ہدایۃ الشیعہ ص۸ المجتبائی عہ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب سہارنپوری دامت برکاتہم حضرت گنگوہیؒ کی اس حیات النبی کی تقریر کے متعلق لکھتے ہیں۔ تقریراً انیقاً ینبغی ان یکتب بماء الذھب۔ (اوجز المسالک جلد ۲ ص۴۸۲)

عـہ سنن ابن ماجہ ص۱۱۹ اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ حضرت نانوتویؒ کے پورے حامی تھے۔

میرا کام کر دیوے، اس میں اختلاف علماء کا ہے۔ مجوزِ سماعِ موتیٰ اس کے جواز کے مقر ہیں اور مانعین سماع منع کرتے ہیں۔ سو اس کا فیصلہ اب کرنا محال ہے، مگر انبیاء علیہم السلام کے سماع میں کسیؒ کو خلاف نہیں۔ اسی وجہ سے ان کو مستثنیٰ کیا ہے، اور دلیلِ جواز یہ ہے کہ فقہاء نے بعد سلام کے وقتِ زیارتِ قبر مبارک کے شفاعت مغفرت کا عرض کرنا لکھا ہےؒ۔ پس یہ جواز کے واسطے کافی ہےؒ۔

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب سہارنپوری دامت برکاتہم حضرت گنگوہیؒ کا مسلک بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:-

حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب مفتی اعظم دار العلوم نور اللہ مرقدہ نے حضرت گنگوہی قدس سرہ سے انك میت الآیہ کے اشکال کا جو جواب نقل کیا ہے، وہ تو حضرت نانوتوی قدس سرہ کی تعبیر سے بھی بہت اونچا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ موت سب کو شامل ہے۔ مگر انبیائے کرام کی ارواح مشاہدۂ جمال و جلالِ حق تعالیٰ شانہ و تعالیٰ آفتابِ وجودِ باری تعالیٰ سے اس طرح پہنچ جاتی ہیں کہ اجزائے بدن پر اُن کا یہ اثر ہوتا ہے کہ تمام بدن حکمِ روح پیدا کر لیتا ہے اور تمام جسم اُن کا عینِ ادراک اور عینِ حیات ہو جاتا ہے اور یہ حیات دوسری قسم کی ہوتی ہے اور اس تحقیق سے نکتہ ان اللہ حرم علی الارض ان تاکل اجساد الانبیاء اور بھی ظاہر ہو جاتا ہےؒ۔ انتہی کلامہ الشریف۔

عہ معلوم ہوا کہ حضور اکرمؐ کے اپنے روضہ اطہر میں خود سماعت فرمانے پر پوری اُمت کا اجماع ہے اور اس کا منکر پورے اجماعِ امت کا منکر ہے۔ عہ ثم یسئل النبی الشفاعة یقول یا رسول اللہ اسئلك الشفاعة۔ (فتح القدیر آخر کتاب الحج جلد ۲ ص ۳۳۷ مصر) لہ حضرت شیخ الحدیث کا پورا بیان آگے آرہا ہے یہاں صرف حضرت گنگوہیؒ کا مسلک پیش کرنا مقصود تھا اس لیے اس پر کفایت ہے۔ لہ حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ کا مسلک بھی اس نقل سے واضح ہو گیا۔ فجزاہ اللہ احسن الجزاء۔

③ — رئیس المحققین زبدۃ المحدثین شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحبؒ (۱۳۳۹ھ)

"المہند علی المفند" میں پانچویں سوال کے جواب میں لکھا ہے :-

عندنا وعند مشائخنا حضرت الرسالۃ صلی اللہ علیہ وسلم حی فی قبرہ الشریف وحیٰوتہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیویۃ برزخیۃ لکونہ فی عالم البرزخ۔[1]

اس پر حضرت شیخ الہندؒ لکھتے ہیں :-

ھو معتقدنا ومعتقد مشائخنا جمیعاً لاریب فیہ۔[2]

ترجمہ۔ ہمارا اور ہمارے مشائخ کا یہی عقیدہ ہے، اس میں کسی قسم کا کوئی شک نہیں۔

حضرت شیخ الہندؒ کے تصحیح کردہ ابو داؤد کے حاشیہ ص۱۵۷ میں ہے :-

ان العرض ھل ھو علی الروح المجرد او علی المتصل بالجسد حسبوا ان جسد النبی کجسد کل احد فکفی فی الجواب ما قالہ علی وجہ الصواب۔[3]

ترجمہ۔ وفاتِ شریفہ کے بعد حضورؐ پر درود شریف کیا صرف روحِ مجرد پر پیش ہوا کرے گا یا روحِ متصل بہ جسد پر اس کا عروض ہوگا؟ حضورؐ کا جواب کہ انبیائے کرام کے اجسادِ مطہرہ مٹی نہیں ہوتے، اس سوالِ کیفیت کا کافی جواب تھا۔

④ — فخر المحدثین زبدۃ العارفین حضرت مولانا خلیل احمد صاحب محدث سہارنپوریؒ

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم حی فی قبرہ کما ان الانبیاء علیہم السلام احیاء فی قبورھم ولا فرق بین ان یکون فوق الارض او تحت حجابھما کالافرق

---

[1] [2] افزازیہ دیوبند [2] المہند ص۱۶ [3] ص۱۵۷

علمائے دیوبند کی مرکزی علمی دستاویز المہند کے مصنف یہی بزرگ ہیں۔ المہند کی تالیف سے بیس برس پہلے آپ نے مولانا عبدالسمیع رامپوری کی کتاب انوارِ ساطعہ کے جواب میں براہین قاطعہ لکھی تھی۔ یہ کتاب حضرت گنگوہیؒ کے حکم سے لکھی گئی اور ان کی زندگی میں لکھی گئی تھی۔ اس وقت مولانا احمد رضا خاں میدان میں نہ تھے نہ ابھی انہوں نے وسیع پیمانے پر تکفیر کی مہم شروع کی تھی۔ اس میں آپ نے اپنا عقیدہ حیات النبی ان الفاظ میں لکھا ہے:۔

اس بات کو خوب یاد کر لینا ضرور ہے کہ عقیدہ سب کا ہے کہ انبیاء علیہم السلام اپنی قبور میں زندہ ہیں اور عالمِ غیب اور جنت میں جہاں چاہیں باذنہ تعالیٰ چلتے پھرتے ہیں اور اس عالم میں بھی حکم ہو تو آسکتے ہیں اور صلوٰۃ وسلام ملئکہ پہنچاتے ہیں اور اعمالِ امت ان پر پیش ہوتے ہیں اور جس وقت چاہے حق تعالیٰ دنیا کے احوال ان پر کشف ہو جاتے ہیں اس میں کوئی مخالف نہیں مگر یہ کہ ہر جگہ محفل مولود میں اور دیگر مجالس ذکر میں ہر روز آتے ہوں یا ہر صورت وندا اور عرض وحالات دنیا کے ہر روز معلوم ہوتے ہوں بدون اعلامِ حق تعالیٰ کے اس کو تسلیم نہیں کرتے۔[1]

اس عالم میں آنے کا یہ مطلب نہیں کہ اب وہ اس جہان (عالمِ دنیا) کے فرد ہو گئے۔ آپ کی یہ تشریف آوری ایک برزخی زندگی سے ہی ہو گی جس طرح معراج کی رات عالمِ برزخ کے ان مسافروں کی بیت المقدس تشریف آوری ایک برزخی زندگی سے تھی اور اس میں اس زندگی (دنیا کی زندگی) کے لوازم گرمی سردی بھوک اور پیاس وغیرہ نہ تھے۔ اس عالم میں عالمِ برزخ کے مسافر اسی پیرایہ میں آتے ہیں۔

یاد رکھیے آپ نے عقیدہ حیات النبی صرف مولانا احمد رضا خاں کے جواب میں ترتیب نہ دیا تھا پہلے سے یہ حضرات اس عقیدہ پر چلے آرہے ہیں اور براہین قاطعہ اس پر شاہد ہے

---

[1] براہین قاطعہ صہ ۱۹۹ صتہ ۲۰۰ تقطیع کلاں

فی حضورہ وغیبتہ فی زمان حیاتہ ولھذا العلۃ لم یذھب الیہ احد من الائمۃ۔[1]

ترجمہ۔ یقیناً نبی کریمؐ اپنی قبر شریف میں زندہ ہیں جیسے کہ سب انبیائے کرام اپنی اپنی قبروں میں زندہ ہیں۔ اس میں کوئی فرق نہیں کہ وہ زمین کے اُوپر دکھائی دیں، یا پردۂ زمین میں استراحت فرما ہوں (وہ زندہ یقیناً ہیں) جیسے کہ آپ کی اس دُنیا کی زندگی میں آپ کے حاضر ہونے یا غائب ہونے میں (زندہ ہونے کے اعتبار سے) کوئی فرق نہ تھا۔

پھر لکھتے ہیں:۔

ان الانبیاء فی قبورھم احیاء۔[2]

ترجمہ۔ یقیناً انبیائے کرام اپنی اپنی قبروں میں زندہ ہوتے ہیں۔

رأس الاتقیاء حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ پر اس یقین کی کیفیت اس طرح غالب تھی۔ کہ سامنے اس کا انکشاف ہو رہا تھا۔ تذکرۃ الخلیل میں ہے:۔

آستانۂ محمدیہ پر حضرت کی عجیب کیفیت ہوتی تھی۔ آواز نکالنا تو کیا مواجہہ شریفہ کے قریب یا مقابل بھی آپ کھڑے نہیں ہوتے تھے۔ خوفزدہ، مؤدبانہ، دبے پاؤں آتے اور مجرم و قیدی کی طرح دُور کھڑے ہوئے بکمال خشوع صلوٰۃ و سلام عرض کرتے اور چلے آتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ آں حضرت حیات ہیں۔ لہٰذا پست آواز سے سلام عرض کرنا چاہیئے۔ مسجد نبوی کی حد میں کتنی ہی پست آواز سے سلام عرض کیا جائے۔ اس کو حضرت خود سنتے ہیں۔[3]

پھر لکھتے ہیں:۔

عندنا وعند مشائخنا حضرۃ الرسالۃ صلی اللہ علیہ وسلم حیّ فی قبرہ

---

[1] بذل المجہود جلد ۲ صفحہ ۱۱۷ [2] ایضاً صفحہ ۱۶ [3] تذکرۃ الخلیل صفحہ ۳۰۶

الشریف وحیوتہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیویۃ من غیر تکلیف . . . . فثبت بھذا ان حیوتہ دنیویۃ لکنہا فی عالم البرزخ۔[1]

ترجمہ۔ ہمارا اور ہمارے سب مشائخ کا عقیدہ یہی ہے کہ حضورؐ اپنی قبر شریف میں زندہ ہیں اور آپ کی حیات (اس دُنیا والے جسدِ اطہر میں ہونے کے اعتبار سے) دُنیاوی ہے، ہاں (بجمیع الوجوہ دُنیاوی نہیں) اس میں آپ مکلف بالاحکام نہیں پس آپ کی حیات اس طرح دُنیاوی اور عالمِ برزخ میں ہونے کے لحاظ سے برزخی ہے۔

⑤ ـــ شیخ الاتقیاء زُبدۃ الصلحاء حضرت مولانا الحاج الشاہ عبدالرحیم صاحب رائپوریؒ

حضرت رائے پوریؒ قدس سرہ العزیز مذکورۃ الصدر "المہند علی المفند" (جس کی عبارت در بارۂ حیات النبیؐ اوپر ہدیۂ قارئین ہو چکی ہے) کے متعلق تحریر فرماتے ہیں۔

الذی کتب فی ھذہ الرسالۃ حق صحیح وثابت فی الکتب بنص صریح و ھو معتقدی ومعتقد مشائخی رضوان اللہ علیہم اجمعین احیانا اللہ بھا و اماتنا علیھا وانا العبد الضعیف عبدالرحیم عفی عنہ الرائیفوری۔[2]

ترجمہ۔ جو کچھ اس رسالہ "المہند" میں لکھا ہے حق اور صحیح ہے اور کتابوں میں نصِ صریح کے ساتھ موجود ہے یہی میرا عقیدہ ہے اور یہی میرے مشائخ کا عقیدہ تھا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس عقیدے کے ساتھ زندہ رکھے اور اسی عقیدے پر ہمیں موت دے۔ میں ہوں بندۂ ضعیف عبدالرحیم عفی عنہ رائے پوری۔

⑥ ـــ امامِ کبیر محدثِ شہیر حضرت مولانا العلامۃ الشیخ امام انور شاہ صاحب کشمیریؒ

یرید بقولہ الانبیاء احیاء مجموع الاشخاص لا الارواح فقط۔[3]

---

[1] المہند ص۱۳، ۱۴ [2] اعزازیہ [3] الغیاث ص۴۸ [4] تحیۃ الاسلام ص۳۶

ترجمہ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کہ "انبیائے کرام زندہ ہوتے ہیں" کا مطلب یہ نہیں کہ فقط ان کی ارواح زندہ ہیں بلکہ اس حدیث کا مطلب یہ ہے، کہ اشخاصِ انبیاء (روح و بدن کے مجموعہ کے ساتھ زندہ ہیں۔

پھر لکھتے ہیں:-

المراد بحدیث "الانبیاء احیاء فی قبورھم یصلّون" انھم ابقوا علیٰ ھٰذہ الحالۃ ولم تسلب عنھم فلا یرد ان الروح بنفسہ یستطیع الصلوٰۃ ورد السلام فکیف وجہہ فی الحدیث بقاء الحیوٰۃ بفعل الصلوٰۃ وکذا رد السلام برد الروح[1]

ترجمہ۔ انبیائے کرام اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور نمازوں میں مشغول ہیں، اس حدیث کا مطلب یہی ہے کہ انبیائے کرام اسی حالت (اشتغال باعمال طیبہ) پر باقی رکھے گئے ہیں اور (خائنۃ الحیات ہو کر اشتغال باعمال طیبہ کی) یہ کیفیت اُن سے سلب نہیں کی گئی۔ یہ خیال نہ ہو کہ روح اکیلی ادائے نماز اور جوابِ سلام کی استطاعت رکھتی ہے۔ اس لیے کہ اگر ایسا ہوتا، تو حضورؐ نے حیات النبیؐ کے ساتھ ان کے فعل نماز کو اور روح لوٹنے (متوجہ ہونے) کے ساتھ جواب سلام کو وابستہ نہ فرمایا ہوتا۔

پھر ارشاد ہوتا ہے:-

قولہ فنبی اللہ حی یرزق واحیاء فی قبورھم یصلّون تسرد فی ذکر الحیٰوۃ افعالھا لا اصلھا اوراد مع الاجساد فان اجسادھم حرمت علی الارض[2]

ترجمہ۔ حضورؐ کا ارشاد ہے کہ اللہ کا نبی زندہ ہوتا ہے اور اسے رزق بھی ملتا ہے اور یہ کہ انبیائے کرام اپنی قبروں میں زندہ ہوتے ہیں اور نمازیں بھی پڑھتے ہیں، یہ احادیث صرف حیات کا بیان نہیں کرتیں، بلکہ افعالِ حیات (زندہ والے کاموں کو) بھی ثابت کرتی ہیں یا یوں کہیے کہ انبیائے کرام کے اجسادِ مطہرہ مٹی پر حرام کر دیئے گئے ہیں۔

---

[1] تحیۃ الاسلام صہ ٣٦ مصنفہ انور شاہؒ [2] ایضاً

(٧) — حکیم الامّت، مجدّد الملّت، محی السنۃ الغراء، قامع البدعۃ الظّلماء

حضرت مولانا شاہ اشرف علی صاحب تھانویؒ (۱۳۶۲ھ)

حضرت ابو الدرداءؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کر دیا ہے کہ وہ انبیاء کے جسد کو کھا سکے، پس خدا کے پیغمبر زندہ رہتے ہیں اور ان کو رزق دیا جاتا ہے۔ روایت کیا اس کو ابن ماجہ نے۔

ف۔ پس آپ کا زندہ رہنا بھی قبر شریف میں ثابت ہوا اور یہ رزق اس عالم کے مناسب ہوتا ہے اور گو شہداء کے لیے بھی حیات اور مرزوقیت وارد ہے۔ مگر انبیاء علیہم السلام میں ان سے اکمل واقوی ہے۔ بیہقی وغیرہ نے حدیث انسؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہوتے ہیں اور نماز پڑھتے ہیں۔ (کذا فی المواہب) اور یہ نماز تکلیفی نہیں، بلکہ تلذذ کے لیے ہے اور اس حیات سے یہ نہ سمجھا جائے کہ آپ کو ہر جگہ سے پکارنا جائز ہے [۱]

ندا کا شبہ یہاں بھی نہ کیا جائے، دو وجہ سے۔ ایک تو متبادر قصہ سے یہ ہے کہ مسجد نبویؐ میں جانے کو فرمایا، سو وہاں حضورؐ قریب ہی سے تشریف رکھتے ہیں، ندائے غائب لازم نہیں آتی۔ [۲]

شہداء کو احیاء کہا گیا اور ان کو دوسرے اموات کے برابر اموات کہنے کی ممانعت کی گئی اور یہی حیات ہے، جس میں حضرات انبیاء شہداء سے بھی زیادہ امتیاز اور قوت رکھتے ہیں، حتیٰ کہ بعد موت ظاہری کے سلامت جسد کے ساتھ ایک اثر اس حیات کا اس عالم کے احکام میں یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مثل ازواج احیاء کے ان کی ازواج سے کسی کا نکاح جائز نہیں ہوتا اور ان کا مال میراث میں تقسیم نہیں ہوتا۔ [۳]

---

[۱] نشر الطیب ص ۲۵۵ شائع کردہ ادارہ اشرفیہ لاہور [۲] ایضاً ص ۲۴۳ [۳] بیان القرآن جلد ۱ ص ۹۴ تاج کمپنی

حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے دور تک اس مسئلے میں کوئی اختلاف سننے میں نہ آیا تھا. علمائے دیوبند کے مخالفین بھی اس مسئلہ میں ان کے ساتھ تھے. آپ فرماتے ہیں :-

(۱) جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جسد اطہر موافقین و مخالفین سب کے نزدیک بالاتفاق محفوظ ہے اور مع روح ہے جیسا کہ بیان کیا گیا تو ظاہر ہے اور علماء نے بھی تصریح کی ہے کہ وہ بقعہ زمین جس سے جسم مبارک خصوص مع الروح مس کیے ہوئے ہے عرش سے بھی افضل ہے.[۱]

(۲) ایک دوسری جگہ حضرت امام مالکؒ کے ایک قول کی تشریح میں فرماتے ہیں :-
ان کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم قبر شریف میں زندہ ہیں. اس لیے زیارت کرنے والے کو یہ نہ کہنا چاہیئے کہ میں نے قبر کی زیارت کی. کیونکہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم زندہ ہیں.[۲]

(۳) ایک مرتبہ فرمایا کہ :-
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کے لیے بہت کچھ شرف حاصل ہے. کیوں کہ جسد اطہر اس کے اندر موجود ہے. بلکہ حضورؐ خود بہ تلبیس الروح اس کے اندر تشریف رکھتے ہیں کیونکہ آپ قبر شریف میں زندہ ہیں. قریب قریب تمام اہل حق اس پر متفق ہیں صحابہ کرام علیہم الرضوان کا بھی یہی اعتقاد ہے. حدیث میں بھی نص ہے کہ آپ اپنی قبر میں زندہ ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو رزق پہنچتا ہے.
اس کے بعد حضرتؒ نے حیات کی تفصیل بیان فرمائی. پھر ارشاد فرمایا کہ :-
تیسرا درجہ جو سب سے قوی ہے وہ انبیائے کرام علیہم السلام کی حیات کا ہے کہ وہ شہید کی حیات سے بھی زیادہ قوی ہوتی ہے. چنانچہ اس کا ایک اثر تو محسوس ہے اور وہ وہی ہے جو شہید کے لیے ہے کہ ان کے جسم مبارک کو مٹی نہیں

---

[۱] تلخیص الصدور صد ۱۵۲ امداد الفتاویٰ جلد ۲ صد ۱۱۹ راس الاربعین صد ۵۱۴ [۲] شکر النعمۃ صد ۴۹

کھا سکتی۔ حدیث شریف میں ہے :-

حرم اللہ اجساد الانبیاء علی الارض۔

اور دوسرا اثر محسوس تو نہیں مگر منصوص ہے اور وہ حرمتِ نکاحِ ازواجِ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن سے بعد ان کے وصال کے کسی امتی کو نکاح جائز نہیں۔ نیز انبیاء علیہم السلام کی میراث ورثہ میں تقسیم نہیں ہوتی۔

نحن معاشر الانبیاء لا نورث ما ترکنا صدقۃ۔

انبیاء کرام علیہم السلام کا تمام ترکہ صدقہ ہوتا ہے۔

یہ باتیں شہید کے لیے شریعت نے مشروع نہیں کیں۔ تو اگرچہ شریعت نے اس کا کوئی خاص راز بیان نہیں کیا مگر علماء محققین یہی کہتے ہیں کہ اس کا راز قوت حیات انبیاء علیہم السلام ہے کہ حیات مانع ہے ان دونوں امروں سے۔ ان امتیازات سے حیاتِ برزخیہ انبیاء کا شہداء اور عام مومنین سے اقویٰ ہونا ثابت ہوا۔

بہر حال یہ بات باتفاقِ امت ثابت ہے کہ انبیاء علیہم السلام قبر میں زندہ رہتے ہیں اور خاص ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں تو مخالفین بھی حیات کے معتقد ہیں اور ان کو بھی حضورؐ کی حیات کا اقرار ہے۔ چنانچہ ایک واقعہ سے ..... اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ مخالفین کو بھی جسدِ اطہر کے صحیح ہونے کا اعتقاد تھا۔[۱]

(۴) حضرت حکیم الامتؒ ایک اور وعظ میں فرماتے ہیں :-

خوب سمجھ لو کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جو میں نے اموات کے ذیل میں بیان کیا ہے اس سے کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ یہ حیاتِ انبیاء علیہم السلام کے خلاف ہے کیونکہ بوجہ ظاہری موت کے آپ کو میت کہہ سکتے ہیں، ورنہ واقع میں

---

[۱] وعظ الحبور ص۱۳ راس الربعین ص۵۱

آپ زندہ ہیں اور آپ کی حیات ایسی قوی ہے کہ دوسروں کو حاصل نہیں. انبیاء علیہم السلام کی حیات ایسی قوی ہے کہ ان کی بیبیوں سے نکاح کرنا بعد ان کی وفات کے بھی جائز نہیں. جیسے کسی زندہ خاوند کی بیوی سے نکاح جائز نہیں اور سب کی بیبیوں سے بعد خاوند کی وفات کے شادی کرنا جائز ہے. حتیٰ کہ شہداء جن کی حیات بعد شہید ہونے کے اموات مومنین سے قوی ہوتی ہے کہ ان کے بدن کو زمین نہیں کھاتی. مگر ان کی بھی بیبیوں سے بعد مرجانے کے نکاح جائز ہے. معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی حیات شہداء کی حیات سے قوی تر ہے.[1]

(۵) ایک مرتبہ فرمایا کہ :-

ایک شخص نے حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں مجھ سے گفتگو کی. میں نے کہا جو لوگ مقتول فی سبیل اللہ ہیں ان کے حق میں ارشاد ہے. بل احیاءٌ عند ربّھم اور جو لوگ فی سبیل اللہ سے بڑھ کر مقتول فی اللہ ہیں وہ کیوں کر زندہ نہ ہوں گے اور اس نکتہ پر مدار مسئلہ کا نہیں. اس میں تو حدیث صریح موجود ہے اور نکتہ تائید کے درجہ میں ہے.[2]

(۶) ایک مرتبہ فرمایا کہ :-

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بعد وفات کے بھی حیاتِ برزخیہ ثابت ہے. وہ حیاتِ شہداء کی حیات سے بھی بڑھ کر ہے اور اتنی قوی ہے کہ حیات ناسوتی کے قریب قریب ہے. چنانچہ بہت سے احکام ناسوت کے اس پر متفرع بھی ہیں دیکھئے زندہ مرد کی بیوی سے نکاح جائز نہیں ہے. حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنہن سے بھی نکاح جائز نہیں اور زندہ کی میراث تقسیم نہیں ہوتی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث بھی تقسیم نہیں ہوتی اور حدیثوں میں صلوٰۃ وسلام کا سماع وارد ہوا ہے.[3]

---

[1] تعظیم الشعائر ص۱۶ [2] الافاضات الیومیہ جلد ۳ ص ۲۱۷ [3] وعظ الظہور ص۵

(۷) ایک مرتبہ فرمایا کہ :۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم بنصِ حدیث قبر میں زندہ ہیں[۱]

ایک مرتبہ فرمایا کہ :۔

مدینہ طیبہ جانے والا یُوں کہے کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں[۲]

(۸) حضرت حکیم الامتؒ کے ایک خلیفہ جب ہندوستان سے حج کے لیے تشریف لے جا رہے تھے تو آپ کے پاس آئے۔ آپ نے ان سے فرمایا کہ :۔

جب تم مدینہ منورہ روضۂ اقدس پر حاضر ہو تو میرا سلام اس طرح عرض کرنا :۔

یاسیدی یارسول اللہ اشرف علی خویدمک یسلم علیک ویسئلک ان یدعوا اللہ تعالیٰ ان یدخلہ فی عشاقک وخدام دینک ویحشرہ معک[۳]

(۹) حضرت حکیم الامتؒ فرماتے ہیں کہ :۔

بس اب میں بیان کو اس واقعہ پر ختم کرتا ہوں جس سے زیارتِ قبر شریف کے برکات اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قبر شریف میں زندہ ہونا معلوم ہوگا :۔

سید احمد رفاعی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ جب وہ مزار شریف پر حاضر ہوتے تو عرض کیا۔ السلام علیک یاجدی۔ جواب مسموع ہوا۔ وعلیک السلام یاولدی۔ اس پر ان کو وجد ہوا اور بے اختیار یہ اشعار زبان پر جاری ہوئے ؎

فی حالۃ البعد روحی کنت ارسلہا	تقبل الارض عنی وھی نائبتی
فھذہ دولۃ الاشباح قد حضرت	فامدد یمینک کی تحظی بہا شفتی

بس فوراً قبر شریف سے ایک منور ہاتھ جس کے روبرو آفتاب بھی ماند تھا باہر نکلا۔ انہوں نے بے ساختہ دوڑ کر اس کا بوسہ لیا اور وہاں ہی گر گئے[۴]

---

[۱] التکشف ص۴۴۶ [۲] التبلیغ ص۳۰ [۳] القول الجمیل حصہ اول ص۳۰ [۴] شکر النعمۃ ص۳۴ الاضافات جلد ۵ ص۲۴۳

(۷) پھر فرماتے ہیں۔ آپ بنص حدیث قبر میں زندہ ہیں[۱]

(۸) مدینہ منورہ جانے والے۔۔۔۔ یوں کہے کہ میں نے حضورؐ کی زیارت کی، کیونکہ حضورؐ زندہ ہیں[۲]

مذکورہ بالا تحریرات وارشادات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قبر اطہر میں زندہ ہونے کا اعتقاد رکھتے تھے۔

(۸) ــــ رئیس المتکلمین، خاتم المحققین، محدث کبیر، شیخ الاسلام

حضرت مولانا علامہ شبیر احمد عثمانیؒ (۱۳۶۹ھ)

الانبیاء احیاء عند ربھم یرزقون[۳]

ترجمہ۔ انبیائے کرام اپنے پروردگار کے ہاں زندہ ہیں اور انہیں رزق بھی ملتا ہے۔

ان النبیؐ حی کما تقرر وانہ یصلی فی قبرہ باذان واقامۃ[۴]

ترجمہ۔ بے شک حضور اکرمؐ زندہ ہیں اور یہ بھی صحیح ہے کہ آپ اپنی قبر شریف میں اذان واقامت سے نماز پڑھتے ہیں۔

اما بعد وفاتہ فروحہ المقدسۃ صلی اللہ علیہ وسلم قد استقرت فی الرفیق الاعلیٰ مع ارواح الانبیاء علیھم الصلوٰۃ والسلام ولایبتھم من ھذا انکار حیاتہ فی قبرہ الشریف فان لروحہ صلی اللہ علیہ وسلم اشراقاً علی البدن المبارک المطیب واشراقاً وتعلقاً بہ وبدنہ فی ضریحۃ غیر مفقود واذا سلم علیہ المسلم رد اللہ علیہ روحہ[*] حتی یرد علیہ السلام کما ورد فی الحدیث

---

[۱] التکشف صت ۴۴۲ [۲] وعظ التبلیغ ۳ جمادی الاولیٰ ۳۷ھ [۳] فتح الملہم جلد ۳ صت ۳۳ [۴] ایضاً صت ۴۱۹

[*] قال شیخ الاسلام المراد بقول رد اللہ علی روحہ کانت سابقۃ عقب دفنہ لا انہا تعاد ثم تنزع ثم تعاد کما فی الفتح صت ۳۳

ولم یفارق الملأ الاعلیٰ ومن کثف دراکہ وغلظت طباعۃ من ھذا الادراک فلینظر الی الشمس فی علو محلہا۔[1]

ترجمہ۔ وفاتِ شریفہ کے بعد آپ کی روحِ مقدسہ دوسرے انبیاء کی ارواحِ طیبہ کے ساتھ رفیقِ اعلیٰ میں استقرار پذیر ہے۔ لیکن اس سے آپ کا اپنی قبر شریف میں زندہ نہ ہونے کا وہم نہ کیا جائے۔ کیونکہ آپ کی روحِ اقدس قبر میں رکھے بدن پاک پر اپنا اثر ڈال رہی ہے اس کی روشنی اس پہ پڑ رہی ہے اور اس کا بدنِ اطہر کے ساتھ تعلق قائم ہے۔ آپ کا بدن مبارک قبر سے ہرگز غائب نہیں ہوا[ع] اور جب بھی کوئی مسلمان آپ پہ سلام عرض کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ آپ کی روحِ اقدس کو آپ کی طرف متوجہ کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ آپ اس کے سلام کا جواب دیتے ہیں، جیساکہ حدیث میں وارد ہے۔ اس کے باوجود آپ ملاء اعلیٰ اعلیٰ علیین سے جدا نہیں ہوتے جس کا ادراک کثیف ہو اور اس کی فطرت ایسے حقائق کے ادراک کرنے میں غلیظ ہو، اسے سورج کو اس کے علوِ محل میں دیکھنا چاہیئے۔

⑨ ــــ محدث شہیر، مجاہد کبیر، عمدۃ الفقہاء، رأس الاتقیاء، مفتیِ اقلیم ہند

حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی رح

حضرت مفتی اعظم "المہند" (جس میں مسئلہ حیات النبیؐ ایک مستقل سوال اور جواب کی صورت میں مرقوم ہے) اس پہ لکھتے ہیں :-

رأیت الاجوبۃ کلہا فوجدتہا حقۃ صریحۃ لا یحوم حول سدادقاتہا شک ولا ریب وھو معتقدی ومعتقد مشائخی۔[2]

---

[1] فتح الملہم جلد ۳ ص ۴۲۱ [2] المہند ص ۵۲ اعزازیہ

ع جیساکہ علامہ قونویؒ کی رائے ہے۔ والتفصیل فی جذب القلوب

ترجمہ: میں نے تمام جوابات خود دیکھے ہیں اور انہیں حق صریح پایا ہے۔ کوئی شک یا ریب اس کے اردگرد بھی گھوم نہیں سکتا۔ یہی میرا عقیدہ ہے اور میرے سب مشائخ بھی انہی عقائد پر تھے۔

(۱۰) —— رئیس المحدثین، امام المجاہدین، شیخ الاسلام والمسلمین، استاذ الہند والحجاز

حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس اللہ اسرارہم

نجدیعہ اور اس کے اتباع کا اب تک یہی عقیدہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی حیات فقط اسی زمانے تک ہے، جب تک وہ دنیا میں تھے۔ بعد ازاں وہ اور دیگر مومنین موت میں برابر ہیں۔ اگر بعد وفات ان کو حیات ہے تو وہی حیات برزخ ہے جو احادِ امت کو ثابت ہے، بعض ان کے حفظِ جسدِ نبی کے قائل ہیں، مگر بلا علاقہ روح اور متعدد لوگوں

عہ یہ تصریح ان لوگوں کے لیے مقام عبرت ہے جو محض اپنے موقف کی حمایت میں حضرت مولانا خلیل احمد صاحب پر الزام لگاتے ہیں کہ انہوں نے خود ہی دوسرے اکابر دیوبند کے نام "المہند" کی تصدیق میں لکھ دیئے تھے یا یہ کہ دوسرے اکابر نے "المہند" پر صرف "اعتماداً" دستخط کر دیئے تھے، عبارات خود نہ دیکھی تھیں۔ دیکھیے حضرت مفتی صاحبؒ کس طرح واضح طور پر تصریح فرما رہے ہیں کہ میں نے تمام جوابات خود دیکھے ہیں۔ اب بھی اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ حضرت مفتی صاحبؒ نے مسلکی حمایت میں جھوٹ بولا ہے، انہوں نے جوابات خود ہرگز نہ دیکھے تھے، تو ہم سوائے اس کے اور کیا کہہ سکتے ہیں ؎ بے حیا باش وہرچہ خواہی کن

عہ اس سے مراد نجدیہ متاخرین ہیں ورنہ متقدمین نجدیہ تو اجماع امت کے مخالف نہ تھے۔ شیخ کبیر عبداللہ بن محمد بن عبدالوہاب نجدی لکھتے ہیں:۔

والذی نعتقد ان رتبۃ نبینا صلی اللہ علیہ وسلم اعلی مراتب المخلوقین علی الاطلاق وانہ حی فی قبرہ حیوۃ مستقرۃ ابلغ من حیات الشہداء المنصوص علیہا فی التنزیل اذ ھو افضل منھم بلا ریب وانہ یسمع من یسلم علیہ۔ (اتحاف النبلاء، ص ۴۱۵ مطبوعہ کانپور)

کی زبان سے بالفاظِ کریہہ کہ جن کا زبان پہ لانا جائز نہیں. در بارہ حیاتِ نبوی علیہ السلام
سُنا جاتا ہے اور انہوں نے اپنے رسائل و تصانیف میں لکھا ہے. اب غور فرمایئے
کہ ان اکابر کے رسائل اور اعتقادات بالکل اس کے مخالف ہیں. حضرت مولانا نانوتوی
قدس اللہ سرہ العزیز نے ایک بہت بڑی ضخیم کتاب تحریر فرمائی ہے. جو کہ مشہور
بین العالم ہے. اس میں کس زور شور سے حیاتِ نبوی کا اثبات کیا ہے اور مذہب
اہل سنت[عہ] والجماعت اور فضائل نبوت میں کسی درجہ اور قوت کے دلائل درج فرمائے
ہیں. مولانا گنگوہی قدس سرہ "ہدایۃ الشیعہ" اور رسالہ "حج" وغیرہ میں بھی اس کی
تصریح[عہ] و تائید فرما رہے ہیں. چونکہ اس مسئلہ میں خصوصاً ان حضرات کی عبارتیں
بہت طویل واقع ہو رہی ہیں اور متعدد رسالے اسی مضمون کے تفصیلاً و اجمالاً
چھپے ہوئے مشہور ہیں، اس لیے بخوفِ تطویل میں نقل نہیں کرتا ہوں. جس کا جی چاہے
"آبِ حیات" و "ہدیۃ الشیعہ" و "اجوبۂ اربعین" و "لطائفِ قاسمیہ" و "ہدایۃ الشیعہ"
و "زبدۃ المناسک" وغیرہ رسائل میں دیکھ لیوے. یہ ایک خاص مسئلہ ہے، جس
میں وہابیہ نے علمائے حرمین کی مخالفت کی ہے اور بارہا جدال و نزاع کی نوبت
آئی. اس مسئلہ میں اور مسئلہ آئندہ کی وجہ سے وہاں وہابی سنّی سے ممتاز[سہ] ہوتا ہے[لہ]
پھر لکھتے ہیں:۔

عہ اس سے معلوم ہوا کہ حیات النبیؐ کا عقیدہ ضروریاتِ مذہب اہل سنّت میں سے ہے جو اس کا
قائل نہیں، وہ دائرہِ اہل سنّت سے خارج ہے.

عہ اس سے معلوم ہوا کہ عقیدہ حیات النبیؐ میں حضرت نانوتویؒ اور حضرت گنگوہیؒ کے مابین کوئی اختلاف
نہ تھا. دونوں بزرگوں کا عقیدہ ایک ہی تھا.

سہ اس سے معلوم ہوا کہ اس مسئلہ حیات النبیؐ کے اقرار سے ہی کسی کا سُنّی ہونا پہچانا جاتا ہے.

لہ رجوم المدنیین صفحہ ۴۸-۴۹ مطبوعہ بمبئی جوپ برقی پریس دہلی، مصنفہ حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ

یہ روایت دوامِ حیات پہ دلالت کرتی ہے۔ اس لیے کہ دن رات میں کوئی گھڑی اور کوئی گھنٹہ بلکہ کوئی منٹ اس سے خالی نہیں رہتا کہ آپ پہ اندرونِ نماز اور بیرونِ نماز درود نہ بھیجا جاتا ہو۔ اس لیے دوامِ حیات لازم آئے گا۔[1]

محمد بن عبدالوہاب اور اس کے فرقہ سے ان حضرات (اکابر علمائے دیوبند) کو دور کا بھی تعلق نہ تھا۔ وہ عقائد و اقوال جو طائفہ وہابیہ کے مشہور اور مابہ الامتیاز (بین اہل السنّۃ وبینھم) ہیں۔ ان کے خلاف ان حضرات کی تصانیف بھری ہوئی ہیں وہ وفاتِ ظاہری کے بعد انبیاء علیہم السلام کی حیاتِ جسمانی اور بقائے ''علاقہ بین الروح والجسم'' کے منکر ہیں۔ اور یہ حضرات صرف اس کے قائل ہی نہیں بلکہ مثبت[ع] بھی ہیں اور بڑے زور شور سے اس پہ دلائل قائم کرتے ہوئے متعدد رسائل اس بارہ میں تصنیف فرماکر شائع کر چکے ہیں۔ رسالہ ''آب حیات'' نہایت مبسوط رسالہ خاص اسی مسئلہ کے لیے لکھا گیا ہے[ت]۔ نیز ''ہدیۃ الشیعہ''، ''اجوبہ اربعین''، حصہ دوم اور دیگر رسائل مطبوعہ مصنفہ حضرت نانوتوی قدس اللہ سرہ العزیز اس مضمون سے بھرے ہوئے ہیں۔[2]

---

[1] مکتوبات شیخ الاسلام جلد ا ص ۲۴۳/۲۴۴ مطبوعہ اعظم گڑھ [2] نقشِ حیات جلد ا ص ۱۰۴

ع حضرت کی اس عبارت سے معلوم ہوا کہ حیاتِ جسمانی اور بقاء علاقہ ''بین الروح والجسم'' کے منکر اہلسنت میں سے نہیں اور وہ دیوبندیت سے بھی خارج ہیں۔ عہ اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ دیوبندیت صرف یہی نہیں کہ آنحضرتؐ کے تعلق بین الروح والجسم کا اقرار کر لیا جائے۔ بلکہ دیوبندی ہونے کے لیے اس کا مثبت ہونا (خواہ تحقیقاً ہو، خواہ تقلیداً) اور اس عقیدے کو تسلیم کرانے کے لیے پوری طرح فکر و قوت صرف کرنا ضروری ہے۔ حضرت کا یہ بیان ان لوگوں کے لیے پیامِ عبرت ہے جو اس تعلق روح و جسم کا اقرار تو کرتے ہیں، مگر اس کے اثبات میں مصلحۃً خاموش ہیں۔ ت معلوم ہوا کہ آب حیات لکھنے کی غرض محض ردِ روافض ہی نہیں جیسا کہ بعض کا خیال ہے، بلکہ اصل مقصد عقیدہ حیات النبی کا اثبات تھا۔

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس اللہ سرہ العزیز نے آں حضرتؐ کی شانِ مبارک میں وہ بلند پایہ مضامین ارشاد فرماتے ہیں، جن کے حریم معلیٰ تک جلیل القدر علمائے امت کا طائرِ فکر بھی پرواز نہیں کر سکتا تھا۔ رسالہ "آبِ حیات"، "قبلہ نما"، "تحذیر الناس"، "ہدیۃ الشیعہ"، "اجوبہ اربعین"، "قاسم العلوم"، "مناظرہ عجیبہ" وغیرہ ایسے مضامین سے بھرے ہوئے ہیں[1]

دس اکابر دیوبند قدس اللہ اسرارہم کا بیان ختم ہوا۔ تلک عشرۃ کاملۃ۔

اکابر دیوبند حضرات موجودین دامت برکاتہم

(۱) ــــ صدر الافاضل، فخر الاماثل، جامع شریعت و طریقت حضرت العلامہ الحاج

القاری محمد طیب صاحب دامت برکاتہم مہتمم دار العلوم دیوبند

حضرت قاری صاحب لکھتے ہیں:۔

مسئلہ زیر بحث میں جہاں تک اپنے بزرگوں کی کتابوں، فتاوے، مقالات اور متوارث ذوق کا تعلق ہے۔ دیوبندیت تو یہی ہے کہ برزخ میں آنحضرتؐ کو حیاتِ دنیوی کے ساتھ زندہ مانا جائے۔ کیونکہ دیوبندیت کی موجودہ جماعتی تشکیل قیامِ دار العلوم سے شروع ہوتی ہے جس کی ابتداء حضرت اقدس حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرہ کی سرپرستی میں ان کے دو جلیل القدر خلفاء حضرت نانوتوی اور حضرت گنگوہی رحمہما اللہ سے ہوئی۔ ان تینوں کا مسلک بھی حیاتِ دنیوی (کہ اس عالمِ برزخ کی حیات اسی جسدِ اطہر میں ہے، جو اس دنیا میں تھا) ہے۔ پھر آخر الذکر دو بزرگوں کے تلامیذ مثل حضرت شیخ الہند، حضرت مولانا احمد حسن امروہیؒ، حضرت مولانا خلیل احمد

---

[1] نقش حیات جلد ۱ ص۱۰۱

سہارنپوریؒ، حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ، حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی دیوبندیؒ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب دیوبندیؒ مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند وغیرہ وغیرہ حضرات کا بھی یہی مسلک تھا، جو اُن کے مطبوعہ فتاویٰ ومقالات میں محفوظ ہے۔

پھر ان اکابر کے تلامذہ مثل حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب دہلویؒ، حضرت مولانا مرتضیٰ حسن صاحبؒ، حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ اور دوسرے اساتذہ دارالعلوم دیوبند وغیرہ وغیرہ حضرات کا بھی یہی مسلک ہے۔ یہی حضرات دیوبندیت کے اساطین کہلاتے ہیں، اس لیے دیوبندیت تو حیات النبیؐ کے بارے میں حیات دُنیوی (باعتبار ابدان دُنیا) ہی ہے جو برزخ میں قائم ہے۔[1]

نحمدہ ونصلی، احقر اور احقر کے مشائخ کا مسلک وہی ہے جو "المہند" وغیرہ میں بالتفصیل مرقوم ہے۔ یعنی برزخ میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام انبیاء علیہم السلام بجسدِ عنصری زندہ ہیں۔ جو حضرات اس کے خلاف ہیں وہ اس مسئلہ میں دیوبند کے مسلک سے ہٹے ہوئے ہیں۔

محمد طیب مدیر دارالعلوم دیوبند حال وارد ملتان[2]

پھر حضرت قاری صاحب ارشاد فرماتے ہیں۔

"آب حیات" وہ کتاب ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ نے فرمایا کہ میں نے یہ کتاب اُستاد رحمۃ اللہ علیہ سے درساً درساً پڑھی۔ تب مصنف کے مدارک پر مطلع ہوا۔ میں نے مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ سے اس واقعہ کا حوالہ دے کر عرض کیا تھا کہ مجھے یہ کتاب آپ پڑھا دیں، تو انہوں نے باایں ذہن و ذکا فرمایا کہ میرے بس

---

[1] الصدیق، ملتان شمارہ ۳ ماہ ربیع الاول ۱۳۷۷ھ یہ اصل تحریر مدرسہ عربی خیر المدارس ملتان میں موجود ہے۔

کی بات نہیں، تو ایسی کتاب ہم جیسے نالائقوں کے بس کی بات کیا ہو سکتی ہے؟

...... حاصل یہ ہوا کہ سرورِ عالمؐ ہر آن مشاہدۂ جمالِ الٰہی میں بھی مستغرق رہتے ہیں اور امت کی طرف بھی آپؐ کی توجہ ہر لمحہ مبذول رہتی ہے، نہ یہ استغراق توجہ میں مانع ہوتا ہے، نہ توجہ استغراق میں، یہی وجہ ہے کہ جب امت کا ایک عارفِ کامل حالتِ کشف میں اپنے محبوب کے جمالِ جہاں آرا کے دیدار سے مشرف ہوا، تو اس نے سرورِ عالمؐ کو اس حال میں پایا:-

ورأيته مستقرًا على حالة واحدة .... متوجهًا الى الخلق لابسًا لباس العظمة ..... فاذا توجه اليه انسان بجهد همته ولا اريد الانسان العالى الهمة فقط بل كل ذى كبد يشتاق الى شئ ويتوجه اليه بقصده وشوقه فانه يتدلى اليه ..... ورأيته صلى الله عليه وسلم ينشرح انشراحًا عظيمًا لمن صلى الله عليه وسلم ومدحه۔

ترجمہ: میں نے سرورِ عالمؐ کو اس حال میں دیکھا کہ آپؐ بندگانِ الٰہی کی طرف متوجہ تھے پوری توجہ کے ساتھ عظمت و بڑائی کا لباس آپؐ کے زیبِ تن تھا جب کوئی خدا کا بندہ ذوق و شوق کے ساتھ آپ کی طرف متوجہ ہوا تو میں نے دیکھا کہ سرورِ عالمؐ اس سے قریب ہو گئے اور میں نے دیکھا کہ جس شخص نے حضورؐ پر درود و سلام بھیجا اور آپ کی تعریف کی، تو آپ اس سے بہت زیادہ خوش ہوئے۔

یہ کشف ہے اُن کا جو عارفوں کے امام اور محدثوں کے سردار تھے، یعنی حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ جسے انہوں نے اپنی مشہور کتاب

عہ جو شبہات منکرینِ حیات کی طرف سے حدیث "مامن احد يسلم على الا رد الله على روحى" پر وارد کئے جاتے ہیں، ان کا ازالہ فرمانے اور مضمون حدیث پر نہایت نفیس بحث کرنے کے بعد حضرت قاری صاحب دامت برکاتہم نے یہ بیان فرمایا ہے۔

"فیوض الحرمین" میں ذکر کیا ہے۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم۔

(مضمون حضرت العلامہ القاری محمد طیب صاحب ماہنامہ دارالعلوم دیوبند)

ربیع الاول ۷۳ھ ــــــ سنہ ۱۹۵۳ء

۲ ــــ زبدۃ المحدثین شمس العارفین شیخ المشائخ حضرت مولانا محمد زکریا صاحب

ــــ دامت برکاتہم شیخ الحدیث مدرسہ عالیہ مظاہر العلوم سہارنپور ــــ

مکرم ومحترم مدّ فیوضکم　　　　بعد سلام مسنون

نہایت طویل گرامی نامہ پہنچا۔ آپ نے ایسے شخص کو مخاطب بنایا، جو نہ تو مفتی نہ مولوی۔ اس ناکارہ کی حقیقت ایک نقل نویس کی ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں، جو اکابر و اسلاف کی کتاب میں ملتا ہے، اسی کو ادھر ادھر نقل کرتا رہتا ہوں اسی کا نام شرح مؤطا ہے، یہی تبلیغی رسائل کی حقیقت ہے۔ آپ نے تحریر فرمایا کہ دونوں طرف کے کچھ لوگ تیری تحریر کو قبول کرنے کو آمادہ ہیں، موجب تعجب ہے جن حضرات کو اس ناکارہ کے جملہ اکابر حضرت گنگوہی قدس سرہ سے لے کر حضرت مدنی نور اللہ مرقدہ کی تحریرات قابل قبول نہیں ہیں، وہ اس ناکارہ کی تحریر کو کیا قبول کرسکتے ہیں۔ بہرحال یہ ناکارہ ان اکابر کا بالکل متبع ہے۔ ان کے اس صاف ارشادات اور تحریرات کے بعد جس پر حضرت سہارنپوری، حضرت شیخ الہند، حضرت رائپوری حضرت تھانوی قدس اللہ اسرارہم نے بلا کسی اجمال کے "ھذا معتقدنا و معتقد مشائخنا" لکھا ہے۔ کیا کوئی گنجائش ہے کہ اس کے خلاف کچھ کہا جاسکے

ع فیوض الحرمین ص۲۳ پھر یہ بھی فرماتے ہیں۔ ما توجہت قبل قبرہ علیہ الصلوٰۃ والسلام الاورایتہ حاضراً ظاہراً اما بان انفتح بصورۃ روحی فرأیتہ علی ماھو واما ان تأثرت نفسی منہ تأثراً۔
(فیوض الحرمین ص۲۳ مطبوعہ دیوبند)

جو نصوص آپ نے ممات کے متعلق لکھی ہیں۔ ان سے کوئی پڑھا لکھا انکار کر سکتا ہے؟
بالخصوص جن حضرات کی راتیں ہمیشہ تلاوتِ قرآن اور دن ساری عمر تدریسِ بخاری
شریف وغیرہ کتب حدیث میں گذریں، ان کو کبھی بھی پتہ نہ چلا کہ قرآن پاک کی آیات
میں کیا وارد ہوا اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے خطبہ میں کیا فرمایا۔ ان میں سے
حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کے علاوہ کون سا ایسا ہے جس کی عمر کا معتدبہ حصہ
تدریسِ حدیث میں نہیں گذرا اور حضرت اقدس رائے پوری قدس سرہٗ کے علوم
و معارف کر سننے والے ابھی تک دنیا میں بکثرت موجود ہیں۔ مگر ان میں سے
کسی کو بھی نہ تو قرآن پاک کی کسی آیت کا پتہ چلا، نہ حدیثِ پاک میں کوئی ممات
والی روایت ان کی نظر سے گذری۔ یہ ناکارہ اپنے ان اکابر کے متعلق وہی عقیدہ
رکھتا ہے جو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے اکابر یعنی صحابہ کرامؓ کے متعلق
ارشاد فرمایا کہ "فانھم علیٰ علم وقفوا وببصرٍ نافذ کفوا وھم علیٰ کشف
الامور کانوا اقویٰ[1] وبفضل ما کانوا فیہ اولیٰ فما دونھم من مقصر
وما فوقھم من محسر وقد قصر قوم دونھم فجفوا وطمح عنھم اقوام
فغلوا وانھم بین ذٰلک لعلیٰ ھدًی مستقیم" حقیقت یہ ہے کہ اس دور
فساد میں آدمی اس وقت تک محقق نہیں سمجھا جاتا، جب تک کہ سلف صالحین کے
خلاف کوئی نئی ایجاد نہ کرے۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی پیش گوئی "ان من
ورائکم فتنا یکثر فیھا المال ویفتح فیھا القران حتّٰی یاخذہ المؤمن و
المنافق والرجل والمرأۃ والکبیر والصغیر والعبد والحر فیوشک قائل
ان یقول ما للناس لا یتبعونی وقد قرأت القران ما ھم بمتبعی حتّٰی ابتدع
لھم غیرہ فایاکم وما ابتدع الخ لہٰذا یہ ناکارہ تو حذو النعل بالنعل ان حضرات

---

[1] ابوداؤد جلد ۲ صفحہ ۲۷۱ کتاب السنۃ

کا جامد متبع ہے اور اس ناکارہ کی تحریر میں کوئی لفظ بھی ان اکابر کی تحقیق کے خلاف ہے، تو وہ لغو ہے، ناقابل التفات ہے، مردود ہے۔ اس سب کے بعد گرامی نامہ کے مستفسرات کے متعلق اپنا خیال یہ ہے کہ جیسا حیات کے درجات متفاوت ہیں، جس کا اعتراف یہ حضرات خود بھی کرتے ہیں، جیساکہ آپ نے لکھا۔ اسی طرح ممات کے بھی درجات مختلف ہیں۔ نوم پر بھی احادیث صحیحہ صریحہ میں موت کا اطلاق کیا گیا ہے اور جاگنے کی دعاؤں میں کثرت سے "الحمد للہ الذی احیانا بعد ما اماتنا" وارد ہے، قرآن پاک میں "اللہ یتوفی الانفس حین موتہا" الآیۃ میں نوم پر وفات کا اطلاق کیا گیا۔ "لاتقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ" میں موت کی نفی کی گئی وغیرہ وغیرہ۔ لہٰذا جن نصوص میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر موت کا اطلاق کیا گیا۔ ان میں سے کوئی سی بھی حضرت نانوتوی نور اللہ مرقدہٗ یا اکابر دیوبند یا مہنّد کے خلاف نہیں ہے۔ حضرت صدیق اکبرؓ کے خطبہ میں بھی وہی موت مراد ہے، جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شایانِ شان ہے۔ خود حضرت عمرؓ کے تفصیلی اقوال جو اس سلسلہ میں نقل کیے گئے ہیں، اس کی واضح تائید کرتے ہیں، اس لیے کہ حضرت عمرؓ کسی نوعِ ممات کے بھی قائل نہ تھے۔ چنانچہ ان کا ارشاد "ان رجالا من المنافقین یزعمون ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم توفی واللہ مامات ولکنّ ذھب الیٰ ربہ کما ذھب موسیٰ ابن عمران واللہ لیرجعنّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کما رجع موسیٰ فلیقطعن ایدی رجال وارجلھم زعموا ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مات" بیہقی کی روایت سے خود حضرت عمرؓ کا یہ مقولہ نقل کیا گیا کہ وہ آیت وکذلک جعلنٰکم امۃ وسطا الآیۃ کے متعلق فرماتے ہیں "واللہ ان کنت اظن انہ صلی اللہ علیہ وسلم سیبقٰی فی امتہ حتّٰی یشھد علیہ باٰخر اعمالھا وانہ

ھوالذے حملنی علی ان قلت ما قلت"، لہذا شیخین کے مکالمہ کو موجودہ مسئلہ متنازعہ سے کوئی تعلق نہیں۔ اس لیے کہ حضرت عمرؓ موت کا بالکلیہ انکار فرماتے تھے اور سمجھتے تھے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ابھی واپس تشریف لے آئیں گے۔ اس لحاظ سے حضرت صدیق اکبرؓ کا رد بالکل صحیح اور واضح ہے کہ بنوع من الموت سے کسی کو بھی انکار نہیں۔ انکار صرف موت بجمیع الوجوہ سے ہے کہ نوع خاص من الحیات فی الجسد الاطہر باقی ہے۔ تعجب ہے کہ یہ حضرات اجسادِ انبیاء کے بقاء کے قائل ہیں، جیساکہ آپ نے لکھا ہے۔ لیکن ان اجساد میں اگر کسی نوع کی بھی حیات نہ مانی جائے، تو یہ حدیثِ پاک ہی مہمل بن جائے گی۔ اس لیے کہ حضورؐ کا پاک ارشاد اس حدیثِ پاک میں یہ ہے "اکثروا علیّ من الصلوٰۃ فیہ فان صلوٰتکم معروضۃ علیّ"، اس پر صحابہ کرامؓ کو اشکال ہوتا ہے۔ قالوا یا رسول اللہ کیف تعرض وقد بلیت"، اس پر حضورؐ جواب فرماتے ہیں ان اللہ حرم الخ آپ ہی غور کریں کہ اگر ان پاک اجساد میں کوئی نوع حیوٰۃ کی نہیں، تو حضورؐ کا یہ پاک ارشاد صحابہؓ کے اشکال "کیف تعرض" کا جواب کیسے بن گیا۔ روایت بھی صحیح ابن حبان کی ہے اور حاکم نے اس کو علیٰ شرط البخاری بتایا ہے اور علامہ ذہبیؒ نے اقرار کیا۔ ایک چیز یہ بھی قابل غور ہے کہ باجماعِ امت قبرِ اطہر کا وہ حصہ جو جسدِ اطہر سے متصل ہے، کعبہ شریف بلکہ عرش معلّی سے افضل ہے۔ کیا یہ فضیلت صرف اس جسدِ اطہر کی ہے، جس کے ساتھ کبھی روح کا تعلق رہ چکا ہے، اب نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر موئے مبارک جو کبھی جسدِ اطہر پہ پڑ چکا ہے، اس کا بھی یہی حکم ہوتا وغیرہ وغیرہ۔ بہرحال یہ ناکارہ تو اکابرِ دیوبند قدس اللہ اسرارہم کا ہمہ تن متّبع ہے اور ان سب حضرات کا متفقہ فیصلہ "المہند" میں بلا کسی اجمال کے تحریر ہے۔ اس سے آپ کے جملہ سوالات کا جواب واضح

ہوگیا مختصر نمبروار بھی عرض ہے لیکن آپ نے صے پر سوالات کر کے گرامی نامہ ختم کر کے صے پر پھر وہی سوالات عبارت کے تغیر کے ساتھ درج کر دیئے، یہ سمجھ میں نہیں آیا۔ بہرحال ہر دو کے جواب حسبِ ذیل ہیں:۔

صفحہ نمبر ۵:

① ــــــ اجسادِ انبیاء کرام علیہم السلام میں ایک خاص نوع کی حیات ہے۔

② ــــــ یہ ظاہر ہے کہ حیوٰۃ تو روح ہی کے تعلق سے ہوتی ہے، بغیر تعلقِ روح کے حیاۃ کا کیا مطلب؟

③ ــــــ اگر ایسی حیات ہوتی جو ہر ذرہ کائنات میں ہوتی ہے، تو پھر انبیاء کی کیا تخصیص رہی؟ علامہ سخاویؒ فرماتے ہیں[عہ] ”نحن نؤمن ونصدق بانہ صلی اللہ علیہ وسلم حی یرزق فی قبرہ“

④ ــــــ ایک دیوبندی سے یہ سوال کہ علماء دیوبند کا یہ قول قابلِ اقتداء ہے یا نہیں، بے محل ہے، علامہ سخاویؒ تو امام بیہقیؒ کا یہ قول نقل کرتے ہیں[عہ] قال البیہقی وفی حدیث سعید ابن المسیب عن ابی ہریرۃؓ انہ لقیھم بیت المقدس وفی حدیث ابی ذرؓ ومالک بن صعصعۃ فی قصۃ المعراج انہ لقیھم فی جماعۃ من الانبیاء بالسموات فکلمھم وکلموہ وکل ذلک صحیح لا یخالف بعضھم بعضاً فقد یری موسیٰ علیہ السلام قائماً یصلی فی قبرہ ثم یسری بموسیٰ وغیرہ الی بیت المقدس کما اسریٰ بنبینا فیراھم فیہ ثم یعرج بھم الی السموٰت کما عرج بنبینا فیراھم فیھا کما اخبر قال وحلولھم فی اوقات مختلفۃ لمواضع مختلفات جائز فی العقل کما ورد بہ خبر الصادق وفی کل ذلک دلالۃ علی حیوتھم، یہ تو بہت ہی صاف ہے لیکن اگر یہ حضرات

عہ القول البدیع صـ۱۲۵ عہ ایضاً صـ۱۲۶

اپنی قبروں میں روح مع الجسد ہوں اور دوسری مواقع میں روح متمثل ہو جیسا کہ بعض نے فرمایا تو اس میں بھی کوئی مانع نہیں۔

⑤ — جو شخص حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر اطہر کے پاس کھڑا ہو کر درود پڑھے، حضور اقدسؐ اس کو سنتے ہیں۔ "من صلی علی عند قبری سمعته"، نص صریح ہے۔ علامہ سخاویؒ نے حافظ ابن حجرؒ سے نقل کیا ہے "سند جید" حضرت عمر بن عبد العزیزؒ مستقل قاصد مدینہ پاک بھیجا کرتے تھے۔ تاکہ قبر اطہر پر سلام پہنچائے۔ اگر کوئی فرق نہیں تھا، تو ان کا یہ فعل عبث تھا، فقط۔

اس کے بعد صفحہ نمبر ۶ پر پھر مکرر سوالات درج ہیں نہ معلوم کیوں؟

① — یہ اوپر بیان ہو چکا کہ ان سب حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کے اجساد میں ایک خاص نوع حیوۃ ہے۔

② — یہ سوال بھی مکرر ہے اور جواب بھی وہی ہے کہ ان حضرات کے نزدیک اجسادِ انبیاء میں ایک خاص نوع حیوۃ کی ہے۔

③ — مجھے حضرت نانوتوی اور حضرت گنگوہی قدس سرہما کے مسلک میں کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا۔ مہند میں حضرت سہارنپوریؒ، حضرت شیخ الہندؒ، حضرت رائپوریؒ وغیرہ کا یہ ارشاد "ھذا معتقدنا ومعتقد مشائخنا"، واضح ہے۔ اس لیے کہ ان تینوں حضرات کے شیخ حضرت گنگوہی قدس سرہ ہیں۔ صرف اتنا ہی نہیں، بلکہ حضرت مفتی عزیز الرحمن صاحب مفتیٔ اعظم نور اللہ مرقدہٗ نے حضرت گنگوہی رح قدس سرہٗ سے "انک میت"، الآیہ کے اشکال کا جو جواب نقل کیا ہے، وہ تو حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کی تعبیر سے بھی اونچا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ موت سب کو شامل ہے، مگر انبیاء کرامؑ کی ارواح مشاہدۂ جمال وجلالِ حق تعالیٰ شانہٗ وتقابلِ

ے دیکھو شفاء السقام ص۱۴۲

آفتاب وجود باری تعالیٰ سے اس درجہ پر پہنچ جاتی ہیں کہ اجزائے بدن پر اُن کا یہ اثر ہوتا ہے کہ تمام بدن حکمِ روح پیدا کر لیتا ہے اور تمام جسم ان کا عین ادراک اور عینِ حیات ہو جاتا ہے اور یہ حیات دوسری قسم کی ہوتی ہے اور اس تحقیق سے نکتہ ان اللہ حرم علی الارض ان تاکل اجساد الانبیاء بھی ظاہر ہو جاتا ہے۔ آپ بھی غور کیجئے کہ ہم ناواقف ان واصلین کے علوم تک کہاں پہنچ سکتے ہیں۔

(۴) معلوم نہیں ایک ہی سوال کو بار بار مختلف عنوانات سے لکھنے میں کیا مقصد ہے۔ یقیناً مہند میں جو ہے صحیح ہے۔ شہاب ثاقب اس وقت میرے سامنے نہیں ہے۔

(۵) حضرت رائپوری دام مجدہم بار بار زبانی اور تحریری ارشاد فرما چکے ہیں کہ میرا مسلک وہی ہے جو اکابر دیوبند کا ہے۔ اس وقت بھی یہی فرمایا اور یہ بھی فرمایا کہ یہ لوگ بے کار وقت ضائع کر رہے ہیں۔ میں ۸۰ سال سے متجاوز ہو کر من یرد الی ارذل العمر لکیلا یعلم من بعد علم شیئاً میں داخل ہو گیا ہوں۔ اور بھی کسرِ نفسی کے الفاظ ارشاد فرمائے، جن کا نقل دشوار ہے کہ میں ان حضرات اکابرؒ کے مقابلے میں کیا چیز ہوں۔

نوٹ: علامہ ذہبیؒ کا قول جرح و تعدیل میں معتبر ہے۔ لیکن ہر شخص کے قول کو دیگر اہلِ فن کے اقوال کے لحاظ سے دیکھا جائے گا۔ اگر علامہ ذہبیؒ کی جرح و تعدیل دوسرے اکابر کے خلاف ہوگی، تو رد کیا جائے گا، ورنہ یقیناً معتبر ہے۔ فقط

آخر میں یہ ضرور عرض کروں گا کہ یہ دقیق مسائل عوام کی عقول سے اونچے ہیں۔ اردو رسائل و اشتہارات میں لانا، ان میں بحثیں کرنا نہایت ناموزوں ہے۔ لا یدرك الصبی مدارك العالم۔ ہر دو فریق سے درخواست ہے کہ اس بحث کا سلسلہ جلد از جلد بند کر دیا جائے۔ فقط والسلام

زکریا بقلم خود مظاہر العلوم سہارنپور ۲۵ ج ۲ ۸۷ھ

③ — فخر المحدثین و الفقہاء استاذ الاساتذہ حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی

دامت برکاتہم شیخ الحدیث دار العلوم الاسلامیہ ٹنڈو الہ یار سندھ

من ینکر حیاته صلی الله علیه وسلم فی قبره .... کان فؤاده فارغاً من حبه و عقله خالیاً من لبه۔[1]

ترجمہ۔ جو شخص حضور اکرمؐ کے اپنی قبر شریف میں زندہ ہونے کا انکار کرتا ہے اس کا دل حضورؐ کی محبت سے فارغ ہے اور اس کی عقل بصیرت سے خالی ہے۔

④ — زبدۃ الفقہاء بدر الادباء حضرت مولانا الحاج محمد شفیع صاحب

دامت برکاتہم۔ مفتی اعظم دار العلوم دیوبند

بسم اللہ الرحمن الرحیم

رسالہ "رحمتِ کائنات" مصنفہ مولانا زاہد الحسینی تقریباً پورا مطالعہ کیا۔ حیاتِ انبیاء علیہم السلام کے مسئلہ پر نہایت نافع اور مفید تحقیقات جمہور اہلسنت والجماعۃ کے مطابق جمع کر دی ہیں۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائیں۔

مسئلہ کے متعلق تحقیقات کے ضمن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تاقیامت باقی رہنے والے فیوض و برکات اور آثارِ حیات کا ذکر آیا ہے۔ وہ خود ایک نہایت مفید مضمون ہے جس سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و محبت مومن کے قلب میں بڑھتی ہے، جو سرمایہ سعادت دنیا و آخرت ہے (رزقنا اللہ تعالیٰ) مجھے بھی بحمد اللہ اس سے بڑا نفع پہنچا۔ دل سے دعا نکلی جمہور علماء امت کا عقیدہ اس مسئلہ میں یہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ

---

[1] اعلاء السنن جلد ۱۰ صـ ۳۳۹

وسلم اور تمام انبیاء علیہم السلام برزخ میں جسدِ عنصری کے ساتھ زندہ ہیں ان کی حیاتِ برزخی صرف روحانی نہیں بلکہ جسمانی حیات ہے جو حیاتِ دنیوی کے بالکل مماثل ہے۔ بجز اس کے کہ وہ احکام کے مکلف نہیں ہیں بلکہ کچھ آثار بعض دنیاوی احکام میں بھی باقی ہیں۔ مثلاً میراث کا تقسیم نہ ہونا۔ ازواجِ مطہرات سے بعد وفات کسی کا نکاح جائز نہ ہونا۔ متقدمین میں امام بیہقیؒ کا اور متاخرین میں شیخ جلال الدین سیوطیؒ کا مستقل رسالہ اس مسئلہ کی توضیح کے لیے کافی ہے جن میں روایاتِ حدیث کافی تفصیل کے ساتھ درج ہیں۔ بیہقیؒ نے فرمایا ہے۔ "ولحیاۃ الانبیاء بعد موتھم شواھد من الاحادیث الصحیحۃ" اس میں تصریح ہے کہ موت کے بعد ان کی حیات احادیث صحیح سے ثابت ہے اور یہ ظاہر ہے کہ موت صرف جسم پر آتی ہے، روح پر نہیں۔ اس لیے حیات بعد الموت کو صرف روحانی کہنے کے کوئی معنی نہیں اور "شفاء السقام" میں امام حدیث وفقہ تقی الدین سبکیؒ نے اپنی کتاب کا نواں باب اسی مسئلہ کی تحقیق کے لیے لکھا ہے۔ اس میں انبیاء علیہم السلام کے لیے بعد الوفات کے حیاتِ جسمانی حقیقی ثابت کرنے کے لیے فرمایا ہے:۔

وقد ذکرنا من جماعۃ من العلماء وشھد لہ صلوٰۃ موسیٰ علیہ السلام فی قبرہ فان الصلوٰۃ یستدعی جسداً معھا وکذلک الصفات المذکورۃ فی الانبیاء لیلۃ الاسراء کلھا صفات الاجسام ولا یلزم من کونھا حیاۃ حقیقۃً ان یکون الابدان معھا کما کانت فی الدنیا من الاحتیاج الی الطعام والشراب والامتناع عن النفوذ فی الحجاب الکثیف وغیر ذلک من الصفات الاجسام التی نشاھدھا بل قد یکون لھا حکم اخر فلیس فی العقل ما یمنع من اثبات الحیاۃ الحقیقیۃ بھم۔ (شفاء الاسقام من السبکی

اس کے بعد شہداء کی حیات برزخی پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

فلم یبق الا انھا حیاۃ حقیقیۃ الاٰن وان الشہدآء احیاء حقیقۃ وھو قول جمھور العلماء لکن ھل ذلک للروح فقط او للجسد معھا فیہ قولان۔

اس کے بعد اس قولِ ثانی کو ترجیح دی کہ یہ حیاتِ حقیقی صرف روح کے لیے نہیں بلکہ جسد کے لیے بھی ثابت ہے اور ظاہر ہے کہ جب عام شہداء امت کے لیے برزخ میں حیاتِ حقیقی جسمانی ثابت ہوئی تو انبیاء کی حیات کچھ ان سے اعلیٰ واقوے ہی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی حیات بعد الموت حقیقی جسمانی مثلِ حیاتِ دنیوی کے ہے جمہور علماء امت کا یہی عقیدہ ہے۔ اور یہی عقیدہ میرا اور بزرگانِ دیوبند کا ہے۔

(۳، ۴) مسئلہ مذکورۃ الصدر کی تحقیق میں یہ بھی آچکا ہے کہ صرف حیاتِ روحانی کا قول جمہور علماءِ امت کے خلاف ہے اور یہ ظاہر ہے کہ دیوبندیت کوئی مستقل مذہب نہیں، اتباعِ سلف وجمہور اہلِ سنت والجماعت کے خلاف ہے وہ دیوبند کے بھی ضرور خلاف ہے۔

بندہ محمد شفیع عفی عنہ دار العلوم کراچی ۱۲

۱۳ ربیع الثانی ۱۳۷۸ھ

(۵) — محدثِ کبیر فقیہ شہیر جامع معقول ومنقول حضرت مولانا مفتی مہدی حسن صاحب

—— دامت برکاتہم مفتی اعظم دار العلوم دیوبند ——

الجواب:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مزارِ مبارک میں بجسدہٖ موجود ہیں اور حیات ہیں

آپ کے مزارِ مبارک کے پاس کھڑے ہو کر جو سلام کرتا اور درود پڑھتا ہے آپ خود سنتے اور سلام کا جواب دیتے ہیں، ہمارے کان نہیں کہ ہم سنیں۔ آپ اپنے مزار میں حیات ہیں مزارِ مبارک کے ساتھ آپ کا خصوصی تعلق بجسدہٖ و روحہٖ ہے۔

جو اس کے خلاف کہتا ہے غلط کہتا ہے، وہ بدعتی ہے، خراب عقیدے والا ہے اس کے پیچھے نماز مکروہ ہے۔ یہ عقیدہ صحیح نہیں ہے۔ حدیث میں ہے:

ان اللّٰہ حرم علی الارض ان تأکل اجساد الانبیاء۔ (الحدیث) وعن ابی ھریرۃ رضی اللّٰہ عنہ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم من صلی علیّ من بعید اعلمتہ رواہ ابو الشیخ وسندہ جیّدا۔ (القول البدیع) عن انس رضی اللّٰہ عنہ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم الانبیاء صلوٰۃ اللّٰہ علیھم احیاء فی قبورھم یصلّون رواہ ابن عدی والبیہقی وغیرھما۔[1]

تین حدیثیں نقل کر دی ہیں۔ اس باب میں بکثرت احادیث وارد ہیں، جن کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اور جو انکار کرتا ہے، بدعتی اور خارج اہلسنت والجماعت ہے۔ غرض پڑھنے والے کو ثواب بھی پہنچتا ہے اور مزارِ مبارک کے قریب پڑھنے سے آپ سنتے بھی ہیں اور اپنے مزارِ مبارک میں بجسدہٖ موجود ہیں اور حیات ہیں۔

کتبہٗ: السید مہدی حسن مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۳ ۵/۶ ھ

۵۰۳ الف: الجواب:۔

اہل سنت والجماعت متفق ہیں کہ انبیاء اپنی قبور میں حیات ہیں۔ اُن کی ارواح کو ان کے اجسامِ مطہرہ سے خصوصی تعلق ہے۔ اس خصوصیت میں مخلوق میں سے کوئی

---

[1] شفاء الاسقام صـ۱۳۴

ان کا شریک وسہیم نہیں ہے۔ اُن کی قبور پر سلام پڑھا جائے تو وہ خود سنتے ہیں اور جواب دیتے ہیں:-

قال الشیخ الکبیر ابو عبد اللہ القرشی سافرت الی الشام فلما وصلت الیٰ قریب ضریح الخلیل علیہ وعلی نبینا افضل الصلوٰۃ والسلام تلقانی فقلت یا رسول اجعلنی ضیافتی عندک الدعاء لاھل مصر فدعا لھم ففرج اللہ عنھم فقال الیافعی نقولہ تلقانی الخلیل قولہ حق لاینکرہ الاجاھل بمعرفۃ مایرد علیھم من الاحوال التی یشاھدون فیھا ملکوت السموات والارض وینظرون الانبیاء احیاء ردت الیھم ارواحھم بعد ما قبضوا واذن لھم فی الخروج من قبورھم والتصرف فی الملکوت العلوی والسفلی[1] وتمثل صورتہ الکریمۃ البھیۃ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کانہ نائم فی لحدہ عالم بہ یسمع کلامہ قال صلی اللہ علیہ وسلم من صلی علی عند قبری سمعتہ[2]

ان عبارتوں سے ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فداہ امی وابی اپنے مزار مبارک میں اپنے جسدِ اطہر کے ساتھ حیات ہیں، جو اہل وسنت والجماعت کا عقیدہ ہے۔ زائر کے صلوٰۃ وسلام سنتے ہیں اور جواب دیتے ہیں۔ اس لیے زید کا خیال صحیح نہیں ہے۔ بکہ کا قول اور اس کا عقیدہ صحیح اور اہلسنت والجماعت کے مطابق ہے اور کتابوں میں یہ تصریح موجود ہے۔ مواہب لدنیہ، شرح زرقانی انباء الاذکیاء، الخصائص الکبریٰ، شرح اللباب، شفاء السقام وغیرہ ذلک من الکتب۔

بے شک اس عقیدے کے سلسلے میں زید اہل سنت کے عقیدے سے خارج

---

[1] الفتاوی الحدیثیہ [2] الاختیار شرح المختار جلد ا ص ۱۷۴

ہے کہ یہ اس کا عقیدہ اہل سنت والجماعت کے خلاف ہے۔

سید مہدی حسن مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۵ ۵/۸ ۷ھ

(۲) — رأس الاتقیاء استاذ الاساتذہ شیخ الحدیث حضرۃ مولانا نصیر الدین غورغشتی

دامت برکاتہم، خلیفہ اعظم حضرت مولانا الشیخ حسین علی واں بھچروی؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمام اولادِ آدم کو موت کا پیالہ پینا ہے۔ کل نفس ذائقة الموت اور انك میت وانهم میتون۔ کل من علیها فان اعلانِ خداوندی سے تمام بنی آدم خواہ عام ہوں یا پیغمبر ہوں، ضرور ایک وقت مرتے ہیں۔ اس کے ساتھ موت کے بعد بھی انسان میں ایک نوعِ حیات موجود رہتی ہے، جس سے وہ ثواب اور عذاب سمجھتا ہے۔ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ میت کو چارپائی پر قبرستان لے جاتے وقت اگر مومن ہے تو "قدمونی۔ قدمونی" مجھے جلد پہنچادو، کہتا ہے اور اگر نافرمان اور کافر ہے تو کہتا ہے "کہ اے مجھے ہلاکت ہو، مجھے کہاں لے جا رہے ہو" قبر میں سوال منکر نکیر میت سے دفن کے بعد لوگوں کے واپسی کے وقت جوتوں کی آواز سننا۔ قبر میں عذاب اور ثواب۔ یہ دلیل ہے کہ موت کے بعد بھی انسان میں ایک قسم کی حیات موجود رہتی ہے۔ شہداء کے حق میں قرآن کا اعلان "احیاء"، "حیاتِ میت" کی دلیل ہے۔ اسی حقیقت کے ساتھ سردارِ انبیاء خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم قبر شریف میں زندہ ہیں اور جو حیات ان کی شان کے مناسب ہے، اللہ نے قبر میں وہ حیات ان کو دی ہے، جسدِ اطہر قبر شریف میں محفوظ ہے۔ مٹی کوئی اثر جسدِ اطہر پہ نہیں کر سکتی۔ اگر قبر کے پاس کوئی مسلمان

درود شریف جہراً سلام ڈالے، تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود سنتے ہیں اور سلام کا جواب دیتے ہیں اور اگر کوئی دور سے درود شریف پڑھے، تو فرشتے رسول اکرمؐ کے پاس پہنچاتے ہیں۔

میں اس مسئلہ کو حق اور صحیح سمجھتا ہوں۔ احادیث شریف، فقہائے عظام، سلف صالحین سے بھی اس مسئلہ کی حقانیت اور صحت ثابت ہے۔

میں نے مولانا حسین علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اس مسئلے کا کبھی اختلاف نہیں سنا اور نہ ہی میں نے کبھی ان سے یہ پوچھا تھا، یہ تو ایک اہل سنت والجماعت کا متفقہ حق مسئلہ ہے۔

مسکین نصیرالدین غور غشتوی[1]

(۷) بقیۃ السلف، حجۃ الخلف، مجاہد کبیر شیخ التفسیر حضرۃ مولانا احمد علی صاحب لاہوری دامت برکاتہم

انبیاء علیہم السلام کی حیات فی البرزخ کے بارے میں میرا عقیدہ وہی ہے جو اکابر دیوبند کا ہے کہ انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی قبروں میں اسی جسدِ عنصری سے زندہ ہیں جو اس دنیا میں تھا۔ وہ حیات باعتبارِ ابدانِ دنیوی بھی ہے اور باعتبار عالم برزخ برزخی بھی ہے۔

انبیاء کرام کا ابدانِ دنیوی کے ساتھ اپنی اپنی قبروں میں زندہ ہونا اہل سنّت و الجماعت کا متفقہ اور اجماعی عقیدہ ہے۔ ہمارے اکابر دیوبند نے اس پر مفصل اور مدلل ارشادات ثبت فرمائے ہیں۔

جہاں تک مجھے علم ہے۔ یہ مسئلہ اکابر دیوبند میں کبھی مختلف فیہ نہیں رہا میرے خیال میں ہر صاحب بصیرت اس عقیدہ حیات النبیؐ کا منکر نہیں ہو سکتا جن کی

---

[1] ﷫

باطن کی آنکھیں کھلی ہیں۔ اُن کے نزدیک تو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی روضہ اطہر کی حیات بدیہیات میں ہے۔

احقر الانام احمد علی عفی عنہ

(۸) — رئیس الاتقیاء اسوۃ الصلحاء شیخ المشائخ حضرت مولانا عبد القادر رائپوری دامت برکاتہم

میرا مسلک وہی ہے، جو اکابر دیوبند کا ہے۔ یہ لوگ بے کار وقت ضائع کر رہے ہیں۔

(ارشاد حضرت رائے پوری بہ تحریر حضرت شیخ الحدیث کاندھلوی)

(۹) — دار الافتاء مدرسہ عربیہ امینیہ مفتی کفایت اللہ صاحبؒ قائم شدہ ۱۹۱۵ء

بقلم شیخ الحدیث والفقہ علامہ محمد عبد الغنی صاحب دامت برکاتہم

الجواب:

صریح صحیح اور قوی متفق علیہ حدیث میں ہے۔ الانبیاء احیاء فی قبورھم۔ حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ نے جذب القلوب اور شرح مشکوٰۃ میں لکھا ہے کہ جمہور علماء اہل سنت نے تصریح کی ہے کہ انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی قبروں میں جو لبعہائے نور اور دریچہائے جنت ہیں۔ حقیقتاً زندہ ہیں۔ ان کو وہاں سے کہیں دوسری جگہ نقل نہیں کیا جاتا۔ الا فی معراج النبی صلی اللہ علیہ وسلم شرح مشکوٰۃ میں لکھتے ہیں "حیاتِ انبیاء متفق علیہ است ہیچ کس را درو خلافے نیست۔ حیاتِ جسمانی دنیاوی حقیقی نہ حیاتِ معنوی روحانی۔ چنانکہ شہداء راست" اور حضرت محدث گنگوہیؒ نے بھی اپنے فتادے میں کئی جگہ لکھا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے سماع میں کسی کو خلاف نہیں اور مزارِ مبارک کے پاس استشفاع بھی

کر سکتے ہیں. کیونکہ بالاتفاق سنتے ہیں. اس استشفاع اور طلبِ دعا جناب باری تعالیٰ میں کسی کو اختلاف نہیں.

الحاصل حیاتِ انبیاء فی القبور کا عقیدہ ایک اجماعی عقیدہ ہے. اس کا انکار اجماع کا انکار ہے اور سخت بدعتِ اعتقادی کا ارتکاب ہے. بہرحال اگر کسی نے لاعلمی کی وجہ سے انکار کیا، تو جہالت محضہ واجب الاجتناب ہے اور اگر احادیث کثیرہ اور اجماعِ امت کو رد کرتے ہوئے انکار کیا تو اس بدعتی عقیدہ ضلالہ سے توبہ واجب ہے. فقط

محمد عبدالغنی غفرلہ مدرسہ امینیہ دہلی ۲۷ر جون ۱۹۵۹ء

حیات النبیؐ کے قائلین پر یہ الزام کہ وہ آنحضرتؐ پر ورودِ موت کے قائل نہیں. اس کے ازالہ اور حیات بعد الوفات کے اثبات و استمرار پر یہ دس وال بیان لیجئے :-

⑩ — سلطان المناظرین عمدۃ المحققین بقیۃ السلف حجۃ الخلف

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحب دامت برکاتہم

پٹیؔ ضلع لاہور سے ایک صاحب لکھتے ہیں :-

کسی کا یہ خیال کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک لحہ کے لیے بھی روحِ مبارک جسدِ اطہر سے جدا نہیں ہوئی، کہاں تک صحیح ہے؟ الفرقان کی قریبی اشاعت میں اس مسئلہ کی تحقیق فرما کر ممنون فرمائیں.“

تحقیق : یہ غلط خیال ہے اور نصوص قرآن و حدیث کے خلاف ہے. اور شاید ایسا خیال کرنے والوں کو مسئلہ حیات النبیؐ کی حقیقت سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے. ورنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ”موت“ کا نفسِ ورود ایک ناقابلِ انکار بلکہ ناقابلِ شک و ریب حقیقت ہے قرآن مجید

؎ یہ ۵۸ھ کی تحریر ہے جب ملک تقسیم نہیں ہوا تھا اور پٹی ضلع لاہور میں تھا.

میں صاف لفظوں میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔ کل نفسٍ ذائقة الموت (ہر جان کو موت کا مزا چکھنا ہے) اور خاص طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے متعلق ارشاد فرمایا گیا ہے۔ انك ميت وانهم ميتون (زمر۴) اے رسول اللہ! آپ کو بھی ضرور موت سے دوچار ہونا ہے اور وہ بھی یقیناً مرنے والے ہیں"۔ پھر احادیث بھی اس بات میں بکثرت ہیں۔ ازاں جملہ حضورؐ کے آخری وقت کے بیان میں حضرت عائشہؓ کی یہ روایت ہے کہ آنحضرتؐ کے سامنے اس وقت لکڑی کے ایک پیالہ میں پانی تھا۔ آپ بار بار اس میں ہاتھ ڈال کر چہرہ مبارک پر پھیرتے تھے اور فرماتے جاتے تھے۔ لا الٰہ الا اللہ ان للموت سکرات (اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے بے شک موت کی کچھ سختیاں ہیں) حضرت صدیقہؓ فرماتی ہیں۔ ثم نصب يده فجعل يقول فی الرفيق الاعلیٰ حتی قبض ومالت يده (صحیح بخاری) پھر آپ نے اپنا ہاتھ اوپر کی جانب اُٹھایا اور فرماتے تھے "آپ رفیق اعلیٰ ہیں" یہاں تک کہ روح مبارک قبض کرلی گئی، اور آپ کا ہاتھ نیچے آگیا)۔

نیز حضرت عائشہؓ اور حضرت عباسؓ دونوں سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں:۔

قالا لما قبض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وغسل اختلفوا فی دفنه فقال ابو بكر ما نسيت ما سمعت من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم يقول ما قبض اللہ نبيًا الا فی الموضع الذی يحب ان يدفن فيه۔ ادفنوه فی موضع فراشه للترمذی۔ (جمع الفوائد)

ترجمہ۔ دونوں فرماتے ہیں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارک قبض کرلی گئی اور آپ کو غسل دے لیا گیا تو مقامِ دفن کے بارہ میں اختلافِ آراء ہوگیا۔ اس وقت صدیق اکبرؓ نے فرمایا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث سنی تھی جس کو میں ابھی تک نہیں بھولا۔ آپ نے ارشاد فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ پیغمبروں کی روح وہیں قبض کرتے ہیں جہاں ان کا دفن ہونا چاہتے

ہیں لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کے بستر مبارک ہی کی جگہ دفن کرنا چاہیئے۔

اور صحیح بخاری وشمائل ترمذی میں حضرت حسنؓ سے مروی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر آخری وقت کی تکلیف شروع ہوئی تو حضرت سیدہ فاطمہؓ کی زبان سے نکلا واکرباہ (ہائے کیسی بے چینی ہے) تو حضورؐ نے ان سے مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا لاکرب علی ابیک بعد الیوم، انه قد حضر من ابیک ما لیس الله بتارك احدًا۔ الحدیث (بیٹی آج کے بعد تمہارے باپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوتی ہے۔ اب تمہارے باپ کے لیے وہ وقت آگیا ہے جس سے اللہ پاک کسی کو بھی مستثنیٰ کرنے والا نہیں)۔

اور وفات نبویؐ کے بعد حضرت صدیق اکبرؓ نے جو کچھ اس باب میں ارشاد فرمایا ہے وہ تو نصوص قرآن وحدیث کے بعد اس بارہ میں فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے۔ ازاں جملہ صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ جب صدیق اکبرؓ کو وفات نبویؐ کی خبر پہنچی تو آپ سیدھے حضورؐ کے پاس آئے۔ پہلے پیشانی مبارک کو بوسہ دیا۔ پھر آنسو گراتے ہوئے کہا۔

بابی انت وامی لا یجمع الله علیك موتتین اما الموتة التی کتبت علیك فقد متها۔

ترجمہ۔ آپ پر میرے ماں باپ فدا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو دو دفعہ موت نہ دے گا جو موت آپ کے لیے مقدر ہو چکی ہے وہ بہر حال آپ پر وارد ہو چکی ہے۔

غالباً حضرت صدیق اکبرؓ کا مقصد ان لوگوں کی تردید کرنا تھا جو اس وقت یہ سمجھ رہے تھے کہ حضرتؐ کی یہ وفات آخری وفات نہیں ہے بلکہ عنقریب آپ اٹھیں گے اور فلاں فلاں کاموں کی تکمیل جب خود آپ کے ہاتھوں سے ہو جائے گی۔ اس کے بعد آپ کو آخری وفات آئے گی حضرت صدیق اکبرؓ نے اس خیال کی تردید یوں فرمائی کہ "ایسا نہیں ہوگا کہ اللہ تعالیٰ آپ پر دو دفعہ موت کو وارد کرے۔ آپ کے لیے ایک ہی موت مقدر تھی جو آگئی"۔

ایک دوسرا مطلب حضرت صدیق اکبرؓ کے اس ارشاد کا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگرچہ عوام الناس کے لیے دو موتیں ہیں۔ پہلی دفعہ اس دنیا میں اُن پر موت وارد ہوتی ہے۔ پھر قبر میں نکیرین کے سوال و جواب کے وقت ان کو زندہ کر دیا جاتا ہے۔ اور اس سے فراغت کے بعد دوبارہ ان پر موت طاری کر دی جاتی ہے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے صرف اسی دنیا کی ایک موت مقدر تھی جو آپ پہ وارد ہو گئی۔ اس کے بعد جب قبر مبارک میں آپ کو پھر حیات بخشی جائے گی تو وہ برابر قائم رہے گی اور عوام الناس کی طرح اُن پہ دوبارہ موت طاری نہیں ہو گی۔ واللہ اعلم

اور صحیح بخاری اور دیگر صحاح میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ وفات نبویؐ کے دن جب حضرت عمرؓ قسم کھا کھا کر فرما رہے تھے۔ واللہ مامات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (خدا کی قسم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر موت وارد نہیں ہوئی) تو حضرت صدیق اکبرؓ نے ان کو خاموش کر کے خطبہ دینا شروع کیا جس میں خدا کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا۔

من کان یعبد محمداً فان محمداً قد مات ومن کان یعبد اللہ فان اللہ حی لا یموت وقال "فانک میت وانهم میتون" وقال تعالیٰ "وما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل افائن مات او قتل انقلبتم علیٰ اعقابکم ومن ینقلب علیٰ عقبیه فلن یضر اللہ شیئا وسیجزی اللہ الشاکرین۔

ترجمہ۔ جو حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عبادت کرتا تھا اسے معلوم ہونا چاہیے کہ حضرت محمدؐ وفات پا گئے۔ اور جو اللہ کا پرستار ہو تو اللہ تعالیٰ بے شک ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے اس کے لیے موت نہیں (پھر وفات نبوی کے ثبوت میں) آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "آپ کو بھی (اے رسولؐ!) موت آنی ہے اور آپ کے بدخواہ دشمن بھی مرنے والے ہیں (نیز صدیق اکبرؓ نے یہ آیت بھی تلاوت فرمائی) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ حضرت

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بس رسول ہی تو ہیں دکوئی حی وقیوم خدا تو ہیں نہیں، تو کیا اگر وہ وفات پا جائیں گے یا شہید کر دیے جائیں تو تم اُلٹے پاؤں گمراہی کی طرف پلٹ جاؤ گے؟ اور یاد رکھو جو بھی اس طرح پلٹے گا تو وہ خدا کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا (بلکہ خود اپنے کو برباد کرے گا) اور اللہ تعالیٰ اپنے شاکر بندوں کو ثواب دے گا۔"

پھر واضح رہے کہ حضرت صدیق اکبرؓ نے یہ خطبہ صحابہ کرامؓ کے بھرے مجمع میں دیا۔ اور کسی نے اس کے کسی جزء پر کوئی تنقید نہیں کی۔ بلکہ خود حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ "ابو بکرؓ کے اس بصیرت افروز بیان نے خود میری آنکھیں کھول دیں اور میں نے اپنی غلطی کو محسوس کر لیا۔"

گویا ایک طرف تو یہ مسئلہ کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر خدا کے عام قانون کل نفسٍ ذائقۃ الموت کے ماتحت موت جاری ہوئی (اور یہ موت بنصوص قرآن وحدیث سے ثابت ہے۔ اور دوسری طرف گویا صحابہ کرامؓ کا اجماع بھی ہے۔ لہٰذا سوال میں کسی کا جو "خیال" ذکر کیا گیا ہے اس کے لیے ہرگز کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔

اور جیسا کہ عرض کیا گیا تھا ان صاحب کو یہ غلط فہمی مصنفین کے کلام میں "حیات النبی" کی مراد نہ سمجھنے کے باعث ہوئی ہے۔ شاید انہوں نے سمجھا ہے کہ "علماء کرام" جو "حیات النبی" کے قائل ہیں ان کا مطلب یہ ہے کہ حضور پر موت وارد ہی نہیں ہوئی۔ حالانکہ ان کا منشا یہ نہیں ہے۔ بلکہ ان حضرات کی مراد یہ ہے کہ اس موت کے بعد حضور اقدسؐ کو حیات بخش دی گئی ہے۔ غالباً متقدمین میں امام بیہقی[1] پہلے وہ شخص ہیں جنہوں نے مسئلہ حیات الانبیاء پر مستقل

---

[1] امام بیہقی شعب الایمان میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں:۔

من صلی علیّ عند قبری سمعتہ ومن صلی علیّ نائیاً ابلغتہ۔

ترجمہ۔ کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو شخص میری قبر کے پاس درود شریف پڑھے گا میں خود اس کو سنتا ہوں اور جو دور سے درود شریف پڑھے گا وہ

رسالہ لکھا ہے۔ اور اس میں اس مسئلہ کے متعلق تمام احادیث جمع کی ہیں۔ انہوں نے خود اس کی تشریح اس طرح کی ہے:-

ان الانبیاء بعد ما قبضوا ردت الیهم ارواحهم فهم احیاء عند ربهم کالشهداء۔ (زرقانی شرح مواہب جلد ۵ صفحہ ۳۳۲)

ترجمہ۔ انبیاء علیہم السلام کی ارواح ان کی وفات کے بعد انہیں لوٹا دی گئیں پس وہ اللہ کے یہاں زندہ ہیں جیسے کہ شہدائے کرام۔

(فرشتوں کے ذریعہ) مجھ تک پہنچا دیا جائے گا۔

ملا علی القاریؒ اپنی کتاب الدرۃ المضیۃ فی الزیارۃ المصطفویہ میں فرماتے ہیں:-

ومن اعظم فوائد الزیارۃ ان الزائر اذا صلی وسلم علیہ عند قبرہ سمعہ سماعا حقیقیا ورد علیہ من غیر واسطۃ بخلاف من یصلی او یسلم علیہ من بعید فان ذلک لا یبلغہ الا بواسطۃ لما جاء عنہ بسند جید من صلی علی عند قبری سمعتہ ومن صلی علی من بعید اعلمتہ۔

ترجمہ۔ زیارۃ قبر اقدس کے بڑے فائدوں میں سے ایک یہ ہے کہ زائر جب آپ کی قبر شریف کے پاس صلوٰۃ وسلام پڑھتا ہے تو آپ خود سنتے اور جواب عطا فرماتے ہیں بجز اس شخص کے جو دور سے درود وسلام پڑھتا ہے وہ آپ کو نہیں پہنچتا مگر بذریعہ فرشتوں کے بوجہ اس کے کہ عمدہ سند سے منقول ہے کہ جو شخص میری قبر کے پاس درود شریف پڑھتا ہے میں اس کو سنتا ہوں اور جو شخص دور سے پڑھتا ہے اس کی مجھے اطلاع دی جاتی ہے۔ (از تعلیم القرآن مئی ۱۹۵۹ء)

ملا علی قاری نے اس حدیث کو اس کی دوسری سند کے اعتبار سے جو ابوالشیخ کی ہے بسند جید کہا ہے۔ اس سے امام بیہقی کی کمزور سند کی بھی توثیق ہو جاتی ہے۔ خالد محمود عفا اللہ عنہ

پھر بعد کے دور میں جن اکابر نے اس مسئلہ پہ خاص توجہ کی ہے ان میں ایک جلیل القدر شخصیت علامہ تقی الدین سبکیؒ ہیں. آپ نے اپنی مشہور کتاب "شفاء السقام" میں "حیات انبیاء" پہ ایک مستقل باب لکھا ہے. جس میں پوری قوت کے ساتھ مسئلہ کا ثبوت دینے کے بعد خود ہی یہ شبہ وارد کیا ہے کہ "قرآن عزیز صاف حضورؐ کی موت کا اعلان کر رہا ہے (انک میت وانهم میتون) اور خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں. انی مقبوض (میں قبض کیا جاؤں گا). اور حضرت ابو بکر صدیقؓ فرماتے ہیں. ان محمدًا قدمات (یعنی حضور اقدس وفات پا گئے) اور ساری امت کا اجماع ہے کہ آپ کے متعلق موت کا لفظ بولا جاسکتا ہے. پھر خود ہی جواب دیتے ہیں :-

يقال انه موت غير مستمر وانه احيى بعد الموت ۔ (شفاء السقام ص۱۴۲)

ترجمہ جواب میں کہا جائے گا کہ یہ موت غیر مستمر (کا ذکر) ہے اور حضورؐ کو اس موت کے بعد اللہ تعالیٰ نے حیات عطا فرمادی۔

بہرحال حیاتِ انبیاء کا یہ مطلب کسی کے نزدیک بھی نہیں ہے کہ ان پہ "موت" قطعاً طاری ہی نہیں ہوتی. بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ وفات کے بعد ان حضرات کو پھر حیات (مع الجسد) بخش دی جاتی ہے اور وہ صحیح وسالم قبر میں محفوظ رہتے ہیں جیسا کہ احادیث میں وارد ہے۔

هٰذا الجواب ويتوب الله على من تاب ۔ محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی دامت برکاتہم کا یہ مضمون ماہنامہ الفرقان کے جمادی الاولیٰ ۱۳۵۸ھ کے ماہنامہ میں شائع ہوا تھا. پھر یہ مضمون ماہنامہ تعلیم القرآن راولپنڈی کی مئی ۱۹۵۹ء کی اشاعت میں شائع ہوا اور اسی حاشیہ سے شائع ہوا جس میں سماع عند القبر الشریف کی حدیث کو سند جید سے مانا گیا ہے. پھر تعلیم القرآن کی جولائی اور اگست ۱۹۶۰ء کی اشاعت میں اس کی تصدیق محدث کبیر حضرت مولانا عبد الرحمٰن کیملپوری سے ان الفاظ میں منقول ہوئی :-

"میرے نزدیک مولانا محمد منظور صاحب کا مضمون جو مختلف رسائل میں طبع وشائع

ہو چکا ہے اس باب میں بہترین مضمون ہے۔" (از تعلیم القرآن راولپنڈی)

یہ ان دس بزرگوں کی شہادات ہیں جو بعقیدہ حیات ہیں۔ وکفیٰ بھم شرفًا وفضلًا۔

ان تمام مضامین میں حیات روح بالجسد مذکور ہے اور روضہ پاک کے پاس حضورؐ کے سماع حقیقی کی تزئین کی گئی ہے۔ دھوالحق والحق احق ان یتبع۔

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی دامت برکاتہم وہ بزرگ ہیں جنہیں حضرت مولانا حسین علی (واں بھچراں) نور اللہ مرقدہ نے سلانوالی کے مناظرہ کے لیے بلایا تھا اور ان کی تقریرات سامنے بیٹھ کر سنیں اور فرمایا: مسلک دیوبند کی حقانیت مولانا منظور نعمانی کی زبان سے آج بہت کھل کر میرے سامنے آئی ہے اور بیشک انہی حضرات کا مسلک برحق ہے۔

حضرت مولانا منصور احمد نعمانی نے ایک مجلس میں بیان کیا کہ میں جب سلانوالی کے مناظرہ کے لیے چلا تھا تو میں نے ارادہ کیا تھا کہ مناظرہ سے پہلے حضرت مولانا حسین علی صاحبؒ سے ملاقات نہ کروں۔ وہ بطور مبصر مناظرہ میں میری تقریر سنیں اور حضرت سے میری ملاقات چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور علماء دیوبند کا مسلک حضرت مرحوم کے سامنے اس طرح آیا کہ اب آپ کے بارے میں کوئی نہ کہے گا کہ حضرت مرحوم اور علمائے دیوبند کے مابین اختلافات ہیں۔ اگر اس میں کچھ بھی حقیقت ہوتی تو حضرت مولانا نصیر الدین غشتوی کبھی کھلے بندوں حیات النبی کا اقرار نہ کرتے اور حضرت مولانا عبدالرحمٰن کیمبلپوری جو کچھ عرصہ جمعیت اشاعۃ التوحید والسنۃ کے سرپرست بھی رہے نہ کہتے کہ حیات النبی میں مولانا محمد منظور نعمانی کا بیان بالکل حق اور درست ہے۔

علمائے دیوبند کا عقیدہ کیا ہے۔ اسے ہم دس اکابر دیوبند سے جو اپنے خیمے جنت میں لگا چکے ہیں اور دس ان بزرگوں سے جن کے نام اور کام سے آج دیوبندیت کا تعارف ہوتا ہے آپ کے سامنے پیش کر چکے۔ ان بیس بڑے مسلمانوں کی تشریح وتفصیل کے مقابلے میں ایک بدعی عقیدے کی اشاعت اور وہ بھی علماء دیوبند کے نام سے علم و دیانت کو کسی طرح زیب نہیں دیتی۔

سرخدا کہ زاہد و عابد کسے نہ گفت   در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید

صورۃ ماکتبہ اکابر العلماء وجہابذۃ الفضلاء ممن تولی الدرس والافتاء فی عقیدۃ حیاۃ الانبیاء

پاکستان کے دس اکابر مسلک دیوبند کا متفقہ اعلان

حضرت اقدس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور سب انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں اکابر دیوبند کا مسلک یہ ہے کہ وفات کے بعد اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور ان کے ابدانِ مقدسہ بعینہ محفوظ ہیں اور جسدِ عنصری کے ساتھ عالم برزخ میں ان کو حیات حاصل ہے اور وہ حیاتِ دنیوی کے مماثل ہے۔ صرف یہ کہ وہ احکامِ شرعیہ کے مکلف نہیں ہیں۔ لیکن وہ نماز بھی پڑھتے ہیں اور روضۂ اقدس پر جو درود پڑھا جائے بلاواسطہ سنتے ہیں اور یہی جمہور محدثین اور متکلمین اہل السنۃ والجماعۃ کا مسلک ہے۔

اکابر دیوبند کے مختلف رسائل میں یہ تصریحات موجود ہیں۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی تو مستقل تصنیف حیاۃ انبیاء پر آبِ حیات کے نام سے موجود ہے۔ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب جو حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے ارشد خلفاء میں سے ہیں۔ ان کا رسالہ المہند علی المفند بھی اہلِ انصاف اہل بصیرت کے لیے کافی ہے اب جو اس مسلک کے خلاف دعویٰ کرے اتنی بات یقینی ہے کہ ان کا اکابر دیوبند کے مسلک سے کوئی واسطہ نہیں۔ واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل۔

○ محمد یوسف بنوری عفا اللہ عنہ
○ عبدالحق عفا اللہ عنہ اکوڑہ خٹک
○ محمد رسول خاں عفا اللہ عنہ
○ شمس الحق افغانی عفا اللہ عنہ
○ محمد ادریس کاندھلوی عفا اللہ عنہ
○ (مفتی) محمد حسن عفا اللہ عنہ
○ خیر محمد جالندھری عفا اللہ عنہ
○ (مفتی) محمد صادق عفا اللہ عنہ جامعہ عباسیہ بہاولپور
○ عبدالقدیر عفا اللہ عنہ
○ محمد عبداللہ درخواستی عفا اللہ عنہ (خانپور)

پنجاب کی رُبع صدی کی معرکہ آرائی دیکھنے کے بعد

دارالعلوم دیوبند کا تاریخی فیصلہ

مسئلہ حیات النبی میں اختلاف پنجاب سے آگے کسی طرف نہیں جاسکا۔ ہندوستان، بنگلہ دیش، برما اور سری لنکا میں دارالعلوم دیوبند کے فیض یافتگان ہزاروں کی تعداد میں علم دین کی خدمت کر رہے ہیں۔ مگر ان میں سے کسی نے پنجاب کے اس اختلاف سے کوئی اثر نہیں لیا۔ اور اکابر دیوبند کی پہلی تصریحات سے کہیں سرِ مو بھی آگے نہیں نکلے۔ صوبہ سرحد۔ آزاد قبائل اور افغانستان میں ہزاروں فضلاء دیوبند اپنا کام کر رہے ہیں۔ مگر ان میں کسی نے اکابر علماء دیوبند سے اس مسئلے میں اختلاف نہیں کیا۔

پنجاب میں یہ بات غلط طور پر مشہور ہوئی کہ اس مسئلے میں جماعتِ دیوبند میں تقسیم ہو گئی ہے۔ کچھ علماء حیاتی ہیں اور کچھ مماتی ــــ پھر لطف یہ کہ مماتی لوگ عقیدہ حیات النبی کا کھلم کھلا انکار کرنے کے باوجود اپنے آپ کو دیوبندی کہتے ہیں اور پاکستان میں بیشتر حصوں میں انہیں دیوبندی ہی سمجھا جا رہا ہے۔

افسوس ہے کہ لوگ اس موضوع میں خود دیوبند کی طرف رجوع نہیں کرتے ــــ دارالعلوم دیوبند کوئی آثارِ قدیمہ میں سے تو نہیں کہ اس کی طرف رجوع نہ کیا جاسکے اور حقیقتِ حال معلوم نہ کی جاسکے۔

پنجاب میں یہ مسئلہ دیوبندی حلقوں میں بڑے زور سے چلا۔ فریقین نے اپنے اپنے موقف پہ بھرپور کتابیں لکھیں اور ان کے ذریعہ دونوں طرف کے دلائل دارالعلوم دیوبند پہنچے وہاں کے علماء کے سامنے کوئی غرض اور کوئی مصلحت نہ تھی۔ وہ مسئلے پر محض علمی نقطہ نظر سے

غور کرتے اور فریقین کی معرکہ آرائی دیکھتے رہے۔

مقامِ حیات پہلی بار الربیع الثانی ۱۳۸۰ھ میں چھپی۔ اس کے جواب میں قاضی شمس الدین صاحب نے مسالک العلماء لکھی۔ قاضی صاحب اس میں کسی ایک مسلک پہ جم نہیں سکے اور ان کی یہ کمزوری خود اس کتاب کے نام سے عیاں ہے۔ حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ جب پاکستان آئے اور قاضی صاحب کے سامنے اپنا دیوبندی عقیدہ لکھا تو قاضی صاحب نے جھٹ اس پہ دستخط کر دیئے۔ اس صورتِ حال سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں مسئلہ زیرِ بحث میں اختلاف اتنا نہیں ہے جتنا انتشار ہے اور نہایت افسوس ہے کہ اب اس انتشار کی ہی اختلاف کے نام پہ پرورش کی جارہی ہے اور زیادہ لوگ نہیں جانتے کہ اختلاف کیا ہے۔

پنجاب کی اس معرکہ آرائی پہ جب ربع صدی گزری اور پچیس سال حیاتی اور مماتی آپس میں معرکہ آراء رہے تو کچھ لوگوں نے یہ معاملہ پھر دیوبند لکھ بھیجا اور دار العلوم دیوبند چھ سوال روانہ کیے۔ مفتی دار العلوم دیوبند مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب نے نمبر ۶۸۴/ج کے تحت ۱۴۰۵ھ میں ان کا جواب لکھا۔ پھر دوسرے مفتی حضرات نے اس پہ دستخط کیے اور دار العلوم دیوبند کے دار الافتاء کی مہر اس پہ ثبت کر دی۔

پنجاب کی ربع صدی کی معرکہ آرائی دیکھنے اور مماتیوں کی کتابیں اور تحریریں دیکھنے کے بعد علماء دار العلوم دیوبند اس نتیجہ پہ پہنچے ہیں کہ مماتیوں کے پاس اس موضوع میں سوائے انتشار کے کچھ نہیں اور اگر ان کے پاس کوئی مادہ اختلاف ہوتا تو وہ ضرور ان کو کچھ نہ کچھ اہمیت دیتے

اب دار العلوم دیوبند کا یہ حالیہ تاریخی فیصلہ سراسر عقیدہ حیات النبی کی تائید میں ہے اور اس لحاظ سے اس کی بہت اہمیت ہے کہ یہ پنجاب کی ربع صدی کی معرکہ آرائی دیکھنے کے بعد کا ہے اور اس سے مماتیوں کی پوری عمارت دھڑام سے نیچے آگری ہے۔

اس تاریخی فیصلے کو غور سے پڑھیں۔ آپ محسوس کریں گے کہ یہ فتوٰے مقامِ حیات کا ہی ایک دوسرا مختصر پیرایہ ہے۔ ماتنا اللہ علی ہذہ العقیدۃ اصلاً و فرعاً ۔ مؤلف عفا اللہ عنہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۶۸۴
ج

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل میں

(۱) —— کیا علمائے دیو بند اور جمہور اہل السنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ سردارِ دو عالم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے روضہ شریف میں دُنیا کی سی زندگی کے ساتھ زندہ ہیں —؟

باسمہٖ سبحانہ وتعالیٰ

الجواب ~~۹۲~~ ومنہ الصواب

حامداً و مصلیاً

تمہید —— سب سے پہلے یہ سمجھنا چاہیئے کہ مسئلہ مستفسرہ میں بزرگانِ دیو بند کا مسلک بالکل صاف اور واضح ہے اور اس سے قبل بھی بار بار اس کی اشاعت ہو چکی ہے نیز علمائے دیو بند کے مختلف اور متعدد تصانیف میں مکرر سہ کرر اسے بیان فرمایا گیا ہے اور وہ کتابیں تمام دُنیا میں معروف و مشہور ہیں۔ مثلاً ۱. آبِ حیات۔ ۲. جمالِ قاسمی۔ ۳. نشر الطیب۔ ۴. الشہاب الثاقب۔ ۵. المصالح العقلیہ۔ ۶. فیض الباری۔ ۷. المہند علی المفند۔ ۸. تسکین الصدور۔ ۹. تنقیدِ اعلان۔ ۱۰. مقامِ حیات وغیر ذلک —— پھر مسئلہ کے آخری حل اور نزاع کے تصفیہ کے لیے ۱۸ محرم ۱۳۸۲ھ مطابق ۲۲ جون ۱۹۶۲ء کو راولپنڈی میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زیر سرپرستی فریقین کے ذمہ داروں نے درج ذیل عبارات پر دستخط بھی فرما دیئے —— عبارت مجوزہ یہ ہے :-

وفات کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جسدِ اطہر کو برزخ (قبر شریف) میں بہ تعلق روح حیات حاصل ہے اور اس حیات کی وجہ سے روضۂ اقدس پر حاضر ہونے والوں کا آپ صلوٰۃ وسلام سنتے ہیں۔

اس صاف اور صحیح عبارت پر اقراری دستخط کے باوجود اصل اور اجماعی مسئلہ سے انحراف جہاں امانت و دیانت کی دنیا میں حیرت زا ہے وہیں باعثِ صد افسوس بھی فیاللعجب ویاحسرتاہ۔

پھر یہ المیہ اس وقت مزید دوچند ہو جاتا ہے جب باہمی اتحاد و اتفاق، عزت و احترام کے بجائے تشتت و افتراق، نزاع وجدال اور طعن و تشنیع کا طریقہ اختیار کیا جائے جو عزت نفس اور شرافتِ ضمیر کے قطعاً قطعاً منافی ہے۔ فالی اللہ المشتکیٰ۔

خدا اصلاحِ اعمال کی توفیق بخشے۔ ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد۔

اس تمہید کے بعد اصل جواب ملاحظہ فرمائیں:۔

(۱) —— جی ہاں ——

تمام اہل سنت والجماعت کا قرآن وحدیث کی روشنی میں اجماعی عقیدہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح دیگر انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام قبروں میں اجساد عنصریہ کے ساتھ حیات ہیں اور یہ حیاتِ برزخی حیاتِ دنیوی سے کم نہیں ہے اور تلاوتِ نماز و دیگر عبادات میں مشغول ہیں۔ یہ حیاتِ برزخی اگرچہ ہم کو محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن بلاشبہ یہ حیات حسّی اور جسمانی ہے۔ اس لیے کہ روحانی اور معنوی حیات تو عامۂ مومنین بلکہ ارواحِ کفار کو بھی حاصل ہے۔

امت کا یہ اجماعی عقیدہ اصول شریعت، کتاب وسنت اور اجماع امت سے ثابت ہے۔ چنانچہ ادلۂ ثلثہ پیش ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:۔

عقیدہ حیات الانبیاء قرآن حکیم میں

قرآن حکیم میں بیشتر مقامات پر حیات الانبیاء کا ثبوت (اشارۃً، دلالۃً اور اقتضاءً) ملتا ہے۔ ان تمام آیات کا احصاء مشکل بھی ہے اور موجبِ طول بھی ــــ اس لیے اختصار کی غرض سے چند آیتوں کے ذکر پر اکتفاء کیا جا رہا ہے:۔

(۱) واسئل من ارسلنا من قبلك من رسلنا اجعلنا من دون الرحمٰن اٰلهة يعبدون۔ (پ ۲۵ الزخرف)

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین نے فرمایا ہے کہ اس آیت سے انبیاء علیہم السلام کی حیات پر استدلال کیا گیا ہے۔ چنانچہ محدث العصر حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:۔

يستدل به على حيات الانبياء[1]

(۲) ولقد اٰتينا موسى الكتٰب فلا تكن في مرية من لقائه۔ (پ ۲۱ الم السجدہ)

ترجمہ: اور دی ہم نے موسیٰ کو کتاب سو اس کے ملنے میں شک میں نہ رہنا۔

حضرت شاہ عبد القادر صاحب رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا:۔

معراج کی رات میں ان سے ملے تھے اور بھی کئی بار[2] ــــ اور ملاقات بغیر حیات ممکن نہیں۔ لہٰذا اقتضاء النص سے حیات الانبیاء کا ثبوت ملتا ہے ــــ یہاں اصول فقہ کا یہ مسلمہ بھی پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ جو حکم اقتضاء النص سے ثابت ہوتا ہے وہ بحالت انفراد قوت و استدلال میں عبارۃ النص کے مثل ہوتا ہے۔

(۳) ولا تقولوا لمن يقتل في سبيل الله اموات بل احياء ولكن لا تشعرون۔

(پ ۲ البقرہ آیت ۱۵۴ ع ۱۹)

---

[1] مشکلات القرآن ص ۲۳۴ و ہکذا فی الدر المنثور جلد ۶ ص ۱۶ روح المعانی جلد ۲۵ ص ۸۹ جمل جلد ۴ ص ۸۸ شیخ زادہ جلد ۳ ص ۲۹۸ خفاجی جلد ۷ ص ۴۴۴ [2] موضح القرآن ص

④ بل احیاء عند ربھم یرزقون فرحین بما اتاھم اللہ من فضلہ (پ۴ آل عمران آیت ۱۶۹)

ان دونوں آیتوں کے بارے میں حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے فرمایا۔

واذا ثبت انھم احیاء من حیث النقل فانہ یقویہ من حیث النظر کون الشھداء احیاء بنص القرآن والانبیاء افضل من الشھداء۔[1]

جب نقل کے اعتبار سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ شہداء زندہ ہیں تو عقلی اعتبار سے بھی یہ بات پختہ ہو جاتی ہے کہ شہداء زندہ ہیں اور حضرات انبیاء علیہم السلام تو شہداء سے بہر حال افضل ہیں۔

غور فرمایئے! حافظ الدنیا کس قدر قوت کے ساتھ آیت کریمہ سے دلالۃ النص یعنی درجہ اولویت سے حیات الانبیاء کو ثابت فرما رہے ہیں۔

⑤ فلما قضینا علیہ الموت ما دلھم علیٰ موتہ الا دابۃ الارض تاکل منسأتہ۔ (پ۲۲ السباء)

اس آیت سے بھی دلالۃ النص سے حیات الانبیاء کا عقیدہ ثابت ہوتا ہے۔ اس لیے کہ جب کیڑوں نے مضبوط اور سخت ترین عصائے سلیمانی کو کھا لیا تو جسم عنصری کا کھا لینا اس سے کہیں سہل تھا۔ اس کے باوجود جسم کا ٹکا رہنا بلکہ محفوظ رہنا حیات کی صریح دلیل ہے۔

حیات الانبیاء احادیث کی روشنی میں

① حضرت انس بن مالکؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:۔

الانبیاء احیاء فی قبورھم یصلون۔[2]

حضراتِ انبیاء اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور نمازیں پڑھتے ہیں۔

علامہ سبکیؒ اس حدیث کی سند کو نقل کر کے اس کے رواۃ کی توثیق کرتے ہیں اور

---

[1] فتح الباری جلد ۶ ص۳۷۹ [2] شفاء السقام ص۱۳۴ حیات الانبیاء للبیہقی ص۱

اس کو صحیح قرار دیتے ہوئے اس سے استدلال کرتے ہیں ـــــ یہ روایت بدون سند الخصائص الکبریٰ[1] میں اور مسند ابو یعلیٰ کے پہلے راوی کے علاوہ بقیہ رواۃ کے ساتھ فتح الباری[2] اور فتح الملہم[3] میں بھی مذکور ہے۔

حدیث شریف کی صحت کے متعلق علماء اسماء الرجال کی تفصیلی آراء

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ فرماتے ہیں کہ :۔

وصححه البیهقی[4] امام بیہقی نے اس کی تصحیح کی ہے۔

محدث العصر حضرت مولانا انور شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں :۔

ووافقه الحافظ فی المجلد السادس[5]

امام بیہقی کی اس تصحیح پر حافظ ابن حجر نے اتفاق کیا ہے۔

علامہ عثمانیؒ بھی اس کی تائید کرتے ہیں[6]

علامہ ہیثمی فرماتے ہیں کہ :۔

رجال ابی یعلیٰ ثقات[7] ابو یعلیٰ کی سند کے سب راوی ثقہ ہیں۔

علامہ عزیزی لکھتے ہیں :۔

وهو حدیث صحیح[8] یہ حدیث صحیح ہے۔

ملا علی قاری لکھتے ہیں :۔

یصح خبر الانبیا احیاء فی قبورهم[9] الانبیاء احیاء فی قبورهم کی حدیث صحیح ہے۔

ملا عبد الرؤف مناوی لکھتے ہیں :۔

هذا حدیث صحیح[10] یہ حدیث صحیح ہے۔

---

[1] الخصائص الکبریٰ صفحہ ۲۸۱ [2] فتح الباری صفحہ ۳۵۲ [3] فتح الملہم جلد ا صفحہ ۳۲۹ [4] فتح الباری جلد ۶ صفحہ ۳۵۲ [5] فیض الباری جلد ۲ صفحہ ۶۴ [6] فتح الملہم جلد ا صفحہ ۳۲۹ [7] مجمع الزوائد جلد ۸ صفحہ ۲۱۱ [8] السراج المنیر جلد ۲ صفحہ ۱۳۴ [9] مرقاۃ المفاتیح جلد ۲ صفحہ ۲۱۲ [10] فیض القدیر جلد ۳ صفحہ ۱۸۴

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ فرماتے ہیں:۔

ابویعلیٰ بنقل ثقات از روایت انس بن مالکؓ آوردہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الانبیاء احیاء فی قبورھم یصلون۔[1]

امام ابویعلیٰ ثقہ راویوں کی نقل سے حضرت انس بن مالکؓ سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انبیاء علیہم السلام زندہ ہیں اور اپنی قبروں میں نماز پڑھتے ہیں۔

قاضی شوکانیؒ لکھتے ہیں:۔

انہ صلی اللہ علیہ وسلم حیّ فی قبرہ وروحہ لا تفارقہ لما صح ان الانبیاء احیاء فی قبورھم۔[2]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قبر میں زندہ ہیں اور آپ کی روح آپ کے جسم مبارک سے جدا نہیں ہوتی۔ کیونکہ صحیح حدیث میں آیا ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں۔

اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:۔

وقد ثبت فی الحدیث ان الانبیاء احیاء فی قبورھم رواہ المنذری وصححہ البیہقی۔[3]

بلاشبہ حدیث سے ثابت ہو چکا ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں، علامہ منذری نے یہ روایت نقل کی ہے اور امام بیہقی رہ نے اس کی تصحیح کی ہے۔

علامہ سمہودی لکھتے ہیں:۔

رواہ ابویعلیٰ برجال ثقات ورواہ البیہقی وصححہ۔[4]

---

[1] مدارج النبوۃ جلد ۲ صفحہ ۴۴۰ جذب القلوب صفحہ ۱۸۰ [2] تحفۃ الذاکرین شرح حصن حصین صفحہ ۱۸ [3] نیل الاوطار جلد ۳ صفحہ ۲۱۴ [4] وفاء الوفاء جلد ۲ صفحہ ۴۰۵

ابو یعلی نے ثقہ راویوں سے یہ روایت کی ہے اور امام بیہقی نے اس کو صحیح سند سے روایت کیا ہے۔

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب رحمہ اللہ لکھتے ہیں:۔

اور یہ حدیث کہ انبیاء اپنی قبروں میں نماز پڑھتے ہیں صحیح ہے۔[1]

آپ نے ملاحظہ کر لیا کہ امام ابو یعلی کے طریق سے جو روایت ہے اس کے تمام راوی ثقہ اور ثبت ہیں اور جمہور محدثین کرام اس کی تصحیح کرتے ہیں کسی حدیث کے صحیح ہونے کے لیے اصول حدیث میں اس سے زیادہ قوی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس کے سب راوی ثقہ ہوں اور جمہور محدثین کرام اس کی تصحیح پر متفق ہوں۔

(۲) حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:۔

ما من احد یسلم علیّ الا ردّ اللہ علیّ روحی حتی اردّ علیہ السلام۔[2]

کوئی شخص ایسا نہیں جو مجھ پر سلام کہتا ہو مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ میری روح مجھ پر لوٹا دیتا ہے یہاں تک کہ میں اس کا جواب دیتا ہوں۔

حدیث کی صحت کے متعلق محدثین کرام کی آراء

امام سبکی فرماتے ہیں کہ: وهو اعتماد صحیح۔[3]

(امام ابو داؤد اور امام احمد نے اس روایت پر اعتماد کیا ہے) اور یہ اعتماد صحیح ہے۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ: رواته ثقات۔[4]

علامہ عزیزی لکھتے ہیں کہ: اسناده حسن۔[5]

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ: صححه النووی فی الاذکار۔[6]

---

[1] فضائل درود شریف ص ۳۷ [2] ابو داؤد جلد ۱ ص ۲۷۹ واللفظ لہ مسند احمد جلد ۲ ص ۵۲۷ [3] شفاء السقام ص ۱۰۵
[4] فتح الباری پ ۳ ص ۲۷۹ [5] السراج المنیر جلد ۳ ص ۲۷۹ [6] تفسیر ابن کثیر جلد ۳ ص ۵۱۴

امام نوویؒ فرماتے ہیں :۔ بالاسناد الصحیح۔[1]

حافظ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں :۔ وھو حدیث جید۔[2]

علامہ زرقانیؒ فرماتے ہیں :۔ بالاسناد صحیح[3]

نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ لکھتے ہیں :۔

قال النووی فی الاذکار اسنادہ صحیح وقال ابن حجر رواتہ ثقات۔[4]

علامہ سمہودیؒ فرماتے ہیں :۔

روی ابوداؤد بسند صحیح۔[5]

مولانا انور شاہ صاحبؒ اور علامہ عثمانیؒ فرماتے ہیں :۔ رواتہ ثقات۔[6]

امام سخاویؒ فرماتے ہیں :۔

روی احمد وابوداؤد والطبرانی والبیہقی باسناد حسن بل صححہ النووی فی کتاب الاذکار وغیرہ۔[7]

اور علامہ محمد بن محمد الفاجی البوستویؒ فرماتے ہیں :۔

قال النووی فی الاذکار وریاض الصالحین اسنادہ صحیح وصححہ ایضا ابن القیم۔[8]

اصول حدیث کی رو سے یہ روایت بالکل حسن اور صحیح ہے اور اس کے جملہ راوی ثقہ ہیں جیساکہ آپ نے باحوالہ پڑھ لیا۔ اور محدثین کرام کی خاصی جماعت اس کی تحسین اور تصحیح کرتی ہے۔

(۳) حضرت اوس بن اوسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :۔

ان من افضل ایامکم یوم الجمعہ فیہ خلق ادم وفیہ قبض وفیہ النفخۃ وفیہ الصعقۃ فاکثروا علیّ من الصلوٰۃ فیہ فان صلوٰتکم معروضۃ

---

[1] کتاب الاذکار صفحہ ۱۰۶ [2] فتاویٰ ابن تیمیہ جلد ۴ صفحہ ۳۱۶ [3] زرقانی شرح مواہب صفحہ ۳۶۸ [4] دلیل الطالب صفحہ ۸۴۳ [5] وفاء الوفاء صفحہ ۱۳۰۳/۲ [6] عقیدۃ الاسلام صفحہ ۵۲ [7] فتح الملہم صفحہ ۳۳۱/۱ [8] القول البدیع صفحہ ۱۰۸ [9] حیاۃ الانبیاء للبیہقی صفحہ ۱۰

علی قال قالوا وکیف تعرض صلوتنا علیک وقد ارمت قال . یقولون بلیت فقال ان اللہ حرم علی الارض ان تاکل اجساد الانبیاء[1]

بے شک تمہارے افضل ترین دنوں میں سے ایک جمعہ ہے ۔ اسی میں حضرت آدم علیہ السلام پیدا کئے گئے اور اسی میں ان کی وفات ہوئی اور اسی میں نفخہ اولیٰ ہوگا اور اسی میں نفخہ ثانیہ ہوگا ۔ سو تم جمعہ کے دن بکثرت مجھ پر درود پڑھا کرو کیونکہ تمہارا درود مجھ پر پیش کیا جاتا ہے ۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کس طرح ہمارا درود آپ پر پیش کیا جائے گا جب کہ آپ ریزہ ریزہ ہو چکے ہوں گے ۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے زمین پر حضرات انبیاء علیہم السلام کے اجساد حرام کر دیئے ہیں (یعنی زمین ان کو کھا نہیں سکتی)

اب حدیث کی صحت اور محدثین عظام کے اقوال لیجیے

اس حدیث کے بارے میں حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں :-

وصححہ ابن خزیمۃ وغیرہ[2]

حافظ ابن القیمؒ فرماتے ہیں :-

ومن تامل فی ھذا الاسناد لم یشک فی صحتہ لثقۃ رواتہ وشہرتہم وقبول الائمۃ حدیثہم[3]

اور یہی الفاظ اس موقعہ پر علامہ ابن عبد الہادیؒ کے ہیں ۔[4]

علامہ عینیؒ لکھتے ہیں :-

صح عنہ صلی اللہ علیہ وسلم ان الارض لا تاکل اجساد الانبیاء ۔[5]

---

[1] ابوداؤد ص ۱۵۰ ج ۱ واللفظ لہ ۔ والدارمی ص ۱۹۵ والنسائی ص ۱۵۴ ج ۱ مستدرک ص ۲۷۸ ج ۱ ص ۵۶۰ ج ۴ موارد الظمان ص ۱۴۶ وابن ماجہ ص ۷۷ وسنن کبریٰ ص ۲۴۹ ج ۳ المصنف لابن ابی شیبۃ ص ۵۱۶ ج ۲ [2] فتح الباری ص ۲۷۹ ج ۶ [3] جلاء الافہام ص ۴۳ [4] الصارم المنکی ص ۱۴۵ [5] عمدۃ القاری ص ۴۹ ج ۴

حافظ ابن القیمؒ ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:۔

قد صح عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان الارض لا تاکل اجساد الانبیاء[1]

علامہ منذریؒ فرماتے ہیں:۔ انہ حسن[2]

اور علامہ عبدالغنی النابلسیؒ لکھتے ہیں:۔ انہ حسن صحیح[3]

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ فرماتے ہیں:۔ حدیث صحیح[4]

علامہ انور شاہ کشمیری فرماتے ہیں:۔

فانہ صح عنہ صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال ان اللہ عز وجل حرم علی الارض ان تاکل اجساد الانبیاء[5]

اصول حدیث کے اعتبار سے یہ حدیث بھی بالکل صحیح ہے بلکہ امام حاکمؒ اور علامہ ذہبیؒ دونوں نے اس حدیث کو صحیح علی شرط البخاری کہا ہے اور ایک دوسرے مقام پہ دونوں نے صحیح علی شرط الشیخین کہا ہے[6]

(۴) حضرت ابو الدرداءؓ سے روایت ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک طویل حدیث میں ارشاد فرمایا:۔

فنبی اللہ حی یرزق[7]

پس اللہ تعالیٰ کا نبی زندہ ہے اس کو رزق ملتا ہے۔

حدیث شریف کی صحت محدثین عظام کے اقوال کی روشنی میں

حافظ منذریؒ فرماتے ہیں:۔ اسنادہ جید[8]

علامہ عزیزیؒ لکھتے ہیں:۔ ورجالہ ثقات[9]

---

[1] کتاب الروح [2] القول البدیع ص ۱۱۹ [3] ترجمان السنۃ جلد ۳ ص ۲۹۷ [4] مدارج النبوۃ ج ۲ ص ۴۳۰ [5] خزائن ص ۱۹ [6] مستدرک حاکم ج ۱ ص ۵۴ [7] سنن ابن ماجہ ص ۱۱۹ [8] ترجمان السنۃ ج ۳ ص ۲۹۷ [9] السراج المنیر جلد ۱ ص ۱۲۹

علامہ مناویؒ کا ارشاد ہے :- قال الدمیری رجاله ثقات [1]

علامہ زرقانیؒ فرماتے ہیں :-

رواه ابن ماجة برجال ثقات [2]

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں :- قلت رجاله ثقات [3]

اور علامہ سمہودیؒ فرماتے ہیں کہ :-

رواه ابن ماجة باسناد جيد [4]

ملا علی قاریؒ ارشاد فرماتے ہیں :-

باسناد جيد نقله ميرك عن المنذرى وله طرق كثيرة [5]

قاضی شوکانیؒ لکھتے ہیں :- باسناده جيد [6]

اور مولانا شمس الحق عظیم آبادیؒ لکھتے ہیں :- باسناده جيد [7]

(۵) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :-

ان لله ملئكته سياحين فى الارض يبلغونى من امتى السلام [8]

حدیث شریف کی صحت کے متعلق

علامہ عزیزیؒ لکھتے ہیں :- حدیث صحیح [9]

علامہ ہیثمیؒ فرماتے ہیں :-

رواه البزار ورجاله رجال الصحيح [10]

---

[1] فیض القدیر جلد ۲ ص ۸۷ [2] زرقانی شارح مواہب ص ۳۳۶ ج ۵ [3] تہذیب التہذیب ص ۲۹۸ ج ۳ [4] خلاصۃ الوفا ص ۴۸ [5] مرقات ص ۱۱۲ ج ۲ [6] نیل الاوطار جلد ۵ ص ۲۶۴ [7] عون المعبود ص ۲۰۵ ج ۱ [8] نسائی ص ۲۴۳ ج ۱ مسند احمد ص ۴۴۲ ج ۱ المصنف لابن ابی شیبہ ص ۵۱۶ ج ۲ دارمی ص ۳۱۱ موارد الظمان ص ۵۱۲ مشکوٰۃ ص ۸۶ البدایہ والنہایہ ص ۱۵۴ ج ۱ الجامع الصغیر ص ۹۳ ج ۱ خصائص الکبریٰ ص ۲۸۰ ج ۲ [9] السراج المنیر ص ۵۱۸ [10] مجمع الزوائد جلد ۹ ص ۲۴

امام حاکم اور علامہ ذہبی فرماتے ہیں۔ صحیح[1]

امام سخاوی فرماتے ہیں:۔

رواہ احمد والنسائی والدارمی وابونعیم والبیہقی والمنذری وابن حبان والحاکم فی صحیحہا وقال صحیح الاسناد۔[2]

ائمہ حدیث کے ان بیانات سے معلوم ہوا کہ یہ حدیث بھی صحیح ہے۔ بلکہ علامہ سمہودی اور علامہ ابن عبدالہادی کے بیان کے مطابق امام نسائی اور اسماعیل القاضی نے مختلف طرق سے اسانید صحیحہ کے ساتھ روایت نقل کی ہے[3]

یہاں تک شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے اس کے تواتر کا دعویٰ کیا ہے:۔

ومتواتر رسیدہ ایں معنی۔[4]

⑤ حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:۔

من صلی عند قبری سمعتہ ومن صلی علیّ من بعید اعلمتہ۔[5]

جس نے میری قبر کے پاس درود پڑھا تو میں اسے خود سنتا ہوں اور جس نے مجھ پر دُور سے درود پڑھا تو وہ مجھے (بواسطہ فرشتوں) کے بتلایا جاتا ہے۔

اس حدیث شریف کے سلسلہ میں بھی محدثین کرام کی آراء ملاحظہ ہوں۔

حافظ ابن حجر حدیث کی سند بطریق ابوالشیخ کے متعلق فرماتے ہیں:۔

بسند جید۔[6]

علامہ سخاوی فرماتے ہیں۔ وبسند جید۔[7]

حضرت ملا علی قاری فرماتے ہیں۔ بسند جید۔[8]

---

[1] مستدرک حاکم ص۴۲۱ ج۲ [2] القول البدیع ص۱۱۵ [3] وفاء الوفاء ص۱۴۰۲ [4] الصارم المنکی ص۱۶۸ [5] فتاویٰ عزیزی ص۱۶۸ ج۲ [5] جلاء الافہام للحافظ ابن القیم ص۱۹ [6] فتح الباری ص۳۵۲ ج۲ [7] القول البدیع ص۱۱۶ [8] مرقات ص۱۰ ج۲

نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ بھی لکھتے ہیں۔ اسنادہ جید۔[۱]

اور علامہ شبیر احمد عثمانیؒ بھی اس کو بسند جید فرماتے ہیں۔[۲]

ان اکابرین محدثین کے (جن میں حافظ ابن حجرؒ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں) بیان سے واضح ہوگیا کہ یہ روایت جید اور صحیح ہے — ان دونوں لفظوں (جید اور صحیح) میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ چنانچہ امام سیوطیؒ فرماتے ہیں:۔

ان ابن الصلاح یری التسویة بین الجید والصحیح۔[۳]

چونکہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی حیات میں کسی کا اختلاف نہیں ہے اور ان احادیث کثیرہ صحیحہ سے ثبوت موجود ہے (یہاں اختصار کی غرض سے چھ احادیثِ صحیحہ کے ذکر پر اکتفا کیا گیا ہے) اور امت کے ہر طبقہ میں اس کو تسلیم کیا گیا ہے)، اس لیے امام سیوطیؒ نے تواتر کا دعوے کیا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:۔

حیاة النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی قبرہ ہو وسائر الانبیاء معلومة عندنا علماً قطعیاً لما قام عندنا من الادلة فی ذٰلک وتواترت بہ الاخبار الدالة علیٰ ذٰلک۔[۴]

ایک دوسرے مقام پر تواتر کا دعوے کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

ان من جملة ماتواتر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم حیاة الانبیاء فی قبورھم۔[۵]

علامہ داؤد بن سلیمان البغدادیؒ نے بھی امام سیوطیؒ کی تائید کی ہے۔[۶]

غرض اس باب میں اس کثرت سے احادیث وارد ہیں کہ جن کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

مسئلہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور علمائے اسلام

---

[۱] دلیل الطالب ص۸۴۲ [۲] فتح الملہم ص۳۴۰ ج۱ [۳] تدریب الراوی ص۱۰۱ [۴] انباء الاذکیاء ص۲ فتاوی امام سیوطی ص۱۴۷ ج۲

[۵] النظم المتناثر من الحدیث المتواتر کذا فی شرح البوسنوی ص۹۲ [۶] المنحة الوھبیہ ص۱۱

ان احادیث صحیحہ اور دیگر دلائل شرعیہ سے علمائے امت نے جو کچھ سمجھا ہے اس مقام پر اس کا ذکر کرنا بھی ایک حد تک ضروری ہے۔ تاکہ احادیث شریفہ کے صحیح مطالب کی تعیین کے ساتھ امت کا اجماعی نظریہ بھی واضح ہو جائے ۔۔۔۔ جیساکہ جواب کے آغاز میں عرض کیا جاچکا ہے۔ کہ تمام اہلسنت والجماعت کا اجماعی عقیدہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح دیگر انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی قبروں میں بجسدہ موجود اور حیات ہیں ۔۔۔۔ اور اہل السنۃ والجماعت کلی طور پہ چار طبقوں میں منقسم ہیں۔ ۱۔ مفسرین۔ ۲۔ محدثین۔ ۳۔ متکلمین اور ۴۔ فقہاء۔ اس لیے آنے والے دلائل میں اسی ترتیب کا لحاظ رکھا گیا ہے ۔۔۔۔ لیکن مفسرین کے اقوال تقریباً ہر آیت کے بعد تفسیر کے طور پہ ذکر کر دیئے گئے ہیں۔ اب ما بقی تین طبقوں کے دلائل ملاحظہ ہوں۔

مسئلہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور محدثین عظام

حافظ ابن حجر عسقلانی ؒ فرماتے ہیں:۔

ان حیاته صلی الله علیه وسلم فی القبر لا یعقبها موت بل یستمر حیًّا و الانبیاء احیاء فی قبورهم[۱]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک میں زندگی ایسی ہے کہ جس پر موت وارد نہیں ہو گی بلکہ آپ ہمیشہ زندہ رہیں گے کیونکہ حضرات انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں۔

اس عبارت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر انبیاء علیہم السلام کی قبروں میں زندگی صریح الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔ نیز یہ بھی فرمایا کہ یہ زندگی دائمی اور مستمر ہے۔ جس پہ موت پھر طاری نہیں ہوتی۔

علامہ بدرالدین محمود بن احمد العینی الحنفی ؒ فرماتے ہیں:۔

---

[۱] فتح الباری جلد ۷، ص ۲۳

غیر الانبیاء علیہم السلام فانہم لا یموتون فی قبورھم بل ھم احیاء۔[1]

ہاں! حضرات انبیاء علیہم السلام اس سے مستثنیٰ ہیں وہ اپنی قبروں میں نہیں مرتے بلکہ وہ زندہ ہی رہتے ہیں۔

حضرت امام بیہقیؒ فرماتے ہیں:۔

ان اللہ جل ثناءہ رد الانبیاء ارواحھم فھم احیاء عند ربہم کالشہداء۔[2]

بے شک اللہ تعالیٰ نے حضرات انبیاء علیہم السلام کے ارواح اُن کی طرف لوٹا دیئے ہیں سو وہ اپنے رب کے یہاں شہیدوں کی طرح زندہ ہیں۔

حضرت ملا علی قاریؒ ارقام فرماتے ہیں:۔

المعتقد المعتمد انہ صلی اللہ علیہ وسلم حیّ فی قبرہ کسائر الانبیاء فی قبورھم وھم احیاء عند ربھم وان لارواحھم تعلقا بالعالم العلوی والسفلی کما کانوا فی الحال الدنیوی فھم بحسب القلب عرشیون وباعتبار القالب فرشیون۔[3]

قابلِ اعتماد عقیدہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قبر میں زندہ ہیں جس طرح دیگر انبیاء کرام علیہم السلام اپنی قبروں میں اور اپنے رب کے یہاں زندہ ہیں اور ان کے ارواح کا عالم علوی اور سفلی دونوں سے تعلق ہوتا ہے جیسا کہ دُنیا میں تھا۔ سو وہ قلب کے لحاظ سے عرشی اور جسم کے لحاظ سے فرشی ہیں۔

اس عبارت میں حیات انبیاء علیہم السلام کو قابلِ اعتماد عقیدہ قرار دیا گیا ہے۔

علامہ سمہودیؒ لکھتے ہیں:۔

لا شک فی حیاتہ صلی اللہ علیہ وسلم بعد وفاتہ وکذا سائر الانبیاء علیہم السلام احیاء فی قبورھم حیاۃ اکمل من حیاۃ الشہداء التی اخبر اللہ

---

[1] عمدۃ القاری جلد ۷ صفحہ ۱۴۹ [2] حیاۃ الانبیاء ص ۱۴ وفاء الوفاء جلد ۲ ص ۴۰۶ زرقانی جلد ۵ ص ۳۳۲ [3] شرح شفاء جلد ۱ ص ۱۴۲

بما فی کتابہ العزیز[1]

وفات کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں کوئی شک نہیں اور اسی طرح باقی تمام انبیاء علیہم السلام بھی اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور ان کی یہ حیات شہداء کی حیات سے (جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں کیا ہے) بڑھ کر ہے۔

دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:۔

واما ادلۃ حیاۃ الانبیاء فمقتضاھا حیاۃ الابدان کحالۃ الدنیا مع الاستغناء من الغذاء[2]

بہرکیف: حضرات انبیاء علیہم السلام کی حیات کے دلائل اس کے مقتضی ہیں کہ یہ حیات ابدان کے ساتھ ہو جیسا کہ دنیا میں بھی مگر خوراک سے مستغنی ہیں۔

یعنی ان کی حیات جہاں شہداء کی منصوص حیات سے بڑھ کر ہے وہیں محض برزخی اور روحانی ہی نہیں بلکہ جسمانی بھی ہے۔ مگر جس طرح دنیا میں اجسام عادۃً خوراک کے محتاج ہوتے ہیں قبر میں حضرات انبیاء علیہم السلام کے اجسام طیبہ کو حسّی اور دنیوی خوراک کی ضرورت نہیں بلکہ اس سے وہ مستغنی ہیں ــــ یہی بات شیخ الاسلام دہلوی فرماتے ہیں، ملاحظہ ہو:۔

ازیں احادیث معلوم شود کہ انبیاء زندہ اند در قبر بعد از وفات بحیات حسّی واجساد ایشاں نیز ثابت باشند وبوسیدہ نگردند۔ وآں حیات ہمچو حیات دُنیا باشد، باوجود استغناء از غذاء[3]

ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:۔

وقول مختار و متقرر جمہور ہم اینست کہ انبیاء بعد از ذوقت موت زندہ اند بحیات دنیوی[4]

اس عبارت میں جہاں حیات بعد الممات کو جمہور کا قول بتلایا گیا ہے وہیں حیات کی

---

[1] وفاء الوفاء جلد ۲ صـ ۴۰۵ [2] ایضاً صـ ۴۰۷ [3] تیسیر القاری جلد ۶ صـ ۱۴۷ [4] ایضاً جلد ۳ صـ ۲۲۲

کیفیت بھی متعین کر دی گئی ہے کہ وہ حیات، دنیوی حیات کی طرح ہے۔ یعنی جس طرح دنیوی حیات میں ان کو ادراک علم اور شعور حاصل ہے۔ اس طرح اس حیاتِ برزخی میں بھی یہ چیزیں حاصل ہیں۔ انہیں امور کی وجہ سے اس کو دنیوی اور جسمانی حیات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

علامہ تاج الدین السبکیؒ حضرت انسؓ کی حدیث کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

عن انسؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الانبیاء احیاءٌ فی قبورھم یصلّون فاذا ثبت ان نبینا صلی اللہ علیہ وسلم حیّ فالحیّ لابد اما ان یکون عالماً او جاھلاً۔ ولا یجوز ان یکون النبی صلی اللہ علیہ وسلم جاھلاً[1]

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرات انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور نماز پڑھتے ہیں جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں تو زندہ کے لیے لازم ہے کہ یا تو وہ عالم ہو یا جاہل۔ اور یہ بات تو ہرگز جائز نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جاہل ہوں (معاذ اللہ) تو لامحالہ آپ عالم ہوں گے۔

اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:۔

لانّ عندنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حیّ یحس ویعلم وتعرض علیہ اعمال الامّۃ ویبلغ الصلوٰۃ والسلام۔[2]

ہمارے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں حس وعلم سے موصوف ہیں اور آپ پر امت کے اعمال پیش کیے جاتے ہیں اور آپ کو صلوٰۃ وسلام پہنچائے جاتے ہیں۔

غور کیجئے حس اور علم سے موصوف ہونا حیات کے لیے کس قدر واضح دلیل ہے۔

---

[1] طبقات الشافعیۃ الکبریٰ جلد ۶ ص ۲۸۱ [2] ایضاً ص ۲۸۲

علامہ ابوالوفا علی بن محمد بن عقیل الحنبلیؒ کا ارشاد ہے:-

وھو حیّ فی قبرہ یصلّی۔[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قبر میں زندہ ہیں اور نماز پڑھتے ہیں۔

امام بدرالدین بعلی الحنبلیؒ جنہوں نے شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کے فتاوے کا اختصار کیا ہے۔ لکھتے ہیں:-

والانبیاء احیاء فی قبورھم وقد یصلّون۔[2]

حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور بسا اوقات نماز بھی پڑھتے ہیں۔

یعنی چونکہ تکلیفی زندگی تو رہی نہیں بلکہ وہ حضرات نماز تلذذ کے طور پر پڑھتے ہیں۔ اس لیے پابندی لازم نہیں۔ قد یصلّون کہہ کر اسی حقیقت کو آشکارا کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ قد مضارع پر داخل ہو کر اکثر تقلیل کا فائدہ دیتا ہے۔[3]

علامہ عزیزیؒ حدیث مامن احد یسلّم علیّ الارد اللہ علیّ روحی کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

الارد اللہ علیّ روحی، ای ردّ علیّ نطقی لانہ حیّ دائماً وروحہ لا تفارقہ لان الانبیاء احیاء فی قبورھم۔[4]

اور روح سے مراد نطق ہے۔ کیونکہ آپ دوامی طور پر زندہ ہیں۔ آپ کی روح مبارک آپ سے الگ نہیں ہوئی۔ کیونکہ حضرات انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں۔

حضرت ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں:-

---

[1] الروضۃ البہیۃ ص۱۲ [2] مختصر الفتاوی جلد ص۱۷۰ [3] رضی جلد ۲ ص۲۸۸، متن متین ص۲۸۷

[4] السراج المنیر جلد ۳ ص۲۷۸

فالجواب ان الانبیاء احیاء فی قبورھم۔[1]

پس جواب کا حاصل یہ ہے کہ حضرات انبیاء اپنی قبروں میں زندہ ہیں۔

اور علامہ احمد بن محمد الخفاجی المصری الحنفیؒ حدیث شریف سے مسئلہ حیات الانبیاء کا استنباط کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

وفیہ دلیل علی انہ صلی اللہ علیہ وسلم حی حیاۃ مستمرۃ۔[2]

اس حدیث میں اس امر کی دلیل ہے کہ پیغمبر علیہ السلام دوامی طور پر زندہ ہیں۔

مندرجہ بالا عبارات میں آپ نے دیکھ لیا کہ جمہور محدثین بیک زبان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات حسی جسمانی دائمی کے قائل ہیں۔

حیاتُ النبی صلی اللہ علیہ وسلم جمہور متکلمین کی آراء کی روشنی میں

علامہ تاج الدین السبکیؒ متکلمین اشاعرہ کا عقیدہ بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:۔

ومن عقائدنا ان الانبیاء علیھم السلام احیاء فی قبورھم۔[3]

ہمارے عقیدہ میں یہ بات داخل ہے کہ انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں۔

امام ابو القاسم عبد الکریم بن ہوازن القشیری اشاعرہ کا عقیدہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

و عندھم محمد صلواۃ اللہ علیہ حی فی قبرہ۔[4]

اشاعرہ کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قبر میں زندہ ہیں۔

ان عبارات میں صاف تصریح ہے کہ اہل سنت والجماعت کے امام ابو الحسن الاشعریؒ کے نزدیک مسلم عقیدہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قبر اطہر میں زندہ ہیں — یہاں یہ اصل بھی پیش نظر رہنی چاہیئے کہ جب علم کلام میں لفظ اشاعرہ بولا جائے تو کلام کے معنی مکتبۂ فکر اشعری اور ماتریدی مراد ہوتے ہیں۔ اب مطلب صاف ہے کہ اہلسنت والجماعت کے دونوں طبقے اشعری

---

[1] مرقات جلد ۲ صفحہ ۲۰۹ [2] نسیم الریاض جلد ۳ صفحہ ۴۹۹ [3] طبقات جلد ۶ صفحہ ۲۶۶ [4] الرسائل القشریہ صفحہ ۱۰

اور ماتریدی کا مجموعی عقیدہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قبر اطہر میں زندہ ہیں — چنانچہ امام ابو منصور طاہر الشافعی البغدادیؒ لکھتے ہیں:-

قال المتکلمون المحققون من اصحابنا ان نبینا صلی اللہ علیہ وسلم حی بعد وفاتہ یسر بطاعات امتہ۔[1]

ہمارے اصحاب کے متکلمین محققین یہ فرماتے ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی وفات کے بعد زندہ ہیں اور آپ اپنی امت کی طاعات سے خوش ہوتے ہیں۔

اصحابنا — سے متکلمین کی جماعت مراد ہو یا شوافع کی۔ بہر صورت ان میں محققین کا مسلک اور تحقیق یہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وفات کے بعد اپنی قبر میں زندہ ہیں۔

فقہائے اسلام اور مسئلہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم

فقیہ وقت علامہ حسن بن عمار بن علی الشرنبلالی الحنفیؒ لکھتے ہیں:-

ولما ھو مقرر عند المحققین انہ صلی اللہ علیہ وسلم حی یرزق متمتع بجمیع الملاذ والعبادات غیر انہ حجب عن الابصار القاصرین من شریف المقامات۔[2]

محققین کے نزدیک یہ بات طے شدہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں۔ آپ کو رزق دیا جاتا ہے اور تمام لذتوں اور عبادتوں سے متمتع ہیں۔ مگر ان نگاہوں سے اوجھل ہیں جو ان ارفع مقامات تک رسائی سے قاصر ہیں۔

اس عبارت میں محققین کا یہ مسلک بتایا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں اور رزق وعبادات سے متنفع ہیں۔ لیکن یہ رزق دنیوی اور حسی نہیں۔ بلکہ عالم غیب اور دوسرے جہاں کا ہے۔

---

[1] وفاء الوفاء جلد ۲ ص ۴۰۶ [2] نور الایضاح ص ۱۷۷ ، رسائل ابن عابدین جلد ۲ ص ۲۰۳

علامہ ابن عابدین الشامیؒ فرماتے ہیں:۔

ان الانبیاء احیاء فی قبورھم کما ورد فی الحدیث[1]

حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے۔
علامہ ابن عابدین شامیؒ جو متاخرین حنفیہ میں معتمد الکل ہیں کس طرح صراحت کے ساتھ
حدیث شریف سے استدلال کر کے حیات الانبیاء کا نظریہ پیش کر رہے ہیں۔

علمائے دیوبند اور عقیدہ حیات الانبیاء

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ تمام اہل سنت والجماعت کا قرآن و حدیث کی روشنی میں
عقیدہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح تمام دیگر انبیاء کرام علیہم السلام اپنے اجسام عنصریہ
مبارکہ کے ساتھ قبروں میں موجود اور حیات ہیں ـــــ علماء دیوبند جو خالص اہل سنت والجماعت
ہیں اور اس صدی میں اہلسنت کے سب سے بڑے ترجمان۔ اس لیے قدرتی طور پر اس بات پر
کل بزرگانِ دیوبند کا وہی عقیدہ ہے جو جمہور کا ہے ـــــ ذیل میں علمائے دیوبند کے اپنے حوالے
نقل کیے جا رہے ہیں جن سے یہ بات بخوبی ثابت ہو جاتی ہے تمام علمائے دیوبند متفقہ طور پر
حیات الانبیاء کے قائل ہیں۔ دلائل کے ذکر کرنے میں یہاں بھی وہی ترتیب قائم رہے گی جو پہلے
تھی یعنی سب سے پہلے محدثین۔ پھر متکلمین اور اس کے بعد فقہاء کے اقوال نقل کیے جائیں گے۔
ملاحظہ ہو:۔

محدثین دیوبند اور عقیدہ حیات الانبیاء

حضرت مولانا احمد علی صاحب سہارنپوریؒ محشی بخاری فرماتے ہیں:۔

والاحسن ان یقال ان حیاته صلی الله علیه وسلم لا یتعقبها موت بل یستمر

---

[1] رسائل ابن عابدین جلد ۲ صفحہ ۲۰۳

حیاً والانبیاء احیاء فی قبورھم[1]

بہتر بات یہ ہے کہ کہا جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات ایسی ہے کہ اس کے بعد موت وارد نہیں ہوتی۔ بلکہ دوامی حیات آپ کو حاصل ہے اور باقی حضرات انبیاء کرام علیہم السلام بھی اپنی قبروں میں زندہ ہیں۔

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری لکھتے ہیں:۔

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم حیٌّ فی قبرہ کما ان الانبیاء احیاء فی قبورھم[2]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قبروں میں زندہ ہیں جس طرح کہ دیگر حضراتِ انبیاء کرام علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں۔

چونکہ انبیاء کرام علیہم السلام کے اجساد مبارکہ قبروں میں بالکل محفوظ ہیں تو قبر میں حیات کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ روح مبارک کا جسم اطہر سے تعلق ہے اور اس کی بدولت حیات حاصل ہے۔

حضرت علامہ عثمانی فرماتے ہیں:۔

فدلت النصوص الصحیحۃ علی حیاۃ الانبیاء[3]

نصوص صحیحہ اس پر دلالت کرتی ہیں حضرات انبیاء علیہم السلام زندہ ہیں۔

ایک دوسرے مقام پر بھی علامہ فرماتے ہیں:۔

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم حی کما تقرر وانہ یصلّی فی قبرہ باذان واقامۃ۔[4]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں جیسا کہ اپنی جگہ یہ ثابت ہے اور آپ اپنی قبر میں اذان واقامت سے نماز پڑھتے ہیں۔

اس عبارت میں جہاں یہ تصریح ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں وہیں یہ بات بھی ثابت کی گئی ہے کہ آپ اذان واقامت سے نماز پڑھتے ہیں اور اذان واقامت سے نماز

۱۔ حاشیہ بخاری جلد ۱ ص ۵۸ ۲۔ بذل المجہود شرح ابی داؤد جلد ۲ ص ۱۱۱ ۳۔ فتح الملہم جلد ۱ ص ۲۲۵ ۴۔ ایضاً جلد ۲ ص ۱۹

پڑھنا حیات کی صریح دلیل ہے۔

حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں۔

ان کثیرًا من الاعمال قد ثبت فی القبور کالاذان والاقامة عند الدارمی وقراءة القران عند الترمذی۔[1]

قبروں میں بہت سے اعمال کا ثبوت ملتا ہے جیسے اذان و اقامت کا ثبوت دارمی کی روایت میں، اور قرأت قرآن کا ثبوت ترمذی کی روایت ہیں۔

غور کیجئے! قبر میں اذان و اقامت کا ثبوت اسی طرح قرأت قرآن کا ثبوت حیات نبوی کی کس قدر صریح دلیل ہے۔

حضرت اقدس مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں کہ آپ بنص حدیث زندہ ہیں۔[2]

حضرت اقدس مولانا ابوالعتیق عبدالہادی محمد صدیق صاحبؒ نجیب آبادیؒ لکھتے ہیں:۔

انهم اتفقوا علی حیوته صلی الله علیه وسلم بل حیاة الانبیاء علیهم السلام متفق علیها لاخلاف لاحد فیه۔[3]

محدثین کرام اس بات پر متفق ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں بلکہ تمام انبیاء علیہم السلام کی حیات متفق علیہا ہے اس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔

یہ عبارت بھی اپنے مدلول و مفہوم کے اعتبار سے بالکل واضح ہے کہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور باقی تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی حیات متفق علیہ ہے جس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

غور فرمایئے! حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانیؒ مدظلہ العالی حدیث مامن احد یسلم علیّ الا ردّ الله علیّ روحی کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:۔

علاوہ ازیں انبیاء کا اپنی قبور میں زندہ ہونا ایک مسلم حقیقت ہے۔

---

[1] فیض الباری ص ۱۸۳ ج ۱ [2] التکشف ص ۶۷۶ [3] انوار المحمود شرح ابی داؤد ص ۶۱۱ ج ۱ [4] معارف الحدیث ص ۳۷۸ ج ۵

آگے فرماتے ہیں :-

اتنی بات سب کے نزدیک مسلم اور دلائل شرعیہ سے ثابت ہے کہ انبیائے کرام علیہم السلام اور خاص کر سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی قبر میں حیات حاصل ہے۔[1]

حضرت اقدس قطب الارشاد مولانا رشید احمد گنگوہیؒ حدیث شریف ونبی اللہ حی یرزق سے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

آپ اپنی قبر شریف میں زندہ ہیں ونبی اللہ حی یرزق۔[2]

مولانا تھانویؒ فرماتے ہیں :-

پس آپ کا زندہ رہنا بھی قبر شریف میں ثابت ہوا اور یہ رزق اس عالم کے مناسب ہوتا ہے۔[3]

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ العالی حدیث ان للہ ملٰئکتہ سیاحین فی الارض یبلغونی من امتی السلام کی تشریح میں فرماتے ہیں کہ :-

اس حدیث سے یہ تفصیل معلوم ہو گئی کہ فرشتوں کے ذریعہ آپ کو صرف وہی درود وسلام پہنچتا ہے جو کوئی دور سے بھیجے لیکن اللہ تعالیٰ جن کو قبر مبارک کے پاس پہنچا دے اور وہ وہاں حاضر ہو کر صلوۃ وسلام عرض کرے تو آپ اس کو بنفس نفیس سنتے ہیں اور جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے ہر ایک کو جواب بھی عنایت فرماتے ہیں۔[4]

متکلمین دیوبند اور عقیدہ حیات الانبیاء

حضرت اقدس مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ متفقہ طور پر علمائے دیوبند کی ترجمانی کرتے ہوئے اجماعی عقیدہ بیان فرماتے ہیں :-

عندنا و عند مشائخنا حیاۃ حضرۃ الرسالۃ صلی اللہ علیہ وسلم دنیویۃ

---

[1] معارف الحدیث ص۲۷۵ ج۵ [2] ہدایۃ الشیعہ ص۳۶ [3] نشر الطیب ص۲۱۱ [4] معارف الحدیث ص۲۸۰ ج۵

من غیر تکلیف وھی مختصۃ بہ صلی اللہ علیہ وسلم وبجمیع الانبیا صلوات اللہ علیہم والشہداء لابرزخیۃ کما ھی لسائر المؤمنین بل لجمیع الناس کما نص علیہ العلامۃ السیوطی فی رسالۃ انباہ الاذکیاء بحیوۃ الانبیاء حیث قال: قال الشیخ تقی الدین سبکی حیوۃ الانبیاء والشہداء فی القبر کحیوتھم فی الدنیا ویشہد لہ صلوۃ موسیٰ علیہ السلام فی قبرہ فان الصلوۃ تستدعی جسداً حیاً الیٰ اٰخرما قال فثبت بھذا ان حیوتہ دنیویۃ برزخیۃ لکونہا فی عالم البرزخ[1]

ہمارے اور ہمارے مشائخ کے نزدیک حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قبر مبارک میں زندہ ہیں اور آپ کی حیات دنیا کی سی ہے بلا مکلف ہونے کے اور یہ حیات مخصوص ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام انبیاء علیہم السلام اور شہداء کے ساتھ برزخی نہیں ہے جو حاصل ہے تمام مسلمانوں بلکہ سب آدمیوں کو چنانچہ علامہ سیوطی رح نے اپنے رسالہ انباہ الاذکیاء بحیوۃ الانبیاء میں بتصریح لکھا ہے فرماتے ہیں کہ علامہ تقی الدین سبکی رح نے فرمایا ہے کہ انبیاء علیہم السلام وشہداء کی قبر میں حیات ایسی ہے کہ جیسی دنیا میں تھی اور موسیٰ علیہ السلام کا اپنی قبر میں نماز پڑھنا اس کی دلیل ہے کیونکہ نماز زندہ جسم کو چاہتی ہے الخ پس اس سے ثابت ہوا کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات دنیوی ہے اور اس معنی کو برزخی بھی کہ عالم برزخ میں حاصل ہے۔

یہ عبارت رسالہ المہند علی المفند سے ماخوذ ہے۔ یہ رسالہ علمائے حرمین شریفین زادھما اللہ شرفاً کے ان چھبیس ۲۶ اعتقادی سوالات کے جوابات پر مشتمل ہے جو اتفاقی اور اجماعی عقیدے کہلاتے ہیں۔ جسے سرخیل علماء محدث کبیر حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری رح نے مرتب کیا۔

---

[1] المہند علی المفند ص۱۳، ص۱۴

اور جس پر اپنی جماعت دیوبند کے تیئس ۲۳ بزرگوں (جن میں خصوصیت سے حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب صدر مدرس و شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا میر احمد حسن صاحب امروہی حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب صدر مفتی دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب دیوبندی، حضرت مولانا غلام رسول صاحب ہزاروی، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی وغیرہم قابلِ ذکر ہیں) کی تصدیقات لکھوا کر علماء حرمین شریفین اور دیگر ممالکِ اسلامیہ کو بھیجیں۔ وہ حضرات ان کے تسلی بخش جوابات دیکھ کر مطمئن ہو گئے ـــــ اس طرح یہ رسالہ المہند یہ جواب علمائے دیوبند کا اجماعی جواب ہے۔ اس اجماعی اور مرکزی جواب کے بعد مزید کچھ لکھنے یا کہنے کی مطلقاً ضرورت باقی نہیں رہتی۔ تاہم مزید چند حوالے اطمینانِ خاطر کے لیے ملاحظہ ہوں۔

حضرت الامام مولانا محمد قاسم نانوتوی ؒ فرماتے ہیں :-

حضرات انبیاء زندہ ہیں ان کی موت ان کے حیات کے لیے ساتر ہے رافع حیات اور دافعِ حیات نہیں ہے[1]

واضح رہے کہ حضرت نانوتوی ؒ نفسِ موت کو اعتقادِ لازم اور ضروری سمجھتے ہیں، چنانچہ حضرت فرماتے ہیں :-

میں انبیاء کرام کو انہی اجسامِ دنیوی کے تعلق کے اعتبار سے زندہ سمجھتا ہوں۔ پر حسب ہدایت کل نفس ذائقة الموت اور انك ميت وانهم ميتون۔ تمام انبیاء کرام کی نسبت موت کا اعتقاد بھی ضروری ہے اور اس ظاہری موت کی وجہ سے حضراتِ انبیاء کرام کا قبروں میں مستور ہو جانا بمنزلہ چلّہ کشی یا پردہ نشینی یا گوشہ نشینی سمجھا جائے گا ـــ لیکن انبیاء کرام کی زندگی زیرِ پردۂ موت ظاہر بینوں کی نظر سے مستور ہے ـــ بمثل امت کے ان کی موت میں زوال نہیں ہے۔[2]

---

[1] آبِ حیات ص۴۲، ص۱۳۴ بحوالہ سیرت المصطفےٰ [2] لطائف قاسمی ص۳، ۴

اور دلیل پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

(۱) اور دلیل یہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے اجسام مبارکہ کا حسب سابق صحیح وسالم رہنا اور تغیر ارضی سے بالکل محفوظ رہنا۔

(۲) اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ان کی ازواج مطہرات کے نکاح کا حرام ہونا۔

(۳) اور ان کے اموال میں میراث کا جاری نہ ہونا۔

امور ثلاثہ میں سے ہر امر حیات انبیاء کرام پر شاہد عدل ہے اور اس امر کی صریح دلیل ہے کہ ارواح طیبہ کا اجسام مبارکہ سے تعلق منقطع نہیں ہوتا بلکہ موت کے بعد بھی انبیاء کرام کا اپنے بدن سے اسی قسم کا تعلق ہے جس قسم کا پہلے تھا۔[۱]

شیخ الاسلام مولانا السید حسین احمد مدنیؒ حیات کی نوعیت متعین کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

آپ کی حیات نہ صرف روحانی ہے جو کہ عام شہداء کو حاصل ہے بلکہ جسمانی بھی اور از قبیل حیات دنیوی بلکہ بہت سے وجوہ سے اس سے قوی تر۔[۲]

حضرت مدنیؒ کی مراد بظاہر حیاتِ جسمانی اور دنیوی سے یہ ہے کہ آپ کی روح مبارک کا تعلق جسدِ مثالی سے قائم نہیں ہوتا جیسا کہ بعض صوفیائے کرام کا نظریہ ہے، بلکہ روح کا تعلق دنیوی جسم سے قائم ہوتا ہے اور بایں معنی یہ حیات جسمانی اور دُنیوی ہے، چنانچہ حضرت الامام مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ نے ایک مقام پر صاف لفظوں میں اس کی تصریح فرمائی ہے:۔

انبیائے کرام علیہم السلام کو ابدانِ دُنیا کے حساب سے زندہ سمجھیں گے۔[۳]

فقہائے دیوبند اور حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ فرماتے ہیں:۔

آپ اپنی قبر شریف میں زندہ ہیں۔ ونبی اللہ حیّ یرزق۔[۴]

---

[۱] آبِ حیات، ص۱۳۴ [۲] مکتوبات شیخ الاسلام جلد۱ ص۱۳۰ [۳] لطائف قاسمیہ ص۳ [۴] ہدایۃ الشیعہ ص۳۶

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ فرماتے ہیں:۔

پس آپ کا زندہ رہنا بھی قبر شریف میں ثابت ہوا اور یہ رزق اس عالم کے مناسب ہوتا ہے۔[1]

حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحبؒ لکھتے ہیں:۔

اور انبیائے کرام علیہم السلام کی حیات خصوصاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات شہداء کی حیات سے افضل و اعلیٰ ہے اور بحث اس کی طویل ہے۔[2]

حضرت مولانا مفتی سید مہدی حسن صاحب پاکستان ہی کے ایک استفتاء میں فرماتے ہیں:۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مزار مبارک میں بجسدہٖ موجود اور حیات ہیں۔[3]

حیات انبیاء کرام علیہم السلام اور اصحابِ ظواہر

اس سے قبل جتنے حوالے نقل کیے گئے ہیں وہ ان حضرات کے ہیں جو فروعی مسائل میں کسی نہ کسی امام کے مقلد تھے۔ کوئی حنبلی تھا، کوئی مالکی اور کوئی شافعی تھا تو کوئی حنفی۔ بجز قاضی شوکانیؒ اور نواب صدیق حسن خاں کہ وہ کسی کی تقلید نہیں کرتے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اتمام حجت کے لیے ہم اس مقام پر اصحابِ ظواہر حضرات کے کچھ حوالے بھی نقل کر دیں۔ تاکہ حیاتِ انبیاء کرام کی حقیقت بلا تامل روشن ہو جائے اور اجماعِ امت کا دعوے بھی صاف ہو جائے۔

قاضی شوکانیؒ لکھتے ہیں:۔

وقد ذهب جماعة من المحققين الى ان رسول الله صلى الله عليه وسلم حي بعد وفاته وانه يسر بطاعات امته وان الانبياء لايبلون مع ان مطلق الادراك كالعلم والسماع ثابت لسائر الموتى (الى ان قال) وورد النص في كتاب الله في حق الشهداء انهم احياء يرزقون وان الحيوة فيهم متعلقة

---

[1] نشر الطیب صفحہ ۲۱۱ [2] فتاویٰ دار العلوم مکمل و مدلل جلد ۵ صفحہ ۱۴۷ [3] فتاویٰ دار العلوم غیر مطبوعہ

بالجسد فكيف بالانبياء والمرسلين وقد ثبت في الحديث ان الانبياء احياء في قبورهم رواه المنذري وصححه البيهقي وفي صحيح مسلم عن النبي صلى الله عليه وسلم قال مررت بموسى ليلة اسري بي عند الكثيب الاحمر وهو قائم يصلي ؎۱

بے شک محققین کی ایک جماعت اس طرف گئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی وفات کے بعد زندہ ہیں اور اپنی امت کی طاعات سے خوش ہوتے ہیں اور یہ کہ انبیاء کرام کے اجسام بوسیدہ نہیں ہوتے۔ حالانکہ مطلق ادراک جیسے علم اور سماع وغیرہ تو یہ سب مردوں کے ثابت ہے (پھر آگے فرمایا کہ) اور اللہ تعالیٰ کی کتاب میں شہداء کے بارے میں نص وارد ہوئی ہے کہ وہ زندہ ہیں اور ان کو رزق ملتا ہے اور ان کی حیات جسم سے متعلق ہے تو حضرات انبیاء اور مرسلین کی حیات جسم سے کیوں متعلق نہ ہوگی۔ اور حدیث سے یہ بھی ثابت ہے کہ انبیاء اپنی قبروں میں زندہ ہیں۔ امام منذری نے اس کو روایت کیا اور امام بیہقی نے اس کی تصحیح کی ہے۔ اور صحیح مسلم میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے معراج کی رات سُرخ رنگ کے ٹیلے کے پاس موسےٰ علیہ السلام کو قبر میں کھڑے ہو کر نماز پڑھتے دیکھا ہے۔

قاضی شوکانیؒ کی اس عبارت سے معلوم ہوا کہ وہ شہداء کی حیاتِ جسمانی کو تسلیم کرتے ہیں اور یہ بھی فرماتے ہیں کہ حضراتِ انبیاء کی زندگی بطریق اولیٰ جسمانی ہے اور یہ بھی تصریح فرماتے ہیں کہ حضراتِ انبیاء کرام کی وفات تو ہوتی ہے لیکن وہ اس کے بعد اپنی قبروں میں زندہ ہوتے ہیں ایک دوسری جگہ پر فرماتے ہیں :-

انه صلى الله عليه وسلم حي في قبره بعد موته كما في حديث الانبياء

؎۱ نیل الاوطار جلد ۳ صفحہ ۲۶۴

احیاء فی قبورھم[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وفات کے بعد اپنی قبر مبارک میں زندہ ہیں، جیساکہ حدیث میں آیا کہ انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں۔

استاد ابو منصور البغدادیؒ فرماتے ہیں:۔

قال المتکلمون المحققون من اصحابنا ان نبینا صلی اللہ علیہ وسلم حیّ بعد وفاتہ ویؤید ذلک ماثبت ان الشہداء احیاء یرزقون فی قبورھم والنبی صلی اللہ علیہ وسلم منہم[2]

ہمارے اصحاب میں متکلمین محققین کا ارشاد ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وفات کے بعد زندہ ہیں اور اس کی تائید یہ بات بھی کرتی ہے کہ شہداء زندہ ہیں اور قبروں میں ان کو رزق دیا جاتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی زندہ ہیں۔

شیخ عبداللہ بن محمد بن عبدالوہاب نجدیؒ اپنا عقیدہ یوں بیان فرماتے ہیں:۔

والذی نعتقد ان رتبۃ نبینا صلی اللہ علیہ وسلم اعلی مراتب المخلوقین علی الاطلاق وانہ حیّ فی قبرہ حیوۃ مستقرۃ ابلغ من حیات الشہداء المنصوص علیہا فی التنزیل اذھو افضل منہم بلا ریب وانہ یسمع من یسلم علیہ[3]

جس چیز کا ہم اعتقاد کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا درجہ مطلقاً ساری مخلوق سے بڑھ کر ہے اور آپ اپنی قبر میں حیاتِ دائمی سے متصف ہیں جو شہداء کی حیات سے اعلیٰ اور ارفع ہے جس کا ثبوت قرآن کریم سے ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہ شہداء سے افضل ہیں اور جو شخص آپ پر (عند القبر) سلام کہتا ہے آپ اس کو سنتے ہیں۔

---

[1] نیل الاوطار جلد ۵ ص۱۰۱ [2] ایضاً [3] اتحاف النبلاء ص۴۱۵

اس عبارت سے آفتاب نیمروز کی طرح یہ بات ثابت ہوگئی کہ علمائے نجد کا بھی یہی نظریہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قبر میں دائمی طور پہ زندہ ہیں اور آپ کی یہ حیات شہداء کی منصوص حیات سے اعلیٰ و ارفع ہے۔ علمائے نجد جو لوگوں میں وہابی کے نام سے مشہور ہیں اپنے عقیدہ کے اختیار کرنے میں اپنے بزرگوں کے اعتقاد پہ کلی اعتماد کرتے ہیں:۔

اما الکلام علیٰ حیٰوۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فاعتقادنا فی ذٰلک اعتقاد سلف الامۃ وائمتنا وھم الاسوۃ[1]

بہر حال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات کے بارے میں ہمارا وہی اعتقاد ہے جو سلف امت اور ہمارے ائمہ کا اعتقاد ہے اور وہی اس میں ہمارے مقتداء ہیں۔

متاخرین اصحابِ ظواہر حضرات کے شیخ الکل مولانا سید نذیر حسین صاحب دہلویؒ لکھتے ہیں:۔

اور حضرات انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی قبر میں زندہ ہیں۔ خصوصاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کہ فرماتے ہیں کہ جو کوئی عند القبر درود بھیجتا ہے میں سنتا ہوں اور دُور سے پہنچایا جاتا ہوں[2]

اور مولانا شمس الحق صاحب عظیم آبادی لکھتے ہیں:۔

ان الانبیاء احیاء فی قبورھم[3]

حضرات انبیائے کرام اپنی اپنی قبروں میں زندہ ہیں۔

ذمہ دار اصحابِ ظواہر بھی جملہ اہل الرائے حضرات کے ساتھ اس امر پہ متفق کہ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام وفات کے بعد اپنی قبور اور برزخ میں زندہ ہیں اور اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔ اور امام بیہقیؒ وغیرہ نے اس مسئلہ پر صرف باب ہی قائم نہیں کیا بلکہ مستقل رسالہ اور کتاب لکھ کر اس کو اُجاگر کیا ہے۔ اسی طرح دیگر کتب حدیث، شروح حدیث اور کتبِ فقہ و سیر

---

[1] الدرر السنیہ فی اجوبۃ النجدیہ جلد ۱ ص ۲۶ [2] فتاویٰ نذیریہ جلد ۲ ص ۵۵ ضمیمہ [3] عون المعبود جلد ۱ ص ۴۰۶

میں اس مسئلہ پر خاصا مواد اور دلائل موجود ہیں جن سے انصاف و دیانت کی دنیا میں علمی طور پر اغماض و اعراض نہیں کیا جا سکتا۔

اجماعِ امت اور حیات الانبیاء

"علماء امت اور حیات الانبیاء" کے عنوان کے تحت آپ نے تفصیل سے دیکھ لیا کہ اجماع پر خاصی روشنی پڑ چکی ہے۔ بلکہ سطر سطر سے اجماع کا ثبوت ہو چکا ہے۔ تاہم مزید اطمینانِ قلب کی خاطر اجماع سے متعلق چند صریح حوالے نقل کیے جا رہے ہیں۔

امام شمس الدین محمد بن عبد الرحمٰن السخاویؒ لکھتے ہیں کہ :-

نحن نؤمن ونصدق بانه صلی اللہ علیہ وسلم حی یرزق فی قبرہ وان جسدہ الشریف لا تاکلہ الارض والاجماع علی ھذا۔[1]

ہم اس پر ایمان لاتے ہیں اور اس کی تصدیق کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قبر میں زندہ ہیں اور آپ کو رزق ملتا ہے اور آپ کے جسدِ اطہر کو زمین نہیں کھا سکتی اور اس پر اجماع منعقد ہے۔

اس ارشاد سے معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قبر مبارک میں زندہ ہونا اور آپ کو رزق ملنا اور جسدِ اطہر کا محفوظ رہنا اجماعِ امت سے ثابت ہے۔ اگر بالفرض قرآن و حدیث سے اس کا کوئی ثبوت نہ بھی ہوتا تب بھی امتِ مسلمہ کا اجماع شرعی دلائل میں ایک مذہبی دلیل ہے۔

علامہ محمد عابد سندھیؒ لکھتے ہیں :-

اما ھو فحیاتھم لا شک فیھا ولا خلاف لاحد من العلماء فی ذلک الیٰ ان قال ومنھم صلی اللہ علیہ وسلم حی علی الدوام۔[2]

بہرحال حضرات انبیاء علیہم السلام کی حیات میں کوئی شک نہیں اور علماء میں سے

---

[1] القول البدیع ص۱۲۵ [2] رسالہ مدینہ ص۱۲

کسی کا اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے (پھر آگے فرمایا) پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دوامی طور پر زندہ ہیں۔

کسی کا کوئی اختلاف نہ ہونا یہی اجماعِ سکوتی ہے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ فرماتے ہیں:۔

حیات متفق علیہ است ہیچ کس را دروے خلاف نیست۔[1]

شیخ محدث دہلویؒ ایک وسیع النظر عالم ہونے کے باوجود کس وضاحت سے اجماع کا دعوے کر رہے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

نواب قطب الدین خاں صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:۔

زندہ ہیں انبیاء علیہم السلام قبروں میں، یہ مسئلہ متفق علیہ ہے کسی کو اس میں خلاف نہیں کہ حیات ان کو وہاں حقیقی جسمانی اور دنیا کی سی ہے۔[2]

نواب صاحب دنیا کی سی کا جملہ بول کر یہ حقیقت بتلانا چاہتے ہیں کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی یہ حیات من کل الوجوہ دنیوی نہیں ہے کہ حسی کھانے پینے کی حاجت ہو۔ بلکہ بعض وجوہ سے دنیوی ہے۔ مثلاً ادراک علم اور شعور وغیرہ میں۔

علامہ داؤد بن سلیمان البغدادیؒ لکھتے ہیں:۔

والحاصل ان حیاۃ الانبیاء ثابتۃ بالاجماع۔[3]

حاصل یہ ہے کہ انبیاء کرام کی حیات بالاجماع ثابت ہے۔

بزرگانِ دیوبند کا اقرارِ اجماع برحیات الانبیاء

مولانا ابوالعتیق عبدالہادی صاحبؒ نجیب آبادی لکھتے ہیں:۔

انهم اتفقوا علی حیوته صلی اللہ علیہ وسلم بل حیاۃ الانبیاء علیهم السلام

---

[1] اشعۃ اللمعات جلد ۱ صفحہ ۶۱۳ [2] مظاہر حق جلد ۱ صفحہ ۴۴۵ [3] المنحۃ الوھبیہ صفحہ ۶

متفق علیہا لا اختلاف لاحد فیہ[1]

محدثین کرام اس بات پر متفق ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں بلکہ تمام حضرات انبیاء کرام کی حیات متفق علیہا ہے اس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔

حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ فرماتے ہیں کہ :-

تمام اہل سنت والجماعت کا اجماعی عقیدہ ہے کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام وفات کے بعد اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور نماز و عبادات میں مشغول ہیں۔ اور حضرات انبیاء کرام کی یہ برزخی حیات اگرچہ ہم کو محسوس نہیں ہوتی لیکن بلاشبہ یہ حیات حسی اور جسمانی ہے۔ اس لیے کہ روحانی اور معنوی حیات تو عامہ مومنین بلکہ ارواحِ کفار کو بھی حاصل ہے۔[2]

اصحابِ ظواہر حضرات اور اجماعی حیات الانبیاء علیہم السلام

مشہور ظاہری عالم مولانا محمد اسماعیل صاحب سلفیؒ لکھتے ہیں :-

اہلسنت کے دونوں مکاتب فکر اصحاب الرائے اور اہل حدیث کا اس امر پر اتفاق ہے کہ شہداء اور انبیاء زندہ ہیں برزخ میں۔ (آگے فرماتے ہیں) انبیاء کی زندگی کے متعلق سنت میں شواہد ملتے ہیں۔ صحیح احادیث میں انبیاء کے متعلق عبادات وغیرہ کا ذکر آتا ہے۔[3]

قیاس صحیح اور حیات الانبیاء

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ الباری فرماتے ہیں :-

واذا ثبت انهم احياء من حيث النقل فانه يقويه من حيث النظر

---

[1] انوار المحمود شرح ابوداؤد جلد ۱ صفحہ ۶۱۱ [2] حیات نبوی [3] حیات النبی صفحہ ۲۷

کون الشہداء احیاء بنص القرآن والانبیاء افضل من الشہداء۔[1]

اور جب نقل کے لحاظ سے ان کا زندہ ہونا ثابت ہے تو دلیل عقلی اور قیاس بھی اس کی تائید کرتا ہے۔ وہ یہ کہ شہداء نص قرآنی کی رو سے زندہ ہیں اور حضرات انبیاء کرام اور شہداء سے اعلیٰ اور افضل ہیں (اس لیے بطریق اولیٰ ان کو حیات حاصل ہوگی)۔

غور فرمایئے ــــ جب شہداء کی زندگی نصِ قرآن سے ثابت ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں تو حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ حدیث انسؓ کی رُو سے تو حضرات انبیاء کرام کی حیات ثابت ہی ہے عقلی اور نظری طور پر دلالت النص سے بھی حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی حیات ثابت ہے۔ اس لیے کہ وہ شہداء سے افضل ہیں تو لامحالہ ان کی حیات بھی شہداء سے افضل اور برتر ہوگی۔ لہٰذا نقل و عقل سے حضراتِ انبیاء کرام کی حیات ثابت ہے۔

سوال ۲ :- جو لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ سردار دو عالم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قبر شریف میں محض بے جان اور مردہ ہیں اور آپ کی دُنیا کی سی زندگی کا انکار کرتے ہیں یہ کس فرقہ کا عقیدہ ہے۔ نام متعین فرمائیں :-

جواب : تاریخ اسلام میں سب سے پہلے حجاج بن یوسف نے اس عقیدہ کا انکار کیا ہے۔ چنانچہ امام ابوالقاسم عبدالکریم بن ہوازن المعروف بہ علامہ قشیریؒ فرماتے ہیں کہ :-

ان امور سے جن کی بناء پر فقہاء نے حجاج بن یوسف پہ کفر کا فتوےٰ دیا تھا۔ اس کا ایک بڑا جُرم یہ تھا کہ حجاج جب مدینہ آیا اور زائرین حرم اطہر کو دیکھا کہ وہ پروانہ وار روضۂ اطہر کے ارد گرد جمع ہو رہے ہیں تو اس نے کہا کہ تم لوگ لکڑیوں اور گلی سڑی ہڈیوں کا طواف کر رہے ہو۔ اس پر علماء نے ان پر کُفر کا فتوےٰ لگا دیا۔[2]

---

[1] فتح الباری جلد ۶ ص ۳۷۹ [2] بحوالہ رحمتِ کائنات ص ۵

اسی طرح فرقہ متقشفہ کا عقیدہ ہے کہ تمام انبیاء کرام کو بشمول جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم موت کے بعد نبوت سے معزول کر دیا جاتا ہے۔ نعوذ باللہ۔ یہ عقیدہ درحقیقت اس بات کا انکار ہے کہ نبی علیہ السلام کو موت ظاہری کے بعد حیات دائمی حاصل ہے ـــــ اسی طرح فرقہ کرامیہ بعض معتزلہ اور رافضیہ کا بھی عقیدہ عدم حیات کا ہے۔

سوال ۱۳: حیات النبیؐ کا عقیدہ رکھنے والے کی نماز منکر حیات النبیؐ کے پیچھے کیا حکم رکھتی ہے؟

جواب: بلا تاویل حیات النبیؐ کا منکر بدعتی ہے اور اس کے پیچھے نماز مکروہ ہے علامہ حصکفیؒ فرماتے ہیں:-

(ویکرہ امامۃ) مبتدع ای صاحب بدعۃ۔[1]

قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ فرماتے ہیں:-

بدعتی کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ تحریمہ ہے[2]

سوال ۱۴: حجاج کرام کا سردار دو عالم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ شریف کی زیارت کے لیے نہ جانا اس عقیدہ کی بنا پر کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صلوٰۃ وسلام نہیں سنتے کیا حکم رکھتا ہے؟

جواب: پہلے سوال کے جواب میں آفتاب نیمروز کی طرح ثابت ہو چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قبر شریف میں زندہ ہیں اور قبر اطہر کے قریب پڑھا جانے والا درود شریف سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم خود بلا واسطہ سُنتے ہیں۔ اس لیے اسلام کے چودہ سو سالہ دور میں مسلمانوں کا عمل اسی عقیدہ پر رہا ہے کہ جس نے حج کیا اس نے مدینہ منورہ کی زیارت ضرور کی تاکہ سید دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں صلوٰۃ وسلام کا تحفہ پیش کر سکے۔ مسلمانوں کا یہ عمل احادیث کثیرہ اور اجماع امت سے ثابت ہے۔

---

[1] الدر المختار جلد ۱ صفحہ ۸۳ [2] فتاوے رشیدیہ جلد ۲ صفحہ ۱۱۸

زیارتِ روضۂ اطہر احادیث شریفہ کی روشنی میں

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

من زار قبری وجبت له شفاعتی[1]

جس نے میری قبر کی زیارت کی تو بلاشبہ اس کے لیے میری شفاعت لازم ہو گئی۔

ایک دوسری روایت میں ہے:۔

من زار بعد مماتی فکانما زارنی فی حیاتی[2]

جس نے میری موت کے بعد میری زیارت کی تو گویا اس نے میری زندگی ہی میں زیارت کر لی۔

غور فرمایئے! کس قدر مبالغہ کے ساتھ زیارت کی ترغیب دی جا رہی ہے — وعد کے بعد وعید کی روایتیں بھی ملاحظہ فرمائیں — آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:۔

من حجّ البیت ولم یزرنی فقد جفانی[3]

جس نے بیت اللہ کا حج کیا اور میری زیارت نہ کی تو اس نے بلاشبہ میرے ساتھ زیادتی کی۔

انہی وعد و وعید کی روایات کی بنا پر پوری امت نے یہ سمجھا کہ روضہ اقدس کی زیارت گو اعتقادی اعتبار سے سنت سہی، تاہم عملی اعتبار سے واجب کے قریب ہے، چنانچہ محقق علی الاطلاق شیخ ابن الہمامؒ فرماتے ہیں:۔

ان زیارة قبر النبی صلی الله علیه وسلم مستحبة وقریبة من الواجب نظرًا الی هذا النزاع وهو الحق عندی فان الاف الالوف من السلف کانوا

---

[1] صحیح ابن خزیمہ۔ دار قطنی بیہقی باسناد حسن بحوالہ آثار السنن ص۱۲۶ [2] طحطاوی علی المراقی الفلاح ص۴۰۵ [3] ایضاً فصل فی زیارت النبی صلی اللہ علیہ وسلم (ابن عدی بسند حسن مرقات المفاتیح)

يشدون رحالهم لزيارة النبي صلى الله عليه وسلم ويزعمونها من اعظم القربات۔[1]

علامہ ابن عابدین شامیؒ فرماتے ہیں:۔

انها قريبة من الوجوب لمن له سعة۔[2]

مخدوم محمد ہاشم سندھیؒ فرماتے ہیں:۔

تصریح کردہ است در بعض کتب بوجوب آں بدلیل قوی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم من حج ولم یزرنی فقد جفانی رواه ابن عدی بسند جید حسن. ونیز مروی است از آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کہ فرمود من زار قبری وجبت له شفاعتی رواه الدار قطني والطبراني والبزار وصححه عبد الحق. ونیز فرمود او صلی اللہ علیہ وسلم من زار قبری بعد موتی کمن زارنی فی حیاتی رواه ابو سعيد بن منصور والدار قطني. ووارد شده اند در فضل زیارت احادیث و آثار بسیار کہ اکتفا کردہ مے شود از آنہا بریں مقدار طلباً للاختصار۔[3]

اجماعِ امت اور زیارتِ روضہ اقدس

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ زیارتِ نبوی جہاں احادیث کثیرہ صحیحہ سے ثابت ہے وہیں بغیر کسی اختلاف کے تعامل امت کے ساتھ اجماعِ امت سے بھی یہی ثابت ہے۔ چنانچہ مخدوم ہاشم سندھی فرماتے ہیں:۔

بدانکہ اجماع کردہ اند مسلماناں برآنکہ زیارت حضرت پیغمبر علیہ السلام از اعظم قربات وافضل طاعات واکد سنن ومندوبات است۔[4]

---

[1] بحوالہ مذکورہ بالا [2] فیض الباری جلد ۲ ص ۴۳۳ [3] شامی جلد ۱ ص ۲۰۹ [4] حیات القلوب ص ۲۹۸ [5] ایضاً

حضرت اقدس مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ فرماتے ہیں:۔

اعلم ان زیارۃ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم باجماع المسلمین من غیر عبرۃ بماذکرہ بعض المخالفین من اعظم القربات وافضل الطاعات وانجح المساعی لنیل الدرجات قریبۃ من درجۃ الواجبات بل قیل انہا من الواجبات لمن لہ سعۃ وترکہا غفلۃ عظیمۃ وجفوۃ کبیرۃ وفیہ اشارۃ الی حدیث استدل بہ علی الزیارۃ وقولہ صلی اللہ علیہ وسلم من حج ولم یزرنی فقد جفانی رواہ ابن عدی بسند جید قال بعض المالکیۃ بان المشی الی المدینۃ افضل من الکعبۃ وبیت المقدس[1]

اس عبارت میں جہاں یہ تصریح ہے کہ زیارتِ نبویؐ اجماعِ امت سے ثابت ہے وہاں یہ بات بھی واضح ہے کہ بعض کے اختلاف سے اجماع متاثر نہیں ہوگا۔ نیز درجہ کی تعیین کے ساتھ ترکِ زیارت کو عظیم غفلت اور بڑی زیادتی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اعاذنا اللہ منہ ـــ یہ بھی بتلایا گیا کہ بعض مالکیہ کے نزدیک مدینہ جانا کعبہ اور بیت المقدس جانے سے بھی بہتر ہے ـــ ہمارے فقہائے احناف نے یہ تفصیل کی ہے کہ اگر فرض حج کے لیے گیا ہے تو پہلے حج کرے (بعد میں زیارت کرے) اور اگر حج فرض نہیں ہے تو پھر اختیار ہے خواہ پہلے زیارت کرے اور بعد میں حج کرے یا پہلے حج کرے اور بعد میں زیارت کرے:۔

قالوا۔ ان کان الحج فرضاً قدمہ علیہا والا تخیر۔[2]

پھر مدینہ جانے میں بھی بہتر یہ ہے کہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی نیت کرے:۔

والاولی فی الزیارۃ تجرید النیۃ لزیارۃ قبرہ صلی اللہ علیہ وسلم۔[3]

الحاصل ـــ مسلمانوں کا یہ عمل امتِ محمدیہ کا عظیم اجماع ہے۔ جس پر دورِ صحابہؓ سے لے کر

---

[1] بذل المجہود جلد ۳ صفحہ ۲۰ [2] طحطاوی علی المراقی الفلاح صفحہ ۴۰۵ [3] ایضاً

آج تک اس پر عمل ہو رہا ہے۔

اتفق مالک والشافعی وابوحنیفة واحمد علی ان زیارة قبر النبی صلی اللہ علیہ وسلم من افضل المندوبات۔[1]

لہٰذا اس نظریہ کی بنیاد پر کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہیں سنتے —— روضۂ اطہر کی زیارت کے لیے نہ جانا جہاں ان احادیث صحیحہ کا —— جن میں سماع النبی عند القبر اور زیارتِ نبوی کی تصریح ہے —— انکار ہے اور اجماعِ امت سے انحراف جس کی امانت و دیانت کی دنیا میں قطعاً قطعاً گنجائش نہیں ہے —— اعاذنا اللہ منہ —— وہیں سخت محرومی اور حرمان نصیبی بھی ہے۔ چنانچہ بذل المجہود کی عبارت گذر چکی ہے۔

علامہ سندھیؒ فرماتے ہیں:-

وترک کردن زیارت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مع الامکان غفلتے است عظیمہ وشناعتی قبیحہ[2]

اس لیے گنجائش کے باوجود زیارت کے لیے نہ جانا موجبِ وعید شدید ہے۔

سوال ۵: منکرین حیات الانبیاء علیہم السلام فی القبور قائلین حیات الانبیاء فی القبور کو دجال وکذاب ومشرک کہتے ہیں۔ آیا یہ منکرین حیات الانبیاء فی القبور دیوبندی کہلانے کے مستحق ہیں؟

جواب: منکرینِ حیات الانبیاء دیوبندی تو کجا بعض علماء نے تو ان کو اہلسنت والجماعۃ سے بھی خارج قرار دیا ہے۔ ملاحظہ ہو:-

حضرت مفتی سید مہدی حسن صاحب سابق صدر مفتی دار العلوم دیوبند ایسے شخص کو اہل سنت والجماعت سے بھی خارج قرار دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں —— اس باب (حیات الانبیاء) میں بکثرت احادیث وارد ہیں جن کا انکار نہیں کیا جا سکتا ہے اور جو شخص اس کا انکار کرتا ہے وہ بدعتی اور اہلسنت والجماعت سے خارج ہے۔[3]

---

[1] حاشیہ مکتوبات شیخ الاسلامؒ جلد ا صفحہ ۱۲۹ [2] حیات القلوب صفحہ ۲۹۸ [3] فتاویٰ دار العلوم دیوبند غیر مطبوعہ

اس فتوے پر حضرت مولانا مفتی جمیل احمد صاحب تھانوی مفتی جامعہ اشرفیہ لاہور، حضرت مولانا مفتی محمد ضیاء الحق صاحب صدر مدرس جامعہ اشرفیہ لاہور اور استاذ الکل حضرت مولانا محمد رسول خاں صاحب ہزاروی کے بھی دستخط ہیں۔ پھر طرفہ یہ ہے کہ خود ایسے لوگ (منکرین حیاۃ الانبیاء) دوسرے صحیح العقیدہ مسلمانوں کو خصوصاً مسلمانوں کو کافر، مشرک اور دجال کہیں، یہ ایک حیرت انگیز بات ہے۔ ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیئے

سوال ۱۶: منکرین ثواب و عذاب قبر کا شرعی حکم کیا ہے؟

جواب: جملہ اہلسنت والجماعت اس عقیدہ پر متفق ہیں کہ قبر (برزخ) میں اہل ایمان اور اصحاب طاعات کو لذت و سرور نصیب ہوتا ہے اور کفار و منافقین کو نیز گناہگاروں کو عذاب اور تکلیف ہوتی ہے۔ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ قرآن و سنت اور اجماع امت کے صریح دلائل کے پیش نظر یہ عقیدہ اتنا مضبوط ہے کہ حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ نے عذاب قبر کے منکر کو کافر کہا ہے۔ حالانکہ وہ تکفیر کے مسئلہ میں بڑے محتاط ہیں اور ان کا یہ فیصلہ ہے کہ اگر کسی ایک کلمہ میں مثلاً سو ۱۰۰ معانی کا احتمال پیدا ہو سکتا ہے جن میں ننانوے پہلو کفر کے نکلتے ہوں اور صرف ایک ہی پہلو اسلام کا پیدا ہوتا ہو تو قائل کی تکفیر نہیں کی جائے گی۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ قائل کی مراد اسلام ہی کا پہلو ہو۔ ہاں! اگر خود ہی وہ کفر کا کوئی معنی اور پہلو متعین کر دے تو پھر کفر کے فتویٰ سے اس کو کوئی تاویل نہیں بچا سکتی۔ مسئلہ کی وضاحت کے لیے مسلم حضرات فقہاء کرام میں سے چند بزرگوں کی شہادت ہم یہاں نقل کر رہے ہیں۔

عذاب و راحت قبر کا منکر اور فقہائے اسلام

علامہ طاہر بن احمد الحنفیؒ لکھتے ہیں:۔

ولا یجوز الصلوٰۃ خلف من ینکر شفاعۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم وینکر الکرام

الکاتبین وعذاب القبر کذا من ینکر الرویۃ لانہ کافر[1]

جو شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت اور کرام الکاتبین اور عذاب قبر اور رؤیت باری تعالیٰ کا منکر ہو اس کے پیچھے نماز درست نہیں ہے. کیوں کہ وہ کافر ہے۔

یہ عبارت اپنے مفہوم و مدلول کے لحاظ سے بالکل روشن ہے کسی مزید تشریح کی محتاج نہیں ہے۔

محقق علی الاطلاق حافظ ابن الہمام محمد بن عبد الواحد الحنفی السیواسیؒ فرماتے ہیں :-

ولا تجوز الصلوٰۃ خلف منکر الشفاعۃ والرؤیۃ وعذاب القبر والکرام الکاتبین لانہ کافر لتوارث ھٰذہ الامور من الشارع صلی اللہ علیہ وسلم.[2]

شفاعت اور اللہ تعالیٰ کے دیدار اور عذاب القبر اور کراماً کاتبین کے انکار کرنے والے کی اقتدار میں نماز درست نہیں ہے. کیونکہ وہ کافر ہے اس لیے کہ یہ امور شارع علیہ السلام سے تواتر کے ساتھ ثابت ہیں.

یہ حوالہ بھی اپنے مدلول میں صریح ہے. فتاویٰ عالمگیری میں بھی انکارِ عذابِ قبر کو کفر لکھا ہے۔[3]

امام ابو عبد اللہ محمد بن احمد بن بکر الانصاری الخزرجی الاندلسی القرطبی ارشاد فرماتے ہیں :-

فاعلموا ایھا الاخوان ان عذاب القبر ونعیمہ حق کما صرحت بہ الاحادیث الصحیحۃ ولکن اللہ تعالیٰ یاخذ بابصار الخلائق واسماعھم من الجن والانس عن رویۃ عذاب القبر ونعیمہ لحکمۃ الٰھیۃ ومن شک فی ذٰلک فھو ملحد[4]

---

[1] خلاصۃ الفتاویٰ جلد ا صفحہ ۱۴۹ [2] فتح القدیر مصری جلد ا صفحہ ۲۴۷ [3] فتاویٰ عالمگیری جلد ۲ صفحہ ۲۰۱ طبع مصری
[4] مختصر تذکرۃ القرطبی لعبد الوہاب الشعرانی صفحہ ۳۶ طبع مصری.

اے بھائیو! تم بخوبی جان لو کہ قبر کا عذاب اور اس کی راحت برحق ہے۔ جیسا کہ صحیح احادیث صراحت سے اس پر دلالت کرتی ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ اپنی (مکلف) مخلوق میں سے جنوں اور انسانوں کی آنکھوں اور کانوں سے قبر کے عذاب و راحت کو اوجھل رکھتا ہے کیونکہ حکمتِ الٰہی کا تقاضا یہی ہے اور جو شخص اس کا انکار کرے تو وہ ملحد ہے۔

علامہ عبدالشکور السالمیؒ فرماتے ہیں:۔

فاما عذاب القبر للمؤمنين حق للكافرين من الواجبات والله تعالى يقول النار يعرضون عليها غدوًّا و عشيا يعني فرعون وقومه دل انه كان صحيحًا في اي موضع وعلى اي حال ومن انكر هذا يصير كافرًا والله اعلم[1]

عذاب قبر مومنین کے لیے جائز اور کافروں کے لیے واجب ہے۔ اللہ کا فرمان ہے کہ فرعون اور اس کی قوم صبح و شام آگ پر پیش کی جاتی ہے۔ یہ ارشاد دلالت کرتا ہے کہ عذاب صحیح ہے، جس جگہ میں ہو اور جس حالت میں ہو۔ جو اس کا منکر ہو سو وہ کافر ہے۔ واللہ اعلم

مولانا عبدالعلی بحرالعلوم الحنفیؒ لکھتے ہیں:۔

منكر الشفاعة لاهل الكبائر والرؤية وعذاب القبر وكرام الكاتبين كافر[2]

ترجمہ: اہل کبائر کی شفاعت کا منکر، رویتِ باری تعالیٰ کا منکر، عذابِ قبر کا منکر اور کرام کاتبین کا منکر سب کافر ہیں۔

دستخط حضرات مفتیانِ کرام	مہر دارالافتاء جامعہ اسلامیہ دیوبند ۲۲ شعبان ۱۴۰۵ھ

[1] تمہید ص ۱۲۵ طبع مصر [2] رسائل بحرالعلوم ص ۹۹